جلد چہارم

بقیہ سورۂ مائدہ سے سورۂ اعراف تک

پارہ ۷ تا پارہ ۹ رکوع ۱۴

تالیف

حضرت علامہ قاضی محمد ثناء اللہ عثمانی مجددی پانی پتیؒ

تشریحی ترجمہ مع ضروری اضافات

مولانا سید عبد الدائم الجلالی

رفیق ندوۃ المصنفین

ناشر

دار الاشاعت

اردو بازار کراچی ۱ ——— فون ۲۱۳۷۶۸

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نحمدہ و نصلی علیٰ رسولہ الکریم

عرض ناشر

اللہ تعالیٰ کا انعام ہے کہ کئی سال کی کوشش کے بعد دارالاشاعت کراچی کی جانب سے تفسیر مظہری اردو کا ایڈیشن زیور طبع سے آراستہ ہو کر قارئین کی خدمت میں پیش کیا جارہا ہے۔

میرے والد ماجد جناب الحاج محمد رضی عثمانی رحمۃ اللہ علیہ نے جہاں اشاعت دین کے پیش نظر قرآن و حدیث، فقہ و تصوف، سیرت و تاریخ کی متعدد گرانقدر کتب کی طباعت کی خدمات انجام دی وہاں ان کی یہ بھی خواہش تھی کہ تفسیر مظہری کی طباعت و اشاعت کا شرف بھی حاصل کریں کیونکہ حضرت قاضی ثناء اللہ عثمانی پانی پتی" نے اس تفسیر میں ایک خاص طرز سے بھی احناف فرمایا کہ مسلک کے اعتبار سے احناف اور شافعی مسلک کے نظریاتی اختلافات بھی واضح فرمائے ہیں اور یہ بھی بتایا کہ احناف کا اس سلسلے میں کیا مقام ہے۔ اسی وجہ سے اس کی افادیت اور بھی بہت بڑھ گئی ہے، نیز مصنف رحمۃ اللہ علیہ ایک طرف قرآن و حدیث اور فقہ میں اپنے وقت کے نامور علماء میں شامل تھے تو دوسری طرف باطنی علوم اور تزکیہ و سلوک میں بھی شیخ وقت سمجھے جاتے تھے، شاید اسی وجہ سے یہ تفسیر تمام دینی حلقوں میں مستند سمجھی جاتی ہے۔

اس تفسیر کا اردو ترجمہ مولانا سید عبدالدائم جلالی رحمۃ اللہ علیہ نے ندوۃ المصنفین دہلی کے زیر اہتمام فرمایا تھا۔ لیکن یہ تفسیر اب تک عوام کو سہولت سے دستیاب نہ تھی۔ اللہ تعالیٰ کے فضل سے ہم نے (حسب اجازت حکومت سندھ پاکستان DPR (NO /2/PB/91.213.24.3.1991) سے شائع کرنے کی سعادت حاصل کی ہے۔

حتی الامکان اس کی اشاعت میں کوشش کی ہے کہ اغلاط نہ رہ جائیں، لیکن پھر بھی تمام حضرات سے درخواست ہے کہ کوئی غلطی نظر آئے تو ادارے کو مطلع فرما کر مشکور فرمائیں۔

اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ اس کو شرف قبولیت سے نوازیں اور دنیا و آخرت کے لئے نافع بنائیں، آمین

طالب دعا **خلیل اشرف عثمانی**

ولد محمد رضی عثمانی رحمہ اللہ تعالیٰ علیہ

نعمتہ پہلے یہ تفسیر باریک کتابت اور لیتھو طریقہ طباعت پر دستیاب تھی اب الحمد للہ کمپیوٹر کی خوبصورت کتابت اور آفسٹ طریقہ طباعت کے ساتھ اور آیات کے قریب ساتھ اور عنوان کے مقامات کو واضح نمایاں کر کے پیش خدمت ہے اللہ تعالیٰ ہماری کوشش کو قبول فرمائے آمین

تفسیر مظہری اور اس کے مصنف

قرآن کریم بنی نوع انسان کے لئے اللہ تعالیٰ کی نازل کردہ وہ آخری کتاب ہے جو رہتی دنیا تک مشعلِ راہ اور ہدایت کا سامان ہے۔ یہ وہ کتاب ہے جس کا ایک ایک لفظ اور نقطہ محفوظ اور اس کا ایک ایک جملہ دریا بکوزہ کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس کا پڑھنا اتنا آسان کہ دنیا کے ہر خطے میں دس بارہ سال کے معصوم بچے بآسانی پورے قرآن کو اپنے سینوں میں محفوظ کر لیتے ہیں۔ اس کی تعلیمات اتنی ہمہ گیر کہ جن کی مثال کہیں ڈھونڈنے سے نہیں ملتی۔ اس کے احکام اس قدر مستحکم کہ صدیوں پر صدیاں گزرنے کے باوجود ان کی حقانیت روز بروز مسلّم ہوتی جاتی ہے۔ اس کے الفاظ اتنے جامع کہ مفسرین و محققین اپنی پوری کوشش کے باوجود ان کے معانی و مفاہیم کو اپنے قابو میں لانے سے عاجز نظر آتے ہیں۔ یہ وہ کلام اللہ ہے جسے خالق دو جہاں نے خاتم النبیین سیدنا احمد مصطفیٰ محمد مجتبیٰ ﷺ پر تئیس سال میں نازل فرمایا اور دنیا بھر کے تمام فصیح و بلیغ انسانوں کو اس کے مقابلے کا چیلنج دے کر اسے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے معجزہ بنا دیا۔

قرآن مجید کا اعجاز اس کے الفاظ میں بھی ہے اور اس کے معانی میں بھی۔ الفاظ کی بندش، نشست و برخاست، روانی و تسلسل، شوکت و دبدبہ کے ساتھ لطافت و حلاوت کا حیران کن امتزاج، صوتی تاثرات کی ہم آہنگی اور دلوں پر بجلی کی طرح گرنے والی تاثیر، حسنِ عبارت اور حسنِ استعمال کی ناقابل بیان خوبصورت کیفیات، آفتاب قرآنی کی چند کرنیں ہیں، جن سے اعجاز قرآنی کی کچھ جھلک نمودار ہوتی ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ معانی کی سحر آفرینی، ان کی ہمہ گیری و وسعت، انسانی زندگی کے ہر شعبے کے بارے میں واضح ہدایات، علم الغیب کی حیرت انگیز صداقت، ترغیب و ترہیب کی دلوں پر غیر معمولی تاثیر، آفاقی رہنما اصول اور ان کی صداقت، معانی کے اعجاز کی وہ چند جھلکیاں ہیں جن سے قرآن کا معجزہ ہونا کھلی آنکھوں نظر آتا ہے۔

قرآن مجید اللہ کا کلام ہے اور جس طرح اللہ تعالیٰ ہر انسان کی شہ رگ سے بھی زیادہ قریب ہیں، مگر ان کی ذات و صفات کا مکمل ادراک محدود انسانی عقل کے بس سے باہر ہے، اسی طرح اللہ کے کلام کا پڑھنا آسان، اسے یاد کرنا آسان، اس سے نصیحت حاصل کرنا اور پھر اس پر عمل پیرا ہونا آسان، مگر اس کے معانی و مطالب کا مکمل استیعاب اور اس کے جملہ پہلوؤں کا زبان و قلم سے احاطہ کر لینا اسی طرح ناممکن ہے جیسے اللہ تعالیٰ کی ذات والا صفات اور اس کی دیگر صفات کا احاطہ کرنا ناممکن ہے۔

رحمت عالم حضور اقدس ﷺ نے اپنے اقوال و افعال کے ذریعے نہ صرف قرآن حکیم کی تشریح و تفسیر کی بلکہ آپ کی ذات اقدس قرآن مجید کا عملی نمونہ تھا اور آپ کی احادیث طیبہ قرآن حکیم کی مکمل تفسیر۔ علم و عمل کا یہ تفسیری ورثہ اور اس کا تسلسل پہلے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین اور اس کے بعد تابعین، تبع تابعین رحمہم اللہ کی عملی زندگی اور ان کے اقوال کی شکل میں منتقل ہوا اور پھر اس مقصد کے لئے بے شمار مفسرین نے تفاسیر لکھیں، جن میں کلام خداوندی کے معانی و مفاہیم کو اجاگر کر کے لوگوں کے لئے راہِ عمل کو آسان بنایا گیا۔ ان میں ہر طرح کی تفاسیر تھیں، مختصر بھی اور طویل بھی۔ یہ تفاسیر مختلف ادوار میں مختلف مفسرین اپنے اپنے ذوق علمی کے پیش نظر تحریر کرتے رہے اور خدمت قرآن کی سعادت حاصل کرتے رہے، مگر ان سب میں صرف وہ تفاسیر ممتاز ہیں جنہیں قبولیت عامہ نصیب ہوئی اور جن پر جمہور اہل سنت والجماعت نے بھرپور اعتماد کیا۔ انہیں تفاسیر میں سے ایک تفسیر "تفسیر مظہری" ہے جس کا ترجمہ شائع کرنے کی سعادت دار الاشاعت کو حاصل ہو رہی ہے۔

مصنف:- اس تفسیر کے مصنف علامہ قاضی محمد ثناء اللہ صاحب پانی پتی رحمۃ اللہ علیہ ہیں، یہ سلسلۂ چشت کے مشہور بزرگ حضرت شیخ جلال الدین کبیر الاولیاء پانی پتی قدس سرہ کی اولاد میں سے ہیں، اور ان کا سلسلۂ نسب سیدنا عثمان غنی رضی اللہ عنہ تک پہنچتا ہے، اسی کی وجہ سے انہیں عثمانی بھی لکھا جاتا ہے۔

قاضی ثناء اللہ پانی پت میں پیدا ہوئے، وہیں قرآن مجید حفظ کر کے ابتدائی درجات کی دینی تعلیم مکمل کی، جس کے بعد دہلی جا کر

حضرت شاہ ولی اللہ صاحب محدث دہلویؒ جیسی جلیل القدر شخصیت سے حدیث کا باقاعدہ علم حاصل کیا۔ اٹھارہ سال کی عمر میں تحصیل علوم سے فارغ ہو کر تزکیہ باطنی کی طرف متوجہ ہوئے تو اولاً شیخ محمد عابد سنامیؒ کے ہاتھ پر بیعت کی اور مدارج طے کئے۔ ان کی وفات کے بعد اس وقت کے نامور ولی اللہ حضرت میرزا مظہر جان جاناں شہیدؒ (۱۱۹۵ھ) کے دست مبارک پر بیعت کا شرف حاصل کیا اور ان کے نامور خلفاء میں شامل ہوئے۔ حضرت میرزا مظہر جان جاناں ان سے بہت زیادہ محبت کرتے تھے، فرمایا کرتے تھے کہ اگر اللہ تعالیٰ مجھ سے کسی تحفے کا مطالبہ فرمائیں تو میں ثناء اللہ کو پیش کر دوں گا۔ یہ بھی فرماتے تھے کہ ثناء اللہ کی دیانت، تقویٰ اور ان کی نیکی کی وجہ سے میرے دل پر ہیبت رہتی ہے۔ یہ پیشین گوئی بھی فرمائی کہ اللہ تعالیٰ ان سے ترویج شریعت اور اشاعت طریقت کا کام لیں گے۔ یہی وجوہات تھیں جن کی وجہ سے حضرت میرزا صاحب قدس سرہ نے اپنے اس چہیتے خلیفہ کا لقب "علم الہدیٰ" رکھا ہوا تھا۔

نزہۃ الخواطر کے مصنف لکھتے ہیں کہ قاضی ثناء اللہ صاحب پانی پتی کے علم، تدبر اور فقہ و حدیث میں مہارت کی وجہ سے حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب محدث دہلویؒ نے انہیں "بیہقی وقت" کا خطاب دیا ہوا تھا۔

آپ کے پیر بھائی شیخ غلام علی دہلوی (۱۲۴۰ھ) اپنی کتاب مقامات میں بیان کرتے ہیں کہ قاضی ثناء اللہ تقویٰ و تدین کے اندر اپنے دور میں اپنی مثال آپ تھے۔ دن بھر میں درس و تدریس، وعظ و تصنیف، مراقبہ و اشتغال، ذکر و اذکار کے علاوہ سو رکعت نوافل اور قرآن مجید کی سات منزلوں میں سے روزانہ ایک منزل کا معمول تھا۔ خوش اوقاتی اور سلامت طبع ان کا خاص وصف تھا۔

تلامذہ اور مسترشدین کی کثیر تعداد کے علاوہ مختلف موضوعات پر وقیع دینی تصانیف حضرت قاضی صاحبؒ اپنے بعد بطور صدقۂ جاریہ چھوڑ کر گئے۔ تفسیر میں "تفسیر مظہری" سات جلدوں میں اور حدیث میں "کتاب مبسوط" دو جلدوں میں تحریر کی۔ فقہ حنفی میں مشہور درسی کتاب "مالابد منہ" ان ہی کی تحریر کردہ ہے۔ تردید شیعہ میں "السیف المسلول"۔ تصوف و سلوک میں "ارشاد الطالبین"، "تذکرۃ الموتیٰ والقبور"، "تذکرۃ المعاد" اور "حقیقت الاسلام" ان کی معروف تصانیف ہیں۔ ان کے علاوہ موسیقی کی حرمت، متعہ کی حرمت اور عشر و خراج کے احکام پر ان کے رسائل بھی مفید خواص و عام رہے ہیں۔ حضرت قاضی صاحب کا انتقال یکم رجب ۱۲۲۵ھ کو پانی پت میں ہوا اور وہیں ان کی تدفین عمل میں آئی۔ رحمہ اللہ واسعۃ۔

تفسیر مظہری :۔ حضرت قاضی ثناء اللہ صاحب پانی پتی رحمۃ اللہ علیہ کی تصانیف میں سب سے نمایاں حیثیت ان کی تفسیر مظہری کو حاصل ہے، جسے انہوں نے عربی زبان میں سات بڑی جلدوں میں تحریر کیا اور اپنے مربی و شیخ حضرت میرزا مظہر جان جاناں شہیدؒ کے نام پر اس کا نام "مظہری" رکھا۔ اس تفسیر کو بحمداللہ قبولیت عامہ حاصل ہوئی، عربی میں تو اس سے استفادہ ہوتا ہی رہا، اردو ترجمے کے بعد اس کا فائدہ اور عام ہو گیا۔

حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب مد ظلہم (فرزند ارجمند حضرت اقدس مولانا مفتی محمد شفیع صاحب قدس سرہ) دور حاضر کی مقبول و معروف تفسیر معارف القرآن کے مقدمے میں رقم طراز ہیں۔

> "تفسیر مظہری علامہ قاضی ثناء اللہ صاحب پانی پتی کی تصنیف ہے ..... ان کی یہ تفسیر بہت سادہ اور واضح ہے اور اختصار کے ساتھ آیات قرآنی کی تشریح معلوم کرنے کے لئے نہایت مفید، انہوں نے الفاظ کی تشریح کے ساتھ متعلقہ روایات کو بھی کافی تفصیل سے ذکر کیا ہے اور دوسری تفسیروں کے مقابلے میں زیادہ چھان پھٹک کر روایات لینے کی کوشش کی ہے۔" (معارف القرآن اول صفحہ ۵۸ جلد ۱)

امید ہے کہ دارالاشاعت کے زیر اہتمام چھپنے والا تفسیر مظہری کا یہ نیا ایڈیشن ان شاء اللہ عوام و خواص میں مقبول ہوگا اور قرآن حکیم کی تعلیمات کو عام کرنے اور اس پر عمل پیرا ہونے کے لئے مشعل راہ ثابت ہوگا۔ اللہ تعالیٰ اس خدمت کو قبول فرمائے، آمین۔

احقر محمود اشرف عثمانی عفی عنہ

استاذ دارالعلوم کورنگی کراچی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

فہرست عنوانات

تفسیر مظہری اردو جلد چہارم "واذا سمعوا"

فہرست سورۃ انعام

نَحْمَدُهٗ وَنُصَلِّیْ عَلٰی رَسُوْلِهِ الْکَرِیْم

تفسیر مظہری اردو جلد چہارم "وَاِذَا سَمِعُوْا، وَلَوْ اَنَّنَا"

بسم اللہ الرحمن الرحیم

وَاِذَا سَمِعُوْا مَآ اُنْزِلَ اِلَى الرَّسُوْلِ تَرٰٓى اَعْيُنَهُمْ تَفِيْضُ مِنَ الدَّمْعِ (اور جب وہ اس (کلام) کو سنتے ہیں جو رسول ﷺ کے پاس بھیجا گیا ہے تو آپ ان کی آنکھوں کو آنسو بہاتے دیکھتے ہیں۔ طبرانی نے بھی نسائی کی مذکورہ بالا روایت کی طرح بیان کیا ہے مگر واقعہ کو ذرا تفصیل سے بیان کیا ہے۔

میں کہتا ہوں تب بھی یہ واقعہ نجاشی کے متعلق آیت کا نزول حکم کی تخصیص کو نہیں چاہتا کہ انہی کے ساتھ حکم مخصوص ہو کیونکہ الفاظ کا عموم معتبر ہوتا ہے واقعہ کی خصوصیت نا قابل اعتبار ہے۔

وَاِذَا سَمِعُوْا کا عطف ذٰلِكَ بِاَنَّ مِنْهُمْ قِسِّيْسِيْنَ پر ہے۔ رونے کا ذکر کرنے سے مقصود ہے ان کے دلوں کی رقت کا، خوف الٰہی کی شدت کا، قبول حق کی طرف سبقت کرنے کا اور پیام حق سے سرکشی نہ کرنے کا اظہار۔

فیض کا معنی ہے کسی چیز کا بھرنے کے بعد چھلک جانا۔ بھرنے کی بجائے چھلکنے کا لفظ کلام میں زور پیدا کرنے کے لئے استعمال کیا گیا یوں کہا جائے کہ کثرت گریہ کی وجہ سے (بجائے آنسوؤں کے) آنکھوں کو چھلکنے والا قرار دینے میں کثرت بکاء کو ظاہر کرنا مقصود ہے (بہنے والی چیز پانی ہے۔ آنکھیں پانی نہیں بہتی مگر مجازاً ظرف بول کر مظروف مراد لے لیا جاتا ہے یا ظرف کی طرف فعل کی نسبت مبالغۃً کر دی جاتی ہے)

مِمَّا عَرَفُوْا مِنَ الْحَقِّ (اس سبب سے کہ انہوں نے حق کو پہچان لیا) مِمَّا عَرَفُوْا میں مِنْ ابتدائیہ ہے یا تعلیلیہ یعنی حق کو پہچاننے کی وجہ سے اور ما موصولہ ہے اور مِنَ الْحَقِّ میں مِنْ بیانیہ ہے۔ یعنی جو حق انہوں نے پہچان لیا اس کے سبب سے ان کی آنکھیں آنسو بہاتی ہیں یا مِنَ الْحَقِّ میں مِنْ تبعیضیہ ہے یعنی حق کو کسی قدر پہچاننے کے بعد ان پر گریہ طاری ہو گیا۔ اگر پورے حق کو پہچان لیتے تو کیا حال ہوتا۔ عطاء کی روایت میں حضرت ابن عباس (رضی اللہ تعالیٰ عنہما) کا قول آیا ہے کہ سننے والوں سے مراد ہیں نجاشی اور ان کے ساتھی حبش میں (نجاشی کے دربار میں) حضرت جعفرؓ نے ان کو کھٰیٰعٰصٓ پڑھ کر سنائی تھی تو جب تک آپ پڑھتے رہے وہ لوگ روتے رہے۔

يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَآ اٰمَنَّا فَاكْتُبْنَا مَعَ الشّٰهِدِيْنَ ۝ کہتے ہیں اے ہمارے رب ہم نے (تیرے رسول محمد اور اس کتاب کو جو تو نے محمد ﷺ پر نازل کی ہے) مان لیا تو ہم کو بھی انہی لوگوں کے ساتھ لکھ لے جو تصدیق کرنے والے ہیں) (اٰمَنَّا سے مراد گزشتہ ایمان کو بیان کرنا نہیں ہے بلکہ ایمان لانے سے مراد ہے نیا ایمان لانا اور زمرۂ مومنین میں داخل ہونا۔ رَبَّنَا کا لفظ بتا رہا ہے کہ وہ منافقوں کی طرح ایمان نہیں لائے بلکہ سچے دل سے انہوں نے تصدیق کی۔ اَلشّٰهِدِيْنَ سے مراد ہے امت محمدیہ جو (قیامت کے دن) پیغمبروں کی طرف سے شہادت دے گی (کہ ان پیغمبروں نے اپنی اپنی امتوں کو پیام ہدایت پہنچا دیا تھا)۔

وسطی عیسائیوں نے اپنی دعا میں یہ لفظ اسلئے کہا کہ انکو انجیل پڑھنے سے معلوم ہو گیا تھا کہ امت محمدیہ پیغمبروں کی طرف سے شہادت دیگی۔ یا شاہدین سے مراد ہیں نبوت محمدیہ اور حقانیت قرآن کی شہادت دینے والے یعنی مسلمان۔ شہادت (سے مراد تصدیق ہے کیونکہ شہادت) وہی ہوتی ہے جو اندرون قلب اور سچے دل سے ہو۔ اللہ تعالیٰ نے منافقوں کے متعلق (باوجودیکہ وہ زبانی اقرار کرتے تھے) فرمایا ہے وَاللّٰهُ يَشْهَدُ اِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ لَكٰذِبُوْنَ گویا الشّٰهِدِيْنَ کا لفظ بتا رہا ہے کہ انہوں نے

اس امر کا اظہار کیا کہ ہمارا ایمان سچا ہے۔ ہم منافقوں کی طرح نہیں اور اگلی آیت میں اس طرح بیان کی۔

وَمَا لَنَا لَا نُؤْمِنُ بِاللَّهِ وَمَا جَاءَنَا مِنَ الْحَقِّ وَنَطْمَعُ أَنْ يُدْخِلَنَا رَبُّنَا مَعَ الْقَوْمِ الصَّالِحِينَ ﴿۸۴﴾

اور کیا وجہ کہ ہم اللہ پر اور اس حق پر جو ہمارے پاس پہنچا ہے ایمان نہ لائیں اور اس بات کی امید نہ کریں کہ ہمارا رب ہم کو نیک لوگوں کے گروہ میں شامل کر دے۔

الْقَوْمِ الصَّالِحِينَ سے مراد ہیں ایماندار مسلمان جن کے متعلق اللہ نے فرمایا ہے وَلَقَدْ كَتَبْنَا فِي الزَّبُورِ مِنْ بَعْدِ الذِّكْرِ أَنَّ الْأَرْضَ يَرِثُهَا عِبَادِيَ الصَّالِحُونَ (ہم نے نصیحت کے بعد زبور میں لکھ دیا تھا کہ زمین کے وارث میرے نیک بندے ہوں گے)۔

نَطْمَعُ کا عطف نُؤْمِنُ پر ہے (یعنی حرف نفی کے تحت، جیسا اس کے موافق ہم نے ترجمہ کیا ہے) یعنی کیا عذر ہے کہ ہم ایمان نہ لائیں اور امید نہ کریں۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ لَا نُؤْمِنُ پر عطف ہو یعنی کیا وجہ کہ ہم اللہ پر اور کلام حق پر ایمان بھی نہ لائیں اور پھر نیک لوگوں کے زمرہ میں شامل کئے جانے کی امید بھی رکھیں۔ عدم ایمان کے ساتھ تو امید صحیح نہیں ہو سکتی۔ یہ بھی ممکن ہے کہ لَا نُؤْمِنُ کی ضمیر سے نَطْمَعُ حال ہو یعنی کیا وجہ کہ ہم ایمان نہ لائیں ایسی حالت میں کہ ہم کو زمرہ صالحین میں شامل ہونے کی امید بھی ہوتی ہے۔ مطلب یہ کہ جب انعام خداوندی کی ہم کو امید ہے تو اس امید کا تو تقاضا یہ ہے کہ ہم ایمان لائیں۔ مقتضی موجود ہے تو مقتضی کا نہ ہونا بعید از عقل ہے۔

بغوی نے لکھا ہے یہ سوال کا جواب ہے یہودیوں نے عار دلائی تھی اور کہا تھا تم ایمان لے آئے ایسا کیوں کیا؟ تو انہوں نے مذکورہ بالا جواب دیا۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ جب وہ لوگ اپنی قوم کے پاس مسلمان ہونے کے بعد لوٹ کر گئے تو انہوں نے ملامت کی اس وقت ان لوگوں نے مذکورہ جواب دیا۔ لیکن جواب بالکل فصل، قطع کلام کو چاہتا ہے اس لئے اس پر حرف عطف نہیں لایا جاسکتا اور یہاں حرف عطف موجود ہے اس لئے کچھ تاویل کرنی ہوگی مثلاً کچھ کلام محذوف مان کر اس پر عطف قرار دیا جائے گا۔

فَأَثَابَهُمُ اللَّهُ بِمَا قَالُوا جَنَّاتٍ تَجْرِي مِنْ تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ خَالِدِينَ فِيهَا "سو اللہ ان کے اس قول کی جزا میں ان کو ایسے باغ عطا فرمائے گا جن کے نیچے نہریں جاری ہوں گی (اور) ہمیشہ ان باغوں میں رہیں گے۔" یعنی خلوص اعتقاد کے بعد جو انہوں نے اظہار ایمان کیا اس کے عوض اللہ ان کو جنت عطا فرمائے گا۔ خلوص اعتقاد کا ظہور ان کے رونے سے ہو رہا ہے کہ کلام حق کو سننے کے بعد وہ رونے لگے تھے۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ قول کا (حقیقی) معنی ہی یہ ہے کہ عقیدہ کے بعد قول ہو جیسے بولتے ہیں یہ فلاں شخص کا قول ہے یعنی پختہ خیال ہے۔

وَذَٰلِكَ جَزَاءُ الْمُحْسِنِينَ ﴿۸۵﴾ اور یہ (جنت) نیکوکاروں کی جزا ہے۔

یعنی ان نیکوکاروں کی جزاء اعمال ہے جو حضور قلب اور انتہائی خشوع سے اللہ کی عبادت کرتے ہیں۔ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا تھا احسان (عبادت کی انتہائی خوبی) یہ ہے کہ تم اپنے رب کی عبادت اس طرح کرو گویا (وہ تمہارے سامنے ہے اور) تم اس کو دیکھ رہے ہو۔ اور اگر یہ نہ ہو تو پھر یہ (یقین رکھو) کہ وہ تم کو دیکھ رہا ہے۔

قرآن مجید کا ضابطہ ہے کہ ترغیب کے بعد خوف بھی دلاتا ہے دونوں کو جوڑ کر بیان کرتا ہے اس لئے آئندہ آیت میں کافروں کی سزا کا ذکر کیا اور چونکہ اہل ایمان کے ذکر میں قلبی تصدیق، معرفت حق اور اقرار قولی کو بیان کیا تھا اس لئے (اس کے مقابل) انکار حق اور تکذیب کا ذکر کیا اور فرمایا۔

وَالَّذِينَ كَفَرُوا وَكَذَّبُوا بِآيَاتِنَا أُولَٰئِكَ أَصْحَابُ الْجَحِيمِ ﴿۸۶﴾ (اور جن لوگوں نے (اللہ اور اللہ کے پیام حق کو نہ مانا (یعنی دل سے انکار کیا) اور (زبان سے) تکذیب کی یہی لوگ دوزخی ہیں۔)

ترمذی وغیرہ نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا بیان نقل کیا ہے کہ ایک شخص نے خدمت گرامی میں حاضر ہو کر عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ جب میں گوشت کھا لیتا ہوں تو میری خواہش مردانہ میں ہیجان پیدا ہو جاتا ہے اس لئے میں نے اپنے

لئے گوشت حرام کر لیا ہے اس پر آیت ذیل نازل ہوئی۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تُحَرِّمُوْا طَيِّبٰتِ مَآ اَحَلَّ اللّٰهُ لَكُمْ اے ایمان والو اللہ نے جو چیزیں تمہارے لئے حلال کر دی ہیں ان میں سے (خصوصیت کے ساتھ) پسندیدہ مرغوب اشیاء کو حرام نہ بناؤ۔

طَيِّبٰتِ سے مراد ہیں پسندیدہ مزے دار چیزیں جو مرغوب طبع ہوں۔ ترتیب آیات میں ایک خاص خوبی ہے۔ اول نصاریٰ کی تعریف فرمائی اور ان کی رہبانیت کو قابل مدح صفت قرار دیا اور نفسانی جوش کو توڑنے کی ترغیب دی پھر اس کے بعد حد مقررہ سے آگے بڑھنے اور حلال کو حرام کی حدود میں داخل کر دینے کی ممانعت فرما دی۔

وَلَا تَعْتَدُوْا ۭ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْمُعْتَدِيْنَ اور (حلال کو حرام بنا کر) حدود مقررہ سے آگے نہ بڑھو اللہ حد سے آگے بڑھنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔ یہ مطلب ہے کہ حلال کی حد سے آگے بڑھ کر حرام کے دائرہ میں نہ داخل ہو (یعنی حرام کے مرتکب نہ ہو) اس وقت آیت میں حرام کو حلال اور حلال کو حرام بنانے کی ممانعت اور اعتدال کی راہ اختیار کرنے کی دعوت ہو گی۔ یہ مقصد بھی ہو سکتا ہے کہ پاکیزہ چیزوں کو استعمال کرنے میں اسراف (اعتدال سے زیادتی) کا اختیار نہ کرو۔ ابن جریر نے بسند عوفی بیان کیا ہے کہ حضرت عثمان بن مظعون اور بعض دوسرے صحابیوں نے عورتوں اور گوشت کو اپنے لئے حرام بنا لیا تھا اور چھریاں لے کر مردانہ آلات کو کاٹ ڈالنے کا تہیہ کر لیا تھا تاکہ نفسانی خواہش کی جڑ ہی کٹ جائے اور عبادت کے لئے فراغت دل حاصل ہو جائے۔ اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔

ابن جریر نے ایسا ہی قصہ مرسلاً عکرمہ، ابو قلابہ، مجاہد، ابو مالک، نخعی اور سدی وغیرہ کے حوالہ سے نقل کیا ہے۔ سدی کی روایت میں اتنا اور بھی ہے کہ یہ صحابی دس تھے جن میں حضرت عثمان بن مظعون اور حضرت علی بن ابی طالبؓ بھی شامل تھے۔ سدی کی روایت میں ان حضرات کی تعداد دس آئی ہے جن میں حضرت ابن مظعون اور حضرت علی بن ابی طالبؓ کا بھی ذکر ہے۔ عکرمہ کی روایت ان الفاظ کے ساتھ آئی ہے ان میں سے ابن مظعون، علی، ابن مسعود، مقداد بن اسود اور حذیفہ رضی اللہ عنہم کے آزاد کردہ سالم رضی اللہ عنہ بھی تھے۔ مجاہد کی روایت میں صرف ابن مظعون اور عبداللہ بن عمرو (بن عاص) کی صراحت ہے۔

ابن عساکر نے تاریخ میں سدی صغیر کے سلسلے سے بروایت کلبی بحوالہ ابو صالح حضرت ابن عباس کا بیان نقل کیا ہے کہ اس آیت کا نزول صحابہ کی ایک جماعت کے متعلق ہوا تھا اس جماعت میں ابو بکر، عمر، علی، ابن مسعود، عثمان بن مظعون، مقداد بن اسود اور حذیفہ رضی اللہ عنہم کے آزاد کردہ سالم شامل تھے۔ سب نے باتفاق آراء طے کر لیا تھا کہ آلات مردانگی قطع کر دیں گے، عورتوں سے کنارہ کش ہو جائیں گے، گوشت اور چکنائی نہیں کھائیں گے کمبل کا لباس پہنیں گے، کھانا بقدر بقاء زندگی کھائیں گے اور سادھوؤں کی طرح سیاحت میں بسر کریں گے۔

بغوی نے اہل تفسیر کی روایت سے لکھا ہے کہ ایک روز رسول اللہ ﷺ نے وعظ فرمایا اور قیامت کا تذکرہ کیا جس کو سن کر لوگوں کے دلوں میں رقت پیدا ہوئی اور رونے لگے اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ بن مظعون کے مکان میں دس صحابی جمع ہوئے۔ عثمان بن مظعون کے علاوہ ابو بکر صدیق، علی بن ابی طالب، عبداللہ بن مسعود، عبداللہ بن عمرو، ابو ذر غفاری، ابو حذیفہ کے آزاد کردہ سالم، مقداد بن اسود، سلمان فارسی، معقل بن مقرن رضی اللہ عنہم مشورہ کے بعد باتفاق طے پایا کہ سب کے سب ترک دنیا کر کے ٹاٹ کا لباس پہن لیں گے۔ آلات مردانگی کو قطع کر لیں گے، ہمیشہ روزے رکھیں گے، رات بھر نمازیں پڑھیں گے، بستر پر نہیں سوئیں گے، گوشت اور چربی نہیں کھائیں گے، عورتوں کے اور خوشبو کے پاس بھی نہیں جائیں گے اور سیاحت میں بسر کریں گے۔ جونہی اس کی اطلاع رسول اللہ ﷺ کو پہنچی۔ حضور اقدس ﷺ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ بن مظعون کے مکان پر تشریف لے گئے، عثمان رضی اللہ عنہ سے ملاقات نہیں ہوئی۔ عثمان رضی اللہ عنہ کی بیوی خولاء ام حکیم بنت ابی امیہ موجود تھیں۔ خولاء عطر ساز تھیں حضور اقدس ﷺ نے اس سے دریافت کیا مجھے تمہارے شوہر کے متعلق جو

اطلاع ملی ہے کیا وہ صحیح ہے حولاء رسول اللہ ﷺ سے جھوٹ بولنا نہیں چاہتی تھیں اور نہ شوہر کا راز فاش کرنا مناسب سمجھتی تھیں اس لئے کہنے لگیں یا رسول اللہ ﷺ اگر عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے یہ بات آپ سے کہی ہے تو صحیح کہا ہے رسول اللہ ﷺ واپس تشریف لے آئے۔

حضرت ابن مظعون جب گھر پہنچے تو بیوی نے اطلاع دی۔ فوراً اٹھا اور ان کے ساتھی حضور ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے، سرکار والا نے ارشاد فرمایا مجھے اطلاع ملی ہے کہ تم لوگوں نے فلاں فلاں بات پر اتفاق کر لیا ہے کیا یہ سچ نہیں ہے۔ ابن مظعون نے جواب دیا بے شک سچ ہے لیکن حضور ہمارا مقصد صرف نیکی ہے حضور نے فرمایا مجھے اس کا حکم نہیں دیا گیا ہے۔ پھر فرمایا تم پر تمہاری جانوں کا بھی حق ہے روزے رکھو اور افطار بھی کرو، قیام (رات کی عبادت) کرو اور نیند بھی کرو میں (رات کے کچھ حصہ میں) نماز پڑھتا ہوں (یعنی نماز پڑھتا ہوں) اور (کچھ حصہ میں) سوتا بھی ہوں۔ روزے بھی رکھتا ہوں اور افطار بھی کرتا ہوں، گوشت اور چربی بھی کھاتا ہوں اور عورتوں سے قربت بھی کرتا ہوں۔ جو میرے طریقہ سے اعراض کرے گا وہ مجھ سے (متعلق) نہ ہوگا۔ پھر لوگوں کو جمع کر کے حضور ﷺ نے ایک خطبہ دیا اور فرمایا کیا وجہ ہے کہ کچھ لوگوں نے عورتوں کو اور کھانے کو اور خوشبو کو اور نیند کو اور دنیوی خواہشات کو بالکل حرام قرار دے رکھا ہے۔ میں تم کو سنیاسی اور راہب بن جانے کا حکم نہیں دیتا میرے دین میں گوشت اور عورتوں کو ترک کر دینے اور خانقاہ نشین بن جانے کا حکم نہیں۔ ہے میری امت کی سیاحت روزہ اور ان کی رہبانیت صرف جہاد ہے۔ اللہ کی عبادت کرو کسی چیز کو اس کا ساجھی نہ قرار دو، حج کرو، عمرہ کرو، نماز قائم کرو، زکوٰۃ ادا کرو، رمضان کے روزے رکھو اور سیدھی چال چلو تمہارے امور درست ہو جائیں گے۔ تم سے پہلے والے لوگ شدت پسندی کی وجہ سے تباہ ہوئے انہوں نے اپنے اوپر خود سختیاں عائد کیں تو اللہ نے بھی ان پر سختیاں کر دیں۔ گرجاؤں اور یہودی خانقاہوں میں بیٹھے ہوئے لوگ انہی کے باقی ماندہ (نشانات) ہیں۔ اس پر اللہ نے آیت مذکورہ نازل فرمائی۔

بغوی نے سعد بن مسعود رضی اللہ عنہ کی روایت سے لکھا ہے کہ حضرت عثمان بن مظعون نے رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ مجھے خصی بن جانے کی اجازت دے دیجئے، حضور نے فرمایا جس نے دوسرے کو خصی کیا اور جو خصی بنا (کوئی بھی) ہم سے (متعلق) نہیں ہے۔ میری امت کے لئے خصی ہونے کی جگہ روزے رکھنا ہے۔ عثمانؓ نے عرض کیا یا رسول اللہ مجھے سیاحت (یعنی کسی جگہ توطن پذیر نہ ہونے) کی اجازت دے دیجئے، فرمایا میری امت کے لئے سیاحت جہاد فی سبیل اللہ ہی ہے۔ صحابہ نے عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ ہم کو راہب (سادھو) بن جانے کی اجازت دے دیجئے، فرمایا میری امت کے لئے رہبانیت مسجدوں میں بیٹھنا اور نماز کا انتظار کرنا ہے۔

صحیحین (بخاری و مسلم) میں حضرت انس رضی اللہ عنہ کی روایت سے آیا ہے کہ تین شخص امہات المومنین کی خدمت میں رسول اللہ ﷺ کی عبادت کے متعلق دریافت کرنے حاضر ہوئے جب ان کو رسول اللہ ﷺ کی عبادت (کی مقدار) بتائی گئی تو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ انہوں نے اس مقدار کو قلیل سمجھا اور کہنے لگے ہم اور رسول اللہ ﷺ سے کیا مقابلہ حضور کے تو اگلے پچھلے قصور معاف کر دیئے گئے تھے۔ اس پر ایک شخص بولا میں تو ہمیشہ رات بھر نماز پڑھا کروں گا۔ دوسرے نے کہا میں ہمیشہ روزے رکھوں گا ناغہ نہیں کروں گا۔ تیسرا بولا میں عورتوں سے کنارہ کش رہوں گا، کبھی نکاح نہیں کروں گا۔ اتنے میں حضور ﷺ تشریف لے آئے اور فرمایا تم لوگوں نے ایسا ایسا کہا تھا سن لو، خدا کی قسم میں تم سے زیادہ اللہ کا خوف اور اس کی خشیت رکھتا ہوں، لیکن روزے بھی رکھتا ہوں اور افطار بھی کرتا ہوں (رات کو) نماز بھی پڑھتا ہوں اور سوتا بھی ہوں اور عورتوں سے نکاح بھی کرتا ہوں، جو شخص میرے طریقے سے اعراض کرے گا وہ مجھ سے (متعلق) نہیں ہے۔

ابوداؤد نے حضرت انس رضی اللہ عنہ کی روایت سے لکھا ہے کہ رسول اللہ ﷺ فرمایا کرتے تھے خود اپنے اوپر سختیاں نہ ڈالو ورنہ اللہ تم پر سختیاں ڈال دے گا، جن لوگوں نے خود شدت پسندی کی اللہ نے بھی ان پر شدت ڈال دی۔ یہ صومعوں خانقاہوں اور عیسائی گرجاؤں والے ان ہی کے باقی ماندہ (آثار) ہیں۔ (اللہ فرماتا ہے) رہبانیت خود ان کی ایجاد کردہ تھی ہم نے ان پر

رہبانیت فرض نہیں کی تھی۔

صحیحین میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا بیان منقول ہے کہ (ایک بار) رسول اللہ ﷺ نے کوئی کام کیا اور لوگوں کو بھی اس کی اجازت دے دی لیکن کچھ لوگوں نے اس کام سے بچنا چاہا اور ناپسند کیا۔ رسول اللہ ﷺ کو اس کی اطلاع پہنچ گئی آپ نے (لوگوں کو جمع کر کے) ایک تقریر کی اور اللہ تعالیٰ کی حمد کے بعد فرمایا کیا وجہ ہے کہ کچھ لوگ اس کام سے بچتے ہیں جو میں خود کرتا ہوں، خدا کی قسم میں ان سے زیادہ خدا کو جاننا بھی ہوں اور اللہ کا خوف بھی ان سے زیادہ رکھتا ہوں۔

ابن ابی حاتم نے زید بن اسلم کی روایت سے بیان کیا کہ حضرت عبداللہ بن رواحہ نے ایک مہمان کی ضیافت پر اپنے گھر والوں کو مامور کیا اور (کھانے کے وقت) خود رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر رہے۔ جب (رات کو) گھر پہنچے تو دیکھا کہ ان کے انتظار میں اہل خانہ نے مہمان کو کھانا نہیں کھلایا تھا۔ بیوی سے بولے تم نے میری وجہ سے میرے مہمان کو بھی کھانے سے روکے رکھا۔ اب یہ کھانا مجھ پر حرام ہے بیوی نے کہا تو مجھ پر بھی حرام ہے۔ مہمان نے کہا تو میرے لئے بھی حرام ہے۔ حضرت عبداللہ نے جب یہ معاملہ دیکھا تو (قسم توڑ کر) کھانے میں ہاتھ ڈال دیا اور کہا کھاؤ بسم اللہ۔ پھر حضور ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو کر یہ واقعہ عرض کر دیا۔ اس پر آیت يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تُحَرِّمُوا طَيِّبَاتِ مَا أَحَلَّ اللَّهُ لَكُمْ وَلَا تَعْتَدُوا إِنَّ اللَّهَ لَا يُحِبُّ الْمُعْتَدِينَ نازل ہوئی۔

وَكُلُوا مِمَّا رَزَقَكُمُ اللَّهُ حَلَالًا طَيِّبًا (اور اللہ نے جو چیزیں تم کو دی ہیں ان میں سے حلال دل پسند چیزیں کھاؤ)۔

عبداللہ بن مبارک نے کہا حلال وہ رزق ہے جو شرعی طریقوں سے حاصل کیا گیا ہو اور طیب وہ رزق ہے جو غذا بخش اور نمو آفریں ہو۔ باقی غیر حیاتی جامد چیزیں جیسے کیچڑ، مٹی وغیرہ اور وہ چیزیں جو غذا بخش نہیں ہیں صرف دوا کے لئے تو ان کو کھانا جائز ہے اور بغیر دوا کے مکروہ ہے۔ حَلَالًا، كُلُوا کا مفعول ہے اور مِمَّا رَزَقَكُمْ حال ہے جس کو حَلَالًا کے نکرہ ہونے کی وجہ سے مقدم کر دیا گیا ہے اور مِمَّا میں مِنْ تبعیضیہ ہے۔ مما میں اس امر کی صراحت ہے کہ کچھ رزق حلال ہوتا ہے اور کچھ حلال نہیں ہوتا۔ اہل حق کا یہی قول ہے۔

یہ بھی ہو سکتا ہے کہ مِنْ ابتدائیہ ہو اور یہ بھی ممکن ہے کہ مِمَّا مفعول ہو اور حَلَالًا حال ہو اور موصول کی طرف لوٹنے والی ضمیر محذوف ہو یا حلالاً کا موصوف محذوف ہو۔ بہرحال ترکیب عبارت کچھ بھی قرار دی جائے اگر حرام کو رزق نہ کہا جائے (اور معتزلہ کے قول کو اختیار کیا جائے کہ حرام رزق نہیں ہوتا) تو پھر خصوصاً لفظ حَلَالًا کو ذکر کرنے کی کوئی وجہ نہیں ہو سکتی۔

وَاتَّقُوا اللَّهَ (اور اللہ سے ڈرو) یہ امر سابق کی تاکید ہے۔

الَّذِي أَنْتُمْ بِهِ مُؤْمِنُونَ (جس پر تم ایمان رکھتے ہو) اس فقرہ میں مزید تاکید ہے کیونکہ تم اہل ایمان ہو تو ایمان میں تقویٰ کو لازم رکھنا تقاضائے ایمان ہے۔

بغوی نے حضرت عائشہؓ کی روایت سے لکھا ہے کہ شیرینی اور شہد رسول اللہ ﷺ کو مرغوب خاطر تھا۔ رواہ البخاری۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ رسول اللہ ﷺ کو سب سے زیادہ مرغوب روٹی کا ثرید اور حیس کا ثرید تھا (ابو داؤد)۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کھانا کھا کر شکر ادا کرنے والا صابر روزہ دار کی طرح ہے۔ رواہ الترمذی۔ ابن ماجہ اور دارمی نے یہ حدیث سنان بن سنہ کی روایت سے بیان کی ہے۔ بغوی نے حضرت ابن عباسؓ کی روایت سے لکھا ہے کہ جب آیت لَا تُحَرِّمُوا طَيِّبَاتِ مَا أَحَلَّ اللَّهُ لَكُمْ نازل ہوئی تو صحابہؓ نے عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ ہم ان قسموں کا کیا کریں جو حلال چیزوں کے سلسلے میں ہم کھا چکے ہیں۔ صحابہؓ نے مذکورہ بالا (تمام) امور کو ترک کرنے کے متعلق آپس میں قسم معاہدہ کر لیا تھا۔ اس پر آیت ذیل نازل ہوئی۔

لَا يُؤَاخِذُكُمُ اللَّهُ بِاللَّغْوِ فِي أَيْمَانِكُمْ وَلَٰكِن يُؤَاخِذُكُم بِمَا عَقَّدتُّمُ الْأَيْمَانَ (بقیہ)

تم سے مواخذہ نہیں کرتا تمہاری قسموں میں لغو قسم پر لیکن مواخذہ اس قسم پر کرتا ہے جو تم نے مستحکم کی ہو۔

اس آیت کی تفسیر اور قسموں کے اصناف و احکام کی تفصیل سورۂ بقرہ میں گزر چکی ہے۔ مواخذہ سے مراد ہے آخرت کی گرفت اور بِمَا عَقَّدتُّمُ الْأَيْمَانَ سے وہ قسمیں مراد ہیں جن کو مستحکم کرنے کا عزم کر لیا گیا ہو خواہ کسی فعل کو کرنے کی قسم ہو یا نہ کرنے کی اور دونوں صورتوں میں اللہ تعالیٰ کا نام لے کر استحکام کیا گیا ہو۔ بہر حال قسم کی تکمیل کسی کام کو کرنے یا نہ کرنے سے ہوتا ہے۔ اسی طرح کی قسم کو پورا کرنا واجب ہے اللہ نے فرمایا ہے يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا أَوْفُوا بِالْعُقُودِ۔ ؎۱

وَلَٰكِن يُؤَاخِذُكُم بِمَا عَقَّدتُّمُ الْأَيْمَانَ کا مطلب یہ ہے کہ پختہ قسموں کو اگر توڑو گے تو اللہ تعالیٰ تمہاری گرفت کرے گا یا یوں کہو کہ پختہ قسموں کو توڑنے پر تم سے مواخذہ کرے گا (اول صورت میں شرط محذوف ہوگی اور دوسری صورت میں ما عقدتم سے پہلے مضاف محذوف ہوگا)۔

مسئلہ :۔ چاروں ائمہ اور جمہور علماء کے نزدیک انعقاد قسم کے لئے حرف قسم ضرور ہونا چاہئے خواہ تلفظ کیا گیا ہو یا محذوف ہو۔ پھر حرف قسم کا اللہ کے کسی نام کے ساتھ یا کسی ایسے لفظ کے ساتھ آنا بھی ضروری ہے جو اللہ کی ذات پر دلالت کر رہا ہے جیسے قسم ہے اس کی جس کے ہاتھ میں میری جان ہے، قسم ہے اس کی جس کے سوا کوئی معبود نہیں، قسم ہے دلوں کو پھیر دینے والے کی، قسم ہے آسمان اور زمین کے رب کی وغیرہ۔

بعض علماء احناف کا قول ہے کہ اگر ایسے ذاتی نام لے کر قسم کھائی جائے جو اللہ کے لئے مخصوص ہیں تو قسم ہو جاتی ہے اور اگر ایسے صفتی ناموں کا ذکر کیا ہو جن کا استعمال دوسروں کے لئے بھی ہوتا ہے جیسے حلیم، علیم، قادر، وکیل، رحیم وغیرہ تو انعقاد قسم نیت یا عرف یا قرینہ حال پر موقوف ہے (بغیر نیت کے یا بغیر دلالت حال کے یا بغیر عرف کے قسم کا انعقاد نہ ہوگا) امام ابو حنیفہؒ نے فرمایا اللہ کی جن صفات کی عرفاً قسم کھائی جاتی ہے ان کی قسم کھانے سے انعقاد قسم ہو جاتا ہے جیسے اللہ کی عزت و جلال اور عظمت و بزرگی کی قسم لیکن جن صفات کی عرفاً قسم نہیں کھائی جاتی ان کو ذکر کرنے سے قسم نہیں ہوتی جیسے اللہ کے علم اور ارادہ اور مشیت کی قسم۔

مشائخ عراق نے صراحت کی ہے کہ صفات ذات کی قسم کھانے سے قسم کا انعقاد ہو جاتا ہے اور صفات فعل کی قسم کھانے سے انعقاد نہیں ہوتا۔ ان مشائخ کے نزدیک صفات ذات سے مراد وہ صفات ہیں جن کی ضد اللہ میں موجود نہیں ہے جیسے قدرت، جلال، بزرگی، عظمت (کہ ان کی ضد یعنی عجز، ذلت، حقارت وغیرہ سے اللہ پاک ہے) اور صفات فعل سے مراد وہ اوصاف ہیں کہ ان کی ضد بھی اللہ میں موجود ہے جیسے رحمت اور غضب، خوشنودی اور ناراضی، رزق کی تنگی اور فراخی وغیرہ۔

مسئلہ :۔ قرآن کی قسم تینوں اماموں کے نزدیک ہو جاتی ہے لیکن امام اعظمؒ کے نزدیک عرف نہ ہونے کی وجہ سے نہیں ہوتی (شاید امام صاحب کے زمانہ میں قرآن کی قسم عرفاً نہیں کھائی جاتی ہو) ابن ہمام نے کہا ہے اب قرآن کی قسم کھائی جاتی ہے لہٰذا امام صاحبؒ کے نزدیک قرآن کی قسم قسم قرار دی جائے گی۔ مصحف کی قسم کا حکم بھی قرآن کی قسم کی طرح ہے کیونکہ مصحف سے مراد بھی قرآن ہی ہے کاغذ مراد نہیں ہے۔ ابن عبدالبر نے مسئلہ قسم میں صحابہ اور تابعین کے اقوال نقل کرکے صراحت کی ہے کہ سب کے نزدیک قرآن کی قسم کا کفارہ واجب ہے اس کے خلاف کسی کا قول قابل اعتبار نہیں۔

قرآن کی جھوٹی قسم کھانے کا کفارہ کتنا ہونا چاہئے اس میں علماء کے اقوال مختلف ہیں۔ امام مالک اور امام شافعیؒ کے نزدیک ایک کفارہ ہوگا۔ امام احمد کے دو قول منقول ہیں۔ ایک قول میں صرف ایک کفارہ ہونا منقول ہے اور دوسرے قول میں آیا ہے کہ ہر آیت کا ایک کفارہ ہوگا۔ اگر اللہ کے حق کی قسم کھائی تو امام صاحبؒ کے نزدیک قسم نہیں ہوگی ہاں تینوں اماموں کے نزدیک

؎۱ ابو الشیخ اور عبد بن حمید نے سعید بن جبیر کا قول نقل کیا ہے کہ اگر قسم میں حلال کو حرام کر لیا گیا تو یہ قسم لغو ہے اس کو توڑ کر کفارہ دینا لازم ہے اللہ اس پر مواخذہ نہیں کرے گا۔ مواخذہ صرف ان قسموں پر ہوگا جن کا تعلق قصد و ارادہ سے ہوگا۔ (مؤلف)

ہو جائے گی۔

اگر لعمر اللہ و ایم اللہ کہا تو امام صاحبؒ کے نزدیک قسم ہو جائے گی قسم کی نیت کی ہو یا نہ کی ہو۔ امام احمدؒ کا بھی ایک قول یہی ہے۔ بعض شوافع کا قول ہے کہ بغیر نیت کے ان الفاظ سے قسم نہیں ہو گی۔ امام احمدؒ کا قول بھی دوسری روایت میں یہی آیا ہے۔

مسئلہ:- اگر کعبہ یا نبی کی قسم کھائی تو امام احمدؒ کے علاوہ تینوں اماموں کے نزدیک قسم نہیں ہو گی نہ کفارہ واجب ہو گا۔ امام احمدؒ کا قوی روایت میں قول اس کے خلاف آیا ہے امام احمد فرماتے ہیں کہ نبی کی قسم کھائی تو قسم ہو جائے گی۔

ہمارے قول کا ثبوت اس فرمان نبوی سے ہوتا ہے کہ قسم کھانی ہو تو اللہ کی قسم کھائے ورنہ خاموش رہے (صحیحین)
ابوداؤد نے حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کی روایت سے نقل کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جس نے اللہ کے سوا کسی اور کی قسم کھائی اس نے شرک کیا۔ حضرت ابن مسعود کا قول موقوفاً منقول ہے اللہ کی جھوٹی قسم کھانا میرے نزدیک کسی اور کی سچی قسم کھانے سے بہتر ہے۔

صاحب ہدایہؒ نے لکھا ہے یہ حکم اس صورت میں ہو گا جب نبی کی قسم کھائی ہو لیکن اگر اس طرح کہا ہو کہ اگر میں نے یہ کام کیا ہو تو میں نبی سے یا کعبہ سے بیزار ہوں یا کافر ہوں یا یہودی یا عیسائی ہوں تو لا محالہ اس کو قسم مانا جائے گا کیونکہ جب وقوع شرط کو کفر کی نشانی اس نے خود قرار دے دی تو لا محالہ وقوع شرط سے باز رہنا واجب ہے لہٰذا اس کو قسم قرار دیا جائے گا جیسے بعض دوسری صورتوں میں (حرف قسم یا شرط ذکر نہ کرنے کی صورت میں) بھی قسم قرار دیا جاتا ہے مثلاً کسی حلال چیز کو کسی نے اپنے لئے حرام بنا لیا تو یہ قسم ہو جائے گی۔ البتہ امام شافعیؒ کے نزدیک تحریم حلال قسم نہیں ہے۔ ہماری دلیل یہ ہے کہ رسول اللہ (ﷺ) نے حضرت ماریہ (رسول اللہ ﷺ کی ایک مملوکہ) کو اور شہد پینے کو اپنے لئے حرام کر لیا تھا تو اس پر اللہ تعالیٰ نے فرمایا يٰاَيُّهَا النَّبِيُّ لِمَ تُحَرِّمُ مَا اَحَلَّ اللّٰهُ لَكَ قَدْ فَرَضَ اللّٰهُ لَكُمْ تَحِلَّةَ اَيْمَانِكُمْ (کذا فی الصحیحین) اس کی تفصیل سورۂ تحریم میں ان شاء اللہ آئے گی۔

مسئلہ:- اگر میں نے ایسا کیا ہو تو یہودی ہوں یا اسلام سے خارج ہوں یہ الفاظ یمین غموس کے ہیں (یعنی گزشتہ واقعہ کے متعلق دانستہ بالارادہ جھوٹی قسم ہے) اگر اس نے ماضی میں وہ فعل کر بھی لیا ہو گا تو امام صاحب کے نزدیک اس قسم سے کافر نہیں ہو جائے گا کیونکہ مستقبل کے متعلق اگر یہی الفاظ استعمال کرے (اور یوں کہے اگر میں ایسا کروں تو اسلام سے خارج ہو جاؤں اور پھر وہ کام کر لے) تو کافر نہیں ہو جاتا ہے پس ماضی کو مستقبل پر قیاس کیا جائے گا۔

بعض لوگ کافر ہو جانے کے قائل ہیں کیونکہ اس نے دانستہ کفر کو اپنے اوپر لازم کیا ہے۔ صاحب ہدایہؒ نے لکھا ہے صحیح یہ ہے کہ ایسا کہنے والا اگر اس قول کو صرف قسم جانتا ہے تو کافر نہ ہو گا اور اگر سمجھتا ہے کہ اس حلف سے وہ کافر ہو جائے گا تو چونکہ حلف کھا کر اس نے خود کفر کو پسند کیا ہے اس لئے کافر ہو جائے گا۔ حضرت بریدہ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اگر کسی نے کہا کہ میں اسلام سے الگ ہوں پس اگر وہ جھوٹا ہے (واقع میں مومن ہوتے ہوئے اس نے اپنے کو خارج از اسلام کہا) تو اپنے قول کے مطابق ہو جائے گا۔ اور سچا ہے تو اسلام کی طرف خالص طور پر نہیں لوٹے گا (رواہ ابوداؤد والنسائی وابن ماجہ)۔

مسئلہ:- اگر اللہ تعالیٰ کے نام یا اس کی کسی صفت کے ذکر کے ساتھ بصیغہ ماضی قسم کھائی مثلاً اَقْسَمْتُ بِاللّٰهِ یا حَلَفْتُ بِاللّٰهِ یا شَهِدْتُ بِاللّٰهِ یا عَزَمْتُ بِاللّٰهِ کہا تو باتفاق علماء یہ قسم ہو گی اور اگر بصیغہ مضارع قسم کھائی مثلاً اُقْسِمُ بِاللّٰهِ یا اَحْلِفُ بِاللّٰهِ یا اَشْهَدُ بِاللّٰهِ یا اَعْزِمُ بِاللّٰهِ کہا تو امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک مضارع کا معنی حال کا لیا جائے گا اور) یہ قسم ہو جائے گی کیونکہ مضارع کا حال میں استعمال ہی حقیقی ہے استقبال کا معنی مراد لینا مجازی ہے جس کے لئے کوئی قرینہ ہونا ضروری ہے خواہ سین ہو یا سوف یا اور کچھ۔ امام شافعیؒ کے نزدیک بغیر نیت کے قسم نہ ہو گی کیونکہ (صیغہ مضارع کا استقبالی معنی میں استعمال حقیقی ہے اور) احتمال ہے کہ صیغہ مضارع بول کر اس نے آئندہ قسم کھانے کا وعدہ کیا ہو (اس صورت میں اُقْسِمُ

اور اُشْھِدُ کا ترجمہ ہوگا میں قسم کھاؤں گا، میں شہادت دوں گا کہ ایسا کروں گا)۔
مسئلہ:- اگر اللہ کا نام اور صفت ذکر نہیں کی بلکہ صرف اَقْسَمْتُ یا اُقْسِمُ یا حَلَفْتُ یا اَحْلِفُ کہا (یعنی میں نے قسم کھائی ہے یا قسم کھاتا ہوں) تو امام اعظم کے نزدیک یہ قسم ہوگی قسم کی نیت کی ہو یا نہ کی ہو اور اگر اس لفظ کو بول کر اس نے قسم کی نیت نہیں کی ہو تو قاضی اس کے قول کو تسلیم نہیں کرے گا (یعنی یہ نہیں مانے گا کہ لفظ قسم واقعہ سے میری مراد قسم نہ تھی) ہاں اللہ کے ہاں وہ ماخوذ نہ ہوگا یعنی عدالت میں اس کو سچا نہیں قرار دیا جائے گا۔ عدالت میں اس کی زبان سے نکلے ہوئے لفظ کو قسم ہی قرار دیا جائے گا البتہ دیانۃً وہ سچا ہوگا اور دیانت کا تعلق صرف اللہ سے ہے جو عالم ہے (جو دلوں کے احوال کو جاننے والا ہے) امام زفر کے اور ایک قول میں امام مالک اور امام احمد کے نزدیک بھی اگر صرف لفظ قسم بول کر اس نے اللہ کی قسم مراد لی ہو گی تو قسم ہو جائے گی اور اللہ کی قسم کی نیت نہ کی ہو گی تو اس لئے قسم نہ ہوگی کیونکہ لفظ میں غیر شرعی قسم کا احتمال ہے (اور غیر شرعی قسم قسم نہیں ہوتی) امام شافعیؒ کے نزدیک صرف لفظ قسم کہنے سے قسم ہی نہیں ہوتی خواہ قسم کی نیت کی ہو یا نہ کی ہو۔
ہم کہتے ہیں اللہ کی قسم ہی مسلمانوں کو دستور اور مشروع ہے اللہ کے سوا دوسرے کی قسم کھانا ممنوع ہے اس لئے نیت غیر مشروع نہ ہونے کی صورت میں مشروع ہی کی طرف کلام کو موڑ دیا جائے گا اس کا ثبوت حدیث میں آیا ہے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا بیان ہے کہ ایک شخص نے خواب دیکھا اور رسول اللہ ﷺ سے بیان کیا، حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ مجھے اجازت دیجئے میں اس کی تعبیر دوں گا۔ رسول اللہ ﷺ نے اجازت دے دی اور حضرت ابوبکر نے تعبیر دی اور عرض کیا یا رسول اللہ کیا میں نے صحیح تعبیر دی فرمایا (کچھ) صحیح دی اور (کچھ) غلط دی۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے عرض کیا یا رسول اللہ میں قسم کھاتا ہوں کہ حضور ﷺ (میری غلطی) مجھے بتا دیں گے۔ حضور ﷺ نے فرمایا اس طرح قسم نہ کھاؤ۔ امام احمد کی روایت میں اس حدیث کے الفاظ اسی طرح آئے ہیں لیکن صحیحین میں یہ الفاظ ہیں (حضرت ابوبکرؓ نے کہا) خدا کی قسم آپ ضرور مجھے بتائیں گے کہ میں نے کیا غلطی کی ہے حضور ﷺ نے فرمایا قسم نہ کھاؤ۔ واللہ اعلم۔

فَكَفَّارَتُهٗٓ (تو اس کا اتار)۔ یعنی قسم توڑنے کا کفارہ یا توڑنے کی صورت میں یمین منعقدہ کا کفارہ۔
کفارہ یعنی ایسا فعل جو قسم کے گناہ کو ساقط کر دے اور اتار دے، اور چھپا دے (کفر کا لغوی معنی ہے چھپانا)۔

اِطْعَامُ عَشَرَةِ مَسٰكِيْنَ دس مسکینوں کو کھانا کھلانا ہے)۔ اطعام کھانے پر قادر بنا دینا خواہ اس طرح ہو کہ کسی کو کھانے کا مالک بنا دے یا اس طرح ہو کہ اس کو کھانے کی اجازت دیدے اسی لئے امام ابوحنیفہؒ نے فرمایا اگر صبح شام دو وقت پیٹ بھر کر کھلا دیا اور مالک نہیں بنایا (یعنی کھانا اس طرح نہ دیا کہ چاہے وہ گھر کو لے جائے اور چاہے تو وہیں کھائے) تو جائز ہے خواہ انہوں نے تھوڑا کھایا ہو یا بہت (یعنی مقدار طعام دینا شرط نہیں ہے پیٹ بھر کر کھلا دینا کافی ہے) امام زہری نے حسن بن زیاد کی روایت سے اسی طرح نقل کیا ہے۔ امام شافعیؒ کے نزدیک کھانے کا مالک بنا دینا ضروری ہے (کہ چاہے وہ سب لے جائے، چاہے باقی کھانے کچھ لے جائے، چاہے سب کھا لے) کیونکہ زکوٰۃ اور صدقۂ فطر میں بھی تملیک ہی شرط ہے (اور دونوں کی مقدار مقرر ہے جو مسکین کو دی جاتی ہے خواہ وہ کچھ بھی کرے لہٰذا کفارہ کی مقدار کا بھی مسکین کو مالک بنا دینا ضروری ہے وہ جیسا چاہے تصرف کرے) اس کے علاوہ مالک بنا دینے یعنی مسکین کو دیدینے سے اس کی ضرورتیں بھی زیادہ پوری ہو جاتی ہیں صرف کھانے کی اجازت دینے سے ضرورتوں کی تکمیل ممکن نہیں۔
ہم کہتے ہیں زکوٰۃ کے لئے تو لفظ اٰتُوا آیا ہے اور صدقہ فطر کے لئے بھی لفظ ادا استعمال کیا گیا ہے اور ایتاء ہو یا اداء دونوں کا حقیقی معنی مالک بنا دینا (ہر قسم کے تصرف کا کامل حق دے دینا) ہی ہے مگر اطعام کا حقیقی معنی کھانا دینا نہیں ہے بلکہ کھانے پر قادر بنا دینا ہے (یعنی کھانا کھلانا اطعام کا حقیقی مفہوم ہے)۔

ایک شبہ

اگر اطعام کا حقیقی مفہوم کھانے پر قادر بنا دینا (یعنی کھانا کھانے سے نہ روکنا) ہی ہے تو مالک بنا دینا (یعنی اس طرح دے دینا کہ وہ خود بھی کھائے بلکہ لے جائے اور اس کھانے کا جس طرح چاہے استعمال کرے) جائز نہ ہونا چاہئے کیونکہ (تملیک کا مفہوم مجازی ہوگا) اس صورت میں حقیقت و مجاز دونوں کا بیک وقت مراد ہونا لازم آئے گا۔

ازالہ :۔ ہم کہتے ہیں تملیک کے اندر بھی کھانے کی اجازت اور اطعام قدرت ہوتی ہے یوں کہا جائے کہ تملیک کا جواز دلالت النص کے سبب سے ہے اور اباحت کا مفہوم حقیقی ہے اور دلالت النص حقیقت پر عمل کرنے سے مانع نہیں ہوتی جیسے (ماں باپ کو) اُف کرنے کی ممانعت (حقیقی ہے اور مارنے، گالی دینے کی ممانعت بدلالت نص ہے اور مارنے، گالی دینے کی ممانعت اف کرنے کی ممانعت سے مانع نہیں، کیونکہ دونوں نص کی اصل غرض تو کھانے کی ضرورت کو پورا کرنا اور تملیک سے ہر ضرورت پوری ہو جاتی ہے لہٰذا کھانے کی ضرورت کا اس میں شمول بدرجہ اولیٰ ہے۔ عبد بن حمید، ابن المنذر، ابن جریر اور ابن ابی حاتم نے بیان کیا ہے کہ آیت فَكَفَّارَتُهُ إِطْعَامُ عَشَرَةِ مَسَاكِينَ کی تشریح میں حضرت علی رضی اللہ عنہ بن ابی طالب نے فرمایا مسکینوں کو صبح شام کا کھانا کھلا دے، روٹی گوشت ہو یا روٹی اور روغن زیتون یا روٹی اور گھی یا روٹی اور کھجوریں۔

مسئلہ :۔ کھانے والے مسکینوں میں اس بچہ کی گنتی نہ ہوگی جس کا دودھ حال میں چھڑایا گیا ہو کیونکہ وہ پورے طور پر (کھانا) نہیں کھا سکتا۔

مسئلہ :۔ اگر گیہوں کی روٹی نہ ہو تو سالن ہونا بھی ضروری ہے تاکہ پیٹ بھر کر پورے طور پر کھائی جا سکے۔ گیہوں کی روٹی میں یہ شرط نہیں ہے بشرطیکہ کھانا کھانے والا بغیر سالن کے گیہوں کی روٹی معمولاً کھاتا ہے۔

مسئلہ :۔ امام صاحبؒ کے نزدیک ایک ہی مسکین کو دس دن تک کھلا دینا جائز ہے لیکن ایک دن میں ایک ہی شخص کو دس مرتبہ کھانا دینا جائز نہیں ہے۔ بعض علماء نے کہا ہے اس سے مراد یہ ہے کہ دن میں دس مرتبہ کھلانا کافی نہیں ہے، لیکن ایک دن میں دس مرتبہ کھانا دینا (یعنی دس مرتبہ میں دس آدمیوں کی خوراک کا ایک شخص کو ایک ہی دن میں مالک بنا دینا) جائز ہے کیونکہ تملیک کی ضرورت ایک دن میں نو بنو ہو سکتی ہے مگر کھانے کی ضرورت ایک دن میں دس بار نہیں ہوتی۔ اگر یکدم دس مسکینوں کا کھانا ایک مسکین کو دے دیا تو جائز نہیں یہ تمام اقوال امام صاحبؒ کے ہیں۔

امام مالکؒ اور امام شافعیؒ کا قول ہے کہ دس مساکین کا کھانا ایک مسکین کو کھلانا جائز ہے نہ دینا (نہ یکدم نہ دس مرتبہ میں اور نہ دس دن میں) کیونکہ آیت میں عَشَرَةِ مَسَاكِينَ (دس مسکینوں) کی نص ہے اور ایک مسکین اگر بار بار حاجتمند ہوتا رہے تو دس مسکین نہیں ہو سکتا (رہے گا ایک ہی مسکین) امام اعظمؒ نے فرمایا کہ اصل مقصد ہے حاجت کو پورا کرنا اور کھانے کی حاجت ہر روز نئی ہوتی ہے لہٰذا دوسرے روز بھی پہلے مسکین کو ہی دے دینا ایسا ہی ہے جیسے کسی دوسرے مسکین کو دینا (گویا حاجت کے تجدد سے امام صاحبؒ کے نزدیک مساکین کا تعدد حکماً ہو جاتا ہے) اور ایک دن میں دس مرتبہ کھانے کی ضرورت نہیں ہوتی (اس لئے مساکین کا تعدد نہ حقیقی ہوتا ہے نہ حکمی) اسی وجہ سے یہ صورت ناجائز ہے۔ امام شافعیؒ نے فرمایا اگر ضرورت طعام پوری کرنے کو اصل علت قرار دیا جائے گا اور عدد کو دبا دیا جائے گا تو نص کا تقاضا پورا نہ ہوگا (لفظ عَشَرَةِ مَسَاكِينَ بے معنی اور بے مقصد قرار پائے گا)۔

مسئلہ :۔ اگر دس مسکینوں کو کھانا دیا جائے تو ہر مسکین کے لئے اہل عراق کے نزدیک دو مد (تقریباً دو سیر) یعنی آدھا صاع ہونا چاہئے۔ بغوی نے لکھا ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کا قول بھی روایت میں یہی آیا ہے۔ امام ابوحنیفہؒ نے فرمایا گندم کا نصف صاع اور جو یا چھوارے کا پورا صاع ہونا چاہئے۔ شعبی، نخعی، سعید بن جبیر، مجاہد اور حکم کا بھی یہی قول ہے۔ امام مالکؒ کے نزدیک مد سے مراد ہے بغدادی دو رطل۔ امام محمدؒ نے فرمایا جو یا (گیہوں کا) آٹا ایک مد ہو یا چھوارے ۲ مد اور روٹی یعنی گیہوں کی روٹی دو رطل ہونی چاہئے۔ امام شافعیؒ نے فرمایا مد سے مراد ہے رسول اللہ ﷺ کا مد جو ۱/۳ رطل کے برابر تھا اور جنس وہ ہونا چاہئے جس کو شہر میں اکثر لوگ کھاتے ہیں روٹی اور آٹا دینا صحیح نہیں ہے، ثابت غلہ دینا

چاہئے۔ بغوی نے لکھا ہے زید بن ثابت، ابن عباس، ابن عمر، سعید بن المسیبؒ، قاسم، سلیمان بن یسار، عطاء اور حسن کا بھی یہی قول ہے۔

تمام کفارات میں احمد اور صحابہ رضی اللہ عنہم و تابعین کا اختلاف قسم کے کفارہ کی طرح ہے۔ امام صاحبؒ کے نزدیک درہم و دینار کی شکل میں قیمت جنس لگانے کے بعد کفارہ ادا کرنا صحیح ہے دوسرے علماء کے نزدیک درست نہیں۔

کرخی نے حضرت عمر کا قول بیان کیا ہے کہ چھواروں اور جو کا ایک صاع اور گیہوں کا آدھا صاع ہونا چاہئے۔ کرخی نے اپنی اسناد سے یہ بھی بیان کیا کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا قسم کا کفارہ گیہوں کا نصف صاع ہے یہ بھی کرخی نے بیان کیا کہ مجاہد نے فرمایا قرآن میں جو کفارہ ہے اس کی مقدار فی مسکین نصف صاع گندم ہے۔
ابن جوزی نے التحقیق میں لکھا ہے کہ سلیمان بن یسار نے کہا میں نے لوگوں کو طعام مساکین میں ایک ایک مد دیتے ہوئے پایا۔ دوسری روایت میں اتنا زائد آیا ہے کہ یہ مقدار کافی ہوتی تھی (یعنی کفارہ ادا کرنے کے لئے کافی سمجھی جاتی تھی)۔
کفارہ کے سلسلے میں حضرت ابو سلمہ رضی اللہ عنہ کی روایت آئی ہے کہ سلیمان بن صخر نے (جن کو سلمہ بن صخر کہا جاتا تھا) اپنی بیوی سے رمضان کے لئے ظہار کرلیا یعنی بیوی سے کہہ دیا کہ تو میرے لئے رمضان میں ایسی ہے جیسی میری ماں کی پیٹھ۔ لیکن آدھا رمضان گزرنے پر ایک رات کو قربت کر بیٹھے اور رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو کر گزارش واقعہ کردی۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ایک بردہ آزاد کردو۔ سلمہ نے عرض کیا بردہ تو مجھے میسر نہیں۔ فرمایا دو مہینے کے پیہم روزے رکھو۔ عرض کیا اس کی بھی مجھ میں طاقت نہیں۔ فرمایا ساٹھ مسکینوں کو کھانا دو۔ عرض کیا یہ بھی مجھے توفیق نہیں۔ اس وقت حضور ﷺ نے عروہ بن عمرو سے فرمایا اس کو ایک فرق دے دو۔ فرق ایک پیمانہ ہوتا تھا جس کے اندر پندرہ سولہ صاع (غلہ) آتا تھا کہ ساٹھ مسکینوں کو یہ کھلا دے۔ رواہ الترمذی۔
ابوداؤد، ابن ماجہ اور دارمی نے بھی بروایت مذکورہ کی روایت میں سلمہ بن صخر کا بیان حسب روایت ترمذی نقل کیا ہے جس میں یہ الفاظ بھی ہیں کہ حضرت سلمہ رضی اللہ عنہ نے کہا میں عورتوں میں وہ چیز پاتا تھا جو دوسرے شخص نہیں پاتے۔ امام شافعی اور دوسرے فقہاء جو ہر مسکین کے لئے مذکورہ حدیث مقدار (یعنی ربع صاع) کافی قرار دیتے ہیں، حدیث سلمہ سے استدلال کرتے ہیں۔ لیکن امام ابو حنیفہ نے اس حدیث سے استدلال کیا ہے جو طبرانی نے حضرت اوس بن صامت کی روایت سے بیان کی ہے کہ حضور ﷺ نے فرمایا تم ساٹھ مسکینوں کو تیس صاع کھانا دیدو۔ اس نے عرض کیا میرے پاس تو یہ نہیں ہاں اگر آپ مدد کریں تو ایسا ہو سکتا ہے۔ چنانچہ حضور ﷺ نے اس کو پندرہ صاع کی مدد دی اور باقی دوسروں نے اعانت کردی کہ تیس صاع ہو گئے۔ الحدیث۔
میں کہتا ہوں غالباً (وہ پندرہ صاع) گیہوں ہوں گے۔ ابوداؤد نے بطریق ابن اسحاق بروایت معمر بن عبداللہ بن حنظلہ از یوسف بن عبداللہ بن سلام حدیث مذکور کی روایت ان الفاظ کے ساتھ کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تھا میں اس کی مدد ایک فرق چھواروں سے کردوں گا۔ حضرت اوس بن صامت نے عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ ایک فرق سے میں مدد کردوں گا۔ فرمایا احسنت۔ راوی نے کہا فرق ساٹھ صاع کا تھا اور مکتل تیس صاع کا۔ ابن ہمام نے لکھا ہے موخر الذکر قول زیادہ صحیح ہے کیونکہ اگر مکتل ساٹھ صاع کا ہوتا تو کفارہ کے لئے دوسرے فرق کی ضرورت ہی نہ تھی۔
ابوداؤد نے ابو سلمہ بن عبدالرحمن کی روایت سے بیان کیا ہے کہ فرق پندرہ صاع کا ایک زنبیل ہوتا تھا۔
ابوداؤد نے سلمہ بن صخر بیاضی کے قصہ میں بیان کیا ہے کہ حضور ﷺ نے فرمایا ساٹھ مسکینوں کو ایک وسق چھوارے دیدو۔ اس شخص (یعنی سلمہ بن صخر) نے عرض کیا، قسم ہے اس ذات کی جس نے آپ کو حق دے کر بھیجا ہے ہم دونوں رات کو بھوکے رہے ہمارے پاس کھانے کو کچھ نہ تھا۔ حضور ﷺ نے فرمایا تو بنی زریق کی زکوٰۃ وصول کرنے والے عامل کے پاس چلا جا وہ تجھے

دے دے گا ان میں سے ایک دن چھوڑ دے تو نصف مسکینوں کو دیدیا اور باقی تو نے تیرے بال بچے کھا گئے۔ (الحدیث) اخرجہ احمد و ابو داؤد۔

مسئلہ :- بچے کو کھانا کھلانا اور دے دینا دونوں جائز ہیں اور قبیل بچے کا دین کرے گا۔ کیا بچہ جس نے ابھی کھانا کھانا شروع نہ کیا ہو ایسا قابل ہے کہ اس کو کفارہ کا کھانا دیا جائے۔ امام اعظمؒ امام مالکؒ اور امام شافعیؒ کے نزدیک جائز ہے اور امام احمدؒ کے نزدیک جائز نہیں۔

مسئلہ :- امام اعظمؒ کے نزدیک ذمی کافر کو دینا جائز ہے کیونکہ نص (عشرۃ مساکین) مطلق ہے اور دوسری آیت میں نفی نے تو فرمایا ہے لَا يَنْهٰىكُمُ اللّٰهُ عَنِ الَّذِيْنَ لَمْ يُقَاتِلُوْكُمْ فِي الدِّيْنِ الخ (یعنی جو کافر تم سے دین کے معاملہ میں نہ لڑے ہوں ان سے دنیوی معاملات میں حسن سلوک کرنے سے اللہ تم کو نہیں روکتا الخ) جمہور کے نزدیک ناجائز ہے کیونکہ ذمی کو زکوٰۃ دینا ناجائز ہے ورنہ کہ لیتے کہ اس کا فرض نہیں ہے یہ مسئلہ اجماعی ہے۔ لہٰذا کفارہ کو بھی زکوٰۃ پر قیاس کیا جائے گا۔

مِنْ اَوْسَطِ مَا تُطْعِمُوْنَ اَهْلِيْكُمْ "اوسط درجہ کا جو اپنے گھر والوں کو کھانے کو دیا کرتے ہو۔" بغوی نے لکھا ہے مراد یہ ہے کہ اپنے بال بچوں کی بہترین خوراک میں سے۔

میں کہتا ہوں ظاہر یہ ہے کہ درمیانی درجہ کی غذا ہو جو اعلیٰ نہ ادنیٰ۔ پس جو دولت مند آدمی اپنے گھر والوں کو لذیذ کھانا کھلاتا ہو اس پر لازم ہے کہ مسکینوں کو بھی وہی کھانا دے جو خود اپنے گھر والوں کو کھلاتا ہو۔ آیت مذکورہ امام ابو حنیفہؒ کے قول کی تائید کر رہی ہے کہ فقیر کو کھانے کی اجازت دے دینا (یعنی بغیر مالک بنائے ہوئے صرف کھانے کی اجازت دے دینا) جائز ہے۔

عبد بن حمید و ابن جریر اور ابن ابی حاتم نے مِنْ اَوْسَطِ مَا تُطْعِمُوْنَ اَهْلِيْكُمْ کی تفسیر میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا قول نقل کیا ہے یعنی تنگدستی اور فراخدستی میں۔ دوسری روایت ان الفاظ کے ساتھ ہے نہ سب سے عمدہ نہ بالکل نکما۔ اھلین کی جمع یاء و نون کے ساتھ شاذ ہے کیونکہ لفظ اہل (زید کی طرح) علم نہیں ہے۔

اَوْ كِسْوَتُهُمْ (یعنی کا کپڑا) یا اس طرح ترجمہ کیا جائے "یا اوسط درجہ کا ان کا لباس" اول صورت میں اطعام پر عطف ہوگا اور دوسری صورت میں من اوسط کے محل پر۔

امام مالکؒ اور امام احمدؒ کے نزدیک کم سے کم اتنا کپڑا ہونا چاہئے جس کو پہن کر نماز صحیح ہو جائے۔ ایک قول امام محمدؒ کا بھی یہی آیا ہے۔ اس صورت میں مرد کے لئے صرف پائجامہ یا تہبند یا (ٹخنوں سے نیچا) کرتہ کافی ہوگا اور عورت کے لئے دو کپڑے ضروری ہیں (لمبا) کرتہ اور اوڑھنی۔ امام اعظمؒ اور امام ابو یوسفؒ کے نزدیک کم سے کم اتنا کپڑا ہونا چاہئے جس سے بدن کا بیشتر حصہ چھپایا جاسکے اس لئے صرف پائجامہ کافی نہیں اگرچہ صرف پائجامہ سے نماز ہو جاتی ہے کیونکہ صرف پائجامہ پہننے والے کو رواج میں برہنہ کہا جاتا ہے اور ضرورت سے لباس پوش بنا دے گی۔ اور عورت کے لئے ایک لمبا کرتہ بغیر اوڑھنی کے کافی ہے اگرچہ عورت کی نماز بغیر اوڑھنی کے صحیح نہیں کیونکہ عرف میں ایسی عورت کو برہنہ نہیں کہتے (بلکہ) لباس پوش کہتے ہیں۔ ابن مردویہ نے لکھا ہے کہ حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا ہم نے عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ اَوْ كِسْوَتُهُمْ سے کیا مراد ہے فرمایا عباء (لمبا ڈھیلا کرتہ) طبرانی اور ابن مردویہ نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی روایت سے رسول اللہ ﷺ کا فرمان نقل کیا ہے کہ ہر مسکین کے لئے ایک عباء (ہونا چاہئے)۔

(امام شافعیؒ کے نزدیک کِسْوَتُهُمْ سے مراد ہے کم سے کم وہ کپڑا جس پر لفظ کسوت کا اطلاق ہوتا ہے اس لئے صرف عمامہ یا صرف پائجامہ یا صرف معمولی کرتہ جائز ہے صرف ٹوپی کے متعلق شافعیہ کے دو قول آئے ہیں۔

اگر پانچ مسکینوں کو کھانا اور پانچ کو کپڑا دیا تو امام ابو حنیفہؒ اور امام احمدؒ کے نزدیک جائز ہے۔ امام مالکؒ اور امام شافعیؒ کے نزدیک ناکافی ہے۔

اَوْ تَحْرِيْرُ رَقَبَةٍ (یا ایک بردہ آزاد کرنا) رقبۃ گردن کو کہتے ہیں مراد ہے انسان (مرد ہو یا عورت) امام اعظمؒ

کے نزدیک قسم اور ظہار کے کفارہ میں کافر غلام یا باندی کو آزاد کرنا جائز ہے کیونکہ نص (یعنی رقبۃ کا لفظ) مطلق ہے۔ امام مالکؒ اور امام شافعیؒ کے نزدیک کافر کو آزاد کرنا کافی نہیں مؤمن ہونا ضروری ہے۔ کفارۂ قتل میں غلام یا باندی کا مؤمن ہونا ضروری ہے (کیونکہ وہاں مومن کی قید آیت میں موجود ہے) اسی پر قیاس کر کے اس جگہ بھی مطلق کو مقید پر محمول کیا جائے گا۔ ہم کہتے ہیں مطلق کو اطلاق پر اور مقید کو تقیید پر رکھا جائے گا کوئی وجہ نہیں کہ ایک کو دوسرے پر قیاس کیا جائے۔

مسئلہ:- لفظ اَوْ کا تقاضا ہے کہ کفارہ کی تینوں قسموں میں سے کوئی ایک قسم واجب ہے اور تعیین کا اختیار کفارہ دینے والے کو ہے۔ ابن مردویہ نے حضرت ابن عباسؓ کی روایت سے لکھا ہے کہ جب آیت کفارہ نازل ہوئی تو حضرت حذیفہؓ نے عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ کیا تعیین کا ہم کو اختیار ہے فرمایا تم با اختیار ہو چاہو کپڑا دو چاہو کھانا دو اور جس کو (اتنا) بھی نہ ملے تو تین روزے ہیں۔

فَمَنْ لَّمْ يَجِدْ (اب اگر کسی کو (تینوں چیزوں میں سے) کچھ میسر نہ آئے) یعنی اتنی چیز اس کو نہ ملے کہ قرض ادا کرنے اور اپنے گھر والوں کے کھانے پینے کے مصارف کے بعد مسکینوں کو کھانا یا کپڑا دے سکے یا بردہ آزاد کر سکے۔ بعض علماء کا قول ہے کہ اہل و عیال کی ضروری حاجات پوری کرنے کے بعد اگر اتنا مال باقی ہو کہ کفارہ کی تینوں قسموں میں سے کوئی قسم ادا کر سکے اور ادائے کفارہ کے بعد مزید کچھ باقی نہ رہے تو ایسے شخص کو عاجز نہیں قرار دیا جائے گا۔ حسن اور سعید بن جبیر کا یہی قول ہے۔ ابوالشیخ نے قتادہؒ کا قول نقل کیا ہے کہ جس شخص کے پاس پچاس درہم ہوں وہ صاحب توفیق ہے اس پر کفارہ کی ادائیگی لازم ہے۔ پچاس درہم سے کم رکھنے والا صاحب توفیق نہیں اس کو (قسم کے کفارہ کے) روزے رکھنے چاہئیں۔ ابوالشیخ نے ابراہیم نخعی کا قول نقل کیا ہے کہ بیس درہم رکھنے والا صاحب توفیق ہے مساکین کو (بطور کفارہ) کھانا دینا اس پر واجب ہے۔

مسئلہ:- غلام کے لئے سوائے روزے رکھنے کے قسم کا کوئی کفارہ نہیں کیونکہ اس کا مال اپنا مال نہیں اس لئے نہ کھانا دے سکتا ہے نہ لباس نہ بردہ آزاد کر سکتا ہے اگر آقا اپنے غلام کی قسم کے کفارہ میں کھانا دے یا لباس یا بردہ آزاد کرے تو کفارہ نہ ہوگا۔ مکاتب اور مستسعیٰ کا بھی یہی حکم ہے۔ [1]

مسئلہ:- اگر غلام نے کفارہ کے روزے رکھنے شروع کئے اور روزے پورے ہونے سے پہلے اس کو آزاد کر دیا گیا خواہ ختم صوم سے ایک ساعت پہلے ہی آزادی ملی ہو اور مال بھی (بقدر کفارہ) ہاتھ آ گیا ہو تو از سر نو کفارہ ادا کرنا ضروری ہے یہی حکم اس نادار آدمی کا ہے جو (ناداری کی وجہ سے) کفارہ کے روزے رکھ رہا ہو لیکن روزے پورے ہونے سے پہلے (بقدر کفارہ) مال اس کے ہاتھ آ جائے تو از سر نو کفارہ ادا کرے گا۔

مسئلہ:- ہمارے نزدیک ادائے کفارہ کا ارادہ کرنے کے وقت صاحب مال ہونا شرط ہے (قسم توڑنے کے وقت مالدار ہو یا نہ ہو) کیونکہ (روزہ) بجائے مال کے مشروع کیا گیا ہے جیسے تیمم وضو کے قائم مقام ہے۔ لہٰذا وقت ادا کا اعتبار ہے (وقت وجوب کا اعتبار نہیں)۔ امام شافعیؒ کے نزدیک قسم توڑنے کے وقت مالدار ہونا چاہئے۔

فَصِيَامُ ثَلٰثَةِ اَيَّامٍ (تو (اس کا کفارہ) تین دن کے روزے رکھنے ہیں۔)

مسئلہ:- امام مالکؒ کے نزدیک مسلسل روزے رکھنے ضروری نہیں (بیچ میں ناغہ کر کے بھی روزے رکھ سکتا ہے تین کی گنتی پوری کرے) کیونکہ نص (یعنی لفظ ثَلٰثَةِ اَيَّامٍ) میں کوئی قید نہیں البتہ بغیر ناغہ کے روزے رکھنا مستحب ہے۔
امام شافعیؒ کے دو قول آئے ہیں۔ جدید و راجح قول یہی ہے کہ مسلسل صیام مستحب ہے واجب نہیں ہے۔ امام ابو حنیفہؒ اور امام احمدؒ کے نزدیک تسلسل واجب ہے۔ امام شافعیؒ کا بھی قول قدیم یہی ہے۔ کیونکہ قتل اور ظہار کے کفارہ میں تسلسل کی قید نص

[1] اگر غلام کو اس شرط پر آزاد کرنے کا معاہدہ کر لیا کہ جس وقت تو اتنا روپیہ مجھے دے دے گا آزاد ہو جائے گا تو ایسے غلام کو مکاتب کہا جاتا ہے اگر ایک غلام دو آدمیوں کا مشترک ہو اور ایک اپنا حصہ آزاد کر دے تو غلام پورا آزاد ہو جائے گا اور غلام سے کہا جائے گا کہ آزاد کرنے والے آقا کے حصہ کی قیمت کچھ محنت مزدوری کر کے ادا کرے ایسے غلام کو مستسعیٰ کہا جاتا ہے۔

میں آگئی ہے اس لئے اس مطلق میں بھی اسی شرط کو ضروری قرار دیا جائے گا۔ امام شافعیؒ کے قول راجح کی دلیل یہ ہے کہ کفارۂ
یمین میں دو قاعدوں کو سامنے رکھنا ہوگا۔ ایک تو قتل اور ظہار کے کفارہ کے قاعدہ کو کہ وہاں تسلسل صیام منصوص ہے۔ دوسرا
صوم تمتع کو کہ وہاں روزوں میں تفریق ضروری ہے (امام شافعی صوم تمتع کو حج میں واجب قرار دیتے ہیں) اول صورت کا تقاضا ہے
کہ تسلسل ضروری قرار دیا جائے اور دوسری صورت کا تقاضا ہے کہ عدم تسلسل کو واجب کہا جائے۔ اس لئے ہم نے اس جگہ
مطلق کو مطلق ہی رہنے دیا اور تسلسل کو واجب کہا نہ تفریق کو۔

امام صاحبؒ کے قول کی دلیل یہ ہے کہ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ کی قرأت میں ثَلٰثَةِ اَيَّامٍ کے بعد متتابعات کا لفظ
آیا ہے اور یہ قرأت شہرت کے درجہ پر فائز ہے اور (قید) مشہور سے (متواتر) مطلق کو مقید کر دیا جاتا ہے کیونکہ اس قید کا وارد
ہونا حکم پر ہوگا سبب پر نہ ہوگا۔

مسئلہ:- امام اعظمؒ کے نزدیک کافر کی قسم کا انعقاد ہی نہیں ہوتا اسی لئے کفارہ بھی لازم نہیں۔ باقی تینوں اماموں کے
نزدیک کافر کی قسم منعقد ہو جاتی ہے اور قسم شکنی پر کفارہ لازم ہے۔ ہماری پہلی دلیل یہ ہے کہ کافر قسم کھانے کا اہل ہی نہیں
ہے۔ قسم کا انعقاد اللہ کے نام کی عظمت کی وجہ سے ہوتا ہے اور کافر کے نزدیک اللہ کے نام کی کوئی عظمت ہی نہیں ہے۔ اس دلیل پر
یہ اعتراض ہو سکتا ہے کہ اگر کوئی کافر کسی دعویٰ کا منکر ہو تو اس سے بالاجماع علماء قسم لی جائے گی (معلوم ہوا کہ کافر کی قسم قابل انعقاد
اور معتبر ہے)۔

دوسری دلیل یہ ہے کہ قسم کا کفارہ ایک طرح کی عبادت ہے اور کافر عبادت کا اہل نہیں ہے۔ میں کہتا ہوں اس دلیل کا
اقتضاء تو یہ ہے کہ اگر کسی کافر نے قسم کھائی ہو پھر مسلمان ہو گیا ہو اور مسلمان ہونے کے بعد قسم شکنی کی ہو تو اس پر کفارہ لازم
ہو جائے گا (کیونکہ اسلام کی حالت میں اس نے قسم شکنی کی ہے اور اس وقت وہ اہل کفارہ بھی ہے) واللہ اعلم۔

ذٰلِكَ كَفَّارَةُ اَيْمَانِكُمْ اِذَا حَلَفْتُمْ (جب تم نے قسم کھائی ہو (اور قسم کے خلاف کیا ہو) تو یہ
تمہاری قسموں کا کفارہ ہے) قسم شکنی کی شرط اس لئے لگائی گئی کہ بغیر شکست قسم کے بالاجماع علماء (محض قسم کھانے سے) کفارہ
واجب نہیں ہو جاتا۔

امام احمدؒ و شافعیؒ نے اس آیت سے استدلال کیا ہے کہ قسم شکنی سے پہلے کفارہ ادا کر دینا جائز ہے۔ ایک قول امام مالکؒ کا
بھی اسی طرح منقول ہے کیونکہ آیت میں کفارہ کی نسبت قسموں کی طرف کی گئی ہے، قسم شکنی کی طرف نہیں کی گئی۔ اور
اضافت اس بات کا ثبوت ہوتا ہے کہ مضاف الیہ مضاف کا سبب ہوتا ہے خواہ مضاف الیہ کا کوئی شرعی حکم ہو یا حکم شرعی
سے تعلق رکھنے والا کوئی امر ہو اور اس جگہ کفارہ (اگرچہ خود حکم شرعی نہیں مگر وجوب سے تعلق رکھنے والا ہے اور وجوب حکم
شرعی ہے اور جب یمین (قسم) کفارہ کا سبب قرار پائی تو قسم شکنی سے پہلے کفارہ کی ادائیگی درست ہونی چاہئے کیونکہ شکست قسم تو
شرط ہے (سبب نہیں ہے) اور سبب موجود ہونے کے بعد شرط پر تقدیم شرعاً جائز ہے۔ دیکھو اگر نصاب زکوٰۃ موجود ہو (جو سبب
وجوب زکوٰۃ ہے) اور مال پورا سال نہ ہوا ہو (جو شرط ہے) تو زکوٰۃ ادا کرنا جائز ہے یا اگر کسی نے کسی کو زخمی کر دیا اور مجروح ابھی مرا
نہیں تو مرنے سے پہلے ادائے خون بہا درست ہے۔

اس دلیل کی روشنی میں (قسم شکنی کا) کفارہ بصورت مالی ہو یا بصورت صوم دونوں کی تقدیم جائز ہے۔ امام مالکؒ اور امام احمدؒ
کا مسلک اور امام شافعیؒ کا قدیم قول یہی ہے۔ امام شافعیؒ کا جدید قول یہ ہے کہ مالی کفارہ کی تقدیم جائز ہے اور قسم توڑنے سے پہلے
کفارہ کے روزے رکھنا درست نہیں کیونکہ وجود سبب کے بعد وجوب سے ادا کی تقدیم صرف مالی عبادت میں شرعاً موجود ہے
(بدنی عبادت کے وجوب سے پہلے ادا کی جانے کی کوئی نظیر نہیں ملتی) دیکھو وجوب سے پہلے نماز روزہ کی ادائیگی جائز نہیں۔

امام اعظمؒ کے نزدیک قسم شکنی سے پہلے کسی قسم کے کفارہ کی ادائیگی جائز نہیں۔ امام صاحبؒ کے نزدیک کفارہ کا سبب

قسم شکنی نہیں، قسم ہے۔ اس لئے قسم شکنی سے پہلے ادائے کفارہ جائز نہیں کیونکہ کفارہ کا قانون گناہ کو دور کرنے اور قصور کی معافی کے لئے بنایا گیا ہے اور گناہ سے پہلے گناہ دور کرنے کے کوئی معنی نہیں۔ گناہ تو قسم شکنی سے پیدا ہوتا ہے۔ رہا قسم کا معاملہ تو وہ کفارہ کا سبب ہے نہ شکست قسم کا بلکہ قسم نیکی کرنے کے لئے ہوتی ہے کوئی امر سبب اسی چیز کا ہو سکتا ہے کہ (اگر علت موجبہ نہ ہو تو) کم سے کم اس چیز تک پہنچانے والا ہو اور قسم کی حالت ایسی نہیں ہے۔ جس چیز پر قسم کھائی جاتی ہے اس کے عدم سے قسم مانع ہوتی ہے پھر اس کے عدم تک مفضی کیسے ہو سکتی ہے۔ ہاں اتفاقاً کبھی قسم کے بعد قسم شکنی ہو جاتی ہے (اگرچہ قسم شکنی سے قسم مانع ہے لیکن شکست کی نہ قسم موجب ہے نہ علت مفضیہ)۔

پھر (یہ بھی ضروری نہیں کہ اضافت سبب ہی کی جانب ہو بلکہ) اضافت شرط کی جانب بھی ہوتی ہے جیسے صَدَقَةُ الْفِطْرِ (یعنی فطر صوم صدقہ کے وجوب کی شرط ہے) اگر تسلیم بھی کر لیا جائے کہ قسم سبب ہے تب بھی قسم شکنی وجوب کفارہ کی شرط ہوگی اور شرط سے پہلے کفارہ واجب ہی نہ ہوگا اب اگر قسم شکنی سے پہلے کفارہ دیا جائے تو نہ قسم شکنی سے پہلے ادائیگی ہو گی نہ قسم شکنی کے بعد وجوب سے پہلے تو ادائیگی کا کوئی تصور ہی نہیں کیا جا سکتا۔ رہی زکوٰۃ اور صدقہ فطر کی قبل وجوب ادائیگی تو عقلی دلیل کا تقاضا تو یہی تھا کہ یہ بھی صحیح نہ ہو مگر قیاس کے خلاف ان دونوں کے جواز کے متعلق نص آ گئی لہٰذا نص کا حکم اسی مسئلہ تک محدود رکھا جائے گا جس کے متعلق نص آئی ہے دوسرا خلاف قیاس نص پر قیاس نہیں کیا جا سکتا۔ زکوٰۃ کے متعلق حضرت علیؓ کی روایت ہے کہ حضرت عباس رضی اللہ عنہ نے رسول اللہ ﷺ سے زکوٰۃ ادا کرنے کا مسئلہ دریافت کیا جب کہ ادا کا وقت نہ آیا ہو حضور نے ان کو اجازت دے دی۔ (رواہ ابو داؤد والترمذی وابن ماجۃ والدارمی) اور صدقہ الفطر کے متعلق بخاری نے حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کی روایت نقل کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے صدقہ فطر واجب قرار دیا۔ اس حدیث کے آخر میں ہے کہ لوگ فطر سے ایک دو روز پہلے صدقہ فطر دے دیا کرتے تھے۔ یہ کھلی ہوئی بات ہے کہ رسول اللہ ﷺ سے یہ بات پوشیدہ نہیں ہوگی بلکہ پہلے سے اجازت دے دی گئی ہو کیونکہ وجوب سے پہلے ادائیگی مشکل ہے (اس لئے صحابہ نے اپنی عقل سے خود ایسا نہیں کیا ہوگا) لامحالہ رسول اللہ ﷺ سے ضرور سنا ہوگا (کذا قال ابن ہمام)

میرے نزدیک صحیح یہ ہے کہ قسم کفارہ کا سبب ہے۔ اضافت کا یہی تقاضا ہے اور قسم کے سبب بننے کی شرط قسم شکنی ہے۔ اصول فقہ میں صراحت کر دی گئی ہے کہ امام صاحبؒ کے نزدیک اِنْ دَخَلْتِ الدَّارَ فَاَنْتِ طَالِقٌ میں تعلیق بالشرط سبب سے مانع ہے حکم سے مانع نہیں اور امام شافعیؒ کے نزدیک حکم سے مانع ہے۔ گویا یہ کلام طلاق کا سبب صرف اس وقت ہوگا جب عورت گھر میں داخل ہو جائے اور مانع زائل ہو جائے۔ داخلہ سے پہلے یہ کلام عورت کو داخل ہونے سے باز رکھنے کے لئے کہا گیا تھا اسی طرح قسم باللہ اصل میں تو قسم کو پورا کرنے کا سبب تھی لیکن جب قسم پوری نہ کی گئی اور توڑ دی گئی تو یہی قسم کفارہ کا سبب ہو گئی۔ پس شکست سے پہلے کفارہ دینا وجوب سبب سے پہلے ادا ہو گیا۔ زکوٰۃ کی حالت اس سے جدا ہے زکوٰۃ کا سبب ہے مال اور صدقہ فطر کی حالت بھی الگ ہے صدقہ فطر کا سبب ہے ذات اور شخص۔

قسم شکنی سے پہلے کفارہ دینے کے جواز میں مندرجہ ذیل روایت بھی پیش کی گئی ہے۔ عوف بن مالک کے والد کا بیان ہے میں نے عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ میرا ایک چچا کا بیٹا ہے میں اس کے پاس کچھ مانگنے جاتا ہوں تو وہ کچھ نہیں دیتا اور مجھ سے سلوک قرابت نہیں کرتا۔ پھر جب وہ حاجت مند ہوتا ہے تو میرے پاس مانگنے آتا ہے، میں نے قسم کھائی کہ اس کو کچھ نہیں دوں گا اور نہ سلوک قرابت کروں گا۔ آپ مجھے کوئی ایسی بات بتا دیجئے جو میرے لئے بہتر ہو میں اپنی قسم کا کفارہ دے دوں گا۔ (رواہ النسائی وابن ماجہ) دوسری روایت اس طرح ہے میں نے عرض کیا یا رسول اللہ میرا چچا کا بیٹا میرے پاس آتا ہے اور میں قسم کھا چکا ہوں کہ اس کو کچھ نہیں دوں گا اور سلوک قرابت نہیں کروں گا فرمایا اپنی قسم کا کفارہ دے دو۔

حضرت ابو موسیٰ اشعری کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا خدا کی قسم اگر میں کسی بات کی قسم کھا لوں اور پھر اس سے بہتر کام مجھے دکھائی دے تو انشاء اللہ ضرور قسم کا کفارہ دے دوں گا اور اس بہتر کام کو کر لوں گا۔ (متفق علیہ) حضرت عبدالرحمن

بن سمرۃؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اگر تو قسم کھائے اور پھر اس سے بہتر کام تجھے نظر آجائے تو اپنی قسم کا کفارہ دیدے اور اس بہتر کام کو کرلے۔ دوسری روایت اس طرح ہے اس بہتر کام کو کرلے اور اپنی قسم کا کفارہ دیدے، متفق علیہ۔

حضرت ابوہریرہؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اگر کوئی کسی بات کی قسم کھالے اور پھر اس سے بہتر بات اس کو نظر آجائے تو قسم کا کفارہ دیدے اور وہ کام کرلے (رواہ مسلم) یہ تمام روایات دلالت کررہی ہیں کہ قسم شکنی سے پہلے کفارہ دینا جائز ہے کیونکہ بعض روایات میں قسم کو توڑنے سے پہلے کفارہ ادا کرنے کا ذکر کیا گیا۔ مگر یہ استدلال ہیچ ہے کیونکہ واؤ مطلق عطف کے لئے آتا ہے (عطف ترتیبی کے لئے نہیں آتا) اس لئے قسم شکنی کا ذکر کفارہ سے پہلے ہو یا کفارہ کا ذکر قسم شکنی سے۔ دونوں صورتوں میں ترتیب نہیں ثابت ہوسکتی۔

ایک شبہ

بعض روایات میں لفظ ثم آیا ہے (جو ترتیب اور تراخی کے لئے آتا ہے) ابوداؤد نے حضرت عبدالرحمن بن سمرہ کی روایت ان الفاظ کے ساتھ نقل کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا پھر اپنی قسم کا کفارہ دیدے اس کے بعد وہی کام کر جو بہتر ہو۔

مستدرک میں حضرت عائشہؓ کا بیان منقول ہے کہ رسول اللہ ﷺ جب قسم کھالیتے تھے تو اس کو توڑتے نہ تھے یہاں تک کہ اللہ نے قسم کے کفارہ کا حکم نازل فرمایا۔ اس پر حضور ﷺ نے فرمایا اگر میں قسم کھاؤں گا اور اس سے بہتر عمل مجھے کوئی اور دکھائی دے گا) تو قسم کا کفارہ دیدوں گا پھر وہی عمل کروں گا جو بہتر ہوگا۔

جواب

ابوداؤد کی روایت شاذ ہے اور صحیحین میں حضرت عبدالرحمن بن سمرہ کی جو روایت مذکور ہے جو ہم نے اوپر نقل کردی اور حضرت عائشہؓ کی روایت جو مستدرک میں ہے وہ بھی شاذ ہے۔ بخاری کی روایت میں (ثم نہیں ہے بلکہ) واؤ کے ساتھ عطف ہے۔ ثم والی روایت کے صحیحین اور سنن اور مسانید کی روایات خلاف ہیں (ان کے مقابلہ میں شاذ روایت ناقابل عمل ہے۔

وَاحْفَظُوْٓا اَيْمَانَكُمْ (اور اپنی قسموں کی حفاظت رکھو) بعض لوگوں نے اس کا یہ مطلب بیان کیا ہے کہ ہر بات میں قسمیں نہ کھایا کرو۔ صحیح مطلب یہ ہے کہ قسموں کے خلاف کرنے سے آیت میں روکا گیا ہے۔ یعنی قسموں کو نہ توڑو قسم کے مطابق عمل کرو اور قسم کو پورا کرو۔ اس مطلب کی تائید آیت يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَوْفُوْا بِالْعُقُوْدِ سے ہورہی ہے۔

احکام قسم

جس چیز پر قسم کھائی ہو اگر وہ طاعت (یعنی نیکی) ہو تو پورا کرنا واجب ہے لیکن قسم توڑ کر کفارہ ادا کرنا بھی جائز ہے یا نہیں امام ابوحنیفہؒ اور امام احمدؒ کے نزدیک چونکہ قسم توڑنا اس آیت کے حکم کے خلاف ہے اس لئے قسم توڑ کر کفارہ ادا کرنا درست نہیں۔ امام شافعیؒ نے فرمایا قسم کی خلاف ورزی نہ کرنا اولیٰ ہے لیکن اگر قسم توڑ دی تو گناہ گار ہوجائے گا۔ امام مالکؒ کے دونوں قول آئے ہیں اول بھی اور دوسرا بھی۔ اگر کسی امر مباح پر قسم کھائی (جس کا نہ کرنا کرنے سے بہتر نہ ہو) تو اس کا حکم بھی حکم مذکور کی طرح ہے۔

اگر کوئی گناہ کرنے پر قسم کھائے تو قسم توڑنا اور کفارہ دینا واجب ہے کیونکہ قسم توڑنے کا گناہ تو کفارہ دے کر دور ہوسکتا ہے اور گناہ کرلیا تو اس کے اتدارک کی کوئی شکل نہیں۔

اگر امر مستحب کو ترک کرنے کی قسم کھائی تو قسم توڑ کر کفارہ ادا کرنا اولیٰ ہے۔ اللہ نے فرمایا ہے وَلَا تَجْعَلُوا اللّٰهَ عُرْضَةً لِّاَيْمَانِكُمْ یعنی اپنی قسموں کو نیکیوں سے مانع اور رکاوٹ نہ بناؤ۔

حضرت عمر بن خطابؓ نے فرمایا تھا میں قسم کھالیتا ہوں کہ بعض لوگوں کو وہ نہیں دوں گا پھر میری رائے دینے کی ہوجاتی

ہے تو (دے دیتا ہوں اور کفارہ میں دس مسکینوں کو (ایک کو ایک صاع جو یا چھوارے یا (آدھا) آدھا صاع گیہوں دے دیتا ہوں اور

حضرت عائشہؓ کا بیان ہے کہ حضرت ابو بکر صدیقؓ قسم کھا کر کبھی اس کی خلاف ورزی نہیں کرتے تھے آخر جب آیت کفارہ نازل ہوئی تو آپ نے فرمایا میں اللہ کی عطا کی ہوئی اجازت قبول کرتا ہوں اب اگر کبھی قسم کھاؤں گا اور کوئی بات قسم کے خلاف مجھے بہتر نظر آئی تو وہ کروں گا جو بہتر ہوگا۔ رواہ ابن ابی شیبہ و عبد الرزاق و البخاری و ابن مردویہ۔

فصل

……نذر (منت) ماننا……

اگر کسی ایسی شرط سے مشروط کر کے نذر مانی جس کے ہو جانے کی دلی خواہش ہو تو باجماع علماء غیر مشروط نذر کی طرح پورا کرنا ضروری ہے، مثلاً یوں کہا کہ اگر بیمار اچھا ہو گیا تو ایک روزہ رکھوں گا (ظاہر ہے کہ بیمار کے شفا پانے کی تمنا موجود ہے اس لئے اگر بیمار شفایاب ہو جائے گا تو ایک روزہ رکھنا واجب ہوگا) اور اگر ایسی شرط کے ساتھ مشروط کیا جس کے نہ ہونے کی خواہش ہے مثلاً یوں کہا کہ اگر میں نے یہ کام کیا تو مجھ پر حج لازم ہے۔ امام صاحبؒ کے نزدیک اس صورت میں بھی وقوع شرط کے بعد وفاء نذر واجب ہوگی۔ امام صاحب کا دوسرا قول جو صحیح ترین روایت سے ثابت ہے یہ ہے کہ (بغیر نذر پوری کئے) کفارہ ادا کرنا کافی ہے۔ امام محمد اور امام احمد کا بھی یہی قول ہے۔ اس صورت میں نذر پوری کرے یا کفارہ ادا کرے دونوں میں سے جو صورت چاہے اختیار کرے۔ دوسری روایت میں امام احمد کا قول آیا ہے کہ صرف کفارہ دینا ضروری ہے۔

امام شافعیؒ کا قول موخر الذکر دونوں روایات کی طرح ہے۔ امام مالکؒ نے فرمایا اگر مال خیرات کرنے کی نذر مانی ہے تو ایک تہائی مال خیرات کرنا واجب ہے اور اگر سارا مال صدقہ کی نذر ہو تو وفاء نذر ضروری ہے کیونکہ روایت میں آیا ہے کہ حضرت ابو لبابہؓ نے رسول اللہ ﷺ سے عرض کیا میری توبہ (کے تکمیلی اجزاء) میں سے یہ بھی ہے کہ اپنی قوم کی جس بستی میں مجھ سے گناہ کا صدور ہوا ہے اس کو چھوڑ دوں اور اپنے (کل) مال سے کنارہ کش ہو جاؤں، میرا کل مال خیرات ہے۔ حضور ﷺ نے فرمایا تیری طرف سے ایک تہائی مال (کی خیرات) کافی ہے۔ رہا کفارہ کا جواز تو اس کا ثبوت حضرت عقبہؓ بن عامر کی روایت سے ہوتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا نذر کا کفارہ قسم کا کفارہ ہے۔ رواہ مسلم۔

حضرت عمران بن حصینؓ کی روایت ہے کہ غضب کی حالت میں نذر نہیں۔ ایسی نذر کا کفارہ قسم کا کفارہ ہے۔ رواہ احمد والنسائی۔

مسئلہ۔ اگر ایسی نذر مانی جس کو پورا کرنا ممکن نہیں خواہ اس وجہ سے کہ اس کو پورا کرنے کی طاقت نہیں۔ جیسے پیدل حج کرنے کی نذر یا ہمیشہ روزے رکھنے کی نذر یا اس وجہ سے کہ نذر کو پورا کرنے سے گناہ لازم آتا ہے (جیسے اقرباء سے قطع تعلق کرنے کی نذر یا رمضان کا روزہ نہ رکھنے کی نذر) تو قسم کے کفارہ کی طرح کفارہ ادا کرے۔ کیونکہ نذر کا معنی ہے کسی بات کو اپنے اوپر فرض کر لینا اور کسی بات کو فرض کر لینے کا معنی ہے اس بات کی ضد کو اپنے لئے حرام کر لینا اور کسی چیز کو حرام کر لینا قسم ہے۔ عربی میں نذر کے موقع پر جو لام لفظ اللہ پر آتا ہے (مثلاً للہ علی کذا) تو وہ لام مفید قسم ہوتا ہے جیسے لعمرک میں لام قسمیہ ہے۔ حضرت عائشہؓ کی حدیث ہے لانذر فی معصیۃ گناہ کی نذر (نذر) نہیں اور اس کا کفارہ قسم کا کفارہ ہے۔ رواہ احمد و ابو داؤد والترمذی والنسائی۔ نسائی نے عمران بن حصینؓ کی روایت سے بھی ایسی ہی حدیث نقل کی ہے۔

حضرت ابن عباسؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جس نے نذر غیر معین مانی اس کا کفارہ قسم کا کفارہ ہے اور جس نے گناہ کی نذر مانی اس کا کفارہ قسم کا کفارہ ہے اور جس نے ایسی نذر مانی جس کو پورا کرنے کی طاقت نہیں تو اس کا کفارہ بھی قسم کا کفارہ ہے اور جس نے قابل برداشت نذر مانی تو اس کو ضرور پورا کرے۔ رواہ ابو داؤد و ابن ماجہ۔ بعض علماء نے اس کو حضرت ابن عباسؓ کا قول قرار دیا ہے۔ حضرت عبد اللہ بن مالکؓ کی روایت ہے کہ عقبہ بن عامرؓ کی بہن نے ننگے پاؤں چل کر

ہونے کی حالت میں پیدل چل کر حج کرنے کی نذر مانی تھی۔ عقبہؓ نے اس کے متعلق رسول اللہ ﷺ سے دریافت کیا۔ حضور ﷺ نے فرمایا اس کو حکم دیدو کہ سر ڈھانک لے اور سوار ہو جائے اور تین روزے رکھ لے۔ رواہ اصحاب السنن الاربعہ والدارمی۔

مسئلہ :۔ جس نے قسم کھاتے ہی متصلاً انشاء اللہ کہہ دیا تو قسم منعقد نہیں ہوتی اگر قسم کے خلاف کرے گا تو قسم شکنی نہ ہوگی حضرت ابن عمرؓ کا بیان ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جس نے قسم کھائی اور انشاء اللہ بھی کہہ دیا تو اس پر قسم شکنی عائد نہیں ہوتی۔ رواہ اصحاب السنن الاربعہ والدارمی۔ ترمذی نے لکھا ہے کہ ایک جماعت نے اس کو حضرت ابن عمرؓ کا قول قرار دیا ہے۔

كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمْ اٰيٰتِهٖ (یونہی تمہارے لئے اللہ اپنی آیات یعنی شریعت کے بیانات کھولتا ہے)

لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ۝ (تاکہ تم اس نعمت تعلیم کا شکر ادا کرو) یا اس نعمت کا شکر ادا کرو کہ واجب کو ادا کرنے اور فارغ الذمہ ہونے اور اللہ کی مرضی حاصل کرنے اور درجات قرب پر فائز ہونے کی تم کو توفیق نصیب ہوئی۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِنَّمَا الْخَمْرُ وَالْمَيْسِرُ (اے اہل ایمان شراب اور جوا) (اور انصاب و ازلام گندگی ہیں) خمر و میسر کی تفسیر اور حکم سورۂ بقرہ میں گزر چکا ہے۔

وَالْاَنْصَابُ (اور پوجا کے بت)

وَالْاَزْلَامُ (اور جوئے کے تیر) ازلام کی تفسیر شروع سورت میں گزر چکی ہے۔

رِجْسٌ (گندگی جس سے سلیم الطبع اور صحیح عقلوں والے نفرت کرتے ہیں)۔

ف ترمذی نے لکھا ہے کہ حضرت عمر بن خطاب نے دعا کی اے اللہ شراب کے متعلق ہمارے لئے کوئی تسکین بخش بیان نازل فرما اس پر سورۂ بقرہ والی آیت يَسْئَلُوْنَكَ عَنِ الْخَمْرِ وَالْمَيْسِرِ قُلْ فِيْهِمَآ اِثْمٌ كَبِيْرٌ وَّمَنَافِعُ لِلنَّاسِ ۔ الخ نازل ہوئی حضرت عمرؓ نے پھر دعا کی اے اللہ شراب کے متعلق ہمارے لئے کوئی تسلی بخش حکم نازل فرما دے۔ اس پر سورۃ النساء والی آیت يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَقْرَبُوا الصَّلٰوةَ وَاَنْتُمْ سُكٰرٰى نازل ہوئی۔ حضرت عمرؓ کو بلوا کر یہ آیت سنائی گئی۔ آپؓ نے پھر دعا کی الٰہی شراب کے متعلق کھول کر ہمارے لئے کوئی بیان شافی نازل فرما دے۔ تو سورۃ المائدہ والی آیت اِنَّمَا يُرِيْدُ الشَّيْطٰنُ اَنْ يُّوْقِعَ بَيْنَكُمُ الْعَدَاوَةَ وَالْبَغْضَآءَ ..... فَهَلْ اَنْتُمْ مُّنْتَهُوْنَ تک شراب اور قمار کے متعلق نازل ہوئی۔ اور حضرت عمرؓ کے سامنے یہ آیت پڑھی گئی۔ حضرت عمرؓ نے کہا ہم باز آگئے ہم باز آگئے (یعنی شراب اور قمار سے باز آگئے)۔

عبدالرحمٰن بن حارث کا بیان ہے میں نے حضرت عثمان بن عفان کو فرماتے سنا شراب سے بچو یہ تمام بری باتوں کی جڑ ہے۔ پچھلے زمانہ میں ایک عابد تھا ایک بدچلن عورت اس پر شیفتہ ہوگئی جس نے عابد کو بلانے کے لئے اپنی باندی کو بھیجا باندی نے آکر عابد سے کہا ہم گواہی کے لئے آپ کو بلانے آئے ہیں۔ عابد باندی کے ساتھ چل دیا (باندی ایک گھر میں لے گئی) ایک دروازے سے داخل ہوئی اور ایک دروازہ کے بعد دوسرے دروازے میں اور دوسرے کے بعد تیسرے میں داخل ہوتی چلی گئی) جس دروازے سے آگے بڑھتی تھی اس کو بند کرتی چلی جاتی تھی آخر ایک گورے رنگ کی عورت کے سامنے پہنچ گئی عورت کے پاس ایک بچہ تھا اور شراب رکھی ہوئی تھی عابد سے کہنے لگی میں نے تم کو گواہی کے لئے نہیں بلوایا بلکہ تم کو تین کاموں میں سے ایک کام کرنا ہوگا یا تو مجھ سے قربت کرو یا شراب پیو یا اس بچہ کو قتل کرو۔ عابد نے کہا (جب کوئی صورت نجات کی نہیں) تو مجھے شراب پلا دے۔ عورت نے ایک جام پلا دیا۔ عابد نے جام پی کر کہا اور دو۔ توقف کرو جب کچھ دیر میں نشہ چڑھا تو اس نے عورت سے قربت بھی کی اور بچہ کو بھی قتل کر دیا لہٰذا تم لوگ شراب سے پرہیز رکھو۔ خدا کی قسم ایمان اور شراب خوری کی عادت ایک جگہ جمع نہیں ہو سکتیں ایک کے آنے سے دوسرے کا نکل جانا ضروری ہے۔ رواہ النسائی۔

حضرت ابن عباسؓ کا بیان ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے زمانہ میں شرابیوں کو ہاتھوں، جوتوں اور لاٹھیوں سے پیٹا جاتا تھا۔ حضور ﷺ کی وفات کے بعد حضرت ابوبکرؓ نے شرابیوں کی سزا مقرر کرنی چاہی اور عہد رسالت کی سزا کو دیکھ کر چالیس کوڑوں کی سزا مقرر کی اور چالیس کوڑے مارنے لگے۔ حضرت ابوبکرؓ کی وفات کے بعد حضرت عمرؓ نے اسی کوڑوں کی سزا دینے کا حکم دیا تو اس نے کہا آپ مجھے کس طرح کوڑے مار سکتے ہیں میرا آپ کا فیصلہ کتاب اللہ سے ہونا چاہئے۔ حضرت عمرؓ نے فرمایا کوڑے نہ مارنے کا حکم کس کتاب میں (بقیہ اگلے صفحہ پر)

مِّنْ عَمَلِ الشَّيْطٰنِ (شیطانی عمل (کا نتیجہ) ہیں) یعنی شیطان کے بہکانے اور فریب کاری (کا نتیجہ) ہیں تو گویا شیطانی عمل ہیں۔

فَاجْتَنِبُوْهُ (پس اس گندگی سے بچو)

لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ۝ (تاکہ (اس اجتناب کی وجہ سے) تم کامیاب ہو جاؤ)۔ اللہ نے بڑے پرزور طریقہ سے اس آیت میں شراب اور جوئے کی ممانعت فرمائی ہے۔ جملہ کا آغاز لفظ اِنَّمَا سے کیا گیا (جو کلمۂ حصر ہے) انصاب و ازلام کے ساتھ ملا کر خمر و میسر کا ذکر کیا۔ خمر و میسر کو گندگی فرمایا۔ عمل شیطانی قرار دیا گویا اس طرح تنبیہ کی کہ یہ دونوں چیزیں خالص شر ہیں۔ دونوں سے بالکل الگ رہنے کا حکم دیا۔ اس سے اجتناب کو امید گاہ فلاح قرار دیا۔ پھر آخر میں ان دینی اور دنیوی خرابیوں کا ذکر کیا۔ جو شراب اور جوئے سے وابستہ ہیں فرمایا۔

اِنَّمَا يُرِيْدُ الشَّيْطٰنُ اَنْ يُّوْقِعَ بَيْنَكُمُ الْعَدَاوَةَ وَالْبَغْضَآءَ فِي الْخَمْرِ وَالْمَيْسِرِ (شیطان) تو بس یہ چاہتا ہے کہ شراب اور جوئے کے ذریعہ سے تمہارے آپس میں دشمنی اور بغض ڈلوا دے)۔ جیسے اس انصاری نے کیا تھا جس نے اونٹ کے جبڑے کی ہڈی سے حضرت سعد بن وقاص کا سر زخمی کر دیا تھا۔ یہ قصہ سورۂ بقرہ میں گزر چکا ہے۔

قتادہ نے کہا بعض لوگ اپنا مال اور عیال کو داؤ پر لگا دیتے تھے پھر ہار جاتے تھے تو پریشان و غمگین ہو کر جیتنے والوں پر غصہ کرتے (اور ان کے دشمن ہو جاتے) تھے۔ دوبارہ شراب و قمار اور ان کی خرابیوں کا خصوصیت کے ساتھ ذکر کرنے سے اس امر پر تنبیہ ہو رہی ہے کہ آیت میں انصاب و ازلام کا ذکر تو ذیلی طور پر کر دیا گیا ہے۔ اصل مقصد شراب اور جوئے کا بیان ہے۔ انصاب و ازلام کا ذیلی ذکر کر کے یہ بتانا غرض ہے کہ ان کی حرمت بھی شراب و قمار کی طرح ہے۔ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد گرامی ہے کہ شراب پینے والا بت پرست کی طرح ہے۔ رواہ البزاز عن حدیث عبداللہ بن عمرو مرفوعًا۔ ابن ماجہ کی روایت میں شراب خور کی جگہ شراب کا دائمی خوگر کا لفظ آیا ہے۔ حارث کی روایت میں ہے۔ شراب خور لات و عزیٰ کے پجاری کی طرح ہے۔

وَيَصُدَّكُمْ عَنْ ذِكْرِ اللّٰهِ وَعَنِ الصَّلٰوةِ (اور (شراب و قمار میں مبتلا کر کے) شیطان تم کو اللہ کی یاد اور نماز سے روکتا ہے۔ جب آدمی شراب پینے اور جوا کھیلنے میں منہمک ہو جاتا ہے تو شیطان اس کو اللہ کی یاد سے غافل کر دیتا ہے اور نماز کو اجاڑ بنا دیتا ہے۔ حضرت عبدالرحمٰن بن عوف کے مہمانوں کا ایسا ہی واقعہ ہوا تھا۔ سب نے شراب پی اور شراب پی کر نماز پڑھنے کھڑے ہو گئے اور جس شخص کو امام بنایا اس نے قُلْ يٰٓاَيُّهَا الْكٰفِرُوْنَ اَعْبُدُ مَا تَعْبُدُوْنَ پڑھ دیا۔ یہ قصہ سورۂ بقرہ میں گزر چکا ہے۔ خصوصیت کے ساتھ صلوٰۃ کا ذکر نماز کی عظمت ظاہر کرنے کے لئے کیا کیونکہ نماز ہی اہل ایمان کا شعار اور دین کا ستون ہے۔ نماز سے روکنے والا ایمان سے روکنے والے کی طرح ہے۔ مؤمن و کافر میں ظاہری امتیاز پیدا کرنے والی نماز ہی ہے اللہ نے نماز کی تعبیر لفظ ایمان سے کی ہے فرمایا ہے وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيُضِيْعَ اِيْمَانَكُمْ نماز کو ایمان فرمایا جس طرح ایمان کا نہ ہونا (حرمت

(بقیہ پچھلے صفحہ) لکھا ہے۔ مجاہد نے کہا اللہ فرماتا ہے لَيْسَ عَلَى الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ جُنَاحٌ فِيْمَا طَعِمُوْٓا اِذَا مَا اتَّقَوْا وَّاٰمَنُوْا (یعنی اہل مؤمن متقی اور ایمان کے بعد جو کچھ کھائیں کوئی گناہ نہیں) اور میں اس آیت کا مصداق ہوں اور رسول اللہ ﷺ کے ہم رکاب بدر اور خندق اور دوسرے جہادوں میں حاضر رہا۔ حضرت عمرؓ نے فرمایا تم لوگ اس کی بات کا جواب کیوں نہیں دیتے [illegible] یہ آیت تو پچھلے لوگوں کے لئے عذر ہے جو شراب کی حرمت سے پہلے مر گئے تھے اور باقی رہنے والوں کے لئے ان آیات کے اندر کوئی عذر نہیں کیونکہ اللہ فرماتا ہے اِنَّمَا الْخَمْرُ وَالْمَيْسِرُ وَالْاَنْصَابُ وَالْاَزْلَامُ رِجْسٌ ... فَهَلْ اَنْتُمْ مُّنْتَهُوْنَ اب تک اللہ نے ان آیات میں شراب پینے کی ممانعت فرما دی۔ حضرت عمرؓ نے فرمایا تو آپ لوگوں کا کیا خیال ہے حضرت علیؓ نے فرمایا ہماری رائے یہ ہے کہ اس نے شراب پی تو بہکا اور بہکا تو [illegible] اور بہتان باندھا اور بہتان باندھنے والے کی سزا اسی ۸۰ کوڑے ہیں۔ چنانچہ حضرت عمرؓ کے حکم سے اس کے اسی کوڑے لگوائے گئے۔ رواہ الحاکم اور حاکم نے اس روایت کو صحیح کہا ہے۔

شراب سے پہلے کی) نماز کو اکارت کر دے۔

حضرت جابرؓ کی روایت سے مسلم، ابوداؤد، ترمذی اور ابن ماجہ نے بیان کیا ہے کہ (مومن) بندے اور کافر کے درمیان ترک صلوٰۃ کا فرق ہے۔ حضرت عبداللہ بن بریدہؓ کی روایت سے امام احمد نے بھی ایسی ہی حدیث نقل کی ہے اس روایت میں ہے جس نے نماز کو چھوڑا وہ کافر ہو گیا۔ حضرت عبداللہ بن عمروؓ کی روایت سے احمدؒ نے بیان کیا ہے کہ ایک روز رسول اللہ ﷺ نے نماز کے تذکرے کے ذیل میں فرمایا جس نے اس کی پابندی کی تو قیامت کے دن نماز اس کیلئے نور اور برہان اور نجات بن جائے گی اور جس نے پابندی نہیں کی نہ اس کیلئے نور ہو گا نہ نجات اور قیامت کے دن وہ قارون، فرعون، ہامان اور ابی بن خلف کا ساتھی ہو گا۔

فَهَلْ أَنْتُمْ مُنْتَهُونَ ۝ (سو اب بھی باز آجاؤ گے)۔ اس آیت میں بہت ہی بلیغ انداز میں بصورت استفہام باز رہنے پر زور دیا گیا ہے۔ گویا یوں کہا گیا کہ مذکورہ بالا مفاسد خمر و میسر جاننے کے بعد کیا اب تم ان سے باز رہو گے یا حسبِ سابق کرو گے اور باز نہ آؤ گے۔

وَأَطِيعُوا اللَّهَ وَأَطِيعُوا الرَّسُولَ یعنی شراب جوا اور تمام ممنوعات سے پرہیز اور واجبات کی ادائیگی کے معاملہ میں (اللہ کی اطاعت کرو اور اس کے رسول کا حکم مانو)۔

وَاحْذَرُوا (اور (خدا اور رسول کی نافرمانی سے) بچو)۔

فَإِنْ تَوَلَّيْتُمْ (اب اگر تم نے (اللہ اور اللہ کے رسول کی اطاعت سے) روگردانی کی)۔

فَاعْلَمُوا أَنَّمَا عَلَىٰ رَسُولِنَا الْبَلَاغُ الْمُبِينُ ۝ (تو سمجھ لو کہ ہمارے رسول پر صرف کھول کر پہنچانے کی ذمہ داری ہے) (یعنی جو کچھ تمہارا کام ہے) تمہاری نافرمانی سے ہمارے پیغمبر کا کچھ نقصان نہ ہو گا تم کو ہی ضرر پہنچے گا۔

حضرت ابن عمرؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہر نشہ لانے والی چیز حرام ہے جو شخص دنیا میں اس کو پئے گا اللہ کا قطعی فیصلہ ہے کہ (قیامت کے دن) اس کو طینۃ الخبال پلائے گا۔ تم جانتے بھی ہو طینۃ الخبال کیا چیز ہو گی، دوزخیوں کا پسینہ (رواہ البغوی)۔ حضرت ابن عمرؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جس نے دنیا میں شراب پی پھر توبہ نہیں کی (یونہی مر گیا) اللہ اس کو آخرت کی شراب سے محروم کر دے گا۔ رواہ البغوی۔

حضرت ابن عمرؓ نے فرمایا میں شہادت دیتا ہوں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو فرماتے سنا کہ اللہ کی لعنت شراب پر، شراب پینے والے پر، پلانے والے پر، بیچنے والے پر، خریدنے والے پر، نچوڑنے والے پر، بنوانے والے پر، اٹھانے والے پر اور اس پر جس کے لئے اٹھا کر لی جاتی ہو اور شراب کی قیمت کھانے والے پر۔ (رواہ ابن ماجہ) ابوداؤد کی روایت میں شراب کی قیمت کھانے والے کا ذکر نہیں ہے اس بحث کی روایت حضرت انس بن مالکؓ سے بھی آئی ہے۔

ترمذی اور ابن ماجہ نے حضرت ابن عباسؓ کی روایت سے اور حاکم نے حضرت ابن مسعودؓ کی روایت سے اس بحث کی احادیث بیان کی ہیں۔ حضرت ابن مسعودؓ کی روایت میں آیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جس نے شراب پی اللہ اس کی چالیس صبح تک نماز قبول نہیں فرماتا اس کے بعد اگر وہ توبہ کرتا ہے تو اللہ اس کی توبہ قبول فرماتا ہے۔ پھر دوبارہ اگر وہ شراب خوری کرتا ہے تو چالیس صبح (چالیس دن) تک نماز قبول نہیں فرماتا ہے اس کے بعد اگر توبہ کر لیتا ہے تو اللہ توبہ قبول فرما لیتا ہے۔ پھر (تیسری بار) اگر لوٹ کر پہلی حرکت کرتا ہے تو چالیس دن کی نماز قبول نہیں فرماتا لیکن اگر پھر توبہ کر لیتا ہے تو توبہ قبول فرما لیتا ہے۔ چوتھی مرتبہ میں چالیس دن کی نماز قبول نہیں فرماتا اور اگر توبہ کرتا ہے تو توبہ بھی قبول نہیں کرتا اور نہر خبال (کا پانی) اس کو پلائے گا۔ رواہ الترمذی، نسائی، ابن ماجہ اور دارمی نے حضرت عبداللہ بن عمروؓ کی روایت سے یہ حدیث بیان کی ہے۔

حضرت عبداللہ بن عمروؓ کا بیان ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جنت میں نہیں جائے گا ماں باپ کا نافرمان نہ جواری نہ دائمی شراب خور۔ رواہ الدارمی۔ حضرت ابو امامہؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اللہ نے مجھے جہان کیلئے رحمت اور ہدایت بنا کر بھیجا ہے میرے رب نے مجھے ساز باجے، بت، صلیب اور امور جاہلیت کو مٹانے کا حکم دیا ہے اور میرے رب نے قسم کھا کر فرمایا ہے

قسم ہے اپنی عزت کی کہ جو بندہ ایک گھونٹ شراب کا پئے گا میں اتنا ہی اس کو پیپ پلاؤں گا اور جو بندہ میرے خوف سے شراب چھوڑ دے گا میں اس کو قدس کے حوضوں سے (شربت) پلاؤں گا۔ (رواہ احمد) حضرت ابن عمرؓ کا بیان ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تین شخص ہیں جن پر اللہ نے جنت حرام کر دی ہے۔ دائمی شراب خور، ماں باپ کا نافرمان اور بھڑوا۔ (رواہ احمد والنسائی)۔

حضرت ابو موسیٰ اشعری کی روایت میں آیا ہے دائمی شراب خور اور رشتہ داری کاٹنے والا اور جادو کی تصدیق کرنے والا۔ (رواہ احمد) سورۂ بقرہ میں امام احمد کے حوالہ سے حضرت ابوہریرہؓ کی روایت ہم نے نقل کر دی ہے کہ جب رسول اللہ ﷺ مدینہ میں تشریف لائے تو لوگ شراب پیا کرتے تھے۔ (الحدیث) اس حدیث کے آخر میں ہے پھر اس سے بھی زیادہ سخت آیت نازل ہوئی فرمایا یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اِنَّمَا الْخَمْرُ وَالْمَیْسِرُ...... فَهَلْ اَنْتُمْ مُّنْتَهُوْنَ تک۔ یہ حکم سن کر صحابہؓ نے کہا اے ہمارے رب ہم باز آ گئے۔ بعض لوگ کہنے لگے کہ کچھ لوگ شراب پیتے اور جوئے کی کمائی کھایا کرتے تھے پھر وہ اللہ کی راہ میں مارے گئے یا اپنے بستر پر مر گئے (ان کا کیا ہو گا) اللہ نے تو شراب اور جوئے کو گندگی اور عمل شیطان قرار دیا ہے اس پر آیت لَیْسَ عَلَی الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا الخ نازل ہوئی۔

نسائی اور بیہقی نے حضرت ابن عباسؓ کی روایت سے بیان کیا ہے کہ انصار کے دو قبیلوں کے معاملہ میں شراب کی حرمت ہوئی تھی۔ ان لوگوں نے شراب پی تھی اور نشہ میں مست ہو کر آپس میں گتھم گتھا کی تھی جب نشہ اترا تو چہروں، سروں اور داڑھیوں کی حالت خراب دیکھ کر کہنے لگے یہ حرکت فلاں بھائی کی ہے اگر اس کو میرا پاس لحاظ ہوتا تو ایسی حرکت نہ کرتا۔ یہ انصاری سب بھائی بھائی تھے کسی کے دل میں کسی کی طرف سے کینہ نہ تھا لیکن اس شراب خوری سے ان کے دلوں میں کینے پڑ گئے۔ اس پر آیت یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اِنَّمَا الْخَمْرُ وَالْمَیْسِرُ الخ نازل ہوئی۔ اس پر کچھ لوگ کہنے لگے یہ تو گندگی ہے مگر فلاں شخص کے پیٹ میں تھی جب کہ احد کی لڑائی میں وہ مارا گیا (اس کا کیا ہو گا) اس پر آیت ذیل نازل ہوئی۔

لَیْسَ عَلَی الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ جُنَاحٌ فِیْمَا طَعِمُوْٓا (جو لوگ ایمان لائے اور نیک کام کئے تو جو شراب انہوں نے (حرمت سے پہلے) پی لی اور جوئے کا مال (حرمت سے پہلے) کھا لیا اس کا کوئی گناہ ان پر نہیں ہے۔

اِذَا مَا اتَّقَوْا (جب کہ وہ شرک سے بچ گئے)

وَّاٰمَنُوْا (اور انہوں نے اللہ کو مان لیا)۔

وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ (اور (ایمان کے بعد) نیک کام کئے)۔

ثُمَّ اتَّقَوْا (پھر (شراب اور جوئے کی حرمت کے بعد دونوں سے) بچے رہے)۔

وَّاٰمَنُوْا (اور (دونوں کی حرمت کو) مان لیا)۔

ثُمَّ اتَّقَوْا (پھر (تمام ممنوعات سے) بچے رہے)۔ پہلا بچنے سے مراد ہے شرک سے بچا رہنا اور دوسرے تقویٰ سے مراد ہے ممنوعات سے بچنا اور تیسرے تقویٰ سے مراد ہے شبہ کی چیزوں سے بچے رہنا۔

وَّاَحْسَنُوْا (اور (لوگوں سے) بھلائی کی، یا یہ مراد ہے کہ انہوں نے اپنے اعمال خوبی سے ادا کئے رب کی عبادت کے وقت ایسا محسوس کرتے رہے کہ گویا اپنے رب کو دیکھ رہے ہیں [1]

وَاللّٰهُ یُحِبُّ الْمُحْسِنِیْنَ ۝ (اور اللہ بھلائی کرنے والوں کو پسند فرماتا ہے) ان کی چوک کسی بات پر نہیں کرے گا۔ اس آیت میں اس امر پر تنبیہ ہے کہ جو مذکورہ صفت کا حامل ہو گا وہ محسن ہو گا اور جو محسن ہو جائے گا وہ اللہ کا محبوب ہو جائے گا۔

---

[1] صحیح بخاری وغیرہ میں آتا ہے کہ جبرئیلؑ نے رسول اللہ ﷺ سے دریافت کیا احسان (عبادت کی خوبی) کیا ہے حضور ﷺ نے فرمایا اپنے رب کی اس طرح عبادت کرنا کہ گویا تم اس کو دیکھ رہے ہو اگر یہ نہ ہو تو (تم یہ تو یقین رکھو کہ) وہ تم کو دیکھ رہا ہے۔ حضرت مفسرؒ کی آخری تفسیر کی بنا اسی حدیث پر ہے۔

ماہ ذیقعدہ ۶ ہجری میں حدیبیہ کے سال مسلمان عمرہ کا احرام باندھے ہوئے (اور حضور اقدس ﷺ) کے ہم رکاب مقام حدیبیہ کی طرف جا رہے تھے) اس وقت آیت ذیل نازل ہوئی۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَيَبْلُوَنَّكُمُ اللَّهُ بِشَيْءٍ مِّنَ الصَّيْدِ (اے ایمان والو اللہ کچھ شکار (بھیج کر اس) سے تمہاری ضرور آزمائش کرے گا)۔ شَیْءٍ (میں تنوین تحقیر کے لئے ہے اس) سے مراد ہے حقیر چیز جو اتنی بڑی نہیں کہ پاؤں ڈگمگا جائیں نہ جان خرچ کرنے کا امتحان ہے نہ مال دینے کا۔ مِنَ الصَّيْدِ، شَیْءٍ کی صفت ہے۔

تَنَالُهُ أَيْدِيكُمْ وَرِمَاحُكُمْ (جن تک تمہارے ہاتھ اور تمہارے نیزے پہنچ سکیں گے)۔ یہ جملہ شَیْءٍ کی دوسری صفت ہے (اس پیشین گوئی کے مطابق) جنگلی شکار لوگوں کے پڑاؤ اور فرودگاہوں کے اندر گھس آتا تھا اور اتنا قریب آجاتا تھا کہ لوگ اس کو ہاتھوں سے پکڑ سکتے تھے اور برچھے سے بھی شکار کر سکتے تھے۔ [1]

لِيَعْلَمَ اللَّهُ مَن يَخَافُهُ بِالْغَيْبِ (تاکہ اللہ معلوم کرے کہ کون شخص اس سے بن دیکھے ڈرتا ہے) لِيَعْلَمَ کا تعلق لَيَبْلُوَنَّكُمْ سے ہے کیونکہ امتحان کی مراد یہ ہے کہ اللہ کے بن دیکھے عذاب سے ڈرنے والوں کو نہ ڈرنے والوں سے الگ کر دیا جائے اس صورت میں علم سے مراد ہوگا معلوم کا وقوع یا ظہور یا یعْلَمَ کا یہ مطلب ہے کہ وقوع خوف کے بعد اللہ ڈرنے والے کے خوف کو اسی طرح جان لے جس طرح وقوع سے پہلے جانتا تھا (کسی واقعہ کے ظہور سے پہلے بھی اللہ کو اس واقعہ کا پورا پورا علم ہوتا ہے۔ اس علم کو اجمالی کہتے ہیں۔ جو اللہ کی صفت کمالیہ اور قدیم ہے اور واقعہ کے ظہور وجود کے بعد بھی اللہ کو اس واقعہ کا پورا پورا علم ہو جاتا ہے یہ علم تفصیلی کہلاتا ہے اور یہ صفت کمالیہ نہیں ہے نہ یہ قدیم ہے بلکہ واقعہ کے ظہور پر موقوف ہے اور وجود واقعہ کے بعد ہوتا ہے آیت میں یہی علم مراد ہے۔ حضرت مفسر کی تفسیر کا یہی مطلب ہے اللہ کے علم اجمالی پر عذاب و ثواب مرتب نہیں ہوتا۔ ظہور واقعہ سے پہلے عذاب ظلم ہے ہاں علم تفصیلی چونکہ بعد وجود عمل ہوتا ہے اس لئے ثواب و عذاب کا اسی پر مدار ہے) بِالْغَيْبِ کا مطلب دو طرح سے ہوتا ہے ایک یہ کہ بن دیکھے خدا سے کون ڈرتا ہے، دوسرا یہ کہ عذاب کے سامنے آنے اور دیکھنے سے پہلے اس سے کون ڈرتا ہے۔

اللہ نے آئندہ امتحان کی پہلے سے اطلاع مومنوں کی اعانت کے طور پر دیدی تاکہ نافرمانی سے کامل طور پر بچے رہیں۔

فَمَنِ اعْتَدَىٰ بَعْدَ ذَٰلِكَ (اس (امتحان یا اطلاع) کے بعد جو شخص زیادتی کرے گا) یعنی شکار کرے گا۔

فَلَهُ عَذَابٌ أَلِيمٌ (اس کو (خصوصیت کے ساتھ) دردناک عذاب ہوگا) کیونکہ حقیر چیز سے جب وہ اپنے نفس کو نہ روک سکا اور اللہ کے حکم کا اس نے پاس لحاظ نہیں کیا تو بڑی چیزوں سے اپنے کو کیسے روک سکے گا۔ جن کی طرف نفس میلان بہت زیادہ ہوتا ہے۔ بغوی نے لکھا ہے کہ (آیت مذکورہ کے نزول کے بعد) ایک شخص نے جس کو ابوالیسر کہا جاتا تھا (حرم کی حالت میں) ایک گورخر پر حملہ کر کے قتل کر دیا اس پر آیت ذیل نازل ہوئی۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَقْتُلُوا الصَّيْدَ وَأَنتُمْ حُرُمٌ (اے مسلمانو! بحالت احرام شکار کو مت مارو) یعنی اس حیوان کو قتل مت کرو جو اصل خلقت کے لحاظ سے جنگلی اور محفوظ الفطرت ہو خواہ اس کا گوشت کھایا جاتا ہو یا نہ کھایا جاتا ہو۔ قاموس۔ امام ابو حنیفہؒ نے صید کی یہی تعریف کی ہے اور یہی مراد لیا ہے لیکن ان جانوروں کو حکم سے الگ قرار دیا ہے جن کے قتل کا جواز احادیث میں آیا ہے یعنی سانپ، بچھو، چیل، کوا اور کاٹنے والا کتا۔ جو ان موذی جانوروں کو قتل کر دیا جائے۔ کیونکہ اسی بنا پر کتے کو خصوصاً کاٹنے والے کتے کو قتل کر دینا جائز قرار دیا ہے۔ ظاہر ہے کہ ہر کتا شکار ہے (یعنی) اصل خلقت کے اعتبار سے جنگلی ہے) اگرچہ کا پلا تو بن جانا ممکن ہے (شکار کے) بچھو لوگ کتے ہیں کتا جنگلی نہیں ہے اس لئے اس کو

[1] ابن ابی حاتم نے مقاتل بن حیان کا قول نقل کیا ہے کہ یہ آیت کا نزول عمرہ حدیبیہ میں ہوا جنگلی چوپائے اور پرندے بکثرت مسلمانوں کی فرودگاہوں میں گھس آتے تھے جن کی نظیر کبھی دیکھنے میں نہیں آئی لیکن لوگ احرام باندھے ہوئے تھے اللہ نے ان کو شکار کرنے سے منع کر دیا یہ بڑا امتحان لیا تھا کہ کون اللہ سے بن دیکھے ڈرتا ہے اور اس کے حکم کی تعمیل کرتا ہے۔

شکار نہیں قرار دیا جاسکتا۔
صحیحین میں حضرت ابن عمرؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ سے دریافت کیا گیا محرم کن جانوروں کو قتل کر سکتا ہے فرمایا ان (مندرجہ ذیل) جانوروں کو (بحالت احرام) قتل کرنے میں کوئی گناہ نہیں ہے۔ بچھو، چوہا، کوا، چیل، کٹ کھنا کتا۔ صحیحین میں حضرت عائشہؓ کی روایت میں بھی انہی پانچ کا ذکر ہے۔ ابن جوزی نے لکھا ہے کہ کلب سے مراد درندہ ہے۔ کلب کا اطلاق عام درندہ پر ہوتا ہے۔ عتیبہ بن ابی لہب کے قصہ میں رسول اللہ ﷺ نے دعا کی تھی الٰہی اپنے کتوں میں سے کسی کتے کو (یعنی کسی درندہ کو) اس پر مسلط فرمادے (چنانچہ عتبہ کو شیر نے پھاڑ کھایا) اللہ نے فرمایا ہے مِنَ الْجَوَارِحِ مُكَلِّبِيْنَ۔
امام ابو حنیفہؒ نے فرمایا اگر لغتہً لفظ کلب کا اطلاق ہر درندہ پر تسلیم بھی کرلیا جائے تب بھی عرفاً اس لفظ کا غالب استعمال صرف کتے ہی کے لئے ہوتا ہے اور حدیث مذکور بالا (یعنی جس حدیث میں پانچ جانوروں کو قتل کرنے کی اجازت ہے) کو عرف عام پر محمول کرنا اولیٰ ہے (لہٰذا کلب سے مراد کتا ہی ہے ہر درندہ مراد نہیں ہے) ابو عوانہ نے حضرت عائشہؓ کی روایت سے چھ جانوروں کا ذکر کیا ہے۔ سانپ کا ذکر مزید ہے۔ یہ روایت بطریق بخاری ہے۔ ابو داؤد نے حضرت ابو سعید خدریؓ کی روایت سے لکھا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا محرم سانپ کو، بچھو کو، چوہے کو، کٹ کھنے کتے کو، چیل کو اور عادی درندہ کو قتل کرسکتا ہے۔ کوے کو قتل نہ کرے کوئی باعث پتھر اس پر پھینک سکتا ہے۔ ترمذی نے بھی یہ حدیث نقل کی ہے مگر اس روایت میں عادی درندہ کا ذکر نہیں ہے۔
حسن نے کہا جس کوے کو قتل کرنے کی ممانعت ہے اس سے مراد کھیتی کا کوا ہے۔ ابن خزیمہ اور ابن المنذر نے حضرت ابوہریرہؓ کی روایت سے جو حدیث نقل کی ہے اس میں سات جانوروں کا ذکر ہے۔ پانچ وہی مشہور اور دو مزید یعنی بھیڑیا اور چیتا کما ہے۔ سعید بن مسیب کی مرسل روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا محرم سانپ اور بھیڑیئے کو قتل کردے۔ یہ روایت ابن ابی شیبہ اور سعید بن منصور اور ابو داؤد نے نقل کی ہے اور اس کے راوی ثقہ ہیں۔ مسلم نے حضرت عائشہؓ کی روایت سے صرف چار کا ذکر کیا ہے مشہور پانچ میں سے بچھو کا ذکر ساقط کر دیا ہے۔

ایک شبہ

امام ابو حنیفہؒ کے نزدیک حدیث احاد سے حکم قرآن کی تخصیص جائز نہیں (یعنی اگر حکم قرآن عام ہو گا اور حدیث نے اس میں کچھ تخصیص کی ہو گی تو امام ابو حنیفہؒ کے نزدیک تخصیص نہیں ہو گی) پھر اس جگہ قرآن میں لفظ صید عام ہے حدیث احاد سے اس کی تخصیص کس طرح جائز ہو گی۔

جواب

اس حدیث کو تمام علمائے امت نے صحیح مانا اور قبول کیا ہے اس لئے اس کا مرتبہ حدیث مشہور کی طرح ہو گیا اور حدیث مشہور سے تخصیص قرآن جائز ہے یا یوں کہا جائے کہ باجماع صحابہ یہ بات تو ثابت ہے کہ بعض قسم کے شکار محرم قتل کر سکتا ہے گویا قرآن مجید کا لفظ صید عام ہے مگر مخصوص منہ البعض اور اس بعض مخصوص کی تعیین احادیث سے ہو گی۔ امام شافعیؒ اور امام احمدؒ کے نزدیک جس جانور کا گوشت کھانا حلال ہے اس کو محرم قتل نہیں کرسکتا اور جس جانور کا گوشت حلال نہیں اس کو قتل کرسکتا ہے، ممانعت صرف ماکول اللحم صید کو قتل کرنے کی ہے۔ کیونکہ احادیث میں کچھ جانوروں کی حکم حرمت سے تخصیص کی گئی ہے۔ جن میں سے کچھ تو شکاری درندے ہیں کچھ ہلاک کر دینے والے کیڑے کوڑے ہیں، کچھ ایسے پرندے ہیں جو درندے اور شکاری نہیں ہیں (جیسے چیل، کوا) مگر گوشت ان کا بھی ناپاک (حرام) ہے اس پر غور کرنے سے ہم کو معلوم ہوا کہ خبیث اللحم ہونا جواز صید کی علت ہے لہٰذا تخصیص بالحدیث کرنے کے بعد ہم نے علت قیاسیہ نکال کر قیاس سے حکم جواز انہی جانوروں پر محدود کر دیا جو خبیث اللحم ہیں (اور آیت کا حکم حرمت اس شکار پر محدود ہو گیا جو ماکول اللحم ہے)۔

میں کہتا ہوں خبیث لحم کو جواز قتل کی علت قرار دینا ہی غلط ہے کیونکہ گوشت کی ناپاکی کی وجہ سے اباحت قتل کسی مصلحت پر مبنی نہیں ہو سکتی (گوشت کی ناپاکی یا پاکی محرم کے لئے شکار کا جواز یا عدم جواز نہیں پیدا کر سکتی) اس لئے قیاس ہی جائز نہیں ہے۔

میرے نزدیک قابل قوی وہ قول ہے جس کو صاحب بدائع نے اختیار کیا ہے کہ صحرائی جانور کچھ ماکول ہوتے ہیں (یہ تو سب صید ہیں ان کو بحالت احرام شکار کرنا حرام ہے) اور کچھ غیر ماکول۔ غیر ماکول کچھ ایسے ہوتے ہیں کہ انسان کو ابتدائی طور پر دکھ پہنچانے والے ہیں کچھ ایسے نہیں ہوتے ابتدائی دکھ پہنچانے والے، غیر ماکول جانوروں کو قتل کرنا جائز ہے جواز صید کی علت مرجحہ ابتدائی اذیت رسانی ہے (یعنی جو جانور عموماً ابتدائی طور پر اذیت رساں ہوتے ہیں ان کو بحالت احرام قتل کرنا درست ہے) ایک روایت میں امام ابو یوسف کا بھی یہی قول آیا ہے کذا فی فتاوی قاضی خاں۔

ایذاء کی صورتیں مختلف ہوتی ہیں (۱) بدن میں زہر پہنچانا جیسے بچھو کرتا ہے، اس صفت میں عقرب (بچھو) کے تحت تمام زہریلے جانور جو ڈنک مارتے اور ڈستے ہیں آگئے۔ (۲) کترنا، سوراخ کرنا۔ جیسے چوہا کرتا ہے چوہے کے تحت اس علت کی وجہ سے نیولا آگیا ہے۔ (۳) جھپٹا مارنا جیسے کوا اور چیل جھپٹا مار کر لے جاتے ہیں۔ اس علت کی وجہ سے شکرا، باز، شاہین وغیرہ چیل کوے کے ذیل میں آگئے۔ (۴) حملہ کرکے کاٹنا اس مناسبت سے کٹ کھنے کتے کے تحت ہر درندہ آگیا۔ پالتو بلا چونکہ جنگلی جانور نہیں ہے اس لئے امام صاحبؒ کے نزدیک وہ صید میں داخل نہیں ہے۔ صحیح یہ ہے کہ بلا تو بلا بھی اصلاً جنگلی جانور ہی ہے اس کا پالتو ہونا عارضی ہے اس کے برخلاف وہ چوپائے ہیں جو خلقۃً تو پالتو ہیں لیکن کبھی بھاگ کر جنگلی بن جاتے ہیں (جیسے کوئی گائے بھینس گھوڑا بیل جنگلی بن جاتا ہے) اس کا شمار جنگلی جانوروں میں نہیں ہو سکتا۔

مسئلہ :- شکاری کو اشارہ سے شکار بتانا یا ایسی حرکت کرنا جس سے شکاری شکار کو دیکھ لے باجماع علماء قتل کے حکم میں ہے۔ شکار کا جانور جنگلی ہونے اور آنکھوں سے دور رہنے کی وجہ سے قتل ہونے سے محفوظ ہوتا ہے لیکن اشارہ کرنے والے کے اشارہ کی وجہ سے اس کا امن سے رہنا ختم ہو جاتا ہے اس لئے اشارہ بھی قتل کا حکم رکھتا ہے۔ صحیحین کی حدیث ہے کہ سب صحابہؓ نے احرام باندھا ہوا تھا حضرت ابو قتادہؓ محرم نہ تھے اثناء سفر میں لوگوں نے ایک گورخر دیکھا اور ابو قتادہ نے حملہ کرکے اس کو قتل کر دیا اور ذبح کرکے اس کا گوشت لائے اور سب نے وہ گوشت کھایا۔ اس حدیث کے آخر میں ہے کہ صحابہؓ جب رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے تو آپؐ نے دریافت فرمایا کیا تم میں سے کسی نے ابو قتادہ کو حملہ کرنے کیلئے کہا تھا یا گورخر کی طرف اشارہ کیا تھا، صحابہؓ نے عرض کیا جی نہیں۔ فرمایا تو جو گوشت باقی رہ گیا ہے اس کو (بھی) کھا سکتے ہو۔ اس حدیث میں رسول اللہ ﷺ نے کھانے کے جواز کے لئے اشارہ نہ کرنے کی شرط لگائی (جس سے معلوم ہوا کہ محرم کے لئے شکار کی طرف اس طرح اشارہ کرنا کہ غیر محرم کو معلوم ہو جائے اور وہ شکار کرلے جائز نہیں ہے)۔

مسئلہ :- پرندے کے انڈوں کا حکم بھی شکار کا ہے۔ داؤد ظاہری کے نزدیک انڈوں کو توڑنے کا کچھ ضمان نہیں۔ اب آگے حدیث اور قول صحابہ ذکر کریں گے جن سے ثابت ہو رہا ہے کہ انڈوں کو توڑنے کا محرم پر ضمان ہے۔

مسئلہ :- محرم نے اگر شکار کیا یا ذبح کیا تو جمہور کے نزدیک وہ مردار ہے اس کا کھانا نہ احرام والے کو جائز ہے نہ غیر محرم کو۔

ثوریؒ اور ابو ثور اور کچھ دوسرے علماء کے نزدیک اس کو کھانا جائز ہے وہ ایسا ہی ہے جیسے چور کسی چوری کے جانور کو ذبح کر دے۔ شافعیہ کا قول بھی یہی ہے۔ ہماری دلیل یہ ہے کہ محرم کا ذبح کرنا ہی گناہ ہے یہ ایسا ہی ہے جیسے کوئی قصداً ذبح کے وقت اللہ کا نام نہ لے لہٰذا محرم کا ذبیحہ ایسا ہی ہو گا جیسے غیر اللہ کے نام کا ذبیحہ۔ چوری کی حالت اس سے غیر ہے چور اپنے سے چوری کے جانور کو ذبح کرتا ہے، ذبح میں کوئی خرابی نہیں لیکن چونکہ اس جانور سے دوسرے شخص کے حق کا تعلق ہے اس لئے ذبیحہ صحیح ہونے کے باوجود حق غیر کا ضمان دینا پڑے گا اور اس طرح حق غیر کی تلافی ہو جائے گی۔

مسئلہ :۔ اگر غیر محرم نے شکار کیا مگر محرم نے اس کو شکار کرنے کو کہا تھا یا اشارہ کیا تھا یا کسی حرکت سے رہنمائی کی تھی تو محرم کے لئے اس کا کھانا حرام ہے۔ حضرت ابوقتادہؓ والی حدیث ہم اوپر نقل کر چکے ہیں۔ لیکن غیر محرم کے لئے اس کو کھانا جمہور کے نزدیک حلال ہے۔

وَمَنْ قَتَلَهُ مِنْكُمْ (اور تم میں سے (یعنی احرام بند مسلمانوں میں سے) جس نے شکار کو قتل کر دیا)۔

مُتَعَمِّدًا (جان بوجھ کر) سعید بن جبیر، داؤد، ابو ثور اور ابو منذر و شافعی کا قول ہے اور ایک روایت میں امام احمدؒ کا بھی یہی قول آیا ہے کہ متعمداً کی شرط اس بات پر دلالت کر رہی ہے کہ اگر غلطی سے یا اپنے احرام کو بھول کر یا کسی کے جبر کرنے سے یا اسی قسم کے کسی اور عذر کی وجہ سے محرم نے شکار کو قتل کر دیا تو مندرجہ آیت ضمان اس پر واجب نہ ہوگا۔ مجاہد اور حسنؒ کا قول ہے کہ مندرجہ آیت ضمان اس وقت واجب ہوگا جب قتل قصداً نہیں بلا بوجھ کر کیا ہو اور اپنے احرام کو بھول گیا ہو لیکن اگر احرام کی حالت بھی پیش نظر ہو اور جانتا ہو کہ میں محرم ہوں تو اس کا کوئی کفارہ نہیں۔ ضمان ادا کرنے سے جرم کی تلافی نہیں ہو گی ایسے آدمی کا معاملہ اللہ کے سپرد رہے گا (خواہ وہ آخرت میں عذاب دے یا رحمت سے معاف فرما دے)۔

جمہور علماء اور چاروں امام قائل ہیں کہ مندرجہ آیت پاداش بہرحال واجب ہے خواہ قصداً قتل کیا ہو یا اپنے احرام کو بھول کر قتل کیا ہو یا غلطی سے مارا ہو یا حرمت نہ معلوم ہو یا کسی حالت میں شکار کیا ہو یا کسی کے اکراہ سے ایسا کیا ہو۔

زہریؒ نے کہا قصداً قتل کرنے والے پر پاداش کا وجوب قرآن سے ثابت ہے اور غلطی سے قتل کرنے والے پر وجوب حدیث میں موجود ہے اور مفہوم مخالف حنفیہ کے نزدیک حجت نہیں ہے (یعنی مُتَعَمِّدًا کے لفظ سے یہ مفہوم اخذ کرنا کہ جس نے قصداً نہ قتل کیا ہو اس پر پاداش واجب نہیں۔ حنفیہ کے نزدیک قابل تسلیم نہیں ہے) اور جو لوگ مفہوم مخالف کے قائل ہیں ان کے نزدیک بھی مفہوم مخالف ایک ظنی دلیل ہے اور حدیث کی صراحت (خواہ وہ بھی ظنی کی حیثیت رکھتی ہو مگر) مفہوم مخالف کی حیثیت سے زیادہ قوی ہے (اس لئے حدیث میں جو غلطی سے قتل کرنے والے کے لئے پاداش کو واجب قرار دیا ہے اسی پر عمل کیا جائے گا) پھر اجماع تو سب سے قوی دلیل ہے (اور غلطی یا بھول کے قتل کو موجب جزا اجماع نے قرار دیا ہے) کیونکہ اجماع دلیل قطعی ہے (ظنی نہیں ہے)۔

ابن جوزی نے حضرت جابرؓ کی روایت کردہ حدیث سے استدلال کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ سے بجو (کو قتل کرنے) کا مسئلہ دریافت کیا گیا۔ آپ نے فرمایا وہ شکار ہے اگر محرم بجو کو قتل کر دے تو حضور ﷺ نے اس کی پاداش میں ایک مینڈھے کی قربانی واجب قرار دی۔ (رواہ الترمذی) ترمذی نے اس روایت کو صحیح قرار دیا ہے جو لوگ حکم جزاء کو مطلق قرار دیتے ہیں ان کے نزدیک مُتَعَمِّدًا کی قید (احترازی نہیں ہے بلکہ) آئندہ آیت وَمَنْ عَادَ فَيَنْتَقِمُ اللّٰهُ مِنْهُ کی تمہید ہے۔

مسئلہ :۔ اگر کوئی شخص شکار کرنا چاہتا ہو اور کوئی محرم اس کو زبان سے یا ہاتھ کے اشارہ سے شکار بتا دے اور وہ قتل کر دے تو امام ابو حنیفہؒ اور امام احمدؒ کے نزدیک بتانے والے محرم پر پاداش عائد ہو گی۔ امام شافعیؒ اور امام مالکؒ کے نزدیک بتانے والا گناہگار ہوگا پاداش اس پر عائد نہ ہو گی جیسے کوئی شخص کسی روزہ دار کو کسی عورت کی طرف زبان یا اشارہ سے رہنمائی کرے اور روزہ دار اس سے جا کر جماع کر لے تو بتانے والے پر کفارہ نہیں پڑے گا۔ روزہ دار کے جماع کرنے سے بتانے والے کا روزہ نہیں ٹوٹے گا۔ بس بتانے والا گناہگار ضرور ہوگا بتانا قتل نہیں ہے اور کفارہ قاتل پر عائد ہوتا ہے۔

ہم کہتے ہیں بتانا درحقیقت قتل ہی ہے اور رسول اللہ ﷺ نے اشارہ کو قتل کے مساوی قرار دیا ہے جیسا کہ ابوقتادہؓ والی حدیث سے ظاہر ہے پھر ایک بات یہ بھی ہے کہ اگر بتانے والے پر پاداش عائد نہیں کی جائے گی تو بتانے کا گناہ بتانے والے پر باقی رہے گا۔ کیونکہ بتانا باجماع امت ممنوع ہے اور قتل کا گناہ کفارہ سے دور ہو جاتا ہے اس صورت میں قتل سے زیادہ بتانے کا گناہ قرار پائے گا (جو بداہت کے خلاف ہے)۔

ایک شبہ

کر جانا قتل کے مساوی ہے تو بھاگ جانے کے بعد مرنے والے پر پاداش کا وجوب ہونا چاہئے خواہ بھاگ جانے کے بعد شکاری شکار کو قتل کرے یا نہ کرے۔

جواب

بھاگنا قتل کا سبب ہے جیسے تیر مارنا قتل کا سبب ہے لیکن صرف تیر مارنا موجب پاداش نہیں جب تک شکار مارا نہ جائے اسی طرح بھاگ جانے کے بعد اگر شکار قتل نہ کیا جائے تو موجب پاداش نہیں کیونکہ جب تک قتل نہ ہوگا بھاگ جانے کو سبب قتل نہیں کہا جا سکتا ہے نہ تیر پھینکنے کو۔

فَجَزَآءٌ مِّثْلُ مَا قَتَلَ مِنَ النَّعَمِ (تو اس پر پاداش واجب ہے برابر اس جانور کے جس کو اس نے قتل کیا ہے)۔ جزاءٌ پر فاء اس لئے لایا گیا کہ جملہ معنی شرط کو متضمن ہے یعنی اس پر پاداش واجب ہے۔ امام ابو حنیفہؒ اور امام ابو یوسفؒ کے نزدیک قربانی کا جانور قیمت میں شکار کے برابر ہونا چاہئے (یعنی مثل معنوی مراد ہے) کیونکہ مطلق مثل تو وہی ہوتا ہے جو صورت اور حقیقت دونوں میں مثل ہو یعنی قربانی کا جانور شکار کا ہم نوع ہو اور یہ بالاجماع مراد نہیں ہے۔ لامحالہ مثل معنوی ہی مراد ہو گا یعنی جو قیمت میں شکار کے برابر ہو۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ بعض قسم کے شکار کی تو بالاجماع قیمت ہی کا حساب لگانا ضروری ہے مثلاً اس جانور کا شکار کیا ہو جس کا وجود گائے، بھینس، بکری، مینڈھے وغیرہ میں سے کوئی مثل نہ ہو یا کبوتر سے چھوٹا ہو مثلاً چڑیا وغیرہ ہو لہٰذا مثل معنوی مراد لینا ہی ضروری ہے ورنہ (اگر بعض اقسام میں مثل معنوی اور بعض اقسام میں مثل صوری مراد لیا جائے گا تو) ایک وقت میں ایک لفظ کا حقیقی اور مجازی دونوں معنی مراد لینا یا عموم مشترک مراد لینا لازم آئے گا (یعنی اگر لفظ مثل کو صوری اور معنوی مثلیت میں مشترک قرار دیا جائے گا اور اس لفظ کو ایک ایسے معنی کے لئے موضوع مانا جائے گا جو صوری و معنوی دونوں کے درمیان مشترک ہے اور دونوں معنی بیک وقت مراد لئے جائیں گے تو عموم اشتراک مراد لینا پڑے گا یا اگر مثل صوری کو حقیقی اور مثل معنوی کو مجازی معنی کہا جائے گا اور دونوں معنی بیک وقت مراد ہوں گے تو حقیقت و مجاز کا اجتماع لازم آئے گا اور احناف کے نزدیک دونوں ناجائز ہیں)۔

ایک بات یہ بھی ہے کہ شرع میں جہاں لفظ مثل بلا قید آیا ہے اس سے مراد یا تو کلی مثل ہوتا ہے یا وہ چیز جو قیمت میں برابر ہو۔ اللہ فرماتا ہے فَمَنِ اعْتَدٰى عَلَيْكُمْ فَاعْتَدُوْا عَلَيْهِ بِمِثْلِ مَا اعْتَدٰى عَلَيْكُمْ اگر کسی نے تم پر زیادتی کی ہو تو جیسی اور جتنی زیادتی اس نے کی ہو اتنا اور ویسا ہی انتقام تم لے سکتے ہو۔ اب اگر ہلاک کردہ چیز کوئی مثلی ہے کہ اس کا نوعی مثل مل سکتا ہے تو ایسی جگہ مثل سے مراد نوعی مثل ہو گا اور نوعی مثل ممکن نہ ہو تو قیمت کے لحاظ سے مثل مراد ہو گا کیونکہ مثل کا لفظ مشترک معنوی ہے (یعنی اس کے معنی کے دو فرد ہیں نوعی اور قیمتی) اور چونکہ حیوانات میں اوصاف کے لحاظ سے تفاوت ہوتا ہی ہے خواہ ایک ہی نوع کے ہیں اس لئے بالاجماع کامل بہمہ جہت مساوات و مثلیت کا تو اعتبار ہی نہیں ہے بلکہ ایک نوع میں داخل ہونے کے باوجود قیمت کی مماثلت کا اعتبار ہے۔ پھر جہاں نوعی اشتراک بھی نہ ہو صرف ظاہری شکل کی مشابہت ہو۔ مثلاً شتر مرغ اور اونٹ کہ دونوں کی گردنیں اور ٹانگیں لمبی ہوتی ہیں یا شکل میں بھی مشابہت نہ ہو مثلاً کبوتر کو شکار کرنے کے کفارہ میں بکری کی قربانی (حاصل یہ کہ صوری مشابہت کی کوئی ضرورت نہیں خواہ ظاہری شکل میں مشابہت ہو جائے یا نہ ہو جائے اور نوعی اشتراک ہو یا نہ ہو بہرحال قیمت میں مماثلت ہونی چاہئے)۔

امام مالکؒ، امام شافعیؒ، امام احمدؒ اور امام محمدؒ کا قول ہے کہ مثل سے مراد ہے وہ پالتو چوپایا (بکری، بھیڑ، گائے، بھینس، اونٹ) جو تخلیقی طور پر (اور جسمانیت میں) شکار کے مشابہ ہو رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا تھا بجو شکار ہے اور اس کو مارنے میں ایک بکری (کی قربانی) ہے۔ (رواہ ابو داؤد بروایت عبداللہ) حاکم نے مستدرک میں اور امام احمد اور ابن حبان اور اصحاب سنن نے یہ حدیث حضرت جابرؓ کی روایت سے نقل کی ہے۔ حاکم کی روایت ان الفاظ کے ساتھ ہے کہ بجو شکار ہے اگر احرام بند شخص

نے اس کو مارا ہو تو اس کے شکار (کے کفارہ) میں ایک مینڈھا (یعنی اس کی قربانی) ہے۔ حاکم نے اس روایت کو صحیح الاسناد کہا ہے۔ امام مالکؒ نے موطا میں نیز امام شافعیؒ نے صحیح سند سے بیان کیا ہے کہ حضرت عمرؓ نے بجو کے شکار میں ایک مینڈھا اور ہرن کے شکار میں بکری (بطور کفارہ قربانی کرنے) کا فیصلہ کیا تھا۔

امام شافعی اور بیہقی نے بیان کیا ہے کہ حضرت عثمانؓ بن عفان ... نے بھی ... کے شکار کے عوض بکری کا ... قربانی کرنے کا فیصلہ کیا۔ بیہقی کا بیان ہے کہ حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا محرم کا کبوتر شکار کرنے میں ایک بکری ہے اور انڈوں ... میں ایک درہم اور شتر مرغ کے شکار میں ایک اونٹ ہے اور [illegible] گدھا یا جنگلی گائے کے شکار میں ایک گائے ذکر فرمایا۔

ایک دلیل مالکیہ اور شوافع کی یہ ہے کہ اللہ نے آگے مِنَ النَّعَمِ فرمایا ہے نعم سے مراد ہیں اونٹ یا گائے یا بکری یہ مثل کی صفت ہے اور ظاہر ہے کہ قیمت چوپایا نہیں ہوتی (اس لئے مثل سے مراد قیمت نہیں ہو سکتی) حنفیہ نے مالک و شافعی کے استدلال کا یہ جواب دیا ہے کہ مثلیت کے جو واقعات رسول اللہ ﷺ کے فرمان اور صحابہؓ کے آثار میں بیان کئے گئے ہیں ان میں ظاہر شکل کی مشابہت کو دخل نہیں صرف قیمت کا اعتبار کیا گیا ہے۔ رہا مِنَ النَّعَمِ کے لفظ سے استدلال تو یہ بھی غلط ہے مِنَ النَّعَمِ ومثل کی صفت نہیں ہے بلکہ قَتَلَ کا مفعول محذوف ہے ضمیر مفعول سے مِنَ النَّعَمِ حال ہے یعنی مقتول شکار اگر چوپایوں میں سے ہو مطلب یہ کہ اگر مقتول چوپایہ ہو تو اس کی مثل دینا واجب ہے لفظ نعم کا اطلاق جیسے پالتو چوپایوں پر ہوتا ہے اسی طرح جنگلی چوپایوں پر بھی ہوتا ہے۔ کذا قال ابو عبیدہؒ صاحب قاموس نے بھی یہی لکھا ہے۔

حنفیہ کی اس تفسیر پر یہ اعتراض ہو سکتا ہے کہ کلام کا مقصود تو ہر شکار کی پاداش کا وجوب ہے خواہ شکار چوپایہ ہو یا پرندہ اگر ضمیر مقتول سے مِنَ النَّعَمِ کو حال کہا جائے گا تو پھر پاداش کا وجوب چوپایا کو شکار کرنے کے ساتھ مخصوص ہو گا اور یہ مقصود کے خلاف ہے۔

میرے نزدیک صحیح تفسیر یہی ہے کہ مِنَ النَّعَمِ، مثل کی صفت ہے اور مثل سے مراد وہ پالتو چوپایہ ہے جو قیمت میں شکار کی مثل ہو بعض اوصاف میں مماثلت مراد نہیں ہے۔ شکار کرنے والا محرم اگر جرم کے کفارہ میں قربانی دے تو پالتو چوپایوں میں سے جس کی قیمت شکار کے برابر یا شکار سے زائد ہو اسکی قربانی کرے۔ گو کہ بیل گائے اور ہر وہ شکار جس کی قیمت بکری کی قیمت سے زائد ہو۔ گائے کی قربانی کرنا چاہئے خواہ شکار کی قیمت بکری سے تو زائد ہو مگر گائے کی قیمت سے کم ہو اور گائے میں کوئی شرط نہیں کہ بہت بڑھیا ہو یا گھٹیا مگر اتنی گھٹیا بھی نہ ہو کہ اس کی قیمت شکار کی قیمت سے بھی کم ہو اور اگر شکار کی قیمت گائے سے زائد ہو تو اونٹ کی قربانی کرنا چاہئے۔ خواہ شکار کی قیمت گائے کی قیمت سے زائد ہونے کے باوجود اونٹ کے برابر نہ ہو۔ اور اگر شکار اونٹ سے بھی زائد قیمتی ہو تو ایک اونٹ اور ایک بکری یا ایک گائے اور ایک بکری یا ایک اونٹ اور ایک گائے یا دو اونٹ یا دو گائے یا دو بکریاں۔ غرض شکار جتنا قیمتی ہو اس کی قیمت کا لحاظ کر کے قربانی کرے۔ شکار کی قیمت سے کم نہ ہونا چاہئے۔

اگر شکار کی قیمت اس بکری کی برابر ہو جس کی قربانی جائز ہے (یعنی ناک، کان، آنکھ، ہاتھ پاؤں، دم سب سالم ہر طرح سے بے عیب اور شریعت کی قائم کردہ معیار عمر کے مطابق) تو ایسی ہی بکری کی قربانی دے جس کی قربانی جائز ہے۔

اگر شکار کی قیمت پوری بکری کی قیمت سے کم ہو، مثلاً بجو، جنگلی چوہا، ہرن، خرگوش، گوہ، مرغی وغیرہ تو بکری کے بچے مختلف عمر کے (جیسے شکار کی قیمت ہو) قربانی میں پیش کرے لیکن بکری کے بچے ایسے ہوں کہ ان کی قیمت شکار کی قیمت کم نہ ہو کبوتر اور کبوتر سے کم درجہ کے شکار کے عوض اگر قربانی دینا چاہے تو بکری کی قربانی دے مگر بکری ایسی ہو جس پر لفظ بکری کا اطلاق ہو سکتا ہو (یعنی نہ بے عیب کی شرط ہے نہ کسی عمر کی نہ تندرست کی) امام ابو یوسفؒ کا یہی قول ہمارے نزدیک قابل فتویٰ ہے اور جمہور کے مسلک کے مطابق بھی ہے کیونکہ کفارہ کی قربانی میں جمہور کے نزدیک ایسا جانور ہونے کی شرط نہیں ہے کہ اس کی قربانی بھی جائز ہو۔ مگر امام صاحبؒ کے نزدیک کفارہ کی قربانی ایسی ہونی چاہئے جس کی قربانی شرعاً درست ہو اس لئے جس شکار کی قیمت بکری سے کم ہو مثلاً بجو، خرگوش، اس کے کفارہ کے لئے ایسی بکری ہونی ضروری ہے جس کی قربانی جائز ہو۔

امام مالکؒ کا قول ہے کہ شکار چھوٹا ہو یا بڑا صحیح سالم ہو یا عیب دار، بہر حال کفارہ کی قربانی میں اس جانور کو دینا صحیح ہو گا جس کی قربانی شرعاً درست ہے (یعنی مقرر کردہ معیار عمر کے مطابق تندرست، بے عیب)۔

امام اعظمؒ اور امام مالکؒ کے قول کی دلیل یہ ہے کہ (لفظ) ہدی (مطلق ہے اور مطلق کا رجوع کامل کی طرف ہوتا ہے اور ہدی کامل وہی ہے جس کی قربانی درست ہو بھی لئے ہدی تمتع میں اور حج کے دوران ان تمام جرائم کے کفارہ میں جن میں قربانی ضروری ہے صرف وہی قربانی دیا جائز ہے جس کی قربانی شرعاً درست ہو۔ ہماری (یعنی جمہور کی) دلیل یہ ہے کہ صحابہؓ نے بکری کا چھوٹا بچہ واجب قرار دیا ہے اور چھوٹے بچے کی قربانی شرعاً درست نہیں ہے) پھر آیت میں لفظ ہدی مطلق نہیں ہے کہ فرد کامل کی طرف رجوع کیا جائے جیسا کہ ہدی تمتع وغیرہ میں ہوتا ہے بلکہ ہدیاً سے وہ ہدی مراد ہے جو مقتول چوپایہ کی مثل ہو خواہ صورت میں مماثلت ہو جیسا کہ امام شافعیؒ کا قول ہے یا قیمت میں برابری ہو جیسا کہ احناف کا قول ہے۔ لہٰذا قربانی کے قابل جانور ضروری قرار دینے کی کوئی وجہ نہیں۔

ہم نے آیت کی جو تفسیر کی ہے اس سے صحابہؓ کے اقوال کا ٹکراؤ نہیں ہوتا۔ صحابہؓ نے خرگوش کے معاوضہ میں بھیڑیے کو قرار دیا تھا اور بھیڑیے کی قیمت خرگوش کی قیمت کے برابر ہوتی ہے اور چونکہ اونٹ اور گائے میں سب سے کم درجہ کی قربانی بکری ہے اور بکری (یعنی اس کے بچہ) کی قیمت بھی کبوتر کے قریب ہے (یعنی گائے اور اونٹ کی قیمت کبوتر کی قیمت سے بہت زیادہ ہوتی ہے بکری کی قیمت اتنی زائد نہیں ہوتی) اس لئے کبوتر کے عوض بکری کی قربانی کو قرار دیا رہا جسمانی مماثلت کا فقدان تو جسمانی مماثلت کی ضرورت پر کوئی دلیل نہیں۔

بیہقی نے عطاء خراسانی کی روایت سے جو حضرت عمرؓ، حضرت عثمانؓ، حضرت علیؓ، حضرت زید بن ثابتؓ، حضرت ابن عباسؓ اور حضرت معاویہؓ کے اقوال بیان کئے ہیں کہ محرم اگر شتر مرغ کا شکار کرلے تو کفارہ میں اونٹ کی قربانی دی جائے اور امام مالک نے ابو عبیدہ بن عبداللہ بن مسعودؓ کا قول بیان کیا کہ میرے باپ کا تحریری قول یہی ہے۔ امام مالک نے یہ بھی فرمایا میں برابر سنتا رہا ہوں کہ شتر مرغ کے عوض اونٹ کی قربانی ہے اور یہ بالکل ظاہر ہے کہ شتر مرغ کے عوض اونٹ کی تعیین صرف جسمانی مشابہت یعنی لمبی گردن اور لمبی ٹانگیں ہونے کی وجہ سے کی گئی قیمت کو اس تعیین میں کوئی دخل نہیں ہے۔

یہ آثار ضعف اور انقطاع سے خالی نہیں ہیں (اس لئے نا قابل استدلال ہیں) کہ امام شافعیؒ نے کہا یہ روایت علماء حدیث کے نزدیک ثابت نہیں۔ مہ قیاس اسی کا متقاضی ہے کہ ہم شتر مرغ کا عوض اونٹ کو قرار دیں۔ اور یہ بھی ممکن ہے کہ بعض قسم کے شتر مرغ بعض زمانوں میں اونٹ کی برابر قیمت رکھتے ہوں اسی لئے بعض صحابہؓ نے شتر مرغ کا عوض اونٹ کو قرار دیا اور صحابہؓ کے بعد آنے والے لوگوں نے خیال کر لیا کہ صحابہ نے شتر مرغ کا عوض اونٹ کو صرف جسمانی مشابہت کی وجہ سے قرار دیا پھر تابعین کے اس خیال کی اتنی شہرت ہوئی کہ امام مالک نے فرمایا میں برابر سنتا رہا ہوں کہ شتر مرغ کے عوض اونٹ کی قربانی ہے۔

ایک شبہ

بیہقی نے عکرمہ کی روایت سے لکھا ہے کہ ایک شخص نے حضرت ابن عباسؓ کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کیا میں نے حالت احرام ایک خرگوش مار دیا آپ کا میرے متعلق کیا حکم ہے۔ حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا خرگوش چار ہاتھ پاؤں سے چلتا ہے اور بکری کا بچہ بھی چار ہاتھ پاؤں سے چلتا ہے۔ خرگوش جگالی کرتا ہے بکری کا بچہ بھی جگالی کرتا ہے۔ خرگوش پتیاں کھاتا ہے بکری کا بچہ بھی سبزی کھاتا ہے لہٰذا خرگوش کے عوض تم بکری کے بچے کی قربانی دو۔ یہ صاف ظاہر ہے کہ حضرت ابن عباسؓ نے ظاہری مشابہت کا اعتبار کیا۔ ابن ابی شیبہ نے عطاء کا قول نقل کیا ہے کہ ایک شخص نے ایک کبوتر اور دو کبوتر کے چوزوں کو حجرہ کے اندر بند کر دیا پھر عرفات اور منیٰ چلا گیا واپس آیا تو دیکھا تینوں مر چکے ہیں وہ شخص حضرت ابن عمرؓ کی خدمت میں حاضر ہوا اور واقعہ عرض کیا آپ نے تینوں بکریوں کی قربانی لازم قرار دی اور آپ کے ساتھ ایک اور شخص نے بھی یہی فیصلہ کیا (کیونکہ قرآنی آیت میں مثلیت کی جو شرط ہے اس کو مسلمانوں کی رائے کو ضروری قرار دیا ہے)۔

ثوری، ابن ابی شیبہ، شافعیؒ اور بیہقی نے حضرت ابن عباسؓ کی حدیث بھی اسی جیسی نقل کی ہے۔ اس سے ثابت ہوتا ہے

کہ کبوتر کے عوض بکری کی قربانی کا وجوب قیمت کی یکسانی کے لحاظ سے نہیں ہے ورنہ دو چوزوں یا ایک کبوتر کے عوض ایک بکری بھی واجب نہ ہوتی بلکہ اس سے زائد کبوتروں کے لئے ایک بکری کافی ہو جاتی۔

جواب

ہم کہتے ہیں بعض آئمہ صحابہؓ بے شک دلالت کر رہے ہیں کہ صورت و جسمانیت کا لحاظ رکھا گیا ہے لیکن یہ بات صحابہؓ کی رائے پر مبنی ہے کسی روایت (یعنی حدیث) پر اس کی بنا نہیں اور جب قرآنی آیت کی مخالفت ہو رہی ہے تو کوئی وجہ نہیں کہ بعض صحابہ کی رائے مانی جائے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے اور یہ یقینی امر ہے کہ بطخ شتر مرغ کی مثل نہیں نہ بکری کبوتر کی مثل ہے جسمانی ہیئت اور صورت میں نہ حقیقت میں۔ اگر بعض اوصاف میں مشابہت بھی ہے تو ایسی مشابہت ہے جو ناقابل اعتبار ہے نہ عرف میں اس کا اعتبار ہے نہ لغت میں ورنہ تمام حیوانات باہم مثل ہو جائیں گے کیونکہ کسی نہ کسی صفت میں تو ہر ایک کو دوسرے سے مشابہت ہوتی ہی ہے۔

يَحْكُمُ بِهِ ذَوَا عَدْلٍ مِّنكُمْ (جس کا فیصلہ تم میں سے دو معتبر شخص کر دیں) یعنی بار اثر کا قصد یا مثل ہونے کا فیصلہ دو معتبر مسلمان کر دیں۔ اکثر حنفیہ قائل ہیں کہ مثل ہونے کی جانچ کے لئے ایک شخص کا فیصلہ بھی کافی ہے۔ حضرت صحابہؓ نے انفرادی فیصلے کئے ہیں یا یہ انفرادی فیصلے روایات میں آئے ہیں اگر دو کا اجتماعی فیصلہ ہو تو زیادہ اچھا ہے تاکہ غلطی سے بخوبی احتیاط ہو جائے۔

امام شافعیؒ اور جمہور علماء کے نزدیک فیصلہ کے لئے تعداد یعنی دو ہونا بھی ضروری ہے اور دونوں کا صالح ہونا بھی۔ فتویٰ بھی اسی پر ہونا چاہئے ظاہر آیت کا بھی یہی تقاضا ہے اور عمل صحابہ بھی اسی کا شاہد ہے۔[1]

امام مالکؒ نے محمد بن سیرین کی روایت سے لکھا ہے کہ ایک شخص نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے ہرن کو شکار کرنے کا کفارہ دریافت کیا۔ حضرت عمرؓ نے حضرت عبدالرحمٰن بن عوف سے فرمایا۔ آپ بھی آ جائیے تاکہ ہم دونوں مل کر فیصلہ کریں چنانچہ دونوں نے مل کر بکرے کی قربانی دینے کا فیصلہ کیا۔ سائل نے کہا یہ امیر المؤمنین ہیں کہ ایک ہرن کے کفارہ کا بھی خود فیصلہ نہیں کر سکتے کہ دوسرے کو فیصلہ کی شرکت کے لئے بلوایا۔ حضرت عمرؓ نے اس کا قول سن پایا اور فرمایا کیا تو سورۃ المائدہ پڑھتا ہے اس شخص نے جواب دیا نہیں۔ حضرت عمرؓ نے فرمایا اگر تو کہہ دیتا کہ سورۃ مائدہ پڑھتا ہوں تو میں تجھے دکھ کی مار دیتا۔ اللہ نے اپنی کتاب میں فرمایا ہے يَحْكُمُ بِهِ ذَوَا عَدْلٍ مِّنكُمْ۔

مسئلہ:۔ جو لوگ مثل جسمانی کے قائل ہیں ان میں خود اس کی تشریح میں اختلاف ہے امام مالکؒ قائل ہیں کہ ہر

---

[1] میمون بن مہران کی روایت ہے کہ ایک بدو حضرت ابو بکرؓ کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کیا میں نے بحالت احرام ایک شکار مار دیا ہے کیا پاداش ادا کروں۔ حضرت ابو بکرؓ نے حضرت ابی بن کعب سے دریافت کیا آپ کی کیا رائے ہے۔ بدو بولا میں آپ کے پاس آیا ہوں آپ اللہ کے رسول کے جانشین ہیں، میں آپ سے پوچھتا ہوں اور آپ دوسروں سے پوچھتے ہیں۔ حضرت ابو بکرؓ نے فرمایا کیا تم کو اللہ کے اس فرمان کا انکار ہے اللہ نے فرمایا ہے يَحْكُمُ بِهِ ذَوَا عَدْلٍ مِّنكُمْ اس حکم کی تعمیل میں میں نے اپنے ساتھی سے مشورہ لیا جب دونوں کی رائے متفق ہو جائے گی تو ہم دونوں تجھے حکم دیں گے۔

ابو بکر مزنی کی روایت ہے کہ دو آدمی احرام بند تھے ایک نے ایک ہرن کو ہنکایا اور دوسرے نے قتل کر دیا پھر دونوں حضرت عمرؓ کی خدمت میں حاضر ہوئے حضرت عمرؓ نے حضرت عبدالرحمٰن بن عوف سے ان کی رائے دریافت کی حضرت عبدالرحمٰن نے کہا میری رائے میں بکری ہونی چاہئے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا میری بھی یہی رائے ہے پھر فرمایا دونوں بکری کی قربانی دو جب دونوں واپس لوٹے تو ایک نے دوسرے سے کہا امیر المؤمنین کو جواب معلوم نہ تھا تب ہی تو اپنے ساتھی سے دریافت کیا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے یہ بات سن پائی دونوں کو بلوایا اور کہنے والے کا احتساب درہ کی ضرب سے کرتے ہوئے فرمایا بحالت احرام میں شکار بھی مارتے ہو اور شرعی فیصلہ سے آنکھیں بھی بند رکھتے ہو اللہ نے فرمایا ہے يَحْكُمُ بِهِ ذَوَا عَدْلٍ مِّنكُمْ اللہ نے فیصلہ کے لئے تنہا عمرؓ کو مقرر نہیں کیا اس لئے میں نے اپنے ساتھی سے مدد لی۔

زمانہ میں دو صالح مسلمان اس مثلیت کا جو فیصلہ کریں گے (خواہ فیصلہ صحابہؓ کے فیصلہ کے خلاف ہو کیونکہ زمانہ کے اختلاف سے مثلیت میں اختلاف ہوتا رہے گا)۔

اکثر علماء قائل ہیں کہ سلف نے اگر کسی کو کسی کے مثل قرار دیا ہے تو وہ واجب التسلیم ہے اس کے خلاف (کسی زمانہ میں) حکم نہیں دیا جاسکتا اور اگر کسی کی مثلیت کا سلف نے کوئی فیصلہ نہ کیا ہو تو دوعدل الرائے اشخاص خود فیصلہ کر سکتے ہیں اور اگر مسئلہ اجتہادی ہو تو اس میں بھی اختلاف کیا جاسکتا ہے۔ ثوری نے کہا جس مسئلہ میں سلف کا باہم اختلاف ہو اس کے متعلق ہر زمانہ میں دو عدل الرائے کا فیصلہ نافذ ہوگا (خواہ بعض اسلاف کے فیصلہ کے خلاف ہو)۔

قرآنی آیت مذکورۂ بالا تمام قول کی تردید کر رہی ہے کیونکہ اگر تخلیقی اور جسمانی مماثلت کا اعتبار کر لیا جائے تو ہر زمانہ میں جدید فیصلہ کا فائدہ ہی کیا ہے (مماثلت جسمانی ہر زمانہ میں قائم رہے گی کسی زمانہ کے اہل الرائے کی رائے مماثلت جسمانی کو بدل نہیں سکتی) اور اسلاف کے فیصلہ کو (ہر زمانہ کیلئے) واجب التسلیم قرار دینا تو اس کی تردید خود آیت کر رہی ہے دو عادل مسلمانوں کا فیصلہ ہر زمانہ میں جدا جدا ہونا چاہئے۔ اگر ایک مرتبہ کا فیصلہ ہمیشہ کیلئے ہو سکتا تو تمام یا اکثر شکاروں کے متعلق رسول اللہ ﷺ خود ہی قطعی فیصلہ فرما دیتے دو عادل مسلمانوں کے فیصلہ کی ضرورت ہی نہ ہوتی (اس سے معلوم ہوا کہ سلف کا فیصلہ خلف کیلئے حجت نہیں بلکہ ہر زمانہ میں دو عادل مسلمان مستقل فیصلہ کرنے کا حق رکھتے ہیں) اس سے ثابت ہوا کہ آیت میں مثلیت سے بلحاظ قیمت مثلیت مراد ہے جس کے اندازہ کرنے کیلئے دو عادل مسلمانوں کی ضرورت ہے اور چونکہ زمان و مکان کے اختلاف سے قیمت کا اختلاف ہوتا رہتا ہے اسلئے ہر زمانہ اور ہر مقام میں دو صاحب رائے مسلمانوں کے فیصلہ کی احتیاج لازم ہے۔

هَدْيًا بَالِغَ الْكَعْبَةِ (خواہ وہ پالتو جانوروں میں سے چوپایہ ہو جس کا نمونہ ہو بشرطیکہ) نیاز کے طور پر کعبہ تک پہنچائی جائے۔ لفظ هَدْيًا حال ہے خواہ ضمیر جزاء سے ہو یا جزاء سے یا ضمیر مثل سے یا محل کے اعتبار سے مثل سے بدل ہے۔

امام شافعی وغیرہ لفظ هَدْيًا سے اس امر پر استدلال کرتے ہیں کہ مثل سے مراد قیمت نہیں ہو سکتی کیونکہ قیمت کعبہ کو بطور نیاز نہیں بھیجی جاتی۔

لیکن ہم نے تشریح کر دی ہے کہ مثل سے مراد وہ چوپایہ ہے جس کی قیمت شکار کے برابر ہو اور اس جانور کو بطور نیاز کعبہ کو بھیجا جائے اس تشریح پر امام شافعی کا اعتراض وارد نہیں ہو سکتا۔

یہ بھی ہو سکتا ہے کہ امام اعظمؒ کے مسلک سے مراد قیمت ہی ہو اور لفظ هَدْيًا حال مقدرہ ہو یعنی وہ قیمت جو هدی بن جانے والی ہو مطلب یہ کہ اس قیمت سے کوئی جانور خرید کر بھیج دیا جائے تو (گویا) قیمت ہی هدی ہو جائے گی۔

ایک سوال :- امام اعظمؒ کی تاویل پر بعض الفاظ محذوف ماننے پڑتے ہیں یعنی مثلاً صائراً هَدْيًا کہنا پڑے گا۔

جواب :- یہ ضرورت نہیں بلکہ بقدر ضرورت مذکورہ بالا امام شافعی کے قول پر بھی تو بعض الفاظ کو محذوف ماننا پڑتا ہے کیونکہ جس وقت دو عادل مثلیت کا فیصلہ کریں گے اس وقت تو وہ جانور کعبہ کو پہنچا ہوا نہ ہوگا بلکہ آئندہ پہنچنے والا ہوگا اس لئے بوقت حکم ہدی نہیں بلکہ حکم و فیصلہ کے بعد اس جانور کو بطور نیاز کعبہ کو بھیجا جائے گا۔ بہر حال دونوں اماموں کی تشریح پر تقدیر لفظی ضروری ہے صرف محل تقدیری کا اختلاف ہے۔

مسئلہ :- کیا یہ ضروری ہے کہ جانور مکہ سے باہر خرید کر بھیجا جائے یا مکہ کے اندر ہی خرید کر قربانی کرنا کافی ہے چونکہ بَالِغَ الْكَعْبَةِ میں لفظی اضافت ہے اس لئے ظاہر لفظ کا اعتبار کر کے امام مالکؒ نے اول قول کو پسند کیا ہے اور باہر سے بھیجنے کو واجب قرار دیا ہے۔ لیکن جمہور کا قول ہے کہ باہر سے بھیجنا ضروری نہیں۔ بَالِغَ الْكَعْبَةِ کا یہ مطلب ہے کہ قربانی کے لئے حرم شرط ہے حرم سے باہر قربانی نہ ہونی چاہئے یہ مطلب نہیں کہ باہر سے خرید کر ہی بھیجی جائے اسی پر اجماع منعقد ہو چکا ہے۔ حجۃ الوداع کے قصہ میں آیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ جب مکہ میں تشریف لائے تو لوگوں سے فرمایا جس نے قربانی بھیج دی ہو وہ حج پورا کرنے سے پہلے باندھا ہوا احرام نہ کھولے اور جس نے قربانی نہ بھیجی ہو وہ کعبہ کا طواف اور صفا و مروہ کی سعی کر کے حلال

کرے اگر احرام کھول دے پھر حج کا احرام باندھے اور قربانی کرے اور جس کو قربانی کا جانور نہ ملے وہ روزے رکھے۔ اس حدیث میں صاف صراحت ہے کہ بعض صحابہ ساتھ باہر سے قربانی کا جانور نہیں بھیجا تھا بلکہ مکہ میں خریدا تھا اور جن لوگوں کو مکہ میں قربانی کا جانور نہیں ملا تھا انہوں نے روزے رکھے تھے۔ دیکھو مکہ کے اندر خریدے ہوئے قربانی کے جانور کو رسول اللہ ﷺ نے اس حدیث میں ھدی فرمایا اور صراحت فرمادی ثم لیھل بالحج ولیھد۔ اللہ نے بھی تمتع کے سلسلہ میں فرمایا ہے فَمَا اسْتَيْسَرَ مِنَ الْهَدْيِ (اس آیت میں ہر قربانی کے جانور کو ھدی فرمایا ہے خواہ اس کو باہر سے نہ بھیجا گیا ہو)۔

امام مالک نے خصوصیت سے ایک شرط لگائی ہے کہ اگر قربانی کا جانور مکہ میں خریدا ہو تو واجب ہے کہ اس کو بوقت ادائے حج عرفہ کو لے جائے (اور وہاں سے بھیجے) امام مالک کے اس قول کی کوئی دلیل نہیں۔

مسئلہ :- کیا قربانی کے جانور کا گوشت صرف مکہ کے فقراء کو تقسیم کردیا جائے۔ جمہور کے نزدیک ایسا کرنا واجب ہے کیونکہ کعبہ تک پہنچنے کی شرط بتا رہی ہے کہ حرم کے مسکینوں کو ہی تقسیم کرنا واجب ہے۔ امام ابوحنیفہؒ عموم جواز کے قائل ہیں حرم کے فقراء ہوں یا بیرون حرم کے سب کو تقسیم کرنا جائز ہے۔ آیت میں مساکین حرم کی کوئی تخصیص نہیں صرف حرم کے اندر ذبح کرنے کی شرط ہے اگر بیرون حرم ذبح کرے گا تو کافی نہ ہوگا اور ذبح کے لئے مکان کی خصوصیت خلاف قیاس ہے (لیکن آیت میں آگئی ہے لہٰذا ذبح سے آگے بڑھ کر تقسیم تک یہ حکم متجاوز نہ ہوگا جتنا آیت میں آیا ہے اسی حد پر حکم محدود رکھا جائے گا) اور گوشت کی تقسیم بہرحال ایسی عبادت ہے جو موافق عقل ہے اس سے فقراء کی پرورش ہوتی ہے جو عقلاً مستحسن ہے۔

أَوْ كَفَّارَةٌ طَعَامُ مَسَاكِينَ اس آیت میں لفظ او بتا رہا ہے کہ قصور کرنے والے کو اختیار ہے قربانی کرے (یا بطور کفارہ مسکینوں کو کھانا دیدے) یا روزے رکھے۔ شعبی اور نخعی نے کہا کہ شکار کرنے کا عوض اسی ترتیب سے لازم کیا جائے گا جس ترتیب سے آیت میں آیا ہے (اول قربانی، قربانی کا جانور نہ ملے تو طعام مساکین اور یہ بھی ممکن نہ ہو تو روزے) لیکن آیت میں لفظ او ہمارے قول کی تائید اور شعبی کے قول کی تردید کررہا ہے۔ [لہ]

مسئلہ :- یہ امر اجماعی ہے کہ کھانا قیمت کے مطابق دیا جائے گا اگر شکار کی مثل کوئی چوپایہ نہ ہوگا تو شکار کی قیمت لگا کر اس قیمت کا کھانا دیا جائے گا اور اگر شکار مثلی ہوگا تو شکار کی مثل جس چوپایہ کو قرار دیا گیا ہوگا اس چوپایہ کی قیمت لگا کر اس کا کھانا خرید کر دیا جائے گا اس وقت شکار کی قیمت کا اعتبار نہ ہوگا کیونکہ اس صورت میں شکار کی قیمت واجب نہیں ہے بلکہ شکار کی مثل چوپایہ واجب ہے کھانا دیا تو چوپایہ کے قائم مقام ہے۔ یہ قول جمہور کا ہے۔ اس قول پر کبوتر کے شکار کے عوض اگر کھانا دیا ہو تو کبوتر کی قیمت کا نہیں بلکہ ایک بکری کی قیمت لگا کر اس کا کھانا دینا ہوگا کیونکہ اصل میں وجوب نظیر کا ہے (لہٰذا نظیر کی قیمت کا کھانا دینا ہوگا) امام اعظمؒ کے نزدیک شکار کی قیمت لگا کر اس کا کھانا دینا ہوگا (مثلی اور غیر مثلی میں کوئی فرق نہیں ہے) کیونکہ (نظیر واجب نہیں بلکہ) شکار کی قیمت واجب ہے شکار کی مثل کسی چوپایہ کی قربانی کرنے کا مطلب یہ ہے کہ جس چوپایہ کی قیمت شکار کی قیمت کے برابر ہو اس کی قربانی دی جائے اگر قربانی کی قیمت زائد ہو تو اس زیادتی کا وجوب (شرعاً نہیں ہے بلکہ) تطوعاً اور خود

لہ شکار کرنے کی سزا کو ہلکا کرنے کے لئے اللہ نے مجرم کو تینوں باتوں میں سے کسی ایک کو پسند کرلینے کا اختیار دیا جیسے قسم کے کفارہ میں اختیار دیا ہے۔ یہ قول امام ابوحنیفہ اور امام ابویوسف کا ہے۔ امام محمد اور امام شافعی قائل ہیں کہ (مجرم کو بطور خود تینوں امور میں سے ایک امر کو پسند کرلینے کا اختیار نہیں ہے بلکہ ان دونوں مسلمانوں کو جو شکار کی جانچ کرنے والے ہوں یہ حق ہے کہ تینوں امور میں کسی ایک امر کی مجرم کے لئے تعیین کردیں۔ مگر آیت میں اس قول کی کوئی دلیل نہیں بلکہ آیت کا مفہوم تو یہ ہے کہ مثل سے مراد قیمت ہے اور قیمت کا اندازہ دو عادل مسلمانوں کی رائے پر موقوف ہے اور جب وہ قیمت کا اندازہ کردیں تو اب مجرم کو اختیار ہے کہ تینوں صورتوں میں سے کسی ایک صورت کو پسند کرلے اس قیمت سے قربانی کا جانور خرید کر کعبہ کو بھیج دے یا کھانا خرید کر مساکین کو دیدے یا ہر مسکین کے کھانے کے عوض ایک روزہ رکھے دو صاحب الرائے مسلمانوں کو ان تینوں میں سے کسی ایک کی تعیین کا حق نہیں ہے یہ حق تو صرف اللہ کو ہے وہ حاکم مطلق ہے اس نے تینوں صورتیں بیان فرما کر مجرم کو سہولت عطا فرمائی ہے اور یہ اس کی رحمت ہے۔

اور وہ سے یہاں کوئی اگر قربانی کرنا چاہتا ہو اور قربانی کی قیمت زائد ہو تو چونکہ قربانی کے ٹکڑے مسکین کے بانٹے (ایک آدھ جانور کی قربانی کر سکے اس لئے ضرور تا پوری قربانی دینی ہوگی لیکن اگر قربانی کرتا ہی ہے اور کھانا دینا چاہے تو کوئی ضرورت نہیں۔ پوری قربانی کی قیمت کا کھانا دلانے ہی کا التزام ہم نے توڑ دیا ہے (بلکہ قربانی کی قیمت میں سے جتنا حصہ کا کھانا دے نا چاہتا ہے شکار کی قیمت کے برابر ہو مثلاً بکری کی قیمت نہیں لگائی جانے گی بلکہ ہرن کی قیمت لگائی جائے گی مضمون تو امام ای چیز کا دیا ہو گا جس کو کافی کیا ہے تلافی کے لئے دوسری چیز کی قیمت کا اگر تلف شدہ کے تاوان میں دینے کا کوئی معنی نہیں۔

ہمارے نزدیک اور درحقیقت آیت میں او وجوب کے لئے ہے۔ جب یہ ذکر مانا ہے دیکھو اگر مجرم کے شکار کے عوض اونٹ کی قربانی کر دے تو کافی ہو گا اگر تخییر وجوب ہوتی تو بکری کے علاوہ دوسرے بڑے جانور کی قربانی تاوان جرم کے لئے کافی نہ ہوتی۔ مزید یہ کہ تخییر کا وجوب ممکن ہی نہ ہو گا جب شعبی اور زہری کی طرح تینوں امور میں ترتیب کو واجب قرار دیا جائے۔ اول قربانی اور قربانی ممکن نہ ہو تو مساکین کو کھانا دینا اور یہ بھی ممکن نہ ہو تو روزے رکھنا گویا نمبر دوم نمبر اول کی اور نمبر سوم نمبر دوم کی قضا ہو غیر معقول ہے۔ مگر ہمارے نزدیک تو ترتیب واجب ہی نہیں ہے بلکہ مجرم کو ہی ایک سزا کو پسند کرنے کا اختیار ہے اس کے کوئی ایسا جیسے کوئی شرعی دلیل ہے ایک قسم کی سزا دوسری قسم کی سزا کا بدل قرار دیا جائے

ایک شبہ

اگر ایک قسم کی سزا دوسری قسم کی سزا کا بدل نہیں ہو سکتی تو مسکینوں کی تعداد کے برابر روزوں کی تعداد کیوں واجب ہے۔

جواب

مسکینوں کی تعداد کا لحاظ روزوں کے وجوب میں تو آیت نے ہے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے۔

اَوْ عَدْلُ ذٰلِكَ صِيَامًا (یا اس (کھانے) کے مساوی روزے) عدل کا لفظ مثل ہم جنس بھی ہو ہوسکتا ہے بلکہ یعنی اور جو مثل غیر جنسی ہو وہ عدل کہا جاتا ہے۔

مسئلہ :- فی مسکین کتنا کھانا دیا جائے؟ امام شافعی کے نزدیک فی مسکین ایک مد طعام (تقریباً ایک سیر) دیا جائے۔ کفارہ صوم، کفارہ ظہار اور کفارۂ یمین میں بھی امام شافعیؒ کا یہی قول ہے۔ امام اعظمؒ کے نزدیک فی مسکین گیہوں آدھا صاع (تقریباً دو سیر) اور جو یا چھوارے ایک صاع دیئے جائیں۔ صدقۂ فطر کی مقدار بھی امام صاحبؒ کے نزدیک یہی ہے اور تمام کفارات میں یہی مقدار واجب ہے۔

اولیٰ یہ ہے کہ شہر میں عام طور سے جو غلہ کھایا جاتا ہو اس کا آدھا صاع فی مسکین دیا جائے کیونکہ تمام جنایات میں کھانا دینے کی مقدار یہی بالاجماع مقرر ہے اگر حج میں کوئی معذور بحالت احرام سر منڈا دے تو یہی مقدار واجب ہے۔ سورۂ بقرہ میں حدیث گزر چکی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے حضرت کعب کو (سر منڈانے کے کفارہ میں) ایک فرق غلہ چھ مسکینوں کو تقسیم کرنے کا حکم دیا (صدقۂ فطر پر جرمانہ شکار کو محمول کرنے سے اس حدیث پر محمول کرنا اولیٰ ہے کیونکہ صدقۂ فطر کسی جنایت وجرم کی وجہ سے واجب نہیں ہوتا اور شکار کی جنایت اور معذور کی جنایت دونوں ہم جنس ہیں (اگرچہ نوع جنایت میں فرق ہے)۔

جمہور کے نزدیک جس طرح قربانی کے گوشت کے مستحق صرف مساکین حرم ہیں اسی طرح کھانا بھی صرف فقراء حرم ہی کو دیا جائے گا۔ امام صاحبؒ کے نزدیک یہ شرط نہیں ہے (قربانی کے گوشت کی طرح کھانے کے لئے بھی مساکین حرم کی تخصیص نہیں ہے)۔

مسئلہ :- اگر شکار کی قیمت میں ایک مسکین کے لائق پورا کھانا نہ مل سکے یا اتنا کھانا ملے جو ایک مسکین یا چند مساکین کو مقدار مقررہ دینے کے بعد کچھ بچ رہے مگر بچا ہوا کھانا ایک مسکین کے لائق پورے طور پر نہ ہو (مثلاً آدھا سیر بچ رہے) تو جتنا باقی

رہا ہو اتنا کسی ایک مسکین کو دے دیا جائے اپنی طرف سے بڑھا کر پوری مقدار کر دینا ضروری نہیں ہے اور اگر بجائے کھانا دینے کے بجائے روزہ رکھے تو ایک روزہ دو روزے کے ٹکڑے نہیں ہو سکتے یہ مسئلہ اجماعی ہے اور اگر قربانی دے گا تو کسی قسم کی اور کسی عمر کی بکری ہو قربانی میں دے سکتا ہے۔ لیکن امام ابو حنیفہؒ اور امام مالکؒ کے نزدیک ایسی بکری کی قربانی کافی ہو گی جس کی قربانی شرعاً ضروری قرار دی گئی ہے (یعنی بے عیب سالم الاعضاء اور عمر مقررہ کے مطابق ہو ورنہ بکری کی قربانی کافی نہ ہو گی)۔

لِيَذُوقَ وَبَالَ أَمْرِهِ (ہم نے یہ سزا کفارہ اس لئے واجب کیا کہ مجرم بے جا کئے کی سزا چکھے۔ وَبَالَ أَمْرِهِ کئے کا بوجھ۔ ثقل کا بار نتیجہ۔ وبل کا لغوی معنی ہے ثقل طعام وبیل ثقیل کھانا۔ آیت فَأَخَذْنَاهُ أَخْذًا وَبِيلًا میں وبیلا کا معنی سخت ثقیل اسی لغوی مناسبت کی وجہ سے کیا گیا ہے۔

عَفَا اللَّهُ عَمَّا سَلَفَ (جو کچھ پیچھے ہو گیا اللہ نے اس کو تو معاف کر دیا)۔ یعنی محرم نے بحالت احرام جو شکار اسلام سے پہلے یا حکم حرمت نازل ہونے سے پہلے کر لیا جو شکار اس مرتب کر لیا اللہ نے اس کو تو معاف کر دیا۔

وَمَنْ عَادَ (لیکن اس بار کے بعد جو شخص دوبارہ ایسا کرے گا)۔

فَيَنْتَقِمُ اللَّهُ مِنْهُ (تو اللہ اس کو سزا دے گا)۔ فَيَنْتَقِمُ اللَّهُ جزا نہیں ہے کیونکہ فعل مضارع اگر جزا واقع ہوتا ہے تو اس پر فاء نہیں آتی بلکہ یہ خبر ہے اور هُوَ مبتدا محذوف ہے۔

حضرت ابن عباسؓ کا قاعدہ تھا کہ جب کوئی محرم شکار کر لیتا تو آپ اس سے پوچھتے کیا تو نے اس سے پہلے کبھی حالت احرام میں شکار کیا ہے (یہ پہلا جرم ہے) اگر وہ کہتا یہ پہلا جرم ہے تو آپ اس کو (قربانی کرنے یا کھانا دینے یا روزے رکھنے کا) حکم دیدیتے اور اگر وہ کہتا پہلے بھی مجھ سے ایسا جرم ہوا ہے تو آپ کوئی حکم نہ دیتے اور ظاہر آیت کے مطابق فرماتے اللہ تجھ سے انتقام لے گا۔ پھر اس کی پشت اور سینہ پر دردناک ضرب بید کرتے کذا قال البغوی۔

میں کہتا ہوں آیت کی تفسیر اس طرح کرنا اولیٰ ہے کہ جو کچھ گزر چکا اس کو تو اللہ نے معاف کر دیا یعنی جس شخص نے اس کا تاوان (بصورت قربانی یا بصورت طعام یا بصورت صیام) ادا کر دیا ہو اللہ نے اس کو معاف کر دیا لیکن جو شخص دوبارہ ایسی حرکت کرے گا اللہ اس سے انتقام لے گا یعنی مذکورہ بالا سزا اس پر عائد کرے گا اور اگر وہ تاوان ادا نہ کرے گا تو قیامت کے دن اس کو عذاب دے گا۔

وَاللَّهُ عَزِيزٌ ذُو انْتِقَامٍ یعنی جو شخص اللہ کی نافرمانی پر جما رہے گا (اللہ اس کو عذاب دینے والا اور انتقام لینے والا ہے)۔

أُحِلَّ لَكُمْ صَيْدُ الْبَحْرِ (تمہارے لئے سمندر سے شکار کرنا حلال کر دیا گیا ہے)۔

وَطَعَامُهُ (اور اس کی غذا) (حلال کر دی گئی ہے) طعامہ کی ضمیر صید کی طرف راجع ہے یعنی شکار سے بنا ہوا کھانا یا البحر کی طرف راجع ہے یعنی سمندر سے حاصل کیا ہوا کھانا۔ ؎

بعض علماء کا قول ہے کہ صَيْدُ الْبَحْرِ سے مراد وہ آبی جانور ہے جو پانی سے باہر زندہ نہیں رہتا اور طَعَامُ الْبَحْرِ سے

؎ حضرت انسؓ راوی ہیں کہ حضرت ابو بکر صدیقؓ نے اس آیت کی تشریح میں فرمایا صَيْدُ الْبَحْرِ وہ (خوردنی) اشیاء ہیں جو سمندر کے اندر موجود ہوں اور طعام سے مراد وہ (خوردنی) اشیاء ہیں جن کو سمندر نے اگل کر باہر پھینک دیا ہو۔ حارث بن نوفل راوی ہیں کہ وہ ایک حج میں حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ کی خدمت میں اس شکار کا گوشت پیش کیا گیا جس کو غیر محرم نے شکار کیا تھا۔ آپ نے اس میں سے کھا لیا مگر حضرت علیؓ نے نہیں کھایا۔ حضرت عثمانؓ نے فرمایا خدا ہم نے یہ نہ خود شکار کیا نہ حکم دیا نہ اشارہ کیا۔ حضرت علیؓ نے فرمایا وَحُرِّمَ عَلَيْكُمْ صَيْدُ الْبَرِّ مَا دُمْتُمْ حُرُمًا۔

حسن راوی ہیں کہ اگر محرم کیلئے شکار نہ کیا گیا ہو بلکہ غیر محرم نے کسی دوسرے غیر محرم کے لئے شکار کیا ہو تو ایسے شکار کے گوشت کو حضرت عمر بن خطاب محرم کے لئے بھی حلال جانتے تھے لیکن حضرت علیؓ مکروہ قرار دیتے تھے۔ رواہ ابن ابی شیبہ

مرتا ہے سمندر ہی کھانا۔ امام مالکؒ نے ہر سمندری جانور کے کھانے کے جواز پر اسی سے استدلال کیا ہے مسئلہ کی پوری تفصیل سورۂ بقرہ میں گزر چکی ہے۔

حضرت عمر بن خطابؓ نے فرمایا صَیْدُ الْبَحْرِ وہ ہے جس کو (سمندر سے) شکار کیا جائے اور طَعَامُ الْبَحْرِ وہ ہے جس کو سمندر خود باہر پھینک دیتا ہے۔ حضرت ابن عباسؓ، حضرت ابو ہریرہؓ اور حضرت ابن عمرؓ کا قول ہے کہ طَعَامُ الْبَحْرِ وہ ہے جس کو پانی مردہ حالت میں کنارہ پر پھینک دیتا ہے۔ سعید بن مسیبؒ، سعید بن جبیر، عکرمہ، قتادہ، نخعی اور مجاہد نے کہا صَیْدُ الْبَحْرِ وہ ہے جو تازہ پکڑا گیا ہو اور طَعَامُ الْبَحْرِ وہ ہے جس کو نمک لگا دیا گیا ہو۔

مَتَاعًا لَّكُمْ وَلِلسَّيَّارَةِ ۚ (مذکورہ بالا صَیْدُ الْبَحْرِ کو حلال کیا گیا ہے) (تمہارے (یعنی اہل اقامت کے) اور مسافروں کے فائدہ کیلئے) اہل اقامت تازہ تازہ پکڑ کر کھاتے ہیں اور مسافر اپنے ہمراہ لے کر نمک لگا کر توشہ سفر کے طور پر لے جاتے ہیں۔

وَحُرِّمَ عَلَيْكُمْ صَيْدُ الْبَرِّ مَا دُمْتُمْ حُرُمًا ۗ (اور جب تک تم احرام بند ہو خشکی کا شکار تم پر حرام کر دیا گیا ہے) بعض علماء کے نزدیک آیت کا مطلب اس طرح ہے کہ خشکی کا شکار (کھانا) محرم کے لئے مطلقاً حرام کر دیا گیا ہے خواہ غیر محرم نے اس کو شکار کیا ہو اور محرم نے حکم نہ دیا ہو نہ مدد کی ہو نہ اشارہ کیا ہو بلکہ محرم کے لئے شکار بھی نہ کیا گیا ہو۔ بہرحال محرم کے لئے حرام ہے۔ یہ قول حضرت ابن عباسؓ کا ہے۔ طاؤسؒ اور سفیان ثوریؒ کا یہی قول ہے حضرت ابن عباسؓ کی روایت میں آیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ ابواء یا ودان میں فروکش تھے صعب بن جثامہ لیثی نے حضور کے لئے گورخر کا گوشت بطور ہدیہ بھیجا۔ آپ نے واپس کر دیا اور صعب کے چہرہ پر کچھ رنج کے آثار دیکھ کر فرمایا ہم نے کسی اور بات کی وجہ سے واپس نہیں کیا ہے۔ بات صرف یہ ہے کہ ہم احرام بند ہیں (متفق علیہ) نسائی کی روایت میں (اتنا زائد) آیا ہے کہ ہم شکار نہیں کھاتے۔ سعید نے ابن عباسؓ کا قول اتنا مزید بیان کیا ہے کہ اگر ہم احرام بند نہ ہوتے تو قبول کر لیتے۔

اس کے جواب میں امام بخاریؒ کی وہ صراحت نقل کی ہے جس میں آیا ہے کہ گورخر زندہ تھا اور زندہ شکار کو ذبح کرنا محرم کے لئے جائز نہیں۔ اس روایت کو امام مالکؒ سے بھی یہی تاویل نقل کی ہے مگر یہ توجیہ درست نہیں ہے کیونکہ اسحاق نے مسند میں اپنی سند سے بروایت موسیٰ از محمد بن عمرو بن علقمہ از زہری بیان کیا ہے کہ گورخر کا گوشت پیش کیا تھا (اور گوشت زندہ کا نہیں ہو سکتا) طبرانی نے زہری کی روایت سے لکھا ہے کہ گورخر کی ٹانگ پیش کی تھی۔ مسلمؒ کی روایت میں ہے کہ گورخر کا سرین تھا جس سے خون ٹپک رہا تھا۔ مسلمؒ کی دوسری روایت میں سرین کی جگہ ٹانگ کا لفظ آیا ہے۔ مسلمؒ کی تیسری روایت میں سعید کی روایت دو طرح سے آئی ہے ایک میں گورخر کا لفظ آیا ہے اور دوسری میں گورخر کا پہلو۔ بہرحال تمام روایات میں اس امر پر اتفاق ہے کہ وہ شکار رسول اللہ ﷺ نے قبول نہیں فرمایا۔ ابن وہب اور بیہقی نے عمرو بن امیہ کے حوالہ سے بیان کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ جحفہ میں فروکش ہوئے کہ ایک گورخر کا سرین پیش کیا گیا آپ نے اس میں سے خود بھی کھایا اور لوگوں نے بھی کھایا اس روایت کی سند حسن ہے۔

معلوم ہوتا ہے کہ دونوں قصوں کا تعلق جدا جدا دو قصوں سے تھا۔ صحیحین میں جو قصہ منقول ہے وہ ابواء یا ودان کا ہے اور وہب کے بیان کئے ہوئے قصہ کا تعلق جحفہ سے ہے جحفہ اور ابواء کا فاصلہ ۱۳ میل ہے اور جحفہ سے ودان آٹھ میل پر ہے۔

اسی موضوع کی ایک حدیث حضرت علیؓ کی روایت سے بھی آئی ہے حضرت علیؓ نے فرمایا تھا کیا تم واقف ہو کہ رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں کسی شکار کا ایک عضو بطور ہدیہ پیش کیا گیا آپ نے قبول نہیں کیا اور فرمایا میں احرام بند ہوں۔ حضرت علیؓ نے یہ خطاب قبیلہ اشجع کے ایک شخص سے کیا تھا اور اس کو قسم دی تھی اس شخص نے جواب میں کہا جی ہاں۔ رواہ ابوداؤد و الطحاوی۔ مسلمؒ نے بھی اسی طرح کی حدیث نقل کی ہے۔

لیکن قرن اول کے بعد مسلمانوں کا اس امر پر اجماع ہو گیا تھا کہ اگر غیر محرم اپنے لئے شکار کرے تو محرم کے لئے اس کا کھانا حلال ہے۔ صحیح احادیث میں آیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے خود بھی ایسے شکار کا گوشت کھایا اور صحابہؓ کو بھی کھانے کی اجازت

دی۔ حضرت ابو قتادہؓ کی حدیث ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اس (شکار) کا جو گوشت بچ گیا ہو وہ تم (لوگ) کھالو۔ بعض صحیح روایات میں آیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے خود بھی اس کو کھایا۔ صعب بن جثامہ کی بعض روایات میں آیا ہے کہ رسول اللہ نے خود بھی اس میں سے کھایا۔

مسلم نے نقل کیا ہے کہ معاذ بن عبدالرحمٰنؒ بن عثمان تیمی کے باپ (عبدالرحمٰن) نے بیان کیا کہ ہم احرام کی حالت میں حضرت طلحہ بن عبیداللہؓ کے ساتھ تھے۔ حضرت طلحہؓ کو ایک پرندہ (یعنی شکار کیا ہوا) ہدیہ میں پیش کیا گیا آپ اس وقت سو رہے تھے۔ ہم میں سے بعض آدمیوں نے تو اس کو کھالیا اور بعض نے کھانے سے پرہیز رکھا۔ طلحہ بیدار ہوئے تو آپ نے کھانے والوں کی موافقت کی اور فرمایا ہم نے رسول اللہ ﷺ کی ہمرکابی میں شکار کھایا تھا۔

عمرو بن سلمہ ضمیری نے بہزی کا بیان نقل کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ مکہ جانے کے ارادے سے احرام بند برآمد ہوئے۔ روحاء کے مقام میں پہنچے تو ایک زخمی گورخر پر نظر پڑی (جو زخمی کیا ہوا تھا) رسول اللہ نے فرمایا اس کو رہنے دو ممکن ہے اس کو شکار کرنے والا آجائے کچھ دیر کے بعد بہزی آگئے۔ بہزی نے اس کا شکار کیا تھا۔ بہزی نے عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ آپ کو اختیار ہے جیسے چاہیں اس میں تصرف کریں۔ حضور ﷺ نے حضرت ابو بکرؓ کو حکم دیا (کہ اس کو تقسیم کردو) حسب الحکم حضرت ابو بکرؓ نے قافلہ والوں کو اس کا گوشت بانٹ دیا (رواہ مالک واصحاب السنن) ابن خزیمہ نے اس روایت کو صحیح کہا ہے۔

تقریر سابق سے ظاہر ہو گیا کہ آیت میں صید سے مراد ہے شکار کردہ۔

مسئلہ:۔ اگر غیر محرم، محرم کے لئے شکار کرے تو کیا حکم ہے۔ امام اعظمؒ کے نزدیک غیر محرم کا شکار کیا ہوا سب کے لئے جائز ہے یہاں تک کہ وہ محرم بھی اس کو کھا سکتا ہے جس کے لئے شکار کیا گیا ہو۔ امام مالکؒ کے نزدیک اگر محرم کے لئے غیر محرم نے شکار کیا تو کسی کے لئے حلال نہیں یہاں تک کہ غیر محرم بھی اس کو نہیں کھا سکتا۔ امام شافعیؒ اور امام احمدؒ کا قول ہے کہ اگر غیر محرم نے محرم کے لئے شکار کیا خواہ احرام باندھنے کے بعد کیا یا احرام باندھنے سے پہلے بہر حال محرم کے لئے اسکو کھانا درست نہیں۔ البتہ غیر محرم اس کو کھا سکتا ہے اور وہ محرم بھی کھا سکتا ہے جس کی نیت سے شکار نہ کیا گیا ہو۔ حضرت عثمانؓ کا قول بھی یہی بیان کیا گیا ہے۔ امام مالکؒ نے موطا میں حضرت عبداللہ بن ابی بکرؓ کی روایت سے بیان کیا ہے کہ عبداللہ بن عامر نے فرمایا میں نے مقام العرج میں حضرت عثمانؓ بن عفان کو دیکھا گرمی کا زمانہ تھا آپ احرام بند تھے اور چہرہ کو چادر سے ڈھانکے ہوئے تھے کچھ دیر کے بعد شکار کا گوشت پیش کیا گیا آپ نے ساتھیوں سے فرمایا تم لوگ کھاؤ۔ عرض کیا گیا کیا آپ نہیں کھائیں گے۔ فرمایا میری حالت تمہاری طرح نہیں ہے میرے لئے شکار کیا گیا ہے (اس لئے میرے لئے حلال نہیں)۔

(مذکورہ بالا) بعض روایات میں آیا ہے کہ غیر محرم کا شکار کیا ہوا رسول اللہ ﷺ نے کھایا اور بعض روایات میں آیا ہے کہ نہیں کھایا بلکہ لوٹا دیا۔ تینوں اماموں نے ان دونوں روایتوں کو تطبیق دینے کیلئے یہ توجیہ کی کہ حضور ﷺ نے وہ گوشت تو کھالیا جو غیر محرم نے اپنے لئے شکار کیا تھا اور اس شکار کا گوشت نہیں کھایا جو حضور ﷺ کے لئے یا کسی دوسرے محرم کیلئے شکار کیا گیا تھا۔

ہم کہتے ہیں کسی حدیث میں اس تفصیل کا کوئی پتہ نہیں (لہٰذا یہ تفصیل خود ساختہ ہے) ہمارے نزدیک دونوں میں تطبیق دینے کی بہترین توجیہ یہ ہو سکتی ہے کہ اگر غیر محرم نے شکار کیا ہو تو اس کا کھانا (محرم اور غیر محرم) سب کیلئے جائز ہے لیکن بہتر یہ ہے کہ محرم اس کو نہ کھائے چنانچہ رسول اللہ ﷺ نے کھا کر جواز کا اظہار فرمایا اور نہ کھا کر تنبیہ فرمادی کہ نہ کھانا مستحب ہے۔

ایک سوال

اگر احادیث میں باہم تعارض ہو اور ایک حدیث کو (روایۃً) دوسری پر ترجیح نہ ہو تو قیاس کا تقاضا ہے کہ تحریم پر احتیاطاً عمل کیا جائے۔

جواب

ہم کہتے ہیں بیشک یہ ضابطہ ہے لیکن ہم نے اس جگہ اس قول کو اختیار نہیں کیا تاکہ اجماع کی مخالفت لازم نہ آئے کیونکہ بعض قسم کے شکار محرم کے لئے باجماع علماء حلال ہیں یعنی محرم کے لئے اگر شکار کیا جائے تو تینوں اماموں کے نزدیک وہ حرام ہے۔

حضرت جابرؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا خشکی کا شکار تمہارے لئے حلال ہے جب کہ تم احرام بند ہو بشرطیکہ تم نے خود شکار نہ کیا ہو اور نہ تمہارے لئے شکار کیا گیا ہو۔ (اخرجہ الترمذی والنسائی وابن خزیمہ واحمد)۔ امام مالکؒ نے فرمایا کہ جو شکار محرم نے خود کیا ہو یا کسی غیر محرم کے لئے جو شکار کیا گیا ہو اس کا حکم بھی اسی شکار کی طرح ہے جو محرم نے خود کیا ہو اور محرم کا خود کیا ہوا شکار تو سب کے لئے حرام ہے لہٰذا) جو شکار محرم کے لئے اس کے احرام بند ہونے کی حالت میں دوسروں نے کیا ہو وہ بھی مردار کی طرح سب لوگوں کے لئے حرام ہے۔

امام شافعیؒ اور امام احمدؒ نے فرمایا اخبار کی بناء پر ترجیح پاتی ہے کہ محرم کے لئے خود اسی کا کیا ہوا شکار یا اس کے لئے غیر محرم کا کیا ہوا شکار حرام ہو لیکن اگر کسی غیر محرم نے یا کسی دوسرے محرم نے شکار کیا ہو یا غیر محرم کے لئے شکار کیا گیا ہو یا کسی دوسرے محرم کے لئے شکار کیا گیا ہو تو ان تمام مسائل کا حکم حدیث کے اندر مذکور نہیں ہے باہر سے معلوم ہوتا ہے۔

ہم کہتے ہیں یہ حدیث اس قابل ہی نہیں ہے کہ اس کو دلیل میں پیش کیا جا سکے کیونکہ اس کی روایت کا مدار عمرو بن ابی عمرو پر ہے۔ امام احمد کی روایت میں عمرو از عمرو انصاری از جابرؓ کا سلسلہ ہے اور ترمذی وغیرہ کی روایت میں عمرو از مطلب از جابرؓ آیا ہے گویا امام احمد کی روایت میں عمرو کا راوی ایک نامعلوم انصاری ہے اور ترمذی کی روایت میں عمرو کا راوی مطلب ہے اور ترمذی نے خود صراحت کی ہے کہ حضرت جابرؓ سے مطلب کا سماع ثابت نہیں ہے۔ پھر عمرو بن ابی عمرو جو مطلب کا آزاد کردہ غلام تھا (ثقہ نہیں ہے) یحییٰ بن معین نے کہا ہے کہ اس کی حدیث نا قابل دلیل ہے نیز یحییٰ اور ابو داؤد دونوں نے اس کے متعلق صراحت کی ہے کہ یہ قوی نہیں ہے البتہ امام احمدؒ نے فرمایا کہ اس میں کوئی خرابی نہیں ہے۔

پھر استدلال مذکور استدلال بالمفہوم ہے اور استدلال بالمفہوم ہمارے نزدیک جائز نہیں ہے۔

حضرت ابو قتادہ کی حدیث کو بھی اس امر کے ثبوت میں پیش کیا جاتا ہے کہ اگر غیر محرم، محرم کے لئے شکار کرے تو جس کے لئے شکار کیا گیا ہو اس کے لئے کھانا جائز نہیں ہے۔ ابو قتادہؓ کا بیان ہے کہ حدیبیہ کے زمانہ میں میں رسول اللہ ﷺ کے ہمرکاب نکلا میرے ساتھی احرام بند تھے مگر میں نے احرام نہیں باندھا تھا مجھے ایک گورخر نظر آیا اور حملہ کر کے میں نے اس کا شکار کر لیا اور رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں اس کا تذکرہ کر دیا اور یہ بھی عرض کر دیا کہ میں نے احرام نہیں باندھا تھا غیر محرم ہونے کی حالت میں حضور ﷺ کے لئے میں نے یہ شکار کیا ہے۔ حضور ﷺ نے صحابہؓ کو کھانے کا حکم دے (یعنی غیر محرم صحابہؓ کو کھانے کی اجازت دے دی۔ حسب اجازت صحابہؓ نے کھایا مگر حضور نے نہیں کھایا کیونکہ میں نے حضور ﷺ کو اطلاع دی تھی کہ آپ ﷺ کے لئے میں نے یہ شکار کیا ہے۔ اخرجہ اسحٰق وابن خزیمہ والدارقطنی۔

اس استدلال کا جواب یہ ہے کہ ابن خزیمہ اور ابو بکر نیشاپوری اور دارقطنی سب نے بالاتفاق صراحت کی ہے کہ صرف معمر نے اس روایت میں یہ الفاظ زیادہ بیان کئے ہیں کہ آپ کے لئے میں نے یہ شکار کیا ہے اور حضور ﷺ نے خود اس میں سے نہیں کھایا۔ معمر کے علاوہ یہ الفاظ کسی نے نقل نہیں کئے۔ شاید یہ معمر کے واہمہ کی ایجاد ہے۔ ترمذی نے لکھا ہے کہ معمر بن راشد کے (نقل احادیث میں) کچھ اوہام (خود ساختہ ذہول) ہیں۔

میں کہتا ہوں تمام صحیح روایات میں باتفاق آیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے بھی اس شکار کا گوشت کھایا تھا پھر معمر والی روایت تو امام مالکؒ کے مسلک کے خلاف جا رہی ہے اس میں صراحت ہے کہ حضور ﷺ نے صحابہؓ کو کھانے کا حکم دیا اور انہوں نے کھایا اس سے معلوم ہوا کہ اگر محرم کے لئے شکار کیا گیا ہو تو دوسرے سب لوگوں کے لئے وہ شکار حلال ہے حالانکہ امام مالکؒ سب لوگوں کے لئے اس کو حرام کہتے ہیں۔

وَاتَّقُوا اللّٰهَ الَّذِیْٓ اِلَیْهِ تُحْشَرُوْنَ ۝ (اور اس اللہ تعالیٰ سے ڈرو جس کے پاس تم جمع کئے جاؤ گے)۔

جَعَلَ اللّٰهُ الْكَعْبَةَ الْبَيْتَ الْحَرَامَ قِيٰمًا لِّلنَّاسِ (اور اللہ نے کعبہ کو جو ادب کا مکان ہے لوگوں کے قائم رہنے کا سبب قرار دیا ہے)۔
کعبہ مربع ہے اسی لئے اس کو کعبہ کہا جاتا ہے ہر مربع گھر کو عرب ”کعبہ“ کہتے ہیں۔ مقاتل نے کہا کعبہ دوسرے مکانوں سے منفرد ہے اس لئے اس کو کعبہ کہا جاتا ہے۔ بعض کے نزدیک اونچا ہونے کی وجہ سے کعبہ کو کعبہ کہا جاتا ہے۔ کعبہ کا لغوی معنی ہے ابھرنا اور بلند ہونا۔ پاؤں کے ٹخنہ کو اسی لئے کعب کہا جاتا ہے۔ جو لڑکی بالغ ہونے کے قریب ہو اور اس کے پستان ابھر آئے ہوں اس کے لئے عرب کہتے ہیں تَكَعَّبَتْ۔ اَلْبَيْتَ الْحَرَامَ یعنی اللہ نے اس کو حرم بنایا اور اس کی حرمت کی عظمت ظاہر فرمائی۔ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: آسمان و زمین کی پیدائش کے دن ہی اللہ نے کعبہ کو حرم بنایا تھا۔ قیاما یعنی لوگوں کے دینی اور دنیاوی درستی کا ذریعہ۔ دینی درستی کا ذریعہ ہونا تو ظاہر ہے کہ اس کا حج کیا جاتا ہے اور دوسرے شعائر کی ادائیگی اس کے ذریعہ سے ہوتی ہے اور دنیوی درستی کا ذریعہ ہونا اس لئے ہے کہ حرم کے اندر لوٹ کھسوٹ، قتل و غارت کی ممانعت کر دی گئی ہے اور یہاں پہنچ کر لوگوں کا مال و جان محفوظ ہو جاتا تھا۔
وَالشَّهْرَ الْحَرَامَ (اور حرمت والے مہینوں کو) اللہ نے لوگوں کے دین و دنیا کی درستی کا ذریعہ بنایا۔ اَلشَّهْرُ سے مراد ہے جنس شہر (یعنی واحد مراد نہیں ہے) حرمت والے چار ماہ ہیں: رجب، ذی قعدہ، ذی الحجہ، محرم۔ اللہ نے ان چاروں مہینوں کو لوگوں کے لئے پُر امن رہنے کے مہینے بنا دیا ان مہینوں میں (عرب) لڑنے مرنے کٹنے لٹنے سے محفوظ رہتے تھے۔
وَالْهَدْيَ وَالْقَلَآئِدَ ۔ (اور نیاز کے جانوروں کو اور قلائد کو) اللہ نے باعث امن بنایا هَدْيَ اور قَلَآئِد کی تفسیر اسی سورت کے شروع میں گزر چکی۔
ذٰلِكَ (یہ) یعنی باعث درستی بنانا یا احرام وغیرہ کی حرمت کا حکم دینا۔ زجاج نے کہا ذٰلِكَ سے اشارہ ان غیبی اطلاعات اور پیشین گوئیوں کی جانب ہے جن کا کچھ بیان اسی سورت میں کر دیا گیا ہے مثلاً فرمایا ہے سَمّٰعُوْنَ لِلْكَذِبِ سَمّٰعُوْنَ لِقَوْمٍ اٰخَرِيْنَ یا جیسے ان کی تحریف کتب کی اطلاع دی گئی ہے۔
لِتَعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ (اس لئے ہے تاکہ تم کو معلوم ہو جائے کہ اللہ ان تمام چیزوں سے واقف ہے جو آسمانوں میں اور زمین میں ہیں) ضرر واقع ہونے سے پہلے ایسے احکام جاری کرنا کہ آنے والا ضرر دفع ہو جائے اور منافع حاصل ہو جائیں بتاتا ہے کہ شارع کا علم کامل اور اس کا حکم پُر حکمت ہے۔ اسی طرح غیب کی خبریں دینے سے خبر دینے والے کے علم کی ہمہ گیری معلوم ہوتی ہے۔
وَاَنَّ اللّٰهَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ ۝ اور یہ بھی معلوم ہو جائے کہ (اللہ ہر شے سے بخوبی واقف ہے)۔ یہ خاص کے بعد عام کا ذکر اور اطلاق کے بعد مبالغہ ہے۔
اِعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعِقَابِ وَاَنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝ (جان لو کہ اللہ سخت سزا دینے والا ہے اور (یہ بھی جان لو کہ) اللہ بڑا معاف کرنے والا مہربان (بھی) ہے)۔ اس آیت میں (ثواب کا) وعدہ اور (عذاب کی) دھمکی ہے جو اللہ کے احکام کی خلاف ورزی کرے اور خلاف ورزی پر جما رہے اس کے لئے عذاب کی دھمکی ہے اور جو احکام کی پابندی کرے اور خلاف ورزی سے باز رہے اس کے لئے ثواب کا وعدہ ہے۔
ابوالشیخ نے بروایت حسن بیان کیا کہ وفات کے قریب حضرت ابوبکرؓ صدیق نے فرمایا کہ اللہ نے نرمی کی آیت سختی کی آیت کے ساتھ اور سختی کی آیت نرمی کی آیت کے ساتھ ذکر فرمائی تاکہ مومن کے دل میں رغبت بھی پیدا ہو اور خوف بھی۔ اللہ سے تمناء باطل نہ کرنے لگے اور خود اپنے کو تباہی میں نہ ڈالے۔
مَا عَلَى الرَّسُوْلِ اِلَّا الْبَلٰغُ (پیغمبر کی ذمہ داری صرف (اللہ کا پیام) پہنچانے کی ہے)۔ اور وہ اپنا فرض تبلیغ ادا کر چکے اور تمہارے خلاف حجت تمام ہو گئی اب تعمیل میں کوتاہی کرنے کا تمہارے پاس کوئی عذر باقی نہیں رہا۔ رسول اللہ

ہے۔ (اللہ کا تو کوئی فعل امید کے زیر اثر نہیں ہو سکتا کیونکہ امید غیر یقینی حالت میں ہوتی ہے اور اللہ کا کوئی فعل قطعی اور یقینی نتیجہ سے خالی نہیں ہوتا۔ اس لئے قرآن مجید میں جہاں لفظ لَعَلَّ آیا ہے کسی سے پیدا ہونے والی امید کا رجوع اللہ کی طرف نہیں ہوتا بلکہ بندوں کی طرف ہوتا ہے اسی لئے مفسر رحمۃ اللہ علیہ نے آیت کا ترجمہ اس طرح کیا کہ اللہ سے تقویٰ رکھو یہ امید رکھتے ہوئے کہ تم کامیاب ہو جاؤ گے)۔

احمد اور ترمذی اور حاکم نے حضرت علیؓ کی روایت سے اور ابن جریر نے حضرت ابوہریرہؓ اور حضرت ابوامامہؓ اور حضرت ابن عباسؓ کے حوالہ سے بیان کیا ہے کہ جب آیت وَلِلّٰهِ عَلَى النَّاسِ حِجُّ الْبَيْتِ نازل ہوئی تو صحابہؓ نے عرض کیا یارسول اللہ ﷺ کیا ہر سال حج فرض ہے۔ حضور خاموش رہے۔ صحابہؓ نے پھر عرض کیا یارسول اللہ ﷺ کیا ہر سال۔ فرمایا نہیں اگر میں ہاں کہہ دیتا تو (ہر سال) واجب ہو جاتا۔ دوسری روایت میں آیا ہے کہ حضور نے فرمایا تم کو اندیشہ نہ ہوا کہ (شاید) میں ہاں کہہ دوں اگر میں ہاں کہہ دیتا تو (ہر سال) حج واجب ہو جاتا اور ہر سال واجب ہو جاتا تو پھر تم سے اس کی ادائیگی ہو نہ سکتی اگر میں تم کو چھوڑے رکھوں تو تم بھی مجھے (بغیر سوال کئے) چھوڑے رکھو۔ تم سے پہلے کے لوگ زیادہ پوچھ پاچھ اور انبیاء سے زیادہ سوالات کرنے سے ہی برباد ہوئے۔ اگر میں تم کو کسی بات کا حکم دوں تو تم سے جہاں تک ہو سکے اس کی تعمیل کرو اور جب کسی بات کی ممانعت کر دوں تو اس سے باز رہو۔ اس پر آیت ذیل نازل ہوئی۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَسْـَٔلُوْا عَنْ اَشْيَآءَ (اے ایمان والو ایسی فضول باتیں مت پوچھو) یعنی ایسی باتیں مت پوچھا کرو جن کا کرنا تم پر شاق ہو جیسے ہر سال حج کرنے کا سوال حج کے متعلق سوال کرنے والے حضرت عکاشہ بن محصن تھے۔ ابن جریر نے حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کے حوالے سے یہی لکھا ہے۔

خلیل، سیبویہ اور جمہور اہل بصرہ کے نزدیک لفظ اشیاء اسم جمع ہے یعنی لفظاً مفرد اور معنیً جمع ہے۔ اس لفظ کی اصل شیئاء تھی بروزن فعلاء جیسے حمراء۔ دونوں ہمزوں کے درمیان الف تھا اور چونکہ دوسری ہمزہ تانیث کی ہے اس لئے یہ لفظ غیر منصرف ہے۔ دو ہمزوں کا اجتماع چونکہ ثقیل تھا اس لئے اول ہمزہ کو (جو لام کلمہ کی جگہ پر تھی) اس کی جگہ سے ہٹا کر شروع میں لے آئے اب اس کا وزن لفعاء ہو گیا۔ بعض اشیاء کی اصل اَشْيِئَاءُ بروزن اَفْعِلَاءُ تھی یہ شَيِّئٌ کی جمع ہے۔ شَيْءٌ اصل میں شَيِّئٌ تھی یا شَيِّيءٌ بروزن هَيِّنٌ تھی۔ بعض لوگوں نے کہا جس طرح ابیات، بیت کی جمع ہے اسی طرح اَشْيَاءُ بروزن اَفْعَالٌ شَيْءٌ کی جمع ہے اور شَيْءٌ بغیر کسی تشدید کے اپنی اصل پر ہے چونکہ غیر منصرف ہونے کے دو سبب اس میں موجود نہیں ہیں اس لئے اس لفظ کا عدم انصراف شاذ ہے۔

اِنْ تُبْدَ لَكُمْ تَسُؤْكُمْ (اگر تم پر ظاہر کر دی جائیں تو تم کو ناگوار گزریں)۔ یعنی اگر تم کو ان باتوں کے کرنے کا حکم دے دیا جائے تو تم پر دشواری آ پڑے۔

وَاِنْ تَسْـَٔلُوْا عَنْهَا حِيْنَ يُنَزَّلُ الْقُرْاٰنُ تُبْدَ لَكُمْ (اور قرآن اترنے کے زمانہ میں تم ایسی باتیں دریافت کرو تو تم سے ظاہر کر دی جائیں) یعنی رسول کی زندگی میں اگر تم ایسی باتیں پوچھو تو احتمال ہے کہ ظاہر کر دی جائیں اور تم کو ان سخت احکام کی تعمیل پر مامور کر دیا جائے۔ دونوں شرطیہ جملے یعنی اِنْ تُبْدَ لَكُمْ اور اِنْ تَسْـَٔلُوْا اَشْيَآءَ کی صفت ہیں۔ مطلب یہ کہ ایسی باتیں نہ پوچھو کہ تمہارے پوچھنے کے بعد وہ تم پر آ پڑنے کا اندیشہ ہو۔

مسئلہ:۔ امر کا صیغہ بغیر قید کے احناف کے نزدیک نہ تکرار عمل کا موجب ہے نہ تکرار کا احتمال رکھتا ہے (یعنی بغیر قید کے امر کا صیغہ ہو تو صرف ایک مرتبہ تعمیل حکم کو چاہتا ہے دوبارہ تعمیل کا مقتضی نہیں، اگر ایک مرتبہ امر کے مطابق عمل کر لیا جائے تو وجوب ساقط ہو جاتا ہے بعد دوبارہ وجوب عمل کا احتمال بھی نہیں ہوتا) پس رسول اللہ ﷺ کا ارشاد لَوْ قُلْتُ نَعَمْ لَوَجَبَتْ اور آیت اِنْ تُبْدَ لَكُمْ تَسُؤْكُمْ کا مطلب یہ ہے کہ حج کا وجوب (جو عمر بھر میں ایک بار تھا اور دوسرے احکام کا وجوب جن کی ادائیگی عمر بھر میں ایک دفعہ کافی تھی) رسول اللہ ﷺ کے حکم فرمانے اور تمہارے سوال کی وجہ سے ہر عام کے

بوضاحت بیان کے بعد منسوخ ہوجاتی۔ آیت مذکورہ کو امر مطلق کا بیان نہیں قرار دیا جاسکتا کیونکہ اگر اسی کو بیان کہا جائے گا تو ظاہر ہے کہ نزول از سوال بیان نہ ہوگا بلکہ سوال کے بعد ہوگا حالانکہ بیان کی ضرورت سوال سے پہلے بھی تھی اور وقت ضرورت سے بیان کا تاخر جائز نہیں۔

دوسری بات یہ بھی ہے کہ بیان (جدید نزول حکم پر موقوف نہیں بلکہ) عقل، غور اور تلاش لغت سے بھی ہوجاتا ہے (مگر نسخ بغیر حکم جدید کے نہیں ہوتا) اس تقریر سے واضح ہوگیا کہ مجمل یا مشکل یا خفی کے متعلق سوال کرنے میں کوئی حرج نہیں (نہ اس کی ممانعت آیت سے مستفاد ہے) رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے عاجز کی شفا پوچھ لینا ہے۔ در حقیقت ممانعت ایسے حکم کو دریافت کرنے کی ہے جو (مثبت، منفی کسی طور پر) شریعت میں نہیں آیا (اور خواہ مخواہ سوال کرنے کا یہ نتیجہ نکلے کہ حکم نازل ہوجائے) جیسے ہر سال حج کرنے کے متعلق سوال یا بنی اسرائیل کو جو گائے ذبح کرنے کا حکم ہوا تھا اس کے رنگ کے متعلق سوال۔

عَفَا اللّٰهُ عَنْهَا (ایسی چیزیں جن کو کرنے کا حکم دینے سے اللہ نے درگزر کی ہو) یہ بھی ترجمہ ہو سکتا ہے کہ جو کچھ تم سوال کر چکے اللہ نے اس کو تو معاف کر دیا آئندہ پھر ایسا نہ کرنا اس صورت میں یہ جملہ استینافیہ ہوگا (یعنی ترکیب لفظی کے اعتبار سے کلام سابق سے مربوط نہ ہوگا۔

وَاللّٰهُ غَفُورٌ حَلِيمٌ ۝ (اور اللہ بڑی مغفرت اور بڑے علم والا ہے) یعنی معاف کر دیتا ہے اگر تمہاری طرف سے قصور یا نادانی ہو جائے تو فوراً سزا نہیں دیتا۔

قَدْ سَأَلَهَا قَوْمٌ مِّن قَبْلِكُمْ (تم سے پہلے بھی کچھ لوگوں نے ایسے سوال کئے تھے)۔ ھا سَأَلَهَا کی ضمیر اَشْيَاءَ کی طرف راجع ہے اور عن محذوف ہے (یعنی ان چیزوں کے متعلق سوال کئے تھے) یا ھا ضمیر مسئلہ کی طرف راجع ہے جس پر لفظ لَا تَسْأَلُوا دلالت کر رہا ہے (اس وقت عن کو محذوف قرار دینے کی ضرورت نہ ہوگی)۔

بیضاوی نے مِن قَبْلِكُمْ کا تعلق سَأَلَهَا سے قرار دیا ہے قوم کی صفت نہیں قرار دیا (ہمارا ترجمہ بھی اس کے موافق ہے) کیونکہ ظرف زمان نہ صفت ہو سکتا ہے نہ حال نہ خبر، لیکن یہ استدلال قابل اعتراض ہے ظرف کی اسناد ایسی چیز کی طرف درست ہے جس کے اندر اس چیز کا وقوع متعین نہیں جیسے الہلال یوم الجمعہ ہلال کا ظہور یوم جمعہ میں متعین نہیں اس لئے اس مثال میں تعیین کو ظاہر کرنے کے لئے یوم جمعہ کی اسناد وقوع ہلال کی طرف کی گئی۔

بنی اسرائیل کو جب گائے ذبح کرنے کا حکم دیا گیا تو انہوں نے گائے کی کیفیت اور رنگ و دیگر صفات پوچھنا شروع کر دیں۔ ثمود نے حضرت صالح ؑ سے (اپنی مرضی کے مطابق) اونٹنی برآمد کرنے کی درخواست کی تھی اور کچھ لوگوں نے حضرت عیسیٰ ؑ سے درخواست کی کہ خوان آسمان سے اتر کر آئے۔ حضرت موسیٰ کے بعد بنی اسرائیل نے پیغمبر وقت سے سوال کیا کہ ہمارے لئے کوئی بادشاہ مقرر کر دو جس کے جھنڈے کے نیچے رہ کر ہم اللہ کی راہ میں جہاد کریں۔

۱؎ حضرت ابی بن کعب کی قرأت میں اس طرح آیا ہے قَدْ سَأَلَهَا قَوْمٌ مِّن قَبْلِكُمْ ثُمَّ أَصْبَحُوا بِهَا كَافِرِينَ۔ اخرجہ ابن جریر و ابن المنذر۔

۲؎ حضرت ابوہریرہؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ غضب کی حالت میں باہر تشریف لائے غصہ سے چہرۂ مبارک سرخ ہو رہا تھا پھر جا کر منبر پر تشریف فرما ہوگئے اسی وقت ایک آدمی نے کھڑے ہو کر پوچھا میرے باپ دادا کہاں ہیں، حضور نے ارشاد فرمایا دوزخ میں۔ پھر دوسرا آدمی کھڑا ہوا اور عرض کیا میرا باپ کون ہے، فرمایا تیرا باپ فلاں شخص ہے۔ حضرت عمر بن خطاب نے (غصہ کی یہ کیفیت دیکھی تو) کھڑے ہو کر عرض کیا ہم اللہ کے رب ہونے پر، اسلام کے دین ہونے پر، محمد کے نبی ہونے پر اور قرآن کے دستور ہونے پر راضی ہیں یا رسول اللہ ہم دور جاہلیت و شرک سے ابھی گزرے ہیں اور اسلام میں ابھی داخل ہوئے ہیں اس لئے ہماری گستاخی قابل معافی ہے اور اللہ ہی خوب واقف ہے کہ ہمارے باپ دادا کون تھے (اور کہاں ہیں) یہ سن کر حضور ﷺ کا غصہ فرو ہوا اور آیت يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَسْأَلُوا عَنْ أَشْيَاءَ نازل ہوئی۔ (از مفسر رحمۃ اللہ علیہ)

ثُمَّ أَصْبَحُوا بِهَا كٰفِرِيْنَ ۞ (پھر اس سوال کی وجہ سے وہ کافر ہو گئے) کیونکہ سوال کے بعد جو ان کو حکم دیا گیا اس کی انہوں نے اطاعت نہیں کی۔

ابو ثعلبہ خشنی نے فرمایا اللہ نے کچھ فرائض مقرر کر دیئے ہیں تم (سوال کر کے) اس سے آگے نہ بڑھو کچھ باتوں کی ممانعت کر دی ہے اس کی (خلاف ورزی کر کے) پردہ دری نہ کرو۔ کچھ حدود مقرر کر دی ہیں ان حدود سے تجاوز نہ کرو کچھ چیزوں (کے ظاہر کرنے) سے بغیر نسیان کے اس نے درگزر کی ہے ان کو (سوال کر کے) نہ اکھاڑو۔ بخاری نے بحوالہ قتادہؒ حضرت انس بن مالکؓ کا بیان نقل کیا ہے کہ کچھ لوگوں نے رسول اللہ ﷺ سے کچھ سوالات کئے اور اتنے مبالغہ کے ساتھ کئے کہ آپ غضبناک ہو گئے اور ممبر پر تشریف لے جا کر فرمایا آج جس چیز کے متعلق تم سوال کرو گے میں اس کا جواب کھول کر دے دوں گا۔ (پوچھو کیا پوچھتے ہو) یہ سن کر میں دائیں بائیں دیکھنے لگا میں نے دیکھا کہ ہر شخص کپڑے میں سر لپیٹے رو رہا ہے ایک آدمی تھا جو اپنا نسب غیر باپ سے جوڑتا تھا اس نے عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ میرا باپ کون ہے فرمایا حذافہ۔ اس کے بعد حضرت عمرؓ نے عرض کیا ہم اللہ کے رب ہونے سے، اسلام کے دین ہونے سے اور محمد ﷺ کے رسول ہونے سے راضی ہیں اور فتنوں سے اللہ کی پناہ مانگتے ہیں۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا آج کی طرح کوئی دن کبھی میں نے نہیں دیکھا خیر میں نہ شر میں، میرے سامنے جنت اور دوزخ کی تصویر لائی گئی (یعنی میری نظر کے سامنے دونوں کو لایا گیا) یہاں تک کہ دیوار سے پرے میں نے دونوں کو دیکھ لیا۔ قتادہؒ اس حدیث کو بیان کرتے وقت آیت يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَسْـَٔلُوْا عَنْ اَشْيَآءَ الخ کا ذکر کر رہے تھے۔

یونس نے بروایت زہری عبید اللہ بن عبد اللہ کا قول نقل کیا ہے کہ عبد اللہ بن حذافہ کی ماں نے عبد اللہ سے کہا میں نے تجھ سے زیادہ ماں کا نافرمان بیٹا کوئی نہیں سنا، تجھے کچھ اندیشہ نہ ہوا اگر دور جاہلیت کی عورتوں کی طرح تیری ماں سے کوئی نازیبا حرکت سرزد ہو گئی تو لوگوں کی آنکھوں کے سامنے تو اس کو رسوا کرنے لگا۔ عبد اللہ نے کہا خدا کی قسم اگر وہ حبشی غلام سے میرا جوڑ ملا دیتے تو میں اسی سے اپنے کو ملا دیتا۔

روایت میں آیا ہے کہ حضرت عمرؓ نے عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ ہم دور جاہلیت سے ابھی نکلے ہیں آپ ہم سے درگزر فرمائیے، اللہ آپ سے درگزر فرمائے گا۔ یہ سن کر حضور ﷺ کا غصہ فرو ہوا۔

بخاری نے حضرت ابن عباسؓ کا بیان نقل کیا ہے کہ کچھ لوگ رسول اللہ ﷺ سے بطور استہزاء سوال کر رہے تھے ایک کہہ رہا تھا میرا باپ کون ہے دوسرا کہہ رہا ہے میری اونٹنی گم ہو گئی ہے بتائیے میری اونٹنی کہاں ہے۔ اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔ حافظ ابن حجرؒ نے لکھا ہے دونوں واقعات ہو سکتے ہیں اور دونوں کے متعلق آیت کا نزول ہو سکتا ہے۔ مگر حضرت ابن عباسؓ کی روایت کی سند تمام روایات سے زیادہ صحیح ہے۔ میں کہتا ہوں اگر آیت کا نزول حج کے سوال کے متعلق قرار دیا جائے تو سیاق قرآنی کے زیادہ مناسب ہے لیکن اگر آیت کے نزول کا تعلق باپ کا نام دریافت کرنے سے جوڑا جائے تو آیت کا معنی یہ ہو گا کہ ایسی چیزیں دریافت نہ کرو کہ اگر تم پر ان کا اظہار کر دیا جائے تو تم کو برا لگے یعنی اگر تمہارا حقیقی نسب ظاہر کر دیا جائے اور غیر باپ کا نام بتایا جائے تو تمہاری رسوائی ہو اور تم کو دکھ پہنچے۔ مجاہد نے کہا اس آیت کا نزول اس وقت ہوا جب لوگوں نے بحیرہ، سائبہ، وصیلہ اور حام کا حکم دریافت کیا تھا دیکھو متصل آیت میں انہی کا حکم بیان فرمایا ہے۔

مَا جَعَلَ اللّٰهُ مِنْۢ بَحِيْرَةٍ وَّلَا سَآئِبَةٍ وَّلَا وَصِيْلَةٍ وَّلَا حَامٍ (اللہ نے نہ بحیرہ کو مشروع کیا ہے نہ سائبہ کو نہ وصیلہ کو نہ حام کو۔) یعنی اللہ نے ان کی اجازت نہیں دی نہ ان کا حکم جاری کیا۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا جو اونٹنی پانچ مرتبہ بیاہ چکی ہوتی تھی اس کا کان چیر کر آزاد چھوڑ دیا جاتا تھا اس پر بوجھ لادا جاتا تھا نہ کوئی اس پر سوار ہوتا تھا نہ اس کا اون کاٹا جاتا تھا نہ کسی پانی اور چراگاہ سے اس کو روکا جاتا تھا۔ اگر پانچویں بیاہ میں نر بچہ پیدا ہوتا تھا تو بچہ کو ذبح کر کے مرد عورتیں سب مل کر کھاتے تھے اور اگر بچہ مادہ ہوتا تو اس کا بھی کان چیر دیتے تھے ایسی سانڈنی کو بحیرہ کہا جاتا تھا۔

ابو عبیدہ نے کہا منت پر چھوڑے ہوئے سانڈھ اونٹ کو سائبہ کہا جاتا تھا اگر کسی بیمار کی صحت یا مسافر کی واپسی کے لئے منت مانی جاتی تھی تو مراد پوری ہونے پر اونٹ کو سانڈھ بنا کر چھوڑ دیا جاتا تھا اور کسی چراگاہ یا چشمہ سے اس کو نہیں روکا جاتا تھا نہ اس پر کوئی سوار ہوتا تھا گویا بحیرہ کی طرح اس کو بھی سانڈھ بنا دیا جاتا تھا سائبہ نر بھی ہوتا اور مادہ بھی۔

بعض اہل لغت نے لکھا ہے کہ اگر کسی اونٹنی کے بارہ بچے مسلسل تک مادہ بچہ پیدا ہوتا رہتا تھا تو اس کو آزاد چھوڑ دیا جاتا تھا نہ اس پر کوئی سوار ہوتا تھا نہ اس کا اون کاٹا جاتا تھا اور سوائے مہمان کے نہ اس کا دودھ کوئی پی سکتا تھا اس کے بعد (تیرھویں بار) جو بچہ پیدا ہوتا اس کا کان چیر کر ماں کے ساتھ آزاد چھوڑ دیا جاتا تھا اور جو سلوک ماں کے ساتھ کیا جاتا وہی بچہ کے ساتھ کیا جاتا تھا ایسی ماں کو سائبہ اور ایسے بچہ کو بحیرہ کہتے تھے

علقمہ نے کہا غلام کو (ہر چیز سے) آزاد قرار دیا جاتا تھا نہ اس کا حق ولاء مانا جاتا تھا نہ خون بہا نہ میراث۔ اس کے خلاف رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ حق ولاء اس شخص کے لئے ہے جس نے آزاد کیا ہو۔ سَائِبَةٌ بروزن فَاعِلَةٌ بمعنی مفعول ہے یعنی آزاد کردہ جیسے عِیْشَةٌ رَّاضِیَةٌ بمعنی مَّرْضِیَّةٌ ہے یعنی پسندیدہ یا پسند کردہ۔ اگر کوئی بکری سات بار پیاپے بچے جنتی اور ساتواں بچہ نر ہوتا تو اس کو ذبح کرتے اور مرد عورتیں سب کھا سکتے تھے اور اگر ساتواں بچہ مادہ ہوتا تو اس کو ذبح نہ کرتے بلکہ بکریوں میں چھوڑ دیتے تھے اور اگر ساتویں بیاہت میں نر مادہ دونوں پیدا ہوتے تو مادہ کے ساتھ نر کو چھوڑ دیتے اور ذبح نہ کرتے تھے اور کہتے تھے اس مادہ نے نر کو بھی اپنے ساتھ ملا لیا ایسے مادہ کو وصیلہ کہا جاتا تھا۔ اس مادہ کا دودھ عورتوں کے لئے حرام قرار دیا جاتا تھا اگر دونوں میں سے کوئی مر جاتا تو پھر مرد اور عورتیں سب اس کو کھا سکتے تھے۔

اگر کسی نر اونٹ کے تخم سے دس بچے پیدا ہو چکتے تو کہتے اب اس کی پشت (سوار ہونے اور بار اٹھانے سے) محفوظ ہو گئی اس کے بعد اس پر کوئی سوار نہ ہوتا نہ اس پر بوجھ لادا جاتا نہ کسی چراگاہ اور چشمہ سے اس کو روکا جاتا اس کو حام کہا جاتا تھا اگر حام مر جاتا تو مرد اور عورتیں سب اس کو کھا سکتے تھے۔

بخاری نے سعید بن مسیب کا قول نقل کیا ہے کہ بحیرہ وہ اونٹنی ہوتی تھی جس کا دودھ بتوں کے لئے محفوظ مانا جاتا تھا کوئی اس کو دوہتا نہ تھا اور سائبہ وہ سانڈھنی ہوتی تھی جو دیوتاؤں کے نام پر آزاد چھوڑ دی جاتی تھی کوئی اس پر سوار نہ ہوتا تھا اور وصیلہ وہ اونٹنی ہوتی تھی جس کے پہلے بیاہت میں نر اور دوسرے میں مادہ پیدا ہوتی تھی اگر مادہ کے بعد تیسری مرتبہ میں بھی مادہ بچہ پیدا ہوتا تو بتوں کے نام پر اس کو آزاد چھوڑ دیتے تھے اس کو وصیلہ کہتے تھے۔ حام وہ اونٹ ہوتا تھا جو محدود معین عدد میں جب جفتی کر چکا اور اس کی نسل سے مقررہ عدد (میں بچے) پیدا ہو چکتے تو اس کو بتوں کے نام پر آزاد چھوڑ دیتے تھے پھر اس پر کسی قسم کا بوجھ نہیں لادا جاتا تھا اس کو حام کہتے تھے۔

حضرت ابوہریرہؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا میں نے دیکھا کہ عمرو بن عامر خزاعی دوزخ کے اندر اپنی انتڑیاں گھسیٹے پھر رہا تھا اسی نے سب سے پہلے سائبہ بنانے کی رسم قائم کی۔

بغوی نے محمد بن اسحاق کی روایت سے حضرت ابوہریرہؓ کا بیان نقل کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے اکثم بن جون خزاعی سے فرمایا اکثم میں نے دیکھا کہ عمرو بن لحی بن قمعہ بن خندف اپنی انتڑیاں دوزخ کے اندر کھینچ پھر رہا ہے۔ میں نے نہیں دیکھا کہ کوئی کسی کا اتنا ہم شکل ہو جتنا تو عمرو سے اور عمرو تجھ سے مشابہ تھا۔ عمرو بن لحی نے ہی سب سے پہلے دین اسماعیل کو بگاڑا استھان قائم کئے بحیرہ اور سائبہ بنانے کی رسم ایجاد کی۔ وصیلہ کو وصیلہ اور حامی کو حامی بنانے کی بنیاد ڈالی میں نے خود دیکھا کہ اس کی آنتوں کی بدبو سے دوزخیوں کو بھی اذیت ہو رہی تھی۔ اکثم نے عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ کیا اس کا ہم شکل ہونے سے مجھے کچھ ضرر پہنچے گا۔ فرمایا نہیں۔ تو یقیناً مومن ہے اور وہ کافر تھا۔

وَلٰكِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا يَفْتَرُوْنَ عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ ط (لیکن یہ کافر اللہ پر دروغ بندی کرتے ہیں۔) یعنی کہتے ہیں کہ اللہ نے ہم کو یہ باتیں کرنے کا حکم دیا ہے۔

وَاَكْثَرُهُمْ لَا يَعْقِلُوْنَ ۝ (اور ان میں سے اکثر جانتے بھی نہیں ہیں) کہ حلال اور حرام قرار دینے کی وجہ کیا ہے، بلکہ اپنے جاہل بزرگوں کی تقلید کرتے ہیں۔ آیت میں اس امر کی طرف اشارہ ہے کہ بعض لوگ اپنے طریقہ کی غلطی کو جانتے ہیں مگر سرداری کی محبت اور باپ دادا کی تقلید ان کو اقرار حق سے روکتی ہے۔

وَاِذَا قِيْلَ لَهُمْ تَعَالَوْا اِلٰى مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ وَاِلَى الرَّسُوْلِ (اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ (حلت و حرمت کے متعلق) اللہ نے جو حکم نازل کیا اور رسول نے جو کچھ فرمایا اس کی طرف آؤ (اس کو مانو اور عمل کرو)۔

قَالُوْا حَسْبُنَا مَا وَجَدْنَا عَلَيْهِ اٰبَآءَنَا (تو کہتے ہیں جس طریقہ پر ہم نے اپنے باپ دادا کو پایا ہے وہی ہمارے لئے کافی ہے) یہ کافروں کی کوتاہ فہمی کا اظہار ہے اور اس امر کی صراحت ہے کہ سوائے باپ دادا کی تقلید کے ان کے پاس اور کوئی دلیل نہیں ہے۔

اَوَلَوْ كَانَ اٰبَآؤُهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ شَيْئًا وَّلَا يَهْتَدُوْنَ ۝ (کیا اس حالت میں بھی تقلید اسلاف ان کے لئے کافی ہوگی جبکہ ان کے باپ دادا کچھ (صحیح) علم نہیں رکھتے تھے اور نہ ہدایت یافتہ تھے۔ او میں واو حالیہ ہے اور ہمزہ انکاریہ۔ یعنی کیا باپ دادا کی جہالت اور گمراہی کی تقلید بھی ان کے لئے کافی ہو سکتی ہے۔ حاصل مطلب یہ ہے کہ تقلید تو صرف ہدایت یافتہ علماء ہی کی مناسب ہے (جاہل گمراہوں کی پیروی جہالت اور گمراہی ہے

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا عَلَيْكُمْ اَنْفُسَكُمْ ۚ[1] (اے ایمان والو! اپنی فکر رکھو یعنی اپنی اصلاح کو لازم قرار دو۔)

لَا يَضُرُّكُمْ مَّنْ ضَلَّ اِذَا اهْتَدَيْتُمْ ۭ (جب تم راہ راست پر قائم رہو گے تو جو گمراہ ہے وہ تمہارا کچھ نہ بگاڑ سکے گا۔)

بعض علماء نے لکھا ہے کہ آیت کا نزول اس وقت ہوا تھا جب مسلمان کافروں کی حالت پر افسوس کرتے اور ان کے مسلمان ہو جانے کی تمنا کرتے تھے۔ احمد اور طبرانی نے حضرت ابو عامر اشعری کا بیان نقل کیا ہے کہ میں نے رسول اللہ ﷺ سے اس آیت کی تشریح دریافت کی (کہ مَنْ ضَلَّ سے کون لوگ مراد ہیں) فرمایا کافر جو گمراہ ہیں تم کو کوئی ضرر نہ پہنچا سکیں گے جب کہ تم راہ راست پر رہو گے۔ مجاہد اور سعید بن جبیر نے کہا مَنْ ضَلَّ سے مراد یہودی اور عیسائی ہیں یعنی اے مسلمانو! اگر تم راہ راست پر قائم رہو گے تو اہل کتاب تم کو ضرر نہ پہنچا سکیں گے۔ لہٰذا تم ان سے جزیہ لو اور ان کو چھوڑ دو۔

بعض علماء کا بیان ہے کہ (دور صحابہ میں) جب بعض لوگ مسلمان ہوتے تھے تو (بھائی بندوں کی طرف سے) ان سے کہا جاتا تھا تو نے اپنے باپ کو بیوقوف مجبور کیا ہے (اس کی تفصیل) عفرہ کے آزاد کردہ غلام حضرت عمر نے بیان کی ہے جس کو ابن ابی حاتم نے نقل کیا ہے کہ آیت يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا عَلَيْكُمْ اَنْفُسَكُمْ کی وجہ نزول یہ تھی کہ بعض لوگ جب مسلمان ہو جاتے اور ان کے باپ یا بھائی کافر ہوتے تو چونکہ ایمان کی چاشنی اس مسلمان کے دل نشین ہو چکی تھی اس لئے وہ اپنے باپ اور بھائی کو بھی مسلمان ہو جانے کی دعوت دیتا تھا۔ جواب میں وہ لوگ کہتے تھے، باپ دادا کا طریقہ ہمارے لئے کافی ہے اس پر آیت مذکورہ کا نزول ہوا۔

آیت کا مقصد یہ نہیں ہے کہ بھلائی کا حکم اور برائی سے باز داشت ترک کر دو (اور تبلیغ کو ختم کر دو) کیونکہ بقدر طاقت امر بالمعروف اور نہی عن المنکر خود ہدایت کے ذیل میں داخل ہے۔ حضرت ابو بکر صدیق نے فرمایا تھا لوگو! تم آیت يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ

---

[1] عفرہ کے آزاد کردہ غلام عمر کی روایت سے ابن ابی حاتم نے لکھا ہے کہ آیت يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا عَلَيْكُمْ اَنْفُسَكُمْ کی وجہ نزول یہ ہے کہ بعض لوگ خود تو مسلمان ہو جاتے تھے مگر ان کے باپ بھائی کافر رہتے تھے ایسے مسلمانوں کو جب ایمان کی چاشنی مل گئی تو انہوں نے باپ اور بھائیوں کو بھی اسلام کی دعوت دی لیکن انہوں نے جواب دیا ہم کو باپ دادا کا طریقہ کافی ہے اس پر آیت مذکورہ نازل ہوئی۔

اٰمَنُوْا عَلَيْكُمْ اَنْفُسَكُمْ لَا يَضُرُّكُمْ مَّنْ ضَلَّ اِذَا اهْتَدَيْتُمْ پڑھتے ہو اور اس کا مطلب غلط سمجھتے ہو۔ میں نے خود رسول اللہ ﷺ سے سنا آپ فرما رہے تھے، لوگ اگر برائی کو دیکھ کر اس کو نہ بدلیں گے (یعنی بدلنے کی کوشش نہیں کریں گے) تو ہو سکتا ہے کہ اللہ سب کو عذاب میں عموماً مبتلا کر دے۔ رواہ ابن ماجہ والترمذی، ترمذی نے اس کو صحیح قرار دیا ہے۔

ابو داؤد کی روایت میں ہے اگر لوگ ظالم کو (ظلم کرتے) دیکھیں اور اس کے ہاتھ نہ پکڑیں تو ممکن ہے اللہ سب کو عموماً عذاب میں مبتلا کر دے۔ ایک اور روایت میں آیا ہے جن لوگوں کے اندر گناہ کئے جائیں اور لوگ ان کو بدل سکتے ہوں لیکن (باوجود قدرت کے) نہ بدلیں تو ہو سکتا ہے کہ اللہ عموماً سب پر عذاب لے آئے۔ دوسری روایت میں آیا ہے جس قوم میں گناہ کئے جاتے ہوں اور گناہ نہ کرنے والے کرنے والوں سے زیادہ ہوں الخ۔ تیسری روایت میں آیا ہے لوگ بھلائی کا حکم دیں اور برائی سے باز داشت کریں ورنہ شریر لوگوں کو اللہ تم پر مسلط کر دے گا پھر وہ تم کو بدترین عذاب کی تکلیفیں دیں گے اس وقت تم میں سے نیک لوگ بھی اگر تمہارے لئے دعا کریں گے تو ان کی دعا قبول نہ ہوگی۔

بغوی نے لکھا ہے کہ اس آیت کی تشریح میں حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا بھلائی کا حکم دو اور برائی سے روکو جب تک تمہاری بات مانی جائے اگر تمہاری بات لوٹا دی جائے تو پھر (تنہا) اپنی (اصلاح کی) فکر کرو۔ قرآن میں کچھ آیات ایسی نازل ہوئیں جن کا مصداق نزول سے پہلے ہی گزر چکا، کچھ آیات ایسی نازل ہوئیں جن کا مصداق رسول اللہ ﷺ کے زمانہ میں موجود ہو گیا، کچھ آیات کا مصداق رسول اللہ کے تھوڑے زمانہ بعد واقع ہو گیا۔ کچھ آیات کا مصداق اب سے کچھ بعد آجائے گا۔ کچھ آیات کا مصداق آخر زمانہ میں واقع ہوگا اور کچھ آیات کا مصداق جن میں حساب، جنت اور دوزخ کا ذکر ہے قیامت کے دن آئے گا۔ پس جب تک تمہارے دل اور خواہشات متحد ہوں اور فرقہ بندی ہو کر آپس میں تم گتھم گتھا نہ ہو جاؤ اور ایک دوسرے پر حملہ آور نہ ہو اس وقت تک بھلائی کی تبلیغ اور برائی سے باز داشت کرو اور جب دلوں میں اور خیالات میں پھوٹ پڑ جائے اور فرقہ بندی ہو کر آپس میں تم گتھم گتھا ہو جاؤ اور ایک دوسرے پر حملہ کرنے لگے اس وقت ہر شخص کو صرف اپنی (اصلاح کی) فکر کرنی چاہئے ایسے وقت میں اس آیت کا مصداق متحقق ہوگا۔ عبد بن حمید، ابن ابی حاتم، ابو الشیخ اور بیہقی نے شعب الایمان میں بحوالہ ابو العالیہ مذکورہ بالا بیان کی نسبت حضرت عبداللہؓ بن مسعود کی طرف کی ہے۔

ترمذی اور ابن ماجہ نے حضرت ابو ثعلبہ خشنی کا بیان نقل کیا ہے حضرت ابو ثعلبہ نے کہا خدا کی قسم میں نے اس آیت کا مطلب رسول اللہ ﷺ سے دریافت کیا تھا۔ حضور نے فرمایا (اس آیت کا مطلب یہ نہیں ہے کہ امر و نہی ترک کر کے بیٹھ رہو) بلکہ مطلب یہ ہے کہ بھلائی پر چلو اور برائی سے باہم روکتے رہو اور خود بھی باز رہو، لیکن جب دیکھو کہ لوگ ہوا و ہوس کے بندے ہو گئے ہیں، خواہشات کے پیچھے پڑے ہیں، دنیا کو (دین پر) ترجیح دی جا رہی ہے اور ہر شخص خود رائے ہو گیا ہے، اپنے خیال میں مست ہے اور تم کو بھی کچھ کرنا ہی ہو (کچھ کرنے پر تم مجبور ہو) تو ایسے وقت میں صرف اپنے نفس (کی اصلاح) کی فکر کرو اور عوام کی فکر چھوڑ دو۔ یہ امر یقینی ہے کہ تمہارے آگے کچھ مصائب کا زمانہ آئے گا۔ ان شدائد میں صبر رکھنا اتنا مشکل ہوگا جیسے انگاروں کو مٹھی میں دبانا۔ اس وقت نیک عمل کرنے کا ثواب ان پچاس آدمیوں کے برابر ہوگا جنہوں نے اسی جیسی نیکی کی ہو۔ صحابہ نے عرض کیا یارسول اللہ ﷺ کیا اس شخص کا اجر ان میں سے ہی پچاس آدمیوں کے برابر ہوگا فرمایا تمہارے پچاس آدمیوں کے برابر۔

بعض اہل روایت کا قول ہے کہ آیت مذکورہ کا نزول اہل بدعت کے حق میں ہوا تھا۔ ابو جعفر رازی نے ذکر کیا ہے کہ صفوان بن محرز کے پاس ایک بدعتی جوان آیا اور اپنی کسی بات کا ذکر کرنے لگا۔ صفوان نے کہا میں تم کو کلام اللہ کی ایک خاص آیت بتاتا ہوں جس میں اللہ نے اپنے اولیاء کا مخصوص طور پر ذکر کیا ہے فرمایا ہے يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا عَلَيْكُمْ اَنْفُسَكُمْ لَا يَضُرُّكُمْ مَّنْ ضَلَّ اِذَا اهْتَدَيْتُمْ

اِلَى اللّٰهِ مَرْجِعُكُمْ جَمِيْعًا (تم سب کی (یعنی گمراہ اور ہدایت یافتہ لوگوں کی) اللہ ہی کی طرف واپسی ہے۔)

فَيُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ۞ (پھر وہ تم کو ان اعمال کی اطلاع دے گا جو تم کرتے رہے تھے۔)

یعنی ہر شخص کو اس کے عمل کا بدلہ دے گا کسی کو دوسرے کے قصور پر نہیں پکڑے گا۔ اس فقرہ میں گمراہ اور ہدایت یافتہ دونوں گروہوں کے لئے وعدہ اور وعید ہے۔ بغوی نے ذکر کیا ہے اور بخاری، ابوداؤد اور ترمذی نے بھی بغوی کے بیان کی طرح حضرت ابن عباسؓ کا قول نقل کیا ہے کہ تمیم داری اور عدی بن بدا تجارت کے لئے شام کو گئے جس زمانہ میں یہ دونوں عیسائی تھے۔ ان کے ساتھ عمرو بن عاص کے آزاد کردہ غلام بدیل بھی تھے۔ بدیل مسلمان تھے شام پہنچ کر بدیل بیمار ہوگئے (موت کا یقین ہو گیا تو) اپنے موجود سامان کی ایک فہرست لکھ کر سامان میں ڈال دی اور ساتھیوں کو اطلاع نہیں دی بلکہ دونوں ساتھیوں کو وصیت کردی کہ میرا سامان میرے گھر پہنچا دینا، پھر مر گئے۔ دونوں ساتھیوں نے سامان کی تلاشی لی تو سامان میں چاندی کا ایک برتن ملا جس کا وزن تین سو مثقال تھا اور اس پر سنہری کام کیا ہوا تھا دونوں نے وہ برتن لے کر چھپا لیا اور اپنے کاروبار سے فارغ ہو کر جب مدینہ لوٹے تو بدیل کے گھر والوں کو بدیل کا سامان پہنچا دیا۔ بدیل کے گھر والوں نے سامان کی جانچ کی تو اس کے اندر موجودات کی ایک فہرست لکھی ہوئی ملی، انھوں نے تمیم اور عدی سے آکر پوچھا تو کیا اس نے کوئی تجارت کی تھی، دونوں نے جواب دیا نہیں۔ گھر والوں نے کہا تو کیا اس کی بیماری اتنی لمبی ہو گئی تھی کہ اس کو کوئی چیز خرچ کرنی پڑی تھی، دونوں نے کہا نہیں اس وقت گھر والوں نے کہا ہمیں سامان میں ایک تحریر ملی ہے جس میں پورے سامان کی فہرست ہے مگر سامان میں چاندی کا ایک پیالہ سونے کے ملمع والا جس کا وزن تین سو مثقال تھا موجود نہیں ہے دونوں نے جواب دیا، ہمیں معلوم نہیں ہم سے اس نے کہا تھا کہ سامان تمہارے پاس پہنچا دیں ہم نے پہنچا دیا ہم کو برتن کا کچھ علم نہیں، غرض انھوں نے انکار کر دیا اور معاملہ کی رپورٹ رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں پیش کی گئی اس پر آیت ذیل نازل ہوئی۔

يَاأَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا شَهَادَةُ بَيْنِكُمْ اِذَا حَضَرَ اَحَدَكُمُ الْمَوْتُ حِيْنَ الْوَصِيَّةِ اثْنٰنِ (اے مسلمانو! تمہارے آپس میں دو آدمیوں کا وصی ہونا مناسب ہے جب کہ تم میں سے کسی کو موت آنے لگے وصیت کے وقت۔)

شَهَادَةُ بَيْنِكُمْ مبتدا ہے اور اثْنَانِ خبر۔ اثْنَانِ سے پہلے لفظ شَهَادَةُ محذوف ہے۔ الفاظ کے اعتبار سے جملہ خبریہ ہے لیکن معنی امر کے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ وصیت کے وقت دو آدمی موجود ہوں یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اِثْنَانِ، شَهَادَةُ (مصدر) کا فاعل ہو اور شَهَادَةُ مبتدا ہو اور اس کی خبر اس سے پہلے محذوف ہو یعنی جس چیز کی وصیت مرد نے کی ہے اس پر دو آدمیوں کی شہادت ہو۔ شہادت سے مراد ہے گواہ بنانا یعنی دو آدمیوں کو وصی بنا لے تاکہ میت ان سے کہہ دے۔ قصہ کی روایت سے ظاہر ہوتا ہے مراد وصی ہے جیسے دوسری آیت میں آیا ہے وَلْيَشْهَدْ عَذَابَهُمَا طَائِفَةٌ مِّنَ الْمُؤْمِنِيْنَ۔

دو کی قید احتیاطی ہے (ضروری اور لازم نہیں) اور یہ ہدایت عام وصیت کے وقت ہے۔ بس ایک ہی کافی ہے۔ اِذَا حَضَرَ شہادت کا ظرف زمان ہے یعنی جب موت کا وقت آ جائے۔ مطلب یہ کہ جب موت کی علامات نمودار ہو جائیں۔ حِيْنَ الْوَصِيَّةِ حَضَرَ کا ظرف ہے یا اِذَا حَضَرَ سے بدل ہے یعنی قرار دینے سے اس طرف اشارہ ہو جاتا ہے کہ موت کے وقت وصیت کو ترک کر دینا چاہئے موت آنے کا وقت بالآخر وصیت کا وقت ہے (یعنی) اصل مقصود تو ہے وصیت کی تاکید ہو۔ بیضاوی مفسر نے اسی ضابطہ کی طرف ایماء کیا ہے۔

ذَوَا عَدْلٍ مِّنْكُمْ (جو تم میں سے ہوں اور نیک مزاج ہوں تم میں سے) یعنی مسلمانوں میں سے کیونکہ نیک مسلمان کی امانت دار ہونے کا امکان زیادہ غالب ہے۔

اَوْ اٰخَرٰنِ مِنْ غَيْرِكُمْ (یا غیر مسلموں میں سے کوئی دوسرے دو آدمی ہوں۔)

اِنْ اَنْتُمْ ضَرَبْتُمْ فِي الْاَرْضِ فَاَصَابَتْكُمْ مُّصِيْبَةُ الْمَوْتِ (اگر تم کہیں سفر میں گئے ہو اور تم پر موت کا حادثہ آ پڑے) (پھر تم نے ان کو وصی بنایا ہو اور ان کو مال دیا ہو اور کسی وارث نے ان پر خیانت کا شبہ کیا ہو اور وہ دونوں خیانت کے منکر ہوں۔ یہ تمام امور محذوف ہیں قصہ بدیل ان کے حذف پر دلالت کر رہا ہے۔

تَحْبِسُوْنَهُمَا تم خیانت کا انکار کرنے والے (دونوں وصیوں) کو روکے رکھو۔ یہ لفظ اثنان کی بھی صفت ہو سکتا ہے اور آخران کی بھی۔ یعنی وصیت کے وقت جو دونوں شخص موجود تھے ان میں سے ہر ایک کو روکے رکھو۔

مِنْۢ بَعْدِ الصَّلٰوةِ (نماز کے بعد) یعنی عصر کی نماز کے بعد کیونکہ یہی وقت لوگوں کے بھی زیادہ اجتماع کا ہے اور شب و روز کے ملائکہ کے ملنے کا بھی۔ بعض کے نزدیک عام نماز مراد ہے۔

فَيُقْسِمٰنِ بِاللّٰهِ اِنِ ارْتَبْتُمْ لَا نَشْتَرِيْ بِهٖ ثَمَنًا وَّلَوْ كَانَ ذَا قُرْبٰى ۙ وَلَا نَكْتُمُ شَهَادَةَ ۙ اللّٰهِ اِنَّآ اِذًا لَّمِنَ الْاٰثِمِيْنَ ۝ (اگر تم کو شبہ ہو تو (نماز کے بعد دونوں میں سے ہر ایک کو روک رکھو) پھر وہ اللہ کی قسم کھائیں (اور کہیں) کہ اس قسم کے عوض ہم کوئی دنیوی نفع لینا نہیں چاہتے اگرچہ کوئی قرابت والا ہی ہو اور اللہ کی بات کو ہم پوشیدہ نہیں کریں گے (ورنہ) اس حالت میں سخت گناہگار ہوں گے)۔

یعنی اگر کسی وارث کو شبہ ہو اور وہ دونوں وصیوں کو خائن قرار دے اور وصی خیانت کا انکار کریں تو حاکم وصیوں سے قسم لے اور دونوں وصی قسم کھائیں۔ لیکن اگر وارثوں کو خیانت کا شبہ نہ ہو تو وصیوں کو قسم دینے کی ضرورت نہیں ہے۔

اِنِ ارْتَبْتُمْ کی شرط بطور جملہ معترضہ ہے قسم کا جواب لَا نَشْتَرِيْ ہے۔ لَا نَشْتَرِيْ بِهٖ یعنی ہم قسم باللہ کے عوض نہیں لیں گے۔ ثَمَنًا یعنی دنیوی مال مراد ہے کہ ہم لالچ میں آکر جھوٹی قسم نہیں کھاتے۔ وَلَوْ كَانَ ذَا قُرْبٰى سے یہ مراد ہے کہ وصی خواہ میت کا قرابتدار ہی ہو اور وارث اس پر خیانت کا شبہ کریں تو اس سے بھی قسم لی جائے گی قسم لینے کا حکم صرف اجنبی اور غیر کے ساتھ ہی مخصوص نہیں ہے۔ شَهَادَةَ اللّٰهِ یعنی وہ شہادت جس کو ادا کرنے کا اللہ نے حکم دیا ہے۔ شہادت سے مراد ہے حق کو ظاہر کرنا اور سچ کہنا خواہ اپنی ذات کے خلاف پڑے۔ اِنَّآ اِذًا یعنی اگر ہم حق پوشی کریں گے تو اس حالت میں ہم بے شک گناہ گار ہوں گے۔

اس آیت کے نزول کے بعد رسول اللہ ﷺ نے عصر کی نماز کے بعد تمیم اور عدی کو بلا کر منبر کے پاس اس طرح قسم لی کہ قسم ہے اس اللہ کی جس کے سوا کوئی معبود نہیں کہ ہم نے اس چیز میں کوئی خیانت نہیں کی جو بدیل نے ہم کو دیا تھا۔ دونوں نے یہ قسم کھائی اور رسول اللہ ﷺ نے ان کو آزاد کر دیا۔ پھر ایک طویل مدت کے بعد وہ برتن ان دونوں کے پاس پایا گیا۔ سعید بن جبیرؓ نے حضرت ابن عباسؓ کی روایت سے بیان کیا کہ وہ برتن مکہ میں ملا اور جن لوگوں کے پاس ملا تھا انہوں نے کہا کہ تمیم و عدی سے ہم نے خریدا ہے یہ خبر بنی سہم کو پہنچی تو وہ تمیم و عدی کے پاس گئے۔ تمیم و عدی نے کہا ہم نے یہ برتن بدیل سے خرید لیا تھا۔ بنی سہم نے کہا تم نے تو پہلے یہ کہا تھا کہ بدیل نے کوئی چیز نہیں فروخت کی۔ کہنے لگے فروخت کرنے کا کوئی ثبوت تو ہمارے پاس تھا نہیں، اس لئے ہم نے پسند نہیں کیا کہ اس کے موجود ہونے کا تم سے اقرار کریں پوشیدہ رکھنے کی یہی وجہ ہوئی۔ بنی سہم نے رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں مرافعہ کیا تو آیت ذیل نازل ہوئی۔

فَاِنْ عُثِرَ عَلٰٓى اَنَّهُمَا اسْتَحَقَّآ اِثْمًا (پھر اگر اطلاع ملے کہ وہ دونوں وصی گناہ کے مستوجب ہوئے ہیں) یعنی انہوں نے اپنی خیانت کی وجہ سے ایسا فعل کیا ہے جو موجب گناہ ہے مطلب یہ کہ الزام خیانت کو اپنے اوپر سے دفع کرنے کے لئے انہوں نے جھوٹی قسمیں کھائی ہوں یا خریدنے کا دعویٰ کیا ہو یا ایسی ہی کوئی اور حرکت کی ہو عثر کا اصل معنی ہے کسی چیز پر گر پڑنا۔ یہاں مراد ہے اطلاع ملنا۔

فَاٰخَرٰنِ يَقُوْمٰنِ مَقَامَهُمَا (تو دونوں وصیوں کے مقام پر (قسم کھانے کے لئے) دو آدمی دوسرے کھڑے ہوں)۔

وارثوں میں سے دو (مدعی) شخصوں کو شاہد اس لئے قرار دیا کہ انہوں نے اپنے حق کا دعویٰ کیا ہے اور شریعت نے بھی ان کے حق کو تسلیم کیا ہے اور وہ دونوں سابق شاہدوں (وصیوں) کے گناہ کو ظاہر کر رہے ہیں تو گویا وصیوں کے گناہ کی شہادت دے رہے ہیں۔ میت کے اقرباء میں دو گواہوں کی شرط صرف اس وجہ سے لگائی گئی کہ مذکورہ بالا واقعہ میں ایسا ہی تھا ورنہ اگر میت کا

وارث ایک ہوگا تو اسی سے قسم لی جائے گی یا اگر دو سے زائد وارث ہوں گے تو سب سے قسم لی جائے گی (گویا دو ہونے کی شرط اس وقت ضروری ہے جب وارث صرف دو ہوں ورنہ ضروری نہیں، ایک بھی قسم کھانے والا ہو سکتا ہے اور دو سے زائد بھی) کیونکہ وصی میت سے خرید لینا یا کسی اور طرح سے ترکہ کی چیز کے مالک ہونے کے مدعی ہوتے ہیں اور وارث ان کے دعویٰ کا انکار کرتے ہیں (اور وصیوں کے پاس گواہ نہیں ہوتے لہٰذا مدعا علیہ پر قسم عائد ہوگی)

مِنَ الَّذِيْنَ اسْتَحَقَّ عَلَيْهِمُ الْاَوْلَيٰنِ (ان وارثوں میں سے جن کے اندر سے قریب ترین رشتہ رکھنے والے دو آدمی مستحق ہوئے ہیں) یعنی وارثوں میں سے جو دو شخص میت سے قریب ترین رشتہ رکھنے کی وجہ سے اس امر کے مستحق ہوں کہ تمام وارث اپنے اندر سے انتخاب کر کے ان کو ادائے شہادت کے لئے مقرر کریں اور ان کے ذریعہ سے وصیوں کی دروغ بیانی ظاہر کریں۔ اس مطلب پر عَلَيْهِمْ کی ضمیر وارثوں کی طرف راجع ہوگی اور اس کا تعلق اِسْتَحَقَّ سے ہوگا اور الْاَوْلَيٰنِ، اِسْتَحَقَّ کا فاعل قرار پائے گا۔

بعض قراتوں میں اُسْتُحِقَّ فعل مجہول آیا ہے اس صورت میں عَلَيْهِمْ کا معنی ہوگا یعنی ان کے معاملہ میں ان کے سبب سے جیسے عَلٰى مُلْكِ سُلَيْمٰنَ کا معنی فِي مُلْكِ سُلَيْمٰنَ ہے مطلب یہ کہ جن کے معاملہ کی وجہ سے دونوں قسم کھانے والے گناہ کے مستوجب ہوئے۔ الْاَوْلَيٰنِ، اٰخَرٰنِ کی صفت ہے کیونکہ اٰخَرٰنِ اگرچہ نکرہ اور الْاَوْلَيٰنِ معرفہ ہے لیکن اٰخَرٰنِ کی صفت مِنَ الَّذِيْنَ ہے اور نکرہ موصوف معرفہ کا حکم رکھتا ہے یا الْاَوْلَيٰنِ، اٰخَرٰنِ یا يَقُوْمٰنِ کی ضمیر سے بدل ہے یا مبتدا محذوف کی خبر ہے یعنی هُمَا الْاَوْلَيٰنِ۔

الْاَوْلَيٰنِ سے مراد ایسے قریبی رشتہ دار جن سے زیادہ میت کا کوئی قرابت دار نہ ہو۔

فَيُقْسِمٰنِ بِاللّٰهِ لَشَهَادَتُنَآ اَحَقُّ مِنْ شَهَادَتِهِمَا وَمَا اعْتَدَيْنَآ اِنَّآ اِذًا لَّمِنَ الظّٰلِمِيْنَ ۝

(پھر یہ دونوں رشتہ دار اللہ کی قسم کھائیں کہ بالیقین ہماری یہ قسم ان دونوں (وصیوں) کی قسم سے زیادہ درست ہے اور ہم نے ذرا تجاوز نہیں کیا ہم اس حالت میں سخت ظالم ہوں گے)۔ یعنی وصیوں کی خیانت ظاہر کرنے اور دعویٰ خرید کی تردید کرنے کے لئے دو وارث اللہ کی قسم کھا کر کہیں کہ ان وصیوں کی قسم سے ہماری قسم زیادہ قابل قبول ہے اور قسم کھانے میں ہم حق سے تجاوز نہیں کر رہے ہیں اگر ہم حق سے ہٹیں گے تو بیجا حرکت کے مرتکب ہوں گے، حق کی جگہ باطل کو اختیار کرنے والے ہو جائیں گے۔ آیت میں شہادت سے مراد ہے قسم جیسے دوسری آیت میں آیا ہے فَشَهَادَةُ اَحَدِهِمْ اَرْبَعُ شَهٰدٰتٍ بِاللّٰهِ اِنَّهٗ لَمِنَ الصّٰدِقِيْنَ۔ بخاری کی روایت میں آیا ہے کہ جب یہ آیت نازل ہوئی تو بدیل سہمی کے قریب ترین اقرباء میں سے دو آدمیوں نے کھڑے ہو کر قسم کھائی۔ ترمذی کی روایت ہے کہ عمرو بن عاص اور ان کے ساتھ ایک دوسرے آدمی نے کھڑے ہو کر قسم کھائی تھی۔ بغوی نے دوسرے آدمی کا نام مطلب بن ابی وداعہ سہمی ذکر کیا ہے اور بیان کیا ہے کہ عصر کے بعد ان دونوں نے قسم کھائی۔ شاید ان دونوں نے اس بات کی قسم کھائی ہوگی کہ ہم کو بدیل کا وصیوں کے ہاتھ برتن فروخت کرنا معلوم نہیں۔

حضرت ابن عباسؓ کی روایت سے تمیم داری کا ایک بیان ترمذی نے نقل کیا ہے لیکن دوسرے اہل حدیث نے اس کو ضعیف قرار دیا ہے۔ تمیم داری نے کہا میں اور عدی بن بدا عیسائی تھے اور شام کو آجایا کرتے تھے چنانچہ ہم دونوں تجارت کی غرض سے شام کو گئے ہوئے تھے وہاں ہمارے پاس بنی سہم کا ایک آزاد کردہ غلام جس کا نام بدیل بن ابی مریم تھا وہ تجارت کا مال لے کر پہنچا اس کے پاس چاندی کا ایک پیالہ بھی تھا اتفاقاً وہاں وہ بیمار ہو گیا اور اس نے ہم کو وصیت کی کہ اس کا متروکہ سامان اس کے گھر والوں کو پہنچا دیں۔ یہ وصیت کر کے وہ مر گیا اور ہم دونوں نے وہ پیالہ لے کر ہزار درہم کو فروخت کر کے قیمت تقسیم کر لی پھر جب بدیل کے گھر والوں کے پاس پہنچے تو بدیل کا جو سامان ہمارے پاس تھا ہم نے وہ ان کو دے دیا سامان میں پیالہ ان کو نہیں ملا تو ہم سے پوچھا ہم نے کہا اس کے علاوہ تو بدیل نے ہم کو کوئی اور چیز دی نہیں۔ کچھ مدت کے بعد جب میں مسلمان ہو گیا اور مجھے اس گناہ کا احساس ہوا تو میں بدیل کے رشتہ داروں کے پاس گیا اور اظہار واقعہ کے بعد پانچ سو درہم ان کو دے دیئے اور کہہ دیا کہ اتنے ہی

میرے ساتھی کے پاس ہیں لوگ اس کو لے کر رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں پہنچے حضورؐ نے ان سے گواہ طلب کئے ان کو گواہ نہ ملے تو حضور ﷺ نے حکم دیا کہ عدی سے قسم لے لی عدی نے قسم کھالی اس پر آیت یٰاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا شَهَادَةُ بَیْنِكُمْ سے اَنْ تُرَدَّ اَیْمَانٌ بَعْدَ اَیْمَانِهِمْ تک نازل ہوئی تو عمرو بن العاص اور ان کے ساتھ ایک اور آدمی نے کھڑے ہو کر قسم کھائی اور عدی بن بداء سے پانچ سو درہم نکلوا لئے گئے۔

ذٰلِكَ (یہ) یعنی وارثوں کے شبہ کی صورت میں وصیوں سے قسم لینا اور وصی خریدنے کا دعویٰ کریں تو وارثوں کو قسم کھلوانا۔

اَدْنٰۤى اَنْ یَّاْتُوْا بِالشَّهَادَةِ عَلٰى وَجْهِهَاۤ اَوْ یَخَافُوْۤا اَنْ تُرَدَّ اَیْمَانٌۢ بَعْدَ اَیْمَانِهِمْ (قریب ترین ذریعہ ہے اس امر کا کہ وہ (وصی) واقعہ کو ٹھیک طور پر ظاہر کریں یا اس بات سے ڈر جائیں کہ ان سے قسمیں لینے کے بعد بھی قسمیں لوٹائی جائیں گی۔

یَاْتُوْا کی ضمیر وصیوں کی طرف راجع ہے اور شہادت سے مراد ہے اظہار حق اور میت کی کی ہوئی وصیت کا بیان۔ عَلٰى وَجْهِهَا سے مراد یہ ہے کہ جیسی وصیت تھی بلا تغیر خیانت کے ویسا ہی ظاہر کر دیں۔ یَخَافُوْا کا عطف یَاْتُوْا پر ہے۔ تُرَدَّ اَیْمَانٌ کا یہ مطلب ہے کہ وصیوں کے انکار کے بعد پھر وارثوں سے قسم لی جائے گی۔

وَاتَّقُوا اللّٰهَ (اور اللہ سے ڈرو) اس جملہ کا عطف محذوف جملہ پر ہے یعنی اللہ کے احکام کی پابندی کرو اور اللہ سے ڈرو۔

وَاسْمَعُوْا (اور (اللہ نے تم کو جو حکم دیا ہے اس کو گوش قبول سے) سنو)۔

وَاللّٰهُ لَا یَهْدِی الْقَوْمَ الْفٰسِقِیْنَ۠ (اگر تم اللہ سے نہیں ڈرو گے اور اس کا حکم نہیں سنو گے تو اللہ کے دائرہ طاعت سے خارج ہو جاؤ گے) اور دائرہ طاعت سے خارج ہونے والے لوگوں کو اللہ ہدایت نہیں فرماتا) یعنی (دنیا میں) کسی دلیل کی ہدایت نہیں کرتا (آخرت میں) جنت کا راستہ نہیں بتائے گا۔

ہماری اس تشریح پر آیات مذکورہ کی شان نزول سے مطابقت ہو جائے گی اور کسی جملہ کو منسوخ قرار دینے کی ضرورت نہ ہوگی کیونکہ وارثوں کے دعوے کا اگر وصی انکار کرے تو اس پر قسم کا عائد ہونا اور وصی اگر مال خیانت کو میت سے خرید لینے وغیرہ کا دعویٰ کرے اور وارث منکر ہوں تو وارثوں پر قسم کا عائد ہونا غیر منسوخ اور محکم حکم ہے اور علماء کے نزدیک یہ امر تسلیم شدہ ہے کہ سورۃ مائدہ کی کوئی آیت منسوخ نہیں۔

لیکن حسن زہری اور عکرمہ نے آیت کا تفسیری مطلب اس طرح بیان کیا ہے کہ میت مرنے کے وقت اگر کسی کے متعلق کچھ وصیت کرنا چاہے تو دو آدمیوں کو گواہ بنالے تاکہ موصیٰ لہ کے لئے وہ حاکم کے سامنے جا کر شہادت دے سکیں ظاہر آیت لَا نَشْتَرِیْ بِهٖ ثَمَنًا وَّلَوْ كَانَ ذَا قُرْبٰى اس مطلب پر دلالت کر رہی ہے۔ مقصد یہ ہے کہ گواہ جس کے موصیٰ لہ اگرچہ ہمارا قرابت دار ہے مگر ہم کسی نرخ میں آکر زیادہ اس کی وصیت کی شہادت نہیں دیں گے اس صورت میں ذَوَا عَدْلٍ مِّنْكُمْ اَوْ اٰخَرٰنِ مِنْ غَیْرِكُمْ کا مطلب یہ ہوگا کہ دو گواہ وصیت کرنے والے کے قبیلہ کے ہوں یا کسی اور قبیلہ خاندان کے۔

مسئلہ:۔ کسی معاملہ میں مسلمان کے خلاف کافر کی شہادت قابل قبول نہیں۔ یہ مسئلہ مسلمہ ہے۔ لیکن اکثر اہل تفسیر یہاں تک کہ حضرت ابن عباسؓ، حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ، سعید بن مسیب، ابراہیم نخعی، سعید بن جبیر، مجاہد اور عبیدہ نے آیت کی تفسیر میں مِنْكُمْ سے مراد مسلمانوں میں سے اور مِنْ غَیْرِكُمْ سے مراد کافروں میں سے ہونے کی صراحت کی ہے (اس تفسیر پر لازم آتا ہے کہ مسلمان پر کافر کی شہادت قابل قبول ہو) لہٰذا کچھ اور علماء کی ایک جماعت نے تو اس آیت کو منسوخ قرار دیا ہے اور بیان کیا ہے کہ ابتدائی دور میں یہ حکم تھا مسلمان پر کافر کی شہادت مان لینے کا جواز تھا لیکن پھر یہ حکم منسوخ کر دیا گیا اب مسلمان پر کافر کی شہادت ناقابل سماعت ہے۔

ع ۱۴

بعض علماء کا قول ہے کہ آیت محکم ہے اگر مسلمان نہ ملیں تو کافروں کو شاہد بنانا درست ہے۔ قاضی شریح نے کہا سفر کی حالت میں اگر وصیت پر گواہ بنانے کے لئے مسلمان نہ ملیں تو کافروں کو گواہ بنایا جا سکتا ہے مگر یہ حکم صرف وصیت کا گواہ بنانے کا ہے وصیت کے علاوہ اور کسی مسئلہ کا گواہ کافروں کو نہیں بنایا جا سکتا۔

شعبی نے بیان کیا کہ دقوقا میں ایک مسلمان کا وقت وفات آپہنچا اور اس نے کچھ وصیت کرنا چاہی مگر کوئی مسلمان گواہ ملا نہیں، آخر اس نے دو اہل کتاب میں سے دو آدمیوں کو وصیت کا گواہ بنایا اور دونوں شخص اس کا متروکہ سامان لے کر کوفہ میں پہنچے اور حضرت ابو موسیٰ اشعری کی خدمت میں حاضر ہو کر سامان پیش کر دیا اور وصیت کی اطلاع دیدی۔ اشعری نے فرمایا رسول اللہ ﷺ کے زمانہ کے بعد ایسا واقعہ کوئی اور پیش نہیں آیا۔ پھر آپ نے دونوں سے قسم لی اور ان کی شہادت کے مطابق حکم نافذ کر دیا۔

میں کہتا ہوں اگر آیت کو محکم مانا جائے تو اگر کسی وجہ سے غیر مسلم گواہوں کے بیان میں کوئی جھوٹ محسوس ہو تو وارثوں سے قسم لی جائے (کہ یہ غیر مسلم گواہ غلط کہتے ہیں)

يَوْمَ يَجْمَعُ اللّٰهُ الرُّسُلَ (جس روز اللہ پیغمبروں کو جمع کرے گا) یعنی قیامت کے دن یَوْمَ یَجْمَعُ کا تعلق یا تو لَا يَهْدِي سے ہے یعنی جس روز اللہ پیغمبروں کو جمع کرے گا اس روز کافروں کو جنت کا راستہ نہیں دکھائے گا یا اتَّقُوا کے مفعول سے بدل ہے یا اسْمَعُوا کا مفعول ہے اور مضاف محذوف ہے یعنی روز قیامت کی خبر سنو یا فعل محذوف کا مفعول ہے یعنی یاد کرو اور ڈرو روز قیامت سے۔

فَيَقُوْلُ مَاذَآ اُجِبْتُمْ (پھر فرمائے گا تم کو (امت کی طرف سے) کیا جواب دیا گیا)۔ مَاذَا۔ اُجِبْتُمْ کا مفعول مطلق ہے (یعنی کس قسم کا تم کو جواب دیا گیا) قوم کو سرزنش کرنے کے لئے انبیاء سے یہ سوال کیا جائے گا جیسے دوسری آیت میں ہے وَإِذَا الْمَوْءُدَةُ سُئِلَتْ بِأَيِّ ذَنْبٍ قُتِلَتْ کہ زندہ درگور کی ہوئی لڑکی سے سوال کیا جائے گا کہ کس قصور پر تجھے قتل کیا گیا (یہ سوال بھی قاتل کو سرزنش کرنے کے لئے کیا جائے گا)۔

قَالُوْا لَا عِلْمَ لَنَا (وہ پیغمبر) عرض کریں گے ہم کو اس کا کچھ علم نہیں ہے۔

حضرت ابن عباسؓ، حسنؒ، مجاہد اور سدی نے کہا قیامت کی ہولناکیاں اور لرزہ انگیزیاں دلوں کو ان کی جگہ سے ہلا دیں گی اور پیغمبر گھبرا جائیں گے۔ گھبراہٹ میں کوئی جواب نہ بن پڑے گا اور عرض کریں گے ہم کو کچھ علم نہیں۔ پھر جب ہوش و حواس کچھ ٹھکانے آئیں گے تو اپنی اپنی امتوں کے متعلق شہادت دیں گے۔ ابن جریج نے کہا آیت کا مطلب یہ ہے کہ پیغمبر عرض کریں گے ہم کو معلوم نہیں کہ امت والوں کا آئندہ کیا ہوا ہمارے بعد انہوں نے (دین میں) کیا کیا نئی باتیں ملا دیں اور دلوں کے اندر کیا کیا خیالات چھپائے رکھے۔

اِنَّكَ اَنْتَ عَلَّامُ الْغُيُوْبِ (بس تو ہی ڈھکی چھپی باتوں کو بخوبی جاننے والا ہے) ہم جس سے لاعلم ہیں اس سے تو واقف ہے اور ہم کو تو صرف اپنے سامنے کی باتوں سے واقفیت ہے۔ ابو بکرؒ اور حمزہؒ نے قرآن میں ہر جگہ غِیُوب بکسر غین پڑھا ہے باقی قراء کے نزدیک غُیُوب بضم غین ہے۔

حضرت انسؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا (قیامت کے دن) حوض پر میرے پاس کچھ لوگ آرہے ہوں گے کہ میں ان کو پہچان لوں گا لیکن ان کو میرے پاس پہنچنے سے پہلے ہی روک لیا جائے گا۔ میں کہوں گا یہ تو میرے پیارے صحابی ہیں یہ تو میرے پیارے ساتھی ہیں۔ جواب ملے گا تم کو علم نہیں کہ انہوں نے تمہارے بعد کیا کیا نئی باتیں دین میں نکال دی تھیں۔ رواہ البخاری وغیرہ۔ اسی کے ہم معنی وہ آیت ہے جس میں حضرت عیسیٰ کے قول کو نقل کرتے ہوئے اللہ نے فرمایا ہے كُنْتُ شَهِيْدًا مَّا دُمْتُ فِيْهِمْ فَلَمَّا تَوَفَّيْتَنِيْ كُنْتَ اَنْتَ الرَّقِيْبَ عَلَيْهِمْ۔

ایک روایت میں آیا ہے کہ حضرت ابن عباسؓ نے آیت کا مطلب اس طرح بیان کیا ہم کو کوئی علم نہیں صرف اتنا علم

بے بسی سے تو ہم سے زیادہ واقف ہے۔ بعض علماء نے کہا مطلب یہ ہے کہ تیرے علم کے مقابلہ میں ہم کو کوئی علم نہیں۔ بعض نے کہا مطلب یہ ہے جس امر کو تو ہم سے زیادہ جانتا ہے اس کو ہم سے دریافت کرنے کی کیا حکمت ہے اس کا ہم کو علم نہیں۔

اِذْ قَالَ اللّٰهُ (جب اللہ نے فرمایا) یہ یَوْمَ یَجْمَعُ سے بدل ہے یعنی جس روز پیغمبروں سے جواب طلبی کر کے کافروں کو سرزنش کی جائے گی اور پیغمبروں کے ہاتھ پر جو معجزات ظاہر کئے گئے تھے جن کو بعض لوگوں نے جادو قرار دیا تھا اور علامت نبوت ملنے سے انکار کر دیا تھا اور بعض نے نشان الوہیت سمجھ کر پیغمبروں کو معبود بنا لیا تھا ان معجزات کو شمار کر کے کافروں کو توبیخ کی جائے گی۔

یٰعِیْسَى ابْنَ مَرْیَمَ اذْكُرْ نِعْمَتِیْ عَلَیْكَ وَعَلٰى وَالِدَتِكَ ۘ (اے عیسیٰ بن مریم میرے اس احسان کو یاد کر جو تیرے اوپر اور تیری ماں پر تھا)۔ نعمت کا لفظ اگرچہ مفرد ہے لیکن معنی جمع کے ہیں کیونکہ اس سے مراد اسم جنس ہے۔

والدہ سے مراد مریم ہیں جن کو اللہ نے پاک کر دیا تھا اور سارے جہان کی عورتوں پر ان کو فضیلت دی تھی۔ حسن نے کہا نعمت کو یاد کرنے سے مراد ہے شکر کرنا۔

اِذْ اَیَّدْتُّكَ بِرُوْحِ الْقُدُسِ ۣ (جب روح القدس کے ذریعہ سے میں نے تجھے طاقت عطا کی تھی)۔ اِذْ اَیَّدْتُّكَ نِعْمَتِیْ کا مفعول فیہ ہے یا حال ہے۔ روح القدس سے مراد ہے جبرئیل یا وہ کلام جو لوگوں کو ابدی زندگی عطا فرمانے والا اور دلوں کو گناہوں سے پاک کرنے والا تھا۔ روح القدس پاکی پیدا کرنے والا کلام اور وہ کلام جس سے مردے زندہ ہو جاتے تھے۔

تُكَلِّمُ النَّاسَ فِی الْمَهْدِ وَكَهْلًا ۚ (کہ تو گہوارے میں ہونے کی حالت اور ادھیڑ عمر ہونے کی حالت میں (برابر ایک ہی طرح کا) کلام لوگوں سے کرتا تھا) یعنی بچپن اور شیر خوارگی کی عمر میں بھی تیرا کلام ویسا ہی پر حکمت اور عاقلانہ ہوتا تھا جیسا متوسط عمر کا کلام۔ اس آیت سے لوگوں نے استدلال کیا ہے کہ حضرت عیسیٰؑ آسمان سے اتریں گے کیونکہ جس وقت ان کو اٹھایا گیا اس وقت ان کی عمر متوسط نہ تھی (غالباً ۳۳ برس کی) حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا اللہ نے تیس سال کی عمر میں عیسیٰؑ کو پیغمبر بنا کر بھیجا، تیس ماہ آپ نے رسالت کی حالت میں گزارے پھر اللہ نے ان کو اپنی طرف اٹھا لیا۔

بعض اہل علم کا قول ہے کہ آیت سے بچپن اور متوسط عمر کے کلام کا ایک جیسا ہونا ثابت نہیں ہوتا بلکہ اولیٰ یہ ہے کہ کَهْلًا کے لفظ کو تشبیہ بلیغ قرار دیا جائے یعنی حضرت عیسیٰؑ بچپن میں اسی طرح لوگوں سے کلام کرتے تھے جیسا اس عمر میں کرتے تھے جبکہ وہ ادھیڑ عمر والے کی طرح ہو گئے تھے (یعنی ۳۲ یا ۳۳ برس کے) اس مطلب پر آیت سے نزول عیسیٰؑ پر استدلال نہیں کیا جا سکتا۔

وَاِذْ عَلَّمْتُكَ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَالتَّوْرٰىةَ وَالْاِنْجِیْلَ ۚ (اور جب میں نے تجھے سکھائیں کتابیں اور سمجھ کی باتیں اور توریت اور انجیل) اِذْ اَیَّدْتُّكَ پر اس کا عطف ہے۔

وَاِذْ تَخْلُقُ مِنَ الطِّیْنِ كَهَیْـَٔةِ الطَّیْرِ (اور جب تو پرندہ کی شکل جیسی شکل گارے کی بناتا تھا)۔

بِاِذْنِیْ فَتَنْفُخُ فِیْهَا فَتَكُوْنُ طَیْرًۢا بِاِذْنِیْ (میرے حکم سے پھر اس پر پھونک مارتا تھا اور وہ میرے حکم سے (زندہ) پرندہ بن جاتا تھا)۔

وَتُبْرِئُ الْاَكْمَهَ وَالْاَبْرَصَ بِاِذْنِیْ ۚ (اور میرے حکم سے مادرزاد اندھے کو اور برص کے بیمار کو اچھا کر دیتا تھا)۔

وَاِذْ تُخْرِجُ الْمَوْتٰى بِاِذْنِیْ ۚ (اور (یاد کے قابل ہے وہ وقت) جب میرے حکم سے تو مردوں کو (زندہ کر کے قبروں کے اندر سے) باہر نکال کھڑا کرتا تھا)۔

وَاِذْ كَفَفْتُ بَنِیْۤ اِسْرَآءِیْلَ عَنْكَ (اور جب میں نے بنی اسرائیل کو تیرے قتل سے باز رکھا اور پھیر دیا)

اس جملہ کا عطف اِذْ عَلَّمْتُكَ پر ہے۔ بنی اسرائیل سے مراد ہیں یہودی جنہوں نے حضرت عیسیٰؑ کو قتل کرنے کا ارادہ کیا تھا۔

اِذْ جِئْتَهُمْ بِالْبَيِّنٰتِ (جب تو ان کے پاس معجزات (مذکورہ بالا) لے کر پہنچا تھا)۔ یہ كَفَفْتُ کا مفعول فیہ ہے (یعنی بنی اسرائیل کو قتل کرنے سے اللہ نے کس وقت باز رکھا تھا جب تو نے ان کے سامنے معجزات ظاہر کیے تھے۔

فَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْهُمْ اِنْ هٰذَآ اِلَّا سِحْرٌ مُّبِيْنٌ ۝ (اور ان میں سے کافروں نے کہا تھا کہ یہ تو صرف کھلا ہوا جادو ہے اس کے سوا کچھ نہیں)۔

حمزہ اور کسائی نے اس جگہ اور سورۂ ہود اور الصف میں اِلَّا سَاحِرٌ پڑھا ہے اس قرأت پر یہاں حضرت عیسیٰؑ کی طرف اور سورۂ ہود میں رسول اللہ ﷺ کی طرف اشارہ ہو جائے گا۔

وَاِذْ اَوْحَيْتُ اِلَى الْحَوَارِيّٖنَ (اور جب میں نے حواریوں کے دل میں ڈالا) اس کا عطف اِذْ كَفَفْتُ پر ہے وحی کرنے سے اس جگہ مراد ہے دل میں ڈالنا۔ عبد بن حمید نے قتادہ کا اور ابو الشیخ نے سدی کا یہی قول بیان کیا ہے۔ بعض علماء کے نزدیک وحی سے مراد ہے حضرت عیسیٰؑ کی زبانی حکم بھیجنا۔

اَنْ اٰمِنُوْا بِيْ وَبِرَسُوْلِيْ (کہ مجھ پر اور میرے پیغمبر پر ایمان لاؤ)۔ اَنْ مصدریہ ہے اَوْحَيْتُ کی تفسیر ہے۔

قَالُوْٓا اٰمَنَّا (تو انہوں نے کہا ہم ایمان لائے)۔

وَاشْهَدْ بِاَنَّنَا مُسْلِمُوْنَ ۝ (اور (اے عیسیٰؑ) آپ گواہ رہیں کہ ہم مخلص ہیں)۔

اِذْ قَالَ الْحَوَارِيُّوْنَ يٰعِيْسَى ابْنَ مَرْيَمَ هَلْ يَسْتَطِيْعُ رَبُّكَ (جب حواریوں نے کہا اے عیسیٰ بن مریم کیا آپ کا رب مان لے گا)۔ یہ مفعول فیہ ہے اذکر محذوف کا یا قالوا کا۔ استطاعت کا معنی (یہاں) اطاعت ہے (یعنی آپ کی درخواست کے مطابق کر دینا) جیسے اِسْتَجَابَ بمعنی اَجَابَ کے آیا ہے (فَاسْتَجَابَ لَهُمُ اللّٰهُ نے قبول کر لیا)۔ ابن ابی حاتم نے عامر شعبی کے حوالے سے لکھا ہے کہ حضرت علیؓ نے هَلْ يَسْتَطِيْعُ رَبُّكَ کی تلاوت کرنے کے بعد (اس کی تشریح میں) هَلْ يُطِيْعُ رَبُّكَ فرمایا تھا۔

سعد میں آتا ہے مَنْ اَطَاعَ اللّٰهَ اَطَاعَهُ جو اللہ کی اطاعت کرتا ہے اللہ اس کی درخواست مان لیتا ہے۔ کسائی کی قرأت میں هَلْ تَسْتَطِيْعُ رَبَّكَ آیا ہے۔ یہ عیسیٰؑ کو خطاب ہے اور رَبَّكَ مفعول ہے۔ یعنی اے عیسیٰ کیا آپ اپنے رب سے یہ درخواست کر دیں گے اور آپ کے لئے یہ دعا کرنے میں کوئی رکاوٹ نہیں ہوگی اور آپ کا رب آپ کی یہ درخواست قبول کرے گا۔ حضرت علیؓ، حضرت عائشہؓ، حضرت ابن عباسؓ اور مجاہدؒ کی بھی یہی قرأت ہے اور حاکم نے حضرت معاذؓ بن جبل کی بھی یہی قرأت نقل کی ہے۔ اس قرأت سے بھی تفسیر مندرجہ بالا کی تائید ہوتی ہے (کہ يَسْتَطِيْعُ بمعنی يُطِيْعُ کے ہے)۔

(حضرت عائشہؓ نے فرمایا حواری اللہ (کے مرتبہ) سے خوب واقف تھے يَسْتَطِيْعُ رَبُّكَ) اَنْ يُّنَزِّلَ (کیا آپ کا رب طاقت رکھتا ہے کہ آپ اس سے دعا کریں اور وہ دعا پوری کر سکے) کہنے سے بہت بعید تھے۔ رواہ ابن ابی شیبہ وابو الشیخ وغیرہما۔ (حضرت عائشہؓ کی قرأت میں تَسْتَطِيْعُ رَبَّكَ آیا ہے يَسْتَطِيْعُ رَبُّكَ نہیں آیا یعنی استطاعت کا مخاطب حضرت عیسیٰؑ ہیں استطاعت کا فاعل اللہ نہیں ہے۔ اس لئے آپ نے اس قرأت کی تغلیط کی جس میں يَسْتَطِيْعُ آیا ہے اور استطاعت کا فاعل اللہ کو قرار دیا ہے) بعض علماء نے کہا کہ اس جگہ استطاعت سے مراد ہے حکمت و ارادہ کا تقاضہ ہم صفت قدرت رکھنے کا مفہوم مراد نہیں ہے اللہ کی قدرت میں تو حواریوں کو شک نہیں تھا (مگر وہ یہ نہیں جانتے تھے کہ اللہ کی حکمت و ارادہ بھی ایسا ہو سکتا ہے یا نہیں کہ آسمان سے خوان نازل فرما دے) جیسے کوئی شخص اپنے ساتھی سے کہے کیا آپ میرے ساتھ اٹھ کر باہر کو جا سکتے ہیں (اس سے مراد یہ نہیں ہوتی کہ آپ میں اٹھ کر جانے کی طاقت بھی ہے یا نہیں بلکہ مطلب یہ ہوتا ہے کہ آپ اٹھ کر چلنے کو مناسب سمجھتے ہیں یا نہیں)۔

بعض علماء نے کہا کلام کا وہی مطلب ہے جو ظاہر الفاظ سے معلوم ہو رہا ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ (ابتدائی ایمان تھا) اس وقت تک ان کے دلوں میں معرفت کا استحکام نہیں ہوا تھا جاہلیت اور کفر کا زمانہ ماضی قریب میں ہی ختم ہوا تھا، اسی لئے حضرت عیسیٰؑ نے ان کے قول کو بڑی گستاخی قرار دیتے ہوئے فرمایا اِتَّقُوا اللّٰهَ اِنْ كُنْتُمْ مُؤْمِنِيْنَ یعنی اگر مومن ہو تو اللہ کی قدرت میں شک نہ کرو۔

اَنْ يُّنَزِّلَ عَلَيْنَا مَآئِدَةً مِّنَ السَّمَآءِ (کہ آسمان سے ہمارے لئے ایک خوان اتار دے) مائدہ وہ خوان جس پر کھانا چنا ہوا ہو۔ مَائِدَةٌ بروزن فَاعِلَةٌ مَادَ يَمِيْدُ سے اسم فاعل کا صیغہ ہے۔ مَيْد دینا اور کھانا کھلانا گویا خوان بھی کھانا دینے والا ہوتا ہے اس لئے اس کو مائدہ کہا جاتا ہے مجازاً کھانا جو خوان پر ہوتا ہے اس کو بھی مائدہ کہہ لیا جاتا ہے جیسے بہنے کی نسبت نہر کی طرف مجازاً کی جاتی ہے۔ اہل کوفہ نے کہا کہ (مَيْد کا معنی حرکت کرنا، ہلنا) کھانے والوں کی وجہ سے مائدہ حرکت میں آجاتا ہے اس لئے اس کو مائدہ کہا جاتا ہے۔ اہل بصرہ کے نزدیک مَائِدَةٌ (اسم فاعل) مَمِيْدَةٌ (اسم مفعول) کے معنی میں ہے یعنی کھانے والوں کی وجہ سے حرکت دیا جانے والا۔

قَالَ اتَّقُوا اللّٰهَ (عیسیٰؑ نے (کہا اللہ سے ڈرو) یعنی ایسے سوال کرنے سے خدا کا خوف کرو کہ جن کی طرح گزشتہ امتوں نے بھی نہیں کئے۔ حضرت عیسیٰؑ نے بنی اسرائیل کو طلب معجزات سے منع کر دیا۔

اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ﴿۱۱۲﴾ (اگر تم ایماندار ہو) کیونکہ اہل ایمان کے لئے معجزات کی طلب جائز نہیں یا یہ مطلب ہے کہ اگر اللہ کی قدرت کی ہمہ گیری اور میری نبوت پر تمہارا ایمان ہے تو اللہ سے ڈرو اور اس کی قدرت میں شک نہ کرو یا یہ مطلب ہے کہ اگر ایمان کے دعوے میں تم سچے ہو تو ایسے سوالات کرنے سے بچو۔

ابن ابی حاتم نے اور حکیم ترمذی نے نوادر الاصول میں اور ابوالشیخ نے العظمۃ میں اور ابوبکر شافعی نے الغیلانیات میں حضرت سلمان فارسی کی روایت سے لکھا ہے کہ جب حواریوں نے حضرت عیسیٰ بن مریم سے نزول مائدہ کی درخواست کی تو آپ کو سخت ناگوار ہوا اور آپ نے فرمایا اللہ نے زمین میں جو کچھ عطا فرمایا ہے اسی پر قناعت کرو۔ مائدہ کی درخواست نہ کرو کیونکہ مائدہ اگر نازل ہو گیا تو اللہ کی طرف سے وہ ایک نشان ہوگا اور ثمود نے جب اپنے پیغمبر سے نشانی طلب کی تھی تو وہ تباہ ہو گئی اور اسی نشانی سے ان کی جانچ کی گئی (جس کی وجہ سے ان پر عذاب آگیا) بنی اسرائیل نے آپ کی نصائح کو شنوائی نہیں کی۔

قَالُوْا (کہنے لگے) ہم نے مائدہ کی درخواست صرف اس لئے کی ہے کہ

نُرِيْدُ اَنْ نَّاْكُلَ مِنْهَا (ہم اس میں سے کھائیں)

وَتَطْمَئِنَّ قُلُوْبُنَا (اور ہمارے دلوں کو اطمینان ہو) دلیل سے تو قدرت کی ہمہ گیری کو مانتے ہی ہیں مشاہدہ دلیل کے ساتھ مل جائے گا تو علم شہودی ہو کر اطمینان پیدا ہو جائے گا۔

وَنَعْلَمَ اَنْ قَدْ صَدَقْتَنَا (اور ہم جان لیں کہ (نبوت کے دعوے میں) آپ سچے ہیں) یعنی ہمارا ایمان اور نبوت پر یقین بڑھ جائے۔

روایت میں آیا ہے کہ حضرت عیسیٰؑ نے بنی اسرائیل کو حکم دیا کہ ۳۰ روزے رکھو اور پھر نزول مائدہ کی درخواست کی اور کہ ہم یقین رکھتے ہیں کہ آپ نے ہم سے یہ بات سچ فرمائی کہ ۳۰ روزے رکھنے کے بعد اللہ ہماری دعا قبول فرمالے گا۔

وَنَكُوْنَ عَلَيْهَا مِنَ الشّٰهِدِيْنَ ﴿۱۱۳﴾ (اور ہم اس پر شہادت دینے والوں میں سے ہو جائیں) یعنی ایمان بالغیب تو ہم کو حاصل ہی ہے نزول مائدہ کے بعد اللہ کی وحدانیت و قدرت اور آپ کی نبوت کا ایمان شہودی ہم کو حاصل ہو جائے گا۔ یہ مطلب ہے کہ ہم جب بنی اسرائیل کے پاس لوٹ کر جائیں گے تو جا کر اس کی شہادت دے سکیں گے۔

روایت میں آیا ہے کہ حضرت عیسیٰؑ نے غسل کر کے کمبل کا لباس پہن کر دو رکعت نماز پڑھی اور سر جھکا کر آنکھیں بند کر کے رونے لگے۔

قَالَ عِيسَى ابْنُ مَرْيَمَ اللَّهُمَّ رَبَّنَا (پھر عرض کیا اے اللہ اے ہمارے رب) رَبَّنَا مکرر نداء ہے۔ اَللّٰهُمَّ کی صفت نہیں ہے بدل ہے کیونکہ اَللّٰهُمَّ نہ موصوف ہوتا ہے نہ بدل منہ۔ علامہ تفتازانی نے اس کی صراحت کی ہے۔

أَنزِلْ عَلَيْنَا مَائِدَةً مِّنَ السَّمَاءِ (ہم پر آسمان سے ایک خوان نازل فرما دے)۔

تَكُونُ لَنَا عِيدًا (جو ہمارے لئے ایک خوشی کی بات ہو جائے)۔

لِأَوَّلِنَا وَآخِرِنَا (یعنی ہمارے اگلوں اور پچھلوں کے لئے)۔ سدی نے کہا یعنی ہمارے زمانہ والوں کے لئے اور آئندہ لوگوں کے لئے خوشی کا دن ہو جائے، ہم اس کو تہوار کا دن بنالیں۔ جو خوشی غم کے بعد آئے اس کو سرور کہتے ہیں۔ بعض لوگوں نے کہا عید خوشی کے دن کو کہتے ہیں، کیونکہ اس میں آدمی رنج سے خوشی کی طرف لوٹتا ہے۔ روایت میں آیا ہے کہ وہ اتوار کا دن تھا اسی لئے عیسائیوں نے اتوار کا دن تہوار کا دن مقرر کر رکھا ہے۔ بعض لوگوں نے کہا عید کا معنی ہے عائدہ یعنی اللہ کی طرف سے حجت اور برہان۔

لِأَوَّلِنَا وَآخِرِنَا، لَنَا سے بدل ہے۔ اول سے مراد ہیں اہل زمانہ اور آخر سے مراد ہیں مستقبل میں آنے والے لوگ جو مذہب عیسوی پر ہوں۔ حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا (عِيدًا لِأَوَّلِنَا وَآخِرِنَا سے یہ مراد ہے کہ) اس میں سے جس طرح پہلے لوگ کھائیں اسی طرح آخری لوگ بھی کھائیں (یعنی خوان بابرکت ہو جو سب کے لئے کافی ہو اور اول سے آخر تک سب لوگ اس میں سے کھائیں)۔

بظاہر لَنَا تَکُونُ کی خبر اول اور عِيدًا دوسری خبر ہے اور لِأَوَّلِنَا وَآخِرِنَا، عِيدًا کی صفت ہے۔

وَآيَةً مِّنكَ (اور تیری طرف سے ایک نشان ہو جائے) یعنی ایسی دلیل ہو جائے جو تیری قدرت کی ہمہ گیری اور میری نبوت کی صداقت پر دلالت کرے۔ لفظ مِنْكَ، آيَةً کی صفت ہے اور آيَةً کا عطف عِيدًا پر ہے۔

وَارْزُقْنَا وَأَنتَ خَيْرُ الرَّازِقِينَ (اور ہم کو عطا فرما تو بہترین عطا فرمانے والا ہے)۔

قَالَ اللَّهُ إِنِّي مُنَزِّلُهَا عَلَيْكُمْ (اللہ نے فرمایا میں اس کو تم پر (بار بار) ضرور اتاروں گا)۔ مُنَزِّلُ باب تفعیل کا صیغہ فاعل ہے اور باب تفعیل کثرت اور تواتر فعل پر دلالت کرتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ تمہاری درخواست کو منظور فرما کر میں متواتر طور پر کتنے ہی مرتبہ خوان نازل کروں گا۔

فَمَن يَكْفُرْ بَعْدُ مِنكُمْ فَإِنِّي أُعَذِّبُهُ عَذَابًا (پھر تم میں سے جو ناشکری کرے گا اس کو ایسی سزا دوں گا)۔

لَّا أُعَذِّبُهُ أَحَدًا مِّنَ الْعَالَمِينَ (کہ ویسی سزا دنیا میں کسی کو نہیں دوں گا)۔

عَذَابًا بمعنی تعذیب ہے یعنی عذاب دینا۔ یہ مفعول مطلق ہے یا بحذف مضاف مفعول بہ ہے یا عذاب سے مراد ہے سزا کا طریقہ اور عذاب کا ڈھنگ یعنی ایسی سخت سزا دوں گا کہ کسی کو نہ دوں گا۔ الْعَالَمِينَ سے مراد ہیں عذاب پانے والے کافروں کے ہم عصر یا آئندہ ہر زمانہ والے۔ کیونکہ نزول مائدہ کے بعد جن لوگوں نے کفر کیا اللہ نے ان کو سور اور بندر بنا دیا اور آئندہ کسی اور پر ایسا عذاب نہیں آیا۔

ع ۵

حضرت سلمان فارسی کی مذکورہ بالا حدیث کا تتمہ

جب حضرت عیسیٰؑ نے دعا کی تو ایک سرخ رنگ کا خوان لوگوں کی نظروں کے سامنے اوپر سے اترنے لگا، ابر کا ایک ٹکڑا خوان سے اوپر تھا اور ایک نیچے۔ خوان آ کر لوگوں کے سامنے گر پڑا۔ یہ منظر دیکھ کر حضرت عیسیٰؑ رونے لگے اور عرض کیا اے اللہ مجھے شکر گزاروں میں سے کر دے اور اس کو رحمت بنا دے عذاب نہ بنانا۔ یہودی بھی ایسی چیز اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے تھے

جس کی نظیر انہوں نے کبھی نہیں دیکھی تھی اور خوان میں سے نکلتی ہوئی ایسی خوشبو محسوس کر رہے تھے جس کی مثل کبھی کوئی خوشبو نہیں پائی تھی۔ حضرت عیسیٰؑ نے فرمایا تم میں سے جو سب سے زیادہ نیک اعمال ہو وہ کھڑا ہو اور بسم اللہ کہہ کے اس کا سرپوش کھولے۔ حواریوں کے سردار شمعون صفا نے عرض کیا اے اللہ کے رسول آپ ہی اس کے زیادہ مستحق ہیں۔ حضرت عیسیٰؑ کھڑے ہوئے اور وضو کر کے ایک لمبی نماز پڑھی اور خوب روئے۔ پھر بسم اللہ کر کے سرپوش ہٹایا اور فرمایا بِسْمِ اللّٰهِ خَيْرِ الرَّازِقِيْنَ۔ خوان میں ایک بریاں مچھلی تھی، جس پر نہ کوئی چھلکا تھا نہ کانٹا۔ مچھلی سے روغن بہہ رہا تھا اس کے سر کی طرف نمک رکھا تھا اور دم کے پاس سرکہ اور چاروں طرف رنگا رنگ کی ترکاریاں رکھی تھیں لیکن گندنا نہ تھا پانچ روٹیاں بھی تھیں ایک پر زیتون دوسری پر شہد تیسری پر گھی چوتھی پر پنیر اور پانچویں پر گوشت کے ٹکڑے رکھے تھے۔ شمعون نے عرض کیا روح اللہ کیا یہ دنیوی کھانا ہے یا اخروی۔ فرمایا تمہارے سامنے جو کھانا ہے وہ دنیا کی کھانے کی نوع کا ہے نہ آخرت کے کھانے کی قسم کا (بلکہ اللہ نے اپنی قدرت کاملہ سے اس کو تیار کیا ہے) تم نے مانگا تھا اب اس کو کھاؤ، اللہ تمہاری مدد کرے گا اور اپنے فضل سے تم کو مزید عطا فرمائے گا۔ حواریوں نے عرض کیا یا روح اللہ آپ ہی سب سے پہلے کھانا شروع کیجئے۔ فرمایا میں اس کو کھانے سے اللہ کی پناہ مانگتا ہوں۔ جس نے اس کی درخواست کی تھی وہی کھائے۔ یہ سن کر حواریوں کو کھانے سے ڈر لگا (اس لئے کھانے پر ہاتھ نہیں ڈالا) حضرت عیسیٰؑ نے کھانے کے لئے فاقہ زدہ فقیروں، بیماروں، کوڑھ اور برص والوں اور لنگڑے لولے اپاہجوں کو بلوایا اور فرمایا اللہ کا بھیجا ہوا رزق کھاؤ یہ تمہارے لئے مبارک ہے اور دوسروں کے لئے مصیبت۔ چنانچہ سب نے کھایا ایک ہزار تین سو فقیر، بیمار، اپاہج اور دکھی مردوں اور عورتوں نے شکم سیر ہو کر کھایا۔ لیکن مچھلی اترنے کے وقت جیسی تھی ویسی کی ویسی اس کے بعد خوان اٹھ گیا اور لوگوں کی نظروں کے سامنے اوپر چڑھتا چلا گیا آخر نگاہ سے غائب ہو گیا۔ جس بیمار اور اپاہج نے اس میں سے کھایا وہ تندرست ہو گیا اور جس فقیر نے کھایا غنی ہو گیا۔ یہ دیکھ کر نہ کھانے والوں کو پشیمانی ہوئی۔ خوان اترنے کا یہ سلسلہ چالیس روز تک چاشت کے وقت قائم رہا۔ امیر، نادار، بڑے چھوٹے، مرد، عورت سب ہی خوان کے نزول کے وقت جمع ہو جاتے تھے تو خوان ان سب کی نظروں کے سامنے رکھا ہوتا اور لوگ کھاتے جب سب کھا کر لوٹ جاتے تو خوان سب کی نظروں کے سامنے اٹھ جاتا اور چڑھتا جاتا آخر نظروں سے چھپ جاتا (یہ بھی کہا جاتا ہے کہ) ثمود کی اونٹنی کی طرح خوان ایک دن بیچ آتا، ایک دن ناغہ ایک دن آمد۔ پھر اللہ نے حضرت عیسیٰؑ کے پاس وحی بھیجی کہ میں اپنا خوان اور رزق صرف فقراء کے لئے مقرر کرتا ہوں مالداروں کے لئے (اس میں) کچھ نہیں ہے یہ حکم مالداروں کو بہت کھلا کہ خود بھی شک میں پڑ گئے اور دوسروں کے دلوں میں بھی شک پیدا کرنے لگے اور کہنے لگے دیکھو تو کیا یہ خوان واقعی آسمان سے اترتا ہے (اگر ایسا ہے تو اس میں ناداروں اور مالداروں کی تفریق کیوں ہے۔ اللہ نے عیسیٰؑ کے پاس وحی بھیجی اور فرمایا میں نے شرط لگا دی تھی کہ خوان نازل ہونے کے بعد جو کفر کرے گا میں اس کو ایسا عذاب دوں گا کہ سارے جہان میں کسی کو نہ دوں گا (اب انہوں نے کفر کیا ہے اس لئے عذاب کے مستحق ہو گئے)۔

حضرت عیسیٰؑ نے عرض کیا اگر تو ان کو عذاب دے گا تو یہ تیرے بندے ہیں (تجھے عذاب دینے کا حق ہے) اور اگر معاف کر دے تو یقیناً تو ہی غالب اور دانا ہے (مغفرت کر سکتا ہے اور مغفرت کی مصلحت سے بھی واقف ہے) الغرض ان میں سے ۳۳۳ آدمیوں کی صورتیں مسخ کر دی گئیں۔ رات کو بیویوں کے ساتھ (بھلے چنگے) سوئے اور صبح کو سوروں کی شکل میں اٹھے اور راستوں اور کوڑا گھروں میں مارے مارے پھرنے اور کوڑے کے اندر گندگی کھانے لگے۔ لوگوں نے یہ حالت دیکھی تو گھبرا کر حضرت عیسیٰؑ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور روئے۔ سوروں نے حضرت عیسیٰؑ کو دیکھا تو آپ کے اردگرد گھومنے اور رونے لگے۔ حضرت عیسیٰؑ ان کے نام لے لے کر پکارتے تھے اور وہ سروں سے اشارہ کرتے اور روتے تھے بات نہیں کر سکتے تھے اس حالت میں تین روز زندہ رہے پھر سب مر گئے۔

بغوی نے لکھا ہے کہ خلاس بن عمرو نے حضرت عمار بن یاسر کی روایت سے بیان کیا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا خوان

اترا تو اس میں گوشت اور روٹی تھی اور بنی اسرائیل سے کہہ دیا گیا تھا کہ یہ مائدہ تمہارے لئے قائم رہے گا جب تک تم اس میں خیانت نہ کرو گے اور چھپا کر نہ رکھو گے لیکن وہ دن بھی ختم نہیں گزرا کہ انہوں نے خیانت کی اور (کچھ حصہ) چھپا کر رکھ لیا۔ آخر بندروں اور سوروں جیسی شکل ان کی کر دی گئی۔

حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا کہ حضرت عیسیٰؑ نے بنی اسرائیل سے فرمایا تھا تم تیس روزے رکھو پھر جو کچھ چاہو اللہ سے مانگو وہ تم کو عنایت فرمائے گا۔ حسب الحکم لوگوں نے روزے رکھے اور روزوں سے فراغت کے بعد عرض کیا اگر ہم کسی کا کام کرتے ہیں اور کام پورا کر دیتے ہیں تو وہ ہم کو کھانا دیتا ہے (آپ اللہ کے لئے ہم نے روزے رکھے ہیں اور اللہ سے کھانا مانگتے ہیں) چنانچہ انہوں نے خوان اترنے کی درخواست کی (دعا قبول ہوئی) ملائکہ ایک خوان اٹھائے ہوئے آئے خوان پر سات روٹیاں اور سات مچھلیاں تھیں لوگوں کے سامنے لا کر اس کو رکھ دیا۔ اول سے آخر تک سب لوگوں نے اس کو کھایا (اور جس طرح کھانا شروع کرنے کے وقت وہ تھا ویسا ہی آخر آدمی کے کھانے کے بعد رہا)۔

کعب احبار نے کہا مائدہ سرنگوں اترا تھا آسمان و زمین کے درمیان ملائکہ اس کو اڑا کر لا رہے تھے۔ گوشت کے علاوہ اس میں ہر چیز تھی۔ قتادہ نے کہا اس میں جنت کے پھل تھے عطیہ عوفی نے کہا آسمان سے اتر کر ایک مچھلی آئی تھی جس میں ہر چیز کا مزہ تھا۔ کلبی نے کہا اس میں چاول کی روٹی تھی۔ سعید بن جبیرؒ نے حضرت ابن عباسؓ کا قول نقل کیا ہے کہ خوان میں سوائے گوشت اور روٹی کے ہر چیز تھی۔ وہب بن منبہ نے کہا اللہ نے جو کی چند چھوٹی روٹیاں اور مچھلیاں اتاری تھیں۔ کچھ لوگ کھا کر جاتے اور دوسرے آ کر کھاتے تھے یہاں تک کہ سب کھا چکے اور کھانا پھر بھی بچ رہا۔ کلبی اور مقاتل نے کہا اللہ نے روٹیاں مچھلیاں اور پانچ اتارے تھے۔ لوگوں کی تعداد پانچ ہزار سے اوپر تھی۔ سب نے کھایا اور لوٹ کر اپنی اپنی بستیوں میں جا کر جب اس کا تذکرہ کیا تو جو لوگ نہیں آئے تھے وہ ہنس دیئے اور کہنے لگے تمہاری نظر بندی کر دی گئی تھی۔ اللہ کو جس کی بھلائی مقصود تھی وہ تو ایمان پر قائم رہا اور جس کی خرابی اللہ کو منظور تھی وہ کفر کی طرف لوٹ گیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اللہ نے ان کو سوروں کی شکل پر کر دیا۔ مسخ شدہ لوگوں میں کوئی بچہ یا عورت نہ تھی (سب مرد تھے) تین روز تک اسی حالت میں رہ کر سب مر گئے نہ کچھ کھایا نہ پیا نہ ان کی نسل ہوئی۔ ہر مسخ شدہ شخص کی یہی کیفیت ہوئی ہے۔ قتادہ کا قول ہے کہ جہاں کہیں بنی اسرائیل ہوتے تھے خوان وہیں صبح شام من و سلویٰ کی طرح اترتا تھا۔ نزول مائدہ کے متعلق اکثر علماء کے یہ مختلف اقوال تھے جو ذکر کر دیئے گئے۔ مجاہد اور حسن نزول مائدہ کی نفی کے قائل تھے ان کا خیال تھا کہ جب ان کو تنبیہ کی گئی کہ نزول مائدہ کے بعد اگر کفر کرو گے تو سنگین ترین عذاب میں مبتلا کر دیئے جاؤ گے۔ تو بنی اسرائیل کو اندیشہ ہو گیا کہ کہیں کوئی کفر کرنے لگے (اور عذاب سب پر پڑے) اس لئے انہوں نے معافی طلب کی اور عرض کیا ہم مائدہ کے طلب گار نہیں۔ واپسی درخواست کے بعد مائدہ نازل نہیں ہوا۔ رہا لفظ اِنِّیْ مُنَزِّلُهَا (جو نازل ہونے پر دلالت کر رہا ہے) تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اس تنبیہ کے بعد بھی اگر تم نزول مائدہ کے طلب گار ہو گے تو اللہ ضرور نازل فرمادے گا۔ صحیح قول وہی ہے جو اکثر علماء کا مختار ہے کہ مائدہ نازل ہوا کیونکہ اللہ نے پہلے سے خبر دیدی تھی کہ میں ضرور نازل کروں گا اور اللہ کی اطلاع غلط نہیں ہو سکتی۔ پھر نزول مائدہ کے متعلق رسول اللہ ﷺ کی احادیث، صحابہ کے آثار اور تابعین کے اقوال بکثرت آئے ہیں جن کو (معنوی طور پر) متواتر کہہ سکتے ہیں۔

وَاِذْ قَالَ اللّٰهُ (اور جب اللہ نے فرمایا) یا فرمائے گا۔ سدی نے کہا جب اللہ نے عیسیٰؑ کو آسمان کی طرف اٹھایا اس وقت یہ بات فرمائی تھی کیونکہ قَالَ ماضی کا صیغہ ہے اور لفظ اذ کی وضع بھی ماضی ہی کے لئے ہے (اس قول پر اول ترجمہ صحیح ہو گا) باقی اہل تفسیر کا قول ہے کہ اللہ یہ بات قیامت کے دن فرمائے گا (اس تشریح پر دوسرا ترجمہ صحیح ہو گا۔ جمہور کا ترجمہ کیا ہے) اس کلام کی غرض کافروں کو تنبیہ و سرزنش کرنا ہے۔ دیکھو اللہ نے فرمایا یَوْمَ یَجْمَعُ اللّٰهُ الرُّسُلَ دوسری آیت میں آیا ہے هٰذَا یَوْمُ یَنْفَعُ الصّٰدِقِیْنَ صِدْقُهُمْ ان دونوں آیتوں میں روز قیامت مراد ہے۔ رہا اذ کا ماضی کے لئے وضع ہونا اور صیغہ ماضی کا ذکر ہونا تو اگر مستقبل میں آنے والا واقعہ یقینی ہو تو اس کے لئے ماضی کا صیغہ استعمال کر لیا جاتا ہے گویا آئندہ اس واقعہ کا

ہونا یقینی ہے گویا وہ ہو چکا اسی کی طرح (مستقبل کے لئے ماضی کا استعمال) آیت وَلَوْ تَرٰی اِذْ فَزِعُوْا میں استعمال کیا گیا ہے۔

یٰعِیْسَی ابْنَ مَرْیَمَ ءَاَنْتَ قُلْتَ لِلنَّاسِ (اے عیسیٰ بن مریم کیا تو نے ہی لوگوں سے کہا تھا) اس آیت میں خطاب حضرت عیسیٰ کو ہے لیکن سرزنش کافروں کو ہے۔ مسند الیہ (اَنْتَ) مسند (قُلْتَ) پر مقدم لانے کی غرض یہ ہے کہ فعل کی نسبت کو عیسیٰ کی طرف مستحکم بنانا کیونکہ اس طرز کلام میں نسبت کی تکرار ہو جاتی ہے ایک تو قُلْتَ کے اندر خود ہی اَنْتَ فاعل موجود ہے پھر قُلْتَ کا ربط اَنْتَ سے دوبارہ ہے) بات یہ تھی کہ قول شرک کی نسبت عیسیٰ کی طرف بہت ہی بعید تھی اس لئے قوت کے ساتھ اس کا ذکر کیا۔

اتَّخِذُوْنِیْ وَاُمِّیَ اِلٰهَیْنِ (کہ مجھے اور میری ماں کو معبود بنا لو)۔

مریم کی جگہ اُمِّیَ کا لفظ اس امر پر سرزنش کر رہا ہے کہ تو پیدا شدہ ہے اور مریم تیری والدہ ہے پھر الوہیت کے دعوے کا کیا جواز ہو سکتا ہے، خدا کو تو توالد اور تناسل سے پاک ہونا چاہئے۔

مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ (اللہ کے علاوہ) یہ اِلٰهَیْنِ کی صفت ہے۔ یعنی اللہ کے علاوہ دو معبود۔ یا اِتَّخِذُوْا کے فاعل یا مفعول سے حال ہے۔ لفظ دُوْنَ مغایرت پر دلالت کرتا ہے اس لفظ سے اس امر کی طرف اشارہ ہے کہ دوسروں کی عبادت کے ساتھ اللہ کی عبادت کرنا عبادت نہ کرنے کی طرح ہے۔ جو شخص اللہ کی عبادت کے ساتھ عیسیٰ اور مریم کی بھی عبادت کرتا ہے وہ اللہ کی عبادت نہیں کرتا۔ دُوْنَ کا معنی کم بھی ہو سکتا ہے یعنی مجھے اور میری ماں کو معبود بناؤ مگر اللہ کی معبودیت سے کم درجہ تک اس مطلب کی وجہ یہ ہے کہ عیسائی عیسیٰ اور مریم کو مستقل معبود تو جانتے نہیں ہیں بلکہ ان کی پرستش کو عبادت الٰہی کا ذریعہ قرار دیتے ہیں۔

ابو روق نے کہا عیسیٰ یہ کلام سن کر لرز جائیں گے ان کا جوڑ جوڑ کانپ جائے گا اور ہر بن مو سے خون پھوٹ نکلے گا پھر

قَالَ سُبْحٰنَكَ (عرض کریں گے تو پاک ہے) یعنی میں تیری پاکی کا اعتراف کرتا ہوں ہر طرح کے شرک سے یا میں تیرے پاک ہونے کا اقرار کرتا ہوں اس کہ تو حقیقت واقعہ جاننے کے لئے سوال اور جواب کا ضرورت مند ہو (حقیقت سے تو خود ہی واقف ہے تجھے مجھ سے دریافت کرنے کی ضرورت نہیں)۔

مَا یَكُوْنُ لِیْٓ اَنْ اَقُوْلَ مَا لَیْسَ لِیْ بِحَقٍّ (میرے لئے سزاوار نہ تھا کہ جس چیز کے کہنے کا مجھے حق نہ تھا وہ بات کہتا)۔

اِنْ كُنْتُ قُلْتُهٗ فَقَدْ عَلِمْتَهٗ (اگر میں نے یہ بات کہی ہوتی تو تجھے اس کا علم ضرور ہوتا) یعنی مجھے عذر پیش کرنے کی ضرورت ہی نہیں کیونکہ اگر میں نے یہ بات کہی ہوتی تو تجھے علم ہوتا اور تو واقف ہے کہ میں نے یہ بات نہیں کی۔

تَعْلَمُ مَا فِیْ نَفْسِیْ وَلَآ اَعْلَمُ مَا فِیْ نَفْسِكَ (جو میرے نفس میں ہے اس کو تو جانتا ہے اور جو تیری ذات میں ہے اس کو میں نہیں جانتا یعنی میرے دل میں جو مخفی خیالات ہیں ان سے تو واقف ہے اور تیری پوشیدہ معلومات سے میں ناواقف ہوں۔ فِیْ نَفْسِكَ میں نفس سے ذات مراد ہے پہلے لفظ نفس کی مناسبت کی وجہ سے دوسری جگہ بھی لفظ نفس ہی استعمال کیا۔

اِنَّكَ اَنْتَ عَلَّامُ الْغُیُوْبِ (بلاشبہ تو ہی چھپی باتوں سے بخوبی واقف ہے)۔ غُیُوْب بکسر غین یا بضم غین ہے یہ اختلاف قرأت اوپر گزر چکا ہے۔ اَنْتَ سے اِنَّ کے اسم (ضمیر ک) کی تاکید ہو رہی ہے اس جملہ سے مذکورہ بالا دونوں جملوں کی تاکید ہو رہی ہے لفظاً بھی اور معنًی بھی۔

مَا قُلْتُ لَهُمْ اِلَّا مَآ اَمَرْتَنِیْ بِهٖ (میں نے ان سے نہیں کہی مگر وہی بات جس کا تو نے مجھے حکم دیا تھا)۔ مَا اَمَرْتَنِیْ کے بجائے مَا قُلْتَنِیْ کہنے میں یہ نکتہ ہے کہ حکم دینا (درحقیقت) رب کا کام ہے اور حضرت عیسیٰ ربوبیت کی آمیزش اور شائبہ سے بھی اپنے کو الگ رکھنا چاہتے تھے۔

حضرت عیسیٰ نے پہلے نفی شرک کی تمہید قائم کی اس کے بعد آئندہ فقرہ میں پیام توحید اور نفی شرک کی صراحت کر دی
اَنِ اعْبُدُوا اللّٰهَ رَبِّیْ وَرَبَّكُمْ (کہ اس اللہ کی عبادت کرو جو میرا بھی رب ہے اور تمہارا بھی رب) یعنی
کسی کو (عبادت میں) اللہ کا شریک نہ بناؤ کیونکہ وہی میرا بھی خالق ہے جو تمہارا خالق ہے (اور میں تمہارا خالق نہیں)۔
یہ فقرہ بِہٖ کی ضمیر کا عطف بیان یا بدل ہے۔ بدل میں یہ ضروری نہیں کہ مبدل منہ کو بالکل ساقط کر دینا جائز ہو اس
لئے موصول کا بغیر ضمیر کے لازم نہیں آتا۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ یہ پورا فقرہ مفعول ہو اور فعل محذوف ہو یا مبتدا محذوف ہو
اور یہ فقرہ خبر ہو۔ لیکن مَا اَمَرْتَنِیْ سے اس کو بدل قرار دینا جائز نہیں کیونکہ اَنْ مصدری ہے اور مصدر قول کا مقولہ نہیں
ہو سکتا۔
اَنْ کو مفسرہ قرار دینا بھی صحیح نہیں ہے کیونکہ امر کا فاعل اَللّٰہُ ہے (اور اللہ اُعْبُدُوا اللّٰهَ رَبِّیْ نہیں فرما سکتا وہ خود
رب ہے اس کا رب کوئی اور نہیں) پھر قول کی تفسیر اَنْ سے ہو بھی نہیں سکتی ہاں اگر قول کو بمعنی امر قرار دیا جائے تو ممکن ہے۔
گویا کلام کا مفہوم اس طرح ہوگا۔ میں نے ان کو حکم نہیں دیا مگر وہی جو تو نے مجھے حکم دیا تھا۔ اس کے بعد حضرت عیسیٰ نے اپنی
طرف سے اپنے امر کی تفسیر کر دی کہ میں نے ان کو یہ حکم دیا تھا کہ اللہ کی عبادت کرو۔
وَكُنْتُ عَلَيْهِمْ شَهِيْدًا (اور میں ان کا نگراں (اور ان کے احوال کا مشاہدہ کر رہا) تھا ان کے کفر و ایمان کی دیکھ
بھال کر رہا تھا، حق کی طرف بلا رہا اور باطل قول و عقیدہ سے روک رہا تھا۔
مَّا دُمْتُ فِيْهِمْ (جب تک میں ان کے اندر رہا)۔
فَلَمَّا تَوَفَّيْتَنِيْ (پھر جب تو نے مجھے لے لیا) اور اپنی طرف اٹھا لیا۔ توفی کا معنی ہے کسی چیز کو پورا پورا لے
لینا۔ موت بھی توفی کی ایک قسم ہے۔ اَللّٰهُ يَتَوَفَّى الْاَنْفُسَ حِيْنَ مَوْتِهَا وَالَّتِيْ لَمْ تَمُتْ فِيْ مَنَامِهَا اللہ ہی پورا
پورا قبضہ میں لے لیتا ہے جانوں کو ان کے مرنے کے وقت اور کچھ جانوں کو ان کے سونے کے وقت (یعنی توفی کا استعمال
صرف موت کے لئے ہی نہیں ہوتا بلکہ موت وفات کی ایک قسم ہے اور سونے کے وقت ارواح کو اللہ جو اپنی گرفت میں لے لیتا
ہے اس پر بھی آیت مذکورہ میں لفظ توفی کا اطلاق کیا ہے)۔
كُنْتَ اَنْتَ الرَّقِيْبَ عَلَيْهِمْ (تو ہی ان کا نگراں رہا) یعنی ان کے اعمال و اقوال کا محافظ و نگراں تھا جس کو
تو نے بچانا چاہا اس کو دلائل انبیاء اور آسمانی کتابوں کے ذریعہ سے ہدایت عطا فرمادی اور توفیق دے دی۔
وَاَنْتَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ شَهِيْدٌ۝ (اور تو ہر چیز سے پورا باخبر ہے) میرے اور ان کے اقوال و اعمال تیرے سامنے ہیں۔
اِنْ تُعَذِّبْهُمْ فَاِنَّهُمْ عِبَادُكَ (اگر تو ان کو عذاب دے (تو بجا ہے) وہ تیرے بندے ہیں) اور مالک حقیقی
جیسا چاہے اپنی ملک میں تصرف کر سکتا ہے۔ اس پر اعتراض نہیں کیا جا سکتا پھر انہوں نے تو تیرے علاوہ دوسروں کی پوجا کی باوجود
یہ کہ تو نے ان کو پیدا کیا اور دوسروں کے گن گانے جانا کہ تو نے ان کو پرورش کیا اور نعمت عطا فرمائی۔ (اس صورت میں تو سزا
دینا خلاف عدل ہو ہی نہیں سکتا)۔ [1]

[1] ابن مردویہ کی روایت ہے کہ حضرت ابوذرؓ نے فرمایا میں نے عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ میرے ماں باپ قربان ایک رات آپ نے
نماز کے اندر قیام کی حالت میں قرآن کی ایک آیت (بار بار) آتی پڑھی کہ اگر ہم میں سے کوئی ایسا کرتا تو ہم اس پر غصہ کرتے۔ فرمایا میں
نے اپنی امت کے لئے دعا کی تھی۔ راوی نے پوچھا پھر کیا جواب ملا۔ فرمایا مجھے ایسا جواب ملا کہ اگر اس کی اطلاع لوگوں کو ہو جائے تو بہت
لوگ نماز چھوڑ دیں۔ راوی نے عرض کیا کیا میں اس کی بشارت لوگوں کو نہ دے دوں۔ فرمایا کیوں نہیں۔ حضرت عمرؓ نے عرض کیا یا رسول اللہ
ﷺ اگر یہ پیام آپ لوگوں کو بھیج دیں گے تو عبادت کو چھوڑ کر اسی پر بھروسہ کر کے بیٹھ جائیں گے۔ یہ سن کر حضور ﷺ نے آواز دے کر راوی کو
واپس بلا لیا اور یہ آیت اِنْ تُعَذِّبْهُمْ فَاِنَّهُمْ عِبَادُكَ وَاِنْ تَغْفِرْ لَهُمْ فَاِنَّكَ اَنْتَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ تلاوت فرمائی۔ اسی کو (نماز میں
بار بار) تلاوت فرماتے رہے تھے۔ مسلم اور نسائی نے حضرت عبداللہ بن عمرو بن عاص کی روایت سے بھی ایسی ہی حدیث نقل کی ہے۔

يَوْمُ کی اضافت پورے جملہ کی طرف ہے اور جملہ مبنی ہوتا ہے۔ جمہور نے يَوْمُ کو خبر ہونے کی بنیاد پر مرفوع بصورت مضموم پڑھا ہے یعنی بغیر تنوین کے۔

حضرت عیسیٰ کے قول سے بظاہر یہ سمجھا جا سکتا تھا کہ کافروں کے لئے حضرت دعاء مغفرت کر رہے ہیں اس خیال کو دور کرنے کے لئے فرمایا کہ آج سچوں کی سچائی فائدہ رساں ہوگی کاذب کافروں کے لئے کوئی فائدہ نہیں ان کی مغفرت نہ ہوگی۔

یہ بھی ممکن ہے کہ عیسیٰ کے قول سے بظاہر جو خوف مترشح ہو رہا ہے اس کو دور کرنے کے لئے فرمایا ہو کہ آج سچوں کو ان کی سچائی فائدہ پہنچائے گی (اور تم سچے ہو تم کو کوئی خوف نہ کرنا چاہئے) مطلب یہ کہ دنیا میں جو لوگ (اعتقاد اور قول و عمل کے لحاظ سے) سچے تھے آخرت میں ان کی سچائی مفید ہوگی اور جو دنیا میں جھوٹے تھے وہ آخرت میں سچ بولیں اور لَمْ نَكُ مِنَ الْمُصَلِّيْنَ وَلَمْ نَكُ نُطْعِمُ الْمِسْكِيْنَ کہیں اور شیطان اقرار کرے کہ اِنَّ اللّٰهَ وَعَدَكُمْ وَعْدَ الْحَقِّ وَوَعَدْتُّكُمْ الخ یا آخرت میں بھی جھوٹ بولیں اور کہیں وَاللّٰهِ رَبِّنَا مَا كُنَّا مُشْرِكِيْنَ بہرحال کوئی بات مفید نہ ہوگی ان کے منہ پر مہر کر دی جائے گی اور ہاتھ پاؤں شہادت دیں گے جس سے ان کی رسوائی ہوگی۔

بعض اہل تفسیر کے نزدیک صٰدِقِيْنَ سے مراد انبیاء ہیں۔ کلبی نے کہا مومنوں کو ان کا ایمان فائدہ پہنچائے گا (یعنی صٰدِقِيْنَ سے مراد مومن ہیں) عطاء کے نزدیک يَوْمُ يَنْفَعُ سے اسی دنیا کا دن مراد ہے کیونکہ آخرت تو دار الجزاء ہے دار العمل نہیں ہے۔

لَهُمْ جَنّٰتٌ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَآ اَبَدًا ۚ (ان کی سچائی ان کو جنتیں دلوائے گی جن کے (درختوں اور محلات کے) نیچے نہریں بہتی ہوں گی ان جنتوں میں وہ ہمیشہ رہیں گے) یہ نفع اور ثواب کا بیان ہے۔

رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَرَضُوْا عَنْهُ ۚ (اللہ ان سے راضی ہوگا اور وہ اللہ سے خوش) کیونکہ محبت دونوں جانب سے ہوگی۔ صوفیہ نے یہی تشریح کی ہے لیکن عام اہل تفسیر نے توضیح مطلب اس طرح کی ہے کہ اللہ ان کی مخلصانہ کوشش کو پسند فرمائے گا۔ اللہ کی رضامندی ہوگی اور اللہ کی طرف سے عطا کئے ہوئے کامل ثواب سے اہل جنت خوش ہوں گے یہ ان کی رضامندی ہوگی یعنی ایک طرف سے سعی مشکور ہوگی اور دوسری طرف سے جزاء موفور۔

ذٰلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ ۝ (یہی بڑے درجہ کی کامیابی ہے) کیونکہ یہ کامیابی لازوال ہے اور دنیوی کامیابی فنا پذیر ہے۔ اس سے آگے آیات میں اللہ نے اپنی ذات کی عظمت کا اظہار اور عیسائیوں کے عقیدہ کا ابطال فرمایا ہے۔

لِلّٰهِ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا فِيْهِنَّ ۚ (اللہ ہی کی ہے حکومت آسمانوں کی اور زمینوں اور ان چیزوں کی جو ان کے اندر ہیں)۔ مَا کا لفظ بے عقل مخلوق کے لئے مستعمل ہے اور مَنْ کا لفظ باعقل کے لئے اور استعمال میں باعقل کو بے عقل پر تغلیب دے دی جاتی ہے۔ لیکن مَا فِيْهِنَّ میں بے عقل کے ذیل میں باعقل کو داخل کر دیا گیا ہے اور وہ لفظ استعمال کیا گیا ہے جو بے عقل کے لئے مخصوص ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ جو ممکنات باعقل ہیں وہ بھی بذاتی امکان، عقلی قصور اور نقصان ارادہ کے اعتبار سے بے عقلوں کے ہم جنس ہیں بلکہ ممکن کی تمام صفات کا ماخذ کا وجود عدم کی طرح ہے۔ اللہ نے فرمایا ہے اِنَّكَ مَيِّتٌ وَّاِنَّهُمْ مَّيِّتُوْنَ یعنی تم سب ذاتی اعتبار سے معدوم ہو (یعنی معدوم الاصل ہو اگرچہ موجود بالاعتبار ہو) اسی مضمون پر تنبیہ کرنے کے لئے بجائے مَنْ کے لفظ مَا ذکر کیا۔

ایک وجہ یہ بھی ہے کہ مَا کا اطلاق تمام اجناس پر ہوتا ہے (باعقل ہوں یا بے عقل) اور یہاں عموم مخلوق ہی مراد ہے۔

وَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ۝ (اور وہ سب کچھ کر سکتا ہے) نہ دینا، دینا، موجود کرنا، معدوم کرنا سب کا اس کو اختیار ہے۔

سورۂ مائدہ کی تفسیر ۱۹ ذیقعدہ ۱۱۹۸ھ کو ختم ہوئی اور اس کا ترجمہ ۱۲ ربیع الاول ۱۳۸۳ھ کو پایہ تکمیل کو پہنچا
فَالشُّكْرُ لِلّٰهِ مِنْ قَبْلُ وَمِنْ بَعْدُ

سورۃ الانعام مکی ہے

اس میں ایک سو پینتالیس یا ایک سو چھیالیس آیات اور ۲۰ رکوع ہیں

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ (ہر طرح کی ستائش ہے اللہ کے لئے) یہ لفظ کے اعتبار سے جملہ خبریہ ہے کہ تمام تعریفیں اللہ کے لئے ہیں۔ لیکن اس سے بندوں کو تعلیم دینا مقصود ہے کہ وہ اللہ کی حمد کریں اور در پردہ اس بات کی بھی تلقین ہے کہ اللہ کو بندوں کی ستائش کی ضرورت نہیں کوئی اس کی تعریف کرے یا نہ کرے بہرحال اس کے لئے واقع میں حمد و ستائش ہے۔

الَّذِیْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ (جس نے آسمانوں کو اور زمین کو اندازہ کے مطابق بنایا) اور بغیر سابق مثال کے پیدا کیا۔ اللہ کے وصف خالقیت کا ذکر کرنے سے اس طرف اشارہ ہے کہ اللہ کے محمود ہونے کے لئے کسی مزید استدلال کی ضرورت نہیں۔ آسمان و زمین کی تخلیق خود ثبوت حمد کے لئے کافی ہے۔ مخلوقات میں سے آسمان و زمین کا خصوصیت کے ساتھ تذکرہ اس لئے کیا کہ تمام مخلوقات میں سب سے بڑے یہی نظر آرہے ہیں، انہی کے اندر لوگوں کے لئے ہر طرح کی عبرت ہیں اور انہی سے بظاہر لوگوں کے مفاد وابستہ ہیں۔ پھر شب و روز کا حدوث و زوال ہر شخص دیکھ رہا ہے (اور کسی چیز کا حدوث بغیر محدث کے نہیں ہو سکتا) اسی لئے بعض نادان آسمانوں کو قدیم بالزمان کہتے ہیں۔ سَمٰوٰت کا ذکر بصیغہ جمع اور اَرْض بصیغہ مفرد ذکر کرنے سے اس امر پر تنبیہ ہے کہ آسمانوں کی ماہیتیں اور اشکال باہم مختلف ہیں اور زمین (باوجودیکہ اس کے طبقات متعدد ہیں) پھر بھی ایک ہی ماہیت اور یکساں شکل رکھتی ہے۔

کعب احبار کا قول ہے کہ توریت کی سب سے پہلی یہی آیت ہے اور سب سے آخری آیت قُلِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ لَمْ یَتَّخِذْ وَلَدًا الخ ہے۔ حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا اللہ نے آغاز تخلیق کا ذکر حمد سے کیا اور فرمایا اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضَ اور انسانوں کے خاتمہ کا ذکر بھی حمد کے ساتھ کیا اور فرمایا وَقُضِیَ بَیْنَهُمْ بِالْحَقِّ وَقِیْلَ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ۔

وَجَعَلَ الظُّلُمٰتِ وَالنُّوْرَ (اور بنایا تاریکیوں کو اور نور کو)۔ صاحب قاموس نے لکھا ہے کہ جَعَلَ کا معنی ہے خَلَقَ۔ بیضاوی نے لکھا ہے دونوں میں فرق ہے۔ خَلَقَ کا معنی ہے اندازہ کرنا اور جَعَلَ کے معنی کے اندر تضمین کا مفہوم ہے یعنی ایک چیز دوسری چیز کے ضمن میں کر دینا خواہ اس طرح کہ ایک چیز دوسری چیز سے موجود کر دی جائے یا اس طور پر کہ ایک شے کو بدل کر دوسری چیز بنا دیا جائے (جیسے جَعَلَ الْخَاتَمَ مِنْ فِضَّةٍ انگوٹھی چاندی سے بنا دی۔ اور جَعَلَ النُّوْرَ ظُلْمَةً روشنی کو تاریکی میں تبدیل کر دیا) خلاصہ یہ کہ جَعَلَ کے مفہوم کے اندر دو چیزوں کا اعتبار ضروری ہے اسی لئے نور و ظلمت کو عدم سے خارج کر کے وجود میں لانے کے لئے لفظ جَعَلَ ذکر کیا تاکہ یہ واضح ہو جائے کہ نور و ظلمت بجائے خود کوئی مستقل حیثیت نہیں رکھتے گویا اس سے فرقہ ثنویہ کے عقیدہ کی تردید ہو جائے گی (جو کہتے ہیں کہ نور سراسر خیر ہے اور ظلمت سراسر شر۔ یعنی خیر کی طاقت کا نام نور ہے اور شر کی طاقت کا نام ظلمت اور یہ دونوں طاقتیں بجائے خود مستقل اور قائم بذاتہ ہیں)۔

میں کہتا ہوں کہ ظلمت باوجودیکہ عدمی چیز ہے اور عدم (محض) سے جَعَلَ کا تعلق نہیں ہو سکتا لیکن اس آیت میں ظُلُمٰت کو بھی مجعول قرار دیا ہے کیونکہ ظلمت (معدوم محض نہیں ہے بلکہ اس کا اخراج ایسے محل سے ہوتا ہے جو مخلوق

ہے ظلمت دور ہو جائے خود تو تم پیدا نہیں ہیں اور چونکہ وہ اجسام جو حامل ظلمت اور تاریک ہیں بکثرت ہیں اس لئے ظلمات کو بصیغہ جمع ذکر کیا اور اجسام نورانی کم ہیں اس لئے صرف نور بصیغہ واحد ذکر فرمایا نیز نور کی نسبت ظلمت سے ایسی ہے جیسے واحد کی نسبت متعدد سے۔

حسن بصری کے نزدیک ظلمات سے مراد کفر اور نور سے مراد ایمان ہے۔ اس قول پر ظلمات کو بصیغہ جمع اور نور کو بصیغہ مفرد لانے کی وجہ یہ ہے کہ کفر کے طریقے بکثرت ہیں اور ایمان کا صرف ایک راستہ ہے۔ حضرت ابن مسعودؓ کا بیان ہے رسول اللہ ﷺ نے ہمارے سامنے ایک سیدھی لکیر کھینچی اور فرمایا یہ اللہ کا راستہ ہے پھر اس لکیر کے دائیں بائیں مختلف لکیریں کھینچیں اور فرمایا ان راستوں میں سے ہر راستہ پر شیطان موجود ہے جو لوگوں کو اپنی طرف بلا رہا ہے۔ اس کے بعد حضور ﷺ نے آیت اِنَّ هٰذَا صِرَاطِیْ مُسْتَقِیْمًا فَاتَّبِعُوْهُ وَلَا تَتَّبِعُوا السُّبُلَ فَتَفَرَّقَ بِكُمْ عَنْ سَبِیْلِهٖ تلاوت فرمائی۔ رواہ احمد والنسائی والدارمی۔

ظلمت کا وجود چونکہ نور سے پہلے ہوتا ہے (عدم وجود سے مقدم ہے) اس لئے ظلمات کا ذکر نور سے پہلے کیا۔ حضرت عبد اللہ بن عمرو بن عاصؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اللہ نے مخلوق کو تاریکی میں پیدا کیا پھر ان پر اپنے نور کا ایک حصہ ڈالا پس جس پر نور کا کوئی حصہ پڑ گیا وہ ہدایت یاب ہو گیا جس پر نہ پڑا وہ گمراہ ہو گیا اسی لئے تو میں کہتا ہوں کہ اللہ کے علم کے مطابق لکھ کر قلم خشک ہو گیا۔ رواہ احمد والترمذی۔

ثُمَّ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا بِرَبِّهِمْ یَعْدِلُوْنَ ① (پھر جو لوگ کفر کرتے ہیں وہ (عبادت و تعظیم اور عطاء انعام کی نسبت میں) دوسروں کو اپنے رب کے برابر قرار دیتے ہیں)۔

اس جملہ کا عطف یا تو اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ پر ہے اس وقت یَعْدِلُوْنَ کا مطلب یہ ہو گا کہ باوجودیکہ سارے جہان کو پیدا اللہ نے کیا اور ہدایت بھی اسی کا انعام ہے لیکن کافر اس کی نعمت کا انکار کرتے ہیں (دوسروں کو اس انعام دہی میں شریک سمجھتے ہیں) یا خَلَقَ پر عطف ہے یعنی اللہ نے تو تمام جہان پیدا کیا جس کی تخلیق پر سوائے اللہ کے کسی کو قدرت نہیں پھر کافر اپنی مخلوق کو اس کے برابر قرار دیتے ہیں جس کو تخلیق کائنات پر قدرت نہیں۔

لفظ ثُمَّ (اس جگہ تراخی کے لئے نہیں ہے بلکہ) تعجب کے اظہار کے لئے ہے کہ اس وضاحت کے بعد پھر کافروں کا شرک نہایت عجیب اور بعید (از عقل) ہے۔

بِرَبِّهِمْ کا تعلق كَفَرُوْا سے ہے اور یَعْدِلُوْنَ کا صلہ محذوف ہے یعنی اللہ کا انکار کرتے اور اس سے عدول کرتے ہیں (اس وقت یعدلون کا ترجمہ ہو گا ہٹتے ہیں یعنی اللہ سے ہٹتے ہیں) یا بِرَبِّهِمْ کا تعلق یَعْدِلُوْنَ سے ہے یعنی بتوں کو اللہ کے برابر قرار دیتے ہیں۔ نضر بن شمیل نے اس صورت میں بھی یعدلون کو عدول سے مشتق قرار دیا ہے اور انحراف و اعراض کے معنی بتائے ہیں اور لکھا ہے کہ بِرَبِّهِمْ میں باء بمعنی عن (سے) ہے یعنی اپنے رب سے انحراف کرتے ہیں۔

هُوَ الَّذِیْ خَلَقَكُمْ مِّنْ طِیْنٍ (اللہ وہی ہے جس نے تم کو (یعنی تمہارے باپ آدم کو ابتداء میں) گارے سے بنایا) یا کُم سے پہلے اب کا لفظ محذوف ہے۔ تمہارے باپ آدم کو گارے سے بنایا (اس صورت میں مجاز فی الحذف ہو گا)۔

سدی نے کہا۔ اللہ نے جبرئیل کو زمین پر کچھ مٹی لانے کے لئے بھیجا زمین نے جبرئیل سے کہا میں اللہ کی پناہ چاہتی ہوں اس بات سے کہ تو میرا کچھ حصہ کم کر دے (یعنی میرے بدن کا کچھ حصہ مجھ سے جدا کر لے) جبرئیل نے یہ سن کر کچھ نہیں لیا اور لوٹ کر عرض کیا اے مالک زمین نے مجھ سے تیری پناہ مانگی (تھی اس لئے میں خالی لوٹ آیا) پھر اللہ نے میکائیل کو بھیجا زمین نے ان سے بھی اللہ کی پناہ مانگی، میکائیل بھی لوٹ گئے آخر اللہ نے ملک الموت کو بھیجا زمین نے ان سے بھی اللہ کی پناہ مانگی۔ ملک الموت نے کہا میں اللہ کی نافرمانی کرنے سے اللہ کی پناہ مانگتا ہوں۔ غرض ملک الموت نے (کل) روئے زمین سے مٹی (تھوڑی تھوڑی) لی سرخ، سیاہ، سفید ہر طرح کی مٹی مخلوط کی اسی وجہ سے آدمیوں کے رنگ جدا جدا ہوئے پھر اس مٹی کو بھیگے سخت اور چکنی پانی سے گوندھا جس کی وجہ سے انسانوں کے اخلاق مختلف ہو گئے پھر اللہ نے فرمایا جبرئیل اور میکائیل نے تو زمین پر

اور تم کیا ایسا نہیں کیا اللہ جو مخلوق تم جیسی شکل سے بناؤں گا اس کی روح میں تیرے ہی ہاتھ میں دوں گا۔

حضرت ابوہریرہؓ کا بیان ہے کہ اللہ نے آدم کی تخلیق خاک سے اس طرح کی کہ خاک کا گارا بنایا پھر (کچھ مدت) اسے چھوڑے رکھا یہاں تک کہ گارا سڑ کر سیاہ کیچڑ بن گیا پھر اس کا پتلا بنایا اور پتلے کی صورت بنائی پھر اتنی مدت اسے چھوڑے رکھا کہ وہ ٹھیکرے کی طرح (خشک ہو کر) کھن کھن بولنے لگا پھر اس میں اپنی طرف سے روح پھونکی۔ کذا قال البغوی۔

حضرت ابو موسیٰؓ کا بیان ہے کہ میں نے رسول اللہ ﷺ سے سنا آپ فرما رہے تھے کہ اللہ نے تمام زمین سے ایک مٹھی (مٹی) لے کر آدمؑ کی تخلیق کی اسی لئے زمین کے مطابق آدمی سرخ، سفید، سیاہ اور مخلوط رنگ کے اور نرم خو، درشت مزاج، بد خصائل اور پاکیزہ اخلاق والے ہوگئے۔ رواہ احمد والترمذی وابو داؤد۔

حضرت ابوہریرہؓ کی مرفوع روایت ہے کہ اللہ نے آدم کو جابیہ کی مٹی سے بنایا اور جنت کے پانی سے اس کو گوندھا (معلوم نہیں جابیہ سے کیا مراد ہے ممکن ہے کسی گڑھے مراد ہوں جہاں پانی جمع ہو جاتا ہے اور دلدل بن جاتی ہے، اس صورت میں مطلب یہ ہوگا کہ دلدل اور سڑی ہوئی سیاہ مٹی سے جنت کے پانی سے گوندھ کر آدم کا پتلا بنایا) رواہ الحکیم وابن عدی بسند حسن۔

ثُمَّ قَضٰٓى اَجَلًا ؕ (پھر ایک وقت معین کیا)۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ جب جسمانی ساخت کی تکمیل ہو جاتی ہے تو فرشتہ اس کی میعاد زندگی لکھتا ہے۔ لفظ ثم اور جملہ فعلیہ اسی پر دلالت کر رہا ہے۔ حضرت ابن مسعودؓ کا بیان ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ہم سے فرمایا کہ تم میں سے ہر ایک کا مادۂ تخلیق ماں کے پیٹ میں چالیس روز تک بصورت نطفہ جمع رکھا جاتا ہے، پھر اتنی ہی مدت پھٹکی کی صورت میں رہتا ہے، پھر اتنی ہی مدت بوٹی کی شکل میں رہتا ہے، پھر اللہ اس کے پاس چار باتوں کا حکم دے کر فرشتہ کو بھیجتا ہے، فرشتہ اس کے (اچھے برے) عمل، میعاد زندگی، رزق اور بدبخت نیک بخت ہونا لکھتا ہے، پھر اس میں روح پھونکی جاتی ہے۔ پس قسم ہے اس ذات کی جس کے سوا کوئی معبود نہیں کہ تم میں سے کچھ لوگ (ساری عمر) جنت والوں کے سے کام کرتے ہیں یہاں تک کہ ان کے اور جنت کے درمیان صرف آدھے گز کا فاصلہ رہ جاتا ہے کہ کتاب کا لکھا آگے آتا ہے اور وہ دوزخیوں جیسا عمل کرتے ہیں اور دوزخ میں چلے جاتے ہیں۔ اور کچھ لوگ (ساری عمر) دوزخیوں کے سے کام کرتے ہیں یہاں تک کہ ان کے اور دوزخ کے درمیان صرف ایک ہاتھ کا فاصلہ رہ جاتا ہے کہ (اللہ کی) تحریر سامنے آتی ہے اور وہ جنت والوں جیسے عمل کرتے ہیں اور جنت میں چلے جاتے ہیں۔ متفق علیہ۔

وَاَجَلٌ مُّسَمًّى عِنْدَهٗ (اور دوسرا معین وقت خاص اللہ ہی کے پاس ہے یعنی میعاد مقررہ معین اللہ کے علم قدیم میں موجود ہے جس میں کوئی تغیر نہیں ہو سکتا، اللہ کے علاوہ اور کسی کو اس میں دخل نہیں ہے۔ جملہ اسمیہ دوام واستمرار پر دلالت کرتا ہے چونکہ اللہ کے علم کے اندر میعاد کا مقرر ہونا ناقابل تغیر ہے اس لئے جملہ اسمیہ استعمال کیا۔ اَجَلٌ کی تنوین عظمت کا اظہار کر رہی ہے اسی لئے اس جملہ کو بغیر عطف کے ذکر کیا اور چونکہ اَجَلٌ کی صفت مُسَمًّى مذکور ہے اس لئے خبر (عِنْدَهٗ) کو مقدم کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔

حسن، قتادہ اور ضحاک نے کہا پہلی اَجَلًا سے مراد ہے پوری مدت زندگی پیدائش سے موت تک اور دوسری اَجَلٌ سے مراد ہے موت سے حشر تک پوری ہونے والی مدت۔ حضرت ابن عباسؓ کا یہی قول روایت میں آیا ہے۔ حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا ہر شخص کی دو اجلیں ہیں۔ ایک پیدائش سے موت تک، دوسری موت سے حشر تک۔ اگر آدمی نیک، پرہیزگار اور کنبہ پرور ہوتا ہے تو برزخی اجل کا کچھ حصہ لے کر میعاد عمر میں بڑھا دیا جاتا ہے اور اگر بدکار رشتہ کو منقطع کرنے والا ہوتا ہے تو مدت زندگی کا کچھ حصہ لے کر اجل برزخی میں بڑھا دیا جاتا ہے۔

مجاہدؒ اور سعید بن جبیرؒ نے کہا اول اجل دنیا (کی زندگی) کی مدت ہے اور دوسری اجل آخرت کی مدت۔ عطیہ نے حضرت ابن عباسؓ کا قول نقل کیا ہے کہ ثُمَّ قَضٰٓى اَجَلًا میں اجل سے مراد نیند ہے جس میں اللہ روح کو قبض کر لیتا ہے اور بیداری کی حالت میں واپس کر دیتا ہے اور اَجَلٌ مُّسَمًّى عِنْدَهٗ سے مراد ہے اجل موت (یعنی مدت زندگی کا خاتمہ)۔

ثُمَّ اَنْتُمْ تَمْتَرُوْنَ ۝ (پھر بھی تم شک میں پڑے ہو)۔ تَمْتَرُوْنَ۔ مِرْیَۃٌ سے ماخوذ ہے مِرْیَۃٌ کا معنی ہے شک یا مِرَاءٌ سے ماخوذ ہے جس کا معنی ہے جھگڑا کرنا۔ یعنی اللہ کی قضا و قدر میں یا مرنے کے بعد جی اٹھنے میں تم شک یا جھگڑا کرتے ہو۔ ثم کا لفظ اظہار تعجب کے لئے ہے یعنی تعجب ہے کہ تم شک اور جھگڑا کرتے ہو باوجودیکہ یہ بات واضح ہو چکی کہ تمہارے تمام اصول کا خالق اور مدت مقررہ تک زندہ رکھنے والا اللہ ہی ہے۔ پس جس طرح اس نے پہلی مرتبہ پیدا کیا اسی طرح دوبارہ بھی زندہ کر کے اٹھا سکتا ہے اس کے حکم اور علم سے کوئی چیز باہر نہیں۔

حضرت عائشہؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا چھ شخص ہیں جن پر میں نے اور اللہ نے اور ہر مستجاب الدعوات پیغمبر نے لعنت کی ہے (۱) اللہ کی کتاب میں (لفظی یا معنوی) زیادتی کرنے والا (۲) تقدیر خداوندی کی تکذیب کرنے والا (۳) جبروتی تسلط جمانے والا تاکہ جس کو اللہ نے ذلیل قرار دیا ہے اس کو عزت دار بنائے اور جس کو اللہ نے عزت دار بنایا ہے اس کی ذلت کرے (۴) اللہ کی حرام کی ہوئی چیز کو حلال سمجھنے والا (۵) اللہ کی حلال قرار دی ہوئی چیز کو حرام بنانے والا (۶) اور میرے طریقہ کو ترک کرنے والا۔ رواہ البیہقی فی المدخل و رزین فی کتابہ۔

میں کہتا ہوں اللہ کی کتاب میں زیادتی کرنے والے رافضی ہیں جو قرآن کے تیس پاروں میں دس پاروں کی زیادتی کرتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ عثمانؓ نے قرآن کے دس پارے ساقط کر دیئے تھے۔ ان کا خیال یہ بھی ہے کہ سورۂ احزاب، سورۂ بقرہ کے برابر تھی۔ اور رسول اللہ ﷺ کی اولاد کے قتل کو حلال سمجھنے والے خارجی ہیں اور تقدیر خداوندی کی تکذیب کرنے والے معتزلہ ہیں۔ انہی کی طرف آیت میں اشارہ ہے۔ اور اللہ کی حرام کی ہوئی چیز کو حلال سمجھنے والا فرقہ مرجیہ ہے جو انسان کو محض مجبور قرار دیتا ہے اور زبردستی تسلط جمانے والے ظالم بادشاہ ہیں اور سنت رسول اللہ ﷺ کو ترک کرنے والے تمام بدعتی اور فاسق ہیں۔

وَهُوَ اللّٰهُ فِى السَّمٰوٰتِ وَفِى الْاَرْضِ (اور وہی ہے معبود برحق آسمانوں میں بھی اور زمین میں بھی)۔ ھو ضمیر لفظ اللہ کی طرف راجع ہے جس کا ذکر پہلے آ چکا ہے اور لفظ اللہ (جو اس جگہ مذکور ہے) ھُوَ کی خبر ہے یا بدل ہے۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ کی طرح ھو ضمیر شان ہو اور اللہ مبتدا ہو اور فِى السَّمٰوٰتِ خبر ہو، اگر لفظ اللہ کو صیغہ مشتق کہا جائے تو اس کا ترجمہ ہوگا معبود برحق اور فِى السَّمٰوٰتِ کا اس سے تعلق ہوگا یعنی اللہ آسمانوں میں اور زمین میں معبود برحق ہے۔ اور اللہ کو علم مانا جائے تو بتاویل مشتق قرار دے کر یوں ترجمہ کیا جائے گا کہ اللہ ہی آسمانوں میں اور زمین میں اللہ ہے یعنی اسی نام سے معروف ہے اور اسی نام سے اس کا ذکر کیا جاتا ہے۔

یا فِى السَّمٰوٰتِ ظرف مستقر ہے اور محذوف کے متعلق ہے اور ہو کا خبر ہے یعنی اللہ آسمانوں میں اور زمین میں موجود ہے۔ اس پر شبہ کیا جا سکتا ہے کہ یہ آسمان و زمین اللہ کے مکانات اور محل ہیں۔ لیکن جب اس کو توجیہ پر محمول کیا جائے تو کوئی شبہ نہیں رہے گا۔ کیونکہ (آسمان زمین اور ساری کائنات اللہ کی معرفت کا مظہر ہیں (یعنی وجود پر نے سے مراد ہوگا ظاہر ہونا یہ تو انداز ہوتا)۔

بیضاوی نے یہ معنی کی ہے کہ اللہ کو آسمان و زمین کا چونکہ کامل علم ہے اس لئے مجازاً کہا جا سکتا ہے کہ اللہ ان میں موجود ہے

يَعْلَمُ سِرَّكُمْ وَجَهْرَكُمْ (وہ تمہارے پوشیدہ اور ظاہر احوال کو جانتا ہے) یعنی جو باتیں تم دلوں میں پوشیدہ رکھتے ہو ان کو بھی جانتا ہے اور جو ظاہر کرتے ہو ان سے بھی واقف ہے۔ یہ دوسری خبر ہے یا پہلی ہی خبر ہے اور فِى السَّمٰوٰتِ وَفِى الْاَرْضِ یَعْلَمُ سے متعلق ہے۔ کیونکہ آسمانوں اور زمین میں اللہ کے معلومات واقع ہیں۔

وَيَعْلَمُ مَا تَكْسِبُوْنَ ۝ (اور جو کچھ تم عمل کرتے ہو اس کو بھی جانتا ہے)۔ یعنی اعضاء جسم سے تم جو نیکی بدی کرتے ہو اس کو اللہ جانتا ہے اس کا بدلہ (اچھا برا) تم کو دے گا۔ یہ مطلب بھی ہو سکتا ہے کہ دل اور اعضاء کے اعمال چھپ کر یا ظاہر طور پر تم کرتے ہو ان کو بھی اللہ جانتا ہے اور جو کام ابھی تم نے نہیں کئے آئندہ کرو گے اللہ ان سے بھی واقف ہے۔ ماضی حال اور

مستقبل کو جاننا اللہ کے معلومات کی خصوصیت ہے۔

وَمَا تَأْتِيهِم مِّنْ آيَةٍ مِّنْ آيَاتِ رَبِّهِمْ إِلَّا كَانُوا عَنْهَا مُعْرِضِينَ ۝ (اور ان کے پاس کوئی بھی نشانی ان کے رب کی نشانیوں میں سے نہیں آتی مگر وہ اس سے روگردانی کیا ہی کرتے ہیں) من آیۃ میں مِنْ عموم کے لئے ہے اور زائد ہے۔ آیات رب سے مراد معجزات ہیں جیسے چاند کا پھٹنا، کنکریوں کا بولنا وغیرہ اور عطاء کے نزدیک قرآن کی آیات مراد ہیں اور مِنْ آیٰتِهِمْ میں مِنْ تبعیضیہ ہے۔

فَقَدْ كَذَّبُوا بِالْحَقِّ لَمَّا جَاءَهُمْ (سو انہوں نے حق کو بھی جھوٹا قرار دیا جب حق ان کے پاس آگیا) حق سے مراد ہے قرآن یا رسول اللہ کی ذات مبارک۔ فقد میں فاء تفریع کے لئے یعنی جب انہوں نے تمام معجزات کا انکار کر دیا تو قرآن کا بھی انکار کر دیا یہ بھی ایک معجزہ ہی ہے۔ یا فاء سببیہ ہے، یعنی جب انہوں نے قرآن کی تکذیب کی جو لفظاً اور معنیً ہر زمانہ میں واضح ترین معجزہ ہے اور رسول اللہ ﷺ کی تکذیب کی جن کا وجود بجائے خود معجزہ ہے، ایک شخص جو ناخواندوں میں پیدا ہوا اور اس نے نہ کسی سے کچھ پڑھا نہ لکھا پھر ایسے شخص سے علم کے چشمے اور حکمت کے دریا بہہ نکلے جس کی تائید سابق آسمانی کتابوں سے ہو رہی ہے اور اس کی نبوت کا اقرار بڑے بڑے یہودی اور عیسائی علماء و مشائخ کر چکے ہیں لیکن انہوں نے اس کی نبوت کا بھی اقرار نہیں کیا تو پھر دوسرے متفرق معجزات سے روگردانی کیوں نہیں کریں گے۔

فَسَوْفَ يَأْتِيهِمْ أَنبَاءُ مَا كَانُوا بِهِ يَسْتَهْزِئُونَ ۝ (سو آئندہ ان کو اس چیز کی خبریں مل جائیں گی جس کا یہ مذاق اڑاتے تھے)۔ یعنی قیامت کے دن یا اسلام کے ظہور و عروج کے زمانہ میں۔ مطلب یہ کہ اپنے عمل کی برائی اس وقت ان پر ظاہر ہو جائے گی جب قیامت کے دن یا دنیا میں ہی ان پر عذاب آئے گا۔

أَلَمْ يَرَوْا كَمْ أَهْلَكْنَا مِن قَبْلِهِم مِّن قَرْنٍ (کیا (دوران سفر میں شام کے راستہ میں) انہوں نے نہیں دیکھا کہ کتنی کثرت سے جماعتوں کو ہم ہلاک کر چکے ہیں)۔ کَمْ خبریہ ہے بمعنی کثیر اور مِنْ قَبْلِهِمْ میں مِنْ زائد ہے۔ قرن ہم عصر جماعت، اس کی جمع قرون ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے خَيْرُ الْقُرُونِ قَرْنِي یعنی تمام جماعتوں میں بہترین لوگ ہیں جو میرے ہم عصر ہیں۔ یا قَرْن کے معنی ہیں زمانہ کا ایک حصہ چالیس سال کا یا دس سال کا یا بیس سال کا یا تیس یا پچاس یا ساٹھ ستر یا اسی یا سو یا ایک سو بیس برس کا، یہ مختلف اقوال آئے ہیں۔ صحیح ترین قول یہ ہے کہ قرن صدی کو کہتے ہیں کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے عبد اللہ بن بشر مازنی سے فرمایا تھا تم ایک قرن جیو گے۔ چنانچہ ان کی عمر سو برس ہوئی۔ (ذکرہ البغوی) نہایہ الجزری میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ایک لڑکے کے سر پر ہاتھ پھیر کر فرمایا تو ایک قرن جیئے گا۔ چنانچہ اس کی عمر سو برس کی ہوئی۔ اگر قرن کا معنی آیت میں زمانہ کا لیا جائے تو (زمانہ کو ہلاک کرنے سے) مراد اہل زمانہ کو ہلاک کرنا ہوگا۔

مَّكَّنَّاهُمْ فِي الْأَرْضِ (جن کو زمین پر ہم نے اتنی قوت دی تھی) یعنی ان کو جما دیا تھا اور طاقت، سامان اور تعداد عطا کی تھی۔

مَا لَمْ نُمَكِّن لَّكُمْ (کہ تم کو اتنی قوت نہیں دی) مَا لَمْ نُمَكِّنْ میں مَا یا مَكَّنَّا کا مفعول دوم ہے کیونکہ مَكَّنَّا کے اندر اَعْطَيْنَا کا معنی ہے یا مصدری ہے تَمْكِيْن کے معنی میں۔

حضرت ابن عباسؓ نے (اس طرح تفسیری مطلب) بیان کیا کہ ہم نے ان کی عمر میں اتنی ڈھیل دی کہ اتنی ڈھیل تمہاری عمروں میں نہیں دی جیسے قوم نوح، قوم عاد، قوم ثمود وغیرہ۔ آیت میں (لَكُمْ) خطاب ہے لیکن اس سے اوپر (فَسَوْفَ يَأْتِيهِمْ أَلَمْ يَرَوْا وغیرہ) غائب کی ضمیریں ہیں اور یہ خوبصورت سے خطاب کی جانب انتقال ہے (جو مستحسن ہے) علماء بصرہ نے کہا اہل مکہ کے متعلق غائب کی ضمیر استعمال کی اور فرمایا أَلَمْ يَرَوْا لیکن اہل مکہ میں رسول اللہ ﷺ اور آپ کے ساتھی بھی شامل تھے (جو حاضر تھے) اس لئے خطاب کی طرف انتقال کیا۔

وَأَرْسَلْنَا السَّمَاءَ عَلَيْهِم مِّدْرَارًا (اور ہم نے ان پر خوب بارشیں برسائیں)۔ اَلسَّمَاء سے مراد ہے

بارش، یہ مِدْرَارًا بروزن مِفْعَالٌ۔ مادہ دَرٌّ ہے دَرٌّ کا معنی ہے دودھ۔ دودھ عرب کے لئے بہت بڑھیا چیز ہے اس لئے بڑے فوائد اور کثیر بھلائی کو دَر کہا جاتا ہے۔ (گویا مدرارا کا ترجمہ ہوا بہت مفید۔ ضرورت کے وقت بہت کار آمد) حضرت ابن عباسؓ نے اس کا ترجمہ کیا پیہم مسلسل۔

وَجَعَلْنَا الْاَنْهٰرَ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهِمْ (اور ہم نے ان کے نیچے سے نہریں جاری کیں) یعنی ان کے مکانوں کے نیچے ہم نے نہریں جاری کر دی تھیں اس لئے پھلدار درختوں اور بہتی نہروں کے اندر وہ بڑے مزے اور عیش سے رہتے تھے۔

فَاَهْلَكْنٰهُمْ بِذُنُوْبِهِمْ (پھر ان کے گناہوں کی وجہ سے ہم نے ان کو تباہ کر دیا) یعنی جب ہدایت کرنے کے لئے ان کے پاس انبیاء بھیجے اور انہوں نے انبیاء کو جھوٹا قرار دیا تو ہم نے ان کو تباہ کر دیا اس وقت ان کے پاس انبیاء پہنچے اور انہوں نے انبیاء کو جھوٹا قرار دیا تو ہم نے ان کو تباہ کر دیا اس وقت ان کی دنیوی طاقت اور خوش عیشی کچھ کام نہ آئی پس یہ کافر جب محمد ﷺ اور قرآن کا انکار کرتے ہیں تو دنیوی ساز و سامان ان کو تباہی سے کس طرح بچا سکتا ہے۔

وَاَنْشَاْنَا مِنْۢ بَعْدِهِمْ قَرْنًا اٰخَرِيْنَ (اور ان کے بعد ہم نے دوسری قومیں پیدا کیں) اور تباہ شدہ لوگوں کی جگہ ان کو قائم کیا یعنی جس طرح گزشتہ زمانہ میں پیغمبروں کی تکذیب کرنے والوں کو تباہ کر کے دوسری قوموں کو ان کا جانشین بنایا اسی طرح اے اہل مکہ اگر تم ایمان نہ لاؤ گے تو تم کو بھی ہم تباہ کر دیں گے (اور تمہاری جگہ دوسرے لوگوں کو لے آئیں گے)۔

کلبی اور مقاتل کا بیان ہے کہ نضر بن حارث، عبداللہ بن ابی امیہ اور نوفل بن خویلد نے کہا محمد ﷺ ہم ہرگز تم پر اس وقت تک ایمان نہیں لائیں گے جب تک اللہ کی طرف سے (ہماری نظروں کے سامنے) تم ایک کتاب نہ لاؤ جس کے ساتھ چار فرشتے ہوں اور وہ شہادت دیں کہ یہ کتاب اللہ کی طرف سے آئی ہے اور محمد اللہ کے رسول ہیں۔ اس پر مندرجہ ذیل آیت نازل ہوئی۔

وَلَوْ نَزَّلْنَا عَلَيْكَ كِتٰبًا فِيْ قِرْطَاسٍ فَلَمَسُوْهُ بِاَيْدِيْهِمْ (اور کسی کاغذ پر لکھی ہوئی تحریر ہم تم پر نازل کر دیں جس کو اپنے ہاتھوں سے یہ لوگ چھو رہے ہوں)۔

لَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اِنْ هٰذَآ اِلَّا سِحْرٌ مُّبِيْنٌ (تب بھی کافر محض ضد اور عناد سے) کہیں گے کہ یہ تو بس کھلا ہوا جادو ہے۔ اپنے ہاتھ سے چھونے کے بعد فریب دہی اور فریب خوردگی کی گنجائش نہیں رہتی کیونکہ جن چیزوں کو ہاتھ سے چھو لیا جائے ان کو جادو کی کارفرمائی نہیں کہہ سکتے اور اس کو نظر بندی کہہ کر ساقط الاعتبار قرار دینا ممکن نہیں مگر کافر اس کو بھی جادو ہی کہیں گے اور ایمان نہیں لائیں گے۔ اللہ کے علم ازلی میں پہلے سے موجود ہے کہ یہ لوگ ایمان لانے والے نہیں ہیں۔

وَقَالُوْا لَوْلَآ اُنْزِلَ عَلَيْهِ مَلَكٌ (انہوں نے کہا کہ محمد پر فرشتہ نازل کیوں نہیں کیا گیا) یعنی فرشتے کو کیوں نہیں اتار دیا گیا جو اس کی نبوت کی شہادت دے اور ہم کو بتائے کہ یہ پیغمبر ہے اس آیت کا مضمون وہی ہے جو آیت لولا انزل الیہ ملک فیکون معہ نذیرا کا ہے۔

وَلَوْ اَنْزَلْنَا مَلَكًا لَّقُضِيَ الْاَمْرُ ثُمَّ لَا يُنْظَرُوْنَ (اور اگر ہم (اس کے ساتھ) فرشتہ کو (شاہد بنا کر) اتار دیں تو کام ہی تمام کر دیا جائے گا اس کے بعد ان کو مہلت نہیں دی جائے گی) کام تمام کر دینے سے مراد ہے درخواست نزول کرنے والوں کو تباہ کر دینا کیونکہ ماضی میں اللہ کا طریقہ یہی رہا ہے کہ طلب معجزات کرنے والوں کو ظہور معجزات کے بعد ہلاک کر دیا گیا۔ مجاہد نے کہا کام تمام ہونے سے مراد ہے قیامت برپا ہو جانا۔ ضحاک نے کہا اگر فرشتہ اصلی شکل میں ان کے سامنے آ جاتا تو ہیبت کے مارے سب مر جاتے۔

لفظ ثُمَّ (تراخی کے لئے یہاں نہیں ہے بلکہ) فرق مرتبہ کو ظاہر کرنے کے لئے ہے کام کا فیصلہ ہو چکنا اور مہلت نہ پانا

دونوں میں بڑا فرق ہے نفس عذاب سے عذاب کا کھل کر آجانا زیادہ سخت ہوتا ہے۔

وَلَوْ جَعَلْنٰهُ مَلَكًا (اور اگر ہم اس (شاہد) کو فرشتہ بناتے یا رسول کو فرشتہ بناتے یعنی اگر فرشتہ کو رسول کا ہمراہی (اور شاہد) بناتے یا یہ مطلب کہ کسی فرشتہ کو رسول بنا کر بھیجتے۔ کافروں کی درخواست دونوں طرح کی تھی۔ کبھی تو وہ کہتے لَوْلَآ اُنْزِلَ اِلَيْهِ مَلَكٌ فَيَكُوْنَ مَعَهٗ نَذِيْرًا اور کبھی کہتے لَوْ شَآءَ رَبُّنَا لَاَنْزَلَ مَلٰٓئِكَةً (اس لئے آیت مذکورہ کا دونوں طرح ترجمہ اور مطلب صحیح ہے۔

لَّجَعَلْنٰهُ رَجُلًا (تو ہم اس کو مرد بناتے) یعنی مرد کی شکل بنا کر بھیجتے جیسے حضرت جبرئیل حضرت دحیہ کلبی کی شکل میں رسول اللہ ﷺ کے سامنے آتے تھے۔ بات یہ ہے کہ فرشتوں کو ان کی اصلی شکل میں دیکھنا عام بشری قوت سے باہر ہے البتہ بعض مخصوص انبیاء نے قوت قدسیہ کا حامل ہونے کی وجہ سے ملائکہ کو اصلی صورت میں بھی دیکھا تھا ایک وجہ یہ بھی ہے کہ پیغمبر خالق و مخلوق کے درمیان ایک برزخی حیثیت رکھتا ہے اس لئے اس میں طرفین سے مناسبت ہوتی ہے خالق کے ساتھ ارتباط رکھنے کی وجہ سے وہ ان تمام فیوض کو قبول کرتا ہے جو عالم بالا سے جاری ہوتے ہیں اور مخلوق کے ساتھ مناسبت رکھنے کی وجہ سے وہ باری تعالیٰ کی طرف سے نازل شدہ فیوض سے مخلوق کو سرفراز کرتا ہے اگر طرفین کے ساتھ مناسبت نہ ہو تو فیضان روحانی کو حاصل کرنا اور مخلوق کو اس سے بہرہ اندوز کرنا ممکن نہیں۔ انبیاء ہوں یا ملائکہ دونوں کا باطنی لگاؤ خالق سے ہوتا ہے ان کا مبداء تعین ذات باری کا کوئی مخصوص وصف ہوتا ہے باقی مخلوق کا مبداء تعین کوئی صفت نہیں بلکہ صفت کا پرتو اور عکس ہوتا ہے۔ اس لئے ضروری ہے کہ رسول کا مخلوق سے شکلی (نوعی اور مادی) مناسبت بھی ہو (پس اگر ملائکہ کو انسانوں کے پاس پیام پہنچانے کے لئے بھیجا جاتا تو کم سے کم ان رسولوں کا آدمی کی شکل پر ہونا ضروری تھا اور ایسی حالت میں ان کی شناخت ناممکن تھی یہ معلوم نہیں ہو سکتا تھا کہ واقع میں وہ ملائکہ انسانی نسل کی پیداوار ہیں اور انسانوں سے نوعی اشتراک رکھتے ہیں یا ملائکہ بشکل بشری ہیں اور انسانوں کے بھیس میں آئے ہوئے ہیں)۔

پیغمبر فرشتوں کو انسانی شکل میں بھیجنا اس لئے بھی ضروری ہو تاکہ انسان ایمان بالغیب کا مکلف ہے۔ اس صورت کا تقاضا ہے کہ فرشتوں کو (پیغمبر بنا کر بھیجنے کے باوجود) مشتبہ اور پردہ کے اندر رکھا جائے (تاکہ یہ بھی حقیقت غائب ہی رہے) اسی لئے آگے فرمایا ہے۔

وَلَلَبَسْنَا عَلَيْهِمْ مَّا يَلْبِسُوْنَ ۝ (اور ہم نے اس فعل سے ان کے لئے وہی اشکال پیدا ہوتا جو اشکال اب کر رہے ہیں) یعنی فرشتوں کی حالت تو ہم اشتباہ میں ہی رکھتے لوگوں کو معلوم بھی نہ ہوتا کہ یہ فرشتے ہیں بلکہ وہ یہی سمجھتے کہ یہ بھی دوسروں کی طرح انسان ہیں جس طرح اب انبیاء کے کھلے معجزات دیکھنے کے بعد بھی رسالت و نبوت میں اشتباہی کیفیت انہوں نے خود اپنے اوپر طاری کر رکھی ہے۔ کافر حضور اقدس ﷺ سے استہزاء کرتے تھے جس سے آپ کو دکھ پہنچتا تھا۔ آئندہ آیت آپ کی تسلی کے لئے نازل ہوئی۔

وَلَقَدِ اسْتُهْزِئَ بِرُسُلٍ مِّنْ قَبْلِكَ (اور آپ سے پہلے پیغمبروں سے بھی استہزاء کیا گیا ہے) جس طرح آپ سے استہزاء کیا جاتا ہے اس لئے آپ اس کی پرواہ نہ کریں۔

ـــه نبوت اور ملکیت کو ایک آئینہ کہا جا سکتا ہے جس کا رخ پورے مقابلے کے ساتھ نہیں بلکہ کچھ ترچھے طور پر آفتاب الوہیت کی طرف ہوتا ہے اور بغیر کسی وساطت کے آفتاب الوہیت کی کوئی شعاع بلاواسطہ اس آئینہ پر پڑتی ہے۔ مبداء تعین ہونے کا یہی معنی ہے۔ پھر آئینہ کا رخ چونکہ ترچھا ہوتا ہے اس لئے آئینہ نبوت و رسالت پر پڑنے والی کوئی شعاع براہ راست دوسری کسی آئینہ پر نہ ہونے کی وجہ سے نہیں پہنچ سکتی گویا آفتاب الوہیت کی شعاع براہ راست آئینہ پر پڑتی ہے اور آئینہ کو روشن کر دیتی ہے پھر آئینہ سے الٹ کر والان کی کسی اور مسقف جگہ پر پہنچتی ہے اور آئینہ نبوت پر پڑنے والی شعاع کے عکس سے اندرونی حصہ بھی چمکنے لگتا ہے یہی معنی ہیں اس قول کے کہ باقی مخلوق کا مبداء تعین صفت کا سایہ ہے۔

فَحَاقَ بِالَّذِيْنَ سَخِرُوْا مِنْهُمْ مَّا كَانُوْا بِهٖ يَسْتَهْزِءُوْنَ ۝ (پھر اسی (عذاب) نے ان مذاق بنانے والوں کو گھیر لیا جس کا وہ مذاق اڑایا کرتے تھے)۔ سوان استہزاء کرنے والوں کو بھی وہی عذاب گھیر لے گا جس سے یہ استہزاء کرتے ہیں۔ ضحاک نے حَاقَ کا ترجمہ کیا ہے "گھیر لیا"۔ قاموس میں بھی یہی ہے۔ لیکن ربیع بن انس اور عطاء نے علی الترتیب اس کا ترجمہ کیا ہے نزل اور حلّ یعنی نازل ہوا اور اترا۔

قُلْ سِيْرُوْا فِي الْاَرْضِ اے محمد ﷺ (آپ کہہ دیجئے کہ زمین کی سیر کرو)۔ خواہ جسمانی سفر کے ذریعہ سے ہو یا عقل ودانش اور عبرت اندوز سوچ بچار کی سیر ہو۔

ثُمَّ انْظُرُوْا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُكَذِّبِيْنَ ۝ (پھر (پیغمبروں کو) جھوٹا قرار دینے والوں کے انجام کی کیفیت دیکھو)۔ یعنی دیکھو کہ ان کا انجام کار کیا ہوا اور کفر وتکذیب کے نتیجہ میں ان کی کیسی تباہی وناکامی ہوئی۔

ایک شبہ

دوسری آیت ہے قُلْ سِيْرُوْا فِي الْاَرْضِ فَانْظُرُوْا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُكَذِّبِيْنَ اور اس آیت میں ہے ثُمَّ انْظُرُوْا۔ فاء صرف تعقیب کے لئے آتی ہے (یعنی فاء کے بعد جو مضمون ہوتا ہے وہ فاء سے پہلے والے مضمون کے بعد بغیر کسی توقف کے واقع ہوتا ہے) اور ثم تراخی کے لئے آتا ہے (یعنی ثُمَّ کے بعد والا مضمون پہلے والے مضمون سے کچھ مدت اور وقفہ کے بعد واقع ہوتا ہے)۔ اب سوال یہ ہے کہ سیر ارض کے بعد فوراً انجام نظر کے سامنے آنا ضروری ہے یا کچھ مدت کے بعد۔ دونوں مضمونوں میں مطابقت کس طرح ممکن ہے۔

ازالہ

سیر (کوئی لمحاتی اور آنی چیز نہیں بلکہ اس) کے لئے کچھ وقت اور مسافت کی ضرورت ہے ابتداء سیر اور انتہاء سیر کے درمیان کافی وقت ہوتا ہے اہل تکذیب کا کچھ انجام تو ابتدائی سیر کے بعد ہی نظر کے سامنے آسکتا ہے اور ان کے ویران شہروں اور تباہ شدہ بستیوں کا پورا عبرت آفریں معائنہ انتہاء سیر کے بعد ہوتا ہے۔ اول صورت کے لحاظ سے فاء کا استعمال کیا اور دوسری صورت کے لحاظ سے ثم کو ذکر کیا۔

بیضاوی نے لکھا ہے کہ اس آیت اور آیت سِيْرُوْا فِي الْاَرْضِ فَانْظُرُوْا میں فرق یہ ہے کہ فَانْظُرُوْا والی آیت میں تو سیر کا حکم صرف نظر کے لئے دیا گیا ہے اور اس آیت میں ایسا نہیں ہے اسی لئے کہا گیا ہے کہ اس آیت کا معنی یہ ہے کہ تجارت وغیرہ کے لئے سفر کرنا مباح ہے اور تباہ شدہ لوگوں کے آثار دیکھنا واجب ہے (یعنی تجارت وغیرہ کے لئے جاؤ تو لازم ہے کہ ان قوموں کی ویران بستیاں اور ان کا انجام بد دیکھو) صاحب مدارک نے بھی یہی لکھا ہے بلکہ اتنا زائد لکھا ہے کہ اس آیت میں (سیر کا حکم بطور اباحت کے ہے اور ہلاک شدہ لوگوں کے آثار دیکھنے کا حکم وجوبی ہے اور دونوں حکموں کے درمیان) ثُمَّ ذکر کیا ہے کیونکہ اباحت وایجاب میں کامل بعد ہے (اور ثُمَّ اسی بُعد پر دلالت کر رہا ہے)۔

میں کہتا ہوں ان دونوں بزرگوں کے قول کا منشا یہ ہے کہ فاء کو سببیہ مانا گیا ہے اور سببیت کا تقاضا یہ ہے کہ سیر واقع میں نظر کا سبب ہے (یعنی سیر کے بعد نظر حاصل ہوتی ہی ہے) خواہ نظر مقصود اصلی ہو یا نہ ہو۔ اب دونوں آیتوں کا مقصد یہ نکلا کہ دونوں چیزیں مطلوب ہیں مطلق سیر اور تباہ شدہ لوگوں کے انجام کا معائنہ۔ مگر اس آیت میں چونکہ ثُمَّ ہے اس لئے سیر کا سبب نظر ہونا معلوم نہیں ہوتا اور دوسری آیت میں فاء ہے اس لئے سیر کا سبب نظر ہونا ضروری ہے اور دونوں آیتوں کا سیاق بتاتا ہے کہ امر کا اصل مقصد تو نظر انجام ہے اور سیر چونکہ نظر کا ذریعہ ہے اس لئے اس کا بھی حکم دے دیا گیا ہے اور چونکہ بلذات مقصود اور وسیلہ مطلوب میں بہت زیادہ بعد ہے (مقصد اور ذریعہ مقصد دو الگ الگ چیزیں ہیں) اس لئے لفظ ثُمَّ استعمال

کیا گیا۔ اب دونوں آیتوں میں مطابقت پیدا کرنے کے لئے اس امر کی ضرورت نہیں رہتی کہ فَانْظُرُوْا والی آیت میں آغاز سیر اور ثُمَّ انْظُرُوْا والی آیت میں اختتام سیر مراد لی جائے۔

قُلْ لِّمَنْ مَّا فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ط اے محمد ﷺ (آپ پوچھئے کہ آسمانوں اور زمینوں میں جو کچھ ہے وہ کس کا (بنایا ہوا اور قائم کیا ہوا) ہے۔ ما کا لفظ عام ہے اصحاب عقل (جن و انس و ملائکہ) اور بے عقل (باقی ساری کائنات) سب کو شامل ہے۔

قُلْ لِّلّٰهِ ط چونکہ اس کا جواب اختلافی نہیں ہو سکتا اور کوئی یہ جواب نہیں دے سکتا کہ یہ کائنات اللہ کے سوا کسی اور کی ہے اسلئے آپ ہی کہہ دیجئے کہ سب کچھ اللہ کا ہے۔

كَتَبَ عَلٰی نَفْسِهِ الرَّحْمَةَ ط اس نے اپنے اوپر رحمت کا ذمہ لے رکھا ہے۔ یعنی اس نے رحمت کرنے کا ذمہ لے رکھا اور محکم ترین وعدہ کر لیا ہے، جس کی خلاف ورزی نا ممکن ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ جب اللہ نے مخلوق کو پیدا کرنے کا فیصلہ کر لیا تو ایک تحریر لکھ کر اپنے پاس عرش کے اوپر رکھ چھوڑی جس میں لکھا ہے یقیناً میری رحمت میرے غضب پر غالب ہو گئی۔ دوسری روایت میں ہے میری رحمت میرے غضب سے آگے بڑھ گئی۔ رواہ البغوی من حدیث ابی ہریرہ۔

حضرت ابوہریرہؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اللہ کی سو رحمتیں ہیں جن میں سے ایک اس نے نیچے اتار کر جن و بشر اور چوپایوں اور کیڑوں مکوڑوں کو تقسیم کی ہے، اسی کی وجہ سے وہ باہم محبت و رحمت کرتے ہیں اور وحشی جانور اسی کے سبب اپنے بچوں سے پیار کرتے ہیں۔ ننانوے رحمتیں اس نے اپنے لئے رکھ چھوڑی ہیں جن سے قیامت کے دن اپنے بندوں کو سرفراز فرمائے گا۔ رواہ مسلم۔

میں کہتا ہوں غالباً سو کی تعیین عددی نہیں بلکہ بطور تمثیل اظہار کثرت مراد ہے کیونکہ بندوں کے پاس جو کچھ ہے (رحمت ہو یا کچھ اور سب) ختم ہونے والا ہے اور جو اللہ کے پاس ہے وہ لازوال ہے۔ ممکنات کی تمام صفات محدود ہیں اور اللہ کی صفات لا متناہی۔ رحمت کا جو حصہ اللہ نے انسانوں اور بندوں کے دلوں میں ڈالا ہے وہ اللہ کی رحمت کا ایک ادنیٰ پرتو ہے۔

حضرت عمر بن خطابؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں کچھ جنگی قیدی حاضر کئے گئے ان میں ایک عورت بھی تھی جس کے پستان دودھ سے بھرے ہوئے تھے جب قیدیوں میں ایک بچہ پر اس کی نظر پڑی تو دوڑ کر عورت نے بچہ کو پکڑ کر سینے سے چمٹا لیا اور اس کو دودھ پلایا۔ حضور ﷺ نے فرمایا دیکھو کیا یہ عورت اپنے بچہ کو آگ میں پھینک سکتی ہے۔ ہم نے عرض کیا نہیں وہ ایسا کر ہی نہیں سکتی۔ فرمایا جس قدر یہ عورت اپنے بچہ پر مہربان ہے اس سے زیادہ اللہ اپنے بندوں پر مہربان ہے۔

اللہ کی دنیوی رحمت دنیوی نعمتوں کی شکل میں ظاہر ہوتی ہے (جیسے جسمانی صحت و حسن، مال و دولت کی کثرت، اولاد کی فراوانی، عیش و راحت، حکومت و عزت، اس میں مسلم و کافر سب شریک ہیں) اور رحمت اخروی سے نعمت آخرت وابستہ ہے جیسے پیغمبروں کی بعثت آسمانی کتابوں کا نزول (باطنی و ظاہری، انفسی و آفاقی) دلائل توحید کا قیام اور موت اور مرنے کے بعد دوبارہ زندگی جس کے نتیجہ میں جنت اور اللہ کا دیدار حاصل ہو گا۔ یہ سب آخرت سے تعلق رکھنے والی رحمت ہے (جو مسلمانوں کے لئے مخصوص ہے) اور یہی اصل مقصود ہے۔ احادیث مندرجہ بالا اسی پر دلالت کر رہی ہیں اور آئندہ آیت بھی کی جارہی ہے۔

لَيَجْمَعَنَّكُمْ اِلٰی يَوْمِ الْقِيٰمَةِ (اللہ تم کو (یعنی تمہارے اجزاء کو) قیامت کے دن ضرور جمع کر کے اٹھائے گا) اس جگہ اِلٰی بمعنی فی ہے۔

یا یہ مطلب ہے کہ اللہ قبروں کے اندر تم سب کو قیامت تک جمع رکھے گا (یہ تو آیت کا اصل مطلب ہے جو صراحۃً معلوم ہو رہا ہے لیکن) اس سے ذیلی طور پر یہ بھی معلوم ہو رہا ہے کہ قیامت کے دن اللہ تم کو اٹھائے گا اور تم قبروں سے نکل

نکالے جاؤ گے تاکہ اپنی اپنی زندگی کا کیا دھرا دیکھ سکو اور پھر اس کا بدلہ تم کو دیا جائے۔

اس آیت سے ظاہر ہو رہا ہے کہ اصل مقصد آخرت کی رحمت ہے۔ چونکہ کافر بڑی قوت کے ساتھ پر زور طور پر دوسری زندگی اور قیامت کے دن اٹھائے جانے کے منکر تھے اس لئے سب سے پہلے تکذیب کرنے والوں کے انجام بد کا معائنہ کرنے کا حکم دیا، پھر ہمہ گیر قدرت کا اظہار لِمَنْ مَّا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ کہہ کر فرمایا، پھر كَتَبَ عَلٰى نَفْسِهِ الرَّحْمَةَ سے دوبارہ جی اٹھنے کی حکمت بیان فرمائی، پھر لَيَجْمَعَنَّكُمْ میں لام تاکید کے ساتھ بعث و حشر کی صراحت کی، پھر آخر دو آیت میں وجود قیامت کو ناقابل شک قرار دیا اور فرمایا۔

لَا رَيْبَ فِيْهِ (اس میں کوئی شک نہیں)۔ یعنی جسم کے منتشر اجزاء کا دوبارہ جمع کیا جانا یا روز قیامت کا آنا قابل شک نہیں ہے۔

اور چونکہ الرَّحْمَةَ کا لفظ عام تھا جس سے شبہ ہوتا تھا کہ شاید اللہ کی نزولی نعمت سے کفار بھی بہرہ اندوز ہو سکیں گے اور یہ شبہ تھا غلط اس لئے آئندہ آیت میں کافروں کی آخرت میں محرومی ظاہر کی اور یہ بھی بتلا دیا کہ یہ محرومی خود کافروں کی آوردہ ہوئی اور فرمایا۔

اَلَّذِيْنَ خَسِرُوْٓا اَنْفُسَهُمْ فَهُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ ۝ (جن لوگوں نے اپنے کو ضائع کر دیا ہے وہ ایمان نہیں لائیں گے)۔

یعنی شرک کرنے کی وجہ سے جنہوں نے اپنے کو ضائع کر دیا وہ ایمان نہیں لائیں گے کیونکہ انہوں نے اصلی پونجی ہی کھو دی، فطرت سلیم اور صحیح دانش ضائع کر دی اور اللہ کی رحمت کا جو حصہ ان کو مل رہا تھا اس کو فوت کر دیا اور اس کے عوض عذاب خرید لیا۔

فَهُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ کی فاء بتا رہی ہے کہ اللہ کے علم میں جو کافروں کا خسران ہے (یعنی اللہ پہلے سے جانتا ہے کہ یہ لوگ خاسر رہیں گے) وہی ان کے ایمان نہ لانے کا سبب ہے۔

اَلَّذِيْنَ خَسِرُوْٓا سے پہلے واؤ عاطفہ کا ذکر ہونا چاہئے تھا تاکہ لَا رَيْبَ فِيْهِ پر عطف ہو جاتا مگر لَا رَيْبَ فِيْهِ کہنے کے بعد ایک سوال کیا جا سکتا تھا کہ روز قیامت ناقابل شک ہے تو کافروں کو اس میں شک کیوں ہے۔ اس کا جواب دینے کے لئے فرمایا کہ درحقیقت ان کا خسران عدم ایمان کا سبب ہے (چونکہ ان کو خاسر رہنا مقدر ہو چکا ہے اس لئے روز قیامت پر ان کا ایمان نہیں) یہ بھی ممکن ہے کہ اَلَّذِيْنَ کو فعل ذم محذوف کا مفعول قرار دیا جائے (اور یہ جملہ فعلیہ ہو جائے)۔

حضرت ابو امامہؓ کی روایت کردہ حدیث بھی اس امر پر دلالت کر رہی ہے کہ اللہ کی رحمت عام ہے اور کافروں کی محرومی کا سبب ان کا خسران ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا تم میں سے ہر ایک جنت میں جائے گا سوائے اس شخص کے جو اللہ سے ایسا بھاگے جیسے وحشی اونٹ اپنے گھر والوں سے بھاگتا ہے (رواہ الطبرانی والحاکم بسند صحیح)۔

وَلَهٗ مَا سَكَنَ فِي الَّيْلِ وَالنَّهَارِ (اور اسی کا ہے وہ سب کچھ جو رات اور دن (کے دور) میں رہتا ہے)۔

سَكَنَ، سُكْنٰی سے مشتق ہے اس کے بعد ظرف مکان آتا ہے، جس سے پہلے فی ہوتا ہے (جیسے فِي الْبَيْتِ، فِي الْمَسْجِدِ وغیرہ) لیکن اس جگہ زمان (اللیل و النہار) کا ذکر بطور استعارہ کیا (گویا زمان کو مکان کا قائم مقام قرار دیا اور یہ ظاہر کیا کہ مکان کی طرح زمان بھی قابل سکونت چیز ہے، دوسری آیت میں سَكَنْتُمْ فِيْ مَسٰكِنِ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْٓا اَنْفُسَهُمْ آیا ہے (اور فی کے بعد مکان کا ذکر ہے) یہاں ما سے مراد وہ تمام چیزیں ہیں جن پر روز و شب کا دور ہوتا ہے۔ یا لفظ سَكَنَ، سُكُوْنٌ سے ماخوذ ہے، مراد یہ ہے کہ اللہ ہی کا ہے جو دن رات کے چکر میں ساکن رہتا یا حرکت کرتا ہے۔ متحرک کا ذکر اس لئے نہیں کیا کہ متحرک کی ضد یعنی ساکن کا ذکر کر دیا (ایک ضد کے ذکر پر اکتفا کر لیا جاتا ہے مگر مراد دونوں ہوتے ہیں) جیسے سَرَابِيْلَ تَقِيْكُمُ الْحَرَّ یعنی کرتے جو تم کو گرمی سردی سے محفوظ رکھتے ہیں۔

وَهُوَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ (اور وہی سننے والا ہے (مشرکوں کے اقوال کو) اور جاننے والا ہے (ان کے احوال کو) اس آیت میں مشرکوں کو وعید ہے (کہ تمہارا کوئی قول و فعل ہم سے مخفی نہیں ہم ضرور سزا دیں گے۔

قُلْ أَغَيْرَ اللَّهِ أَتَّخِذُ وَلِيًّا (آپ کہہ دیں کہ اللہ کے علاوہ کیا کسی دوسرے کو میں مددگار معبود قرار دوں)۔ یہ استفہام انکاری ہے۔ یعنی اللہ کے سوا دوسروں کو کارساز بنانے کا انکار ہے شخص ولی بنانے کا انکار نہیں ہے۔ اس لئے ہمزہ کے بعد اَتَّخِذُ سے پہلے مفعول کو ذکر کیا ہے۔

فَاطِرِ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ اللہ تو ایسا ہے کہ (آسمانوں اور زمینوں کا خالق و موجد ہے) فاطر کی اضافت معنوی ہے (یعنی آسمان و زمین فاطر کا مفعول ہے) مطلب یہ ہے کہ اللہ نے آسمان و زمین کو پیدا کیا ہے۔

وَهُوَ يُطْعِمُ وَلَا يُطْعَمُ (اور وہی کھانے کو دیتا ہے اس کو کوئی کھانا نہیں دیتا) طعام سے مراد ہے رزق (کھانا پینا اور تمام چیزیں) کھانے کا ضرورت مند انسان زیادہ ہوتا ہے اس لئے طعام کا ذکر کیا۔ کچھ لوگوں نے رسول اللہ ﷺ کو باپ دادا کا دین اختیار کرنے کی ترغیب دی تو آیت ذیل نازل ہوئی۔

قُلْ إِنِّي أُمِرْتُ أَنْ أَكُونَ أَوَّلَ مَنْ أَسْلَمَ (آپ کہہ دیں مجھے حکم دیا گیا ہے کہ سب سے پہلے اسلام قبول کروں)۔ رسول اللہ ﷺ تمام امت سے پہلے اسلام پر مامور ہوئے تھے۔

وَلَا تَكُونَنَّ مِنَ الْمُشْرِكِينَ (اور (یہ بھی کہا گیا ہے کہ) تم مشرکوں میں سے ہرگز نہ ہونا) (وَقِيلَ) محذوف ہے اور لَا تَكُونَنَّ اس کا مقولہ ہے۔ یا اس کا عطف قُلْ پر ہے۔ ہم نے اول شق کے مطابق ترجمہ کیا ہے۔

قُلْ إِنِّي أَخَافُ إِنْ عَصَيْتُ رَبِّي عَذَابَ يَوْمٍ عَظِيمٍ (آپ کہہ دیجئے مجھے بڑے دن (یعنی روز قیامت) کے عذاب کا خوف ہے اگر میں اپنے رب کی نافرمانی کروں گا)۔ یعنی اس کے سوا کسی اور کی عبادت کروں گا تو قیامت کے دن وہ مجھے عذاب دے گا۔

پر زور طرز کلام سے ساتھ کافروں کے خیال کا استیصال کر دیا اور در پردہ اس بات کی طرف بھی اشارہ کر دیا کہ تم جو نافرمانی کی وجہ سے تم لوگ عذاب کے مستحق ہو تم کو ضرور عذاب ہوگا۔ عَذَابَ يَوْمٍ، أَخَافُ کا مفعول ہے اور أَخَافُ، إِنْ عَصَيْتُ کی جزا نہیں ہے یعنی إِنْ عَصَيْتُ رَبِّي عَذَابَ چونکہ جملہ جزاء محذوف پر دلالت کر رہا ہے اس لئے اس کے ذکر کی ضرورت نہیں۔

مَنْ يُصْرَفْ عَنْهُ يَوْمَئِذٍ فَقَدْ رَحِمَهُ (جس شخص سے اس روز عذاب ہٹا دیا جائے گا تو بے اس پر اللہ کی رحمت ہی ہوگی) کہ محض اپنی مہربانی سے اس کو عذاب سے بچا لے گا ورنہ عذاب سے محفوظ رہنے والے کا اللہ پر کوئی واجب اللادا حق نہیں ہوگا۔ يَوْمَئِذٍ فتح پر مبنی ہے۔ عاصم اور یعقوب کی قرأت میں يَصْرِفْ ہے اس کا فاعل اللہ ہے اور عذاب مفعول محذوف ہے۔ مشہور قرأت يُصْرَفْ ہے جس کا نائب فاعل عذاب ہے۔

وَذَلِكَ الْفَوْزُ الْمُبِينُ (اور یہی کھلی کامیابی ہے)۔ قاموس میں ہے کہ فَوْز کا معنی ہے نجات، کامیابی، ہلاکت۔ ہلاکت تو بہرحال مراد نہیں ہے سیاق کلام کے خلاف ہے اور نجات بھی مراد نہیں ہے کیونکہ عذاب کا ہٹا خود ہی نجات ہے (تو یہ معنی ہو جائے گا کہ نجات نجات ہے اور یہ مطلب غیر مفید ہے) لامحالہ کامیابی مراد ہے۔ اس تقریر سے واضح ہو رہا ہے کہ عذاب دور ہونے کے لئے جنت میں داخل ہونا لازم ہے (درمیان میں کوئی اور درجہ نہیں کہ عذاب بھی دور کر دیا جائے اور پھر جنت میں بھی داخلہ نہ ہو) اس سے معتزلہ کے قول کی غلطی ظاہر ہو رہی ہے جو عذاب اور جنت کے درمیان تیسرے درجہ کے قائل ہیں۔

وَإِنْ يَمْسَسْكَ اللَّهُ بِضُرٍّ فَلَا كَاشِفَ لَهُ إِلَّا هُوَ اور اگر تجھ کو اللہ کوئی تکلیف پہنچائے تو اس کا دور کرنے والا سوائے اللہ کے اور کوئی نہیں۔ ضُرّ یعنی شدت جیسے مفلسی، بیماری، عذاب۔ فلا کی نفی سے یہ مراد ہے کہ

اس کو دور کرنے پر کوئی قادر نہ ہوگا (یعنی اللہ کی بھیجی ہوئی تکلیف کو سوائے اس کے کوئی دوسرا دور نہیں کر سکتا) ورنہ خدا کی کمزوری لازم آئے گی اور کمزوری الوہیت اور واجب الوجود ہونے کے منافی ہے۔

وَاِنْ يَّمْسَسْكَ بِخَيْرٍ فَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ﴿۱۷﴾ (اور اگر تجھ کو اللہ کوئی نفع پہنچائے تو وہ ہر چیز پر پوری قدرت رکھنے والا ہے)۔ خیر بھلائی خواہ نعمت ہو صحت ہو دولت ہو یا کچھ اور یعنی اللہ کے قابو میں سب کچھ ہے۔ کسی خیر کو قائم رکھنا یا رفع اور زائل کر دینا بھی اسی کی قدرت میں ہے کوئی اور خدا کی عطا کی ہوئی خیر کو زائل نہیں کر سکتا۔

بغوی نے اپنی سند سے حضرت ابن عباسؓ کا بیان نقل کیا ہے کہ کسریٰ نے رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں ایک خچر بطور ہدیہ بھیجا تھا آپ بالوں کی رسی کی لگام دے کر اس پر سوار ہوئے اور مجھے اپنے پیچھے بٹھا لیا پھر مجھے لے کر روانہ ہو گئے تھوڑی دیر چلنے کے بعد میری طرف رخ موڑ کر فرمایا لڑکے میں نے عرض کیا یا رسول اللہ میں حاضر ہوں، فرمایا اللہ (کے احکام) کی نگہداشت کر اللہ تیری حفاظت رکھے گا اللہ (کے اوامر و نواہی) کی نگہداشت کر تو اس کو اپنے سامنے پائے گا، تو عیش و آرام کے وقت اللہ کو پہچان رکھ تو سختی کے وقت خدا تجھ سے انجان نہ ہوگا، کچھ مانگے تو اللہ سے مانگ اگر مدد طلب کرے تو اللہ سے طلب کر جو کچھ ہونے والا ہے قلم اس پر چل چکا ہے۔ فیصلہ خداوندی کے خلاف اگر ساری مخلوق تجھے فائدہ پہنچانے کی کوشش کرے تو فائدہ نہیں پہنچا سکتی اور اللہ کی تحریر کے خلاف اگر تجھے ضرر پہنچانا چاہے گی تو ضرر نہیں پہنچا سکے گی۔ اگر تجھ سے ہو سکے تو یقین کے ساتھ (مصائب پر) صابر رہ کر عمل کر اگر یہ نہ کر سکتا ہو تو صبر کر، ناگوار امور پر صبر رکھنے میں بڑی بہتری ہے۔ یہ بھی جان رکھ کہ صبر کے ساتھ مدد ہوتی ہے اور تنگی کے ساتھ کشائش اور دشواری کے ساتھ آسانی۔ احمد اور ترمذی نے یہ حدیث نقل کی ہے ترمذی نے اس کو حسن صحیح کہا ہے لیکن ترمذی کی روایت میں یہ الفاظ نہیں ہیں کہ اگر تجھ سے ہو سکے تو یقین کے ساتھ صابر رہ کر عمل کر الخ (یعنی ترمذی کی روایت مختصر ہے۔

وَهُوَ الْقَاهِرُ (اور وہی غالب ہے)۔ قہر اس غلبہ کو کہتے ہیں جس میں مغلوب کا عاجز ہونا بھی سمجھ میں آتا ہو اور قدرت کا معنی ہے قادر کے ارادہ کے خلاف ارادہ کرنے والے کو اس کے مقصد سے روک دینا۔ قدرت کے مفہوم سے قہر کے معنی میں کچھ زیادتی ہے (کیونکہ قدرت کے مفہوم سے مقدور کا عجز ظاہر نہیں ہوتا اور قہر کے مفہوم میں مقہور کا عجز لازم ہے

فَوْقَ عِبَادِهٖ (وہی اپنے بندوں سے بالا ہے)۔ یہ دوسری خبر ہے (اول خبر القاہر ہے) لفظ فوق سے قاہر اور برتر ہونے کی تصویر کشی ہو رہی ہے۔

وَهُوَ الْحَكِيْمُ (اور وہی حکمت والا ہے) اپنے حکم کی حکمت سے واقف ہے۔

الْخَبِيْرُ ﴿۱۸﴾ (ہر چیز سے باخبر ہے کوئی شے اس سے مخفی نہیں۔

کلبی نے بیان کیا ہے کہ کچھ مکہ والے رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا، کیا کوئی شخص ایسا ہے جو تمہارے رسول ہونے کی شہادت دیتا ہو، ہمیں تو کوئی ایسا آدمی ملا نہیں جو تمہاری تصدیق کرتا ہو۔ ہم نے یہودیوں اور عیسائیوں سے بھی تمہارے متعلق دریافت کیا سب نے جواب دیا کہ ان کے ہاں تمہارا کوئی ذکر نہیں ہے (یعنی ان کی کتابوں میں تمہارا کوئی تذکرہ نہیں آیا) اس پر آیت ذیل نازل ہوئی۔

قُلْ اَيُّ شَيْءٍ اَكْبَرُ شَهَادَةً (آپ کہئے کہ سب سے بڑھ کر چیز گواہی دینے کے لئے کون ہے)۔ ہر موجود کو شی کہتے ہیں۔ پوری تشریح سورۂ بقرہ میں گزر چکی ہے۔ یہاں شے سے مراد ہے شاہد (گواہ) اکبر سے مراد ہے عظمت والا۔ مطلب یہ کہ اللہ کی شہادت سے بڑی کس شاہد کی شہادت ہے اب اگر وہ جواب دیں تو خیر ورنہ

قُلِ اللّٰهُ (آپ (خود ہی) کہہ دیں کہ سب سے بڑا شاہد اللہ ہے)۔ اللہ مبتدا ہے اور قرینہ کی وجہ سے خبر کو حذف کر دیا گیا ہے

شَهِيْدٌۢ بَيْنِيْ وَبَيْنَكُمْ (وہی میرے اور تمہارے درمیان گواہ ہے) شہید خبر ہے ھو مبتدا محذوف

ہے۔ یا اللہ مبتدا ہے اور شہید خبر اور پورا جملہ قُل کا مفعول۔ کیونکہ اللہ جب گواہ ہے تو وہی سب سے بڑا شاہد ہو گا۔

یہ بھی ممکن ہے کہ شَیْءٌ سے مراد مشہود ہو یعنی جس چیز کی گواہی دی جائے اور شہادت سے مراد ہو گواہی دیا جانا (یعنی مشہودیت۔ مصدر مبنی للمجہول) آیت کا مطلب یہ ہو گا کہ میری رسالت یا عدم رسالت سے بڑھ کر کس مسئلہ کی گواہی ہو سکتی ہے اور میری رسالت کا شاہد اللہ ہے اور جس چیز کا گواہ اللہ ہو اس سے بڑھ کر مشہود کون ہو سکتا ہے، پس میری رسالت سب سے بڑھ کر مشہود ہے۔ اس تفسیر پر کسی تکلف کی ضرورت نہیں۔ اللہ کی شہادت وہ معجزات ہیں جو رسول اللہ کی صداقت کو ثابت کرنے کے لئے اللہ نے عطا فرمائے اور چونکہ تمام معجزات سے بڑا معجزہ قرآن مجید ہے اس لئے فرمایا۔

وَأُوحِيَ إِلَيَّ هَٰذَا الْقُرْآنُ اور قرآن خود معجزہ ہے جو اللہ کی گزشتہ کتابوں کے مطابق مبدء اور معاد کے احوال بیان کرتا ہے۔

لِأُنذِرَكُم بِهِ وَمَن بَلَغَ (تاکہ اس کے ذریعہ سے میں تم کو اور ان تمام لوگوں کو جن کو قرآن پہنچ جائے ڈراؤں) یعنی اگر تم ایمان نہ لاؤ تو اس قرآن کے ذریعہ سے اللہ کے عذاب سے ڈراؤں۔ کُمْ کا خطاب اہل مکہ کو ہے اور مَنْ بَلَغَ کا عطف کُمْ پر ہے اور اس سے مراد وہ سب جن و انس ہیں جو نزول قرآن کے وقت موجود تھے یا آئندہ قیامت تک آنے والے ہیں (پیغمبر کا فرض ہے فرماں برداروں کو خوشخبری دینا اور نافرمانوں کو عذاب سے ڈرانا لیکن) یہاں صرف ڈرانے کا ذکر کیا (بشارت کا ذکر نہیں کیا) کیونکہ حال و مقال کا قرینہ بشارت پر دلالت نہیں کر رہا ہے۔ اس کے علاوہ یہ بات بھی ہے کہ انذار کی اہمیت (تبلیغ کے موقع پر) زیادہ ہے (اگر انذار مفید ہو گا تو بشارت بدرجہ اولیٰ غیر مفید ہو گی کیونکہ) حصول منفعت سے دفع مضرت کی اہمیت زیادہ ہوتی ہے۔

حضرت عبداللہ بن عمرؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا میری جانب سے (لوگوں تک) پہنچا دو خواہ ایک ہی آیت ہو اور بنی اسرائیل کے (بیان کردہ اقوال) بیان کر دیا کرو اس میں کوئی (تم پر) تنگی نہیں (بشرطیکہ احادیث کے خلاف نہ ہوں) اور جس نے قصداً مجھ پر دروغ بندی کی اس کو اپنا ٹھکانا دوزخ میں بنا لینا چاہئے۔ متفق علیہ۔

اس حدیث میں بنی اسرائیل سے مراد وہ بنی اسرائیل ہیں جو سچے دل سے مسلمان ہو گئے تھے ورنہ جھوٹے کافروں کی روایت کا کوئی اعتبار نہیں۔ حضرت سمرہ بن جندبؓ اور حضرت مغیرہ بن شعبہؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جس شخص نے میری جانب سے کوئی حدیث یہ جانتے ہوئے بیان کی کہ وہ جھوٹ ہے (میرا کلام نہیں ہے) تو وہ بھی جھوٹوں میں سے ہے (رواہ مسلم)۔

حضرت ابن مسعودؓ راوی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اللہ اس بندے کو سرسبز کرے جو میری بات سن کر یاد رکھے اور سمجھے اور پھر (دوسروں تک) پہنچا دے۔ کیونکہ بہت سے لوگ ایسے ہیں جو کسی سمجھ کی بات ایسے لوگوں تک پہنچا دیتے ہیں جو پہنچانے والے سے زیادہ سمجھدار ہوتے ہیں۔ تین باتوں میں مسلمان کا دل کھوٹ (یا بخل) نہیں کرتا۔ خلوص کے ساتھ اللہ کے لئے عمل کرنا، مسلمانوں کی خیر خواہی کرنا اور اہل اسلام کی جماعت کے ساتھ وابستہ رہنا۔ کوئی شبہ نہیں کہ ان کی دعوت پیچھے والوں کو محیط ہو گی۔ رواہ الشافعی والبیہقی فی المدخل۔ احمد، ترمذی، ابوداؤد، ابن ماجہ اور دارمی نے یہ حدیث حضرت زید بن ثابت کی روایت سے بیان کی ہے مگر ترمذی اور ابوداؤد کی روایت میں تین باتوں کا ذکر نہیں ہے۔ محمد بن کعب قرظی کا قول ہے جس کو قرآن پہنچ گیا اس نے گویا رسول اللہ ﷺ کی زیارت کر لی اور آپ سے قرآن سن لیا۔

أَئِنَّكُمْ لَتَشْهَدُونَ أَنَّ مَعَ اللَّهِ آلِهَةً أُخْرَىٰ (اے اہل مکہ) کیا تم اس بات کے قائل ہو کہ اللہ کے ساتھ دوسرے معبود بھی ہیں (جو اللہ کے ساتھ اس کے خصوصی صفات میں شریک ہیں) یہ استفہام انکار تعجب اور تقریر کی تاکید کے لئے ہے یعنی تعجب ہے اور بعید از عقل ہے کہ تم شرک کے قائل ہو باوجودیکہ تمام عقلی و نقلی دلائل

توحید کو ثابت کر رہے ہیں۔ یہ آیت دلالت کر رہی ہے کہ قریش نے توحید پر شہادت طلب کی تھی۔ اس صورت میں آیت کا مطلب اس طرح ہوگا کہ اللہ توحید کا شاہد ہے اور توحید کی شہادت یہ ہے کہ اس نے دلائل قائم کیں اور قرآن نازل فرمایا جو سراسر معجزہ ہے اور اللہ کی یہ شہادت سب سے بڑی شہادت ہے اب تعجب ہے کہ تم شرک کے قائل ہو۔ میں کہتا ہوں شاید انہوں نے توحید و رسالت دونوں کی شہادت طلب کی ہو، مگر کلبی نے شان نزول کے بیان میں صرف شہادت رسالت کی طلب کا ذکر کیا کیونکہ شہادت رسالت کے لئے شہادت توحید لازم ہے اور شہادت توحید کے لئے شہادت رسالت لازم نہیں۔

قُلْ لَّآ اَشْهَدُ (آپ کہہ دیجئے کہ (جس بات کے تم قائل ہو) میں اس کی شہادت نہیں دیتا)۔

قُلْ اِنَّمَا هُوَ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ (آپ کہہ دیجئے کہ اللہ ہی معبود یکتا ہے) یعنی معبودیت، وجوب وجود، خالقیت، رزاقیت اور تمام صفات کمالیہ میں اکیلا ہے، اس کی کسی خصوصیت میں کوئی اس کا شریک نہیں۔ ہر طرح کی (جسمانی یا حقیقی) ترکیب و تعدد، جسمانیت، مکان اور ترکیب و تعدد کے دوسرے لوازم سے پاک ہے۔ ہماری اس تشریح کے بعد یہ اعتراض نہیں ہو سکتا کہ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ کا اللہ کے لئے ثبوت افادیت سے خالی ہے اللہ تو خود ہی جزئی حقیقی ہے اور جزئی حقیقی میں کثرت کا احتمال ہوتا ہی نہیں ہے پھر اس کو اِلٰهٌ وَّاحِدٌ کہنے سے کیا فائدہ اس شبہ کا ازالہ ہماری تشریح سے ہو گیا کہ اِلٰہ بمعنی معبود ہے (اور احتمال ہو سکتا تھا کہ اللہ کے سوا کوئی دوسرا بھی معبود ہو اس لئے واحد کہہ کر اس احتمال کو دور کر دیا) پس اللہ جزئی حقیقی ہے اس کی ذات و شخصیت میں کوئی اس کا شریک نہیں نہ اس کے خصوصی اوصاف میں کسی کی شرکت ہے۔

یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اِنَّمَا (کلمہ حصر نہ ہو بلکہ اس) میں مَا موصولہ ہو اور هُوَ ضمیر اسی مَا موصول کی طرف راجع ہو اور هُوَ اِلٰہ پورا جملہ صلہ ہو اور وَّاحِدٌ مَا موصولہ کی خبر ہو۔ مطلب اس طرح ہوگا کہ وہ جو معبود ہے وہ واحد ہے کیونکہ وہ واجب الوجود اور حامل صفات کمالیہ ہے اس کا کوئی شریک نہیں۔ خلاصہ یہ کہ جس شرک کے تم قائل ہو میں اس کا قائل نہیں بلکہ میں توحید کی شہادت دیتا ہوں۔

وَّاِنَّنِيْ بَرِيْٓءٌ مِّمَّا تُشْرِكُوْنَ ﴿ (اور میں تمہارے شرک سے قطعاً بیزار ہوں) (بِمَّا میں اگر مَا موصولہ ہو تو مَا سے مراد ہوں گے بت۔ یعنی جن بتوں کو استحقاق معبودیت میں تم اللہ کا شریک قرار دیتے ہو میں ان سے بیزار ہوں یا (اگر مَا کو مصدریہ قرار دیا جائے تو) مَا تُشْرِكُوْنَ سے مراد ہوگا شرک یعنی میں تمہارے شرک کرنے سے بیزار ہوں۔

اَلَّذِيْنَ اٰتَيْنٰهُمُ الْكِتٰبَ (جن لوگوں کو ہم نے کتاب دی ہے)۔ یعنی توریت و انجیل۔

يَعْرِفُوْنَهٗ (وہ محمد ﷺ کو پہچانتے ہیں) کہ اللہ کے رسول ہیں کیونکہ رسول کا جو حلیہ اور اوصاف و اخلاق ان کی کتابوں میں بیان کئے گئے ہیں وہ بعینہٖ محمد ﷺ کے تھے۔

كَمَا يَعْرِفُوْنَ اَبْنَآءَهُمْ (جس طرح (دوسرے بچوں میں سے) اپنے بیٹوں کو پہچانتے ہیں)۔

اَلَّذِيْنَ خَسِرُوْٓا اَنْفُسَهُمْ فَهُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ ﴿ جن لوگوں نے (رسول اللہ ﷺ کے صفات مندرجہ توریت و انجیل چھپانے کی وجہ سے) اپنے کو ضائع کر لیا ہے (یعنی اپنے نے علم قدیم میں ان کی نامرادی کا اندازہ کر لیا ہے) وہ ایمان نہیں لائیں گے۔ یعنی دلوں سے یقین کرنے کے باوجود محض عناد، ظلم اور غرور و انانیت کی وجہ سے محمد ﷺ کی نبوت کو نہیں مانیں گے۔

مکہ والوں نے کہا تھا کہ تمہاری نبوت کا کون شاہد ہے، ہم نے تو یہودیوں اور عیسائیوں سے بھی پوچھا تھا انہوں نے جواب دیا کہ تمہارا تذکرہ ان کی کتابوں میں نہیں ہے۔ اس قول کا جواب اس آیت میں دیا گیا ہے کہ جن لوگوں نے محمد ﷺ کی رسالت کی تکذیب کی انہوں نے اپنے کو ضائع کر دیا کہ بصورت ایمان جو مقامات و مراتب ان کے لئے جنت کے اندر مقرر تھے ان کو کھو دیا اور دوزخ کے ٹھکانوں کو پسند کر لیا۔ ابن ماجہ اور بیہقی نے صحیح سند کے ساتھ حضرت ابوہریرہؓ کی روایت سے بیان کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تم میں سے ہر ایک کے دو مقام ہیں ایک جنت میں ایک دوزخ میں، پس جو شخص مر کر دوزخ میں چلا جاتا

ہے، اس کے جنت والے مکان کے وارث اہل جنت ہو جاتے ہیں۔ یہی مطلب ہے آیت اُولٰٓئِکَ ھُمُ الْوَارِثُوْنَ الخ کا۔ بغوی نے لکھا ہے قیامت کا دن ہوگا تو اللہ مؤمنوں کو دوزخیوں کے جنت والے مکان اور دوزخیوں کو مومنوں کے دوزخ والے مکان دے دے گا۔ اور یہی مراد ہے۔ میں کہتا ہوں مذکورہ کلام اس طرح ہونا چاہئے تھی کہ جو لوگ ایمان نہیں لائیں گے وہ اپنے کو ضائع کریں گے مگر کلام میں قوت پیدا کرنے کے لئے طرز بیان کو الٹ دیا۔

وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرٰى عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا (اور جس نے اللہ پر دروغ بافی کی اس سے زیادہ بے انصاف کون ہوگا)۔ یعنی نبوت کا جھوٹا دعویٰ کیا اور باوجودیکہ اس کے پاس اللہ نے وحی نہیں بھیجی مگر وہ وحی کا مدعی بن بیٹھا

اَوْ كَذَّبَ بِاٰيٰتِهٖ (یا اللہ کی آیات کی اس نے تکذیب کی)۔ یعنی قرآن میں اللہ نے جو آیات نازل فرمائی ہیں اور معجزات جو توحید پر دلالت کرتے ہیں اور رسول کی صداقت ان سے ثابت ہوتی ہے ان کو نہیں مانا۔ استفہام انکاری ہے یعنی ایسے شخص سے بڑھ کر کوئی نا انصاف نہیں (ظالم کا ترجمہ بے جا حرکت کرنے والا بھی ہے اس لئے اَظْلَمُ کا ترجمہ سب سے بڑا بے جا حرکت کرنے والا بھی ہو سکتا ہے، مترجم)۔

اس تشریح کی بناء پر آیت میں رسول اللہ ﷺ کے جھوٹ سے پاک ہونے اور کافروں کے ظالم ترین ہونے پر تنبیہ ہو گی۔

لیکن آیت کا دوسرا مطلب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ان کافروں سے بڑھ کر کون بے انصاف ہوگا جو اللہ پر دروغ بندی کرتے ہیں اور اللہ کی شان میں ایسی باتیں کہتے ہیں جو اس کے لئے نازیبا ہیں کوئی اس کا ساجھی قرار دیتا ہے اور کوئی اس کو باپ کہتا ہے اور کوئی پتھروں کو بارگاہ خداوندی میں اپنا سفارشی قرار دیتا ہے یا اللہ کی آیات کو جھوٹ جانتا ہے۔ اس صورت میں بجائے اَوْ کے وَاؤ عاطفہ ہونا چاہئے تھا کیونکہ مکہ والے ان تمام افکار و اقوال شنیعہ کا مجموعہ تھے لیکن یا (اَوْ) لانے سے اس امر پر تنبیہ ہو جائے گی کہ ان دونوں اقوال میں سے ہر ایک کامل طور پر اَظْلَمُ بنانے کے لئے کافی ہے۔ پھر ان کے اندر تو دونوں چیزیں ہیں، افترا بندی بھی اور تکذیب آیات بھی، اس لئے ان کا اَظْلَمُ ہونا تو بدرجہ اولیٰ یقینی ہے۔

اَوْ ذکر کرنے کی ایک وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ افترا بندی اور تکذیب آیات دو جرم ایسے ہیں جو باہم ضد ہیں اور دونوں کو یکجا جمع نہ ہونا چاہئے مگر ان کافروں کی حماقت اس درجہ تک پہنچ گئی ہے کہ دونوں (متضاد) خرابیاں ان کے اندر موجود ہیں۔

اللہ پر افترا بندی اور اس امر کا دعویٰ کرنا کہ اللہ نے فلاں کام کو حلال اور فلاں کام کو حرام بنایا ہے اور اس کی بیوی بھی ہے اور اولاد بھی اور یہ بت اس کی شفاعت قبول کرے گا۔ اس قسم کی خرافات کا تقاضا ہے کہ وہ رسالت کے قائل ہیں اور ان باتوں کو رسالت کے ذریعہ سے آیا ہوا مانتے ہیں۔ لیکن اس کے ساتھ وہ آیات و معجزات کی تکذیب کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ آدمی کو کس طرح پیغمبر بنایا جا سکتا ہے۔ پیغمبر تو فرشتہ ہونا چاہئے اس کے معنی یہ ہوئے کہ وہ کسی انسان کی رسالت کے قائل نہیں۔ یہ دونوں باتیں ایک دوسرے کے لئے منافی ہیں مگر [illegible] کافر دونوں کے قائل ہیں۔

اِنَّهٗ لَا يُفْلِحُ الظّٰلِمُوْنَ ﴿۲۱﴾ (ظالم قطعاً فلاح یاب نہیں ہوں گے) اور جو سب سے بڑا ظالم ہو اس کا تو ٹھکانا ہی کیا۔ اِنَّہٗ میں ضمیر شان ہے۔ [1]

وَيَوْمَ نَحْشُرُهُمْ جَمِيْعًا (اور جس روز ہم ان سب کو جمع کریں گے) یعنی کافروں کو اور ان کے معبودوں کو (بتوں وغیرہ کو)۔ يَوْمَ منصوب ہے اس کا فعل محذوف ہے یعنی یاد کرو اس دن کو جب ایسا ہوگا۔

یوں کہا جائے کہ کوئی معین فعل ذکر نہ کرنے کی وجہ یہ ہے کہ روز قیامت کے تمام خطرات اور شدائد و مصائب کی طرف ذہن کا انتقال ہو جائے (وہ ہر قسم کی دہشت کا پانا تصور کے سامنے آ جائے اگر کوئی معین فعل ذکر کیا جاتا تو صرف اسی فعل کا تصور ہوتا اور دوسرے شدائد کی طرف ذہن کا انتقال نہ ہوتا) گویا یوں فرمایا کہ جس روز ہم سب کو جمع کریں گے اس روز سب پر

---

[1] شعر: دانہ ہر قوت کہ بست [illegible] جست کنند [illegible]

یسی دہشت طاری ہو جائے گی کہ ناقابل بیان ہے، الفاظ کی حدود کے اندر نہیں آسکتی۔ سورج قریب آجائے گا، پسینہ کی لگام لگ جائے گی۔ یعنی منہ تک لوگ پسینہ میں غرق ہوں گے، پسینہ بہہ کر ستر ہاتھ زمین میں گھس جائے گا وغیرہ وغیرہ جیسا کہ صحیح احادیث میں آیا ہے۔

ثُمَّ نَقُوْلُ لِلَّذِيْنَ اَشْرَكُوْٓا (پھر (سرزنش کرنے کے لئے) ہم مشرکوں سے کہیں گے)۔ نَقُوْلُ کا عطف نَحْشُرُهُمْ پر ہے۔ ثُمَّ کا لفظ بتارہا ہے کہ حشر کے بعد مدت تک لوگ سوال کے منتظر رہیں گے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تمہارا اس وقت کیا حال ہوگا جب تم کو اللہ پچاس ہزار برس تک جمع کر رکھے گا جیسے تیر دان کے اندر تیر اکٹھے کئے جاتے ہیں۔ (اس مدت میں) تمہاری طرف نظر بھی نہیں کرے گا۔ حاکم نے اس حدیث کو صحیح کہا ہے اور بیہقی نے بھی حضرت ابن عمرؓ کی روایت سے بیان کیا ہے۔

رسول اللہ ﷺ نے یہ بھی فرمایا قیامت کے دن ہر ایک کو ہزار برس تک تم کو روک رکھا جائے گا کہ بات بھی نہ کر سکو گے۔ رواہ البیہقی عن ابن عمرؓ۔

اَيْنَ شُرَكَآؤُكُمُ الَّذِيْنَ كُنْتُمْ تَزْعُمُوْنَ ۞ (تمہارے وہ شرکاء جن کے معبود ہونے کا تم دعوی کرتے تھے کہاں گئے)۔ شرکاء سے مراد ہیں وہ معبود جن کو مشرک اللہ کے ساتھ عبادت میں شریک قرار دیتے تھے۔ تَزْعُمُوْنَ کا مطلب یہ ہے کہ تم استحقاق معبودیت میں شریک قرار دیتے تھے یا ان کو اپنا خدا اور قدرت میں اپنا سفارشی سمجھتے تھے۔

ثُمَّ لَمْ تَكُنْ فِتْنَتُهُمْ (پھر ان کے شرک کا انجام اور کچھ نہ ہوگا)۔ لفظ ثُمَّ بتارہا ہے کہ مدت تک تامل کرنے کے بعد وہ جواب دیں گے۔ فتنہ سے مراد کفر ہے یعنی انجام کفر یہ ہوگا کہ طویل تامل و ندامت کے بعد وہ کہیں گے۔ حضرت ابن عباسؓ اور قتادہؒ نے فتنہ کا ترجمہ عذر کیا ہے اور ان کا عذر ان کے لئے فتنہ ہوگا کیونکہ وہ معذرت کو رہائی اور نجات کا ذریعہ سمجھ رہے ہوں گے حالانکہ اس جواب سے ان کی رہائی نہ ہو سکے گی۔ فَتَنْتُ الذَّهَبَ میں نے سونے کو میل کچیل سے الگ کر دیا یہ عربی کا محاورہ ہے۔ یا فِتْنَةٌ سے مراد ہے جواب۔ جواب چونکہ جھوٹا ہوگا اس لئے اس کو فتنہ فرمایا۔ بعض علماء نے فتنہ کا ترجمہ تجربہ کیا ہے چونکہ سوال ان کے اندرونی خیال کو ظاہر کرانے کا ایک تجربہ ہوگا اس لئے جواب کو تجربہ فرمایا۔ زجاج نے کہا یہ لفظ اس جگہ ایک لطیف معنی کی طرف اشارہ کر رہا ہے۔ بعض محب محبوب پر شیفتہ و فریفتہ ہوتے ہیں۔ لیکن جب اس شیفتگی اور عشق میں ان پر مصائب آتے ہیں تو وہ محبوب سے بیزار ہو جاتے ہیں۔ اس وقت ان سے کہا جاتا ہے تمہارا عشق بس یہ ہوا (کہ دکھ پڑا تو عشق کو بھول گئے) قیامت کے دن بتوں کی محبت سے بھی کافر اسی طرح بیزار ہو جائیں گے۔ میں کہتا ہوں بتوں کی محبت ہی کیا اسلاف کی تقلید سے بھی اظہار نفرت کریں گے۔

اِلَّآ اَنْ قَالُوْا وَاللّٰهِ رَبِّنَا مَا كُنَّا مُشْرِكِيْنَ ۞ (سوائے اس کے کہ وہ کہیں گے اللہ کی قسم جو ہمارا رب ہے ہم تو مشرک نہیں تھے)۔

ایک آیت میں آیا ہے وَلَا يَكْتُمُوْنَ اللّٰهَ حَدِيْثًا (اللہ سے وہ کوئی بات نہیں چھپائیں گے) اور اس آیت میں ہے وَاللّٰهِ رَبِّنَا مَا كُنَّا مُشْرِكِيْنَ دونوں آیات کا مضمون باہم مخالف ہے۔ حسب روایت بخاری حضرت ابن عباسؓ نے (اس تضاد کو دور کرنے کے لئے) فرمایا قیامت کے دن جب کافر دیکھیں گے کہ اللہ مسلمانوں کے گناہ تو معاف فرما رہا ہے اور شرک کو معاف نہیں فرماتا تو وہ مشرک ہونے سے انکار کر دیں گے اور کہیں گے واللہ ہم مشرک نہیں تھے۔ اس وقت اللہ ان کے منہ پر مہر لگا دے گا اور ان کے ہاتھ پاؤں ان کے اعمال کی شہادت دیں گے۔ ایسی حالت میں ان کو تمنا ہوگی کاش ہم زمین کا پیوند ہو جاتے، خاک کے ساتھ خاک بن جاتے۔ اس وقت وہ اللہ سے کوئی بات نہیں چھپا سکیں گے (حضرت ابن عباسؓ کی توضیح کا خلاصہ یہ ہے کہ ابتدائی حالت میں وہ شرک کا انکار کریں گے اور جب دست و پا کی شہادت کے بعد حقیقت کھل جائے گی تو پھر کوئی بات چھپا نہ سکیں گے)۔

اُنْظُرْ كَيْفَ كَذَبُوا عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ (اے مخاطب) ذرا دیکھ تو انہوں نے اپنے اوپر کیسا جھوٹ بولا۔ كَذَبُوا کی ضمیر فاعل ہے كَيْفَ حال ہے چونکہ استفہام صدارت کو چاہتا ہے اس لئے كَيْفَ کو پہلے ذکر کیا۔

وَضَلَّ عَنْهُمْ مَّا كَانُوْا يَفْتَرُوْنَ ۝ (اور جو کچھ دروغ بندیاں کرتے تھے وہ ان سے غائب ہو گئیں) دروغ بندی سے مراد ہے بعض احکام کو خود حرام حلال بنانا اور اللہ کی طرف ان کی حرمت و حلت کی نسبت کرنا اور بتوں کو اپنا سفارشی قرار دینا۔

کلبیؒ نے بیان کیا ایک بار ابوسفیان بن حرب، ابوجہل بن ہشام، ولید بن مغیرہ، نضر بن حارث، عتبہ و شیبہ پسران ربیعہ، امیہ بن خلف، ابی بن خلف اور حارث بن عامر جمع ہو کر رسول اللہ ﷺ سے قرآن سننے لگے۔ ساتھیوں نے نضر سے کہا ابوقتیلہ محمد کیا کہہ رہا ہے نضر نے کہا مجھے تو معلوم نہیں کیا کہہ رہا ہے زبان ہلا رہا ہے اور پرانے لوگوں کی کچھ داستانیں اسی طرح کہہ رہا ہے جس طرح گزشتہ اقوام کے قصے میں تم سے بیان کرتا ہوں۔ نضر اقوام پارینہ کے قصے اور افسانے بہت زیادہ بیان کیا کرتا تھا ابوسفیان بولا میرے خیال میں تو بعض باتیں سچی کہتا ہے۔ ابوجہل بولا ہرگز نہیں، تم ایسا اقرار نہ کرو۔ بعض روایات میں آیا ہے کہ ابوجہل نے کہا اس سے تو ہمارے لئے موت آسان ہے۔ اس لئے اللہ نے آیات ذیل نازل فرمائیں۔

وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّسْتَمِعُ اِلَيْكَ (اور ان میں سے بعض لوگ آپ کی طرف کان لگاتے ہیں)۔ یعنی جب آپ قرآن پڑھتے ہیں تو کان لگا کر سنتے ہیں۔

وَجَعَلْنَا عَلٰى قُلُوْبِهِمْ اَكِنَّةً اَنْ يَّفْقَهُوْهُ (اور ہم نے ان کے دلوں پر اس کو سمجھنے سے حجاب ڈال رکھے ہیں)۔ اَكِنَّةً، كِنَان کی جمع ہے اور كِنّ کا معنی ہے پردہ یعنی ان کے دلوں پر حجاب ڈال دیئے ہیں تاکہ قرآن کو نہ سمجھیں۔

وَفِيْٓ اٰذَانِهِمْ وَقْرًا (اور ان کے کانوں میں ڈاٹ دے دی ہے) وقر کا معنی گرانی گوش اور ٹھوس پن ہے۔

وَاِنْ يَّرَوْا كُلَّ اٰيَةٍ لَّا يُؤْمِنُوْا بِهَا اور اگر وہ تمام دلائل کو دیکھ لیں تب بھی ان پر ایمان نہ لائیں گے دلائل سے مراد ہیں معجزات۔ اللہ نے ان کی آنکھوں پر پردے اور دلوں پر حجاب ڈال دیئے ہیں، انہی حجابات کی وجہ سے وہ رسول اللہ ﷺ سے دشمنی اور تقلید اسلاف پر کربستہ ہو گئے ہیں نتیجہ یہ کہ نہ اچھے کو اچھا جانتے ہیں نہ برے کو برا۔

حَتّٰٓى اِذَا جَآءُوْكَ يُجَادِلُوْنَكَ (یہاں تک کہ یہ لوگ جب آپ کے پاس آتے ہیں تو آپ سے (خواہ مخواہ) جھگڑتے ہیں)۔

يَقُوْلُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اِنْ هٰذَآ اِلَّآ اَسَاطِيْرُ الْاَوَّلِيْنَ ۝ (یہ کافر کہتے ہیں کہ یہ قرآن تو سوائے پہلوں کی بے سند داستانوں کے اور کچھ بھی نہیں ہے)۔ حَتّٰى عاطفہ ہے جو جملہ پر داخل ہوتا ہے اور لَا يُؤْمِنُوْنَ پر اس کا عطف ہے اور اِذَا ظرفیہ ہے جس کے اندر شرط کا معنی ہے اور شرط کی جزا يُجَادِلُوْنَكَ ہے اور يَقُوْلُ يُجَادِلُوْنَكَ کی تفسیر ہے۔ یا یوں کہا جائے کہ جَآءُوْكَ کے فاعل سے يُجَادِلُوْنَكَ حال ہے اور شرط کی جزا يَقُوْلُ ہے۔ مطلب یہ ہے کہ ان کی بے ایمانی اور تکذیب حق جھگڑے کی حد تک پہنچ چکی ہے اور یہ نوبت آگئی ہے کہ قرآن کو پہلوں کی خرافات کہنے لگے اور صرف جھگڑے کیلئے کرنے لگے۔

یہ بھی ہو سکتا ہے کہ حَتّٰى حرف جر ہو اور اِذَا محل جر میں لَا يُؤْمِنُوْنَ سے متعلق۔ کیونکہ جمہور اہل نحو کے خلاف سیبویہ کے نزدیک اِذَا کا شرطیہ ہونا درست ہے اس صورت میں يُجَادِلُوْنَكَ حال ہوگا اور يَقُوْلُ اس کی تشریح ہوگا کہ آپ سے جھگڑتے ہیں یعنی کافر کہتے ہیں۔

قاموس میں ہے سَطْر کا معنی ہے ایک لائن، قطار، درختوں کی ہو یا تحریر کی یا کتاب کی یا کسی اور چیز کی، اس کی جمع سُطُوْر، اَسْطُر اور اَسْطَار ہے اور جمع الجمع اَسَاطِيْر ہے اور اَسَاطِيْر الاحادیث دو باتیں ہیں جو بے تکی ہوں ان کے اندر ایک نظم نہ ہو۔ بیضاوی نے اَسَاطِيْر کا ترجمہ اَبَاطِيْل کیا ہے (بیہودہ بے حقیقت باتیں)۔ میں کہتا ہوں اَسَاطِيْر کے حقیقی

سننے کے لئے باطل اور خرافات ہونا لازم ہے۔ اسلاف نے متعلق قصوں کی کتابوں میں بیشتر خرافات ہی درج ہیں جو واقعات سابقہ کی صحیح اطلاع نہیں دیتے نقل میں احتیاط سے کام لیا گیا ہے نہ روایات کے اختلاف کی وجہ سے قصوں کا ایک نظم بھی نہیں رہا ہے۔ لیکن پھر اساطیر کا استعمال باطل جھوٹی اور بیہودہ باتوں کے لئے اتنا کثیر ہو گیا کہ گویا اساطیر کا حقیقی معنی ہی اکابرین کا پوشیدہ ہو گیا۔

وَهُمْ يَنْهَوْنَ عَنْهُ وَيَنْـَٔوْنَ عَنْهُ (اور یہ لوگ قرآن سے دوسروں کو بھی روکتے ہیں اور خود بھی دور رہتے ہیں)۔ یہ ترجمہ محمد بن حنفیہ اور قتادہ کے قول کے مطابق کیا گیا ہے۔ دونوں بزرگوں کے نزدیک اس آیت کا نزول مکہ کے ان کافروں کے حق میں ہوا تھا جو رسول اللہ ﷺ کے اتباع اور قرآن سے دوسروں کو روکتے تھے اور خود بھی دور دور رہتے تھے۔ لیکن حضرت ابن عباسؓ کے قول پر آیت کا نزول ابوطالبؓ کے حق میں ہوا جو مشرکوں کو رسول اللہ ﷺ کو تکلیف دینے سے روکتے تھے۔ لیکن رسول اللہ ﷺ جو دین و قرآن لے کر آئے تھے اس کو نہیں مانتے تھے خود اس سے دور رہتے تھے۔ (کذا اخرج الحاکم وغیرہ) اس صورت میں جمع کی ضمیر ابوطالبؓ اور ان کے رفقاء کی طرف راجع ہو گی۔ ابن ابی حاتم نے سعید بن ابی ہلال کی روایت سے بیان کیا ہے کہ آیت کا نزول رسول اللہ ﷺ کے چچیروں کے حق میں ہوا جن کی تعداد دس تھی۔ علی الاعلان تو وہ رسول اللہ ﷺ کے ساتھی تھے لیکن اندرونی طور پر رسول اللہ ﷺ کے سخت مخالف تھے رسول اللہ ﷺ کو ایذا دینے سے لوگوں کو روکتے تھے لیکن اتباع رسول ﷺ سے خود دور رہتے تھے۔ بغوی نے لکھا ہے مشرکوں کے کچھ لوگ ابوطالب کے پاس جمع ہوئے اور درخواست کی کہ محمد ﷺ کو ہمارے سپرد کر دیجئے اور اس کے عوض ہمارے کسی حسین ترین جوان کو لے لیجئے۔ ابوطالبؓ نے جواب دیا تم نے یہ انصاف کی بات نہیں کی میں تو اپنا بچہ تم کو دے دوں کہ تم اس کو قتل کر دو اور تمہارے بچے کی میں پرورش کروں۔

روایت میں آیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ابوطالبؓ کو اسلام کی دعوت دی ابوطالبؓ نے کہا اگر قریش کے عار دلانے کا مجھے اندیشہ نہ ہوتا تو میں (مسلمان ہو کر) تمہاری آنکھیں ٹھنڈی کر دیتا۔ پھر بھی جب تک زندہ ہوں دشمنوں کو تمہاری طرف سے دفع کرتا رہوں گا۔ ابوطالب نے رسول اللہ ﷺ اور آپ کی دعوت کے سلسلے میں یہ شعر کہے ہیں۔

میرے قبر میں دفن ہونے تک یہ لوگ اپنے جتھوں کے ساتھ بھی آپ تک نہیں پہنچ سکیں گے۔ آپ علی الاعلان اپنا کام کریں آپ کے لئے کوئی رکاوٹ نہیں ہو سکتی اور اپنے کام سے آپ خوش اور خنک چشم رہیں آپ نے مجھے دعوت دی ہے اور میں جانتا ہوں کہ آپ میرے خیر خواہ سچے اور امین ہیں اور ایسا دین پیش کر رہے ہیں جو سب لوگوں کے مذاہب سے اچھا ہے مگر مجھے ملامت کا اندیشہ ہے اگر لوگوں کے ملامت کرنے اور عار دلانے کا اندیشہ نہ ہوتا تو آپ مجھے علی الاعلان بسہولت قبول کرنے والا پاتے۔

وَإِن يُهْلِكُونَ إِلَّا أَنفُسَهُمْ وَمَا يَشْعُرُونَ ﴿٢٦﴾ (اور وہ شخص اپنے آپ کو تباہ کر رہے ہیں اور (اس بات کو) نہیں سمجھتے)۔ کہ اس فعل سے خود انہی کو نقصان پہنچے گا رسول اللہ ﷺ کا کچھ ضرر نہ ہوگا۔

وَلَوْ تَرَىٰ إِذْ وُقِفُوا عَلَى النَّارِ (اور اگر آپ (کافروں کی) وہ حالت دیکھیں جب ان کو دوزخ پر روکا جائے گا تو عجیب وحشت ناک حالت دیکھیں گے) یعنی جب دوزخ کے معاینہ یا اس میں داخل کرنے کے لئے کافروں کو روکا جائے گا تو وہ منظر عجیب ہولناک ہوگا۔

فَقَالُوا يَا لَيْتَنَا نُرَدُّ وَلَا نُكَذِّبَ بِآيَاتِ رَبِّنَا وَنَكُونَ مِنَ الْمُؤْمِنِينَ ﴿٢٧﴾ (اور وہ کہیں گے کاش ہم کو (دنیا کی طرف جو دار العمل ہے) لوٹا دیا جائے (اس صورت) میں ہم اپنے رب کی آیات کی تکذیب نہ کریں گے اور مومنوں میں سے ہو جائیں گے)۔

بَلْ بَدَا لَهُم مَّا كَانُوا يُخْفُونَ مِن قَبْلُ (بلکہ (وجہ یہ ہے کہ) جس چیز کو پہلے چھپایا کرتے تھے وہ ان

کے سامنے آگئی (ظاہر ہو گئی)۔

تمنا سے سمجھا جاتا تھا کہ عذاب دیکھنے کے وقت کافروں کے دلوں میں ایمان کا پختہ ارادہ پیدا ہو جائے گا اللہ نے اس کی نفی فرما دی اور بطور اعتراض فرمایا کہ یہ بات نہیں بلکہ (پچھلا کیا ہوا عمل اور سینوں میں چھپایا ہوا) ان کے سامنے آگیا ہوگا اس سے تنگ آکر ایسا کلمہ زبان سے نکال رہے ہیں۔ مِنْ قَبْلُ سے مراد ہے دنیا میں۔ بعض نے مَا كَانُوْا يُخْفُوْنَ سے مراد لیا ہے رسول اللہ ﷺ کے وہ خصوصی اوصاف جو اہل کتاب جانتے تھے اور ان صفات کی وجہ سے وہ رسول اللہ ﷺ کو اس قدر یقین کے ساتھ پہچانتے تھے جس طرح اپنی اولاد کو پہچانتے تھے مگر حضور ﷺ کے اوصاف کو چھپاتے تھے۔ یا مِنْ قَبْلُ سے مراد ہے آخرت کا گزرا ہوا وقت جس میں کافر اپنے مشرک ہونے کو چھپائیں گے اور کہیں گے وَاللّٰهِ رَبِّنَا مَا كُنَّا مُشْرِكِيْنَ۔ نضر بن شمیل نے کہا بَدَا لَهُمْ کا معنی ہے بَدَا عَنْهُمْ یعنی وہ بات جس کو وہ چھپاتے تھے خود ان سے ظاہر ہو جائے گی۔ مبرد نے مَا كَانُوْا يُخْفُوْنَ کو مبتدا شرطی اور بَدَا لَهُمْ کو خبر جزائی قرار دیا ہے۔

وَلَوْ رُدُّوْا لَعَادُوْا لِمَا نُهُوْا عَنْهُ (اور (عذاب جہنم کے معائنہ کے بعد بالفرض کافر (دوبارہ) ان کو بھیج دیا جائے تب بھی وہی (کفر و معصیت وغیرہ) کریں گے جس سے ان کو منع کیا گیا ہے)۔ کیونکہ اللہ کے اسم وصفی مُضِلٌّ (گمراہ کرنے والا) کا پرتو ان کافروں کا مبدء تعین ہے اب اگر کافروں کو ایمان کی حقانیت اور کفر کے بطلان کا کتنا ہی یقین ہو مگر (اپنے مبدء تعین کے خلاف نہیں جا سکتے اور) ایمان نہیں لا سکتے، جیسے یہودی رسول اللہ ﷺ کو اپنی اولاد کی طرح بلاشبہ پہچاننے کے باوجود نہیں مانتے تھے اور آپ سے بغض رکھتے تھے اور محض مجرمانہ عناد کی وجہ سے یقین کلی رکھنے کے باوجود آپ کا انکار کرتے تھے۔

وَاِنَّهُمْ لَكٰذِبُوْنَ ۝ (اور بلاشک وشبہ وہ جھوٹے ہوں گے) یعنی تکذیب نہ کرنے اور ایمان لانے کا جو وعدہ کریں گے وہ جھوٹا ہوگا یا یہ مطلب ہے کہ جھوٹ بولنے کے وہ عادی ہیں (اس وقت بھی حسب عادت جھوٹ بولیں گے)۔

طبرانی نے الاوسط میں لکھا ہے کہ حضرت ابوہریرہؓ نے بیان کیا میں نے سنا رسول اللہ ﷺ فرما رہے تھے (کافروں کو دوزخ میں بھیجنے کے) تین عذر قیامت کے دن اللہ آدم کے سامنے بیان فرمائے گا۔ ارشاد فرمائے گا اے آدم میں کافروں کو رحمت سے دور کر چکا ہوں اور اسی کا وعدہ کر چکا ہوں اور جھوٹ بولنے اور وعدہ خلافی کرنے سے مجھے نفرت ہے اگر یہ بات نہ ہوتی تو آج تیری تمام اولاد پر میں رحمت کر دیتا (کسی کو دوزخ میں نہ بھیجتا) مگر میری یہ بات پوری ہو کر رہے گی کہ اگر میرے پیغمبروں کی تکذیب کی گئی اور میری نافرمانی کی گئی تو جہنم کو جنات اور انسانوں سے بھر دوں گا۔ اے آدم میں کسی کو دوزخ میں داخل نہیں کروں گا نہ کسی کو عذاب دوں گا سوائے ان لوگوں کے جن کے متعلق مجھے اپنے علم سے معلوم ہے کہ اگر ان کو دنیا میں دوبارہ بھیج دیا گیا تب بھی یہ اسی شر کی طرف رجوع کریں گے جو ان کے اندر ہے شر سے نہیں لوٹیں گے۔ اے آدم میں اپنے اور تیری اولاد کے درمیان تجھے ہی فیصلہ کن (پنچ) بناتا ہوں، اعمال کی وزن کشی کے وقت میزان کے پاس جا کر تو کھڑا ہو جا جس کا خیر کا پلڑا شر کے پلڑے سے ذرہ برابر بھی جھکا ہوا ہو اس کے لئے جنت ہے (میں نے یہ باتیں تجھ سے اس لئے کہی ہیں) تاکہ تجھے معلوم ہو جائے کہ میں صرف ظالم کو دوزخ میں داخل کروں گا۔

وَقَالُوْٓا اِنْ هِيَ اِلَّا حَيَاتُنَا الدُّنْيَا وَمَا نَحْنُ بِمَبْعُوْثِيْنَ ۝ (اور وہ کہتے ہیں کہ (جینا اور کہیں نہیں) بجز اسی فی الحال کا جینا ہے اور ہم زندہ نہ کئے جائیں گے) هِيَ ضمیر حیات کی طرف راجع ہے۔ دُنْیا، اَدْنٰی کا مؤنث ہے اس کا مادہ دُنُوّ ہے اور دُنُوّ کا معنی ہے قرب۔ قَالُوْٓا کا عطف لَعَادُوْا پر ہے یعنی اگر بالفرض ان کو دنیا میں لوٹا کر بھیج دیا جائے تو ممنوعات کا ارتکاب کریں گے اور یہ بات کہیں گے۔ یا كٰذِبُوْنَ پر عطف ہے یعنی یہ کذاب ہیں اور انہوں نے دنیا میں یہ بات کہی تھی۔ یا نُهُوْا پر عطف ہے یعنی اگر دنیا میں لوٹا دیا جائے تو دوبارہ انہی امور کا ارتکاب کریں گے جن کی ممانعت کر دی گئی اور اسی بات کی طرف لوٹیں گے۔ یہ نیا جملہ ہے (واو استینافیہ ہے) اور دنیا میں کافروں کا جو قول ہے اللہ نے اس کا ذکر کیا ہے

یعنی یہ لوگ کہتے ہیں کہ بس یہی دنیوی زندگی ہے۔ اس کے علاوہ دوسری زندگی نہ ہو گی (ہم نے ترجمہ اسی مطلب کے مطابق کیا ہے)۔

وَلَوْ تَرٰۤى اِذْ وُقِفُوْا عَلٰى رَبِّهِمْ (اور اگر (اے محمد ﷺ) آپ دیکھیں اس حالات کو جب ان کو ان کے مالک کے سامنے (سوال اور سرزنش کے لئے) روکا جائے گا) تو آپ کے سامنے عجیب منظر آئے گا۔ رب کے سامنے کھڑے کئے جانے سے مراد مجازی معنی ہے یعنی سوال اور سرزنش کے لئے روکا جائے گا۔ عَلٰى رَبِّهِمْ کا معنی فیصلۂ رب اور جزاء رب بھی کیا گیا ہے یا یہ مطلب ہے کہ اس وقت کامل طور پر وہ خدا کو پہچان لیں گے۔

قَالَ (وہ (یعنی اللہ) کہے گا) یا جماعت الٰہی دوزخ کے کافروں سے کہیں گے گویا ایک محذوف سوال کا یہ جواب ہے، کلام مذکور سن کر کوئی شخص پوچھ سکتا تھا کہ مذکورہ بالا کلام کافروں کو جواب کیا ملے گا تو جواب دیا گیا اللہ فرمائے گا۔

اَلَيْسَ هٰذَا بِالْحَقِّ (کیا یہ (یعنی قبروں سے زندہ ہو کر اٹھنا اور اس کے ثواب و عذاب، حساب و کتاب) حق نہیں ہیں) کیا اب بھی اس میں کچھ شبہ ہے۔ یہ سوال محض سرزنش کرنے اور تکذیب پر عار دلانے کیلئے ہو گا (طلب فہم اور دریافت خبر کے لئے نہ ہو گا)۔

قَالُوْا بَلٰى وَرَبِّنَا (وہ کہیں گے بے شک و شبہ (حق ہے) اپنے مالک کی قسم)۔ چونکہ واقعات بالکل سامنے ہوں گے اور شرک و تکذیب سے دست برأت ظاہر کرنا چاہیں گے اس لئے اپنے اقرار کو قسم سے مؤکد کریں گے۔ حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا یہ گفتگو قیامت کے ایک موقف پر ہو گی اور قیامت کے مختلف موقف ہوں گے کسی موقف پر کافر انکار کریں گے اور کسی پر اقرار۔

قَالَ فَذُوْقُوا الْعَذَابَ بِمَا كُنْتُمْ تَكْفُرُوْنَ ۝ (اللہ یا فرشتہ کہے گا) تو اپنے گزشتہ کفر کے (سبب یا کفر کے) عوض اب عذاب کا مزہ چکھو۔ بِمَا میں با سببیہ ہے یا عوض کے لئے۔

قَدْ خَسِرَ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِلِقَآءِ اللّٰهِ (بے شک خسارے میں پڑے وہ لوگ جنہوں نے اللہ کی پیشی کو جھوٹ مانا) لقاء اللہ سے مراد ہے مرنے کے بعد دوبارہ زندہ کر کے اٹھایا جانا کیونکہ دوسری زندگی ہی دیدار الٰہی تک پہنچانے کا ذریعہ ہے۔ مطلب یہ ہے کہ کافر نامراد رہیں گے کیونکہ وہ قیامت اور جنت و دوزخ کا انکار کرتے ہیں جس کی وجہ سے لازوال راحت سے محروم ہو گا اور دوامی درد ناک عذاب میں مبتلا ہونا پڑے گا۔

معتزلہ بھی چونکہ اللہ کے دیدار اور مغفرت و شفاعت کے منکر ہیں اس لئے ان کو دیدار و مغفرت اور شفاعت سے محرومی ہو گی اس لئے وہ بھی نامراد رہیں گے۔ اللہ نے فرمایا ہے (حدیث قدسی ہے) میرے متعلق میرا بندہ جیسا گمان رکھتا ہے میں اسی کے گمان کے پاس (یعنی اس کے مطابق) ہوں گا۔ متفق علیہ۔

طبرانی اور حاکم نے صحیح سند کے ساتھ وائلہ کی روایت سے ابراہیم صالح کا قول نقل کیا ہے ابراہیم نے کہا دیدار الٰہی کے عوض اگر مجھے آدمی جنت مل جائے تو مجھے پسند نہیں پھر ابراہیم نے آیات ذیل تلاوت کیں كَلَّآ اِنَّهُمْ عَنْ رَّبِّهِمْ يَوْمَئِذٍ لَّمَحْجُوْبُوْنَ ثُمَّ اِنَّهُمْ لَصَالُوا الْجَحِيْمِ ثُمَّ يُقَالُ هٰذَا الَّذِيْ كُنْتُمْ بِهٖ تُكَذِّبُوْنَ پھر فرمایا (هٰذَا سے اشارہ دیدار کی طرف ہے) یہ کلبی نے بیان کیا۔

حَتّٰۤى اِذَا جَآءَتْهُمُ السَّاعَةُ (یہاں تک کہ جب وہ مقررہ گھڑی ان پر آپہنچے گی)۔

بیضاوی نے لکھا ہے کہ حَتّٰى کا تعلق كَذَّبُوْا سے ہے (یعنی جن لوگوں نے آخری گھڑی تک تکذیب کی وہ نامراد رہے) خَسِرَ سے نہیں ہے کیونکہ کافروں کے نامراد رہنے کی تو کوئی انتہا نہیں ہے۔ اس پر شبہ کیا جا سکتا ہے کہ تکذیب تو موت پر ختم ہو جاتی ہے قیامت تک قائم نہیں رہتی (اور ساعت سے مراد ہے قیامت) اس شبہ کو دور کرنے کے لئے ہم کہتے ہیں کہ ساعت سے مراد موت کی گھڑی ہے کیونکہ مرنے والے کی موت اس کی قیامت ہے جو مرا اس کی قیامت بپا ہو گئی۔

صحیحین میں حضرت عائشہؓ کی روایت سے آیا ہے کہ کچھ دیہاتی رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو کر ساعت کے متعلق دریافت کیا کرتے تھے (کہ ساعت موعود یا قیامت کب ہوگی) آپ ان کی جماعت کے سب سے کم عمر شخص کی طرف دیکھ کر فرماتے تھے اگر یہ زندہ رہا تو اس کا بڑھاپا آنے سے پہلے تم پر تمہاری قیامت آپہنچے گی۔ اور (بالفرض) اگر آیت میں اَلسَّاعَۃ سے مراد قیامت ہی ہو تب بھی کوئی حرج نہیں کیونکہ موت قیامت کا پیش خیمہ ہے، موت آجانا گویا قیامت آجانا ہے۔ یا یوں کہا جائے کہ مرنے کے بعد چونکہ قیامت بہت جلد آجائے گی اس لئے موت کے وقت کو قیامت قرار دیا۔

اگر اَلسَّاعَۃ سے موت مراد ہو تو حَتّٰی کا تعلق خَسِرُوْا سے بھی ہو سکتا ہے کیونکہ خسران کا معنی ہے اصل پونجی کا ضائع ہو جانا اور مرنے کے وقت کافروں کا اصل سرمایہ یعنی زندگی ختم ہو جاتی ہے اس کے بعد تو ہلاکت کا زمانہ آجاتا ہے۔

بَغْتَۃً (اچانک) یہ حال ہے یا مفعول مطلق کیونکہ اچانک آنا بھی آنے ہی کی ایک نوع ہے (اس لئے مفعول مطلق بیان نوع کے لئے ہوگا)۔

قَالُوْا یٰحَسْرَتَنَا عَلٰی مَا فَرَّطْنَا فِیْهَا (تو کہیں گے ہائے افسوس ہم سے اس (کے بارہ) میں بڑی کوتاہی ہوئی)

فیہا کی ضمیر حیات دنیا کی طرف راجع ہے اور کمی کرنے سے مراد ہے نیک کام میں کمی کرنا۔ چونکہ مرجع معلوم تھا اس لئے بغیر سابق ذکر کے حیات دنیا کی طرف ضمیر راجع کر دی گئی یا اَلسَّاعَۃ کی طرف ضمیر راجع ہے یعنی ہم نے قیامت کے بارہ میں بڑی کمی کی اس پر ایمان نہ لائے۔

وَهُمْ یَحْمِلُوْنَ اَوْزَارَهُمْ عَلٰی ظُهُوْرِهِمْ ____ (اور (قبروں سے نکلتے وقت) وہ اپنی بدعملی کے بوجھ اپنی کمر پر لادے ہوں گے)۔ ابن ابی حاتم نے عمرو بن قیس ملائی کا بیان نقل کیا ہے کہ مومن جب قبر سے برآمد ہوگا تو اس کا نیک عمل حسین ترین شکل اور پاکیزہ ترین خوشبو کے ساتھ اس کے سامنے آئے گا اور کہے گا کیا آپ مجھے پہچانتے ہیں مومن کہے گا نہیں، بس اتنا جانتا ہوں کہ اللہ نے تیری صورت حسین اور تیری خوشبو پاکیزہ بنائی ہے۔ نیک عمل کہے گا میں دنیا میں بھی ایسا ہی تھا میں آپ کا نیک عمل ہوں، میں مدت دراز تک دنیا میں تیرے اوپر سوار رہا، آج تو مجھ پر سوار ہو جا۔ پھر (راوی نے) یہ آیت تلاوت کی یَوْمَ نَحْشُرُ الْمُتَّقِیْنَ اِلَی الرَّحْمٰنِ وَفْدًا اور کافر کا عمل مکروہ ترین شکل اور بدترین بو کے ساتھ اس کے سامنے آئے گا اور کہے گا کیا تو مجھے نہیں پہچانتا۔ کافر جواب دے گا نہیں، مگر اتنی بات جانتا ہوں کہ اللہ نے تیری شکل بہت مکروہ اور تیری بو بہت گندی بنائی ہے۔ عمل کہے گا میں دنیا میں بھی ایسا ہی تھا میں تیرا برا عمل ہوں دنیا میں مدت دراز تک تو مجھ پر سوار رہا آج میں تجھ پر سوار ہوں گا۔ پھر (راوی نے) یہ آیت تلاوت کی وَهُمْ یَحْمِلُوْنَ اَوْزَارَهُمْ عَلٰی ظُهُوْرِهِمْ۔

حضرت ابوہریرہؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ (خطبہ دینے) کھڑے ہوئے اور مال غنیمت میں چوری کرنے کو بڑا جرم بتایا پھر (مویشی اور سونے چاندی کی زکوٰۃ نہ دینے والوں کو ڈرانے کے لئے) فرمایا خوب سن لو میں ایسی حالت میں (تم کو نہ) پاؤں کہ تم میں سے بعض لوگ بلبلاتے اونٹ کو اپنی گردن پر اٹھائے میرے سامنے آئیں اور کہیں یا رسول اللہ ﷺ دہائی ہے اور میں جواب دوں آج اللہ کے سامنے میرا کچھ زور نہیں، میں تجھے (دنیا میں) پیام پہنچا چکا۔ یہ ایک طویل حدیث ہے جس کے اندر حضور ﷺ نے ہنہناتے گھوڑے اور منمناتی بکری اور سونے چاندی کے گردن پر سوار ہونے کا بھی ذکر فرمایا تھا۔ متفق علیہ۔

ابو یعلیٰ اور بزار نے بھی اسی طرح کی حدیث حضرت عمر بن خطابؓ کی روایت سے نقل کی ہے۔

طبرانی نے حضرت ابن مسعودؓ کی روایت سے مرفوع حدیث بیان کی ہے کہ جس نے اپنی ضرورت سے زائد کوئی مکان بنایا (یعنی جائیداد بنائی) قیامت کے دن اس کو مجبور کیا جائے گا کہ اس مکان کو اپنے کندھے پر اٹھائے۔ صحیحین میں حضرت عائشہؓ کی مرفوع روایت ہے جس نے بالشت بھر زمین بغیر حق کے لی قیامت کے دن اللہ اس کو ساتھ زمینوں کا طوق پہنائے گا۔

اس مبحث کی احادیث طبرانی نے حضرت حکم بن حارث اور حضرت انس کی روایت سے بھی بیان کی ہیں اور طبرانی نیز امام احمد نے حضرت یعلیٰ بن مرہ اور حضرت ابو مالک اشعری کی روایت سے اس باب کی احادیث نقل کی ہیں۔

اَلَا سَآءَ مَا يَزِرُوْنَ ۞ (خوب سن لو کہ برا ہو گا وہ بوجھ جس کو وہ اٹھائے ہوں گے)۔

وَمَا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَآ اِلَّا لَعِبٌ وَّلَهْوٌ (اور دنیوی زندگی تو کچھ بھی نہیں ہے بجز کھیل اور بہلاوا ہے) لَعِبٌ غیر مفید کام جس کا کوئی صحیح مقصد نہ ہو۔ لَهْوٌ مفید کام سے روکنے والا امر۔ یعنی جن اعمال کی غرض صرف دنیوی عیش پسندی اور لذت اندوزی ہو اور رضاء مولیٰ کی طلب نہ ہو ان سے کوئی خاص قابل اعتبار نفع حاصل نہیں ہو سکتا جو دنیوی فائدہ ہو گا وہ عارضی اور زوال پذیر اور لازوال زندگی کے فوائد کے حصول سے روکنے والا ہو گا۔

وَلَلدَّارُ الْاٰخِرَةُ خَيْرٌ لِّلَّذِيْنَ يَتَّقُوْنَ ۭ (اور پچھلا گھر یعنی آخرت پرہیزگاروں کے لئے بہترین ہو گا)۔

ابن عامر کی قرأت میں وَلَدَارُ الْاٰخِرَةِ بھی آیا ہے۔ اس صورت میں اَلْاٰخِرَةِ کا موصوف اَلسَّاعَةُ محذوف ہو گا۔ جیسے صَلٰوةُ الْوُسْطٰى اور مَسْجِدُ الْجَامِعِ میں (الساعة اور الوقت محذوف ہے) پرہیزگاروں سے مراد ہیں شرک اور گناہوں سے بچنے والے۔ دار آخرت لازوال ہے، اس کی لذتیں اور فوائد کدورت سے پاک ہیں، اس لئے دنیوی فوائد و لذائد سے بہتر ہیں۔ دار آخرت کی بھلائی صرف اہل تقویٰ کے لئے مخصوص ہے، مشرکوں کے لئے تو آخرت دنیا سے بہت ہی زیادہ بری ہے۔ چونکہ آیت میں متقین کے اعمال کو اعمال دنیا کے مقابل بیان کیا ہے اور اعمال دنیا کو لہو و لعب فرمایا ہے اس لئے اشارہ معلوم ہوا کہ جو اہل تقویٰ کا عمل نہ ہو وہ لہو و لعب ہے۔

اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ۞ (کیا تم (اتنا بھی) نہیں سمجھتے) کہ کون سے اعمال بہتر ہیں دنیا کے یا آخرت کے۔ بہتر وہی عمل ہو گا جس کا فائدہ زیادہ خالص اور لازوال ہو اور جس کا فائدہ عارضی، کدورت آمیز اور کمزور ہو وہ عمل بہتر نہیں ہو سکتا۔

ترمذی اور حاکم نے حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی روایت سے لکھا ہے کہ ابو جہل نے رسول اللہ ﷺ سے کہا ہم آپ کو جھوٹا نہیں کہتے بلکہ جو چیز آپ نے پیش کی ہے اس کی تکذیب کرتے ہیں اس پر آیت ذیل نازل ہوئی۔

قَدْ نَعْلَمُ اِنَّهٗ لَيَحْزُنُكَ الَّذِيْ يَقُوْلُوْنَ فَاِنَّهُمْ لَا يُكَذِّبُوْنَكَ وَلٰكِنَّ الظّٰلِمِيْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ يَجْحَدُوْنَ ۞ (ہم کو خوب معلوم ہے کہ آپ کو ان کے اقوال مغموم کرتے ہیں سو یہ آپ کو جھوٹا نہیں کہتے بلکہ یہ ظالم اللہ کی آیتوں کا انکار کرتے ہیں)۔

بیضاوی نے لکھا ہے کہ (اس جگہ) لفظ قَدْ فعل کی زیادتی اور کثرت کو ظاہر کرنے کے لئے آیا ہے جیسے وَلٰكِنَّهٗ قَدْ يُهْلِكُ الْمَالَ نَائِلُهٗ میں آیا ہے اور اِنَّهٗ میں ضمیر شان ہے (جس کو مرجع کی ضرورت نہیں ہوتی) سدی کا بیان ہے کہ اخنس بن شریق نے ابو جہل بن ہشام سے ملاقات کی اور کہا ابو الحکم محمد بن عبد اللہ کے متعلق مجھے بتاؤ وہ سچے ہیں یا جھوٹے۔ اس وقت یہاں میرے سوا آپ کی بات سننے والا اور کوئی نہیں ہے۔ ابو جہل نے کہا خدا کی قسم محمد بلاشبہ سچے ہیں لیکن جب قصی کی اولاد کے پاس جھنڈا، حاجیوں کو پانی پلانا، کعبہ کی تولیت، دربانیت اور نبوت (ہر امتیاز) پہنچ گیا تو باقی قریشیوں کے لئے کیا بچا (میں اس لئے محمد کی نبوت کی مخالفت کرتا ہوں) اس پر آیت فَاِنَّهُمْ لَا يُكَذِّبُوْنَكَ نازل ہوئی۔ ناجیہ بن کعب کا بیان ہے کہ ابو جہل نے رسول اللہ ﷺ سے کہا ہم آپ ﷺ پر (جھوٹے ہونے کا) شبہ نہیں کرتے اور آپ کو جھوٹا کہتے ہیں بلکہ جو چیز آپ نے پیش کی اس کی تکذیب کرتے ہیں۔

بجائے ضمیر غائب کے اَلظّٰلِمِيْنَ کا لفظ صراحت کے ساتھ ذکر کرنا دلالت کر رہا ہے کہ انکار کرنے کی وجہ سے وہ لوگ ظالم ہو گئے تھے یا یوں کہا جائے کہ حق کو ٹھکرانا چونکہ ان کی عادت تھی اس لئے انہوں نے انکار کر دیا تھا اور چونکہ جحود (انکار) کے اندر تکذیب کا مفہوم داخل ہے (اور تکذیب کے بعد آتی ہے) اس لئے آیات سے پہلے ب کو ذکر کیا۔ مطلب یہ ہے کہ آپ کی تکذیب حقیقت میں خدا کی تکذیب ہے کیونکہ آپ کی تکذیب وہ نبوت کے اعتبار سے کرتے ہیں (ورنہ

دوسری باتوں میں آپ کو جھوٹا نہیں جانتے اور حقیقت میں یہ نبوت دے کر بھیجنے والے کی تکذیب ہے۔

وَلَقَدْ كُذِّبَتْ رُسُلٌ مِّنْ قَبْلِكَ (اور آپ سے پہلے بہت پیغمبروں کو (نبوت کے دعوے میں) جھوٹا کہا گیا) یعنی جس طرح آپ کی قوم نے آپ کی تکذیب کی اسی طرح سابق پیغمبروں کی قوموں نے ان کی تکذیب کی اس میں رسول اللہ ﷺ کو تسلی دی گئی ہے (کہ آپ قوم کی مخالفت سے متگدل نہ ہوں پیغمبروں کی مخالفت قدیم دستور ہے کوئی نئی بات نہیں)۔

وَلَقَدْ كُذِّبَتْ کا لفظ بتا رہا ہے کہ لَا يُكَذِّبُونَكَ کا حقیقی مفہوم مراد نہیں ہے بلکہ مراد یہ ہے کہ رسول ﷺ کی تکذیب حقیقت میں خدا کی تکذیب ہے (تو یہ حقیقت میں خدا کی تکذیب ہوئی) رسول اللہ ﷺ نے (اسی لئے) ارشاد فرمایا تھا جس نے مجھے ایذا دی ہے اس نے حقیقت میں اللہ کو ایذا دی۔

فَصَبَرُوا عَلَىٰ مَا كُذِّبُوا وَأُوذُوا حَتَّىٰ أَتَاهُمْ نَصْرُنَا (سو انہوں نے اپنی تکذیب اور دکھ رسیدہ ہونے پر صبر کیا آخر ہماری مدد ان کو پہنچ گئی) یعنی صبر کا نتیجہ نصرت نکلا پس جس طرح انہوں نے صبر کیا آپ بھی صبر کریں آخر کار آپ کو بھی اللہ کی طرف سے نصرت پہنچ جائے گی۔

وَلَا مُبَدِّلَ لِكَلِمَاتِ اللَّهِ (اور اللہ کی باتوں کو کوئی بدلنے والا نہیں)۔

كَلِمَاتِ اللَّهِ سے مراد ہیں نصرت انبیاء کے خداوندی وعدے۔ اللہ نے فرمایا ہے وَلَقَدْ سَبَقَتْ كَلِمَتُنَا لِعِبَادِنَا الْمُرْسَلِينَ إِنَّهُمْ لَهُمُ الْمَنصُورُونَ۔ دوسری آیت ہے إِنَّا لَنَنصُرُ رُسُلَنَا۔ تیسری آیت میں آیا ہے وَإِنَّ جُندَنَا لَهُمُ الْغَالِبُونَ (اپنے پیغمبر بندوں کے لئے ہمارا وعدہ پہلے ہی ہو چکا ہے کہ انہیں کی مدد کی جائے گی ہم ہی اپنے پیغمبروں کی مدد کرتے ہیں۔ ہمارا لشکر ہی غلبہ پانے والا ہے) یا كَلِمَاتِ اللَّهِ سے مراد ہے اللہ کا تکوینی فیصلہ اور قضاء مقدر۔ یعنی اضطراب سے کوئی فائدہ نہیں۔ صبر رکھنا لازم ہے۔ جب وقت آجائے گا تو اللہ کی طرف سے نصرت آجائے گی پھر اس کو کوئی پلٹ نہیں سکتا۔

وَلَقَدْ جَاءَكَ مِن نَّبَإِ الْمُرْسَلِينَ ﴿٣٤﴾ (اور آپ کے پاس پیغمبروں کے بعض قصے پہنچ چکے ہیں) اخفش نحوی کے نزدیک مِن زائد ہے۔ سیبویہ کلام مثبت میں مِن کی زیادتی جائز نہیں قرار دیتا اس لئے سیبویہ کے نزدیک اس جگہ مِن تبعیضیہ ہے یعنی پیغمبروں کی بعض خبریں آپ کے پاس پہنچ چکی ہیں جو آپ کی تسلی کے لئے کافی ہیں۔

رسول اللہ ﷺ کو قوم کے مسلمان ہونے کی رغبت حرص کی حد تک پہنچ چکی تھی۔ ایمان سے ان کی روگردانی آپ کو بہت گراں گزرتی تھی اس کا نتیجہ تھا کہ جب وہ آپ سے کوئی معجزہ طلب کرتے تو آپ دل سے خواستگار ہوتے کہ اللہ یہ معجزہ آپ کے ہاتھ سے نمودار کر دے تاکہ لوگ ایمان لے آئیں اس پر آیت ذیل نازل ہوئی۔

وَإِن كَانَ كَبُرَ عَلَيْكَ إِعْرَاضُهُمْ فَإِنِ اسْتَطَعْتَ أَن تَبْتَغِيَ نَفَقًا فِي الْأَرْضِ أَوْ سُلَّمًا فِي السَّمَاءِ (اور اگر آپ کو ان کا اعراض کرنا گراں گزرتا ہے تو اگر آپ کو یہ قدرت ہے کہ زمین میں کوئی سرنگ یا آسمان پر چڑھنے کی کوئی سیڑھی تلاش کر لیں) اعراض روگردانی سے مراد ہے نبوت و قرآن پر ایمان لانے سے روگردانی کرنا نَفَقًا کا معنی ہے سرنگ فِي الْأَرْضِ اس کی صفت ہے یعنی اگر تم زمین کے اندر گھسنے کیلئے کوئی سرنگ بنا سکتے ہو اور سرنگ کے ذریعہ سے زمین کے اندر گھس کر ان کے لئے کوئی معجزہ نمودار کر سکتے ہو۔ سُلَّمًا زینہ چڑھنے کا راستہ۔ فِي السَّمَاءِ سے مراد ہے آسمان کی سمت یعنی اگر تم آسمان کی طرف چڑھنے کا کوئی زینہ بنا سکتے ہو کہ اس پر چڑھ کر آسمان پر پہنچ جاؤ اور

فَتَأْتِيَهُم بِآيَةٍ (وہاں سے لا کر کوئی معجزہ ان کے سامنے ظاہر کر دو تو ایسا کرو)۔ خلاصہ مطلب یہ ہے کہ جب خود کوئی معجزہ پیش نہیں کر سکتے اس لئے خواہ مخواہ اپنے کو بے چین نہ کرو خواہ ان کا اعتراض تم کو کتنا ہی کھلے تم صبر رکھو۔

وَلَوْ شَاءَ اللَّهُ (اور اگر اللہ ان سب کو ہدایت کرنا چاہتا)۔

لَجَمَعَهُمْ عَلَى الْهُدٰى (تو سب کو ہدایت پر متفق کر دیتا)۔ کیونکہ بندوں کے ارادہ کا خالق بھی خدا ہے بندوں کی مشیت اللہ کی مشیت کی تابع ہے مگر اللہ ہی اپنی مصلحت کے پیش نظر ان کی ہدایت نہیں چاہتا اور اس کی مصلحت سے کوئی دوسرا واقف نہیں تم ان کو ہدایت یافتہ بنانے کا قابو نہیں رکھتے اس لئے صبر کرو، بے چین نہ ہو۔

فَلَا تَكُونَنَّ مِنَ الْجٰهِلِيْنَ ﴿۳۵﴾ (اور ناوانوں میں سے نہ ہو)۔ غیر مفید کام کے لئے ایسے مقام پر مضطرب ہونا جہاں صبر مفید ہو ناوانوں کی خصوصیت ہے۔ یا یہ مطلب ہے کہ آپ ان ناوانوں میں نہ ہوں جو اتنا بھی نہیں جانتے کہ لوگوں کا ہدایت یاب ہونا اللہ کی مشیت پر موقوف ہے کسی اور کی مشیت کو اس میں دخل نہیں ہے۔

اِنَّمَا يَسْتَجِيْبُ الَّذِيْنَ يَسْمَعُوْنَ ؔ (آپ کی دعوت کو تو) وہی لوگ قبول کریں گے جو (حق و قبول کے کانوں سے) سنتے ہیں)۔ یعنی سنی ہوئی بات کی حقانیت کا علم جن کے دلوں کے اندر اللہ نے پیدا کر دیا ہو۔ سننے سے مراد ہے سن کر جاننا کیونکہ سننے کے بعد علم کی تخلیق اللہ کا دستور ہے۔

وَالْمَوْتٰى (اور مردے) یعنی کافر (کیا سنیں گے، کافروں کے دلوں پر اللہ نے قفل ڈال دیا ہے کانوں پر مہر لگا دی ہے اور آنکھوں پر پردے ڈال دیئے ہیں اس لئے وہ حق کو حق اور باطل کو باطل نہیں جانتے گویا مردے ہیں۔

يَبْعَثُهُمُ اللّٰهُ (ان کو (تو بس قیامت کے دن) اللہ اٹھائے گا (تو اٹھیں گے)۔

ثُمَّ اِلَيْهِ يُرْجَعُوْنَ ﴿۳۶﴾ (پھر اللہ ہی کی طرف سب کو لوٹایا جائے گا)۔ وہی ان کو کفر کی سزا دے گا اس سے پہلے نہ وہ حق بات سنیں گے نہ تصویر حق دیکھیں گے۔ یا الْمَوْتٰى سے عام مردے مراد ہیں کافر ہوں یا مومن سب کو اللہ زندہ کر کے اٹھائے گا اور سب کی واپسی اللہ ہی کی طرف ہو گی وہی سزا جزا دے گا۔ جیسے اعمال ہوں گے ویسا بدلہ ملے گا۔

وَقَالُوْا لَوْلَا نُزِّلَ عَلَيْهِ اٰيَةٌ مِّنْ رَّبِّهٖ (اور (قریش کے سرداروں نے) کہا کہ اس پر اس کے رب کی طرف سے کوئی معجزہ کیوں نازل نہیں کیا گیا) یعنی ہمارا مطلوبہ معجزہ یا موجودہ معجزات کے علاوہ کوئی اور غیر معمولی معجزہ نازل شدہ معجزات کو تو وہ محض عناد کی وجہ سے در خور اعتناء نہیں سمجھتے تھے۔

قُلْ اِنَّ اللّٰهَ قَادِرٌ عَلٰٓى اَنْ يُّنَزِّلَ اٰيَةً (آپ کہہ دیجئے کہ اللہ (ہر) معجزہ اتارنے پر قادر ہے۔ آیۃ سے مراد یا تو مطلوبہ معجزہ ہے یا ایسا معجزہ جس کو ماننے پر وہ مجبور ہو جائیں جیسے پہاڑ کو جڑ سے اکھاڑ کر سروں پر معلق کر دینا۔ یا ایسا معجزہ جس کے بعد انکار کرنے والوں کی ہلاکت ضروری ہو جائے۔

وَّلٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴿۳۷﴾ (لیکن اکثر لوگ نہیں جانتے) کہ اللہ ہر نشانی اتارنے پر قادر ہے یا مطلوبہ معجزہ اتار کر انکار کرنے والوں کو بیخ و بن سے برباد کر دینے پر قادر ہے۔

وَمَا مِنْ دَآبَّةٍ فِي الْاَرْضِ (اور نہیں ہے زمین پر کوئی چلنے والا جانور)

وَلَا طٰٓئِرٍ يَّطِيْرُ بِجَنَاحَيْهِ (اور نہ کوئی پرندہ جو اپنے دونوں بازوؤں سے ہوا میں اڑتا ہو)۔ ہر پرندہ بازوؤں سے ہی اڑتا ہے لیکن رفتار کی تیزی کے لئے بھی مجازاً کبھی اڑنے کا لفظ استعمال کر لیا جاتا ہے۔ اس خیال کو دور کرنے کے لئے طائر کے بعد يَّطِيْرُ بِجَنَاحَيْهِ فرمایا۔ يَّطِيْرُ بِجَنَاحَيْهِ کہنے سے محض معنوی تاکید مقصود ہے۔

اِلَّآ اُمَمٌ اَمْثَالُكُمْ (مگر سب تمہاری طرح گروہ گروہ ہیں) یعنی پیدا ہونے میں، مرنے میں، پھر جی اٹھنے میں، غذا کی ضرورت اور رزق کی طلب میں، عافیت و مصیبت کے تاثر میں (غرض تمام حیوانی لوازم و خصوصیات میں) تمہاری طرح ہیں تم کو محض معرفت الٰہی کی وجہ سے ان پر برتری حاصل ہے اور نہ اور کوئی وجہ فضیلت نہیں۔

مَا فَرَّطْنَا فِي الْكِتٰبِ مِنْ شَيْءٍ (ہم نے کتاب کے اندر کسی قسم کی کمی نہیں چھوڑی)۔ مِنْ شَيْءٍ میں مِنْ زائد ہے اور شَيْءٍ مفعول بہ نہیں ہے مفعول مطلق ہے۔ کیونکہ فرط کے بعد مفعول بہ بغیر ب کے نہیں آتا۔ الْكِتٰبِ سے مراد ہے لوح محفوظ یعنی اللہ کا علم ہمہ گیر ہے ظاہر ہو یا پوشیدہ کوئی چیز علم خدا سے باہر نہیں اور کوئی حیوان وغیرہ حیوان ایسا نہیں

کہ اس کا اندراج لوح محفوظ میں نہ ہو۔ یا الکتاب سے مراد ہے قرآن مجید اور شیء سے مراد ہیں دینی امور یعنی قرآن میں تمام دینی امور تفصیل یا اجمال کے ساتھ موجود ہیں۔

ثُمَّ إِلَىٰ رَبِّهِمْ يُحْشَرُونَ ۝ (پھر ان سب کو ان کے مالک کے پاس جمع کیا جائے گا) ھُم کی ضمیر مجموعہ کی طرف راجع ہے یعنی اُمَم اور اُمَم دونوں کا مجموعہ ضمیر کا مرجع ہے اسی لئے یُحْشَرُوْنَ جمع مذکر غائب کا صیغہ استعمال کیا۔ حضرت ابن عباسؓ اور ضحاک نے فرمایا ان کی موت ہی ان کا حشر ہے (یعنی حشر سے مراد موت ہے مطلب یہ کہ ان سب پر موت آتی ہے اور یہ سب اللہ کی طرف چلے جاتے ہیں)۔

لیکن ابن ابی حاتم اور ابن جریر اور بیہقی نے حضرت ابوہریرہؓ کا بیان نقل کیا ہے کہ قیامت کے دن تمام مخلوق اٹھائی جائے گی، چوپائے کیڑے مکوڑے اور پرندے سب ہی کا حشر ہوگا اور اللہ کا انصاف اس حد تک پہنچ جائے گا کہ اللہ سینگوں والی سے منڈی کا بدلہ دلوائے گا۔ پھر فرمائے گا خاک ہو جاؤ (اداء حقوق کے بعد سب جاندار خاک ہو جائیں گے) اس وقت کافر کہے گا، کاش میں بھی خاک ہو جاتا (کہ دوامی عذاب سے نجات ہو جاتی) بغوی نے حضرت ابوہریرہؓ کی روایت سے لکھا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا قیامت کے دن اہل حقوق کو ان کے حقوق دلوائے جائیں گے یہاں تک کہ سینگوں والی بکری سے منڈی بکری کا بدلہ دلوایا جائے گا۔ طبرانی نے الاوسط میں حضرت ابوہریرہؓ کی روایت سے لکھا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا قیامت کے دن سب سے پہلا مقدمہ جس کا سب سے پہلے فیصلہ کیا جائے گا دو بکریوں کا ہوگا ایک سینگوں والی ہوگی دوسری منڈی۔ اسی طرح کی ایک حدیث حضرت ابوذرؓ کی روایت سے احمد اور بزار اور طبرانی نے بھی نقل کی ہے۔ اور حاکم نے حضرت ابن عمرؓ کی روایت سے بھی ایسی ہی حدیث بیان کی ہے۔

تخلیق کائنات اور آثار قدرت جو اللہ کی عظمت اور اس کے علم و قدرت کی ہمہ گیری کے نشانات ہیں اور ان سے حشر و جزاء پر استدلال کیا جاتا ہے جب ان کا ذکر ہو چکا تو آگے فرماتے ہیں۔

وَالَّذِينَ كَذَّبُوا بِآيَاتِنَا صُمٌّ وَبُكْمٌ (اور جو لوگ ہماری آیتوں کی تکذیب کرتے ہیں وہ بہرے ہیں (واضح نشانات حق کی آواز نہیں سنتے) گونگے ہیں (کلمۂ حق ان کی زبانوں پر نہیں آتا)۔

فِي الظُّلُمَاتِ (تاریکیوں میں) اندھے ہوئے ہیں یعنی کفر، جہالت، عناد اور اسلاف پرستی کے اندھیروں میں پڑے ہوئے ہیں۔

آیات قدرت سے کسی کا ہدایت یاب ہونا یا نہ ہونا اللہ کی مشیت پر موقوف ہے وہی جو کچھ چاہتا ہے کرتا ہے اس بات پر تنبیہ کرنے کے لئے آگے فرمایا۔

مَن يَشَإِ اللَّهُ يُضْلِلْهُ وَمَن يَشَأْ يَجْعَلْهُ عَلَىٰ صِرَاطٍ مُّسْتَقِيمٍ ۝ (اللہ جس کی گمراہی چاہتا ہے اس کو گمراہ کر دیتا ہے اور جس کو ہدایت یاب کرنا چاہتا ہے اس کو سیدھے راستے پر کر دیتا ہے) اور یہ راستہ اس کو حق تک پہنچا دیتا ہے۔

قُلْ (اے محمد ﷺ ان مشرکوں سے) آپ کہہ دیں۔

أَرَأَيْتَكُمْ (بھلا بتاؤ تو) ہمزہ استفہام اظہار تعجب کے لئے ہے اور کاف حرف خطاب ہے اس سے رَأَيْتَ کے فاعل کی تاکید ہو رہی ہے۔ کاف کا اعرابی محل کچھ نہیں ہے (یعنی یہ نہ فاعل ہے نہ مفعول) بلکہ رَأَيْتَ کے دونوں مفعول محذوف ہیں جن پر آنے والا کلام دلالت کر رہا ہے یعنی کیا تم نے دیکھا کہ جب تم اپنے معبودوں کو پکارتے ہو تو کیا تم کو وہ فائدہ پہنچاتے ہیں۔ فراء نے کہا عرب اَرَأَيْتَكَ بولتے ہیں لیکن (اس استفہام سے) ان کی مراد یہ ہوتی ہے کہ ہم کو بتاؤ۔

علامہ تفتازانی نے کہا کہ رَأَيْتَ میں رُؤْيَت بَصَرِي یا رُؤْيَت قلبی کا سوال ہے مگر اس سے مقصود ہے طلب خبر کیونکہ آنکھوں سے دیکھنا علم کا ذریعہ ہے اور علم خبر دینے کا سبب ہے سبب کو مسبب کے قائم مقام رکھا گیا ہے۔

إِنْ أَتٰىكُمْ عَذَابُ اللّٰهِ (اگر دنیا میں گزشتہ اقوام کی طرح) تم پر اللہ کا عذاب آجائے)۔
أَوْ أَتَتْكُمُ السَّاعَةُ (یا قیامت (اپنی پوری ہولناکیوں کے ساتھ) تم پر آجائے)۔
أَغَيْرَ اللّٰهِ تَدْعُونَ (تو کیا اللہ کے سوا کسی اور کو پکارو گے)۔ استفہام انکاری ہے جس سے مخاطبوں کو قائل کرنا مقصود ہے۔
إِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ۝ (اگر تم سچے ہو) کہ یہ بت دیوتا اور معبود ہیں تو کیا ان کو مصیبت دور کرنے کے لئے پکارو گے (نہیں)۔
بَلْ إِيَّاهُ تَدْعُونَ (بلکہ تم اسی کو پکارو گے)۔ تقدیم مفعول حصر کے لئے ہے۔
فَيَكْشِفُ مَا تَدْعُونَ إِلَيْهِ إِنْ شَاءَ (سو وہی اگر چاہے گا تو اس مصیبت کو دور کر دے گا جس کے دور کرنے کے لئے تم اس کو پکارو گے)۔ یعنی دنیا میں مصیبت دور کر دے گا اگر چاہے گا آخرت کا عذاب نہیں دور کرے گا۔
وَتَنْسَوْنَ مَا تُشْرِكُوْنَ ۝ (اور ایسے وقت میں) ان (دیوتاؤں) کو بھول جاؤ گے جن کو شریک قرار دیتے ہو) بھول جانے سے مراد ہے چھوڑ دینا (بات یہ ہے کہ فطری طور پر) انسان کے دماغ میں یہ امر پیوست ہے کہ مصیبت کو دور کرنے پر قدرت صرف اللہ کو حاصل ہے (اس لئے مشرک بھی نزول مصیبت کے وقت اللہ ہی کو پکارنے پر مجبور ہیں)
وَلَقَدْ أَرْسَلْنَا إِلٰى أُمَمٍ مِّنْ قَبْلِكَ فَأَخَذْنٰهُمْ بِالْبَأْسَاءِ وَالضَّرَّاءِ لَعَلَّهُمْ يَتَضَرَّعُوْنَ ۝
(اور ہم نے آپ سے پہلے والی امتوں کے پاس بھی پیغمبر بھیجے (اور جب انہوں نے سرتابی کی) تو تنگ دستی اور بیماری میں (مبتلا کر کے) ان کی پکڑ کی تاکہ وہ گڑگڑا کر (گناہوں سے) توبہ کرلیں۔ مِنْ قَبْلِكَ میں مِنْ زائد ہے۔ بَأْسَاء سختی اور ناداری۔ ضَرَّاء بیماری اور دوسرے جسمانی دکھ۔ تضرع عاجزی سے سوال کرنا۔
فَلَوْلَا إِذْ جَاءَهُمْ بَأْسُنَا تَضَرَّعُوْا (سو جب ان کو ہماری طرف سے سزا پہنچی انہوں نے عاجزی (کے ساتھ توبہ) کیوں نہیں کی)۔ مراد یہ ہے کہ انہوں نے سزا دیکھنے کے بعد بھی توبہ نہیں کی۔ کلمۂ نفی کی جگہ لَوْلَا کا استعمال اس طرف اشارہ کر رہا ہے کہ تضرع کے ترک کا ان کے پاس کوئی عذر نہ تھا بلکہ تضرع کے دواعی موجود ہونے کے باوجود انہوں نے توبہ نہیں کی۔
وَلٰكِنْ قَسَتْ قُلُوْبُهُمْ (لیکن ان کے دل سخت ہوگئے تھے)۔
وَزَيَّنَ لَهُمُ الشَّيْطٰنُ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ۝ (اور شیطان ان کے اعمال کو ان کی نظر میں پسندیدہ بنا کر دکھاتا رہا)۔ یعنی مصائب میں مبتلا ہونے سے بھی ان کو تنبیہ نہ ہوئی اور انہوں نے اپنے اعمال کو پسندیدہ نظر سے دیکھا۔ یہ توبہ سے روکنے والے سبب کا بیان ہے اور اس بات کا اظہار ہے کہ دل کی سختی اور شیطانی اغوا نے ان کو توبہ سے روک دیا تھا۔ شیطان کے اغوا سے وہ اپنے اعمال پر فریفتہ رہے۔
فَلَمَّا نَسُوْا مَا ذُكِّرُوْا بِهٖ (سو جب انہوں نے ان چیزوں کو چھوڑے رکھا جن کی ان کو نصیحت کی گئی) اور اختیار تہ کیا ان احکام کو جو ان کو دیئے گئے تھے اور تنگدستی و بیماری میں مبتلا ہو کر بھی بیدار نہ ہوئے اور توبہ نہ کی۔
فَتَحْنَا عَلَيْهِمْ أَبْوَابَ كُلِّ شَيْءٍ (تو ہم نے ان پر ہر چیز کے دروازے کھول دیئے) یعنی ڈھیل دینے کے لئے ان کو ہر طرح کی نعمتیں عطا کر دیں۔ حضرت عقبہ بن عامر کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اگر کوئی بندہ گناہوں پر جما ہوا ہو اور دنیا میں ہر دل پسند چیز اس کو مل رہی ہے تو (سمجھ لو کہ) یہ محض ڈھیل ہے۔ پھر حضور ﷺ نے یہ آیت تلاوت فرمائی فَلَمَّا نَسُوْا مَا ذُكِّرُوْا بِهٖ فَتَحْنَا عَلَيْهِمْ أَبْوَابَ كُلِّ شَيْءٍ۔
حَتّٰى إِذَا فَرِحُوْا بِمَا أُوْتُوْا (یہاں تک کہ جب ان چیزوں پر جو ان کو ملی تھیں وہ اترا گئے)۔
أَخَذْنٰهُمْ بَغْتَةً (تو ہم نے ان کو اچانک پکڑ لیا)۔

فَاِذَا هُمْ مُّبْلِسُوْنَ ۝ (سو وہ یکدم (حیرت زدہ ہو کر رہ گئے) ہر بھلائی سے ناامید ہو گئے)۔

فَقُطِعَ دَابِرُ الْقَوْمِ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا (پھر ظالم لوگوں کی جڑ کٹ گئی) قاموس میں دابر کا معنی ہے تابع ہر چیز کا آخری حصہ، جڑ۔ مطلب یہ ہے کہ سب کو ہلاک کر دیا گیا ان میں سے کوئی بھی باقی نہیں رہا۔ تو الدکا سلسلہ ہی کاٹ دیا گیا۔ نسل منقطع ہو گئی یہی قطع جڑ، قطع اصول کی صورت میں ہو گیا قطع فروع کی شکل میں۔

بجائے دَابِرُهُمْ کہنے کے دَابِرُ الْقَوْمِ الَّذِيْنَ الخ سے اس طرف اشارہ ہے کہ ان کی بربادی کی علت ان کا ظلم تھا (اللہ نے ان پر ظلم نہیں کیا ان کا خود ظلم موجب بربادی ہوا)۔

وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝ (اور اللہ ہی کے لئے ہر ستائش ہے جو سارے جہان کا مالک ہے)۔ ظالموں کو ہلاک کرنا بھی قابل حمد و ستائش نعمت ہے، مومنوں کو ظالموں کے شر سے نجات مل گئی ہے، غلط افکار اور فاسد اعمال سے زمین پاک ہو گئی ہے۔ عقائد باطلہ اور اعمال فاسدہ نزول عذاب کا موجب ہوتے ہیں جن ظالموں کی تباہی سے اہل زمین محفوظ ہو جاتے ہیں۔ اس جگہ وصف ربوبیت کا خصوصی ذکر اس لئے کیا کہ ظالموں کو تباہ کر دینا بھی ربوبیت کا تقاضا ہے (مضر چیز کی ہلاکت تعدیہ امراض کی بندش اور صحت کا سبب ہوتی ہے) اس جملہ میں اس بات پر تنبیہ ہے کہ جو اللہ کی رحمت کرنے اور اللہ جس کو ہلاک کر دے تو ایسے شخص کی ہلاکت پر اللہ کی حمد کرنا واجب ہے۔ اس سے آگے اپنی قدرت کی ہمہ گیری اور توحید کو بیان فرمایا ہے ارشاد ہے۔

قُلْ (اے محمد (ﷺ) آپ کہہ دیجئے)۔

اَرَءَيْتُمْ اِنْ اَخَذَ اللّٰهُ سَمْعَكُمْ وَاَبْصَارَكُمْ وَخَتَمَ عَلٰى قُلُوْبِكُمْ مَّنْ اِلٰهٌ غَيْرُ اللّٰهِ يَاْتِيْكُمْ بِهٖ ؕ

(اے مشرکو) بتاؤ تو اگر اللہ تمہاری شنوائی اور بینائی بالکل لے لے (تم کو اندھا بہرا کر دے) اور تمہارے دلوں پر مہر کر دے (ایسی غفلت مسلط کر دے کہ تمہاری عقلیں ناکارہ ہو جائیں) تو اللہ کے سوا کون سا معبود ہے جو یہ چیزیں تم کو پھر دے دے (یعنی اللہ کے سوا کوئی تم کو یہ چیزیں نہیں دے سکتا۔ استفہام تقریری ہے مطلب یہ کہ تم خود جانتے ہو کہ اگر اللہ تمہاری شنوائی، بینائی اور دانائی لے لے تو اور کوئی معبود بھی واپس نہیں دے سکتا۔

اُنْظُرْ كَيْفَ نُصَرِّفُ الْاٰيٰتِ ثُمَّ هُمْ يَصْدِفُوْنَ ۝ (اے محمد ﷺ) آپ دیکھئے تو ہم کس طرح دلائل کو مختلف پہلوؤں سے پیش کر رہے ہیں پھر بھی یہ اعراض کرتے ہیں)۔ قاموس میں تصریف آیات کا معنی ہے آیات کو کھول کر بیان کرنا بغوی نے یہی لکھا ہے یعنی ہم توحید کے دلائل کس طرح کھول کھول کر بیان کر رہے ہیں۔ بیضاوی نے نُصَرِّفُ الْاٰيٰتِ کی تشریح اس طرح کی ہے ہم بار بار دلائل بیان کرتے ہیں، کبھی عقلی دلائل پیش کرتے ہیں کبھی ترغیب اور تخویف سے کام لیتے ہیں، کبھی گزشتہ اقوام کے احوال بیان کر کے عبرت اندوز ہونے کی نصیحت اور تنبیہ کرتے ہیں۔

ثُمَّ هُمْ میں ثُمَّ (تراخی کے لئے نہیں ہے بلکہ) استبعاد و دوری کے لئے ہے یعنی کھلے دلائل کے بیان اور ظہور آیات کے بعد ان کا اعراض کرنا بہت بعید ہے۔

قُلْ اَرَءَيْتَكُمْ اِنْ اَتٰىكُمْ عَذَابُ اللّٰهِ بَغْتَةً اَوْ جَهْرَةً هَلْ يُهْلَكُ اِلَّا الْقَوْمُ الظّٰلِمُوْنَ ۝

(اے محمد ﷺ آپ کہہ دیجئے کہ (مشرکو) بتاؤ اگر اللہ کا عذاب تم پر آ پڑے خواہ بے خبری میں یا خبرداری میں تو کیا بجز ظالم لوگوں کے اور بھی کوئی ہلاک کیا جائے گا)۔

بَغْتَةً سے مراد ہے اچانک بغیر کسی نشانی اور علامت کے۔ اور جَهْرَةً کا معنی ہے علی الاعلان جس کی نشانیاں پہلے سے نمودار ہو چکی ہوں۔ حضرت ابن عباسؓ اور حسنؓ نے فرمایا بَغْتَةً اَوْ جَهْرَةً کا معنی ہے رات میں یا دن میں۔ هَلْ يُهْلَكُ میں استفہام انکاری ہے یعنی سوائے ظالموں کے اور کوئی ہلاک نہ ہو گا۔ چونکہ اس جگہ استفہام بمعنی نفی ہے اسی لئے آگے استثناء کیا گیا۔ اَلظّٰلِمُوْنَ سے مراد ہیں کافر جو کفر کی وجہ سے خود اپنے اوپر ظلم کرتے ہیں۔

وَمَا نُرْسِلُ الْمُرْسَلِيْنَ اِلَّا مُبَشِّرِيْنَ وَمُنْذِرِيْنَ ۚ (اور ہم پیغمبروں کو صرف اس لئے بھیجا کرتے ہیں کہ وہ (اہل ایمان کو جنت کی) بشارت دیں اور (کافروں کو دوزخ سے) ڈرائیں)۔ یعنی کافروں کے مطلوبہ معجزات کو پیش کرنا اور جس کو اللہ ہدایت یافتہ بنانا چاہے اس کو ہدایت یاب بنانا ان کی قدرت میں نہیں ہوتا نہ پیغمبران صفات کے حامل ہوتے ہیں جن سے متصف ہونا کافروں کے نزدیک ضروری ہے (مثلاً فرشتہ ہونا، کھانے پینے کا ضرورت مند نہ ہونا، کوئی عجیب مافوق الفطرت ہستی ہونا وغیرہ وغیرہ)۔

فَمَنْ اٰمَنَ وَاَصْلَحَ فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ۝ (پس جو لوگ ایمان لے آئے اور انہوں نے درستی کرلی (یعنی پیغمبروں کی پیش کردہ تعلیم کو سچا مان لیا اور جنت کی امید اور دوزخ کے خوف سے اپنے اعمال کی اصلاح کرلی) تو پھر نہ ان کو (عذاب کا) ڈر ہوگا نہ (ثواب کے فوت ہونے کا) غم)۔

وَالَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا (اور جن لوگوں نے ہماری (بشارت آفریں خوف آگیں) آیات کو جھوٹا قرار دیا)۔

يَمَسُّهُمُ الْعَذَابُ بِمَا كَانُوْا يَفْسُقُوْنَ ۝ (تو (ایمان و اطاعت کے دائرہ سے) خارج ہونے کی وجہ سے ان کو عذاب لگے گا)۔ چھونا اور لگنا تو زندگی کی علامت ہے گویا عذاب بھی ایک زندہ چیز ہوگا جو کافروں سے جس طرح چاہے گا آلگے گا۔ بِمَا كَانُوْا میں مَا مصدری ہے۔

قُلْ لَّآ اَقُوْلُ لَكُمْ عِنْدِيْ خَزَآئِنُ اللّٰهِ (آپ کہہ دیجئے میں تم سے یہ نہیں کہتا کہ میرے پاس اللہ کے خزانے ہیں) یعنی جن چیزوں پر اللہ کو خصوصی قدرت حاصل ہے وہ میرے قبضہ میں ہیں یا اس کے رزق کے خزانے میرے پاس ہیں۔

وَلَآ اَعْلَمُ الْغَيْبَ (اور نہ میں یہ کہتا ہوں کہ میں غیب جانتا ہوں) یعنی وہ (گزشتہ اور آئندہ چیزیں) جن کی وحی سے مجھے اطلاع نہیں دی گئی ان کو جاننے کا میں دعویٰ نہیں کرتا۔ لَا زائد ہے اس کا عطف عِنْدِيْ خَزَآئِنُ اللّٰهِ پر ہے۔

وَلَآ اَقُوْلُ لَكُمْ اِنِّيْ مَلَكٌ ۚ (اور نہ تم سے یہ کہتا ہوں کہ میں فرشتہ ہوں) کہ میرا کھانا پینا اور نکاح کرنا میرے دعویٰ کے خلاف ہو، مطلب یہ کہ میں تم سے کوئی ایسی بات نہیں کہتا جس کا عقلاً انکار ضروری ہو اور جو طلب دلائل کا محتاج ہو۔

اِنْ اَتَّبِعُ اِلَّا مَا يُوْحٰٓى اِلَيَّ ۚ (میں تو (تعلیم و تبلیغ میں) بس اسی کا اتباع کرتا ہوں جس کی وحی میرے پاس آتی ہے)۔ یعنی میں صرف نبوت کا دعویٰ کرتا ہوں اور انہی امور کے درپے ہوں جن کے درپے دوسرے انبیاء تھے اور اس میں کوئی عقلی استحالہ نہیں۔ یہ بات عقلاً درست ہے گزشتہ انبیاء کی خبریں اس سلسلہ میں متواتر پہنچ چکی ہیں۔ مشرکوں نے رسول اللہ ﷺ کے دعوئے نبوت کو بعید از عقل سمجھا تھا اور حضور ﷺ کے دعوے کے ناممکن ہونے کا ان کو یقین تھا۔ اس آیت میں ان کے خیال کی تردید فرمادی۔

بغویؒ نے اس آیت کی تشریح میں کہا ہے کہ مشرکوں نے جب (اندھا دھند) معجزات کی طلب کی تو ان آیات کا نزول ہوا۔ مطلب یہ ہے آپ ان سے کہہ دیجئے کہ میں یہ دعویٰ نہیں کرتا کہ اللہ کے خزانے میرے قبضہ میں ہیں یہاں تک کہ میں کوہ صفا کو سونے کا بنادوں اور جو کچھ تم چاہتے ہو وہ تم کو دے دوں نہ میں غیب دانی کا مدعی ہوں کہ گزشتہ و آئندہ کی باتیں بغیر اللہ کی وحی کے تم کو بتادوں نہ خود فرشتہ ہونے کا میرا دعویٰ ہے کہ مجھے کھانے پینے اور نکاح کرنے کی ضرورت نہ ہو میں تو بس اسی پر چلتا ہوں جو وحی سے میرے پاس آیا ہے۔

قُلْ هَلْ يَسْتَوِي الْاَعْمٰى وَالْبَصِيْرُ ۭ (آپ کہئے کہ کیا اندھے اور انکھیارے برابر ہوسکتے ہیں) اندھا (کافر) حق و باطل میں امتیاز نہیں کرتا، ممکن الانکار چیز کا انکار کرتا ہے اور ناممکن التصدیق بات کی تصدیق کرتا ہے اور انکھیارا (یعنی سچا مومن) حق و باطل کی تمیز رکھتا ہے مدعی نبوت کے معجزات و آیات کی تصدیق کرتا ہے اور جو لوگ اللہ

کے سوا دوسروں کو معبود بنانے اور بتوں کو دربارِ خداوندی میں اپنا سفارشی ماننے اور فرشتوں کو اللہ کی بیٹیاں قرار دینے اور سائبہ کو بغیر کسی دلیل کے حرام کہتے ہیں ان کی اس خرافات کی یہ انکار آدمی تکذیب کرتا ہے (اور ان سب بیہودہ باتوں کو غلط کہتا ہے)

أَفَلَا تَتَفَكَّرُونَ ﴿۵۰﴾ (تو کیا تم غور نہیں کرتے) کہ حق و باطل میں تمیز کرنے اور واجب التصدیق و واجب الانکار امور میں فرق کرنے کا راستہ تم کو مل جائے۔

وَأَنذِرْ بِهِ الَّذِينَ يَخَافُونَ أَن يُحْشَرُوا إِلَىٰ رَبِّهِمْ (اور اس سے ایسے لوگوں کو ڈراؤ جو اس بات سے اندیشہ رکھتے ہیں کہ اپنے رب کے پاس جمع کئے جائیں گے)۔

چونکہ الَّذِينَ کے بعد يَخَافُونَ أَن يُحْشَرُوا آیا ہے (جس سے معلوم ہو رہا ہے کہ انہی لوگوں کو خوف دلانے کا حکم ہے جن کو اندیشہ حشر بصورت یقین یا بطور تردد لگا ہوا ہے) اس لئے بیضاوی نے لکھا ہے کہ الَّذِينَ سے مراد یا تو وہ مؤمن ہیں جن سے عمل میں کچھ کوتاہی ہو رہی ہے یا وہ لوگ مراد ہیں جن کو حشر کا اقرار ہو، خواہ وہ مؤمن ہوں یا کافر کتابی یا حشر ہونے نہ ہونے میں تردد رکھنے والے ہوں۔ غرض وہ لوگ مراد نہیں ہیں جن کو حشر کے نہ ہونے کا یقین ہو کیونکہ اس آخری گروہ کو ڈرانا بے سود ہے اور باقی اقسام کو ڈرانا سودمند ہو سکتا ہے۔

بیضاوی کی یہ تشریح غلط ہے انذار کا حکم عمومی ہے اللہ نے اپنے پیغمبر کو یہ کہنے کا حکم دے دیا ہے کہ أُوحِيَ إِلَيَّ هَٰذَا الْقُرْآنُ لِأُنذِرَكُم بِهِ وَمَن بَلَغَ۔ عمل میں کوتاہی کرنے والے مؤمنوں کی انذار کے لئے کوئی خصوصیت نہیں۔ عمل کی انتہائی کوشش کرنے والے مؤمنوں کے لئے بھی انذار مفید ہے تاکہ انذار کے بعد وہ اجتہاد اور کوشش میں غفلت نہ کریں۔ ویسے دور رسالت میں سب ہی سعی عمل میں منہمک تھے کوئی بھی کوتاہی کرنے والا نہ تھا لہٰذا الَّذِينَ سے مراد سب لوگ ہیں۔ بندہ عاجز کو اپنے خالق قوی سے ڈرنا ہی چاہئے یا یوں کہا جائے کہ آیت میں حشر سے ڈرنے والوں کا خصوصیت سے ذکر اس وجہ سے کیا کہ ڈرانے کا فائدہ انہی کو پہنچ سکتا ہے (جیسے هُدًى لِّلْمُتَّقِينَ میں اہل تقویٰ کا خصوصی ذکر اس لئے ہے کہ وہی ہدایت قرآنی سے فائدہ اٹھانے والے ہیں اگرچہ قرآن کی ہدایت عمومی ہے)۔

لَيْسَ لَهُم مِّن دُونِهِ وَلِيٌّ وَلَا شَفِيعٌ (کہ ان کے لئے اللہ کے سوا کوئی مددگار ہوگا نہ سفارشی)۔

یعنی حشر کی اس حالت سے ڈرتے ہیں کہ اللہ کے سوا کوئی ان کا حامی ہوگا نہ سفارشی۔ اس صورت میں پورا جملہ يُحْشَرُوا کی ضمیر سے حال ہوگا۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اس جملہ کا مضمون بِهِ کی ضمیر سے بدل ہو۔ اس وقت مطلب اس طرح ہوگا کہ قرآن کے ذریعہ سے حشر کا اندیشہ کرنے والوں کو اس طرح ڈراؤ کہ اللہ کے سوا ان کا نہ کوئی حامی ہوگا نہ سفارشی۔ لہٰذا اس کے سوا نہ کسی کی عبادت کریں نہ کسی اور کو مدد کے لئے پکاریں۔ اس آیت میں بظاہر شفاعت کی نفی ہے لیکن دوسری آیت میں باذن خداوندی شفاعت ہونے کا ثبوت موجود ہے (اسی طرح مؤمنوں کے لئے مؤمنوں کا حامی ہونا بھی مذکور ہے) اس لئے مثبتین شفاعت (یعنی اہل سنت) کی طرف سے کہا جائے گا کہ اللہ کے اذن کے بعد شفاعت ہونا بھی حقیقت میں اللہ ہی کی حمایت ہے (اور آیت میں نفی ولایت و شفاعت سے بلا اذن الٰہی ولایت و شفاعت کی نفی مراد ہے) یعنی اولیاء کی طرف سے ولایت و شفاعت جو اذن خداوندی کے بعد ہوگی اس کی نفی آیت میں نہیں ہے۔

لَّعَلَّهُمْ يَتَّقُونَ ﴿۵۱﴾ (اس امید پر کہ وہ ڈر جائیں) حضرت مفسر نے لعل کا ترجمہ تاکہ کیا ہے۔ امام احمد طبرانی اور ابن ابی حاتم نے حضرت ابن مسعودؓ کا بیان نقل کیا ہے کہ ایک مرتبہ قریش کے کچھ سردار رسول اللہ ﷺ کی طرف سے گزرے اس وقت حضرت خبابؓ، حضرت صہیبؓ، حضرت بلالؓ اور حضرت عمارؓ حضور ﷺ کی خدمت میں موجود تھے۔ سرداران قریش کہنے لگے محمد ﷺ تم نے انہی لوگوں کا انتخاب کیا ہے کیا اللہ نے ہم لوگوں میں سے انہی کو اپنی نعمت سے سرفراز کیا ہے اگر تم ان کو اپنے پاس سے نکال دو گے تو ہم آپ کے ساتھ ہو جائیں گے اس پر وَأَنذِرْ بِهِ سے سَبِيلُ الْمُجْرِمِينَ تک آیات کا

نزول ہوا۔

ابن حبان اور حاکم نے حضرت سعد بن وقاصؓ کا بیان نقل کیا۔ حضرت سعدؓ نے فرمایا یہ آیت چھ آدمیوں کے حق میں نازل ہوئی، میں اور عبداللہ بن مسعودؓ اور چار دوسرے لوگ۔ کفار قریش نے رسول اللہ ﷺ سے عرض کیا تھا ان لوگوں کو نکال دو تو ہم آپ کے پیرو ہو جائیں گے، ہم کو ان کی طرح تمہارا پیرو ہونے میں شرم آتی ہے (یعنی ہم ان لوگوں کے ساتھ آپ کے پاس نہیں بیٹھ سکتے) حضور ﷺ کے دل میں بھی اس بات کا کچھ خیال آیا اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔ مسلم کی روایت بالفاظ ذیل ہے ہم چھ آدمی رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر تھے، میں، ابن مسعودؓ اور قبیلہ ہذیل کا ایک شخص اور بلال اور دو آدمی اور جن کے نام میں بھول گیا۔ ہم کو حضورؐ کی صحبت میں دیکھ کر مشرکوں نے کہا ان کو اپنے پاس سے ہٹا دو تاکہ ہمارے دو قار میں فرق نہ آئے حضور ﷺ کے دل میں بھی اس سے کچھ خیال آیا اور آپ نے کچھ سوچا۔ اس پر آیت ذیل نازل ہوئی۔

وَلَا تَطْرُدِ الَّذِينَ يَدْعُونَ رَبَّهُمْ بِالْغَدٰوةِ وَالْعَشِيِّ ﴿ اور جو لوگ صبح و شام اپنے رب کو پکارتے ہیں ان کو اپنے پاس سے نہ نکالو۔ پکارنے سے مراد ہے عبادت اور ذکر کرنا۔ کریم کی عبادت اور یاد سے اس کے انعام کا فیضان مزید ہوتا ہے۔ بعض علماء کے نزدیک پکارنے سے مراد ہے دعاء کرنا۔ حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا، صبح و شام پکارنے سے مراد ہے فجر اور عصر کی نماز۔

ایک روایت میں حضرت ابن عباسؓ کی طرف اس قول کی بھی نسبت کی گئی ہے کہ پانچوں نمازیں مراد ہیں کیونکہ کچھ غریب مسلمان رسول اللہ ﷺ کے ساتھ تھے اس پر کچھ بڑے لوگوں نے کہا کہ جب ہم نماز میں شریک ہوں تو ان لوگوں کو آپ پیچھے کر دیا کریں یہ ہمارے پیچھے ہو کر نماز پڑھیں اس وقت یہ آیت نازل ہوئی۔

يُرِيدُونَ وَجْهَهُ ﴿ (جو خاص اس کی رضامندی چاہتے ہیں)۔

یعنی خلوص دل سے اللہ کی عبادت کرتے ہیں۔ تمام کاموں کا مدار اخلاص پر ہے اور جب خلوص کے ساتھ وہ اللہ کی عبادت کرتے ہیں تو ایسے عبادت گزاروں کی عزت کی جائے، نکالا نہ جائے [1]

مَا عَلَيْكَ مِنْ حِسَابِهِمْ مِنْ شَيْءٍ وَّمَا مِنْ حِسَابِكَ عَلَيْهِمْ مِنْ شَيْءٍ ﴿ (ان کا حساب ذرا بھی آپ کے متعلق نہیں اور نہ آپ کا حساب کچھ ان کے متعلق ہے)۔ مِنْ شَيْءٍ، مَا کا اسم ہے اور عَلَيْكَ خبر اور مِنْ حِسَابِهِمْ، عَلَيْكَ کی ضمیر سے حال ہے۔ مقصد یہ ہے کہ اپنی مجلس سے نکالنا اور ہم نشینی ترک کرنا اس وقت جائز بلکہ ضروری ہو جاتا ہے اگر ہم نشینی سے دونوں میں سے کسی کا ضرر ہوتا ہو۔ اگر آپس میں کسی کا نقصان نہ ہوتا ہو تو مجالست ترک کرنا واجب نہیں اور ان لوگوں کی ہم نشینی سے تو نہ آپ کا کوئی ضرر ہے نہ ان کا، بلکہ دونوں کا فائدہ ہے۔ آپ کی صحبت میں بیٹھ کر یہ نیکیاں کریں گے اور راست کی نیکیوں کا ثواب پیغمبر کو ملتا ہی ہے اور ان کو اپنی صحبت میں بٹھا کر آپ راہ راست بتاتے اور ہدایت کرتے رہیں گے اس سے ان کو فائدہ پہنچے گا۔ اس مطلب پر یہ پورا جملہ حقیقہ آئندہ سے حال ہوگا۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ حِسَابِهِمْ اور عَلَيْهِمْ کی ضمیر مشرکوں کی طرف راجع ہو۔ اس وقت مطلب اس طرح ہوگا مشرکوں کے اعمال کا آپ سے کوئی مواخذہ نہ ہوگا نہ آپ کے اعمال کی ان سے حساب فہمی، پھر ان کے مسلمان ہونے کے لالچ میں موجود مسلمانوں کو اپنے پاس سے نکالنا درست نہیں اور زیبا نہیں۔

[1] حکم مرتب کا مسلمہ ضابطہ ہے جس کی صراحت امام عبدالقاہر نے اپنی کتابوں میں کی ہے اور صاحب مطول نے بھی اس کو نقل کیا ہے کہ اگر کسی حکم کو کسی وصف پر مرتب کیا جائے تو وہ وصف اس حکم کی علت ہوتا ہے جیسے اپنے باپ سے اور استاد سے اچھا سلوک کرو۔ اچھا سلوک کرنے کی علت سجادہ دست ہونا ہے۔ اسی ضابطہ کی طرف حضرت مفسر نے اشارہ کیا ہے کہ اخراج کی ممانعت جن لوگوں سے متعلق کی گئی ہے ان کو مخصوص وصف بھی ذکر کر دیا ہے کہ وہ خلوص کے ساتھ عبادت کرتے ہیں یعنی اخلاص کے ساتھ عبادت کرنا ممانعت اخراج کی علت ہوئی خلوص کے ساتھ عبادت کرنے کا تقاضا عزت ہے نہ کہ اخراج۔ ۱۲

فَتَطْرُدَهُمْ (کہ مسلمانوں کو آپ اپنے پاس سے نکالیں) یہ نفی کا جواب ہے اسی لئے منصوب ہے۔
فَتَكُوْنَ مِنَ الظّٰلِمِيْنَ ﴿۵۲﴾ (اور ظالموں میں سے ہو جائیں) (یہ ترجمہ اس وقت ہوگا جب فتکون کا عطف تطردہم
پر قرار دیا جائے اور اگر یہ نہی کا جواب ہے (جیسا کہ حضرت مفسر نے صراحت کی ہے تو ترجمہ اس طرح ہوگا ان کو اپنے پاس سے
نہ نکالو ورنہ ظالموں میں سے ہو جاؤ گے)۔
وَكَذٰلِكَ فَتَنَّا بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ (اور اسی طور پر ہم نے ایک کو دوسرے کے ذریعہ سے آزمائش میں
ڈال رکھا ہے) کذلک میں کاف اسی طرح زائد ہے جس طرح لَيْسَ كَمِثْلِهٖ شَيْءٌ میں۔ ذلک سے اشارہ سرداران
قریش کی گمراہی کی جانب ہے اور فتنا کا مفعول مطلق ہے۔ بعضہم سے مراد ہیں کفار قریش اور ببعض سے مراد ہیں فقراء
اہل اسلام جن کی موجودگی اور حاضر باشی سرداران قریش کے اسلام نہ لانے کا سبب تھی۔ ببعض اصل میں ببعضہم تھا (یعنی
تنوین مضاف الیہ کے قائم مقام ہے)۔
علامہ تفتازانی نے لکھا ہے کہ اس جگہ کذلک فتنا (اور اسی طرح دوسرے مقامات پر لفظ کذلک) اگرچہ تشبیہ کا ہے
لیکن تشبیہ مراد نہیں بلکہ یوں کہا جائے کہ آیت کا معنی اس طرح ہے کہ وہ گمراہی جس میں ہم نے قریش کے سرداروں کو مبتلا کیا
ویسی ہی تھی جیسے گزشتہ امتوں میں ہے۔ ہم نے بعض کو بعض کی گمراہی کا سبب بنایا تھا مثلاً قوم نوح نے کہا تھا مَا نَرٰىكَ اِلَّا بَشَرًا
مِّثْلَنَا وَمَا نَرٰىكَ اتَّبَعَكَ اِلَّا الَّذِيْنَ هُمْ اَرَاذِلُنَا بَادِيَ الرَّاْيِ اور حضرت نوح نے ان کے جواب میں فرمایا وَمَآ اَنَا بِطَارِدِ
الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا (اس تفسیر پر بعضہم ببعض سے گزشتہ اقوام مراد ہیں اور سرداران قریش کی گمراہی کو گزشتہ اقوام کی گمراہی
سے تشبیہ دی گئی ہے۔ جو مطالبہ سرداران قریش نے کیا تھا وہی مطالبہ گزشتہ انبیاء کی بعض امتوں نے کیا تھا اور جس سبب سے
سرداران قریش گمراہ ہوئے اسی سبب سے بعض اقوام گزشتہ کے سردار گمراہ ہوئے)۔
بیضاوی نے آیت کی جو تشریح کی ہے اس کا خلاصہ یہ ہے کہ ذلک سے اشارہ دنیوی آزمائش کی طرف ہے اور فتنا سے
مراد ہے دینی ابتلاء یعنی جیسے ہم نے دنیوی معاملات میں لوگوں کو مختلف کر کے آزمائش کی ہے کسی کو فقیر بنایا اور کسی کو امیر اسی
آزمائش کی طرح ہم نے دینی امور میں بھی لوگوں کو امتحان میں ڈالا ہے اور بعض کو بعض کی آزمائش کا سبب بنایا ہے، چنانچہ
کمزوروں کی سابقیت الی الایمان بنا کر سرداروں پر ان کو برتری عطا کی (اور یہی فضل سرداروں کی گمراہی کا سبب بن گیا)
لِيَقُوْلُوْٓا اَهٰٓؤُلَآءِ مَنَّ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ مِّنْۢ بَيْنِنَا (تاکہ یہ لوگ کہا کریں کہ کیا یہی لوگ ہیں کہ ہم سب
میں سے اللہ تعالیٰ نے ان پر زیادہ فضل کیا ہے)۔ یقولوا کا فاعل اغنیاء ہے اور ھٰؤلاء سے اشارہ فقراء مسلمین کی جانب ہے۔
انعام سے مراد ہے ہدایت اور توفیق ایمان۔ اَھٰؤلاء میں استفہام انکاری ہے یعنی اغنیاء نے اس امر کا انکار کیا کہ فقراء کو قبول حق
کی توفیق مل جائے اور وہ خیر کی جانب اغنیاء سے آگے بڑھ جائیں۔ حاصل مطلب یہ ہے کہ اگر اسلام حق ہوتا تو ہم اس کی طرف
فقراء سے پیش قدمی کرتے اور وہ ہم سے آگے نہ بڑھ سکتے۔
اَلَيْسَ اللّٰهُ بِاَعْلَمَ بِالشّٰكِرِيْنَ ﴿۵۳﴾ (کیا اللہ شکر گزاروں سے بخوبی واقف نہیں ہے) یعنی جن لوگوں کے
اندر شکر گزار ہونے کی استعداد ہے جس کی وجہ سے اللہ ان کو شکر گزاری کی توفیق عطا فرما دیتا ہے اور جن لوگوں کے اندر
ایمان اور شکر گزاری کی صلاحیت نہیں ہے جس کی وجہ سے اللہ ان کو توفیق ایمان نہیں دیتا کیا ان دونوں گروہوں سے اللہ
واقف نہیں ہے۔

یہ آیت (اس تفسیر کی روشنی میں) دلالت کر رہی ہے کہ (خیر و شر کی) استعداد وجود سے پہلے ہوتی ہے۔ حضرت مجدد
الف ثانی نے اسی لئے فرمایا تھا کہ تعینات اہل ایمان کے مبادی اللہ کے اسم ہادی کا پرتو ہیں اور تعینات کفار کے مبادی اللہ کے
اسم مضل کا پرتو (یعنی توفیق ایمان ہو یا ضلالت توفیق دونوں اللہ کی صفات کے پرتو ہیں۔ جس پر اللہ کے اسم ہادی کا پرتو پڑ گیا
وہ ہدایت یافتہ ہو گا اور جس پر اللہ کے اسم مضل کا پرتو پڑ گیا وہ گمراہ ہو گیا) اصل جس چیز سے اور جس غرض کے لئے جس کو پیدا

کیا گیا ہے اس سے تجاوز نا ممکن ہے۔
آیت کا مطلب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ یہ رذیل فقیر اس قابل ہیں کہ ہم کو تو صحبت رسول حاصل نہ ہو اور صرف ان کو صحبت رسول ﷺ کی نعمت دے کر اللہ سربلند کرے (ایسا نہیں ہو سکتا) اس خیال کو دور کرنے کے لئے اللہ نے فرمایا کیا اللہ شکر گزاروں کو نہیں جانتا یعنی جو شکر گزار ہیں وہی رسول اللہ ﷺ کی ہم نشینی کے مستحق ہیں۔ اغنیاء شکر گزار نہیں ہیں اس لئے ان کو صحبت رسول ﷺ کا استحقاق بھی نہیں ہے۔

بغویؒ کا بیان ہے کہ حضرت سلمانؓ اور حضرت خباب بن الارتؓ نے فرمایا اس آیت کا نزول ہمارے سلسلہ میں ہوا۔ اقرع بن حابس تمیمی، عیینہ بن حصن فزاری اور بعض دوسرے لوگ جو مولفۃ القلوب (مسلمانوں) میں سے تھے رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے، اس وقت حضور ﷺ کے پاس بلال، صہیب، عمار، خباب اور کچھ اور کمزور مسلمان بیٹھے ہوئے تھے۔ آنے والوں نے ان بے چاروں (غریبوں) کو دیکھ کر تحقیر کی نظر سے دیکھا اور عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ اگر آپ صدر مقام پر تشریف فرما ہوں اور ان لوگوں کو اور ان کے لباس کی بدبو کو اپنے پاس سے ہٹا دیں تو ہم آپ کے پاس بیٹھیں گے اور آپ سے کچھ حاصل کریں گے۔ ان غریب مسلمانوں کے کوئی جبے تھے جن سے پسینہ کی وجہ سے بدبو پھیل رہی تھی۔ حضور ﷺ نے فرمایا میں اہل ایمان کو اپنے پاس سے نہیں نکال سکتا۔ کہنے لگے اچھا تو ہمارے لئے الگ جگہ مقرر کر دیجئے کہ (آنے والے) عرب ہماری بڑائی کو پہچان لیں کیونکہ آپ کے پاس عربوں کے وفد آتے رہتے ہیں ہمیں ان کے سامنے ان غلاموں کے ساتھ بیٹھتے شرم آتی ہے۔ ہم جب آپ کے پاس آیا کریں تو آپ ان کو اٹھوا دیا کریں اور جب ہم فارغ ہو کر چلے جائیں تو آپ کو اختیار ہے آپ پھر ان کو اپنے پاس بٹھا لیا کریں۔ حضور ﷺ نے کاغذ طلب فرمایا اور حضرت علیؓ کو بلایا۔ راوی کا بیان ہے ہم ایک گوشہ میں بیٹھے ہوئے ہی تھے (اور تحریر لکھنے نہ پائے تھے) کہ جبرئیل آیت وَلَا تَطْرُدِ الَّذِيْنَ ..... بِالشّٰكِرِيْنَ تک لے کر نازل ہوئے۔ حضور ﷺ نے فوراً دست مبارک سے کاغذ پھینک دیا اور ہم کو طلب فرمایا ہم خدمت میں پہنچے تو آپ پڑھ رہے تھے سَلٰمٌ عَلَيْكُمْ كَتَبَ رَبُّكُمْ عَلٰى نَفْسِهِ الرَّحْمَةَ چنانچہ ہم حضور ﷺ کے پاس برابر بیٹھتے رہے۔ جب حضور ﷺ اٹھنے کا ارادہ کرتے تو خود اٹھ جاتے اور ہم کو بیٹھے چھوڑ جاتے۔ اس پر اللہ نے نازل فرمایا وَاصْبِرْ نَفْسَكَ مَعَ الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ رَبَّهُمْ بِالْغَدٰوةِ وَالْعَشِيِّ يُرِيْدُوْنَ وَجْهَهٗ۔ اس کے بعد (جب بڑے سرداروں کے آنے پر بھی) حضور ﷺ ہمارے پاس بیٹھے رہتے اور ہم آپ کے قریب بیٹھتے۔ ہمارے زانو حضور ﷺ کے زانو سے چھوتے تھے۔ پھر جب حضور ﷺ کے اٹھنے کا وقت آجاتا تو ہم خود اٹھ جاتے اور حضور ﷺ نے ہم سے فرمایا تھا اللہ کا شکر ہے کہ مرنے سے پہلے اس نے مجھے حکم دے دیا کہ میں اپنی امت کی ایک جماعت کے ساتھ بیٹھا کروں۔ تمہارے ہی ساتھ میرا مرنا جینا ہے۔ کلبی نے کہا اقرعؓ اور عیینہ وغیرہ نے عرض کیا تھا آپ ایک دن ہمارے لئے اور ایک دن ان کے لئے مقرر فرما دیجئے۔ حضور ﷺ نے فرمایا میں ایسا نہیں کر سکتا۔ کہنے لگے اچھا تو مجلس ایک ہی رکھئے مگر ہماری طرف کو منہ اور ان کی طرف کو پشت رکھئے اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔

بغوی نے جو واقعہ حضرت خبابؓ اور حضرت سلمانؓ کی روایت سے نقل کیا ہے وہی واقعہ ابن جریر اور ابن ابی حاتم وغیرہ نے (صرف) حضرت خبابؓ کی روایت سے بیان کیا ہے اس میں اتنا زائد ہے کہ پھر اللہ نے اقرعؓ اور اس کے ساتھی کا تذکرہ فرمایا اور ارشاد فرمایا وَكَذٰلِكَ فَتَنَّا بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ الخ شیخ ابن کثیر نے لکھا ہے یہ روایت غریب ہے کیونکہ یہ آیت تو مکی ہے اور اقرعؓ و عیینہ ہجرت سے بہت مدت کے بعد مسلمان ہوئے تھے۔

بغوی نے اپنی سند سے بیان کیا ہے کہ حضرت ابو سعید خدریؓ نے فرمایا، میں مہاجروں کی ایک جماعت میں بیٹھا ہوا تھا برہنگی کی وجہ سے بعض لوگ بعض کی آڑ پکڑے ہوئے تھے اور ایک قاری پڑھ رہا تھا کہ رسول اللہ ﷺ تشریف لے آئے اور آکر کھڑے ہو گئے۔ حضور ﷺ کو کھڑا دیکھ کر قاری چپ ہو گیا آپ نے سلام کیا اور فرمایا تم کیا کر رہے تھے۔ ہم نے عرض کیا یا

عَمِلَ سے حال ہے اور مفعول محذوف ہے یعنی بداعمالی کے ضرر رساں نتائج آفریں نتیجہ کو نہ جاننے کی حالت میں جس نے کوئی برا کام کیا یا بِجَهَالَةٍ کا معنی ہے مُتَجَاهِلًا یعنی جس کسی نے کوئی برا کام جاہلانہ طور پر کر لیا۔ مطلب یہ ہے کہ خواہشات نفس کے غلبہ کی وجہ سے اس کا طور طریقہ جاہلانہ ہو گیا اور پھر جاہلانہ طور پر اس نے کوئی برا عمل کر لیا اور کرنے کے بعد اس کو پشیمانی ہو گئی اور آئندہ نہ کرنے کا اس نے پختہ ارادہ کر لیا اور اپنے اعمال کو درست کر لیا تو اس کے لئے اللہ غفور رحیم ہے۔ آیت دلالت کر رہی ہے کہ توبہ مغفرت گناہ کا سبب ہے۔

وَكَذٰلِكَ نُفَصِّلُ الْاٰيٰتِ (اور اسی طرح ہم آیات کو الگ الگ کر کے بیان کرتے رہتے ہیں)۔

یعنی جس طرح ہم نے اس سورت میں آیات کی تفصیل کی، اسی طرح ہم قرآن کی آیات الگ الگ کھول کر بیان کرتے ہیں یا آیات سے مراد ہیں دلائل حق جو منکرین حق کے سامنے بیان کی جاتی ہیں۔

وَلِتَسْتَبِيْنَ سَبِيْلُ الْمُجْرِمِيْنَ (تاکہ راہ مستقیم معلوم ہو جائے اور مجرموں کی راہ نمایاں ہو جائے) اس کا عطف محذوف جملہ پر ہے پورا کلام اس طرح تھا ہم آیات بیان کرتے ہیں تاکہ راہ مستقیم واضح ہو جائے اور مجرموں کا راستہ کھل کر سامنے آجائے۔

قُلْ اِنِّيْ نُهِيْتُ (آپ کہہ دیجئے مجھے ممانعت کر دی گئی ہے) یعنی مجھے عقلی دلائل و براہین اور قرآنی آیات و احکام کے ذریعے سے باز داشت کر دی گئی ہے، پھیر دیا گیا ہے۔

اَنْ اَعْبُدَ الَّذِيْنَ تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ (کہ ان کی پرستش کروں جن کو اللہ کے علاوہ تم معبود قرار دیتے اور ان کی عبادت کرتے اور ان کو الٰہ کہتے ہو۔

قُلْ لَّآ اَتَّبِعُ اَهْوَآءَكُمْ (آپ کہہ دیجئے کہ میں تمہاری خواہشات کی پیروی نہیں کروں گا)۔ اس جملہ میں کافروں کی امید کو پرزور طریقہ سے قطع کر دیا گیا اور اس بات کو واضح کر دیا گیا کہ جن خیالات پر تم چل رہے ہو ان کے لئے نہ کوئی عقلی دلیل ہے نہ نقلی ثبوت، محض خواہش نفس کی پیروی ہے اس میں ترک اتباع کی علت کا بھی اظہار فرما دیا اور طالب کو راہ حق کی توجیہ بھی کر دی کہ دلیل و برہان واجب الاتباع ہے اور (بے ثبوت) تقلید ناجائز۔

قَدْ ضَلَلْتُ اِذًا (کیونکہ اس حالت کی تو میں بے راہ ہو جاؤں گا)۔ یعنی اگر میں تمہاری خواہشات پر چلا تو گمراہ ہو جاؤں گا۔

وَّمَآ اَنَا مِنَ الْمُهْتَدِيْنَ ۝ (اور ہدایت یافتہ گروہ میں سے نہ ہوں گا) اس میں در پردہ تنبیہ ہے کہ تم ہدایت یافتہ گروہ میں شامل نہیں ہو۔

قُلْ اِنِّيْ عَلٰى بَيِّنَةٍ مِّنْ رَّبِّيْ (آپ کہہ دیجئے کہ میرے پاس تو ایک دلیل ہے میرے رب کی طرف سے)۔ مِنْ رَّبِّيْ، بَيِّنَةٍ کی صفت ہے۔ یعنی وہ دلیل جو میرے رب کی طرف سے مجھے ملی۔ یا مِنْ رَّبِّيْ، بَيِّنَةٍ کا صلہ ہے یعنی اپنے رب کی معرفت اور اس بات کا علم کہ اس کے سوا اور کوئی معبود نہیں ہے۔

سابق آیت میں اس (خواہش نفس) کا اظہار تھا جس کا اتباع ناجائز ہے اس آیت میں اس شئے کا بیان ہے جس کا اتباع لازم ہے یعنی دلیل و بصیرت۔

وَكَذَّبْتُمْ بِهٖ (اور تم اس کی تکذیب کرتے ہو) بِهٖ کی ضمیر بَيِّنَةٍ کی طرف راجع ہے کیونکہ بَيِّنَةٍ کا لفظ اگرچہ مؤنث ہے لیکن معنوی اعتبار سے مذکر ہے یعنی برہان۔ یا رب کی طرف راجع ہے یعنی تم میرے رب کی تکذیب کرتے ہو دوسروں کو (عبادت میں) اس کا شریک بناتے ہو۔

مَا عِنْدِيْ مَا تَسْتَعْجِلُوْنَ بِهٖ (جس چیز کے جلد آنے کی تم درخواست کر رہے ہو وہ میرے پاس نہیں)۔ مَا تَسْتَعْجِلُوْنَ بِهٖ سے مراد عذاب ہے، کیونکہ کافر کہتے تھے اِنْ كَانَ هٰذَا هُوَ الْحَقَّ مِنْ عِنْدِكَ فَاَمْطِرْ عَلَيْنَا حِجَارَةً

بیّنۃ السماویۃ یا آیتنا بعذاب (آیۃ) بقیامت مراد ہے اللہ نے فرمایا ہے یَسْتَعْجِلُ بِهَا الَّذِیْنَ لَا یُؤْمِنُوْنَ بِهَا۔

اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ عذاب میں تعجیل یا تاخیر اور قیامت کو لانے کے متعلق (حکم بس اللہ کے ہی اختیار میں ہے)۔

يَقُصُّ الْحَقَّ (اللہ واقعی بات بتا دیتا ہے)۔ یقص کا معنی ہے وہ بیان کرتا ہے، فرماتا ہے، تفصیل کرتا ہے۔ لیکن اگر اس لفظ کو قص اثرہ (اس کے نشان قدم پر چلا) سے ماخوذ قرار دیا جائے تو ترجمہ یہ ہوگا وہ حق کے ساتھ ہے حق کے پیچھے ہے۔

وَهُوَ خَيْرُ الْفٰصِلِيْنَ ﴿۵۷﴾ (وہی سب سے اچھا حاکم اور (حکم کو) ظاہر کرنے والا ہے)۔

قُلْ لَّوْ اَنَّ عِنْدِيْ مَا تَسْتَعْجِلُوْنَ بِهٖ (اے محمد ﷺ آپ کہہ دیجئے کہ بالفرض۔ اگر میری قدرت میں وہ عذاب اور قیامت کو لانا۔ جس کی تم جلدی مچا رہے ہو ہوتا)۔

لَقُضِيَ الْاَمْرُ بَيْنِيْ وَبَيْنَكُمْ (تو میرا اور تمہارا باہمی قصہ فیصل ہو چکا ہوتا)۔

یعنی عذاب آ جاتا اور تم ہلاک ہو چکے ہوتے اور میرا تمہارا جھگڑا ہی مٹ جاتا یہ مطلب ہے کہ آج ہی قیامت بپا ہو جاتی، حق و باطل کا فیصلہ ہو جاتا اور میرے تمہارے درمیان جھگڑے کا فیصلہ جو قیامت میں ہونے والا ہے وہ آج ہی طے ہو جاتا۔ اللہ نے فرمایا ہے ثُمَّ اِلَيْهِ مَرْجِعُكُمْ ثُمَّ يَحْكُمُ بَيْنَكُمْ فِيْمَا كُنْتُمْ فِيْهِ تَخْتَلِفُوْنَ اس آیت میں باہمی جھگڑا چکانے کا مبہم طور پر ذکر کر دیا گیا لیکن تعیین کے ساتھ یہ نہیں بتایا کہ عذاب میں مبتلا کون فریق ہوگا اس کی توضیح کے لئے آگے فرمایا۔

وَاللّٰهُ اَعْلَمُ بِالظّٰلِمِيْنَ ﴿۵۸﴾ (اور اللہ ظالموں (بے جا حرکات کرنے والے ناحق کوشوں یعنی کافروں) کو خوب جانتا ہے) یعنی انہی کو اپنی حکمت کے زیر اقتضاء تباہ کرے گا۔

وَعِنْدَهٗ مَفَاتِحُ الْغَيْبِ (اور غیب کے خزانے (یا کنجیاں) اللہ ہی کے قبضہ میں ہیں)۔ عِنْدَهٗ کی تقدیم مفید حصر ہے (یعنی اسی کے قبضہ میں ہیں کسی دوسرے کے اختیار میں نہیں ہیں)۔ مَفَاتِح جمع ہے اس کا واحد مَفْتَح (فتح میم) ہے جس کا معنی ہے خزانہ یا مِفْتَح (بکسر میم) واحد ہے جس کا معنی ہے ہر چیز کو کھولنے کا آلہ یعنی کنجی۔ مفاتح الغیب سے مراد ہے علم خداوندی جو ہر معلوم چیز تک پہنچنے (اور اس کی حقیقت کو پانے) کا ذریعہ ہے اور قبضہ میں ہونے کا معنی یہ ہے کہ اس کا علم ہر غیبی چیز کو اپنے احاطہ میں لئے ہوئے ہے گویا وہ غیبی چیز اس کے پاس موجود ہے۔

غیب وہ چیز ہے جو ابھی تک عالم وجود میں نہیں آئی جیسے قیامت کے احوال، بارش ہونا نہ ہونا اور کب ہونا، آدمی کا کل کو کیا کام کرنا، کس جگہ (اور کب) مرنا۔ یہ سب امور اسی قسم کی غیب میں داخل ہیں۔ غیب وہ چیز بھی ہے جو موجود تو ہو گئی مگر اللہ نے کسی کو اس سے واقف نہیں کیا جیسے شکم مادر میں کیا ہے (فرمایا ہو) آیت میں دونوں طرح کا غیب مراد ہے۔

بغوی نے حضرت ابن عمرؓ کی روایت سے لکھا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا مفاتح الغیب پانچ چیزیں ہیں جن کو سوائے اللہ کے اور کوئی نہیں جانتا۔ سوائے اللہ کے کوئی نہیں جانتا کہ رحم مادر کے اندر کیا ہے، سوائے اللہ کے کوئی نہیں جانتا کہ کل وہ کیا کرے گا، سوائے اللہ کے کوئی نہیں جانتا کہ بارش کب ہوگی، کوئی نہیں جانتا کہ وہ کس سرزمین میں مرے گا اور سوائے اللہ کے کوئی واقف نہیں کہ قیامت کب بپا ہوگی۔ امام احمد اور بخاری کی روایت بھی اسی طرح ہے۔ صحیحین میں حضرت ابوہریرہؓ کی روایت سے حضرت جبرئیل کے سوال کے سلسلہ میں آیا ہے کہ حضور ﷺ نے فرمایا ان پانچ چیزوں میں سے ہے جن کو اللہ کے سوا کوئی نہیں جانتا یعنی قیامت (بھی انہی امور میں سے ہے) اس کے بعد حضور ﷺ نے تلاوت فرمائی اِنَّ اللّٰهَ عِنْدَهٗ عِلْمُ السَّاعَةِ وَيُنَزِّلُ الْغَيْثَ الخ۔

میں کہتا ہوں کہ خزائن غیب انہی پانچ چیزوں میں محدود نہیں ہیں بلکہ جو چیز اب تک موجود نہیں ہوئی یا موجود ہو گئی مگر اللہ نے اس کا اظہار کسی پر نہیں کیا وہ خزائن غیب میں داخل ہے۔ ضحاک نے کہا مَفَاتِحُ الْغَيْبِ زمین کے خزانے ہیں اور نزول عذاب کا علم ہے۔ عطاء نے کہا مَفَاتِحُ الْغَيْبِ وہ ثواب و عذاب ہے جو تم سے پوشیدہ ہے۔ مَفَاتِحُ الْغَيْبِ کے متعلق

بعض اقوال دوسرے بھی آئے ہیں جیسے زندگی کی مدت کب ختم ہوگی، آدمی سعید ہے یا شقی، آدمی کا خاتمہ کس حالت پر ہوگا (وغیرہ) ہم نے جو تفسیر ذکر کر دی اس کی بناء پر ان تمام اقوال میں کوئی تعارض نہیں ہے۔

لَا يَعْلَمُهَآ اِلَّا هُوَ (ان کو اس کے سوا کوئی نہیں جانتا) پہلے مفاتح الغیب کو اللہ کے لئے محدود کیا گیا تھا مگر اجمالاً، اس آیت میں اس حصر کی صراحت کر دی گئی۔ ھَا کی ضمیر مغیبات کی طرف راجع ہے یعنی اللہ کے سوا ان غیبی امور کا علم کسی کو نہیں۔ وہی ان کے اوقات اور دیر میں یا جلدی آنے سے واقف ہے اور ان کی حکمت سے بھی وہی واقف ہے۔ ہاں اگر اللہ خود ہی کسی کو ان چیزوں کا کچھ علم عطا فرمادے تو دوسرا جان سکتا ہے۔ آیت دلالت کر رہی ہے کہ اللہ تمام چیزوں کو ان کے وجود سے پہلے ہی جانتا ہے۔

وَيَعْلَمُ مَا فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ (اور جو کچھ خشکی اور سمندر میں ہے اللہ اس سے واقف ہے) یعنی خشکی میں نباتات اور حیوانات وغیرہ اور سمندر میں حیوانات اور موتی مونگا وغیرہ جو کچھ ہے سب سے اللہ ہی واقف ہے۔

آیت بالا میں مغیبات کا ذکر تھا۔ اس آیت میں موجود محسوسات کا بیان ہے مطلب یہ ہے کہ دونوں قسم کی مخلوق اللہ کے علمی احاطہ کے اندر ہے۔

وَمَا تَسْقُطُ مِنْ وَّرَقَةٍ اِلَّا يَعْلَمُهَا (اور نہیں گرتی کوئی پتی مگر اللہ اس کو جانتا ہے)۔

مَا نفی کے لئے ہے اور مِنْ استغراق کے لئے۔ اس آیت میں پر زور طور پر بیان فرمایا کہ ہر ہر جزئی کو اللہ کا علم محیط ہے۔ مطلب یہ ہے کہ درختوں کی تمام پتیوں کی پوری تعداد اور نیچے گرنے سے پہلے اور بعد کے تمام احوال و کیفیات کو اللہ جانتا ہے۔

وَلَا حَبَّةٍ فِي ظُلُمٰتِ الْاَرْضِ وَلَا رَطْبٍ وَّلَا يَابِسٍ اِلَّا فِي كِتٰبٍ مُّبِيْنٍ ۝ (اور کوئی حبہ زمین کی اندھیریوں میں نہیں پڑتا اور نہ کوئی تر و خشک چیز گرتی ہے مگر یہ سب کتاب مبین میں ہیں)۔

حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا رَطْبٍ (سے مراد ہے) پانی اور یَابِسٍ (سے مراد ہے) صحرا۔ عطاء نے کہا پانی اور جامد مراد ہے۔ بعض کے نزدیک زندہ اور مردہ مراد ہے۔ وَلَا حَبَّةٍ اور وَلَا رَطْبٍ وَّلَا يَابِسٍ کا عطف وَرَقَةٍ پر ہے اور یہ سب نفی علم کے تحت مندرج ہیں۔ گویا یوں مطلب ہوا کہ ہر پتی کو ہر دانہ کو اور ہر تر و خشک کو اللہ جانتا ہے۔ اس صورت میں کِتٰبٍ مُّبِيْنٍ سے مراد ہوگا اللہ کا علم اور اِلَّا فِي كِتٰبٍ مُّبِيْنٍ استثناء اول سے بدل کل ہوگا۔ اور اگر کتاب مبین سے لوح محفوظ مراد ہوگی تو اِلَّا فِي كِتٰبٍ مُّبِيْنٍ بدل بعض ہو جائے گا۔ یا یوں کہا جائے کہ حَبَّةٍ کا عطف وَرَقَةٍ پر اور اِلَّا فِي كِتٰبٍ مُّبِيْنٍ کا عطف اِلَّا يَعْلَمُهَا پر ہے فعل ایک ہی ہے اور دو معمولوں کا دو معمولوں پر عطف ہے۔

وَهُوَ الَّذِيْ يَتَوَفّٰىكُمْ بِالَّيْلِ وَيَعْلَمُ مَا جَرَحْتُمْ بِالنَّهَارِ ثُمَّ يَبْعَثُكُمْ فِيْهِ (اور وہی ہے جو رات میں تمہاری روحوں کو (ایک گونہ) قبض کر لیتا ہے اور جو کچھ تم دن میں کرتے ہو اس کو جانتا ہے، پھر دن میں تم کو جگا اٹھاتا ہے)۔ تَوَفّٰی کا اصل (لغوی) معنی ہے کسی چیز کو پورے طور سے قبض کر لینا۔ تَوَفّٰی سے بطور استعارہ موت مراد ہوتی ہے۔ یہاں مراد نیند ہے کیونکہ نیند بھی ایک قسم کی وفات (موت) ہے۔ جَرَحَ ہاتھ پاؤں اور دوسرے اعضاء سے کوئی کام کرنا۔ آیت میں کام کرنے کا وقت دن کو اور سونے کا وقت رات کو قرار دیا کیونکہ عموماً دنیا میں ایسا ہی ہوتا ہے۔ اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ آدمی رات کو کام نہ کر سکے اور دن کو نہ سو سکے۔ پوری آیات میں تقدیم و تاخیر ہے۔ اصل کلام یوں ہے هُوَ الَّذِيْ يَتَوَفّٰىكُمْ بِالَّيْلِ ثُمَّ يَبْعَثُكُمْ بِالنَّهَارِ وَيَعْلَمُ مَا جَرَحْتُمْ چونکہ اعضاء سے کام کرنے کی اہمیت زائد تھی اس لئے بیدار ہو کے اٹھانے سے پہلے اس کا ذکر کیا۔

لِيُقْضٰٓى اَجَلٌ مُّسَمًّى (تاکہ میعاد معین تمام کر دی جائے) یعنی موت آنے کی میعاد معین، شکم مادر میں جب بچہ ہوتا ہے اسی وقت میعاد موت مقرر کر دی جاتی ہے بلکہ ازل میں ہی اس کی تعیین کر دی گئی ہے۔

ثُمَّ اِلَیْهِ (پھر اس کی طرف یعنی اس کے فیصلہ کی طرف)

مَرْجِعُكُمْ (تم سب کی (مرنے کے بعد) واپسی ہے)۔

ثُمَّ يُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ﴿۶۰﴾ (پھر (قیامت کے دن حساب کے وقت) تم کو ان اعمال پر آگاہ کرے گا جو تم کرتے تھے) اور ان اعمال کا بدلہ دے گا۔ سابق آیت میں علم کی ہمہ گیری پر تنبیہ کی گئی تھی اور اس آیت میں کمال قدرت کو ظاہر کیا گیا ہے۔ نیند موت کی جنس سے ہے سونے کے بعد اٹھانے سے دوبارہ جی اٹھنے کی دلیل کی جانب اشارہ ہے۔

وَهُوَ الْقَاهِرُ فَوْقَ عِبَادِهٖ (اور وہی اپنے بندوں پر غالب ہے)۔ فوقیت سے مراد ہے غلبہ اور برتری۔ قاہر اس غالب کو کہتے ہیں جس کا مقابلہ ممکن نہ ہو۔

وَيُرْسِلُ عَلَيْكُمْ حَفَظَةً حَتّٰٓى اِذَا جَآءَ اَحَدَكُمُ الْمَوْتُ تَوَفَّتْهُ رُسُلُنَا وَهُمْ لَا يُفَرِّطُوْنَ ﴿۶۱﴾ (اور وہی تم پر نگرانی کرنے والے بھیجتا ہے یہاں تک کہ جب تم میں سے کسی کو موت آپہنچتی ہے تو ہمارے بھیجے ہوئے اس کی روح قبض کر لیتے ہیں اور (اپنے فرض کی ادائیگی میں) وہ کوتاہی نہیں کرتے)۔ حَفَظَةً سے مراد ہیں نامہائے اعمال میں اعمال کا اندراج کرنے والے اور لکھنے والے تاکہ قیامت کے دن ان اعمال ناموں کو کھولا جائے اور نافرمان و فرماں بردار کا سب کے سامنے ظہور ہو جائے۔

حَتّٰى سے ارسال حَفَظَة کے غرض ظاہر کی گئی ہے یا غلبہ کا نتیجہ۔ ابن ابی حاتم اور ابن ابی شیبہ نے حضرت ابن عباسؓ کا قول نقل کیا ہے کہ رُسُلُنَا سے مراد ہیں ملک الموت کے مددگار فرشتے۔ ابو الشیخ نے نخعی کی روایت سے بھی یہی نقل کیا ہے۔ سیوطی نے وہب بن منبہ کا قول نقل کیا ہے کہ جو فرشتے انسان کے قریب رہتے ہیں وہی اس کی اجل کو بھی لکھتے ہیں اور جب موت کا وقت آجاتا ہے تو وہی روح کو لے کر ملک الموت کے سپرد کر دیتے ہیں (گویا اعمال نامے لکھنے والے ملک الموت کے ماتحت ہوتے ہیں) گویا ملک الموت اس تحصیلدار کی طرح ہے کہ اس کے ماتحت زکوٰۃ کی رقم وصول کر کے اس کے سپرد کر دیتے ہیں۔

ابن حبان اور ابو الشیخ کا بیان ہے کہ ربیع بن انسؓ سے دریافت کیا گیا کیا ملک الموت تنہا تمام روحوں کو قبض کرتا ہے؟ ربیع نے کہا روحوں کا ذمہ دار تو تنہا ملک الموت ہے مگر اس کے مددگار اور کارندے ہیں اور سب کا سردار ملک الموت ہے اور فرشتہ موت کا ایک قدم مشرق سے مغرب تک کا ہوتا ہے۔ دریافت کیا گیا مومنوں کی روحیں کہاں رہتی ہیں؟ ربیع نے جواب دیا سدرۃ المنتہی کے پاس۔ قرطبی نے کہا ان تینوں آیات میں کوئی تعارض نہیں ہے ایک آیت ہے تَوَفَّتْهُ رُسُلُنَا دوسری آیت میں يَتَوَفّٰىكُمْ مَّلَكُ الْمَوْتِ الَّذِيْ وُكِّلَ بِكُمْ تیسری آیت ہے اَللّٰهُ يَتَوَفَّى الْاَنْفُسَ۔ اول آیت میں قابض ارواح رسل کو قرار دیا ہے اور دوسری آیت میں ملک الموت کو اور تیسری آیت میں قبض ارواح کی نسبت خود اللہ نے اپنی طرف کی ہے کیونکہ قبض روح کرنے والے اور جان کھینچنے والے تو فرشتے ہیں جو ملک الموت کے مددگار ہیں اور روحوں پر قبضہ رکھنے والا ملک الموت ہے جان کھینچنے کا کام مددگار کرتے ہیں اور قبضہ ملک الموت کا ہوتا ہے اور حقیقی فاعل اللہ ہی ہے حقیقۃً قبض ارواح اسی کا کام ہے کیونکہ بندوں کے تمام افعال اللہ کے پیدا کیے ہوئے ہیں۔

یہ بھی قرطبی کا بیان ہے کہ حدیث میں آیا ہے کہ مرنے والے پر چار فرشتے اترتے ہیں ایک دائیں پاؤں سے، دوسرا بائیں پاؤں سے، تیسرا دائیں ہاتھ سے اور چوتھا بائیں ہاتھ سے جان کھینچتا ہے۔ ذکرہ ابو حامد۔

کلبی کا بیان ہے کہ ملک الموت روح کو قبض کر کے رحمت یا عذاب کے فرشتوں کے سپرد کر دیتا ہے۔ جویبر نے اپنی تفسیر میں حضرت ابن عباسؓ کا قول نقل کیا ہے کہ ملک الموت کا تسلط زمین کی تمام چیزوں پر اسی طرح ہے جس طرح اپنے ہاتھ میں پکڑی ہوئی چیز پر ہے تمام جانوں کو وہ خود ہی قبض کرتا ہے مگر اس کے ساتھ رحمت اور عذاب کے فرشتے ہوتے ہیں پاک روح کو قبض کرنے کے بعد رحمت کے فرشتوں کو دے دیتا ہے اور ناپاک روح کو عذاب کے فرشتوں کے سپرد کر دیتا

ہے۔ ابن ابی الدنیا اور ابوالشیخ نے ابن المنتشی حمصی کی روایت سے بھی ایسا ہی بیان کیا ہے۔ اس کی تائید حضرت براء بن عازب کی روایت کردہ اس طویل حدیث سے ہوتی ہے جس کو احمد، ابوداؤد، حاکم، ابن ابی شیبہ اور بیہقی وغیرہ نے صحیح اسنادوں کے ساتھ بیان کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا مومن بندہ کا تعلق جب دنیا سے منقطع ہونے لگتا ہے اور آخرت سامنے سے آرہی ہوتی ہے تو سورج جیسے گورے چہروں والے ملائکہ اس کے پاس اتر کر آتے ہیں، جنت کا کفن اور خوشبو ان کے ساتھ ہوتی ہے آکر وہ حد نگاہ کے فاصلہ پر بیٹھ جاتے ہیں پھر ملک الموت آکر مرنے والے کے سرہانے بیٹھ جاتا ہے اور کہتا ہے اے پاکیزہ روح اللہ کی مغفرت اور رضامندی کی طرف نکل کر چل۔ روح فوراً اس طرح بہتی نکل آتی ہے جس طرح مشک کے اندر سے پانی کا قطرہ نکل آتا ہے۔ موت کا فرشتہ اس کو لے کر فوراً (مندرجہ بالا) ملائکہ کے سپرد کر دیتا ہے۔ پل بھر بھی اپنے ہاتھ میں نہیں روکتا ملائکہ اسی (بہشتی) کفن اور خوشبو میں روح کو لپیٹ دیتے ہیں (الحدیث)۔ اسی حدیث میں کافر کے متعلق حضور ﷺ نے فرمایا کہ سیاہ رو ملائکہ ٹاٹ لئے دراز نظر کے فاصلہ پر آکر بیٹھ جاتے ہیں پھر ملک الموت آکر اس کے سرہانے بیٹھ جاتا ہے اور روح کو قبض کر کے فوراً (عذاب کے سیاہ رو) فرشتوں کے سپرد کر دیتا ہے پل بھر بھی اپنے ہاتھ میں نہیں رکھتا۔

ابن ابی حاتم نے زہیر بن محمد کی روایت سے بیان کیا ہے کہ عرض کیا گیا یا رسول اللہ ﷺ ملک الموت تو ایک ہے اور مشرق مغرب اور ان دونوں کے درمیان دو لشکر لڑتے بھی کرتے ہیں اور ہلاک ہوتے ہیں (ایک وقت میں ملک الموت کہاں کہاں جاتا اور کس کس کی جان قبض کرتا ہے) فرمایا ملک الموت کے لئے دنیا اس طرح گھیر دی گئی ہے جس طرح ایک طشت تمہارے سامنے ہوتا ہے دنیا کی کوئی چیز ملک الموت سے چھوٹ نہیں سکتی۔ ابن ابی الدنیا اور ابوالشیخ نے اشعث بن اسلم کا قول نقل کیا ہے کہ حضرت ابراہیمؑ نے ملک الموت سے جس کا نام عزرائیل ہے اور جس کی دو آنکھیں آگے چہرہ میں اور دو آنکھیں پیچھے گدی میں ہیں دریافت کیا کہ جب ایک شخص مشرق میں اور دوسرا مغرب میں ہو اور وباء کسی زمین پر پھیلی ہوئی ہو (یا) دو لشکر باہم لڑ رہے ہوں تو آپ کیا کرتے ہیں۔ عزرائیل نے کہا میں روحوں کو باذن اللہ پکارتا ہوں اور تمام روحیں میری ان دو انگلیوں میں آجاتی ہیں۔ اشعث بن اسلم نے کہا ملک الموت کے سامنے زمین ہموار شکل میں طشت کی طرح کر دی گئی ہے جس جگہ سے چاہتے ہیں وہ روح کو پکڑ لیتے ہیں۔

یہ بھی روایت میں آیا ہے کہ حضرت یعقوبؑ کے سوال کے جواب میں ملک الموت نے کہا کہ اللہ نے دنیا کو میرا تابع بنا دیا ہے جس طرح تمہارے سامنے طشت رکھا ہو اور تم اس میں سے جس کنارہ سے چاہو (پھل یا کھانا وغیرہ) لے سکتے ہو اسی طرح دنیا میرے لئے ہے۔

ابوالشیخ اور ابونعیم نے مجاہد کا قول نقل کیا ہے اور الزہد میں بھی مجاہد کا یہ بیان آیا ہے کہ ملک الموت کے لئے زمین ایک طشت کی طرح کر دی گئی ہے وہ جہاں سے چاہتا ہے روحوں کو لے لیتا ہے اللہ نے اس کے کچھ مددگار بنا دیئے ہیں جو روحوں کو قبض کرتے ہیں پھر ان سے ملک الموت وہ روحیں لے لیتا ہے۔

میں کہتا ہوں احادیث اور آثار صحابہ کی روشنی میں مسئلہ کی تحقیق یہ ہے کہ جس طرح محسوسات میں سورج کا تعلق (ایک وقت میں) ہر چیز سے برابر ہے اسی طرح ملک الموت کے لئے تمام زمین اور اطراف زمین ہے۔ (ایک ہی وقت اس کا تعلق ہر گوشہ زمین سے ہے) ایک کام میں مشغولیت اس کو (اسی وقت میں) دوسرے کام میں مشغول ہونے سے نہیں روکتی (اگر ایک وقت میں مشرق کے کسی گوشہ میں وہ کسی روح کو قبض کرنے میں مشغول ہو تو اسی وقت اسی آن مغرب، جنوب، شمال اور حصۂ زمین میں دوسری روحوں کو قبض کر لیتا ہے) اللہ نے بعض اولیاء کو بھی یہ قوت عطا فرمائی ہے کہ ایک آن میں وہ مختلف مقامات میں اپنے اختیار کردہ اجسام میں نمودار ہو سکتے ہیں۔ اللہ نے ملک الموت کے کچھ مددگار بھی بنا دیئے ہیں جو ملک الموت کے اعضاء کی طرح ہیں اور روحیں قبض کرتے ہیں۔ ہر مرنے والے کے پاس خواہ مومن ہو یا کافر فرشتوں کی ایک جماعت جنت یا

دوزخ کا کفن لئے آتی ہے اور اس کی روح کو ملک الموت سے لے کر آسمان کی طرف چڑھ جاتی ہے۔ پس اس آیت میں رُسُلُ سے مراد یا ملک الموت کے مددگار ہیں یا وہ ملائکہ مراد ہیں جو ملک الموت سے روحیں لے کر آسمان کی طرف چڑھ جاتے ہیں۔
بعض علماء کا قول ہے کہ رُسُلُ اگرچہ جمع کا صیغہ ہے مگر مراد تنہا ملک الموت ہے۔

ادائیگی فرض میں کوتاہی نہ کرنے کا یہ مطلب ہے کہ سستی اور تاخیر نہیں کرتے ملائکہ میں بغیر اذن الٰہی کے روحوں کو قبض کرنے کی قدرت نہیں ہے۔ طبرانی اور ابن مندہ اور ابو نعیم نے حضرت حارث بن خزرج کی روایت سے لکھا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ایک بار ملک الموت کو ایک انصاری کے سر کے قریب دیکھا اور فرمایا اے ملک الموت میرے صحابی سے نرمی کرنا یہ مومن ہے ملک الموت نے جواب دیا آپ ﷺ دل کو خوش اور آنکھوں کو ٹھنڈی رکھئے اور سمجھ لیجئے کہ میں ہر مومن سے نرمی کرتا ہوں۔ محمد ﷺ آپ کو جان لینا چاہئے کہ میں جب کسی آدمی کی روح قبض کرتا ہوں اور اس کے گھر والوں میں سے کوئی چیختا چلاتا ہے تو میں میت کی روح لئے اس کے گھر میں کھڑا ہو کر کہتا ہوں اے چیخنے والے خدا کی قسم ہم نے اس پر ظلم نہیں کیا اور نہ اس کی اجل سے پہلے اس کو مارا نہ اس کی وقت طلب کرنے میں عجلت کی، اس کو قبض کرنے میں ہماری کوئی خطا نہیں (یہ اللہ کا کیا ہوا ہے) اب اگر تم اللہ کے کئے ہوئے کام پر رضا مند رہو گے تو اجر پاؤ گے ناراض ہو گئے تو گناہ گار ہو گے اور گناہ کا بار اٹھاؤ گے، ہم تو تمہارے پاس لوٹ لوٹ کے بار بار آتے ہی رہیں گے تم کو خوف اور احتیاط رکھنی چاہئے کوئی ڈیرے خیمہ میں رہنے والا ہو یا مستقل مکانوں کا باشندہ اہل شعر (بالوں والا) اہل مدر (مٹی کے ڈھیلوں والا) اول سے مراد خانہ بدوش بدوی جو کہیں مستقل طور پر نہیں رہتے اور دوسرے سے مراد وہ لوگ جو کہیں بستی نگری میں مکان بنا کر رہتے ہیں۔ عرب میں خیمے ڈیرے اون بنائے جاتے تھے اس لئے اہل شعر سے مراد اہل خیام ہو گئے) نیک ہو یا بد میدانی علاقہ کا باشندہ ہو یا پہاڑ کا سب کو شب و روز میں تلاش شمار رکھتا ہوں یہاں تک کہ وہ خود اپنے کو اتنا نہیں پہچانتے جتنا میں ان کے چھوٹے بڑے کو پہچانتا ہوں۔ خدا کی قسم میں اگر ایک مچھر کی جان بھی خود قبض کرنا چاہوں تو بغیر اللہ کے اذن کے نہیں کر سکتا اسی جان کو قبض کرنے کا حکم ہوتا ہے۔ ابن ابی الدنیا اور ابو الشیخ نے بھی حسن کی روایت سے اسی طرح بیان کیا ہے۔

جعفر بن محمد نے فرمایا مجھے اطلاع ملی ہے کہ ملک الموت نماز کے اوقات پر (مسجدوں میں) لوگوں کی تلاش رکھتا ہے پھر مرنے کے وقت نظر رکھتا ہے اگر مرنے والا پانچوں نمازوں کی پابندی رکھنے والوں میں سے ہوتا ہے تو ملک الموت اس کے قریب آکر شیطانوں کو ہٹا دیتا ہے اور مرنے والے کو لا اله الا الله محمد رسول الله کی تلقین کرتا ہے۔

ثُمَّ رُدُّوْٓا اِلَى اللّٰهِ مَوْلٰىهُمُ الْحَقِّ (پھر سب اپنے مالک حقیقی کے پاس لائے جائیں گے)۔

مَوْلٰى۔ لفظ ثم دلالت کر رہا ہے کہ اللہ کی طرف لوٹائے جانے سے مراد ہے: قیامت کے دن حساب کے لئے پیشی ہونا۔ یا یہ مراد ہے کہ مرنے کے بعد رحمت یا عذاب کے فرشتے ان کو اوپر چڑھا کر لے جاتے ہیں۔ ایک طویل حدیث میں جس کے راوی حضرت براء بن عازب ہیں آیا ہے کہ حضور ﷺ نے فرمایا۔ اس کو یعنی مومن کی روح کو فرشتے اوپر چڑھا کر لے جاتے ہیں اور فرشتوں کی جس جماعت کی طرف سے گزرتے ہیں تو وہ پوچھتے ہیں یہ پاکیزہ روح کس کی ہے، لے جانے والے فرشتے اس کا دنیوی سب سے اچھا نام لے کر کہتے ہیں یہ فلاں بن فلاں ہے یہاں تک کہ آسمان دنیا تک اس کو لے کر پہنچتے ہیں اور (دروازہ) کھلواتے پہنچتے ہیں تو کھول دیا جاتا ہے اور ہر آسمان کے مقرب فرشتے اس کے ساتھ ہو لیتے ہیں اور متصل آسمان تک پہنچا دیتے ہیں اسی طرح ساتویں آسمان تک اس کو پہنچا دیا جاتا ہے یہاں اللہ فرماتا ہے میرے بندہ کا اعمالنامہ علیین میں درج کر لو اور اس کو زمین کی طرف لوٹا دو۔

کافر کے بارے میں حضور ﷺ نے فرمایا (ملائکہ) اس کو چڑھا کر لے جاتے ہیں اور ملائکہ کے جس گروہ کی طرف سے اس کو لے کر گزرتے ہیں تو وہ دریافت کرتے ہیں یہ گندی روح کون ہے۔ لے جانے والے فرشتے اس کے دنیوی ناموں میں سے بدترین نام لے کر کہتے ہیں یہ فلاں بن فلاں ہے، یہاں تک کہ اس کو آسمان دنیا تک لے جاتے ہیں اور (آسمان کا

دروازے) کھلوانا چاہتے ہیں مگر وہ نہیں کھولا جاتا۔ پھر حضور ﷺ نے پڑھا لَا تُفَتَّحُ لَهُمْ اَبْوَابُ السَّمَآءِ۔ الخ اللہ فرماتا ہے سب سے نچلی زمین کے اندر سجین میں اس کا اعمالنامہ درج کرلو نتیجہ میں اس کی روح کو دور پھینک دیا جاتا ہے۔ پھر حضور ﷺ نے یہ آیت تلاوت فرمائی وَمَنْ یُّشْرِكْ بِاللّٰهِ فَكَاَنَّمَا خَرَّ مِنَ السَّمَآءِ فَتَخْطَفُهُ الطَّیْرُ اَوْ تَهْوِیْ بِهِ الرِّیْحُ فِیْ مَكَانٍ سَحِیْقٍ۔

اَلَا لَهُ الْحُكْمُ (خوب سن لو کہ حکم بس اللہ ہی کا ہوگا کسی اور کا نہیں)۔

وَهُوَ اَسْرَعُ الْحٰسِبِیْنَ ۝ (اور وہ بہت تیزی سے حساب لے لے گا) (ایک وقت میں) ایک کا حساب اس کو دوسرے (کے) حساب سے مانع نہیں ہو سکتا۔ حدیث میں آیا ہے دنیا کے آدھے دن (کے برابر وقت) میں اللہ ساری مخلوق کا حساب لے لے گا۔

قُلْ مَنْ یُّنَجِّیْكُمْ مِّنْ ظُلُمٰتِ الْبَرِّ وَالْبَحْرِ (آپ پوچھئے تم کو بحر و بر کی تاریکیوں سے کون بچاتا ہے) چونکہ تاریکی اور مصیبت دونوں ہولناک ہوتی ہیں اس لئے بطور استعارہ آیت میں تاریکیوں سے مراد ہیں مصائب و مقامات ہلاکت۔ لوگ جب تری خشکی کا سفر کرتے اور دوران سفر میں راستہ سے بھٹک جاتے، طوفانی موجیں اور بادل کی کڑک ہر طرف سے گھیر لیتی، تو اس وقت خلوص کے ساتھ وہ اللہ کو پکارتے تھے کیونکہ اتنا وہ بھی جانتے کہ پتھروں کے بت نہ نفع پہنچا سکتے ہیں نہ ضرر۔

تَدْعُوْنَهٗ تَضَرُّعًا وَّخُفْیَةً (کہ تم اس سے گڑگڑا کر اور چپکے چپکے دعا کرتے ہو)۔

تضرع زاری کرنا اور خوب گڑگڑا کر مانگنا۔ تَضَرُّعًا اور خُفْیَةً دونوں مصدر ہیں لیکن معنی اسم فاعل کے ہیں۔ چپکے چپکے دعا اور ذکر کرنا سنت ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تم نہ کسی بہرے کو پکارتے ہو نہ غائب کو (یعنی اللہ نہ بہرا ہے نہ غائب کہ اس کو زور سے پکارا جائے بلکہ ہر وقت حاضر ہے اور پست ترین آواز کو بھی سنتا ہے) آیت کا مطلب یہ ہے کہ تم عاجزی اور خلوص کے ساتھ دعا کرتے ہو (یعنی چپکے چپکے دعا کرنے سے مراد ہے خلوص کے ساتھ دعا کرنا) کیونکہ چپکے چپکے دعا کرنے میں ریاکاری کا شائبہ نہیں ہوتا محض خلوص ہوتا ہے۔

لَئِنْ اَنْجٰىنَا مِنْ هٰذِهٖ (اور کہتے ہو کہ اگر اس (شدت اور ظلمت) سے اس نے ہمیں بچالیا)۔ هٰذِهٖ سے ظلمات و شدت کی طرف اشارہ ہے۔ لَئِنْ اَنْجٰىنَا سے پہلے یا لفظ قول محذوف ہے (یعنی کہتے ہو) یا یہ تَدْعُوْنَهٗ کا بیان ہے (دعا کرتے ہو کہ اگر اس نے ہمیں بچالیا) لَنَكُوْنَنَّ مِنَ الشّٰكِرِیْنَ ۝

تو ہم شکر گزاروں میں سے ہوں گے۔ شکر کی حقیقت ہے منعم کی نعمت کا اقرار کرنا اور نعمت کا حق ادا کرنا یعنی منعم کی رضامندی میں اس کو صرف کرنا۔

قُلِ اللّٰهُ یُنَجِّیْكُمْ مِّنْهَا وَمِنْ كُلِّ كَرْبٍ ثُمَّ اَنْتُمْ تُشْرِكُوْنَ ۝ (آپ کہہ دیجئے کہ اللہ ہی تم کو اس تاریکی اور ہر غم سے بچاتا ہے پھر بھی تم شرک کرنے لگتے ہو)۔ یعنی شرک کی طرف لوٹ جاتے ہو وعدہ پورا نہیں کرتے۔ جانتے ہو کہ مصیبت سے اللہ ہی تم کو بچاتا ہے اور بت کسی کام نہیں آتے پھر بھی بتوں کو (عبادت میں) اللہ کا شریک بناتے ہو۔ بجائے لَا تَشْكُرُوْنَ کے تُشْرِكُوْنَ فرمایا اس میں پوری سرزنش ہے اور اس بات پر تنبیہ ہے کہ جس نے اللہ کی عبادت میں دوسروں کو شریک کیا اس نے گویا اللہ کی عبادت ہی نہیں کی۔ ثُمَّ اَنْتُمْ میں ثُمَّ تراخی کے لئے نہیں ہے بلکہ انعام و شرک میں انتہائی بعد ظاہر کرنے کے لئے ہے۔

قُلْ هُوَ الْقَادِرُ عَلٰۤى اَنْ یَّبْعَثَ عَلَیْكُمْ عَذَابًا مِّنْ فَوْقِكُمْ

(آپ کہہ دیجئے کہ اللہ ہی اس بات پر بھی قدرت رکھتا ہے کہ تمہارے اوپر سے کوئی عذاب تم پر بھیج دے) جیسے قوم نوح، قوم عاد اور قوم لوط اور اصحاب الفیل کے ساتھ کیا ہے۔

اَوْ مِنْ تَحْتِ اَرْجُلِكُمْ (یا تمہارے پاؤں تلے سے) کوئی عذاب بھیج دے) جیسے قوم نوح کے ساتھ کیا کہ زمین کے اندر سے چشمے جاری کر کے پانی کے طوفان سے سب کو ڈبو دیا یا فرعون کو غرق کر دیا اور قارون کو زمین میں دھنسا دیا۔

حضرت ابن عباسؓ و مجاہدؒ کا قول ہے کہ عذاب فوق سے ظالم بادشاہ اور تَحْتِ اَرْجُلِكُمْ سے بدکردار غلام مراد ہیں۔ ضحاک نے کہا فوق و تحت سے بڑے چھوٹے مراد ہیں۔ بعض علماء نے کہا فَوْقِكُمْ سے بارش کو اور تَحْتِ اَرْجُلِكُمْ سے روئیدگی کو روک لینا مراد ہے۔

اَوْ يَلْبِسَكُمْ شِيَعًا وَّيُذِيْقَ بَعْضَكُمْ بَاْسَ بَعْضٍ (یا تم کو گروہ گروہ کر کے سب کو بھڑ دے اور ایک کو دوسرے کی جنگ کا مزہ چکھا دے)۔

يَلْبِسَكُمْ کا معنی ہے يَخْلِطَكُمْ۔ شِيَعًا کا معنی ہے مختلف گروہ جن کے خیالات و خواہشات الگ الگ ہوں۔ بَاْس کا معنی عذاب اور جنگ کے شدائد کا مزہ ہے۔

مراد یہ ہے کہ تم میں سے بعض بعض کو قتل کرنے لگیں۔ حضرت جابرؓ بن عبداللہ کی روایت ہے کہ جب آیت مذکورہ کا پہلا حصہ (یعنی) قُلْ هُوَ الْقَادِرُ عَلٰٓى اَنْ يَّبْعَثَ عَلَيْكُمْ عَذَابًا مِّنْ فَوْقِكُمْ نازل ہوا تو رسول اللہ ﷺ نے کہا اَعُوْذُ بِوَجْهِكَ الْكَرِيْمِ۔ جب (اس سے آگے دوسرا حصہ) اَوْ يَلْبِسَكُمْ شِيَعًا وَّيُذِيْقَ بَعْضَكُمْ بَاْسَ بَعْضٍ نازل ہوا تو آپ نے فرمایا یہ (پہلے عذاب سے) آسان اور سہل ہے۔ رواہ البخاری وغیرہ۔

فائدہ:- آیت (کے آخری حصہ) کی تعبیر ہجرت سے ۳۵ سال کے بعد نظروں کے سامنے آگئی جب جنگ جمل و صفین میں مسلمان باہم کشت و خون میں مبتلا ہو گئے۔

حضرت سعد بن ابی وقاصؓ کا بیان ہے ہم رسول اللہ ﷺ کے ہمرکاب مسجد بنی معاویہ کی طرف سے گذرے۔ آپ ﷺ نے مسجد میں داخل ہو کر دو رکعت نماز ادا کی اور ہم نے بھی نماز پڑھی پھر آپ ﷺ نے دیر تک دعا کی اور دعا کے بعد فرمایا میں نے اپنے رب سے تین باتوں کا سوال کیا تھا میں نے اس سے درخواست کی تھی کہ میری امت کو (عمومی) غرق (کے عذاب) سے ہلاک نہ کرے (جیسا کہ حضرت نوح کی امت کے ساتھ کیا) اللہ نے میری یہ دعا قبول کر لی۔ میں نے اپنے رب سے دعا کی کہ میری امت کو (عمومی) قحط سے ہلاک نہ کرے اس نے میری یہ دعا بھی قبول فرمائی۔ میں نے سوال کیا کہ میری امت کو باہم جنگ کے عذاب میں مبتلا نہ کرے اللہ نے میری یہ دعا نہ مانی۔ رواہ البغوی۔

عبداللہؓ بن عبدالرحمٰن انصاری کا بیان ہے کہ حضرت عبداللہؓ بن عمرؓ ہمارے پاس تشریف لائے اور فرمایا کہ رسول اللہ ﷺ نے ایک مسجد میں تین دعائیں کیں اللہ نے دو دعائیں تو قبول فرمالیں اور ایک دعا رد فرما دی۔ حضور ﷺ نے اللہ سے دعا کی کہ میری امت پر کسی غیر دشمن کو مسلط نہ فرمائے کہ وہ سب پر چیرہ دستی کرے۔ اللہ نے یہ دعا قبول فرمالی۔ حضور ﷺ نے دعا کی کہ سب امت کو (عمومی عام) قحط سالیوں سے ہلاک نہ کرے۔ اللہ نے یہ دعا بھی قبول فرمالی۔ حضور ﷺ نے دعا کی کہ امت کو باہم خانہ جنگی میں مبتلا نہ کرے۔ اللہ نے یہ دعا قبول نہیں فرمائی۔ رواہ البخاری۔

ابن ابی حاتم نے زید بن اسلم کا بیان نقل کیا ہے کہ جب آیت قُلْ هُوَ الْقَادِرُ عَلٰٓى اَنْ يَّبْعَثَ عَلَيْكُمْ عَذَابًا مِّنْ فَوْقِكُمْ الخ نازل ہوئی تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا میرے بعد لوٹ کر کافر نہ ہو جانا کہ باہم ایک دوسرے کی گردن کاٹنے لگو۔ صحابہؓ نے عرض کیا ہم شہادت دیتے ہیں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور آپ اللہ کے رسول ہیں (کیا اس شہادت کے باوجود ہم ایسا کر سکتے ہیں) ایک شخص بولا ایسا کبھی نہیں ہو سکتا کہ ہم سب مسلمان ہیں پھر ایک دوسرے کی گردن ماریں ایسا نہیں ہو سکتا۔ اس پر آیت ذیل نازل ہوئی۔

اُنْظُرْ كَيْفَ نُصَرِّفُ الْاٰيٰتِ لَعَلَّهُمْ يَفْقَهُوْنَ ۝ (آپ دیکھئے تو ہم کس طرح دلائل مختلف پہلوؤں سے بیان کرتے ہیں شاید وہ سمجھ جائیں) یعنی وعدہ وعید کے مختلف پہلوؤں سے دلائل بیان کرتے ہیں۔

وَكَذَّبَ بِهٖ قَوْمُكَ (اور آپ کی قوم (یعنی کفار قریش اس) عذاب یا قرآن کی تکذیب کرتی ہے)۔

وَهُوَ الْحَقُّ (حالانکہ وہ حق ہے) یعنی واقعی حقیقت ہے یا حق ہے۔

قُلْ لَّسْتُ عَلَيْكُمْ بِوَكِيْلٍ ﴿۶۶﴾ (آپ کہہ دیجئے کہ میں (اللہ کی طرف سے) تم پر تعینات نہیں کیا گیا ہوں یعنی اس کا ذمہ دار نہیں بنایا گیا ہوں کہ تم پر اسلام کو چپکا دوں یا اگر تم انکار کرو تو سزا دے ڈالوں۔

لِكُلِّ نَبَاٍ مُّسْتَقَرٌّ (ہر خبر کے وقوع کا ایک وقت ہے۔ یعنی قرآن نے جو کافروں کے عذاب میں مبتلا ہونے کی خبریں دی ہیں ان میں سے ہر خبر کا وقوع مقرر ہے جس میں تقدیم و تاخیر نہیں ہو سکتی۔

وَّسَوْفَ تَعْلَمُوْنَ ﴿۶۷﴾ (اور جلدی ہی تم کو معلوم ہو جائے گا) جب کہ دنیا میں یا آخرت میں اس خبر کا ظہور ہو جائے گا۔

وَاِذَا رَاَيْتَ الَّذِيْنَ يَخُوْضُوْنَ فِيْٓ اٰيٰتِنَا فَاَعْرِضْ عَنْهُمْ (اور جب تم ایسے لوگوں کو دیکھو جو ہماری آیات میں عیب جوئی کر رہے ہوں تو ان سے کنارہ کش ہو جاؤ) یعنی ان کے پاس سے اٹھ جاؤ ان کے ساتھ نہ بیٹھو۔ اس آیت کی غرض کفار کے دین اور ان کی ہم نشینی سے الگ رکھنا ہے ترک جہاد مقصود نہیں ہے کہ اس کو (آیت قتال سے) منسوخ قرار دیا پڑے (یعنی اگر اعراض اور تعلق نہ رکھنے کو مفہوم یہ مانا جائے کہ ان کو ان کے حال پر چھوڑ دو ان سے کچھ تعرض نہ کرو تو لامحالہ ترک قتال کا حکم اس سے مستفاد ہو گا اور پھر آیت قتال سے اس کو منسوخ ماننا پڑے گا)۔

حَتّٰى يَخُوْضُوْا فِيْ حَدِيْثٍ غَيْرِهٖ (اس وقت تک کہ وہ (آیات میں عیب جوئی کو چھوڑ کر) کسی اور بات میں لگ جائیں)۔ غیرہ کی ضمیر معنی آیات کی طرف راجع ہے جو (مفرد مذکر ہے اور حقیقت میں) قرآن ہے۔ قریش اپنی مجالس میں بیٹھ کر آیات قرآنی کی تکذیب کرتے تھے ان میں نکتہ چینی کرتے اور ان کا مذاق اڑاتے تھے۔ (ایسے لوگوں کے ساتھ بیٹھنے کی ممانعت اس آیت میں کی گئی۔

وَاِمَّا يُنْسِيَنَّكَ الشَّيْطٰنُ فَلَا تَقْعُدْ بَعْدَ الذِّكْرٰى مَعَ الْقَوْمِ الظّٰلِمِيْنَ ﴿۶۸﴾ اور اگر (یہ حکم ممانعت) شیطان تم کو بھلا دے تو یاد آنے کے بعد پھر ایسے ظالموں کے ساتھ نہ بیٹھو) بجائے ضمیر غائب کے اَلظّٰلِمِيْنَ کا لفظ صراحت کے ساتھ لانا بتا رہا ہے کہ یہ لوگ بڑی بیجا حرکت کرتے ہیں کہ بجائے تصدیق کے تکذیب اور استہزاء کرتے ہیں۔

بغوی نے لکھا ہے روایت میں آیا کہ حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا جب آیت مذکورہ نازل ہوئی تو مسلمانوں نے کہا ہم کعبہ میں کس طرح بیٹھیں اور کیونکر طواف کریں، مشرک تو ہمیشہ ہی آیات میں عیب جوئی کرتے رہتے ہیں۔ دوسری روایت میں آیا کہ مسلمانوں نے کہا اگر ہم ان کو یوں ہی چھوڑ دیں اور عیب جوئی سے منع نہ کریں تو ہم کو گناہ کا اندیشہ ہے اس پر آیت ذیل نازل ہوئی۔

وَمَا عَلَى الَّذِيْنَ يَتَّقُوْنَ مِنْ حِسَابِهِمْ مِّنْ شَيْءٍ وَّلٰكِنْ ذِكْرٰى (اور جو لوگ احتیاط رکھتے ہیں (یعنی رسول اللہ ﷺ اور آپ کے صحابہؓ) ان پر ان (مشرکوں) کی باز پرس کا کوئی اثر نہیں پہنچے گا ہاں ان (مسلمانوں) کے ذمہ نصیحت کر دینا ہے یعنی مِنْ حِسَابِهِمْ میں مِنْ تبعیض کے لئے ہے اور ضمیر کفار کی طرف راجع ہے۔ مِنْ شَيْءٍ میں مِنْ زائد ہے۔ مطلب یہ ہے کہ کافروں سے ان کے گناہوں کا جو محاسبہ و مؤاخذہ ہو گا اس کا کوئی حصہ مسلمانوں کو نہیں چمٹ جائے گا۔ وَلٰكِنْ ذِكْرٰى کا یہ مطلب ہے کہ اگر مسلمانوں میں طاقت و استطاعت ہو تو بقدر استطاعت خوض فی الآیات اور دوسری برائیوں سے منع کرنے کی ذمہ داری مسلمانوں کی ہے۔

لَعَلَّهُمْ يَتَّقُوْنَ ﴿۶۹﴾ (شاید وہ بھی احتیاط کرنے لگیں)۔ یعنی مسلمانوں کے نصیحت کرنے سے شاید کافر نصیحت پذیر ہو جائیں۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ لَعَلَّهُمْ کی ضمیر اَلَّذِيْنَ يَتَّقُوْنَ کی طرف راجع ہو اس وقت مطلب اس طرح ہو گا کہ مسلمان تقویٰ پر جمے رہیں۔

وَذَرِ الَّذِيْنَ اتَّخَذُوْا دِيْنَهُمْ لَعِبًا وَّلَهْوًا (اور ایسے لوگوں سے بالکل کنارہ کش رہو جنہوں

نے اپنے دین کو کھیل کود بنا رکھا ہے)۔

یعنی ایسا مذہب اختیار کیا ہے جو نہ دنیا میں ان کے لئے سود مند ہے نہ آخرت میں نفع بخش جیسے بت پرستی اور بحیرہ سائبہ کو حرام بنا لینا یا یہ مطلب ہے کہ جس دین کو قبول کرنے کا ان کو حکم دیا گیا ہے اس کو بھی کھیل سمجھ رکھا ہے اس کا مذاق اڑاتے ہیں۔ بعض علماء نے یہ مطلب بیان کیا ہے کہ اللہ نے ہر قوم کا ایک تہوار کا دن بنا دیا تھا لیکن ہر قوم نے سوائے مسلمانوں کے اپنے تہوار کو لہو و لعب بنا لیا مگر مسلمانوں نے اپنے تہوار کو عبادت کا دن قائم رکھا جیسے عید اور جمعہ کی نماز، تکبیرات، قربانی، صدقہ فطر، خطبہ نصیحت وغیرہ۔ ذَرِ الَّذِيْنَ کا مطلب یہ ہے کہ ان کے اقوال و افعال کی پروا نہ کرو۔ یہ کیا کہتے ہیں، کیا کرتے ہیں، سب سے کنارہ کش رہو۔ یا ذَرْ سے مراد ہے دھمکی دینا اور ڈرانا جیسے دوسری آیت میں آیا ہے ذَرْنِيْ وَمَنْ خَلَقْتُ وَحِيْدًا۔

بعض علماء کے نزدیک یہ مطلب ہے کہ ان سے تعرض نہ کرو ان کے معاملہ میں دخل دینے سے باز رہو۔ اس صورت میں آیت قتال سے اس آیت کا حکم منسوخ قرار دیا جائے گا۔

وَغَرَّتْهُمُ الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا (اور دنیوی زندگی نے ان کو فریب دے رکھا ہے) یہاں تک کہ وہ حشر و نشر کے منکر ہو گئے۔

وَذَكِّرْ بِهٖٓ اَنْ تُبْسَلَ نَفْسٌۢ بِمَا كَسَبَتْ ڰ لَيْسَ لَهَا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَلِيٌّ وَّلَا شَفِيْعٌ ۚ

(اور اس قرآن کے ذریعہ سے نصیحت کرتے رہو تا کہ کوئی شخص اپنے کردار کے سبب اس طرح نہ پھنس جائے کہ کوئی غیر اللہ اس کا مددگار ہو نہ سفارشی) تُبْسَلَ سے پہلے لا محذوف ہے یعنی لِئَلَّا تُبْسَلَ (تا کہ پھنس نہ جائے) بَسْل کا معنی ہے بند کر رکھنا روک رکھنا۔ قاموس۔ ولی مددگار جو قوت سے عذاب کو دفع کر سکے شفیع سفارشی جو سفارش کر کے عذاب سے بچا لے۔

وَاِنْ تَعْدِلْ كُلَّ عَدْلٍ لَّا يُؤْخَذْ مِنْهَا ۚ (اور (یہ کیفیت ہو کہ) اگر دنیا بھر کا بھی معاوضہ دے ڈالے تب بھی اس سے قبول نہ ہو) چونکہ اس آیت میں عدل مصدری معنی میں ہے اس لئے لَا يُؤْخَذْ کی ضمیر اس کی طرف راجع نہیں ہو سکتی ہاں آیت لَا يُؤْخَذُ مِنْهَا عَدْلٌ میں چونکہ عدل بمعنی اسم مفعول ہے اس لئے لَا يُؤْخَذُ کی نسبت اس کی طرف صحیح ہے۔ عدل کا معنی ہے فدیہ، معاوضہ۔ عدل اس لئے کہا جاتا ہے کہ وہ مفدی (جس کا معاوضہ دیا جائے) کے برابر ہوتا ہے۔ كُلَّ عَدْلٍ مفعول مطلق ہے (یعنی عدل بمعنی معدول نہیں ہے)۔

اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ اُبْسِلُوْا بِمَا كَسَبُوْا ۚ لَهُمْ شَرَابٌ مِّنْ حَمِيْمٍ وَّعَذَابٌ اَلِيْمٌۢ بِمَا كَانُوْا يَكْفُرُوْنَ ۝

(یہ ایسے ہی ہیں کہ اپنے کردار کے سبب پھنس گئے۔ ان کے لئے نہایت تیز گرم پانی پینے کو ہو گا اور دردناک عذاب ہو گا اپنے کفر کے سبب) اُولٰٓئِكَ سے اشارہ ان ہی لوگوں کی طرف ہے جنہوں نے دین کو لہو و لعب بنا رکھا ہے اُبْسِلُوْا یعنی محبوس کر دیئے گئے اور ان کو عذاب کے سپرد کر دیا گیا۔ حَمِيْم انتہائی گرم پانی۔ عَذَابٌ اَلِيْمٌ آگ وغیرہ کا عذاب۔ بِمَا كَانُوْا میں باء سببیہ ہے۔ یہ آخری جملہ یا اُولٰٓئِكَ کی دوسری خبر ہے۔

قُلْ اَنَدْعُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَا لَا يَنْفَعُنَا وَلَا يَضُرُّنَا وَنُرَدُّ عَلٰٓى اَعْقَابِنَا بَعْدَ اِذْ هَدٰىنَا اللّٰهُ

(آپ کہہ دیجئے کیا ہم اللہ کے سوا ایسی چیزوں کی پوجا کریں جو ہم کو کوئی نفع نہیں پہنچا سکتیں (اگر ہم ان کی پوجا کریں) اور نقصان نہیں پہنچا سکتیں (اگر ہم ان کی پوجا ترک کریں اور ان کو نہ مانیں) اور الٹی ایڑیوں کے بل (شرک کی طرف کو) لوٹ جائیں (جس پر ہم پہلے تھے) بعد اس کے کہ اللہ نے ہم کو (وحی کے ذریعہ سے) ہدایت کر دی (اور شرک سے بچا لیا اور اسلام کی نعمت عطا فرما دی)

كَالَّذِي اسْتَهْوَتْهُ الشَّيٰطِيْنُ فِي الْاَرْضِ حَيْرَانَ ۠ لَهٗٓ اَصْحٰبٌ يَّدْعُوْنَهٗٓ اِلَى الْهُدَى ائْتِنَا ۭ

(جیسے کوئی شخص ہو کہ اس کو شیطان نے کسی بیابان میں بے راہ کر دیا ہو اور وہ بھٹکتا پھرتا ہو اس کے کچھ ساتھی ٹھیک راستہ کی طرف اس کو بلا رہے ہوں کہ ہمارے پاس آجا)۔ اِسْتَہْوَتْ (واحد مؤنث) باب استفعال۔ مجرد ھَوٰی یَھْوِی ھُوِیّ کا معنی ہے "گیا" ۔اِسْتَہْوَتْہُ اس کو لے جانا چاہا ہو لے گئے ہوں۔ کَالَّذِی میں کاف محل نصب میں ہے خواہ اس کو مفعول مطلق قرار دیا جائے یا نُرَدُّ کی ضمیر سے حال۔ اول صورت میں ترجمہ ہو گا کہ کیا ہم شرک کی طرف لوٹ جائیں اس طرح جیسے وہ شخص لوٹ جاتا ہے جس کو شیطانوں نے بے راہ کر دیا ہو، دوسری صورت میں ترجمہ ہو گا کیا ہم شرک کی طرف لوٹ جائیں اس شخص سے مشابہت رکھتے ہوئے جس کو الخ۔

شیاطین سے مراد ہیں سرکش جنات۔ الْاَرْضِ سے مراد بیابان یعنی راستہ سے بہکا کر مقامات ہلاکت کی طرف لے گئے ہوں۔ حَیْرَانَ اِسْتَہْوَتْہُ کی مفعول ضمیر سے حال ہے یعنی اس حال میں کہ وہ بھٹکتا ہوا متحیر پھر رہا ہو اس کی سمجھ میں نہ آتا ہو کہ کہاں جائے اور کیا کرے۔ الْھُدٰی مصدر ہے بمعنی اسم مفعول یعنی سیدھا راستہ۔ اِئْتِنَا۔ یَدْعُوْنَہٗ کی تشریح ہے۔ یَدْعُوْنَ کے اندر قول کے معنی ہیں یعنی اس کے ساتھی اس سے کہہ رہے ہوں کہ ہمارے پاس آجا اور وہ قبول نہ کرے ان کے پاس نہ آئے۔

جو شخص راہ اسلام سے بھٹک گیا ہو اور مسلمان ان کو اسلام کی طرف بلا رہے ہوں مگر وہ دعوت کی طرف توجہ نہ کرے اللہ نے اس شخص کی تشبیہ اس آدمی سے دی جس کو جنگل میں شیطانوں نے بے راہ کر دیا ہو ساتھی اس کو راستہ کی طرف بلا رہے ہوں مگر وہ نہ آتا ہو۔

اَنَدْعُوْا میں استفہام انکاری ہے یعنی ہم ایسا نہیں کریں گے اور پورا تشبیہی جملہ نُرَدُّ کی ضمیر سے حال ہے۔

قُلْ اِنَّ ھُدَى اللّٰهِ هُوَ الْهُدٰى ؕ (آپ کہہ دیجئے کہ اللہ کی ہدایت (یعنی اسلام) ہی حقیقت میں ہدایت ہے) اس کے سوا ہر طریقہ گمراہی ہے۔

وَاُمِرْنَا لِنُسْلِمَ لِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝ وَاَنْ اَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَاتَّقُوْهُ ؕ (اور ہم کو یہ حکم دیا گیا ہے کہ ہم پروردگار عالم کے پورے مطیع ہو جائیں اور یہ (بھی حکم ہوا ہے) کہ نماز کی پابندی کرو اور اس سے ڈرو)۔ لِنُسْلِمَ میں لام زائد ہے باء کے معنی میں اور اَنْ مقدر ہے اس لئے فعل بمعنی مصدر ہے یا لام تعلیلیہ ہے اور اُمِرْنَا کا مفعول محذوف ہے۔ مطلب اس طرح ہو گا ہم کو اتباع رسول کا حکم دیا گیا تا کہ ہم رب العالمین کے مطیع ہو جائیں۔ اللہ تک پہنچنا اور اس کا مطیع ہونا اتباع رسول ﷺ پر موقوف ہے۔

وَهُوَ الَّذِيْٓ اِلَيْهِ تُحْشَرُوْنَ ۝ (اور وہی ہے جس کے پاس تم سب جمع کئے جاؤ گے)۔

وَهُوَ الَّذِيْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ بِالْحَقِّ ؕ (اور وہی ہے جس نے آسمانوں کو اور زمین کو باقاعدہ پیدا کیا) بِالْحَقِّ کا معنی ہے حکمت کے ساتھ یا حق بمعنی محق ہے یعنی برحق واقعی یا باء بمعنی لام ہے یعنی اظہار حق کے لئے پیدا کیا۔

وَيَوْمَ يَقُوْلُ كُنْ فَيَكُوْنُ ؕ (اور جس روز وہ (کسی چیز کو) فرمائے گا ہو جا وہ فوراً ہو جائے گی) یعنی جب (مردہ) مخلوق سے فرمائے گا اٹھ کھڑے ہو فوراً سب اٹھ کھڑے ہوں گے۔

قَوْلُهُ الْحَقُّ ؕ (اس کا کہنا اثر ہے) اَلْحَقُّ سے مراد ہے سچا۔

وَلَهُ الْمُلْكُ يَوْمَ يُنْفَخُ فِي الصُّوْرِ ؕ (اور ساری خالص حکومت اسی کی ہو گی جس روز صور میں پھونک ماری جائے گی) دوسری آیت میں بھی یہی مضمون کیا ہے فرمایا ہے لِمَنِ الْمُلْكُ الْيَوْمَ لِلّٰهِ الْوَاحِدِ الْقَهَّارِ۔ صور نرسنگھا جس کو پھونکا جائے گا اور اعرابی نے جب صور کے متعلق رسول اللہ ﷺ سے دریافت کیا تو آپ نے یہی فرمایا۔ حضرت عبداللہ بن عمرو بن عاص کی روایت سے ابن مبارک نے الزہد میں اور بیہقی نے البعث میں اس کو بیان کیا ہے نسائی نے بھی اس کو

نقل کیا ہے اور ابن حبان نے نقل کرنے کے بعد اس کو صحیح اور ابوداؤد نے حسن کہا ہے۔

ابوالشیخ ابن حبان نے کتاب العظمۃ میں وہب بن منبہ کی روایت سے لکھا ہے کہ اللہ نے صور کو بلور کی طرح چمکتے ہوئے سفید موتی سے بنایا، پھر عرش سے فرمایا، صور کو پکڑ لے فوراً صور عرش سے لٹک گیا پھر اللہ نے فرمایا ہو جا، فوراً اسرافیل پیدا ہو گئے اللہ نے اسرافیل کو صور لے لینے کا حکم دیا اسرافیل نے صور کو پکڑ لیا، صور میں ہر پیدا شدہ روح اور موجود کردہ جان کی گنتی کے برابر سوراخ ہیں۔ دو روحیں ایک سوراخ سے نہیں نکلیں گی صور کے وسط میں اتنا بڑا دائرہ ہے جیسے آسمان و زمین کا گول۔ پکڑ رکھا اسرافیل اس دہانے پر اپنا منہ رکھے ہوئے ہے پھر اللہ نے اسرافیل سے فرمایا میں نے صور پھونکنے اور چیخ مارنے کی ڈیوٹی تیری مقرر کر دی ہے چنانچہ اسرافیل نے عرش کے اگلے حصے میں داخل ہو کر دایاں پاؤں عرش کے نیچے داخل کر کے بایاں قدم آگے بڑھا رکھا ہے جو پیدائش کے بعد سے بھی پلک نہیں مارتا حکم کا انتظار کر رہا ہے۔ احمد اور طبرانی نے عمدہ سند کے ساتھ حضرت زید بن ارقم کی روایت سے لکھا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا مجھے کیسے چین ہو صور والا تو سینگ منہ میں دبائے پیشانی جھکائے اور کان لگائے منتظر ہے کہ کب اس کو حکم ملے۔ یہ سن کر صحابہ سخت متفکر ہو گئے۔ حضور ﷺ نے فرمایا کہو حَسْبُنَا اللّٰهُ وَنِعْمَ الْوَكِيْلُ۔ اسی طرح احمد نے اور مستدرک میں حاکم نے اور البعث میں بیہقی نے اور اوسط میں طبرانی نے حضرت ابن عباسؓ کی روایت سے بھی نقل کیا ہے اس روایت میں ہے کہ حضور ﷺ نے فرمایا کہو حَسْبُنَا اللّٰهُ وَنِعْمَ الْوَكِيْلُ عَلَى اللّٰهِ تَوَكَّلْنَا ترمذی اور حاکم اور بیہقی نے حضرت ابوسعید خدریؓ کی روایت سے بھی حدیث اسی طرح نقل کی ہے اور ابو نعیم نے حضرت جابرؓ کی روایت سے بھی ایسی ہی لکھا ہے۔

بزار اور حاکم نے حضرت ابوسعید خدریؓ کی روایت سے بیان کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہر صبح کو (یعنی روزانہ) دو فرشتے جن کی ڈیوٹی صور پر ہے منتظر ہیں کہ کب ان کو حکم ہو اور وہ صور میں پھونک ماریں۔ ابن ماجہ اور بزار کی روایت ان الفاظ کے ساتھ ہے کہ حضور ﷺ نے فرمایا دونوں صور والوں کے ہاتھوں میں دو سینگ ہیں دونوں منتظر ہیں کہ کب ان کو (صور پھونکنے کا) حکم ملتا ہے۔ حاکم نے حضرت ابن عمرؓ کی روایت سے لکھا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا دونوں (صور) پھونکنے والے دوسرے آسمان میں ہیں ایک کا سر مشرق میں اور پاؤں مغرب میں اور دوسرے کا سر مغرب میں اور پاؤں مشرق میں ہے۔ دونوں منتظر ہیں کہ کب ان کو صور پھونکنے کا حکم ہو اور وہ پھونکیں۔ ان تمام روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ صور پھونکنے والے دو فرشتے ہیں جن کے پاس دو نرسنگھے ہیں۔

طبرانی نے حسن سند کے ساتھ کعب احبار کی روایت سے ایک حدیث اسی طرح نقل کی ہے صور کا فرشتہ ایک زانو بیٹھے دوسرا کھڑا کئے صور منہ میں دبائے پشت جھکائے تیار ہے اس کو حکم دیا گیا ہے کہ جونہی اسرافیل کو وہ دونوں بازو سمیٹے دیکھے فوراً صور میں پھونک مار دے۔ یہی حدیث حضرت عائشہؓ کی روایت سے بھی آئی ہے، اس روایت میں ہے کہ حضرت عائشہؓ نے فرمایا میں نے خود سنا کہ رسول اللہ ﷺ فرما رہے تھے (یعنی حضرت عائشہؓ کی روایت مرفوع ہے) شیخ ابن حجرؒ نے کہا یہ حدیث دلالت کر رہی ہے کہ صور پھونکنے والا اسرافیل کے علاوہ کوئی اور ہے اس لئے (متضاد روایات میں توافق پیدا کرنے کے لئے) کہا جائے گا کہ صاحب صور جب اسرافیل کو دونوں بازو سمیٹے دیکھے گا تو پہلا صور پھونکے گا پھر مردوں کو قبروں سے اٹھانے کے لئے دوبارہ اسرافیل صور پھونکیں گے۔

ابوالشیخ ابن حبان نے کتاب العظمۃ میں ابوبکر ہذلی کا قول نقل کیا ہے کہ فرشتہ صور جس کے متعلق صور کی ڈیوٹی ہے اس کا ایک قدم زمین میں ہے اور وہ ایک زانو بیٹھے آنکھیں اسرافیل کی طرف اٹھائے تک رہا ہے۔ جب سے اللہ نے اس کو پیدا کیا کبھی اس نے پلک نہیں ماری انتظار میں ہے کہ کب اس کو اشارہ ہو اور وہ صور پھونکے۔

عٰلِمُ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ (وہ جاننے والا پوشیدہ چیزوں کا ظاہر چیزوں کا)۔ غیب سے مراد غیر موجود (یعنی جو ابھی معدوم ہے) اور شہادت سے مراد موجود (یعنی جو پیدا ہو چکا ہے) کیونکہ ہر موجود اللہ کے سامنے ہے اس سے آسمان و

زمین کا کوئی ذرہ چھپا ہوا نہیں۔

وَهُوَ الْحَكِيْمُ الْخَبِيْرُ ۝ (وہی حکمت والا اور خبر رکھنے والا ہے) شئی موجود و معدوم کرنے کی حکمت سے واقف ہے اور حساب، سزا، جزا اور مخلوق کے تمام احوال سے باخبر ہے۔

وَاِذْ قَالَ اِبْرٰهِيْمُ لِاَبِيْهِ اٰزَرَ (اور جب ابراہیم نے اپنے باپ آزر سے کہا)۔ آزر عجمی نام ہے۔ علمیت اور عجمیت کی وجہ سے غیر منصرف ہے (اس پر کسرہ اور تنوین نہیں آتا) بعض نے اس کو عربی لفظ کہا ہے اور ازر بمعنی قوت یا وزر بمعنی ثقل سے مشتق قرار دیا ہے۔ اس وقت اس کے عدم انصراف کی وجہ یہ ہے کہ اس میں علمیت اور وزن فعل ہے۔

صحیح تحقیق یہ ہے کہ آزر حضرت ابراہیم کا چچا تھا عرب چچا کو بھی باپ کہہ لیتے ہیں (اس لئے آیت میں باپ کہا گیا) جیسے اس آیت میں آیا ہے نَعْبُدُ اِلٰهَكَ وَاِلٰهَ اٰبَآئِكَ اِبْرٰهِيْمَ وَاِسْمٰعِيْلَ وَاِسْحٰقَ اِلٰهًا وَّاحِدًا۔ آزر کا اصل نام ناحور تھا ناحور بیٹے اپنے آباؤ اجداد کے دین توحید پر تھا لیکن نمرود کا وزیر ہونے کے بعد دین توحید چھوڑ کر دنیا کی لالچ میں کافر ہو گیا۔ امام رازی نے بھی صراحت کی ہے کہ آزر ابراہیم کا چچا تھا باپ نہ تھا۔ امام رازی سے پہلے بھی سلف کی ایک جماعت کا یہی قول تھا۔ زرقانی نے شرح مواہب میں لکھا ہے کہ آزر کے عم ابراہیم ہونے کی دلیل یہ ہے کہ شہاب بیہقی نے صراحت کی ہے کہ توریت وانجیل والوں نے نیز تمام اہل تاریخ نے اس کو ابراہیم کا چچا لکھا ہے۔ سیوطی نے لکھا ہے کہ ہم کو سندوں کے ساتھ یہ بات پہنچی ہے کہ حضرت ابن عباس، مجاہد، ابن جریر اور سدی قائل تھے کہ آزر ابراہیم کا باپ نہ تھا ابراہیم کے باپ کا نام تارخ تھا۔ سیوطی نے یہ بھی لکھا ہے کہ ابن منذر کی تفسیر میں مجھے ایک اثر (قول صحابی) ملا ہے کہ آزر ابراہیم کا چچا تھا۔

قاموس میں ہے آزر ابراہیم کا چچا تھا باپ تارخ تھا یا تارخ تھا یہ دونوں نام ایک ہی شخص کے تھے۔ آزر کے باپ نہ ہونے کی تائید اس تشریح سے ہوتی ہے جو سورۂ بقرہ کی آیت وَلَا تُسْئَلُ عَنْ اَصْحٰبِ الْجَحِيْمِ کی تفسیر کے ذیل میں ہم نے کی ہے ایک صحیح روایت میں آیا ہے کہ حضور ﷺ نے فرمایا بُعِثْتُ مِنْ خَيْرِ قُرُوْنِ بَنِيْ اٰدَمَ قَرْنًا فَقَرْنًا حَتّٰى كُنْتُ مِنَ الْقَرْنِ الَّذِيْ كُنْتُ مِنْهُ۔ رواہ البخاری۔

(اس حدیث سے ثابت ہو رہا ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے تمام آباؤ اجداد موحد گذرے ہیں کوئی مشرک نہیں ہوا اور آزر مشرک تھا اس لئے حضرت ابراہیم کا چچا ہو سکتا ہے باپ نہیں ہو سکتا) سیوطی نے حضرت آدم تک رسول ﷺ کے آباؤ اجداد کو مسلم ثابت کرنے کے لئے چند رسائل لکھے ہیں۔ محمد بن اسحٰق، ضحاک اور کلبی کا بیان ہے کہ آزر ابراہیم کے باپ کا نام تھا اسی کا نام تارخ بھی تھا جیسے اسرائیل و یعقوب دونوں ایک ہی شخص کے نام تھے۔ مقاتل ابن حبان نے ابراہیم کے باپ کا لقب آزر اور نام تارخ قرار دیا ہے۔

بخاری نے حضرت ابوہریرہؓ کی روایت سے لکھا ہے کہ قیامت کے دن حضرت ابراہیم کی ملاقات اپنے باپ آزر سے ہو گی۔ آزر کا چہرہ غبار آلود اور دخان آگیں ہو گا (جو دوزخی ہونے کی علامت ہو گی) حضرت ابراہیم فرمائیں گے کیا میں نے تجھ سے نہیں کہا تھا کہ میری نافرمانی نہ کر حضرت ابراہیم کا باپ جواب دے گا آج میں تیرے حکم کے خلاف نہیں کروں گا۔ حضرت ابراہیم دعا کریں گے اے میرے مالک تو نے مجھ سے وعدہ کیا تھا کہ جس روز لوگوں کو اٹھایا جائے گا اس روز تو مجھے رسوا نہ کرے گا مگر میرے باپ کی یہ حالت ہے اس سے زیادہ رسوائی اور کیا ہو گی۔ اللہ فرمائے گا میں نے کافروں کے لئے جنت حرام کر دی ہے۔ پھر حکم ہو گا ابراہیم اپنے قدموں کے نیچے دیکھو ابراہیم حکم کی تعمیل کریں گے تو ایک نر بجو کو ہر اور کیچڑ میں لتھڑا ہوا دکھائی دے گا، پھر اس کی ٹانگیں پکڑ کر دوزخ میں پھینک دیا جائے گا واللہ اعلم (اس روایت سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ آزر حضرت ابراہیم کا باپ تھا) سلیمان تیمی نے کہا آزر کے معنی ہے ٹیڑھا یا ایک برا لفظ ہے۔ بعض نے کہا فارسی میں اس کا معنی ہے پیر فرتوت۔ اس قول پر یہ لفظ فارسی قرار پائے گا اور چونکہ اس کے دوسرے ہم وزن (اسماء) غیر منصرف ہیں ان کی مشابہت وزنی کی وجہ سے اس کو بھی غیر منصرف پڑھا گیا۔ اول قول (یعنی علم ہونا) زیادہ صحیح ہے۔ سعید بن مسیب اور مجاہد نے کہا آزر بت کا نام تھا

چونکہ یہ شخص اس بت کا پرستار تھا اس لئے اس کو آزر کہا جانے لگا یوں کہا جائے کہ آزر اصل میں عبد آزر تھا لفظ عبد کو حذف کر دیا گیا۔ اگر آزر کو بت کا نام مانا جائے گا تو آزر کو نصب دینے والا ایک فعل مضمر ماننا ہوگا جس کی تفسیر آئندہ فعل مذکور کر رہا ہے۔

أَتَتَّخِذُ أَصْنَامًا آلِهَةً (یعنی کیا تو آزر کی پوجا کرتا ہے) کیا اس کو معبود بناتا ہے اور چونکہ یہ بتانا مقصود ہے کہ ابراہیمؑ کا باپ صرف آزر کی پوجا پر بس نہیں کرتا تھا بلکہ دوسرے بتوں کو بھی معبود بناتا تھا اس لئے تتخذ کے بعد اصناما آلهة فرمایا۔

إِنِّي أَرَاكَ وَقَوْمَكَ (میں تجھ کو اور تیری قوم کو (یعنی تیرے ہم مذہب لوگوں کو) دیکھتا ہوں کہ

فِي ضَلَالٍ مُّبِينٍ ۝ (کھلی ہوئی گمراہی میں)۔

وَكَذَٰلِكَ (اور اسی طرح) یعنی جس طرح الٰہۃ باطلہ کے خلاف ہم نے ابراہیمؑ کو حق دکھایا تھا اسی طرح۔

نُرِي إِبْرَاهِيمَ مَلَكُوتَ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ (ہم ابراہیمؑ کو آسمانوں اور زمین میں اپنی حکومت کا مشاہدہ کراتے تھے) نری میں گذشتہ حال کی حکایت کی گئی ہے (اس لئے حال کا صیغہ استعمال کیا) قاموس میں ہے ملکوت بروزن رہبوت و ترقوت غلبہ اور اقتدار یہ لفظ ملک سے مشتق ہے واؤ اور تاء مبالغہ کی ہے، اس لئے ملک سے زیادہ ملکوت کے معنی میں عظمت ہے (بڑی حکومت بڑا اقتدار) صحاح جوہری میں ہے کہ ملکوت صرف اللہ کی حکومت کو کہا جاتا ہے (کیونکہ اسی کی حکومت سب سے بڑی حکومت ہے) ملکوت کی اضافت السَّمَاوَات کی طرف اضافت الی المفعول ہے یعنی آسمان و زمین پر اللہ کا غلبہ و اقتدار۔ مجاہد اور سعید بن جبیر نے کہا مَلَكُوتَ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ سے مراد ہیں آسمان و زمین میں (اللہ کی قدرت و حکومت کی) نشانیاں۔ واقعہ اس طرح ہوا کہ حضرت ابراہیمؑ کو ایک پتھر پر کھڑا کیا گیا اور دیکھا پردے اٹھا دیئے گئے تمام آسمان و زمین یہاں تک کہ عرش بریں اور اسفل الارضین سب ہی کا مشاہدہ کرا دیا گیا، یہاں تک کہ آپ نے بہشت کے اندر اپنی جگہ بھی دیکھ لی۔ یہی مطلب ہے آیت وَآتَيْنَاهُ أَجْرَهُ فِي الدُّنْيَا کا یعنی ہم نے ابراہیمؑ کو ان کی جنتی جگہ (دنیا میں ہی) دکھا دی۔

حضرت سلمانؓ کا بیان ہے اور بعض اہل روایت نے اس کی نسبت حضرت علیؓ کی طرف بھی کی ہے کہ حضرت ابراہیمؑ کو جب آسمان و زمین میں اللہ کی قدرت و حکومت دکھائی گئی تو دوران مشاہدہ میں آپ نے دیکھا کہ ایک مرد ایک فاحشہ عورت پر سوار ہے، آپ نے بد دعا کی وہ فوراً غارت ہو گیا۔ پھر دوسرے شخص کو بھی اسی حالت میں دیکھا اور بد دعا کی وہ بھی ہلاک ہو گیا۔ پھر تیسرے شخص کی بھی یہی حالت دیکھی اور جونہی بد دعا کرنے کا ارادہ کیا تو اللہ نے فرمایا ابراہیمؑ تو مقبول الدعوات ہے میرے بندوں کے لئے بد دعا نہ کر، میرا تعلق اپنے (گنہگار) بندوں سے تین طرح کا ہے یا تو وہ (گناہ کے بعد) توبہ کر لیتا ہے تو میں اس کی توبہ قبول کر لیتا ہوں یا اس کی نسل سے کوئی ایسا شخص پیدا کر دیتا ہوں جو میری عبادت کرتا ہے یا (اسی گناہگار ہونے کی حالت میں) اس کو میرے پاس لایا جاتا ہے پھر میں اپنی مشیت کے مطابق اس کو معاف کر دیتا ہوں یا سزا دیتا ہوں۔ گناہگار بندوں سے میرے یہی تین سلوک ہوتے ہیں۔ دوسری روایت میں آیا ہے اگر وہ منہ پھیرتا ہے تو اس کے پیچھے جہنم موجود ہے (جس میں اس کو داخل کر دیا جائے گا)۔

قتادہ نے کہا مَلَكُوتُ السَّمَاوَاتِ چاند اور ستارے ہیں اور مَلَكُوتُ الْأَرْضِ پہاڑ، درخت اور سمندر۔

وَلِيَكُونَ مِنَ الْمُوقِنِينَ ۝ (اور تاکہ وہ (یعنی) یقین رکھنے والوں میں سے ہو جائے) اس جملہ کا عطف فعل محذوف پر ہے یعنی دیکھنے کے بعد وہ استدلال کرے اور مشاہدہ کے بعد عینی یقین کرے جیسا کہ اس کو اس سے پہلے بصیرت کی روشنی میں اللہ کی طرف سے یقین عطا فرمایا گیا تھا (اب بصری روشنی سے دیکھ کر صاحب یقین ہو جائے)

یا یوں مطلب کہا جائے کہ ہم نے ایسا اس لئے کیا کہ ابراہیمؑ شہودی یقین کرنے والوں میں سے ہو جائے۔

فَلَمَّا جَنَّ عَلَيْهِ اللَّيْلُ رَأَىٰ كَوْكَبًا (جب اس پر رات (کی تاریکی) چھا گئی تو اس نے ایک ستارہ دیکھا) یعنی زہرہ یا مشتری کا۔

قَالَ هٰذَا رَبِّیْ (تو کہا یہ میرا رب ہے) کافر بتوں اور ستاروں کی پوجا اور تعظیم کرتے تھے اور عقیدہ رکھتے تھے کہ تمام کام انہی کے ہاتھ میں ہیں حضرت ابراہیمؑ نے چاہا کہ اس گمراہی پر ان کو متنبہ کریں اور دلیل و برہان کے ساتھ راہ حق دکھائیں اس لئے هٰذَا رَبِّیْ فرمایا یعنی تمہارے خیال میں یہ میرا رب ہے یا هٰذَا سے پہلے ہمزہ استفہام محذوف ہے یعنی کیا یہ میرا رب ہے یا الزاماً فرضی یہ جملہ فرمایا یعنی بفرض محال یہ میرا رب ہے۔ اول مخالفوں کا مفروضہ بیان کیا تاکہ آگے ان کے قول کی تردید کی جائے۔ بعض علماء کے نزدیک جملہ کا ظاہری معنی ہی مراد ہے کسی تاویل کی ضرورت نہیں کیونکہ اس بات کو کہنے کے وقت حضرت ابراہیم طالب توحید اور خواستگار ہدایت تھے (ہدایت یافتہ اور پختہ کار نہ ہوئے تھے) استدلال کے موقع پر ایسا کلمہ زبان سے نکالنا کوئی جرم نہ تھا۔ بغوی نے لکھا ہے کہ حضرت ابراہیمؑ اس وقت بچہ تھے مکلف نہ ہوئے تھے اس لئے یہ کلمۂ کفر نہ تھا۔

بیضاویؒ نے لکھا ہے کہ وہ زمانہ آپ کے شعور یا آغاز بلوغ کا تھا۔ شرح خلاصۃ السیر میں مولانا ابو بکر نے لکھا ہے کہ چاند ستاروں سے استدلال کے وقت حضرت ابراہیمؑ پندرہ مہینے کے تھے مگر (یہ تمام اقوال غلط ہیں) صحیح پہلا ہی قول ہے کہ (جملہ استفہامیہ یا فرضیہ ہے) کیونکہ ہر پیغمبر ہر وقت موحد ہوتا ہے، کبھی کسی وقت مشرک نہیں ہو سکتا ایسا شرکیہ قول اس شخص سے کیسے سرزد ہو سکتا ہے جس کو اللہ نے معصوم و طاہر بنایا تھا اور سن رشد سے پہلے ہی اس کو رشد یافتہ کر دیا تھا۔ قاضی عیاض کی شفاء میں ہے کہ اللہ نے فرمایا ہے وَلَقَدْ اٰتَيْنَآ اِبْرٰهِيْمَ رُشْدَهٗ مِنْ قَبْلُ یعنی بچپن کے زمانہ میں ہی ہم نے ابراہیم کو ہدایت یافتہ بنا دیا تھا۔ مجاہد وغیرہ نے یہی مطلب بیان کیا ہے۔ ابن عطاء نے کہا پیدا کرنے سے پہلے ہی ان کو چن لیا تھا۔ بعض روایات میں آیا ہے حضرت ابراہیم پیدا ہوئے تو اللہ کی طرف سے ایک فرشتہ نے آکر کہا اللہ کو دل سے پہچانو اور زبان سے اس کی یاد کرو حضرت ابراہیمؑ نے فرمایا یہ تو میں نے کر لیا۔ آپ نے یہ نہیں فرمایا کہ میں ایسا کروں گا (یعنی مضارع کا صیغہ نہیں بولا ماضی کا صیغہ فرمایا یہی تو رشد تھا (جو اللہ نے پہلے سے ہی آپ کو عطا کر دیا تھا) اس آیت میں فَلَمَّا جَنَّ کا عطف قال پر ہے اور ف تعقیب ہے اور وَكَذٰلِكَ نُرِيْٓ اِبْرٰهِيْمَ مَلَكُوْتَ السَّمٰوٰتِ الخ جملہ معترضہ ہے گویا اَتَتَّخِذُ اَصْنَامًا اٰلِهَةً اِنِّيْٓ اَرٰىكَ وَقَوْمَكَ فِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ فرمانے کے بعد ہی آپ نے چاند ستاروں کے غروب سے اللہ کی ربوبیت پر استدلال کیا تھا اور اگر اس کلام کو بطریق استدلال قرار دیا جائیگا تو فاء تفصیل کے لئے ہوگی اور یہ وَكَذٰلِكَ نُرِيْٓ اِبْرٰهِيْمَ الخ کی تشریح و تفسیر ہو جائے گی اس صورت میں اس کلام کا وقت وہ ہوگا جب عقل و شعور کی دنیا میں قدم رکھنے کے بعد پہلی مرتبہ آپ نے ستارہ دیکھا جو کبھی پہلے نہیں دیکھا تھا۔ اہل تفسیر کی بنیاد کے طور پر اہل روایت ایک قصہ بیان کرتے ہیں جس کی تفصیل یہ ہے کہ نمرود بن کنعان (عراق کا بادشاہ تھا اس) نے سب سے پہلے اپنے لئے تاج بنوایا اور لوگوں کو اپنی پوجا کرنے کا حکم دیا اس کے دربار میں کچھ جوتشی اور نجومی بھی تھے ان جوتشیوں اور نجومیوں نے ایک بار نمرود سے کہا اس سال آپ کے ملک میں ایک لڑکا پیدا ہوگا جو اس ملک کے رہنے والوں کا مذہب تبدیل کر دے گا اور آپ کی جان اور حکومت اس کے ہاتھوں سے تباہ ہو جائے گی۔ یہ بھی روایت میں آیا ہے کہ سابق انبیاء کی کتابوں میں انہوں نے یہ لکھا پایا تھا۔ سدی کا بیان ہے کہ نمرود نے ایک خواب دیکھا تھا کہ ایک ستارہ ایسا طلوع ہوا جس کی روشنی کے سامنے چاند سورج کی روشنی جاتی رہی۔ نمرود اس خواب سے گھبرا گیا جادوگروں اور جوتشیوں کو طلب کر کے اس کی تعبیر پوچھی، تعبیر دینے والوں نے کہا اس سال آپ کی طرف ایک لڑکا پیدا ہوگا جو آپ کی اور آپ کے گھر والوں کی ہلاکت اور آپ کی سلطنت کے زوال کا باعث ہوگا۔ نمرود نے یہ سن کر حکم دے دیا کہ اس سال اس کے ملک میں جو لڑکا پیدا ہو اس کو قتل کر دیا جائے اور آئندہ مرد عورتوں سے الگ رہیں اور ہر دس آدمیوں پر ایک نگراں مقرر کر دیا جائے۔ یہ جاہلیت کے زمانہ میں مردوں کو عورتوں کے ساتھ اختلاط کی اجازت تھی کیونکہ حیض کی حالت میں وہ لوگ قربت صحبت نہیں کرتے تھے اور جب عورتیں پاک ہو جاتیں تو مرد عورت کا اختلاط ممنوع ہو جاتا۔ ایک روز آذر جو اپنی بیوی کے پاس گیا اور اس کو پاکی کی حالت میں پایا تو قربت کر بیٹھا اور حضرت ابراہیمؑ کا حمل قرار پا گیا۔

محمد بن اسحاق نے لکھا ہے کہ نمرود نے ہر حاملہ عورت کے پاس ایک نگراں مقرر کر رکھا تھا جو عورت کو اپنے پاس روکے رہتا تھا۔ البتہ حضرت ابراہیمؑ کی والدہ چونکہ کم سن تھیں اور ان کے پیٹ کے اندر حمل کی علامت نمایاں نہ تھی اس لئے ان پر کوئی نگراں مسلط نہ تھا۔ سدی نے ذکر کیا ہے کہ موعود بچہ کی پیدائش کے ڈر سے نمرود تمام مردوں کو لشکر گاہ میں لے کر چلا گیا تھا اور اس طرح مردوں کو عورتوں سے الگ کر دیا تھا کچھ مدت تک اسی حالت پر رہا پھر شہر میں آنے کی اس کو کوئی ضرورت پڑی اور سوائے آزر کے اس کو کوئی اور شخص نظر نہ آیا جس کو شہر میں (اپنی جگہ) بھیجنے پر اس کو اطمینان ہوتا مجبوراً آدمی بھیج کر آزر کو بلوایا آزر آگیا تو نمرود نے اس سے کہا میرا ایک کام ہے اور میں وہ کام تیرے سپرد کرنا چاہتا ہوں اور چونکہ مجھے تیرے اوپر اعتماد ہے اس لئے اس کام کے لئے تجھے بھیج رہا ہوں مگر تجھے قسم دیتا ہوں کہ اپنی بیوی کے پاس نہ جانا آزر نے کہا مجھے بیوی کے پاس جانے سے زیادہ مذہب زیادہ پیارا ہے۔ نمرود نے کام بتا کر آزر کو روانہ کر دیا آزر نے شہر میں جا کر کام سر انجام دیا پھر دل میں کہا اگر میں گھر جا کر گھر والوں کو دیکھتا چلوں تو کیا حرج ہے یہ سوچ کر گھر پہنچا اور ابراہیمؑ کی ماں کو دیکھ کر اپنے کو قابو میں نہ رکھ سکا اور قربت کر بیٹھا نتیجہ میں وہ حاملہ ہو گئی اور ابراہیمؑ کا حمل قرار پا گیا۔

حضرت ابن عباسؓ کا بیان ہے جب حضرت ابراہیمؑ کی ماں حاملہ ہو گئی تو کاہنوں نے نمرود سے کہا جس لڑکے کی ہم نے آپ کو اطلاع دی تھی اس کی ماں آج رات حاملہ ہو گئی۔ نمرود نے فوراً لڑکوں کو قتل کرنے کا حکم دے دیا۔ جب ابراہیمؑ کی پیدائش کا وقت قریب آگیا اور ماں کو درد زہ ہونے لگا تو وہ بھاگ کر بستی سے باہر نکل گئی کہ کہیں کسی کو اطلاع ہو گئی تو بچہ کو قتل کر دیا جائے گا اور (جنگل میں پہنچ کر) ایک خشک کھاتی میں اس کا بچہ پیدا ہوا اس نے آکر اپنے شوہر کو اطلاع دے دی کہ میرے بچہ پیدا ہو گیا اور فلاں جگہ موجود ہے باپ نے وہاں جا کر بچہ کو لے کر ایک سرنگ کھود کر اس کے اندر بچہ کو چھپا دیا اور درندوں کے خوف سے سرنگ کا دروازہ پتھر سے بند کر کے چلا آیا۔ ماں وہاں آتی جاتی اور دودھ پلایا کرتی۔

محمد ابن اسحاق کا بیان ہے کہ حضرت ابراہیمؑ کی والدہ کو جب درد زہ ہوا تو وہ رات کو نکل کر قریب کے ایک غار میں چلی گئی غار کے اندر ابراہیمؑ پیدا ہو گئے نوزائیدہ بچہ کا جو کام ہوتا ہے ماں وہ سب کام ٹھیک کر کے غار کا دروازہ بند کر کے گھر کو لوٹ آئی، پھر دیکھ بھال کرتی رہی جب وہاں جاتی تو ابراہیمؑ کو زندہ انگوٹھا چوستے پاتی۔ ابو روق کا بیان ہے ایک روز حضرت ابراہیمؑ کی ماں نے کہا آج میں اس کی انگلیاں دیکھوں گی۔ چنانچہ انگلیاں دیکھیں تو آپ ایک انگلی سے پانی، دوسری سے شہد، تیسری سے دودھ، چوتھی سے چھوارا اور پانچویں سے گھی چوس رہے تھے۔ محمد بن اسحق کا بیان ہے آزر نے ابراہیمؑ کی ماں سے پوچھا حمل کا کیا ہوا ماں نے کہا لڑکا پیدا ہوا تھا مگر مر گیا۔ آزر کو یقین آگیا اور خاموش ہو رہا۔ ابراہیمؑ کے لئے ایک دن ایک ماہ کی طرح اور ایک مہینہ سال کی طرح (نمو کے اعتبار سے) ہوتا تھا۔ غار کے اندر آپ صرف پندرہ مہینے رہے آخر ایک روز ماں سے کہا مجھے یہاں سے باہر نکال لو ماں عشاء کے وقت آپ کو باہر لائی آپ نے کائنات سماوی و ارضی کو دیکھا اور غور کیا اور فرمایا جس نے مجھے پیدا کیا اور کھلایا پلایا وہی میرا پروردگار ہے، اس کے سوا میرا کوئی اور معبود نہیں۔ پھر آسمان پر غور سے دیکھا تو ایک ستارہ نظر آیا بولے یہ میرا رب ہے اس کے بعد اس کے پیچھے نظر لگائے دیکھتے رہے آخر وہ غائب ہو گیا آپ نے کہا غائب ہونے والوں کو میں نہیں چاہتا پھر چاند کو چمکتا دیکھ کر بولے یہ میرا رب ہے اس کے پیچھے بھی نگاہ لگائے رکھی آخر وہ بھی ڈوب گیا۔ پھر سورج نکلا اور مندرجہ بالا صورت ہوئی پھر اپنے باپ آزر کے پاس لوٹ کر آئے تو رخ درست ہو چکا تھا رب کو پہچان چکے تھے اور اپنی قوم کے مذہب سے بیزار ہو گئے تھے مگر قوم پر یہ بات ظاہر نہیں کی اور باپ سے آکر کہا میں آپ کا بیٹا ہوں ماں نے بھی بتایا کہ واقعی یہ تمہارا بیٹا ہے اور میں نے یہ کام کیا تھا آزر اس سے بہت خوش ہوا ایک روایت میں آیا ہے سرنگ کے اندر آپ دس سال رہے دوسری روایت میں سات سال اور تیسری میں سترہ سال رہنے کا ذکر آیا ہے۔

میں کہتا ہوں اگر اس قصہ کو صحیح تسلیم بھی کر لیا جائے تب بھی حضرت ابراہیمؑ کے ماں باپ کا کافر ہونا اس سے ثابت نہیں ہوتا ہاں اتنی بات ضرور ہے کہ اس میں حضرت ابراہیمؑ کے باپ کا نام آزر بتایا گیا ہے اور آزر کے کافر ہونے کی صراحت

قرآن مجید اور حدیث مبارک میں آچکا ہے۔ لیکن اس قصہ میں لفظ آزر کا آنا بعض راویان قصہ کا وہم ہے (اصل بیان میں صرف ابراہیمؑ کے باپ کا ذکر ہے آزر کا نہیں بلکہ اصل قصہ بعض راویوں نے اس طرح بیان کیا کہ جب سرنگ کے اندر حضرت ابراہیم جوان ہو گئے تو انہوں نے اپنی ماں سے پوچھا میرا پروردگار کون ہے۔ ماں نے کہا میں۔ حضرت ابراہیمؑ نے فرمایا تیرا پالنے والا کون ہے۔ ماں نے کہا تیرا باپ۔ حضرت ابراہیم نے فرمایا میرے باپ کا پالنے والا کون ہے۔ ماں نے کہا نمرود۔ حضرت ابراہیم نے فرمایا نمرود کا رب کون ہے۔ ماں نے کہا خاموش ہو جا۔ حضرت ابراہیم خاموش ہو گئے ماں نے واپس جا کر اپنے شوہر سے کہا دیکھو تو جس لڑکے کے متعلق ہم سے کہا جاتا تھا کہ وہ (اس) ملک والوں کے مذہب کو بگاڑ دے گا وہ آپ ہی کا بیٹا ہے پھر ابراہیم کا قول اس نے نقل کیا باپ فوراً ابراہیم کے پاس پہنچا آپ نے اس سے بھی پوچھا اباجی مجھے پالنے والا کون ہے۔ باپ نے کہا تیری ماں۔ حضرت نے فرمایا میری ماں کو پالنے والا کون ہے۔ باپ نے کہا میں۔ آپ نے پوچھا آپ کو پالنے والا کون ہے۔ باپ نے کہا نمرود۔ ابراہیمؑ نے فرمایا نمرود کا رب کون ہے۔ یہ سن کر باپ نے ایک طمانچہ مارا اور کہا چپ۔ پھر جب رات چھا گئی تو حضرت ابراہیم نے سرنگ کے دروازہ کے پاس آ کر پتھر کی جھری سے باہر کو دیکھا تو ایک ستارہ نظر آیا آپ نے کہا یہ میرا رب ہے۔ ایک روایت میں آیا ہے کہ حضرت ابراہیمؑ نے اپنے والدین سے کہا مجھے یہاں سے نکالو والدین نے سرنگ سے باہر نکالا اور غروب آفتاب کے بعد ساتھ لے چلے۔ حضرت ابراہیمؑ نے کچھ اونٹ گھوڑے اور بکریاں دیکھیں اور باپ سے پوچھا یہ کیا ہیں۔ باپ نے کہا اونٹ، گھوڑے اور بکریاں ہیں۔ حضرت ابراہیم نے فرمایا ان کو پالنے اور پیدا کرنے والا ضرور کوئی ہوگا۔ پھر (آسمان کی طرف) نظر کی تو مشتری دکھائی دیا زہرہ دکھائی دیا مہینہ کی آخری رات تھی چاند کا طلوع آخر رات میں ہونے والا تھا چاند سے پہلے آپ نے ستارہ دیکھا تھا۔ آیت فَلَمَّا جَنَّ عَلَيْهِ الَّيْلُ رَاٰ كَوْكَبًا میں اسی کا بیان ہے۔ یہ بیان حضرت ابراہیمؑ کے والدین کے کافر ہونے پر ضرور دلالت کر رہا ہے مگر اس سے یہ نہیں معلوم ہوتا کہ کفر کی حالت ہی میں ان کی موت ہوئی۔ پھر یہ بیان مختلف مضطرب ضعیف بھی ہے اور صحیح سند سے ثابت نہیں اس کے مقابلہ میں رسول اللہ ﷺ کی صحیح حدیث ہے کہ حضرت آدمؑ سے لے کر آپ کے والدین تک حضور ﷺ کے تمام آباؤ اجداد مؤمن تھے پاک لوگوں کی پشت سے پاک عورتوں کے رحم کی طرف اور پاک عورتوں کے رحم سے پاک مردوں کی پشت کی طرف آپ کا انتقال ہوتا رہا (یہاں تک کہ پاک ماں باپ کے بطن و صلب سے آپ ﷺ پیدا ہوئے) آیت وَتَقَلُّبَكَ فِي السّٰجِدِيْنَ کو اسی معنی پر محمول کیا گیا ہے اور چچا کو باپ کہنا عام محاورہ ہے خصوصاً اس صورت میں جب چچا نے پرورش کی ہو اور یہ ممکن ہے کہ تارخ (حضرت ابراہیمؑ کا باپ) ابراہیمؑ کو دودھ پیتا شیر خوارگی کی حالت میں چھوڑ کر مر گیا ہو اور چچا آزر نے آپ کی پرورش کی ہو۔ واللہ اعلم

فَلَمَّآ اَفَلَ قَالَ لَآ اُحِبُّ الْاٰفِلِيْنَ ۝ (پھر جب ستارہ چھپ گیا تو ابراہیم نے کہا میں غائب ہونے والوں کو پسند نہیں کرتا) یعنی جس کے احوال میں تغیر ہوتا رہے اس کی پوجا کرنے کو پسند نہیں کرتا کیونکہ تغیر احوال حادث ہونے کی نشانی ہے جو قدیم ہو اس کے احوال حادث نہیں ہو سکتے اور حادث قابل عبادت نہیں۔

فَلَمَّا رَاَ الْقَمَرَ بَازِغًا قَالَ هٰذَا رَبِّيْ ۚ (پھر جب چاند (ابتداء طلوع کے وقت) چمکتا دیکھا تو اس نے کہا یہ میرا رب ہے۔)

حضرت ابراہیمؑ کے اندر قوت فکریہ کامل تھی اور ستارہ کے غروب سے (توحید پر) استدلال کامل ہو چکا تھا مزید دلیل کی ضرورت نہ تھی لیکن مشرکوں کو مزید شکست دینے کے لئے آپ نے اپنے استدلال کے دائرہ کو وسیع کیا اور چاند و سورج سے بھی استدلال کیا۔

فَلَمَّآ اَفَلَ قَالَ لَئِنْ لَّمْ يَهْدِنِيْ رَبِّيْ لَاَكُوْنَنَّ مِنَ الْقَوْمِ الضَّآلِّيْنَ ۝ (پھر جب چاند بھی چھپ گیا تو ابراہیم نے کہا اگر میرا رب ہی مجھے سیدھی راہ نہ بتائے گا تو میں گمراہ لوگوں میں سے ہو جاؤں گا) اللہ کی طرف سے ہدایت ملنے کی نعمت کا شکر ادا کرنے کے لئے مذکورہ بالا الفاظ حضرت ابراہیمؑ نے کہے جیسا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تھا اگر

اللہ کی طرف سے توفیق نہ ہوتی تو ہم نہ ہدایت یاب ہوتے نہ صدقہ دیتے نہ نماز پڑھتے۔ مذکورہ بالا قول میں حضرت ابراہیم نے اپنی قوم کو راہ حق بتائی ہے اور تنبیہ کی ہے کہ چاند بھی قابل عبادت نہیں جس کے احوال بھی تغیر پذیر ہیں جو اس کو معبود قرار دے کا گمراہ ہو جائے گا طلوع اور غروب دونوں سے حالات کے تغیر کا پتہ لگتا ہے لیکن غروب زوال کی حالت ہے (اور طلوع عروج کی) اور زوال کی حالت سے ناقابل عبادت ہونے پر استدلال زیادہ واضح ہے۔ اس لئے حضرت نے غروب قمر سے استدلال کیا طلوع سے نہیں کیا۔

فَلَمَّا رَاَ الشَّمْسَ بَازِغَةً قَالَ هٰذَا رَبِّیْ هٰذَآ اَكْبَرُ (پھر جب سورج کو دمکتا دیکھا تو اس نے کہا یہ میرا رب ہے یہ سب سے بڑا ہے) (یعنی تمام ستاروں سے بڑا ہے) شَمْسٌ عربی زبان میں مونث اور هٰذَا (اسم اشارہ مذکر) ہے اشارہ سورج کی طرف ہے کیونکہ هٰذَا کی خبر رَبِّیْ مذکر ہے (اور جو اسم اشارہ مبتدا ہو اور خبر کے درمیان واقع ہوتا ہے اس میں مشار الیہ کی تذکیر و تانیث قابل لحاظ نہیں ہوتی خبر کا مذکر مونث ہونا ملحوظ رہتا ہے) بعض اہل تفسیر نے لکھا ہے کہ هٰذَا سے اشارہ نکلنے والے (یعنی طالع) کی طرف ہے یا روشنی کی طرف ہے یعنی چمک اور نور۔

میں کہتا ہوں کہ لفظ شَمْسٌ کی تانیث صرف سماعی ہے کیونکہ اس کی تصغیر شُمَیْسَۃٌ آتی ہے (اور تصغیر میں اصلی حروف ظاہر کر دیئے جاتے ہیں) اور حضرت ابراہیم کی زبان عربی نہیں تھی آپ کی زبان میں سورج مذکر تھا اپنی زبان کے اعتبار سے انہوں نے اشارہ بصیغہ مذکر ذکر کیا ہو گا اور اللہ نے انہی کے زبان کے استعمال کا لحاظ کر کے اشارہ کو عربی زبان میں ذکر رہنے دیا۔

حضرت ابراہیم نے هٰذَآ اَكْبَرُ استدلال کے اعتبار سے اور مشرکوں کے شبہ کو ظاہر کرنے کی غرض سے فرمایا (یعنی مشرکوں کو غیر اللہ کی ربوبیت کا شبہ سورج کو دیکھ کر زیادہ ہو سکتا ہے)

فَلَمَّآ اَفَلَتْ قَالَ یٰقَوْمِ اِنِّیْ بَرِیْٓءٌ مِّمَّا تُشْرِكُوْنَ ۝ (پھر جب وہ ڈوب گیا تو ابراہیم نے کہا اے میری قوم والو (تم جن چیزوں کو (معبود برحق کا عبادت میں) شریک بناتے ہو میں ان سب سے بیزار ہوں) ستارے اور چاند سورج اجرام علوی ہیں بڑے بڑے ہیں روشن ہیں، مگر الوہیت کے قابل نہیں۔ سب حوادث ہیں، خود حادث ہیں ان کے احوال حادث ہیں پیدا کرنے والے کے محتاج ہیں اور ایسی ذات کے ضرورت مند ہیں جس نے ان کو یہ مخصوص احوال عطا فرمائے ہیں، ان کے مقابلہ میں بت اور دوسرے سفلی اجسام بہت حقیر ہیں اور ناقابل عبادت ہیں۔ حضرت ابراہیم نے اسی لئے اجرام علویہ کے حالات کو دیکھ کر تمام علوی اور سفلی اجرام کی الوہیت سے بیزاری کا اظہار کر دیا جب علوی اجرام قابل الوہیت نہیں تو سفلی اجسام کیسے معبود ہو سکتے ہیں حضرت ابراہیم نے پہلے استدلال کیا پھر قوم کو خطاب کر کے غیر اللہ کی الوہیت سے بیزاری کا اظہار کیا اس سے صاف معلوم ہو رہا ہے کہ حضرت ابراہیم کو مسئلہ توحید کی تحقیق پہلے ہو چکی تھی یہ کلام بول کر فقط مشرکوں کو لاجواب بنانا مقصود تھا۔

باطل معبودوں سے اظہار برأت کرنے کے بعد آئندہ کلام میں آپ نے قوم کو اللہ حق کی ہستی کی طرف رہنمائی کی جس کے وجود پر تمام ممکنات دلالت کر رہے ہیں چنانچہ فرمایا۔

اِنِّیْ وَجَّهْتُ وَجْهِیَ لِلَّذِیْ فَطَرَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ حَنِیْفًا وَّمَآ اَنَا مِنَ الْمُشْرِكِیْنَ ۝ (میں سب کو چھوڑ کر اپنا منہ اس کی طرف موڑتا ہوں جس نے آسمان و زمین کو پیدا کیا اور میں اس کے ساتھ کسی اور کو ساجھی قرار دینے والوں میں سے نہیں ہوں) یعنی آسمان اور اس کی ساری کائنات اور زمین اور اس کی تمام موجودات اپنے وجود میں ایک واجب الوجود ہستی کی محتاج ہیں جو ان کو عدم سے وجود میں لانے والی ہے۔ میں نے اس کی طرف اپنا رخ پھیر لیا اور تمام مذاہب کو چھوڑ کر اسی کی اطاعت اختیار کر لی۔

وَحَآجَّهٗ قَوْمُهٗ (اور ابراہیم سے اس کی قوم نے حجت کرنی شروع کر دی) یعنی توحید اور نفی شرک کے مسئلہ میں جھگڑنے لگے جب استدلال صحیح کے مقابلہ سے عاجز اور لاجواب ہو گئے تو جھگڑے پر اتر آئے، کہنے لگے

ہمارے معبودوں سے ڈر، کہیں تجھے کسی دکھ میں مبتلا کردیں اور نمرود سے بھی ڈر ورنہ کہیں تجھے قتل کردے یا جلادے۔

قَالَ اَتُحَآجُّوْٓنِّیْ فِی اللّٰهِ وَقَدْ هَدٰىنِ ؕ (ابراہیمؑ نے کہا کیا اللہ کی ہستی اور توحید پر عقلی استدلال کے بعد بھی خواہ مخواہ) تم اللہ کے معاملہ میں مجھ سے جھگڑتے ہو حالانکہ اسی نے مجھے ہدایت کردی (یعنی باوجودیکہ میں کم عمر اور ان پڑھ ہوں مگر اسی نے مجھے حق اور استدلال کا راستہ بتادیا۔

وَلَآ اَخَافُ مَا تُشْرِكُوْنَ بِهٖٓ (اور جس چیز کو تم اس کا شریک قرار دیتے ہو میں اس سے نہیں ڈرتا) یعنی ممکنات میں سے کوئی ہو خواہ علویات میں سے ہو جیسے چاند، سورج، ستارے یا عنصریات میں (آگ، پانی، ہوا، مٹی اور ان کے مرکبات) پھر ذی عقل عنصری مرکب ہو جیسے نمرود یا جماد ہو جیسے بت میں کسی سے نہیں ڈرتا، یہ سب میری طرح عاجز ہیں، بغیر اللہ کے خود نفع نقصان پہنچانے کی قدرت نہیں رکھتے بلکہ بعض مجھ سے بھی زیادہ عاجز ہیں (جیسے جمادات نباتات) روایت میں آیا ہے کہ حضرت ابراہیمؑ جب سرنگ سے برآمد ہوئے اور مشرکوں کو ان سے کوئی امید نہ رہی اور آزر نے ان کو اپنا لیا تو خود مورتیاں بنا کر بیچنے کے لئے ابراہیمؑ کو دیں۔ آپ مورتیاں لے کر بازار گئے اور آواز لگائی۔ مجھ سے کوئی ایسی چیز خریدتا ہے جو ضرر رساں ہے فائدہ بخش بالکل نہیں۔ نتیجہ میں کسی نے نہیں خریدی شام کو آپ سب مورتیاں واپس لے آئے اور نہر پر لے جاکر ایک مورتی کو پکڑ کر اس کا منہ پانی کی طرف جھکا کر کافروں کا مذاق اڑانے کے لئے کہنے لگے پانی پی۔

اِلَّآ اَنْ يَّشَآءَ رَبِّیْ شَيْـًٔا ؕ (مگر یہ کہ میرے رب کی مشیت ہو) یعنی تمہارے معبود جن کو تم اللہ کا شریک قرار دیتے ہو مجھے بھی کوئی دکھ نہیں پہنچا سکتے ہاں جس وقت میرا رب ہی دکھ پہنچانا چاہے (تو اس وقت کسی ذریعہ سے مجھے دکھ پہنچ سکتا ہے

وَسِعَ رَبِّیْ كُلَّ شَیْءٍ عِلْمًا ؕ (میرے رب کا علم ہر چیز کو اپنے اندر سمائے ہوئے ہے) ہر چیز کو محیط ہے۔ یہ فقرہ گویا استثناء کی علت ہے۔ یعنی یہ ہو سکتا ہے کہ اللہ کے علم میں یہ بات ہو کہ اس کی مشیت اور عطاء اختیار کی وجہ سے بعض مخلوقات کی طرف سے مجھے دکھ پہنچ جائے تو در حقیقت رب کا پہنچایا ہوا ہوگا۔

اَفَلَا تَتَذَكَّرُوْنَ ۝ (کیا اب بھی تم نہیں سمجھتے) کہ ایک ہستی مکمل بااقتدار و قہار ہے (یعنی اللہ) اور کچھ مخلوق بالکل پورے طور پر عاجز جیسے بت اور کچھ ہستیاں اپنی ذات سے اقتدار کے تو عاجز و بے اختیار ہیں لیکن ان کو قدرت و اختیار دے سکتا ہے اور وہ (ظاہر مجازی) قادر ہو سکتی ہیں ان ہستیوں کے فرق کو کیا تم نہیں جانتے۔

وَكَيْفَ اَخَافُ مَآ اَشْرَكْتُمْ (اور جن کو تم نے اللہ کا شریک بنا رکھا ہے، میں ان سے کس طرح ڈر سکتا ہوں) ان میں سے تو کوئی اللہ کی مشیت کے بغیر مجھے دکھ نہیں پہنچا سکتی۔

وَلَا تَخَافُوْنَ اَنَّكُمْ اَشْرَكْتُمْ بِاللّٰهِ مَا لَمْ يُنَزِّلْ بِهٖ عَلَيْكُمْ سُلْطٰنًا ؕ (حالانکہ (جو بات حقیقت میں ڈرنے کی ہے وہ یہ ہے کہ خالق کل، قادر مطلق، حقیقی فائدہ بخش، نفع رساں ہستی کا کسی کو ساجھی قرار دیا جائے مگر) تم اس بات کا خوف نہیں کرتے کہ اللہ کے ساتھ تم ایسی ہستیوں کو شریک بناتے ہو جن کو شریک قرار دینے کی اللہ نے تمہارے لئے کوئی دلیل نہیں اتاری (نہ عقلی نہ نقلی)۔

فَاَیُّ الْفَرِيْقَيْنِ اَحَقُّ بِالْاَمْنِ ۚ (پس (دنیا و آخرت کے عذاب و شدائد سے) محفوظ رہنے کا زیادہ مستحق دونوں فریقوں میں سے کون سا فریق ہے)۔ اہل توحید کا گروہ جس کا عقیدہ عقل و نقل کے تقاضوں کے موافق ہے یا اہل شرک کا گروہ جن کے پاس اپنے شرکیہ عقیدہ کی کوئی دلیل نہیں۔ اَیُّ الْفَرِيْقَيْنِ فرمایا اَیُّنَا (ہم میں سے کون) نہیں فرمایا کیونکہ اَیُّنَا کہنے میں تزکیہ خودی کا شائبہ تھا پھر اس بات کی طرف بھی اشارہ کرنا تھا کہ استحقاق امن کی خصوصیت صرف میری ذات کے ساتھ نہیں بلکہ اہل توحید کا پورا گروہ اس کا مستحق ہے کوئی بھی ہو اور پردہ اس میں مشرکوں کو توحید کی ترغیب بھی دی ہے۔

اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ۝ (اگر تم جانتے ہو) کہ کس سے ڈرنا چاہئے تو صرف اللہ سے ڈرو اس کے سوا کسی سے نہ ڈرو۔ اِنْ کی جزا محذوف

ہے جس پر کلام سابق دلالت کر رہا ہے یا کُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ بمعنی فعل نہیں بلکہ اسم فاعل کے معنی میں ہے اس صورت میں (یہ معنی ہوگا کہ اگر تم اہل بصیرت اور دانش مند ہو تو میرے سوال کا جواب انصاف کے ساتھ دو۔

اَلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَلَمْ یَلْبِسُوْٓا اِیْمَانَهُمْ بِظُلْمٍ اُولٰٓئِكَ لَهُمُ الْاَمْنُ وَهُمْ مُّهْتَدُوْنَ۝

(جو لوگ (اللہ پر) ایمان لائے اور اپنے ایمان کو ظلم آمیز یعنی شرک آلود نہیں کیا انہی کیلئے عذاب سے حفاظت ہے اور وہی حق یا جنت کا راستہ پانے والے ہیں) حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کا بیان ہے کہ جب یہ آیت اتری تو مسلمانوں پر بڑی شاق گذری انہوں نے عرض کیا یارسول اللہ ﷺ ہم میں سے کون (باوجود مومن ہونے کے) اپنے نفس پر ظلم نہیں کرتا (پھر ہمارے محفوظ رہنے کی کیا شکل ہے) حضور ﷺ نے فرمایا ظلم (سے مراد) شرک ہے کیا تم نے لقمان کا وہ قول نہیں سنا جو انہوں نے اپنے بیٹے کو نصیحت کرتے ہوئے کہا تھا یا بُنَیَّ لَا تُشْرِكْ بِاللّٰهِ اِنَّ الشِّرْكَ لَظُلْمٌ عَظِیْمٌ (رواہ البخاری و مسلم)۔

حضرت ابراہیمؑ نے مشرکوں سے یہ سوال کیا تھا کہ محفوظ رہنے کا مستحق کون ہے۔ مشرکوں کی طرف سے جب کوئی جواب نہیں ملا تو حضرت ابراہیمؑ نے خود فرمایا اَلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا الخ اس صورت میں یہ ابراہیمؑ کا کلام ہوگا جو اللہ نے نقل فرمایا ہے یا یہ اللہ نے اپنی طرف سے فیصلہ فرمایا اور یہ ہر او رحمت اللہ کا قول ہے۔ ابن ابی حاتم نے بکر بن سوادہ کا بیان نقل کیا ہے کہ ایک دشمن نے مسلمانوں پر حملہ کر کے ایک مسلمان کو مار ڈالا پھر دوبارہ حملہ کر کے دوسرے مسلمان کو قتل کر دیا پھر تیسری مرتبہ حملہ کر کے ایک اور مسلمان کو قتل کر دیا پھر (مسلمان ہونے کے ارادہ سے رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا اور) عرض کیا اس حالت میں بھی مجھے اسلام سے فائدہ پہنچ سکتا ہے، حضور ﷺ نے فرمایا ہاں وہ شخص فوراً مسلمانوں میں شامل ہو گیا (یعنی مسلمان ہو گیا) پھر اپنے (گزشتہ) ساتھیوں پر حملہ کر کے ایک کو پھر دوسرے کو قتل کر دیا پھر تیسرے کو مار ڈالا۔ لوگوں کا خیال ہے کہ آیت مذکورہ کا نزول اسی شخص کے حق میں ہوا۔

وَتِلْكَ (اور یہ) تِلْكَ سے فَلَمَّا جَنَّ عَلَیْهِ الَّیْلُ سے مُهْتَدُوْنَ تک جس مضمون کو بیان کیا ہے اس کی طرف اشارہ ہے اس سے صاف ظاہر ہے کہ حضرت ابراہیمؑ نے جو ستارے اور چاند سورج کو رب قرار دیا اور ان کے زوال کو دیکھ کر ان کی ربوبیت سے گریز کیا یہ حضرت ابراہیمؑ کا اپنے اطمینان کے لئے مقام تفکر نہ تھا۔ نفوس قدسیہ کو ان فکری استدلالات کی ضرورت نہیں ہوتی بلکہ قوم کو غلطی پر متنبہ کرنے کے لئے تھا۔ بعض اہل تفسیر نے لکھا ہے کہ تِلْكَ سے اس دلیل کی طرف اشارہ ہے جو حضرت ابراہیمؑ نے نمرود کے مقابلہ میں پیش کی تھی جس کا ذکر سورۂ بقرہ میں گذر چکا ہے مگر یہ قول بعید از قرینہ ہے اول تفسیری صحیح ہے۔

حُجَّتُنَآ (ہماری (تعلیم کردہ) دلیل تھی) یہ اسم اشارہ کی خبر یا صفت یا بدل ہے۔

اٰتَیْنٰهَآ اِبْرٰهِیْمَ عَلٰی قَوْمِهٖ (جو ہم نے ابراہیم کو اس کی قوم کے مقابلہ میں عطا کی تھی) عطا کرنے سے مراد ہے بتا دینا اور قوم سے مراد ہیں نمرود اور اس کے ہم مذہب۔ اگر حُجَّتُنَا کو خبر یا صفت قرار دیا جائے گا تو عَلٰی قَوْمِهٖ کا تعلق حُجَّتُنَا سے ہوگا اور اگر حُجَّتُنَا کو اسم اشارہ سے بدل کہا جائے گا تو عَلٰی قَوْمِهٖ کا تعلق فعل محذوف سے ہوگا۔

نَرْفَعُ دَرَجٰتٍ مَّنْ نَّشَآءُ (ہم جس کو چاہتے ہیں کتنے ہی درجے اونچا کر دیتے ہیں) یعنی علم و حکمت کے درجات (دے کر) عالی مرتبہ کر دیتے ہیں درجت یا تمیز ہے یا مفعول مطلق۔

اِنَّ رَبَّكَ حَكِیْمٌ (بے شک آپ کا رب (کسی کو اونچا کرنے میں) حکمت والا ہے)۔

عَلِیْمٌ۝ جس کو اونچا کرتا ہے اس کی حالت اور قابلیت کو (خوب جانتا ہے)۔

وَوَهَبْنَا لَهٗٓ اِسْحٰقَ وَیَعْقُوْبَ (اور ہم نے ابراہیمؑ کو بخشا (ایک بیٹا) اسحاقؑ اور (ایک پوتا) یعقوبؑ۔)

كُلًّا هَدَیْنَا (اور (دونوں میں سے) ہر ایک کو ہدایت دی) یعنی كُلًّا کی تنوین مضاف الیہ کے عوض ہے۔

وَنُوْحًا هَدَیْنَا مِنْ قَبْلُ (اور ابراہیمؑ سے پہلے نوحؑ کو ہدایت عنایت کی) حضرت نوحؑ حضرت ابراہیمؑ کے

سلسلہ اجداد میں تھے اس لئے حضرت نوحؑ کے ہدایت یافتہ ہونے کو حضرت ابراہیمؑ کے لئے نعمت قرار دیا اس سے معلوم ہوا کہ والد کا شرف اولاد کی طرف، اولاد کا شرف والد کی طرف منتقل ہوتا ہے۔

میں کہتا ہوں اس صورت میں ممکن نہیں کہ رسول اللہ ﷺ کے آباؤ اجداد میں سے کوئی کافر ہو آپ تو اللہ کے محبوب تھے (اور محبت کا تقاضا ہے کہ شرف کامل عطا کیا جائے)

وَمِنْ ذُرِّيَّتِهِ دَاوُدَ وَسُلَيْمَانَ وَأَيُّوبَ وَيُوسُفَ وَمُوسَىٰ وَهَارُونَ ۚ (اور اس کی یعنی نوحؑ یا ابراہیمؑ کی) نسل میں سے ہم نے ہدایت کی داؤد (بن ایشا) کو اور سلیمان (بن داؤد) کو اور ایوبؑ (بن اموص بن رازح بن روم بن عیص بن اسحاق بن ابراہیم) کو اور یوسف (بن یعقوب بن اسحاق) کو اور موسیٰ (بن عمران بن یصہر بن قاہث بن لاوی بن یعقوب) کو اور (موسیٰ کے بھائی) ہارون کو (جو موسیٰ سے سال بھر بڑے تھے) مِنْ ذُرِّيَّتِهِ کی ضمیر ابراہیمؑ کی طرف لوٹ رہی ہے کیونکہ کلام آپ ہی کے متعلق ہے۔ بعض کے نزدیک نوحؑ کی طرف راجع ہے۔ نوح کا لفظ قریب مذکور ہے۔ اس کے علاوہ یونسؑ اور لوطؑ حضرت ابراہیمؑ کی نسل میں سے نہیں تھے، حضرت نوحؑ کی نسل میں سے تھے یہی زیادہ ظاہر ہے کہ لیکن اگر ابراہیم کی طرف ضمیر راجع قرار دی جائے تو اس آیت اور اس کی بعد والی آیت میں جن انبیاء کے نام آئے ہیں صرف انہی کے ساتھ مِنْ ذُرِّيَّتِهِ کی خصوصیت ہوگی اور جن انبیاء کا ذکر تیسری آیت میں کیا ہے ان کا عطف نُوحًا پر ہوگا (وہ مِنْ ذُرِّيَّتِهِ کے ذیل میں نہیں آئیں گے۔

وَكَذَٰلِكَ (اور اسی طرح) یعنی جس طرح ہم نے ابراہیمؑ کو ان کے حسن کردار و رفتار کا بدلہ دیا اور ان کے درجات اونچے کئے اور اولاد کے مرتبے بلند کئے اسی طرح

نَجْزِي الْمُحْسِنِينَ ۝ (ہم اہل احسان کو بدلہ دیتے ہیں) حضرت عمرؓ کی مرفوع روایت ہے کہ حضرت جبرئیلؑ کے سوال کے جواب میں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا احسان یہ ہے کہ تم اپنے رب کی عبادت (اتنے استغراق کے ساتھ) کرو گویا تم اس کو دیکھ رہے ہو کیونکہ اگر تم اس کو نہیں دیکھ پاتے تو یقیناً وہ تم کو دیکھ رہا ہے۔ متفق علیہ

وَزَكَرِيَّا وَيَحْيَىٰ وَعِيسَىٰ وَإِلْيَاسَ ۖ (اور زکریا (ابن آذن) کو اور یحییٰ (بن زکریا) کو اور عیسیٰ (بن مریم بنت عمران) کو اور الیاس (بن متی بن فنحاص بن عیزار بن ہارون) کو) حضرت عبداللہ بن مسعودؓ نے فرمایا ادریس ہی الیاس تھے دونوں نام ایک ہی شخص کے تھے جیسے یعقوب اور اسرائیل لیکن آیت کی رفتار اس کے خلاف ہے اور یقیناً نوحؑ کی نسل میں سے نہیں تھے بلکہ پدر نوحؑ کے دادا تھے۔ نوح کے باپ لامک، لامک کے باپ متوشلخ، متوشلخ کے باپ خنوخ اور خنوخ کے باپ حضرت ادریس تھے، اولاد آدمؑ میں آپ سب سے پہلے نبی تھے اور آپ نے قلمی تحریر ایجاد کی۔

كُلٌّ مِّنَ الصَّالِحِينَ ۝ (مذکورہ بالا اشخاص میں سے ہر ایک نیکوکاروں میں سے تھا) یعنی یہ حضرات ان لوگوں میں سے تھے جو تمام کبائر و صغائر سے معصوم تھے کیونکہ جو شخص کسی امر ممنوع کا مرتکب یا امور بہ کا تارک ہو وہ صالح نہ ہوگا فاسد ہوگا خواہ اس کے اعمال کتنے ہی کم ہوں (مگر ہوگا فاسد) غیر معصوم پر جو بھی صالح کا اطلاق ہو جاتا ہے وہ حقیقی نہیں ہوتا اضافی ہوتا ہے (یعنی مرتکب کبائر کے مقابلہ میں ہم بعض صغائر کے مرتکب کو صالح کہہ سکتے ہیں اگرچہ وہ بالکل صالح نہیں ہوتا) ہاں گناہ کرنے کے بعد جو بھی توبہ کرے وہ صالح ہو جاتا ہے کیونکہ گناہ سے توبہ کرنے والا بے گناہ کی طرح ہو جاتا ہے لیکن جو کامل الصلاح ہو وہ معصوم ہوتا ہے۔

وَإِسْمَاعِيلَ وَالْيَسَعَ وَيُونُسَ وَلُوطًا ۚ (اور اسمٰعیل (بن ابراہیمؑ) کو (جو رسول اللہ ﷺ کے جد اعلیٰ تھے) اور الیسع (بن اخطوب بن عجوز) کو اور یونس (بن متی) کو اور لوط (بن ہاران) کو) جو حضرت ابراہیم کے بھتیجے تھے یسع عجمی نام ہے اس پر الف لام داخل کر لیا گیا ہے جیسے یزید پر الف لام داخل کر کے اَلْيَزِيد کہا جاتا ہے ایک شاعر کا قول ہے۔

رَأَيْتُ الْوَلِيْدَ بْنَ الْيَزِيْدِ مُبَارَكًا ... شَدِيْدًا بِاَعْبَاءِ الْخِلَافَةِ كَاهِلُهُ

میں نے ولید بن یزید کو بابرکت پایا اس کے کاندھے خلافت کا بار اٹھانے میں مضبوط ہیں۔

وَكُلًّا فَضَّلْنَا عَلَى الْعٰلَمِيْنَ ﴿۸۶﴾ (اور ان میں سے ہر ایک کو ان کے زمانہ والوں پر ہم نے برتری عطا کی تھی) یہ آیت بتا رہی ہے کہ ان انبیاء کو ان کے تمام اہل زمانہ پر فضیلت حاصل تھی اہل زمانہ خواہ انسان ہوں یا جنات یا ملائکہ۔

وَمِنْ اٰبَآئِهِمْ وَذُرِّيّٰتِهِمْ وَاِخْوَانِهِمْ وَاجْتَبَيْنٰهُمْ وَهَدَيْنٰهُمْ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ﴿۸۷﴾ (اور ان کے باپ دادوں اور نسل اور بھائیوں میں سے بعض کو (ہم نے ہدایت کی یا بزرگی عطا کی) اور ان کو ہم نے برگزیدہ بنایا اور سیدھا راستہ بتلایا) وَمِنْ اٰبَآئِهِمْ کا عطف كُلًّا پر ہے یعنی ہم نے بزرگی عطا کی یا نوحاً پر عطف ہے یعنی ہم نے ہدایت کی اور مِنْ تبعیضیہ ہے یعنی ان کی اصل نسل اور بھائیوں میں سے بعض کو برتری دی یا ہدایت کی کیونکہ سب کے سب نہ پیغمبر ہوئے نہ ہدایت یافتہ۔

ذٰلِكَ هُدَى اللّٰهِ يَهْدِيْ بِهٖ مَنْ يَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖ (یہی (دین توحید) اللہ کا بتایا ہوا ہے اللہ اپنے بندوں میں سے جس کو چاہتا اس کی ہدایت کرتا ہے)۔

وَلَوْ اَشْرَكُوْا لَحَبِطَ عَنْهُمْ مَّا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴿۸۸﴾ (اور اگر وہ (پیغمبر بھی بالفرض) شرک کرتے تو جو کچھ (اچھے اعمال) وہ کرتے تھے سب اکارت چلے جاتے) دوسروں کا تو ذکر ہی کیا ہے پیغمبروں کی جلالت وعظمت بھی شرک کے بعد کسی عمل کو بربادی سے نہیں روک سکتی۔

اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ اٰتَيْنٰهُمُ الْكِتٰبَ (یہ سب ایسے تھے کہ ہم نے ان کو کتاب دی) اَلْكِتٰب اسم جنس ہے یعنی نازل کردہ خدائی کتابیں دینے سے مراد ہے اتارنا یا نازل شدہ کتاب کی تبلیغ کا حکم دینا۔

وَالْحُكْمَ وَالنُّبُوَّةَ (اور حکمت ونبوت) حکم سے مراد یا حکومت ہے یعنی ہم نے ان کو حاکم بنایا تھا کہ لوگ ان کی اطاعت کریں یا حکمت ودانش مراد ہے یا تقاضاء حق کے مطابق مقدمات کا فیصلہ کرنا مراد ہے۔

فَاِنْ يَّكْفُرْ بِهَا هٰٓؤُلَآءِ فَقَدْ وَكَّلْنَا بِهَا قَوْمًا لَّيْسُوْا بِهَا بِكٰفِرِيْنَ ﴿۸۹﴾ (اب اگر یہ (کفار مکہ) ان (تینوں چیزوں) کا انکار کر دیں تو (کوئی نقصان ہمارا نہیں) ہم نے اس کے لئے ایسے بہت لوگ مقرر کر دیئے ہیں جو اس کا انکار نہیں کرتے) یعنی انصار اور اہل مدینہ۔ اس کے لئے مقرر کرنے سے مراد ہے ایمان لانا اور ان پر عمل کرنا۔ قوماً سے مراد انصار اور اہل مدینہ کی تخصیص حضرت ابن عباسؓ اور مجاہدؒ کے نزدیک ہے بظاہر آیت کا مصداق عام ہے تمام صحابہؓ اور صحابہؓ کے بعد آنے والے اہل ایمان اور دوسرے ممالک کے مومنوں کو آیت شامل ہے۔ ابورجاء عطاردی نے آیت کا مطلب اس طرح بیان کیا اگر زمین کے رہنے والے اس کا انکار کر دیں تو ہم نے آسمان سے فرشتوں کو مقرر کر دیا ہے وہ منکر نہیں ہیں۔

اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ هَدَى اللّٰهُ (یہ ایسے لوگ تھے جن کو اللہ نے ہدایت کی تھی) یعنی توحید، اصول دین اور مامورات ومنہیات کی پابندی کی ہدایت کر دی تھی۔

فَبِهُدٰىهُمُ اقْتَدِهْ (پس انہی کے طریقہ پر آپ چلیں) یعنی دوسروں کے طریقہ پر نہ چلیں اس میں مشرکوں پر تعریض ہے کہ وہ (پیغمبروں کے راستہ پر چلنے کی بجائے) اپنے گمراہ آباء واجداد کی پیروی کرتے ہیں۔ طریقہ انبیاء خصوصاً سید الانبیاء کا تو ذکر ہی کیا ہے آپ کے لئے تو تقلید جائز ہی نہیں۔

مطلب یہ ہے کہ دوسرے انبیاء کی طرح آپ بھی ہدایت کے راستہ پر چلیں اور اس شریعت ہی کا اتباع کریں جو تقاضاء عقل کے مطابق ہے۔ اس سے یہ امر ثابت ہوتا ہے کہ انبیاء کا طریقہ حق تھا اور عقل ونقل کے تقاضوں کے مطابق تھا۔

بیضاوی نے لکھا ہے کہ ھُدٰھُمُ سے مراد عقیدۂ توحید اور دین کے وہ اصول ہیں جو تمام انبیاء کی تعلیم میں مشترک ہیں فروعی مسائل مراد نہیں ہیں فروعی مسائل میں تو انبیاء میں تفریق ہے اور ھُدٰھُمُ میں ھُدٰی کی نسبت کل انبیاء کی طرف کی گئی ہے لہٰذا ایسا راستہ ہونا ضروری ہے جو سب کے درمیان مشترک ہو۔ فروعی مسائل میں سب انبیاء کی پیروی ممکن نہیں (کیونکہ فروعی احکام میں انبیاء میں اختلاف ہے) کاب یہ کہنا غلط ہے کہ اس آیت میں گزشتہ انبیاء کی شریعتوں پر چلنے کا حکم

رسول اللہ ﷺ کو دیا گیا ہے اور آپ گزشتہ شرائع کے مکلف تھے۔

میں کہتا ہوں تمام انبیاء امر خداوندی کے مکلف تھے اگر سابق فروعی مسائل کو اللہ کی طرف سے منسوخ نہیں کیا گیا تو ان فروعی احکام کی تعمیل بھی سب کے لئے ضروری تھی اور اگر متلو یا غیر متلو وحی کے ذریعہ سے گزشتہ احکام جزئیہ کو منسوخ کر کے جدید احکام نازل کر دیے گئے تو جدید احکام کی تعمیل لازم ہے۔ حاصل یہ ہے کہ تمام انبیاء گزشتہ فروعی احکام کے بھی پابند تھے بشرطیکہ جدید شریعت میں ان کو منسوخ نہ کر دیا گیا ہو۔ پس گزشتہ شریعتوں کے فروعی احکام کی تعمیل بھی ہم پر واجب ہے اگر ہماری شریعت میں اللہ نے ان کو منسوخ نہ کر دیا ہو۔ فَبِهُدَاهُمُ اقْتَدِهْ میں بتایا گیا ہے (تفسیر ختم ہوئی)۔

قُلْ لَّآ اَسْـَٔلُكُمْ عَلَيْهِ اَجْرًا (آپ کہہ دیجئے میں اس (تبلیغ یا قرآن) کا کسی قسم کا معاوضہ تم سے نہیں مانگتا) جس طرح مجھ سے پہلے انبیاء اپنی امتوں سے اجر تبلیغ کے طلب گار نہ تھے۔ جن امور میں اقتداء انبیاء کا حکم دیا گیا تھا ان میں سے یہ اجر کا طلب گار نہ ہونا بھی ہے۔ یہ جملہ بتا رہا ہے کہ قرآن حدیث اور فقہ کی تعلیم کا معاوضہ (طلب کر کے) لینا جائز نہیں۔

اِنْ هُوَ اِلَّا ذِكْرٰى لِلْعٰلَمِيْنَ ۝ (یہ (تبلیغ یا قرآن) تو جن و انس کے لئے محض ایک یادداشت اور نصیحت ہے)

ابن ابی حاتم نے سعید بن جبیرؒ کی مرسل روایت نقل کی ہے کہ ایک یہودی جس کا نام مالک بن صیف تھا مناظرہ کرنے کے لئے رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا اور جھگڑے بازی کرنے لگا۔ رسول اللہ ﷺ نے اس سے فرمایا میں تجھے اس خدا کی قسم دے کر پوچھتا ہوں جس نے موسیٰ پر توریت نازل فرمائی تھی کیا توریت میں یہ بات تم لکھی ہوئی پاتے ہو کہ موٹے عالم کو اللہ پسند نہیں فرماتا۔ مالک موٹا تھا۔ یہ سن کر غضبناک ہو گیا اور بولا خدا کی قسم اللہ نے کسی انسان پر کوئی حکم نہیں اتارا۔ اس کے ساتھیوں نے جو یہ بات سنی تو بولے ارے (ارے) کیا موسیٰ پر بھی اللہ نے کچھ نہیں اتارا۔ اس پر مندرجہ ذیل آیت نازل ہوئی۔

وَمَا قَدَرُوا اللّٰهَ حَقَّ قَدْرِهٖٓ اِذْ قَالُوْا مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ عَلٰى بَشَرٍ مِّنْ شَيْءٍ ؕ (اور انہوں نے اللہ (کی ذات و صفات) کا ایسا اندازہ نہیں کیا جیسا کرنا چاہئے تھا)۔ حَقَّ قَدْرِهٖ مفعول مطلق ہے۔ بغویؒ نے لکھا ہے کہ اسی قول کی وجہ سے یہودیوں نے مالک کو احبار کے عہدہ سے معزول کر کے اس کی جگہ ابن اشرف کو مقرر کر دیا۔ سدی کا بیان ہے کہ اس آیت کا نزول فنحاص بن عازوراء کے حق میں ہوا اور فنحاص نے ہی یہ بات کہی تھی۔ سورۂ نساء میں یہ حدیث گزر چکی ہے۔ ابن جریر نے بطریق ابو طلحہ حضرت ابن عباسؓ کا قول نقل کیا ہے کہ یہودیوں نے کہا محمد ﷺ کیا اللہ نے آپ پر کوئی کتاب نازل کی ہے حضور ﷺ نے فرمایا ہاں۔ بولے خدا کی قسم اللہ نے آسمان سے کوئی کتاب نہیں اتاری۔ اس پر اللہ نے نازل فرمایا وَمَا قَدَرُوا اللّٰهَ حَقَّ قَدْرِهٖ یعنی اللہ نے بندوں پر جو نعمت اور رحمت مبذول فرمائی ہے اس کو انہوں نے نہیں جانا اور اس لحاظ سے اللہ کو جیسا پہچاننا چاہئے ویسا نہیں پہچانا۔ جب کہ انہوں نے کہا کہ اللہ نے کسی آدمی پر کچھ نازل نہیں فرمایا یعنی پیغمبروں کی بعثت کا انکار کر دیا حالانکہ نبوت اللہ کی سب سے بڑی رحمت ہے جو اللہ نے اپنے بندوں پر کی ہے۔

قُلْ مَنْ اَنْزَلَ الْكِتٰبَ الَّذِيْ جَآءَ بِهٖ مُوْسٰى نُوْرًا وَّهُدًى لِّلنَّاسِ تَجْعَلُوْنَهٗ قَرَاطِيْسَ تُبْدُوْنَهَا وَتُخْفُوْنَ كَثِيْرًا ۚ (اے محمد ﷺ) آپ کہئے کہ جو کتاب (توریت) موسیٰ لائے تھے وہ کس نے اتاری تھی جو (سراسر) نور اور لوگوں کے لئے ہدایت ہے جس کو تم نے متفرق اوراق میں رکھ چھوڑا ہے کہ ان میں سے بعض حصوں کو تو ظاہر کرتے ہو اور بہت حصے کو چھپائے رکھتے ہو) نُوْرًا الکتاب یا کتاب کی ضمیر بہ سے حال ہے۔ متفرق اوراق میں کرنے سے یہ مراد ہے کہ کاغذ کے مختلف ٹکڑوں پر لکھتے ہو اور ان کی جداجدا کاپیاں بناتے ہو۔ بعض حصوں کو ظاہر کرنے کا یہ معنی ہے کہ جس حصہ کو اور توریت کی جن باتوں کو ظاہر کرنا چاہتے ہو ظاہر کرتے ہو۔ زیادہ باتوں کے چھپانے کا یہ مطلب ہے کہ حضرت محمد رسول اللہ ﷺ کی تعریف اور آیت رجم وغیرہ کو چھپاتے ہو حالانکہ یہ چیزیں توریت میں موجود ہیں۔ ابن عمرو کی

ہے (ایک پر ایمان اور دوسرے پر شرک ہو یہ ہو نہیں سکتا)

وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرٰى عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا (اور اس شخص سے بڑھ کر بیجا حرکت کرنے والا کون ہوگا جو اللہ پر جھوٹ تہمت تراشی کرتا ہے) جیسے مالک بن الصیف جو کہتا تھا کہ اللہ نے کسی آدمی پر کچھ نازل نہیں کیا۔ یا جیسے عمرو بن لحی اور اس کے پیرو جو کہتے تھے کہ اللہ نے سائبہ اور حام کو حرام کر دیا ہے اور بعض قسم کے اونٹوں پر سوار ہونا اللہ کی طرف سے ناجائز کر دیا گیا ہے اور ان جانوروں کے پیٹ کے بچے اگر زندہ برآمد ہوں تو مردوں کے لئے حلال ہیں عورتوں کے لئے حرام اور اگر مردہ برآمد ہوں تو سب کے لئے حلال ہیں۔

اَوْ قَالَ اُوْحِيَ اِلَيَّ وَلَمْ يُوْحَ اِلَيْهِ شَيْءٌ (یا کہتا ہے کہ میرے پاس وحی آئی ہے حالانکہ اس کے پاس بالکل وحی نہیں آئی)۔

بغویؒ نے لکھا ہے کہ بقول قتادہ اس آیت کا نزول مسیلمہ کذاب کے حق میں ہوا یہ شخص کاہن تھا اور کاہنوں کی طرح کچھ مسجع فقرے بولتا تھا۔ اس نے نبوت کا دعویٰ کیا تھا اور کہتا تھا کہ میرے پاس وحی آئی ہے۔ ابن جریر نے عکرمہ کا بھی یہی بیان نقل کیا ہے۔ رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں اس نے دو قاصد بھیجے تھے حضور ﷺ نے قاصدوں سے دریافت کیا کیا تم مسیلمہ کو نبی مانتے ہو قاصدوں نے کہا جی ہاں۔ حضور ﷺ نے فرمایا اگر قاصدوں کو قتل کرنے کا دستور ہوتا تو میں تم دونوں کی گردن اڑا دیتا۔

بغویؒ نے حضرت ابوہریرہؓ کی روایت سے ذکر کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا میں سو رہا تھا سونے کی حالت میں مجھے زمین کے خزانوں کی کنجیاں دے دی گئیں اور سونے کے دو کنگن میرے دونوں ہاتھوں میں ڈال دیئے گئے مجھے اس سے بڑی ناگواری اور رنج ہوا تو مجھے وحی کی گئی کہ ان دونوں پر پھونک مارو میں نے پھونک ماری کنگن فوراً غائب ہو گئے میں نے اس کی تعبیر دی کہ دونوں کنگنوں سے مراد دو کذاب ہیں ایک صنعاء (یمن) کا اور دوسرا یمامہ والا۔ صنعا والے سے حضور کی مراد عنسی اور صاحب یمامہ سے مراد مسیلمہ کذاب تھا (ان دونوں نے نبوت کا جھوٹا دعویٰ کیا تھا)۔

وَمَنْ قَالَ سَاُنْزِلُ مِثْلَ مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ ؕ (اور وہ جو کہتا ہے کہ جیسا کلام اللہ نے نازل کیا ہے ایسا میں بھی لاتا ہوں)۔ بقول بغوی اس آیت کا نزول عبداللہ بن ابی سرح کے حق میں ہوا ہے۔ عبداللہ مسلمان ہو گیا تھا اور رسول اللہ ﷺ کا کاتب تھا لیکن (قرآن میں جس جگہ) حضور ﷺ سَمِيْعًا بَصِيْرًا لکھواتے وہ عَلِيْمًا حَكِيْمًا لکھتا اور جہاں عَلِيْمًا حَكِيْمًا لکھواتے وہاں وہ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا لکھتا تھا جب آیت وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنْ سُلٰلَةٍ مِّنْ طِيْنٍ نازل ہوئی اور حضور نے یہ آیت لکھوائی تو عبداللہ کو تخلیق انسانی کی یہ تفصیل بہت پسند آئی اور وہ فوراً بول اٹھا فَتَبٰرَكَ اللّٰهُ اَحْسَنُ الْخٰلِقِيْنَ۔ حضور ﷺ نے فرمایا (آگے) یہ بھی لکھو یہ اسی طرح نازل ہوئی ہے۔ عبداللہ کے دل میں شک پیدا ہو گیا اگر محمد ﷺ (وحی کے دعوے میں) سچے ہیں تو جس طرح ان کے پاس وحی آئی ہے میرے پاس بھی آگئی (میں بھی نبی ہو گیا) اور اگر جھوٹے ہیں تو پھر جس طرح وہ کہتے ہیں۔ میں نے بھی کہہ دیا (نہ خدا کا کلام ان کا نہ میرا) اس کے بعد وہ مرتد ہو گیا اور مشرکوں سے جا ملا۔ ابن جریرؒ نے عکرمہ اور سدی کی روایت سے بھی آیت فَتَبٰرَكَ اللّٰهُ اَحْسَنُ الْخٰلِقِيْنَ کے سلسلہ میں یہی قصہ بیان کیا ہے۔

بغوی نے لکھا ہے کہ فتح مکہ سے پہلے جب رسول اللہ ﷺ مرالظہران میں فروکش تھے۔ عبداللہ دوبارہ اسلام لے آیا تھا۔ حافظ فتح الدین ابن سید الناس نے سیرت میں لکھا ہے کہ ابن ابی سرح نے حضرت عثمانؓ بن عفان کی سفارش کرائی تھی۔ رسول اللہ ﷺ نے حضرت عثمانؓ کی سفارش کو قبول فرمالیا اس کے بعد عبداللہ کا اسلامی کریکٹر اچھا رہا کسی نے اس کے اسلام پر کوئی خوردہ گیری نہیں کی آخر سجدہ کی حالت میں عبداللہ کا انتقال ہوا۔

حضرت ابن عباسؓ نے آیت سَاُنْزِلُ مِثْلَ مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ کے متعلق فرمایا اس سے مراد وہ لوگ ہیں جو اللہ کے کلام کو مخول بناتے تھے اور لَوْ نَشَآءُ لَقُلْنَا مِثْلَ هٰذَآ کا یہ جواب ہے۔

میں کہتا ہوں اس سے مراد نضر بن حارث ہے جو سورۂ وَالنّٰزِعٰتِ غَرْقًا کے مقابلہ میں (بطور استہزاء) وَالطّٰحِنٰتِ طَحْنًا وَّالْعٰجِنٰتِ عَجْنًا وَّالْخٰبِزٰتِ خَبْزًا کہتا تھا (قسم ہے آٹا پیسنے اور گوندھنے اور روٹی پکانے والیوں کی)

وَلَوْ تَرٰٓى اِذِ الظّٰلِمُوْنَ فِيْ غَمَرٰتِ الْمَوْتِ (اور اگر آپ اس وقت دیکھیں جبکہ یہ ظالم لوگ موت کی سختیوں میں ہوں گے)۔ تَرٰى کا خطاب رسول اللہ ﷺ کو ہے اور الظّٰلِمِيْنَ مفعول محذوف ہے۔ الظّٰلِمُوْنَ میں الف لام یا عہدی ہے اور مراد ہیں یہودی اور نبوت کے جھوٹے دعویدار اور کلام اللہ سے استہزاء کرنے والے یا الف لام جنسی ہے ان سب کو بھی شامل ہے اور دوسرے ظالموں (کافروں) کو بھی۔ لو حرف شرط ہے تَرٰى اس کی شرط ہے اور جزاء محذوف ہے یعنی اگر آپ ظالموں کی حالت دیکھیں گے تو آپ کو بہت ناک منظر دکھائی دے گا۔ غَمَرٰتُ کا معنی ہے شدائد۔ یہ غَمْرَةٌ کی جمع ہے قاموس میں ہے غَمْرَةُ الشَّيْءِ کسی چیز کی شدت۔ وضعی معنی ہے ڈھانکنا غَمَرَهُ الْمَاءُ اس کو پانی نے ڈھانک لیا۔ اس کے بعد شدائد اور مصائب کے لئے اس لفظ کا استعمال کیا جانے لگا (کیونکہ شدائد بھی انسان کو محیط ہو جاتی ہیں اور ہر طرف سے چھا جاتی ہیں) صحاح میں آیا ہے غَمْر کا اصل وضعی معنی ہے کسی چیز کے اثر کو زائل کر دینا آب کثیر کو غمر اسی مناسبت کی وجہ سے کہتے ہیں۔ صاحب صحاح کی تحقیق کے بموجب آیت میں موت کی جانب غَمَرٰتُ کی اضافت بیانیہ ہوگی شدت موت کو غَمْرَة اس لئے کہا جاتا ہے کہ موت زندگی کا اثر مٹا دیتی ہے۔

وَالْمَلٰٓئِكَةُ بَاسِطُوْٓا اَيْدِيْهِمْ ۚ اَخْرِجُوْٓا اَنْفُسَكُمْ (اور فرشتے اپنے ہاتھ بڑھا رہے ہوں گے (اور کہہ رہے ہوں گے کہ) اپنی جانیں نکالو)۔ یہ جملہ حالیہ ہے اور ضمیر کا مرجع محذوف ہے یعنی سختی کے ساتھ تقاضا کرنے والے قرض خواہ کی طرح جھڑک کر اور درشتی کے ساتھ روحوں کو قبض کرنے یا عذاب دینے کے لئے فرشتے ان سے کہیں گے کہ اپنی جانوں کو جسموں کے اندر سے نکالو یا عذاب سے بچاؤ۔

اَلْيَوْمَ (آج) مرنے کے وقت سے غیر متناہی مدت تک۔

تُجْزَوْنَ عَذَابَ الْهُوْنِ (تم کو عذاب ذلت کی سزا دی جائے گی) یعنی وہ عذاب دیا جائے گا جس میں ذلت اور شدت ہوگی۔

بِمَا كُنْتُمْ تَقُوْلُوْنَ عَلَى اللّٰهِ غَيْرَ الْحَقِّ (کیونکہ تم اللہ پر جھوٹی افتراء بندی کیا کرتے تھے) اس کو صاحب اولاد کہتے تھے، مخلوق کو اس کا شریک قرار دیتے تھے، نبوت کا جھوٹا دعویٰ کرتے تھے اور باوجود وحی نہ آنے کے کہتے تھے کہ ہمارے پاس وحی آتی ہے۔

وَكُنْتُمْ عَنْ اٰيٰتِهٖ تَسْتَكْبِرُوْنَ ۝ (اور تم اللہ کی آیات (یعنی قرآنی آیات یا دلائل توحید) سے تکبر کرتے تھے) نہ ان پر غور کرتے تھے نہ ان کو مانتے تھے۔ ابن جریر وغیرہ نے عکرمہ کے حوالہ سے لکھا ہے کہ نضر بن حارث نے کہا تھا لات اور عزیٰ اللہ کے سامنے ہماری سفارش کریں گے اس پر مندرجہ ذیل آیت نازل ہوئی۔

وَلَقَدْ جِئْتُمُوْنَا فُرَادٰى (تم اکیلے مرنے کے بعد یا قیامت کے دن حساب کتاب اور جزا و سزا کے لئے ہمارے پاس تنہا آگئے) یعنی نہ مال نہ اولاد نہ دوست احباب اور مددگار اور نہ وہ معبود جن کو تم نے اپنے لئے جمع کر رکھا تھا یا اکیلے آنے سے یہ مراد ہے کہ وہ بت جن کو اپنے خیال میں تم نے اپنا سفارشی سمجھ رکھا تھا وہ تمہارے ساتھ نہ ہوں گے۔ فُرَادٰى فرد کی جمع ہے آخر کی الف تانیث کا ہے۔

اس آیت میں اللہ نے ملائکہ کے اس قول کی خبر دی ہے جو مرنے کے وقت یا قیامت کے دن فرشتے کافروں سے کہیں گے۔ کلام کی رفتار بتا رہی ہے کہ مرنے کے وقت فرشتے یہ کلام کریں گے کیونکہ اس کلام کا عطف اَلْيَوْمَ تُجْزَوْنَ پر ہے۔

كَمَا خَلَقْنٰكُمْ اَوَّلَ مَرَّةٍ (جیسے پہلی مرتبہ ہم نے تم کو (اکیلا) پیدا کیا تھا)۔ یہ فُرَادٰى سے بدل یا حال ہے یا فرادیٰ کی ضمیر سے حال ہے۔ صورت اول کی صورت میں یہ مطلب ہوگا کہ جس طرح تم کو برہنہ اور

جدا جدا ہونے سے تھک کر رات کو گہری نیند سے سکون یاب ہوتا ہے یا یوں کہا جائے کہ ایک عارف دن بھر مخلوق کے ساتھ مشغول رہتا ہے جس سے اس کو وحشت ہوتی ہے رات کو تنہائی میں اپنے خالق سے انس گیر ہوتا ہے۔

وَالشَّمْسَ وَالْقَمَرَ حُسْبَانًا (اور سورج چاند کو اس نے حساب (اوقات) کی علامت بنایا ہے)۔ حُسْبَانٌ بضم حاء مصدر ہے اس کا ماضی حَسَبَ بفتح سین ہے (حساب کرنا) حِسْبَانٌ بکسر حاء بھی مصدر ہے اس کا ماضی حَسِبَ بکسر سین ہے (گمان کرنا) بعض علماء نے حسبان کو حساب کی جمع کہا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اللہ نے چاند سورج کی رفتار کو حساب اوقات کی علامت بنایا ہے۔

ذٰلِكَ تَقْدِيرُ الْعَزِيزِ الْعَلِيمِ ۝ (یہ (حساب) غالب اور دانا ہستی کا ٹھہرایا ہوا ہے) یعنی وہ غالب ہے چاند سورج اس کے تابع فرمان ہیں۔ وہ علیم ہے چاند سورج کا نظام اور ان کے نافع ترین چکروں سے بخوبی واقف ہے۔

وَهُوَ الَّذِي جَعَلَ لَكُمُ النُّجُومَ لِتَهْتَدُوا بِهَا فِي ظُلُمَاتِ الْبَرِّ وَالْبَحْرِ (وہی ایسا ہے جس نے ستاروں کو تمہارے لئے بنایا تاکہ ان کے ذریعہ سے تم راستے معلوم کر سکو خشکی اور اندھیروں میں بھی اور سمندر کی تاریکیوں میں بھی) ظُلُمَاتِ الْبَرِّ وَالْبَحْرِ میں اضافت ملابست کی وجہ سے ہے، مراد ہیں رات کی تاریکیاں جو خشکی اور سمندر میں ہوتی ہیں یا راستوں کی مجہول بھلایا مراد ہیں جن کو بطور استعارہ تاریکیاں کہا گیا ہے۔

قَدْ فَصَّلْنَا الْآيَاتِ (ہم نے کھول کر نشانیاں (یعنی خالق حکیم کی توحید کی دلیلیں) بیان کر دیں) لِقَوْمٍ يَعْلَمُونَ ۝ (ان لوگوں کے لئے جو علم رکھتے ہیں) کیونکہ وہی اس بیان سے فائدہ اندوز ہوتے ہیں اگرچہ بیان ہر ایک کے لئے عام ہے عالم ہو یا جاہل۔

وَهُوَ الَّذِي أَنشَأَكُم مِّن نَّفْسٍ وَاحِدَةٍ (اور اللہ وہی ہے جس نے ایک شخص سے تمہاری ابتدائی تخلیق کی) یعنی آدم سے۔

فَمُسْتَقَرٌّ وَمُسْتَوْدَعٌ (پھر ایک جگہ زیادہ رہنے کی ہے اور ایک جگہ چندے رہنے کی) مُسْتَقَرٌّ اسم مفعول ہے یعنی تم میں سے بعض (زمین کے اوپر) ٹھہرائے گئے ہیں یا مصدر میمی ہے یعنی تمہارے لئے (زمین پر) ٹھہراؤ ہے یا اسم ظرف ہے یعنی تمہارے لئے (زمین پر) ٹھہرنے کی جگہ ہے۔ مُسْتَوْدَعٌ بھی یا اسم مفعول ہے یا مصدر یا اسم ظرف، ترجمہ کا اختلاف حسب سابق ہے۔ حضرت ابن مسعودؓ نے فرمایا مُسْتَقَرٌّ رحم میں ہوتا ہے وقت پیدائش تک اور مستودع قبر میں ہوتا ہے وقت قیامت تک (یعنی مستقر سے مراد رحم مادر اور مستودع سے مراد قبر ہے) سعید بن جبیر نے کہا مستقر رحم میں اور مستودع باپ کی پشت میں ہوتا ہے حضرت ابن عباسؓ کا قول بھی ایک روایت میں آیا ہے۔ مجاہد کا قول ہے مستقر زمین میں اور مستودع قبر میں ہوتا ہے۔ اللہ نے فرمایا ہے وَلَكُمْ فِي الْأَرْضِ مُسْتَقَرٌّ۔ حسن بصری کے نزدیک مستقر قبر میں اور مستودع دنیا میں ہے۔ میں کہتا ہوں کہ مستقر جنت اور دوزخ ہے اور مستودع باقی چیزیں خواہ پشت پدر ہو یا رحم مادر یا دنیا یا قبر۔

قَدْ فَصَّلْنَا الْآيَاتِ لِقَوْمٍ يَفْقَهُونَ ۝ (ہم نے سمجھنے والوں کے لئے (توحید کی) نشانیاں کھول کر بیان کر دیں)۔ ستارے نظروں کے سامنے تھے اس لئے وہاں لِقَوْمٍ يَعْلَمُونَ فرمایا لیکن بنی آدم کی ابتدائی تخلیق پھر ان کے استقرار و استیداع کا علم سمجھ بوجھ اور غور و فکر کا محتاج تھا اس لئے یہاں يَفْقَهُونَ فرمایا۔

وَهُوَ الَّذِي أَنزَلَ مِنَ السَّمَاءِ مَاءً (اور وہی ہے جس نے آسمان سے (ابر کے اور ابر سے زمین تک) پانی اتارا) فَأَخْرَجْنَا بِهِ نَبَاتَ كُلِّ شَيْءٍ (پھر ہم نے پانی سے (ہر قسم کے دانے اور گٹھلی کے اندر سے) ہر طرح کے نباتات کو باہر نکالا) سبحان اللہ ایک ہی قسم کے پانی سے ہر طرح کی سبزی کو سینچا جاتا ہے، مگر کھانے میں ایک دوسرے سے بڑھ کر ہے۔

فَاَخْرَجْنَا مِنْهُ خَضِرًا (پھر اس (سبزے یا پانی) سے ہم نے سبز (شاخ) نکالی) یعنی تخم سے پھوٹ کر ایک سبز شاخ نکلتی ہے پھر اس سبزی کی جڑ سے سبز شاخیں برآمد ہوتی ہیں بکثرت۔

نُخْرِجُ مِنْهُ حَبًّا مُّتَرَاكِبًا (اس سبز شاخ سے ہم اوپر تلے چڑھے ہوئے دانے نکالتے ہیں) یعنی بالیں دانوں سے بھری ہوئی پیدا ہوتی ہیں۔

وَمِنَ النَّخْلِ مِنْ طَلْعِهَا قِنْوَانٌ دَانِيَةٌ (اور کھجور کے درختوں (یعنی ان کے گابھوں) سے خوشے (نکلتے) ہیں جو (دانوں کے بوجھ سے) نیچے کو جھکے پڑتے ہیں قنوان کا واحد قنو ہے۔ قنو کا معنی ہے خوشہ، گچھا۔ دَانِيَةٌ سے مراد یا تو یہ ہے کہ توڑنے والے کے قریب ہوتے ہیں یا یہ مراد ہے کہ آپس میں ایک گچھا دوسرے سے قریب ہوتا ہے (دَانِيَةٌ کا صحیح ترجمہ وہ ہے جو مترجم نے آیت کے بعد ذکر کر دیا ہے)

وَجَنّٰتٍ مِّنْ اَعْنَابٍ (اور (ہم نے پانی سے پیدا کئے) انگوروں کے باغ) اس کا عطف نَبَاتَ كُلِّ شَيْءٍ پر ہے۔

وَالزَّيْتُوْنَ وَالرُّمَّانَ (اور زیتون اور انار کے (درخت)) لفظ شجر، الزَّيْتُوْنَ اور الرُّمَّانَ سے پہلے محذوف ہے۔

مُشْتَبِهًا وَّغَيْرَ مُتَشَابِهٍ

(جو آپس میں ملتے جلتے بھی ہوتے ہیں اور ملتے جلتے نہیں بھی ہوتے) یہ الزَّيْتُوْنَ سے حال ہے یعنی اور باہم ہم شکل بھی ہوتے ہیں اور ہم شکل نہیں بھی ہوتے ہیں۔ یا مجموعہ سے حال ہے یعنی مذکورہ بالا مجموعہ میں سے شکل، مقدار، رنگ اور مزہ میں کوئی تو کسی سے ملتا جلتا ہوتا ہے اور کوئی ملتا جلتا نہیں ہوتا۔

اُنْظُرُوْۤا اِلٰى ثَمَرِهٖۤ اِذَاۤ اَثْمَرَ وَيَنْعِهٖ (اے لوگو! (بصیرت کی نظر سے) دیکھو ہر ایک کے پھل کو جب وہ پھلتا ہے اور اس کے پکنے (ہونے) کو) ثَمَر اسم جنس ہے جیسے تمر اور تمرۃ، کلم اور کلمۃ یعنی بصیرت کی نظر سے دیکھو کہ جب پھل پیدا ہوتا ہے تو کیسا پھیکا اور بے کار ہوتا ہے اور پھر پک کر کیسا مزہ دار لذیذ ہو جاتا ہے۔ يَنْع مصدر ہے۔ بعض کے نزدیک یانع کی جمع ہے جیسے تجر تاجر کی جمع ہے۔

اِنَّ فِيْ ذٰلِكُمْ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ (مذکورہ بالا چیزوں میں ایماندار لوگوں کے لئے (قادر حکیم اللہ کی توحید کی) بڑی نشانیاں ہیں) جس کا نہ کوئی حریف مخالف ہے نہ مثل مقابل اور یہ نشانیاں صرف ایمانداروں کے لئے اس لئے ہیں کہ وہی ان سے توحید پر استدلال کرتے ہیں۔

وَجَعَلُوْا لِلّٰهِ شُرَكَآءَ الْجِنَّ (اور (باوجود دلائل توحید قائم ہونے کے کفار نے) جنات کو اللہ کا شریک ٹھہرا رکھا ہے)۔ آیات توحید کا ذکر تقاضا کر رہا تھا کہ مشرکوں کو سرزنش کی جائے اس لئے مشرکوں کی مذمت کی۔ الْجِنَّ سے مراد ہیں ملائکہ کیونکہ فرشتے نظروں سے مخفی ہیں اور مرتبہ ربوبیت سے قاصر ہیں۔ ملائکہ کو شریک بنانے کا یہ مطلب ہے کہ انہوں نے ملائکہ کی پوجا کی اور ان کو اللہ کی بیٹیاں قرار دیا یا شیاطین مراد ہیں۔ شیاطین کے بہکانے سے مشرکوں نے بتوں کی پوجا کی اور شیطانوں کا کہا مانا یہی شیاطین کو شریک خدا بنانے کا مطلب ہے۔ یا شیاطین کو شریک جاننے کا یہ مطلب ہے کہ انہوں نے شیاطین کی پوجا کی کیونکہ شیاطین بھی بتوں کے اندر گھس جاتے تھے اور مشرک بتوں کی پوجا کرتے تھے تو یہ شیطانوں کی پوجا ہوتی یا شرک کا یہ مطلب ہے کہ وہ اللہ کو خیر کا اور شیطان کو شر کا خالق کہتے تھے۔

جَعَلُوْا کا پہلا مفعول شُرَكَآءَ اور دوسرا مفعول الْجِنَّ ہے اور لِلّٰهِ کا تعلق شُرَكَآءَ سے ہے یا لِلّٰهِ اور شُرَكَآءَ دو مفعول ہیں اور الْجِنَّ، شُرَكَآءَ سے بدل ہے۔

وَخَلَقَهُمْ (حالانکہ اللہ ہی نے ان سب کو پیدا کیا) یعنی یہ جانتے ہوئے کہ اللہ نے جن و انس اور ہر چیز کو پیدا کیا اور جن کسی چیز کے خالق نہیں وہ اللہ کے ساتھ جن کو شریک جانتے ہیں۔

استدلال کیا ہے کہ اللہ کا دیدار محال ہے۔ اہل سنت قائل ہیں کہ دنیا میں اللہ کا دیدار نہیں ہو سکتا جنت کے اندر مومنوں کو نصیب ہوگا۔ آیت سے معتزلہ کا استدلال غلط ہے۔ (۱) لا تُدْرِكُ مضارع کا صیغہ ہے اور صیغہ مضارع کی حقیقی وضع حال کے لئے ہے استقبال کے لئے استعمال مجازی ہے یا حال و استقبال دونوں کے لئے بطور اشتراک مضارع کی وضع ہے اور آیت میں فی الحال نفی رویت تو بالاجماع مراد ہی ہے دنیا میں اللہ کے دیدار کے جواز کا قائل کوئی نہیں۔ ایسی حالت میں استقبال میں بھی نفی رویت مراد ہونا غلط ہے ورنہ (بصورت اول) حقیقت و مجاز دونوں کا ایک وقت میں مراد ہونا لازم آئے گا۔ (بصورت دوئم) عموم مشترک کا قائل ہونا پڑے گا جو ناجائز ہے (یعنی ایک وقت میں ایک لفظ مشترک کے دونوں معنی مراد لینا درست نہیں اس کو عموم مشترک کہتے ہیں)۔

۲..... اَلْاَبْصَارُ جمع کا صیغہ ہے اس لئے جنس بصر تو مراد ہو ہی نہیں سکتی بلکہ مجموعہ افراد مراد ہوگا۔ اب اگر الف لام کو عہدی قرار دیا جائے گا تو وہ ابصار مراد ہوں گے جو دنیا میں موجود ہیں (اور معنی یہ ہوں گے کہ دنیا میں تمام بینائیاں اللہ کو نہیں دیکھ سکتیں) پس اس سے یہ کہاں نکلا کہ جنت میں مومنوں کی آنکھیں بھی نہ دیکھ سکیں گی اور اگر الف لام کو استغراقی کہا جائے تو آیت میں استغراق کی نفی کی گئی ہے (یعنی سب آنکھیں نہیں دیکھ سکتیں) نفی رویت کا استغراق نہیں ہے (یعنی یہ مطلب نہیں ہے کہ کوئی آنکھ نہیں دیکھ سکتی یہاں تک کہ جنت میں کوئی مومن بھی نہیں دیکھ سکتا) ابو نعیم نے حلیہ میں حضرت ابن عباسؓ کی روایت سے بیان کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے آیت رَبِّ اَرِنِیْٓ اَنْظُرْ اِلَیْكَ تلاوت فرمائی پھر فرمایا اللہ نے ارشاد فرمایا موسیٰ مجھے جو زندہ دیکھے گا مر جائے گا جو خشک (پتھر وغیرہ) دیکھے گا لڑھک جائے گا اور جو تر (درخت وغیرہ) دیکھے گا پھٹ جائے گا اور اس کے اجزاء پراگندہ ہو جائیں گے۔ مجھے صرف جنت والے دیکھیں گے جن کی آنکھیں مردہ نہ ہوں گی اور ان کے بدن بوسیدہ نہ ہوں گے۔

۳..... آیت میں نفی ادراک کی صراحت ہے نفی رویت کا ذکر نہیں اور ادراک اور رویت میں فرق ہے۔ رویت کا معنی ہے "دیکھنا" اور ادراک کا معنی ہے "کسی چیز کی حقیقت پالینا اور اس کو ہر طرف سے گھیر لینا یا کامل طور پر کسی چیز تک پہنچ جانا (یعنی پورے طور پر اس چیز کو پالینا) رویت اور ادراک میں تلازم نہیں ہے۔ دیکھو اللہ نے فرمایا فَلَمَّا تَرَآءَ الْجَمْعٰنِ قَالَ اَصْحٰبُ مُوْسٰٓى اِنَّا لَمُدْرَكُوْنَ قَالَ كَلَّا جب دونوں گروہوں نے ایک دوسرے کو دیکھ لیا تو موسیٰ کے ساتھیوں نے کہا اب یقیناً ہم تم سے پہنچ جائیں گے (ہم پکڑے جائیں گے) موسیٰ نے کہا ہرگز نہیں (یہ تم کو نہیں پا سکتے) اس آیت میں طرفین سے رویت ہونے کا تو ثبوت ہے مگر ادراک کی پر زور نفی ہے۔

۴..... اتحاد رویت اور ادراک کو اگر ہم معنی تسلیم بھی کر لیا جائے تو آیت میں نفی رویت کی صراحت ہے (کوئی آنکھ اس کو نہیں دیکھتی) رویت محال ہونے کی صراحت نہیں (یعنی یہ مطلب نہیں کہ کوئی آنکھ اس کو دیکھ ہی نہیں سکتی)۔

وَهُوَ يُدْرِكُ الْاَبْصَارَ (اور وہ تمام نگاہوں کو محیط ہے) یعنی اس کا علم محیط ہے۔

وَهُوَ اللَّطِيْفُ الْخَبِيْرُ (اور وہی باریک بین باخبر ہے)۔ لطیف کا معنی صاحب قاموس نے لکھا ہے اپنے بندوں سے بھلائی کرنے والا، اپنی مہربانی سے مخلوق کو فائدہ پہنچانے والا۔ حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا اپنے دوستوں پر مہربان۔ صاحب قاموس نے لطیف کا معنی پوشیدہ امور کا عالم بھی لکھا ہے۔ صحاح میں ہے کہ لطیف ایسی چیز کو بھی کہتے ہیں جس کا ادراک حس سے نہ ہو سکے (یعنی محسوس نہ ہو) صاحب صحاح کی توضیح کے موافق آیت میں لف و نشر مرتب ہوگا، کلام اس طرح ہوگا اس کو نگاہیں نہیں پا سکتیں کیونکہ وہ غیر محسوس ہے اور نگاہوں کو پالیتا ہے کیونکہ باخبر ہے۔

قَدْ جَآءَكُمْ بَصَآئِرُ مِنْ رَّبِّكُمْ ۚ فَمَنْ اَبْصَرَ فَلِنَفْسِهٖ ۚ وَمَنْ عَمِيَ فَعَلَيْهَا ؕ (اب بلاشبہ تمہارے پاس حق بینی کے ذرائع پہنچ چکے ہیں سو جو شخص دیکھ لیگا اور جو شخص اندھا رہے گا وہ اپنا نقصان کرے گا) بَصَآئِر کھلی ہوئی دلیلیں

جس سے کھر لیتی ہدایت اور حق و باطل میں امتیاز کرنے والی بصیرت حاصل ہو جائے۔ بصیرت: نفس کی بینائی۔ بصر: جسمانی آنکھ کی بینائی۔ یعنی جو دلیل سے کام لے گا حق کو دیکھے گا اور اس پر ایمان لائے گا تو اس کا فائدہ خود اسی کو پہنچے گا اور جو حق کی طرف سے اندھا ہو جائے گا دلائل سے روگرداں ہو کر گم گشتہ راہ بن جائے گا تو اس کا برا انجام اسی کو بھگتنا ہوگا۔

وَمَآ اَنَا عَلَيْكُمْ بِحَفِيْظٍ ۝ (آپ کہہ دیجئے کہ میں تمہارا نگراں نہیں ہوں) یعنی میں تمہارے اعمال کا نگراں نہیں، نہ سزا جزا دینے والا ہوں میں تو صرف بشیر و نذیر ہوں۔ حفیظ تو اللہ ہے۔ جملہ مذکورہ اللہ نے رسول اللہ ﷺ کی زبان سے کہلوایا ہے گویا یوں فرمایا آپ کہہ دیجئے کہ دلائل واضحہ آ گئیں، دلائل کی روشنی میں راہ حق دیکھنا نہ دیکھنا تمہارا کام ہے، نفع نقصان تمہارا ہے، میں تمہارے اعمال کی سزا جزا دینے والا نہیں، میرا کام تو صرف ڈرانا اور بشارت دینا ہے۔

وَكَذٰلِكَ نُصَرِّفُ الْاٰيٰتِ (ہم اسی طرح آیات کی تفصیل کرتے ہیں یا کھول کر بیان کرتے ہیں) صَرَّفَ کا لغوی معنی ہے کسی چیز کو ایک حال سے دوسرے حال کی جانب منتقل کرنا (تبدیل حالت، تغیر وغیرہ کا مفہوم صَرَّفَ کے مفہوم کے قریب ہے) کسی معنی کی تفصیل بھی اسی طرح ہوتی ہے کہ ایک عبارت سے دوسری عبارت کی طرف اس معنی کے لئے انتقال کیا جاتا ہے تاکہ مخاطب سمجھ لے۔ قاموس میں ہے صَرَّفَ الْحَدِيْثَ کا معنی ہے بات میں کچھ بڑھانا اور اس کو خوبصورت بنا دینا یہ لفظ صَرَفَ فِی الدَّرَاهِم کے محاورہ سے ماخوذ ہے۔ جس کا معنی ہے بعض دراہم کی قیمت کا بعض دراہم سے زیادہ ہونا۔ صَرَّفَ الْكَلَامَ کا معنی بھی صرف الحدیث کی طرح ہے لَهٗ عَلَيْهِ صَرْفٌ اس کی اسی پر پیشی ہے، برتری ہے، برتر چیز ممتاز ہوتی ہی ہے۔

وَلِيَقُوْلُوْا دَرَسْتَ (تاکہ تبلیغ پورے طور پر ہو جائے اور اس لئے بھی کہ اس کے نتیجہ میں کفار کہہ دیں تم تو (کسی سے) سیکھ آئے ہو (جب ہی ایسی باتیں کر رہے ہو) وَلِيَقُوْلُوْا کا عطف محذوف پر ہے اور اس میں لام عاقبت ہے (یعنی تفصیل آیات کا لازمی نتیجہ یہ نکلے کہ کافر کہہ دیں تم یہ باتیں کسی سے پڑھ کر آئے ہو) دَرَسْتَ الْكُتُبَ تم نے کتاب کسی سے پڑھ لی (گویا درس کتاب کا معنی ہے کسی سے کتاب پڑھنا سیکھنا) حضرت ابن عباسؓ نے آیت کا توضیحی مطلب اس طرح بیان کیا ہے جب اہل مکہ کے سامنے تم قرآن پڑھو تو وہ کہیں کہ تم بسیار اور جبر سے یہ کلام سیکھ آئے ہو یہ دونوں شخص رومی غلام تھے (اور شاید انجیل سے واقف تھے) اور پھر ہم کو پڑھ کر سناتے ہو اور دعویٰ یہ کرتے ہو کہ یہ اللہ کی طرف سے تمہارے پاس آیا ہے۔

وَلِنُبَيِّنَهٗ لِقَوْمٍ يَّعْلَمُوْنَ ۝ (اور تاکہ جاننے والے لوگوں کے (فائدہ کے لئے) ہم اس قرآن کو کھول کر بیان کر دیں) قرآن کا نزول اگرچہ سارے جہان کے لئے ہے صرف اہل علم کے لئے خاص نہیں لیکن اس سے فائدہ اندوز صرف اہل علم ہوتے ہیں (اس لئے گویا قرآن کا نزول انہی کے لئے ہوا)۔

لِنُبَيِّنَهٗ میں ضمیر غائب قرآن کی طرف راجع ہے آیات کا لفظ سابق کلام میں آگیا ہے اور آیات سے مراد ہے قرآن، اس لئے قرآن کی طرف ضمیر راجع ہونا صحیح ہے۔ خلاصہ مطلب یہ ہے کہ تصریف آیات کے تین مقصد ہیں۔ ۱...... تکمیل تبلیغ۔ ۲...... (جو شخص اس کو کسی انسان کا سکھلایا ہوا کلام کہے اس کا بدنصیب ہو جانا۔ ۳...... جس کے سامنے حق واضح ہو جائے اور وہ مان لے تو اس کا سعادت مند ہو جانا۔

اِتَّبِعْ مَآ اُوْحِيَ اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ ۚ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ (آپ اسی کا اتباع کریں جو آپ کے رب کی طرف سے آپ کے پاس وحی کے ذریعہ سے بھیجا گیا ہے اس کے سوا کوئی معبود نہیں) یعنی قرآن پر آپ عمل کریں۔ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ یا تو رب سے حال مؤکدہ ہے یعنی الوہیت تنہا۔ یا مستقل علیحدہ جملہ ہے اتباع قرآن کے وجوبی حکم کی تاکید کے لئے اس کو ذکر کیا گیا ہے۔

وَاَعْرِضْ عَنِ الْمُشْرِكِيْنَ ۝ (اور مشرکوں کی طرف التفات نہ کریں یعنی مشرکوں سے جھگڑا نہ کرو، ان کی

بات نہ سنو ان کے خیالات کی طرف توجہ نہ دو۔

وَلَوْ شَاۤءَ اللّٰهُ مَاۤ اَشْرَكُوْا (اور اگر اللہ (ان کو مؤمن بنانا) چاہتا تو وہ شرک نہ کرتے) مگر اللہ کی بات تو پوری ہونی ہے کہ میں جہنم کو جن وانس سے بھر دوں گا۔ یہ آیت بتا رہی ہے کہ کفر و ایمان ہر ایک اللہ کے ارادہ کے تحت ہوتا ہے اور اللہ کے ارادہ کا پورا ہونا ضروری ہے۔ فرقہ معتزلہ کی رائے اس کے خلاف ہے (ان کا قول ہے کہ اللہ کفر کا ارادہ نہیں کرتا، بندہ خود کفر کا ارادہ کرتا ہے)۔

وَمَا جَعَلْنٰكَ عَلَيْهِمْ حَفِيْظًا (اور ہم نے آپ کو ان کا نگراں نہیں بنایا) کہ آپ ان کے اعمال کی چوکیداری کریں اور ان کے جرم کا آپ سے مواخذہ ہو۔ عطاء نے اس طرح تشریح کی ہے ہم نے آپ کو ان کا نگہبان و محافظ نہیں بنایا کہ اللہ کے عذاب سے آپ ان کو بچالیں۔ آپ کو صرف معلم بنا کر بھیجا گیا ہے۔

وَمَاۤ اَنْتَ عَلَيْهِمْ بِوَكِيْلٍ (اور آپ ان کے ذمہ دار نہیں ہیں) کہ ان کی کارسازی آپ کے ذمہ ہو۔ ابن عبدالرزاق نے بسلسلہ معمر قتادہ کا بیان نقل کیا ہے کہ مسلمان کافروں کو گالیاں دیتے تھے، اس پر کافر بھی مسلمانوں کو گالیاں دیتے تھے، اس کی ممانعت میں آیت ذیل نازل ہوئی۔

وَلَا تَسُبُّوا الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ فَيَسُبُّوا اللّٰهَ عَدْوًا بِغَيْرِ عِلْمٍ (اور دشنام نہ دو ان کو جن کی خدا کو چھوڑ کر یہ لوگ عبادت کرتے ہیں کہ پھر یہ بھی براہ جہل حد سے آگے بڑھ کر اللہ کی شان میں گستاخی کریں گے)۔

بغوی نے حضرت ابن عباس کا بیان نقل کیا ہے کہ جب آیت اِنَّكُمْ وَمَا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ حَصَبُ جَهَنَّمَ نازل ہوئی تو مشرکوں نے کہا کہ محمد ﷺ یا تو ہمارے معبودوں کی ہجو کرنے سے تم باز آجاؤ ورنہ ہم بھی تمہارے رب کی ہجو کریں گے، اس پر اللہ نے مسلمانوں کو بتوں کی ہجو کرنے سے منع فرمادیا۔

سدی کا بیان ہے کہ جب ابو طالب کے انتقال کا وقت آپہنچا تو قریش نے کہا چلو اس شخص سے چل کر کہیں کہ اپنے بھتیجا کو ہم سے روک دے کیونکہ ہم کو شرم آتی ہے کہ اس شخص کے مرنے کے بعد جب اس کے بھتیجا کو قتل کردیں تو لوگ کہنے لگیں کہ چچا اس کی حفاظت کرتا تھا چچا مر گیا تو لوگوں نے اس کو مار ڈالا۔ چنانچہ ابو سفیان، ابو جہل، نضر بن حارث، امیہ بن خلف، ابی بن خلف، عقبہ بن ابی معیط، عمرو بن عاص اور اسود بن ابوالبختری جمع ہو کر ابو طالب کے پاس گئے اور کہا ابو طالب آپ ہمارے بزرگ اور سردار ہیں مگر محمد ﷺ نے ہم کو اور ہمارے معبودوں کو دکھ دے رکھا ہے، اگر آپ پسند کریں تو محمد ﷺ کو بلا کر اس حرکت سے روک دیں کہ وہ ہمارے معبودوں کا ذکر نہ کرے، ہم اس کو اور اس کے معبود کو کچھ نہیں کہیں گے۔

ابو طالب نے رسول اللہ ﷺ کو بلایا اور کہا میری قوم والے چاہتے ہیں کہ تو ہم سے اور ہمارے معبودوں سے کچھ تعرض نہ کر ہم تجھے اور تیرے معبود کو کچھ نہ کہیں گے اور بات بھی یہ انصاف کی کہہ رہے ہیں لہٰذا (بھتیجے) تو یہ بات مان لے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اگر میں تمہاری یہ بات مان لوں تو کیا تم بھی میری ایک بات مان لو گے جس کو مان لینے کے بعد تم عرب کے مالک بن جاؤ گے اور عجم بھی تمہارے زیر حکم آجائیں گے۔ ابو جہل نے کہا تیرے باپ کی قسم ایک بات نہیں ایسی ایسی دس باتیں ہم مان لیں گے۔ حضور ﷺ نے فرمایا کہ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ کے قائل ہو جاؤ۔ قریش نے انکار کردیا اور چلے گئے۔ ابو طالب نے کہا بھتیجے اس کے علاوہ کوئی اور بات کہو (کہ یہ مان لیں) حضور ﷺ نے فرمایا چچا میں کوئی اور بات کہنے والا نہیں خواہ یہ لوگ سورج کو لا کر میرے ہاتھ پر رکھ دیں۔ قریش نے کہا ہمارے معبودوں کو برا کہنے سے باز آجاؤ ورنہ ہم تم کو اور جو تم کو حکم دیتا ہے اس کو دشنام دیں گے۔ اس پر اللہ نے نازل فرمایا وَلَا تَسُبُّوا الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ یعنی بتوں کی برائیوں کا ذکر نہ کرو۔

بغیر علم کا ترجمہ ہے براہ جہالت یعنی اللہ اور اللہ کی صفات ثبوتیہ و سلبیہ کا علم نہ رکھنے کی وجہ سے ظاہر آیت میں اگرچہ بتوں کی ہجو کرنے کی ممانعت کی گئی ہے لیکن حقیقت میں یہ اللہ کو دشنام طرازیوں سے بچانے کی ہدایت ہے کیونکہ بتوں کو دشنام دینے کا نتیجہ اللہ کو دشنام دینا ہے۔ اس آیت سے یہ بات نکلتی ہے کہ جو طاعت معصیت غالبہ تک پہنچانے والی ہو اس کو

ترک کرنا واجب ہے کیونکہ شر تک پہنچانے والی چیز بھی شر ہے۔

كَذٰلِكَ زَيَّنَّا لِكُلِّ اُمَّةٍ عَمَلَهُمْ (اسی طرح ہم نے ہر طریقہ والوں کی نظر میں ان کے اعمال پسندیدہ بنا دیئے ہیں) یعنی جس طرح ان کافروں کی نظر میں اللہ کو دشنام دینا مرغوب بنا دیا اسی طرح ہر طریقہ والوں کو اُمَّۃ سے مراد ہے طریقہ والے مؤمن ہوں یا کافر۔ پھر کافروں میں سے بھی جدا جدا طریقوں والے سب کو اپنے اپنے مذہبی اعمال مرغوب ہیں۔ عمل سے مراد ہے خیر و شر۔ اللہ اگر توفیق خیر دے تو خیر محبوب ہو جاتی ہے اگر خیر کی توفیق نہ دے تو شر پسند خاطر بن جاتی ہے۔ ہدایت یاب کرنا اور گمراہ کرنا ہر ایک کا اختیار اللہ ہی کو ہے۔ اس آیت سے ثابت ہو رہا ہے کہ بندہ کے لئے مفید ہو وہ چیز عطا کرنا اللہ پر لازم نہیں (ایمان اور خیر ہر شخص کے لئے نافع ہے مگر اللہ نے بعض لوگوں کو کفر و شر مرغوب خاطر بنا دیا ہے)۔

ثُمَّ اِلٰی رَبِّهِمْ مَّرْجِعُهُمْ فَيُنَبِّئُهُمْ بِمَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ۞ (پھر اپنے رب کے پاس ہی ان کو واپس جانا ہے وہی ان کو (حساب فہمی کر کے اور سزا جزا دے کے) جتلا دے گا جو کچھ وہ کیا کرتے تھے (یعنی تمام بدی کو ان کے سامنے لے آئے گا۔

ابن جریر اور بغوی نے محمد بن کعب قرظی کی روایت سے نیز بغوی نے کلبی کے حوالے سے لکھا ہے کہ قریش نے رسول اللہ ﷺ سے گفتگو کی اور عرض کیا محمد ﷺ آپ ہم کو بتاتے ہیں کہ موسیٰ کے پاس ایک لاٹھی تھی جس کو پتھر پر مار کر پتھر کے اندر سے بارہ چشمے جاری کر دیتے تھے اور عیسیٰؑ مردوں کو زندہ کر دیتے تھے اور صالحؑ نے قوم ثمود کے لئے (پتھروں سے) ایک اونٹنی برآمد کر دی تھی۔ لہٰذا تم بھی اسی طرح کے معجزات میں سے کوئی معجزہ دکھاؤ تو ہم تم کو سچا مان لیں گے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تم مجھ سے کیا معجزہ چاہتے ہو۔ قریش نے کہا کوہ صفا کو ہمارے لئے سونے کا کر دو۔ بغوی کی روایت میں اتنا زائد ہے کہ یا ہمارے بعض مردوں کو زندہ کر کے اٹھا دو تاکہ تمہارے متعلق ہم ان سے دریافت کریں کہ جو کچھ تم کہتے ہو وہ سچ ہے یا غلط یا ملائکہ کو ہمارے سامنے لے آؤ کہ وہ تمہاری تصدیق کریں۔ ابن جریر اور بغویؒ کا بیان ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اگر تمہاری درخواست کے مطابق میں کچھ کر دوں تو کیا پھر تم میری تصدیق کرو گے کہنے لگے۔ بے شک خدا کی قسم اگر تم ایسا کرو گے تو ہم سب تمہارے پیرو ہو جائیں گے۔

مسلمانوں نے بھی حضور ﷺ سے درخواست کی کہ ان کی گزارش کے مطابق کوئی معجزہ پیش کر دیجئے تاکہ یہ ایمان لے آئیں۔ رسول اللہ ﷺ دعا کرنے کھڑے ہوئے کہ اللہ کوہ صفا کو سونے کا کر دے۔ فوراً جبرئیل آ گئے اور اللہ کی طرف سے پیام لائے کہ اگر آپ چاہتے ہیں تو کوہ صفا سونے کا ہو جائے گا لیکن اس کے بعد اگر انہوں نے تصدیق نہ کی تو میں ان پر عذاب نازل کروں گا اور اگر آپ کی خواہش ہو تو میں ان کو یونہی رہنے دوں تاکہ ان میں سے جو توبہ کرنے والے ہیں توبہ کر لیں۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا (یونہی چھوڑ دیا جائے تاکہ ان پر عذاب نہ آئے) بلکہ جو توبہ کرنے والے ہیں وہ توبہ کر لیں اس پر آیت ذیل نازل ہوئی۔

وَاَقْسَمُوْا بِاللّٰهِ جَهْدَ اَيْمَانِهِمْ لَئِنْ جَآءَتْهُمْ اٰيَةٌ لَّيُؤْمِنُنَّ بِهَا ۚ (اور (کافروں نے) قسموں میں بڑا زور لگا کر اللہ کی قسم کھائی کہ اگر ان کے پاس کوئی نشانی (مطلوبہ معجزہ) آ جائے تو وہ ضرور ہی اس پر ایمان لے آئیں گے) یعنی جس قدر مستحکم ترین قسم کھانا ان کے بس میں ہے اتنی مضبوط قسم کھانے کی کوشش کرتے ہوئے انہوں نے کھائی۔ ترجمہ پر جہد مصدر (بمعنی اسم فاعل) ترکیب عبارت میں حال ہو گا یا جَهْدَ کو مفعول مطلق کہا جائے گا۔ تاکید قسمیں کھا کر انہوں نے کہا چونکہ پیش نظر معجزات کی ان کی نظر میں کوئی وقعت نہ تھی اور اپنے مطلوبہ معجزات پر ان کو اصرار تھا اس لئے کلام کو چند قسموں کے ساتھ مستحکم کیا۔ اٰيَةٌ سے مراد ہے مطلوبہ معجزہ۔

قُلْ اِنَّمَا الْاٰيٰتُ عِنْدَ اللّٰهِ (آپ کہہ دیجئے تمام معجزات اللہ کے بس میں ہیں وہی جو معجزہ چاہتا ہے نمودار کرتا ہے میرے اختیار میں کوئی معجزہ نہیں ہے۔

وَمَا يُشْعِرُكُمْ اَنَّهَآ اِذَا جَآءَتْ لَا يُؤْمِنُوْنَ ۞ (اور تم کو اس کی کیا خبر (بلکہ ہم کو خبر ہے) کہ وہ نشانیاں

جس وقت آجائیں گی جب بھی یہ لوگ ایمان نہیں لائیں گے) وما یشعرکم میں ما نافیہ ہے یا ما استفہامیہ انکاریہ ہے۔ پر زور طور پر مسبب کے تاکد کے لئے سبب کا انکار کیا گیا ہے۔ دونوں صورتوں میں مخاطب یا قسمیں کھانے والے مشرک ہیں یا مومن۔ مطلب یہ ہے کہ تم کو (اے مسلمانو یا اے مشرکو) نہیں معلوم کہ معجزہ آنے کے بعد بھی یہ ایمان نہیں لائیں گے۔ یعنی اللہ ہی جانتا ہے کہ ایمان نہیں لائیں گے۔ ان کے مبادی تعین اللہ کے اسم مضل کا پرتو ہیں، ان کا ہدایت یاب ہونا ممکن ہی نہیں۔ بعض علماء کے نزدیک لَا یُؤْمِنُوْنَ میں لَا زائد ہے جیسے آیت حَرٰمٌ عَلٰی قَرْیَةٍ اَهْلَكْنٰهَا اَنَّهُمْ لَا یَرْجِعُوْنَ میں لا زائد ہے۔ اس وقت ترجمہ اس طرح ہوگا کہ تم کو کیا معلوم کہ ظہور معجزہ کے بعد وہ ایمان لے آئیں گے۔ بعض اہل علم کے نزدیک اَنَّهَا کا معنی لَعَلَّهَا ہے یعنی تم کو کیا معلوم کہ ظہور معجزہ کے بعد مشرکوں کی کیا رفتار ہے، شاید وہ ایمان نہ لائیں۔ بعض کے نزدیک لَا یُؤْمِنُوْنَ کے بعد اَوْ یُؤْمِنُوْنَ محذوف ہے یعنی تم کو نہیں معلوم کہ معجزہ آنے کے بعد یہ ایمان نہیں لائیں گے یا لائیں گے۔

وَنُقَلِّبُ اَفْـِٕدَتَهُمْ وَاَبْصَارَهُمْ كَمَا لَمْ یُؤْمِنُوْا بِهٖۤ اَوَّلَ مَرَّةٍ وَّنَذَرُهُمْ فِیْ طُغْیَانِهِمْ یَعْمَهُوْنَ۠

(اور ہم بھی ان کے دلوں کو (حق کو سمجھنے سے) اور ان کی آنکھوں کو (حق اندوز نظر سے دیکھنے سے) پھیر دیں گے) (کہ آیات مطلوبہ سامنے آنے کے بعد بھی ایمان نہیں لائیں گے) (جس طرح پہلی دفعہ (کھلے ہوئے محسوس) معجزات پر ایمان نہیں لائے (مثلاً معجزۂ شق القمر وغیرہ دیکھنے کے بعد بھی ایمان نہیں لائے) اور ہم ان کو ان کی سرکشی میں حیران پڑا رہنے دیں گے۔ راہ حق پر نہیں چلائیں گے۔

﴿ساتواں پارہ ختم، الحمد للہ﴾

...... آٹھواں پارہ شروع ......

بفضلہ و توفیقہ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

وَلَوْ اَنَّنَا نَزَّلْنَا اِلَيْهِمُ الْمَلٰٓئِكَةَ وَكَلَّمَهُمُ الْمَوْتٰى وَحَشَرْنَا عَلَيْهِمْ كُلَّ شَيْءٍ قُبُلًا مَّا كَانُوْا لِيُؤْمِنُوْٓا اِلَّآ اَنْ يَّشَآءَ اللّٰهُ اور اگر ہم ان کے پاس فرشتوں کو بھیج دیتے اور ان سے مردے باتیں کرنے لگتے اور ہم تمام موجودات (غیبیہ) کو ان کی آنکھوں کے روبرو لا کر جمع کر دیتے تب بھی یہ ایمان نہ لاتے ہاں اگر اللہ ہی چاہے تو اور بات ہے۔

مردوں کے کلام کرنے سے یہ مراد ہے کہ مردے ان سے آپ کی نبوت کی تصدیق کر دیں۔ قُبُلًا: مصدر ہے بمعنی آمنا سامنا یا قبیل کی جمع ہے اور قبیل یا قبیلہ کی جمع ہے بمعنی جماعت یا صفت مشبہ کا صیغہ ہے بمعنی کفیل یعنی جو کچھ ان کو (جنت کی) بشارت اور (دوزخ سے) تخویف کی گئی ہے اس سب کی کفیل اور ذمہ دار۔

مَا كَانُوْا لِيُؤْمِنُوْا کا یہ مطلب ہے کہ چونکہ ان کے کافر ہونے کا ازل میں فیصلہ ہو چکا ہے اور ان کا سعید اتمیں اللہ کے علم مفصل کا پرتو ہے اسلئے وہ ایمان نہیں لائیں گے۔ اِلَّآ اَنْ يَّشَآءَ اللّٰهُ کا یہ مطلب ہے کہ اگر ان کیلئے ازل میں مؤمن ہونے کا فیصلہ ہو چکا ہے اور اللہ کی ازلی مشیت کا تقاضا ہے تو وہ مؤمن ہو جائیں گے ورنہ اور کسی صورت سے ایمان نہیں لائیں گے۔

وَلٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ يَجْهَلُوْنَ ۝ (لیکن ان میں زیادہ لوگ نہیں جانتے)۔ باوجودیکہ جہالت تمام مشرکوں کو محیط تھی مگر اکثر مشرکوں کو جاہل فرمایا اس کی وجہ کیا ہے۔ بات یہ ہے کہ جہالت سے ہر طرح کی جاہلی مراد نہیں ہے بلکہ مطلب یہ ہے کہ ان میں سے اکثر لوگ اس بات کو نہیں جانتے کہ ہر طرح کے نشانات و معجزات نمودار ہونے کے بعد بھی وہ ایمان نہیں لائیں گے اسی واسطے وہ انجانی بات پر پختہ قسمیں کھاتے ہیں یا ھم کی ضمیر مسلمانوں کی طرف راجع ہے یعنی اکثر مسلمان ناواقف ہیں کہ یہ مشرک کسی طرح ایمان نہیں لائیں گے اس ناواقفی کی وجہ سے وہ آرزو کرتے ہیں کہ مطلوبہ معجزات کا ظہور ہو جائے تاکہ یہ لوگ ایمان لے آئیں۔

وَكَذٰلِكَ جَعَلْنَا لِكُلِّ نَبِيٍّ عَدُوًّا شَيٰطِيْنَ الْاِنْسِ وَالْجِنِّ اور (جس طرح کفار قریش کو ہم نے آپ کا دشمن بنایا ہے کہ وہ آپ کی مخالفت کرتے اور آپ کو دکھ دیتے ہیں) اسی طرح ہر (گزشتہ) پیغمبر کا دشمن جن اور بشر میں سے شیطانوں کو بنایا تھا۔ اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ کفار کا انبیاء سے عداوت رکھنا بھی اللہ کے زیر تخلیق ہے (کفار خود خالق کفر و عداوت نہیں۔ اس سے معتزلہ کے قول کی تردید ہوتی ہے کہ بندہ خود اپنے افعال کا خالق ہے) شیاطین سے مراد ہیں سرکش جن و انس۔ قتادہؓ، مجاہدؒ اور حسنؒ نے فرمایا انسانوں میں سے بھی شیطان ہوتے ہیں۔ جو چیز بھی حد سے تجاوز کرنے والا سرکش ہو وہ شیطان ہے۔

میں کہتا ہوں اس کی تائید حضرت جابرؓ کے بیان سے ہوتی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے اول ہم کو کتوں کو قتل کر دینے کا حکم دیا تھا پھر ممانعت فرمادی اور فرمایا کالے بھجنگ کتے کو جو دو نقطوں والا ہو قتل کر دیا کرو وہ بلاشبہ شیطان ہوتا ہے۔ رواہ مسلم۔ علماء نے لکھا ہے کہ جب مؤمن کو اغوا کرنے سے شیطان عاجز ہو جاتا ہے تو وہ کسی شیطان آدمی یعنی سرکش انسان کے

پاس جا کر مومن کو بہکانے پر اکساتا ہے۔ حضرت ابوذر کی روایت بھی اسی پر دلالت کر رہی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے مجھ سے فرمایا کیا شیاطین جن وانس کے شر سے تو نے اللہ کی پناہ مانگی۔ میں نے عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ کیا انسانوں میں بھی شیاطین ہوتے ہیں فرمایا ہاں وہ شیطین جن سے زیادہ شریر ہوتے ہیں۔

مالک بن دینار کا قول ہے کہ شیطین انس شیاطین جن سے زیادہ سخت ہوتے ہیں۔ جب میں اللہ کی پناہ لے لیتا ہوں تو شیاطین جن تو میرے پاس سے چلے جاتے ہیں اور شیاطین انس آکر مجھے علی الاعلان گناہ کی طرف کھینچتے ہیں۔ عکرمہ، ضحاک، سدی اور کلبی کے نزدیک شیاطین الانس سے مراد وہ شیاطین ہیں جو آدمیوں (کو بہکانے کے لئے ان) کے ساتھ رہتے ہیں اور شیاطین الجن وہ ہیں جو جنات کے ساتھ رہتے ہیں۔ انسان شیطان نہیں ہوتے۔ ابلیس نے اپنی (جناتی) فوج کو دو حصوں میں تقسیم کر رکھا ہے ایک حصہ کو جنات (کو بہکانے) کے لئے اور دوسرے حصہ کو آدمیوں (کو اغواء کرنے) کیلئے مقرر کر رکھا ہے۔ دونوں فریق رسول اللہ ﷺ اور آپ کے دوستوں کے دشمن ہیں۔ ہر فریق ہر وقت دوسرے فریق سے ملتا رہتا ہے۔ شیاطین انس شیاطین جن سے کہتے ہیں ہم نے اپنی آسامی کو اس طرح بہکایا تم بھی اپنی آسامی کو اسی طرح گمراہ کرو۔ شیطین جن بھی شیاطین انس سے یہی کہتے ہیں یُوحِی بَعْضُهُمْ اِلٰى بَعْضٍ کا یہی مطلب ہے۔ اول الذکر تفسیر سیاق آیت کے موافق اور قابل ترجیح ہے۔

يُوحِي بَعْضُهُمْ إِلَىٰ بَعْضٍ زُخْرُفَ الْقَوْلِ غُرُورًا (جن میں سے بعض دوسرے بعض کو چکنی چپڑی باتوں کا وسوسہ ڈالتے رہتے تھے تاکہ ان کو دھوکہ میں ڈال دیں) یعنی شیاطین جن شیاطین انس کے دلوں میں ڈالتے تھے یا بعض جنات بعض جنات کو القاء کرتے تھے اور بعض انسان بعض انسانوں کو۔ زُخْرُفَ الْقَوْلِ بیہودہ ملمع پر فریب باتیں غُرُورًا دھوکہ فریب۔ یہ مفعول لہ ہے یعنی علت فعل سابق۔ مفعول مطلق (تاکیدی) یا مصدر بمعنی اسم فاعل جو حال واقع ہوا ہے۔

وَلَوْ شَاءَ رَبُّكَ مَا فَعَلُوهُ (اور اگر آپ کا رب چاہتا (کہ شیاطین انبیاء کے دشمن نہ ہوں یا دلوں میں گمراہی کے خیالات نہ پیدا کریں یا دھوکہ نہ دیں) تو وہ ایسا (انبیاء سے دشمنی دلوں میں القاء و دھوکہ بازی) نہ کرتے۔ اس آیت سے ثابت ہو رہا ہے کہ گمراہی اور کفر لوگوں کا خالق بھی اللہ ہے۔ (بلکہ معتزلہ کا قول کہ خالق شر بندہ ہے غلط ہے۔

فَذَرْهُمْ وَمَا يَفْتَرُونَ ۝ (سو آپ ان لوگوں کو اور ان کی افترا پردازیوں کو رہنے دیجئے) یعنی آپ پر اور اللہ پر جو افترا بندی اور بہتان تراشی یہ کرتے ہیں اس کی طرف آپ التفات نہ کریں۔ اللہ آپ کی مدد کریگا اور ان کو سزا دیکر رسوا کریگا۔

وَلِتَصْغَىٰ إِلَيْهِ أَفْئِدَةُ الَّذِينَ لَا يُؤْمِنُونَ بِالْآخِرَةِ وَلِيَرْضَوْهُ وَلِيَقْتَرِفُوا مَا هُم مُّقْتَرِفُونَ ۝

(اور تاکہ اس کی طرف ان لوگوں کے دل مائل ہو جائیں جو آخرت پر ایمان نہیں رکھتے اور اس کو اختیار کر لیں اور جن امور کے مرتکب ہیں ان کا ارتکاب کرتے رہیں)۔

وَلِتَصْغَىٰ کا عطف غُرُورًا پر ہے اگر غُرُورًا کو مفعول لہ مانا جائے یا فعل محذوف ہے اس کا متعلق ہے یعنی ہم نے ایسا اس لئے کیا کہ آخرت پر ایمان نہ رکھنے والوں کے دل اس کی طرف مائل ہوں۔ قریش رسول اللہ ﷺ سے کہتے تھے کہ اپنے اور ہمارے اختلاف کا فیصلہ کرنے کے لئے ایک ثالث مقرر کر دو۔ اس پر آیت ذیل نازل ہوئی۔

أَفَغَيْرَ اللَّهِ أَبْتَغِي حَكَمًا وَهُوَ الَّذِي أَنزَلَ إِلَيْكُمُ الْكِتَابَ مُفَصَّلًا ۚ آپ کہہ دیجئے (کیا اللہ کے سوا کسی اور فیصلہ کرنے والے کو تلاش کروں حالانکہ اللہ ہی نے تو تمہارے پاس ایک کامل کتاب بھیج دی ہے جو تفصیل وار ہے)۔ افغیر میں فاء عطف کیلئے ہے اور معطوف علیہ محذوف ہے یعنی کیا میں تمہاری بات مان لوں اور اپنے تمہارے درمیان اللہ کے سوا کسی اور کو حاکم بنالوں جو فیصلہ کرے کہ ہم میں سے حق پر کون ہے اور باطل پر کون ہے حالانکہ اللہ نے قرآن تمہارے پاس بھیج دیا ہے جو بجائے خود معجزہ ہے۔ کتب سابقہ کے مطابق غیبی امور کی خبریں دے رہا ہے اور حق و باطل کو اس میں کھول کر بیان کر دیا گیا ہے کہ اب کوئی اشتباہ باقی نہیں رہا۔ حکم کے مفہوم میں حاکم کے معنی سے زیادہ زور ہے اسی لئے اس لفظ کا اطلاق صرف منصف پر ہوتا ہے۔ آیت میں اس بات پر تنبیہ ہے کہ قرآن کے اعجاز و تقریر کے بعد کسی معجزہ کی ضرورت باقی

تفسیر مروی ہے۔

وَالَّذِينَ آتَيْنَاهُمُ الْكِتَابَ يَعْلَمُونَ أَنَّهُ مُنَزَّلٌ مِّن رَّبِّكَ بِالْحَقِّ (جن لوگوں کو (یعنی یہودیوں کو) ہم نے کتاب دی ہے وہ اس بات کا یقین رکھتے ہیں کہ قرآن بلاشبہ آپ ﷺ کے رب کی طرف سے حق کے ساتھ بھیجا گیا ہے)۔ رسول اللہ ﷺ امی تھے یہودیوں کی کتابیں آپ نے نہیں پڑھی تھیں اور نہ یہودی علماء کے ساتھ رہے تھے اس کے باوجود ایسا قرآن پیش کیا جو یہودیوں کی کتابوں کے مطابق تھا۔ قرآن کو پڑھ کر ہی اہل کتاب کو یقین ہو جاتا تھا کہ یہ اللہ کی بھیجی ہوئی کتاب ہے۔

اگرچہ بعض یہودی ہی قرآن کی حقانیت سے واقفیت تھے مگر باقی لوگ بھی خود غور و خوض کر کے یا اپنے علماء سے دریافت کر کے قرآن کی حقانیت من اللہ کا علم حاصل کر سکتے تھے۔ اسی لئے تمام اہل کتاب کو قرآنی صداقت کا جاننے والا قرار دیا۔

فَلَا تَكُونَنَّ مِنَ الْمُمْتَرِينَ (پس (اے سامع) تو شک کرنے والوں میں سے نہ ہو) یعنی اس بات میں شک نہ کر کہ یہ قرآن اللہ کی کتاب ہے۔

وَتَمَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ صِدْقًا وَعَدْلًا (اور آپ کے رب کی باتیں سچائی اور اعتدال کے اعتبار سے کامل ہیں)۔ اللہ کی بات پوری ہونے کا مطلب ہے کہ اللہ کی دی ہوئی خبروں کا اور وعدہ وعید کا سچا ہونا اور احکام (امر و نہی) کا مبنی بر عدل ہونا۔ قتادہ اور مقاتل نے یہی تفسیر بیان کی ہے۔ صِدْقًا وَعَدْلًا کا نصب تمیز یا حال ہونے کی بناء پر ہے۔

لَا مُبَدِّلَ لِكَلِمَاتِهِ (اس کی باتوں کو کوئی بدلنے والا نہیں)۔ یعنی کسی بات کو کوئی نہیں بدل سکتا۔ حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا اس کے (ابدی) فیصلہ کو کوئی پلٹنے والا اور اس کے حکم کو کوئی بدلنے والا نہیں۔ یا یہ معنی ہے کہ قرآن کے بعد کوئی نبی آنے والا یا کتاب کہ قرآن کو بدل دے اور قرآن کے احکام تبدیل کر دے۔

وَهُوَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ (اور (جو کچھ یہ کہتے ہیں اس کو) وہ سننے والا ہے) اور جو کچھ دلوں میں چھپائے رکھتے ہیں اس سے) پورا واقف ہے) کوئی ان کو سہولت نہیں دے گا۔

وَإِن تُطِعْ أَكْثَرَ مَن فِي الْأَرْضِ يُضِلُّوكَ عَن سَبِيلِ اللَّهِ (اور اگر آپ اکثر اہل زمین کی پیروی کریں گے تو وہ آپ کو اللہ کے راستے سے بھٹکا دیں گے)۔ اکثر اہل زمین سے مراد ہیں کفار، کیونکہ اہل ایمان سے کافروں کی تعداد زائد ہے اور راہ خدا سے مراد ہے اللہ تک پہنچانے والا راستہ یعنی دین اسلام

إِن يَتَّبِعُونَ إِلَّا الظَّنَّ (اکثر لوگ تو محض بے اصل خیالات پر چلتے ہیں) یعنی اپنی جہالت اور خود ساختہ حلت مردار اور حرمت بحیرہ وغیرہ پر۔

وَإِنْ هُمْ إِلَّا يَخْرُصُونَ (اور بالکل قیاسی باتیں کرتے ہیں) یعنی جو کچھ کہتے ہیں محض گمان اور تخمین سے کہتے ہیں کسی صحیح دلیل سے حاصل شدہ یقین کی روشنی میں نہیں کہتے۔

إِنَّ رَبَّكَ هُوَ أَعْلَمُ مَن يَضِلُّ عَن سَبِيلِهِ ۖ وَهُوَ أَعْلَمُ بِالْمُهْتَدِينَ (بلاشبہ آپ کا رب ہی ان لوگوں کو خوب جانتا ہے جو اس کے راستے سے بھٹکے ہوئے ہیں اور وہی راہ راست پر چلنے والوں سے بھی بخوبی واقف ہے) یعنی دونوں فریقوں کو جانتا ہے ہر ایک کو اس کے استحقاق کے مطابق بدلہ دے گا۔ مَنْ يَضِلُّ میں مَنْ موصولہ ہے یا موصوفہ یا استفہامیہ ابتدائیہ اور يَضِلُّ صلہ ہے یا صفت یا خبر۔

ابوداؤد اور ترمذی نے حضرت ابن عباسؓ کی روایت سے لکھا ہے کہ کچھ لوگ خدمت گرامی میں حاضر ہوئے اور عرض کیا یا رسول اللہ (کیا وجہ کہ) جس کو ہم خود قتل کریں اس کو تو کھائیں اور جس کو اللہ (بغیر ہمارے ذبح کئے) مار ڈالے اس کو نہ کھائیں اس پر آیت ذیل نازل ہوئی۔

فَكُلُوا مِمَّا ذُكِرَ اسْمُ اللَّهِ عَلَيْهِ (پس جس پر اللہ کا نام لے لیا گیا ہو اس کو کھاؤ)۔

فائدہ یہ ہے کہ گمراہ کن کافروں کے اتباع سے گزشتہ کلام میں ممانعت کی گئی ہے اسی ممانعت پر یہ حکم متفرع ہے یعنی حرام کو حلال اور حلال کو حرام قرار دیتے میں کافروں کے خیالات پر نہ چلو، جو مردار کو حلال اور ذبیحہ کو حرام قرار دیتے ہیں۔

اِنْ كُنْتُمْ بِاٰيٰتِهٖ مُؤْمِنِيْنَ ۝ (اگر تم اللہ کی آیات پر ایمان رکھنے والے ہو) کیونکہ اللہ پر ایمان رکھنے کا تقاضا ہے کہ جس چیز کو اللہ نے حلال قرار دیا ہے اس کو مباح سمجھا جائے اور جس کو حرام قرار دیا ہے اس سے پرہیز کیا جائے۔

وَمَا لَكُمْ اَلَّا تَاْكُلُوْا مِمَّا ذُكِرَ اسْمُ اللّٰهِ عَلَيْهِ (اور کیا وجہ کہ جس پر (ذبح کے وقت) اللہ کا نام لے لیا گیا اس کو نہ کھاؤ) ما استفہامیہ مبتدا اور لکم خبر ہے۔

وَقَدْ فَصَّلَ لَكُمْ مَّا حَرَّمَ عَلَيْكُمْ (حالانکہ جن چیزوں کو تمہارے لئے اللہ نے حرام کیا ہے ان کی تفصیل وہ خود کر چکا ہے) تفصیل محرمات سے مراد آیت قُلْ لَّآ اَجِدُ فِيْمَآ اُوْحِيَ اِلَيَّ مُحَرَّمًا الخ ہے۔

اِلَّا مَا اضْطُرِرْتُمْ اِلَيْهِ (مگر وہ بھی جب سخت ضرورت پڑ جائے) (تو حلال ہیں) ما بمعنی وقت ہے یعنی اللہ نے ان چیزوں کی تفصیل کر دی ہے جن کو ہر وقت (کھانا) حرام کر دیا ہے سوائے مجبوری کے وقت کے۔

ایک شبہ ......

اس استثناء کا فائدہ ہی کیا ہے فَصَّلَ لَكُمْ مَّا حَرَّمَ عَلَيْكُمْ کے اندر تو خود استثناء داخل ہے۔

ازالہ ......

جس چیز کو حرام نہیں کیا گیا اس کو نہ کھانے کی ممانعت کی تاکید مقصود ہے کیونکہ حرام چیز تو مجبوری کے وقت حلال ہو جاتی ہے لیکن حلال چیز کو کسی وقت حرام نہیں کیا جا سکتا۔

وَاِنَّ كَثِيْرًا لَّيُضِلُّوْنَ بِاَهْوَآئِهِمْ بِغَيْرِ عِلْمٍ اِنَّ رَبَّكَ هُوَ اَعْلَمُ بِالْمُعْتَدِيْنَ ۝ (یقیناً بہت سے آدمی اپنے من گھڑت خیالات پر بغیر کسی (عقلی یا نقلی) دلیل کے (لوگوں کو) بے راہ کرتے ہیں اس میں کوئی شبہ نہیں کہ اللہ حد سے نکلنے والوں کو خوب جانتا ہے) یعنی جو حق سے نکل کر باطل کی طرف اور حلال سے آگے بڑھ کر حرام کی طرف جاتے ہیں ان کو خوب جانتا ہے۔

وَذَرُوْا ظَاهِرَ الْاِثْمِ وَبَاطِنَهٗ (اور تم ظاہری گناہ کو بھی چھوڑ دو اور باطنی گناہ کو بھی)۔

یعنی تمام گناہ چھوڑ دو۔ ظاہری گناہ یعنی جن کا تعلق بیرونی جسمانی اعضاء (کان، ناک، آنکھ، زبان، ہاتھ، پاؤں وغیرہ) سے ہے اور اندرونی گناہ یعنی جن کا تعلق قلب، دماغ اور اندرونی جذبات نفس سے ہے۔ کلبی اور اکثر مفسرین کے نزدیک اثم سے مراد زنا ہے یعنی ظاہری طور پر اور چھپ کر زنا کرنے سے بچو۔ سعید بن جبیر نے ظاہر اثم سے محرمات کے ساتھ نکاح کرنا اور باطن اثم سے زنا مراد لیا ہے۔ ابن زید نے کہا ظاہر اثم کپڑے اتار کر ننگے ہو کر طواف کرنا اور باطن اثم زنا ہے۔ ایک روایت میں کلبی کا قول ہے یعنی قول ہے کہ دن میں برہنہ ہو کر مردوں کا طواف کرنا ظاہر اثم ہے اور رات کو برہنہ ہو کر عورتوں کا طواف کرنا باطن اثم ہے۔

اِنَّ الَّذِيْنَ يَكْسِبُوْنَ الْاِثْمَ سَيُجْزَوْنَ بِمَا كَانُوْا يَقْتَرِفُوْنَ ۝ (جو لوگ (دنیا میں) گناہ کرتے ہیں عنقریب ان کو (آخرت میں) ان کے کئے کی سزا دی جائے گی)۔

وَلَا تَاْكُلُوْا مِمَّا لَمْ يُذْكَرِ اسْمُ اللّٰهِ عَلَيْهِ (اور جس پر (ذبح کے وقت) اللہ کا نام نہ لیا گیا ہو اس میں سے نہ کھاؤ) اس آیت کے عموم سے امام احمد نے استدلال کیا ہے کہ ذبح کے وقت اللہ کا نام لینا بھول گیا ہو یا قصداً نہ لیا ہو دونوں صورتوں میں ایسے ذبیحہ کا کھانا حرام ہے۔ داؤد، ابو ثور، شعبی اور محمد بن سیرین کا بھی یہی قول ہے۔ امام مالک کے نزدیک

آیت کے عموم میں وہ ذبیحہ داخل نہیں جس کو ذبح کرتے وقت اللہ کا نام لینا بھول کر رہ گیا ہو۔ اس کا ثبوت حضرت ابوہریرہؓ کی روایت سے ہوتا ہے کہ ایک شخص نے رسول اللہ ﷺ سے دریافت کیا یارسول اللہ اگر ہم میں سے کوئی ذبح کرے اور اللہ کا نام لینا بھول جائے تو کیا حکم ہے حضور ﷺ نے فرمایا اللہ کا نام ہر مسلمان کے منہ میں ہے (تلفظ کرے یا نہ کرے) رواہ الدار قطنی حضرت ابن عباسؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا مسلمان اگر ذبح کرنے کے وقت بسم اللہ کہنا بھول جائے تو بعد کو بسم اللہ کہہ لے اور پھر کھالے رواہ الدار قطنی۔ یہ دونوں حدیثیں ضعیف ہیں۔ حضرت ابوہریرہؓ کی حدیث میں ایک راوی مروان بن سالم ہے جس کے متعلق امام احمد نے کہا ہے کہ یہ ثقہ نہیں ہے اور نسائی و دار قطنی نے اس کو متروک کہا ہے۔ رہی حضرت ابن عباسؓ کی روایت تو اس میں معقل مجہول راوی ہے۔ امام ابوحنیفہ کا قول بھی امام مالکؒ کی رائے کے موافق ہے لیکن آپ کے ضابطہ پر اخبار احاد کے ذریعہ سے نص قرآنی کے عموم کی تخصیص درست نہیں (اس لئے حضرت ابوہریرہؓ اور حضرت ابن عباسؓ کی روایت کردہ حدیثوں کی وجہ سے آیت مذکورہ کے عموم کو مخصوص البعض نہیں قرار دیا جاسکتا)۔

صاحب ہدایہؒ نے حنفیہ کے قول کی تائید میں لکھا ہے کہ اگر آیت کے حکم کو عام قرار دیا جائے گا تو بھول کر بسم اللہ ترک کرنے والے کے لئے بھی غیر معقول دشواری ہو جائے گی اور دشواری بہرحال قابل ازالہ ہے۔ انسان کثیر النسیان ہے بھول ہی جاتا ہے اگر آیت کا وہی معنی ہو جو ظاہر کلام سے سمجھا جاتا ہے تو جھگڑا پڑ جائے گا اور اختلاف رونما ہو جائے گا بلکہ قرن اول میں سب ہی اس حکم کے سامنے سر تسلیم خم کر دیتے، کوئی اختلاف ہی نہ ہوتا (کہ اب اختلاف کی نوبت آتی) صاحب ہدایہ کی یہ دلیل نہایت کمزور ہے۔ امام شافعیؒ کے نزدیک مِمَّا لَمْ يُذْكَرِ اسْمُ اللّٰهِ عَلَيْهِ سے مراد ہے مردار اور وہ ذبیحہ جو غیر اللہ کے نام پر ذبح کیا گیا ہو کیونکہ آگے فرمایا ہے

وَإِنَّهُ لَفِسْقٌ (اور بلاشبہ یہ امر بے حکمی ہے) اور فسق اللہ کو چھوڑ کر دوسروں کا نام ذکر کرنے میں ہوتا ہے۔ اسی سورت کے آخر میں آیا ہے أَوْ فِسْقًا أُهِلَّ لِغَيْرِ اللّٰهِ بِهِ۔

اگر قصداً ذبح کے وقت اللہ کا نام نہ لیا گیا ہو تب بھی امام شافعیؒ کے نزدیک ذبیحہ حلال ہے۔ حضرت عائشہؓ کی روایت ہے کہ کچھ لوگوں نے عرض کیا یارسول اللہ ﷺ کچھ لوگ ایسے ہیں جن کے شرک کا زمانہ ابھی گذرا ہے (حال میں مسلمان ہوئے ہیں) وہ لوگ ہمارے سامنے کچھ گوشت لاتے ہیں، معلوم نہیں ذبح کے وقت اللہ کا نام لیتے ہیں یا نہیں لیتے (ہم وہ گوشت کھائیں یا نہ کھائیں)۔

حضور ﷺ نے فرمایا تم اللہ کا نام لے لیا کرو اور کھا لیا کرو۔ رواہ البخاری۔ بغوی نے اس دلیل کی تشریح میں بیان کیا ہے کہ اگر ذبح کے وقت اللہ کا نام لینا اباحت کے لئے ضروری ہوتا تو بسم اللہ کہنے میں شک پیدا ہو جانا ہی کھانے کی ممانعت کے لئے کافی ہوتا، جس طرح اگر ذبح کے متعلق شک ہو (کہ معلوم نہیں یہ ذبیحہ ہے یا نہیں) تو کھانا ممنوع ہے اور سوال کرنے والوں نے اپنے شک کا اظہار کیا تھا اور عرض کیا تھا معلوم نہیں ذبح کے وقت اللہ کا نام لیا گیا ہے یا نہیں۔ اس صورت میں یقیناً ممانعت ہونی چاہئے تھی لیکن حضور ﷺ نے ممانعت نہیں فرمائی جس سے ثابت ہوتا ہے کہ زبان سے اللہ کا نام لینا اباحت کی شرط نہیں ہے۔ اس کے علاوہ حلت کی مرسل حدیث ہے جس کو ابوداؤد نے مراسیل میں ذکر کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا مسلمان کا ذبیحہ حلال ہے، اللہ کا نام لیا گیا ہو یا نہ لیا گیا ہو۔

حنفیہ کہتے ہیں کہ حلت کی حدیث میں اللہ کا نام نہ لئے جانے سے مراد بھول جانا اور حضرت عائشہؓ والی حدیث ہمارے خلاف نہیں جاتی بلکہ ہماری تائید کرتی ہے کیونکہ سوال کرنے والے یہ تو جانتے تھے کہ ذبح کرنے والا مسلمان ہے۔ شک ان کو اس بات میں تھا کہ اللہ کا نام لیا گیا ہے یا نہیں۔ اس سے ثابت ہو رہا ہے کہ صحابہؓ کے نزدیک ذبیحہ کے حلال ہونے کی یہ شرط تھی کہ ذبح کے وقت اللہ کا نام لیا گیا ہو۔ اب رسول اللہ ﷺ نے جو کھانے کے جواز کا حکم دیا تو اس کی بنا مسلمان کی ظاہری حالت پر ہے۔ ظاہر یہی تھا کہ مسلمان قصداً اللہ کا نام لینا ترک نہیں کرتا۔ جیسے کہ مسلمانوں کے بازار سے اگر گوشت خرید لیا ہو تو اس کو

میں حضرت حمزہؓ بن عبدالمطلب اور ابو جہل مراد ہیں۔ واقعہ یہ ہوا تھا کہ ابو جہل نے رسول اللہ ﷺ کے اوپر (اونٹ کا) اوجھ ڈال دیا تھا۔ حضرت حمزہؓ شکار سے لوٹ رہے تھے کہ ابو جہل کی اس حرکت کی اطلاع آپ کو ملی آپ کے ہاتھ میں اس وقت کمان تھی یہ قصہ حضرت حمزہؓ کے مسلمان ہونے سے پہلے کا ہے۔ آپ غصہ میں بھرے ہوئے کمان لے کر ابو جہل کے پاس پہنچے۔ ابو جہل عاجزی کے ساتھ کہنے لگا۔ ابو یعلیٰ دیکھتے تو محمد ﷺ کیا چیز لائے ہیں یہ تو ہماری عقلوں کو بے وقوف بتاتے ہمارے معبودوں کو گالیاں دیتے اور ہمارے اسلاف کی مخالفت کرتے ہیں۔ حضرت حمزہؓ نے فرمایا تم سے زیادہ احمق اور کون ہوگا اللہ کو چھوڑ کر پتھروں کی پوجا کرتے ہو۔ میں اقرار کرتا ہوں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور محمد ﷺ اس کے بندے اور پیغام رسان ہیں۔ اس پر اللہ نے یہ آیت نازل فرمائی۔ عکرمہ اور کلبی نے مورد نزول حضرت عمار بن یاسر اور ابو جہل کو قرار دیا ہے۔[1]

ان تینوں روایات کا اس امر پر اتفاق ہے کہ مَّثَلُهُ فِي الظُّلُمٰتِ سے مراد ابو جہل ہے اور اس کے مقابل مَنْ اَحْيَيْنٰهُ سے مراد باختلاف روایت تینوں حضرات میں سے کوئی ایک ہے۔ ظاہر یہ ہے کہ ان تینوں حضرات کے مسلمان ہونے کا زمانہ کچھ زیادہ فصل سے نہ تھا قریب ہی وقت میں ایک کے بعد دوسرا اور دوسرے کے بعد تیسرا مسلمان ہوا تھا اسی زمانہ میں اس آیت کا نزول ہوا۔ واللہ اعلم اس لئے ہر ایک کو مورد نزول قرار دیا جاسکتا ہے۔ آیت میں ابو جہل کے اس خیال کی تردید ہے کہ مسلمان چونکہ اپنے (سابق) معبودوں کو گالیاں دیتے اور اپنے باپ دادا کی مخالفت کرتے ہیں اس لئے ہم ان سے افضل ہوں۔ رفتار بیان کا تقاضا تھا کہ کافروں کے افضل ہونے کی نفی کی جاتی لیکن آیت میں مومن و کافر کی مساوات کی نفی کی گئی اس سے کافروں کی افضلیت کی پرزور طور پر نفی ہوگئی اور دونوں کے برابر ہونے کی طرف گمان بھی نہیں جاسکتا۔ آیت میں مساوات کی نفی اس طور پر کی جس سے مومن کا افضل ہونا ثابت ہو رہا ہے مومن کے کمالات کی خصوصیت اور کافروں کے اندر اس خصوصیت کا فقدان بدلالت مطابقی اشارۃ النص ہے اور افضلیت کفار کی نفی بدلالت التزامی عبارۃ النص ہے۔

كَذٰلِكَ زُيِّنَ لِلْكٰفِرِيْنَ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ۝ جس طرح ابو جہل کیلئے اس کی بداعمالی دل پسند بنادی گئی کہ وہ اپنے کو مسلمانوں سے افضل جاننے لگا (اسی طرح کافروں کیلئے ہم نے ان کی تمام بداعمالیاں دل پسند بنادی ہیں)۔

وَكَذٰلِكَ جَعَلْنَا فِيْ كُلِّ قَرْيَةٍ اَكٰبِرَ مُجْرِمِيْهَا لِيَمْكُرُوْا فِيْهَا ؕ (اور (جس طرح ہم نے مکہ میں بڑے لوگوں کو مجرم بنایا) اسی طرح ہم نے ہر بستی میں وہاں کے رئیسوں کو ہی بڑا مجرم کا مرتکب بنایا تاکہ وہ لوگ وہاں شرارتیں کیا کریں۔ جَعَلْنَا کا ترجمہ اگر "بنادیا" کیا جائے تو اس کے دو مفعول ہوں گے ایک فِيْ كُلِّ قَرْيَةٍ اور دوسرا اَكٰبِرَ اور مُجْرِمِيْهَا، اَكٰبِرَ سے بدل ہوگا یا اَكٰبِرَ مفعول دوم اور مُجْرِمِيْهَا مفعول اول ہوگا یا اَكٰبِرَ مُجْرِمِيْهَا بصورت اضافت ایک مفعول ہوگا اور فِيْ كُلِّ قَرْيَةٍ دوسرا مفعول۔ اور اگر جَعَلْنَا کا ترجمہ کیا جائے "ہم نے جمادیا، ہم نے طاقت عطا کی" تو اَكٰبِرَ مُجْرِمِيْهَا بصورت اضافت اس کا مفعول ہوگا۔

اگر صیغہ اسم تفضیل مضاف ہو اور مضاف الیہ جمع ہو تو مضاف کو واحد لانا بھی درست ہے اور جمع لانا بھی (آیت میں اَكٰبِرَ صیغہ جمع ہی آیا ہے) بڑے لوگوں کے پیچھے چونکہ چھوٹے لوگ لگ جاتے ہیں اور بڑے لوگ چھوٹے لوگوں کو بہکانے کی زیادہ طاقت رکھتے ہیں اس لئے اَكٰبِرَ کا خصوصیت کے ساتھ ذکر کیا۔ اللہ کا ضابطہ ہی یہ ہے کہ شر میں جو تخریب کا اتباع چھوٹے لوگ کرتے اور بڑے لوگ سرکشی کرتے ہیں۔ مکر کا معنی ہے دھوکہ، فریب (قاموس) صحاح میں ہے کہ مکر کا معنی ہے تدبیر کے ساتھ کسی کو اس کے مقصد سے پھیر دینا (یا پھیر دینے کی کوشش کرنا) قریش کے مکر کی صورت یہ تھی کہ انہوں نے مکہ کے چہار طرف کے راستوں پر ایک ایک آدمی بٹھا رکھا تھا کہ جو لوگ مسلمان ہونے کے لئے رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں آتا چاہیں ان کو راستے ہی لوٹا دے۔ خدمت گرامی میں پہنچنے نہ دے اور کہے یہ شخص تو کاہن اور جھوٹا جادوگر ہے۔

---

[1] زید بن اسلم کی روایت ہے کہ آیت کا نزول حضرت عمر بن خطابؓ اور ابو جہل کے حق میں ہوا۔ حسن بصریؒ اور ابو سنان کی روایات بھی اسی طرح ہیں۔

وَمَا يَمْكُرُونَ إِلَّا بِأَنْفُسِهِمْ (اور وہ صرف اپنے ہی ساتھ شرارت کرتے تھے) کیونکہ اس فریب کا نتیجہ بد انہی پر پڑتا تھا۔

وَمَا يَشْعُرُونَ ﴿١٢٣﴾ (اور ان کو ذرا خبر نہ تھی)۔

بغوی نے قتادہ کا بیان نقل کیا ہے کہ ابو جہل نے کہا عبد مناف کی اولاد نے شرف میں ہم سے مقابلہ کیا یہاں تک کہ جب ریس کے دو گھوڑوں کی طرح (مقابلہ پر) دوڑنے لگے تو انہوں نے (اپنی برتری ظاہر کرنے کے لئے) کہا کہ ہم میں ایک نبی ہے جس کے پاس وحی آتی ہے۔ خدا کی قسم ہم تو اس کو نہیں مانیں گے اور نہ کبھی اس کے تابع بن کر رہیں گے، ہاں اگر ہمارے پاس بھی اسی طرح وحی آ جائے جس طرح اس کے پاس آتی ہے تو پھر (مان لیں گے)۔ ایک روایت میں آیا ہے کہ ولید بن مغیرہ نے کہا تھا کہ اگر نبوت واقعی کوئی ضروری چیز ہے تو میں تجھ سے نبوت کا زیادہ حقدار ہوں، عمر میں بھی زیادہ ہوں اور مال میں بھی۔ اس پر آیت ذیل نازل ہوئی۔

وَإِذَا جَاءَتْهُمْ آيَةٌ قَالُوا لَنْ نُؤْمِنَ حَتَّىٰ نُؤْتَىٰ مِثْلَ مَا أُوتِيَ رُسُلُ اللَّهِ ۘ اللَّهُ أَعْلَمُ حَيْثُ يَجْعَلُ رِسَالَتَهُ

(اور جب ان کو کوئی آیت پہنچتی ہے تو کہتے ہیں ہم ہرگز یقین نہیں کریں گے جب تک ہم کو بھی ایسی ہی چیز نہ دی جائے جیسی اللہ کے رسولوں کو دی گئی ہے جہاں اللہ اپنی پیغمبری رکھتا ہے اس کو وہی خوب جانتا ہے) وَاللَّهُ أَعْلَمُ کے جملہ سے یہ ظاہر کرنا مقصود ہے کہ نسب یا مال یا عمر کی وجہ سے نبوت کا استحقاق نہیں ہوتا بلکہ یہ اللہ کا فضل ہے، وہی خوب جانتا ہے کہ کون نبوت کا اہل ہے۔ حضرت مجدد الف ثانیؒ نے لکھا ہے کہ تعین نبوت کا مبدأ محض صفت الٰہی ہے جس میں پرتو (اور ظلیت) کی کوئی آمیزش ہی نہیں ہے، باقی انسانوں کے (مؤمن ہوں یا کافر اور نیک ہوں یا بد ہونے کے) مبادی اللہ کے اسماء و صفات کے پرتو ہیں (یعنی نبوت کا سرچشمہ براہ راست اور بالذات صفات خداوندی ہیں اور دوسری مخلوق کا مبدء تعین اور سرچشمہ براہ راست صفات نہیں بلکہ صفات کے پرتو اور ظلال ہیں) اللہ کی صفات اگرچہ واجب ہیں لیکن (ان کا وجوب بذات خود نہیں بلکہ) وہ واجب بالغیر ہیں یعنی ذات الٰہی کے لئے ان کا وجوب ہے (اور ذات الٰہی واجب ہے لہٰذا اس کی صفات بھی واجب ہیں) اسی وجہ کہ وہ ذات کی محتاج ہیں اسی اعتبار سے وہ ملائکہ اور انبیاء کے تعین کا مبدأ ہیں اور یہی وجہ ہے کہ معصوم صرف انبیاء اور ملائکہ ہیں۔ صفات اگرچہ ملائکہ اور انبیاء دونوں کے تعین کا مبدء ہیں لیکن مبدئیت کی دو حیثیتیں ہیں ایک بطونی دوسری ظہوری۔ بطونی اعتبار سے ان صفات کا قیام اللہ کی ذات سے ہے اور اسی اعتبار سے وہ تعین ملائکہ کی مبدأ ہیں اور ظہوری اعتبار سے وہ عالم کا سرچشمہ اور مصدر ہیں اس لحاظ سے وہ تعین انبیاء کا مبدأ ہیں۔ اس تقریر سے واضح ہو گیا کہ ملائکہ کی ولایت انبیاء کی ولایت سے زیادہ اونچی اور اقرب الی اللہ ہے، مگر ملائکہ پر انبیاء کی فضیلت نبوت کی وجہ سے ہے کیونکہ نبوت انسان کی خصوصیت ہے اور نبوت نام ہے خالص ذاتی جود و احسان کے نتیجہ کا۔ خلاصہ کلام یہ کہ نبوت اور رسالت کا استحقاق نسب، مال یا عمر سے نہیں ہو سکتا اس کا مبدأ تعین (اور موجب) تو صفات الٰہیہ ہیں۔

سَيُصِيبُ الَّذِينَ أَجْرَمُوا صَغَارٌ عِنْدَ اللَّهِ وَعَذَابٌ شَدِيدٌ بِمَا كَانُوا يَمْكُرُونَ ﴿١٢٤﴾

(عنقریب ان لوگوں کو جنہوں نے یہ جرم کیا ہے اللہ کے پاس پہنچ کر ذلت پہنچے گی اور سخت سزا ان کی شرارتوں کے بدلے میں ملے گی)۔ صَغَارٌ ذلت اور حقارت۔ عِنْدَ اللَّهِ یعنی قیامت کے دن۔ بعض علماء کے نزدیک عِنْدَ اللَّهِ اصل میں مِنْ عِنْدِ اللَّهِ تھا (اللہ کی طرف سے)۔ یعنی دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی۔ عذاب شدید دنیا میں قتل اور قید ہونا جیسے بدر کی

۱۔ حضرت ابن مسعودؓ نے فرمایا کہ اللہ نے بندوں کے دلوں کو دیکھا اور محمد ﷺ کے دل کو سب سے بہتر پایا تو آپ کو اپنے لئے چن لیا اور اپنا پیغمبر بنا کر مبعوث فرمایا، پھر آپ کے بعد اور لوگوں کے دلوں پر نظر کی تو آپ کے صحابہ کے دلوں کو دوسروں کے دلوں سے بہتر پایا تو ان کو اپنے پیغمبر کے وزیر (مددگار) بنایا جو اللہ کے دین کے لئے جہاد کرتے ہیں۔ پس جس بات کو مؤمن اچھا جانتے ہیں وہ اللہ کے نزدیک بھی اچھی ہے اور جس بات کو مؤمن برا جانتے ہیں وہ اللہ کے نزدیک بھی بری ہے۔

لڑائی کے رن ہوا اور آخرت میں دوزخ میں جانا۔ بِمَا كَانُوا میں باء سببیہ ہے یعنی شرارتوں کی وجہ سے۔ یا مقابلہ کی ہے یعنی شرارتوں کے بدلے میں۔

فَمَنْ يُرِدِ اللّٰهُ اَنْ يَّهْدِيَهٗ يَشْرَحْ صَدْرَهٗ لِلْاِسْلَامِ (پس جس شخص کو اللہ راہ حق کی ہدایت کرنا چاہتا ہے اس کا سینہ اسلام کیلئے کھول دیتا ہے) جب یہ آیت اتری تو رسول اللہ ﷺ سے شرح صدر کی تشریح دریافت کی گئی، فرمایا مومن کے دل کے اندر اللہ ایک نور ڈال دیتا ہے جس کی وجہ سے اس کا دل کشادہ اور وسیع ہو جاتا ہے۔ میں کہتا ہوں مراد یہ ہے کہ معرفت حق کے لئے کھل جاتا ہے۔ اور ایمان لے آتا ہے صحابہؓ نے عرض کیا، کیا اس کی کوئی علامت ہوتی ہے۔ فرمایا ہاں غیر فانی گھر (آخرت) کی طرف میلان قلب، اس فریب خانہ (دنیا) سے طبیعت کی دوری اور موت آنے سے پہلے موت کی تیاری۔ یہ حدیث حضرت ابن مسعودؓ کی روایت سے حاکم نے مستدرک میں اور بیہقی نے شعب الایمان میں لکھی ہے اور ابو جعفر کی روایت سے مرسلاً فریابی اور ابن جریر اور عبد بن حمید نے بھی ذکر کی ہے۔

صوفیہ کے نزدیک شرح صدر اس وقت ہوتا ہے جب نفس کو فنا کر دیا جائے، نفسانیت کا کوئی نشان بھی باقی نہ رہے اور ایسا اسی وقت ہوتا ہے جب ولایت کبریٰ یعنی ولایت انبیاء میں تجلی صفات نمودار ہو، اس وقت حقیقی ایمان حاصل ہو جاتا ہے۔

وَمَنْ يُّرِدْ اَنْ يُّضِلَّهٗ يَجْعَلْ صَدْرَهٗ ضَيِّقًا حَرَجًا كَاَنَّمَا يَصَّعَّدُ فِي السَّمَآءِ (اور جس کو وہ بے راہ رکھنا چاہتا ہے اس کے سینہ کو تنگ بہت تنگ کر دیتا ہے (اس کو ایسی دشواری معلوم ہوتی ہے) جیسے اس کو آسمان پر چڑھنا پڑ رہا ہو) سیبویہ نے کہا کہ حَرَجٌ بفتح راء مصدر ہے بمعنی فاعل اور صیغہ صفت بھی۔ اس کا معنی ہے بہت ہی تنگ، مطلب یہ ہے کہ اللہ اس کے سینہ کو ایسا کر دیتا ہے کہ اس کے اندر ایمان داخل ہی نہیں ہو سکتا، حق کو قبول کرنا اس کے لئے سخت دشوار ہوتا ہے وہ حق کو ناممکن سمجھنے لگتا ہے۔ خیر کے داخل ہونے کا اس میں کوئی راستہ ہی نہیں ہوتا (کلبی) حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا اللہ کا ذکر سن کر اس میں انقباض ہو جاتا ہے اور بتوں کی پوجا کا تذکرہ سن لیتا ہے تو کھل جاتا ہے۔

حضرت عمر بن خطاب نے یہ آیت تلاوت فرما کر بنی کنانہ کے ایک اعرابی سے دریافت کیا حَرَجَةٌ کا کیا معنی ہے اعرابی نے کہا ہماری بولی میں حَرَجَةٌ اس درخت کو کہتے ہیں جو درختوں کے اتنا اندر ہو کہ وہاں تک نہ کوئی چرنے والا مویشی پہنچتا ہو نہ جنگلی چوپایہ۔ حضرت عمرؓ نے فرمایا منافق کا دل بھی ایسا ہی ہوتا ہے کوئی بھلائی اس تک نہیں پہنچ سکتی۔ آسمان پر چڑھنا یعنی ایسا کام کرنا جو طاقت سے باہر ہو۔ انتہائی تنگ دل ہونے کی تشبیہ اس شخص کی حالت سے دی ہے جو خارج از قدرت کام کر رہا ہو۔ مطلب یہ ہے کہ جس طرح آسمان پر چڑھنا عام طور پر ناممکن ہے اسی طرح ایمان کا اس کے دل میں داخل ہونا ناممکن ہوتا ہے۔ بعض علماء نے اس تشبیہ کا یہ مطلب بیان کیا ہے کہ وہ ایمان سے اتنی دور بھاگتا ہے جیسے کوئی شخص بھاگ کر آسمان پر چڑھ جائے (وجہ شبہ دوری ہے)

كَذٰلِكَ يَجْعَلُ اللّٰهُ الرِّجْسَ عَلَى الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ ۝ جس طرح بے ایمانوں کا سینہ تنگ اور دل ایمان سے دور ہو جاتا ہے (اسی طرح ایمان نہ لانے والوں پر اللہ پھٹکار ڈالتا ہے)۔

رجس سے مراد عذاب (عطاء) دنیا میں پھٹکار اور آخرت میں عذاب (زجاج) گناہ (کلبی) ایسی چیز جس میں کوئی بھلائی نہیں (مجاہد) شیطان (حضرت ابن عباسؓ) یعنی شیطان کو مسلط کر دیتا ہے۔ عَلَيْهِمْ کی جگہ عَلَى الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ کہنے سے اس طرف اشارہ ہے کہ ان کا ایمان نہ لانا پھٹکار کا سبب ہے۔ اس آیت سے ثابت ہو رہا ہے کہ معتزلہ کا قول غلط ہے جو کہتے ہیں کہ اللہ معصیت کا ارادہ نہیں کرتا (کیونکہ گناہ شر ہے اور اللہ شر کا خالق نہیں)

وَهٰذَا صِرَاطُ رَبِّكَ مُسْتَقِيْمًا ؕ (اور یہی (یعنی جس کو اللہ ہدایت کرنا چاہے اس کا سینہ ایمان کے لئے کھول دینا اور جس کو گمراہ رکھنا چاہے اس کے سینہ کو بہت تنگ کر دینا) تیرے رب کا سیدھا راستہ ہے) رب کے راستہ سے مراد ہے وہ راستہ جو تقاضائے حکمت اور اللہ کے مقررہ ضابطہ کے مطابق ہے۔ بعض نے کہا یہ راستہ

سے پہلے کسی پیغمبر کی بعثت تمام انسانوں کے لئے ہوئی نہ تمام جنات کے لئے) مجاہد نے کہا انسانوں میں تو پیغمبر ہوئے اور جنات میں صرف ڈرانے والے۔ اللہ نے فرمایا ہے وَلَّوْا اِلٰى قَوْمِهِمْ مُّنْذِرِيْنَ ڈرانے والوں سے مراد ہیں پیغمبروں کے قاصد یعنی جنات پیغمبروں کا کلام سن کر اپنی قوم والوں کو جا کر سناتے تھے یہ پیغمبروں کے قاصد ہوتے تھے جنات پیغمبر نہیں ہوئے۔ اس قول پر مِنْكُمْ کا خطاب صرف انسانوں کو ہوگا جیسے آیت يَخْرُجُ مِنْهُمَا اللُّؤْلُؤُ وَالْمَرْجَانُ میں مِنْهُمَا تثنیہ کی ضمیر ہے مگر مراد واحد ہے یعنی نمکین سمندر سے موتی اور مونگے نکلتے ہیں۔ دوسری آیت ہے وَجَعَلَ الْقَمَرَ فِيْهِنَّ اس میں فِيْهِنَّ ضمیر جمع ہے اور مراد ایک آسمان ہے کیونکہ چاند ایک ہی آسمان میں ہے۔

میں کہتا ہوں آیت سے یہ بات یقیناً معلوم ہو رہی ہے کہ جن ہوں یا انسان ہر فریق کی ہدایت کے لئے پیغمبروں کو بھیجا گیا تو پیغمبر صرف انسان کو ہی بنایا گیا جنات میں سے بھی بعض کو رسول اللہ ﷺ کی بعثت سے پہلے ان کی قوم کی ہدایت کے لئے پیغمبر بنا کر بھیجا گیا یہ دونوں صورتیں ممکن ہیں۔ دیکھو اللہ نے فرمایا ہے لَوْ كَانَ فِي الْاَرْضِ مَلٰٓئِكَةٌ يَّمْشُوْنَ مُطْمَئِنِّيْنَ لَنَزَّلْنَا عَلَيْهِمْ مِّنَ السَّمَآءِ مَلَكًا رَّسُوْلًا یعنی اگر زمین پر فرشتوں کی بستی ہوتی تو آسمان سے ان کے لئے فرشتہ کو پیغمبر بنا کر بھیجا جاتا۔ اس آیت کے مفہوم کا تقاضا ہے کہ جنات کی ہدایت کے لئے جنات کو ہی پیغمبر بنا کر بھیجا گیا کیونکہ مرسل اور مرسل الیہ کے درمیان کامل مناسبت اور ربط ضروری ہونا چاہئے (اور یہ صرف اتحاد نوعی کی صورت میں ہو سکتا ہے) پھر یہ بات بھی قابل غور ہے کہ جنات اس فہم و عقل کے ہیں آدم علیہ السلام سے پہلے ان کی تخلیق ہوئی تھی اور ذی عقل ہونے کی وجہ سے بھی یہ اوامر و نواہی کے لئے مکلف تھے۔ اسی لئے فرمایا لَاَمْلَئَنَّ جَهَنَّمَ مِنَ الْجِنَّةِ وَالنَّاسِ۔ اب اگر ان میں سے کسی کو پیغمبر نہ بنایا گیا ہوتا تو ان کو عذاب بھی نہ دیا جاتا کیونکہ اللہ نے خود فرمایا ہے وَمَا كُنَّا مُعَذِّبِيْنَ حَتّٰى نَبْعَثَ رَسُوْلًا پس اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت آدمؑ سے پہلے جنات میں سے ہی ان کی اپنی قوم کے لئے پیغمبر تھے۔

ہندوستان کے ہندو جن کو دیوتا کہتے ہیں اور تاریخ میں جن کو لاکھوں کروڑوں سال پہلے کی ہستیاں قرار دیتے ہیں۔ شاید وہ بھی یہی جنات ہوں، جن کو پرماتما کی طرف سے جنات کی ہدایت کے لئے بھیجا گیا ہو اور ممکن ہے کہ ایشور کی طرف سے جنات کے لئے کوئی دین و دھرم مقرر کیا گیا ہو اور پھر انسانوں نے بھی اس سے استفادہ کیا ہو کیونکہ ان انسانوں کی پیدائش کسی پری کے بطن سے ہوئی ہو۔ اس کے بعد اس مذہب کو منسوخ کر دیا گیا ہو کیونکہ اصل دین کو شیطان نے اپنی بدعات و اختراعات کے ساتھ مخلوط کر دیا ہو۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اہل ہند کے اصول دین اکثر تو قرآن و سنت کے مطابق ہیں اور جہاں اختلاف ہے وہ شیطان کی کارستانی کا نتیجہ ہے۔

يَقُصُّوْنَ عَلَيْكُمْ اٰيٰتِيْ وَيُنْذِرُوْنَكُمْ لِقَآءَ يَوْمِكُمْ هٰذَا ۭ (جو میری آیات یعنی کتابیں تم کو پڑھ کر سناتے تھے اور آج کے دن کی پیشی سے تم کو ڈراتے تھے) یعنی قیامت کے دن کی پیشی سے۔

قَالُوْا شَهِدْنَا عَلٰٓى اَنْفُسِنَا (وہ کہیں گے ہم اپنے خلاف شہادت دیتے ہیں)۔

یعنی ہم شہادت دیتے ہیں کہ پیغمبروں نے ہم کو تیرا پیام پہنچایا تھا اور ہم نے ماننے سے انکار کیا تھا۔ مقاتل کا قول ہے کہ کافر یہ شہادت اس وقت دیں گے جب ان کے ہاتھ پاؤں ان کے شرک و کفر کی شہادت دے چکے ہوں گے (اور سوائے اقرار کرنے کے ان کے لئے کوئی صورت نہ ہوگی۔

وَغَرَّتْهُمُ الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا وَشَهِدُوْا عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ اَنَّهُمْ كَانُوْا كٰفِرِيْنَ ۝ (اور ان کو دنیوی زندگی نے فریب دے رکھا تھا اور ان کو اپنے خلاف (خود) شہادت دینی پڑی کہ وہ کافر تھے)۔ اس آیت میں کافروں کی اس بات پر مذمت کی گئی ہے کہ دنیا میں انہوں نے (حق و باطل میں سے) اپنے لئے بری چیز کا انتخاب کیا اور بالآخر ایسی بات کا اعتراف کرنے پر مجبور ہوئے جس نے ان کو دوزخ کا مستحق بنا دیا۔

ذٰلِكَ اَنْ لَّمْ يَكُنْ رَّبُّكَ مُهْلِكَ الْقُرٰى بِظُلْمٍ وَّاَهْلُهَا غٰفِلُوْنَ ۝ (اس کی وجہ یہ ہے کہ

اللہ ظلم کے ساتھ بستیوں کو ایسی حالت میں تباہ نہیں کیا کرتا کہ ان کے رہنے والے بے خبر ہوں) ذٰلِکَ سے بعثت انبیاء کی طرف اشارہ ہے اور اس سے حکم کی علت بیان کی گئی ہے۔ اَنْ مصدریہ ہے یعنی انبیاء کی بعثت کی علت اللہ کا مہلک بالظلم نہ ہونا ہے یا اَنْ مخففہ ہے اور اس کا اسم ضمیر شان محذوف ہے۔ مُهْلِكَ الْقُرٰى بستیوں کو یعنی بستیوں کے رہنے والوں کو ہلاک کرنے والا۔ غٰفِلُوْنَ کا یہ مطلب ہے کہ کسی پیغمبر کو بھیج کر ان کو متنبہ نہ کیا گیا ہو۔ بِظُلْمٍ یا حال ہے یعنی ظلم کے ساتھ اللہ بستیوں کو تباہ نہیں کرتا یا یہ مطلب ہے کہ بستی والوں کے ظلم کرنے کی وجہ سے اللہ بغیر پیغمبر بھیجے اور بغیر تنبیہ کئے ان کو ہلاک نہیں کرتا۔

وَلِكُلٍّ دَرَجٰتٌ مِّمَّا عَمِلُوْا (ہر ایک کے لئے درجے ہیں ان کے اعمال کے سبب) یعنی اللہ کے قرب و بعد کے اعتبار سے ہر مکلف کا مرتبہ جدا جدا ہے۔ مِمَّا عَمِلُوْا اپنے اپنے اعمال کی وجہ سے کسی کو بہت بڑا ثواب اور مرتبہ قرب نصیب ہوگا اور کوئی رحمت سے دور سخت ترین عذاب میں پڑا ہوگا۔

وَمَا رَبُّكَ بِغَافِلٍ عَمَّا يَعْمَلُوْنَ ﴿۱۳۲﴾ (اور آپ کا رب ان کے اعمال سے لاعلم نہیں ہے) اس لئے ہر ایک کو اس کے عمل کے مطابق بدلہ دے گا۔

وَرَبُّكَ الْغَنِيُّ (اور آپ کا رب بے نیاز ہے) بندوں کی عبادت سے بندوں کو اوامر و نواہی کا مکلف بنانے میں اس کی کوئی غرض نہیں بلکہ

ذُو الرَّحْمَةِ (وہ اپنی مخلوق پر) رحمت کرنے والا ہے) مہربان ہے بندوں کے منافع کی تکمیل کے لئے ہی اس نے پیغمبر بھیجے اور لوگوں کو اوامر و نواہی کا مکلف کیا۔ یہ بھی اسی کی رحمت ہے کہ گناہوں کے باوجود گنہگاروں کو ڈھیل دیتا رہتا ہے اور فوری گرفت نہیں کرتا لیکن

اِنْ يَّشَاْ يُذْهِبْكُمْ اے اہل مکہ (اگر وہ چاہے تو (تمہارے گناہوں کی پاداش میں) تم کو فنا کر دے) تمہارے فنا ہونے سے اس کی کوئی غرض فوت نہیں ہو جائے گی۔

وَيَسْتَخْلِفْ مِنْ ۢ بَعْدِكُمْ مَّا يَشَآءُ (اور تمہارے بعد تمہاری جگہ جس کو چاہے پیدا کر دے) جو تم سے زیادہ اس کا فرمانبردار ہو۔

كَمَآ اَنْشَاَكُمْ مِّنْ ذُرِّيَّةِ قَوْمٍ اٰخَرِيْنَ ﴿۱۳۳﴾ (جس طرح تم کو دوسری قوم کی نسل سے اس نے پیدا کیا) یعنی قرن در قرن لیکن اپنی مہربانی سے اس نے تم کو مہلت دی اور باقی رکھا۔

اِنَّ مَا تُوْعَدُوْنَ لَاٰتٍ (جس چیز کا تم سے وعدہ کیا جا رہا ہے وہ یقیناً آنے والی چیز ہے) یعنی حشر و نشر، حساب، ثواب، عذاب ضرور ہوگا اس میں کوئی شک نہیں

وَّمَآ اَنْتُمْ بِمُعْجِزِيْنَ ﴿۱۳۴﴾ (اور تم عاجز نہیں کر سکتے) یعنی پکڑنے والے کو عاجز نہیں کر سکتے۔ تم جہاں بھی ہو گے وہ تم کو ضرور پکڑ لے گا۔

قُلْ يٰقَوْمِ اعْمَلُوْا عَلٰى مَكَانَتِكُمْ اِنِّيْ عَامِلٌ ۚ فَسَوْفَ تَعْلَمُوْنَ ۙ مَنْ تَكُوْنُ لَهٗ عَاقِبَةُ الدَّارِ

(آپ کہہ دیجئے اے میری قوم تم اپنی حالت پر عمل کرتے رہو میں بھی عمل کر رہا ہوں (آئندہ) جلد ہی تم کو معلوم ہو جائے گا کہ اس عالم کا انجام کار کس کے لئے نافع ہوگا)۔ مَكَانَةٌ یا مصدر ہے تَمَكُّنٌ مَكَانَةٌ وہ جم گیا، کسی چیز پر مسلط ہو گیا۔ یعنی جتنی انتہائی طاقت رکھتے ہو اور جتنا ہو سکے کئے جاؤ یا اسم ظرف ہے مجازاً حالت مراد ہے۔ اگر کسی شخص کو حکم دیا جائے کہ وہ اپنی حالت پر قائم رہے، تو کہا جاتا ہے عَلٰى مَكَانَتِكَ (اپنی جگہ پر اپنی حالت پر رہو) یعنی جس حالت پر تم ہو اسی پر رہتے ہوئے عمل کرو۔ دونوں صورتوں میں کلام کا مقصود تہدید و وعید ہے، مراد یہ ہے کہ کفر و دشمنی کی حالت پر جمے رہو۔

اِنِّيْ عَامِلٌ سے یہ مراد ہے کہ میں اپنی حالت اسلام پر قائم اور اپنے رب کے حکم پر ثابت قدم رہ کر عمل کر رہا ہوں۔ انجام کار سے مراد ہے دوسرے عالم میں اچھا انجام اور مَنْ موصولہ ہے یا استفہامیہ یہ کلام مبنی بر انصاف ہے مگر تخویف

آئیں اور اس میں در پردہ اس طرف اشارہ ہے کہ متقیوں کا انجام یقیناً اچھا ہوگا۔

اِنَّهٗ لَا يُفْلِحُ الظّٰلِمُوْنَ ۝ (اس میں شبہ نہیں کہ ظالم (یعنی جو معبودیت کے قائل نہیں ان کی عبادت کرنے والے) فلاح یاب نہیں ہوں گے)۔

بغویؒ نے لکھا ہے مشرکوں کا دستور تھا کہ اپنی کھیتیوں، باغوں کے پھلوں، مویشیوں کے بچوں اور تمام مالوں میں ایک حصہ اللہ کا اور ایک حصہ بتوں کا مقرر کرتے تھے خدا کا حصہ تو مسافروں اور مسکینوں پر صرف کرتے تھے اور بتوں کا حصہ نوکروں چاکروں اور خدمت گاروں کے صرف میں لاتے تھے اور خدا کے حصہ میں سے اگر کچھ بتوں کے حصہ میں شامل ہو جاتا تو پروا نہیں کرتے تھے اور کہتے تھے خدا محتاج نہیں اس کو اس کی کوئی ضرورت نہیں لیکن اگر بتوں کے حصہ میں سے کچھ خدا کے حصہ میں شامل ہو جاتا تو فوراً نکال کر بتوں کے حصہ میں ملا دیتے اور کہہ دیتے یہ حاجت مند ہیں پھر خدا کے حصہ کی اگر کوئی چیز تلف ہو جاتی تو ان کو پروا بھی نہ ہوتی اور بتوں کے حصہ کی کوئی چیز تلف یا کم ہو جاتی تو فوراً اس کے عوض پوری کر دیتے۔ اس پر آیت ذیل نازل ہوئی۔

وَجَعَلُوْا لِلّٰهِ مِمَّا ذَرَاَ مِنَ الْحَرْثِ وَالْاَنْعَامِ نَصِيْبًا (اور اللہ کی پیدا کی ہوئی کھیتی اور چوپایوں میں انہوں نے کچھ حصہ اللہ کا مقرر کیا) اور کچھ حصہ اپنے (مفروضہ) معبودوں کا، چونکہ تقابل کی وجہ سے یہ آخری فقرہ ظاہر تھا اس لئے ذکر نہیں فرمایا۔

فَقَالُوْا هٰذَا لِلّٰهِ بِزَعْمِهِمْ (اور بزعم خود کہتے ہیں یہ حصہ تو اللہ کا ہے) یعنی اللہ نے ان کو حکم نہیں دیا اور یہ تقسیم شریعت خداوندی سے نہیں آئی بلکہ محض ان کی خود ساختہ ہے۔

وَهٰذَا لِشُرَكَآئِنَا (اور یہ ہمارے شریکوں کا ہے) یعنی اللہ کی عبادت میں ہم جن کو شریک کرتے ہیں یہ ان کا حصہ ہے۔

فَمَا كَانَ لِشُرَكَآئِهِمْ فَلَا يَصِلُ اِلَى اللّٰهِ ۚ وَمَا كَانَ لِلّٰهِ فَهُوَ يَصِلُ اِلٰى شُرَكَآئِهِمْ (پھر جو چیز ان کے معبودوں (کے نام) کی ہوتی ہے وہ تو اللہ کی طرف نہیں پہنچتی اور جو چیز اللہ (کے نام) کی ہوتی ہے وہ ان کے معبودوں کی طرف پہنچ جاتی ہے) کیونکہ اللہ کے نام کی چیزوں میں سے معبودوں کے حصہ کو یہ پورا کر دیتے ہیں اور معبودوں کے نام کی چیزوں میں سے اللہ کے نام کا حصہ پورا نہیں کرتے۔ قتادہ نے فرمایا جب کال پڑ جاتا تھا تو مشرکین کچھ حصہ اللہ کا مقرر کر کے اس کو کھا لیتے تھے اور جو حصہ بتوں کا مقرر کرتے تھے اس میں سے کچھ نہیں کھاتے تھے۔

سَآءَ مَا يَحْكُمُوْنَ ۝ (برا ہے ان کا یہ فیصلہ) اور عاجز جمادات کو اس اللہ کا شریک قرار دینا جو تمام کھیتوں کا چوپایوں کا اور ساری مخلوق کا خالق ہے اور خالق عالم پر بے حس جماد کو ترجیح دینا۔

وَكَذٰلِكَ زَيَّنَ لِكَثِيْرٍ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ قَتْلَ اَوْلَادِهِمْ شُرَكَآؤُهُمْ لِيُرْدُوْهُمْ وَلِيَلْبِسُوْا عَلَيْهِمْ دِيْنَهُمْ

(اور اسی طرح بہت سے مشرکوں کے خیال میں ان کے معبودوں نے اپنی اولاد کے قتل کرنے کو مستحسن بنا رکھا ہے تاکہ وہ ان کو برباد کر دیں اور ان کے مذہبی طریقہ کو مشتبہ کر دیں)۔

وَكَذٰلِكَ یہ مفعول محذوف کی صفت ہے یعنی جس طرح کھیتی اور چوپایوں کی تقسیم کو ان کے معبودوں نے ان کی نظر میں مستحسن بنا دیا ہے اسی طرح قتل اولاد کو بھی پسندیدہ فعل بنا دیا ہے۔ قتل اولاد سے مراد ہے لڑکیوں کو زندہ دفن کر دینا اور دیوتاؤں کے نام پر بھینٹ چڑھانا۔ شُرَكَآؤُهُمْ سے مجاہد کے نزدیک شیاطین مراد ہیں، جنہوں نے مشرکوں کے لئے اس بات کو پسندیدہ فعل بنا دیا تھا کہ ناداری کے اندیشہ سے لڑکیوں کو زندہ دفن کر دیں۔ شیاطین کو شرکاء اس لئے کہا کہ (اللہ کی طرح) انہوں نے اللہ کے حکم کے علاوہ شیطانوں کا حکم مانا۔ شُرَكَآؤُهُمْ کہنے کی وجہ یہ ہے کہ بغیر کسی دلیل کے انہوں نے شیطانوں کو معبود مطاع بنا رکھا تھا۔ کلبی کے نزدیک شرکاء سے مراد ہیں بتوں کے مجاور جو قتل اولاد کی ترغیب دیتے تھے اور انہی کی ترغیب سے لوگ منت مان لیتے تھے کہ اگر میرے اتنے لڑکے پیدا ہوں گے تو میں ایک کو بھینٹ چڑھا دوں

گا۔ شرکاء کی جانب تزئین قتل کی نسبت اس لئے کی کہ دلالی اور سبب تزئین وہی تھے اگرچہ خود انہوں نے بچوں کو نہیں کیا تھا۔ لِيُرْدُوْهُمْ تاکہ ہلاک کر کے تباہ کردیں۔ وَلِيَلْبِسُوْا عَلَيْهِمْ دِيْنَهُمْ مطلب یہ ہے کہ اصل دین اسماعیل کو جس پر یہ پہلے تھے گڑبڑ اور مخلوط بنا دیں یہ شیاطین کی خواہش کا نتیجہ ہے گویا دِيْنَهُمْ سے مراد ہے دین اسماعیل۔ حضرت ابن عباسؓ کا قول ہے کہ دین سے مراد ہے وہ دین جس پر مشرکوں کو رہنا چاہئے تھا۔ یعنی دین توحید۔

لِيُرْدُوْهُمْ اور لِيَلْبِسُوْا میں لام علت کا ہے اگر شیاطین کو ان کو فاعل قرار دیا جائے اور اگر مجاوروں کی طرف ضمیر راجع کی جائے تو لام عاقبت (نتیجہ فعل) ہوگا۔

وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ مَا فَعَلُوْهُ (اور اگر اللہ چاہتا تو یہ دوا اغواء اور دین میں خلط ملط یا قتل اولاد یا بتوں کی منت بھینٹ نہ کریں) تو وہ ایسا نہ کرتے۔

فَذَرْهُمْ وَمَا يَفْتَرُوْنَ ۝ (اب آپ ان کو اور جو کچھ یہ غلط باتیں بنا رہے ہیں یونہی رہنے دیجئے) مَا يَفْتَرُوْنَ میں ما موصول ہے یعنی افتراء کردہ باتیں یا مصدریہ ہے یعنی افتراء کرنا۔

وَقَالُوْا هٰذِهٖٓ (اور وہ یہ بھی کہتے ہیں) کہ یہ یعنی جو کھیتی اور چوپائے اللہ کے نام اور بتوں کے نام کے دو کر رکھے ہیں وہ

اَنْعَامٌ وَّحَرْثٌ حِجْرٌ (ممنوع چوپائے اور ممنوع کھیت ہیں) یعنی حرام ہیں۔ حِجْرٌ مصدر ہے اس کا اطلاق واحد جمع اور مذکر مونث سب پر یکساں ہوتا ہے۔ مجاہد کا قول ہے کہ انعام سے مراد ہیں بحیرہ، سائبہ، وصیلہ اور حام۔

لَّا يَطْعَمُهَآ اِلَّا مَنْ نَّشَآءُ بِزَعْمِهِمْ (جن کو (ان کے گمان کے مطابق) سوائے اس کے جس کو وہ چاہیں اور کوئی نہیں کھا سکتا) یعنی عورتیں نہیں کھا سکتیں، صرف مرد اور بتوں کے مجاور کھا سکتے ہیں۔ بِزَعْمِهِمْ سے مراد یہ ہے کہ وہ اپنے خیال سے بغیر کسی دلیل کے حرمت حلت بناتے ہیں۔

وَاَنْعَامٌ حُرِّمَتْ ظُهُوْرُهَا (اور کچھ مخصوص چوپائے ہیں جن پر سواری اور بار برداری حرام کر دی گئی ہے) ان چوپایوں سے مراد ہیں بحیرہ، سائبہ اور حامی۔

وَاَنْعَامٌ لَّا يَذْكُرُوْنَ اسْمَ اللّٰهِ عَلَيْهَا (اور کچھ مخصوص مواشی ہیں جن پر وہ اللہ کا نام نہیں لیتے) یعنی ذبح کے وقت اللہ کا نام نہیں لیتے بلکہ بتوں کے نام سے ذبح کرتے ہیں۔ ابووائل نے کہا اللہ کا نام ذکر کرنے سے مراد نیک عمل ہے، کیونکہ عام دستور تھا کہ ہر نیک عمل اللہ کا نام لے کر شروع کیا جاتا تھا۔ اس صورت میں آیت کا مطلب اس طرح ہوگا وہ ان چوپایوں پر سوار ہو کر حج کے لئے نہیں جائیں گے بہرحال کوئی نیک عمل کرنے کے لئے ان پر سوار نہ ہوں گے۔

افْتِرَآءً عَلَيْهِ (ایسا (محض) اللہ پر افترا باندھنے کے طور پر کہتے ہیں) افْتِرَآءً مفعول مطلق ہے یا حال اور عَلَيْهِ کا تعلق قَالُوْا سے ہے یا فعل محذوف سے یعنی یہ بات انہوں نے اللہ پر بطور افترا باندھی یا اللہ پر افترا کرتے ہوئے کہی۔ یا افْتِرَآءً مفعول لہ ہے یعنی علت قول ہے۔

سَيَجْزِيْهِمْ بِمَا كَانُوْا يَفْتَرُوْنَ ۝ (عنقریب اللہ ان کو ان کی افترا بندی کی سزا دے گا)۔ یعنی افْتِرَآءً کے سبب سے (با، سببیہ) یا افْتِرَآءً کے عوض (باء بدلیت کے لئے) دونوں صورتوں میں ما مصدری ہوگا۔

وَقَالُوْا مَا فِيْ بُطُوْنِ هٰذِهِ الْاَنْعَامِ خَالِصَةٌ لِّذُكُوْرِنَا وَمُحَرَّمٌ عَلٰٓى اَزْوَاجِنَا ۚ وَاِنْ يَّكُنْ مَّيْتَةً فَهُمْ فِيْهِ شُرَكَآءُ ۭ (اور وہ (یہ بھی) کہتے ہیں کہ جو بچے ان چوپایوں کے پیٹ کے اندر سے نکلتے ہیں وہ (اگر زندہ نکلیں تو) ہمارے مردوں کے لئے خالص ہیں اور عورتوں کیلئے حرام اور اگر مردہ نکلیں تو سب مرد عورتیں اس میں شریک ہیں) سب کیلئے حلال ہیں یعنی بحیرہ اور سائبہ کے پیٹ کے اندر کے بچے اگر زندہ برآمد ہوں تو صرف مردوں کیلئے حلال ہیں، عورتوں کے لئے حرام اور اگر مردہ برآمد ہوں تو مرد عورتیں سب اس کو کھا سکتے ہیں۔ هٰذِهِ الْاَنْعَامِ سے مراد ہیں بحیرہ اور سائبہ۔ خَالِصَةٌ بمعنی خالص جس میں کوئی آمیزش نہ ہو۔ اس لفظ میں آخری تاء تاکید یا مبالغہ کی ہے (بالکل خالص) کسائی نے کہا

خالص اور خالصۃ کا ایک ہی معنی ہے (تاء محض تاکید کی ہے نہ مبالغہ کی) جیسے وعظ اور موعظۃ ہم معنی ہیں۔ فراء نے کہا تاء تانیث کی ہے کیونکہ انعام مونث ہیں ان کے لحاظ سے پیٹ کے اندر کے بچوں کو بھی مونث قرار دیا۔ بعض نے کہا مَا فِیْ بُطُوْنِهَا کے معنی کا لحاظ کرتے ہوئے خَالِصَۃٌ کو مونث ذکر کیا کیونکہ مَا فِیْ بُطُوْنِهَا سے مراد ہیں اَجِنَّۃٌ (جنین کی جمع) بہر حال خالصۃ سے مراد ہے خالص حلال۔

اَزْوَاجِنَا سے مراد ہیں عورتیں (خواہ زوجہ ہوں یا نہ ہوں یا لڑکیاں ہوں) فَهُمْ سے مراد ہیں سب مرد عورتیں فِیْهِ کی واحد مذکر کی ضمیر مَیْتَۃٌ کی طرف راجع ہے کیونکہ مَیْتَۃٌ کا لفظ مذکر مونث دونوں کے لئے استعمال ہوتا ہے۔

سَیَجْزِیْهِمْ وَصْفَهُمْ اِنَّهٗ حَکِیْمٌ عَلِیْمٌ (ابھی اللہ ان کی غلط بیانی کی سزا دیئے دیتا ہے بلاشبہ وہ بڑی حکمت والا اور بڑے علم والا ہے) وَصْفَهُمْ یعنی بِوَصْفِهِمْ مطلب یہ کہ حلت حرمت کے مذکورہ احکام کی جو نسبت یہ اللہ کی طرف کرتے ہیں اس کی سزا اللہ ان کو دے گا اور اللہ کی یہ سزا دہی مبنی بر حکمت ہے جو کچھ یہ لوگ کر رہے ہیں اللہ اس کو خوب جانتا ہے۔

قَدْ خَسِرَ الَّذِیْنَ قَتَلُوْٓا اَوْلَادَهُمْ سَفَهًۢا بِغَیْرِ عِلْمٍ (بے شک گھاٹے میں رہے وہ لوگ جنہوں نے اپنی اولاد کو جہالت کی وجہ سے بغیر جانے قتل کر دیا) یعنی بغیر اس بات کے جانے کہ اللہ ان کی اولاد کا بھی رازق ہے اولاد کو قتل کر دیا۔ بغوی نے لکھا ہے اس آیت کا نزول قبائل ربیعہ اور مضر اور بعض دوسرے عربوں کے حق میں ہوا جو مفلسی کے ڈر سے لڑکیوں کو زندہ دفن کر دیا کرتے تھے قبیلۂ بنی کنانہ ایسا نہیں کرتا تھا۔

وَحَرَّمُوْا مَا رَزَقَهُمُ اللّٰهُ افْتِرَآءً عَلَى اللّٰهِ (اور اللہ پر افترا بندی کرتے ہوئے انہوں نے ان جانوروں کو حرام قرار دے لیا ہے جو اللہ نے ان کو عنایت فرمائے تھے) یعنی بحیرہ، سائبہ، وصیلہ اور حام کو انہوں نے حرام بنا لیا ہے اور اس حکم کی نسبت غلط طور پر اللہ کی طرف کی ہے۔ افتراء مفعول لہ ہے یا حال یا مفعول مطلق۔

قَدْ ضَلُّوْا وَمَا کَانُوْا مُهْتَدِیْنَ ۝ (واقعی وہ راہ سے بھٹک گئے اور کبھی (حق و صواب کے) راستہ پر چلنے والے نہ ہوئے)۔

وَهُوَ الَّذِیْٓ اَنْشَاَ جَنّٰتٍ مَّعْرُوْشٰتٍ وَّغَیْرَ مَعْرُوْشٰتٍ (اور وہی ہے جس نے باغات پیدا کئے جن کے کچھ پیڑوں کو ٹٹیوں پر چڑھایا جاتا ہے اور کچھ پیڑوں کو ٹٹیوں پر نہیں چڑھایا جاتا)۔

حضرت ابن عباسؓ نے اس کی تشریح میں فرمایا مَعْرُوْشٰتٍ زمین پر پھیلنے والی بیلیں جن کو ٹٹیوں پر پھیلایا جاتا ہے جیسے کدو اور انگور اور خربوزہ کی بیلیں اور غَیْرَ مَعْرُوْشٰتٍ وہ پودے اور درخت جن کا تنا اور ڈنڈی ہوتی ہے جس پر وہ کھڑے ہوتے ہیں جیسے کھجور کا درخت اور (جو، گیہوں وغیرہ کی) کھیتی۔ ضحاک نے کہا مَعْرُوْشٰتٍ اور غَیْرَ مَعْرُوْشٰتٍ دونوں سے مراد انگور کی بیلیں ہیں۔ اول سے مراد وہ بیلیں ہیں جن کو لوگ بوتے اور ٹٹیوں پر پھیلاتے ہیں اور دوسرے سے مراد وہ بیلیں ہیں جو خود رو جنگلوں اور پہاڑوں میں ہوتی ہیں کوئی ان کے لئے ٹٹیاں نہیں باندھتا۔

وَّالنَّخْلَ وَالزَّرْعَ مُخْتَلِفًا اُکُلُهٗ (اور کھجور کے درخت اور کھیتی جس کے پھل مختلف ہیں) اُکُل پھل یعنی جس کے پھل رنگ، بو اور مزہ میں جدا جدا ہیں۔ اُکُلُهٗ کی ضمیر الزرع کی طرف راجع ہے یا النخل کی طرف راجع ہے اور زرع نخل کے حکم میں داخل ہے کیونکہ زرع کا عطف نخل پر ہے یا دونوں کی طرف راجع ہے اس وقت اُکُلُهٗ کا معنی ہوگا اکل کل واحد منہما۔ مُخْتَلِفًا حال مقدرہ ہے کیونکہ پیدا کرنے کے وقت تو پھل نہیں ہوتا (اور حال ذوالحال کا زمانہ ایک ہونا چاہئے۔

وَّالزَّیْتُوْنَ وَالرُّمَّانَ مُتَشَابِهًا وَّغَیْرَ مُتَشَابِهٍ (اور زیتون اور انار (کچھ) آپس میں ہم شکل اور (کچھ) مختلف شکلوں والے)۔

کُلُوْا مِنْ ثَمَرِهٖٓ اِذَآ اَثْمَرَ (ان سب کی پیداوار کھاؤ جب نکل آئے) یعنی ان میں سے ہر ایک کا پھل نمودار ہوتے ہی کھا سکتے ہو پکنے کی ضرورت نہیں۔ اِذَآ اَثْمَرَ کی قید کا فائدہ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اس سے مالک کے لئے ادائے حق شرعی

سے پہلے خود کھانے کی اجازت مستفاد ہو رہی ہے۔

وَاٰتُوْا حَقَّهٗ یَوْمَ حَصَادِهٖ (اور اس میں جو حق (شرعاً) سے واجب ہے کاٹنے (یا توڑنے) کے دن مسکینوں کو دیا کرو۔ حَصَاد اور حِصَاد بالفتح اور بالکسر دونوں ہم معنی ہیں جیسے صَرَام اور صِرَام، جِذاذ اور جَذاذ۔ حق سے کیا مراد ہے۔ اس کے متعلق علماء کے اقوال مختلف ہیں۔ حضرت ابن عباسؓ، طاؤس، حسن، جابر بن زید اور سعید بن مسیب کے نزدیک اس سے مراد فرض زکوٰۃ ہے یعنی عشر یا نصف عشر کیونکہ امر وجوب کے لئے ہے اور حق کا استعمال عام طور پر واجب ہی کے لئے ہوتا ہے۔ پھر اجماع علماء بھی ہے کہ مال میں سوائے زکوٰۃ کے اور کوئی چیز واجب نہیں۔ صحیحین میں حضرت طلحہ بن عبیداللہ کی روایت سے آیا ہے کہ ایک آدمی رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا اور اسلام کے متعلق دریافت کرنے لگا حضور ﷺ نے پانچ نمازوں کا، ماہ رمضان کے روزوں کا اور زکوٰۃ کا ذکر فرمایا اس شخص نے عرض کیا، کیا مجھ پر اس کے علاوہ بھی کچھ (لازم) ہوگا۔ فرمایا نہیں ہاں اگر تو اپنی خوشی سے (نیکی اور کار خیر اور نفل عبادت وغیرہ) کرے تو خیر۔ اس قول کے بموجب یہ آیت مدنی قرار پائے گی اور اس صورت پر آیت میں امام ابو حنیفہؒ کے قول کی دلیل بھی مل جائے گی کہ انار جیسے پھلوں میں (بھی) زکوٰۃ واجب ہے۔ امام مالکؒ اور امام شافعیؒ کا قول اس کے خلاف ہے۔ ان دونوں اماموں کے نزدیک زکوٰۃ کا وجوب صرف انہی چیزوں میں ہے جو روزی کے طور پر استعمال کی جاتی ہیں۔ سورۂ بقرہ کی آیت اَنْفِقُوْا مِنْ طَیِّبٰتِ مَا كَسَبْتُمْ وَمِمَّاۤ اَخْرَجْنَا لَكُمْ مِّنَ الْاَرْضِ کی تفسیر کے ذیل میں عشر کی زکوٰۃ کے مسائل کی تفصیل گزر چکی ہے۔

امام زین العابدینؒ، عطاء، مجاہد اور حماد کا قول ہے کہ آیت میں جس حق کا ذکر ہے اس سے مراد زکوٰۃ کے علاوہ حق ہے جس کو ادا کرنے کا حکم دیا گیا ہے کیونکہ آیت مکی ہے اور زکوٰۃ کی فرضیت مدینہ میں ہوئی۔ ابراہیم نے کہا حق سے مراد ہے ایک گٹھا۔ ربیع نے کہا سیلا (گری پڑی بالیں) مراد ہے۔ نحاس نے ناسخ میں اور ابن مردویہ نے حضرت ابو سعید خدریؓ کی روایت سے بیان کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے اس آیت کے ذیل میں فرمایا (حق سے مراد) گری پڑی بالیں ہیں۔ مجاہد نے کہا کھجوریں کاٹنے کا وقت لوگ ایک گچھا لٹکا دیا کرتے تھے ادھر سے جو گزرتا تھا کھالیا کرتا تھا۔ جعفر بن ابی اخرم کا بیان ہے کہ اہل مدینہ جب کھجوریں کاٹتے تھے تو ان کا ایک خوشہ لا کر مسجد کے ایک گوشہ میں لٹکا دیا کرتے تھے اور مسکین آکر لاٹھی مار کر اس میں سے کھجوریں گرا کر لے لیتا تھا۔ اس قول کی تائید حضرت فاطمہ بنت قیس کی روایت سے ہوتی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا مال میں زکوٰۃ کے علاوہ بھی (فقراء کا کچھ) حق ہے پھر آپ نے یہ آیت تلاوت فرمائی لَیْسَ الْبِرَّ اَنْ تُوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ قِبَلَ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ رواہ الترمذی و ابن ماجہ والدارمی۔ اس آیت کی تفسیر سورۂ بقرہ میں گزر چکی ہے اور حق سے مراد عام ہے وجوبی ہو یا استحبابی۔ سعید بن جبیر نے فرمایا ابتداء اسلام میں یہ حق تھا جس کو ادا کرنے کا حکم دیا جاتا تھا پھر جب عشر واجب کر دیا گیا تو یہ حکم منسوخ کر دیا گیا۔ مقسم نے حضرت ابن عباسؓ کا قول نقل کیا ہے کہ قرآن میں جس نفقہ (خدا کی راہ میں خرچ کرنے) کا بھی حکم دیا گیا ہے زکوٰۃ نے اس (کے وجوب) کو منسوخ کر دیا۔

وَلَا تُسْرِفُوْا اِنَّهٗ لَا یُحِبُّ الْمُسْرِفِیْنَ (اور اسراف نہ کرو اللہ اسراف کرنے والوں کو پسند نہیں فرماتا)۔ اسراف میانہ روی کی ضد ہے کذا فی القاموس۔ صحاح میں ہے ہر کام میں حد سے آگے بڑھنے کو اسراف کہتے ہیں۔ بعض علماء کا قول ہے کہ اس جگہ اسراف سے مراد ہے کل مال دیدینا۔ بیضاوی نے کہا یہ آیت ایسی ہے جیسی آیت وَلَا تَبْسُطْهَا كُلَّ الْبَسْطِ (بالکل کھلا ہاتھ نہ کھول دو) ہے۔ بروایت کلبی حضرت ابن عباسؓ کا بیان ہے کہ حضرت ثابت بن قیس بن شماس نے پانچ سو درختوں کی کھجوریں توڑ کر ایک دن میں (غریبوں کو) تقسیم کر دیں اور گھر والوں کے لئے کچھ نہ چھوڑا اس پر آیت مذکورہ نازل ہوئی کذا اخرج ابن جریر عن ابن جریج۔ بغویؒ نے سدی کا قول نقل کیا ہے کہ لَا تُسْرِفُوْا سے مراد ہے کہ اپنا تمام مال نہ دیدو ورنہ فقیر ہو کر بیٹھ رہو گے۔

میں کہتا ہوں سارا مال دینا اس وقت ممنوع اور اسراف قرار پائے گا جب اپنے متعلقین اور بال بچوں کی حق تلفی کی ہو

اور حق داروں کے حقوق نہ دیئے ہوں۔ مستحقین کے حقوق ادا کرنے کے بعد اگر بقیہ سارا مال اللہ کی راہ میں دے دے تو یہ اسراف نہیں بلکہ افضل ہے، کذا قال ابن جریج۔ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا اگر میرے پاس (کوہ) احد کے برابر سونا ہو تو مجھے اس سے خوشی ہوگی کہ تین راتیں بھی اس میں سے میرے پاس سوائے اتنی مقدار کے جس کو میں قرض کی ادائیگی کے لئے روک لوں اور کچھ باقی نہ رہے۔ رواہ البخاری۔

ایک بار حضرت ابوذرؓ نے حضرت عثمانؓ سے داخلہ کی اجازت طلب کی، حضرت عثمانؓ نے اجازت دے دی۔ حضرت ابوذر لاٹھی ہاتھ میں لئے اندر پہنچ گئے۔ حضرت عثمانؓ نے فرمایا عبدالرحمٰنؓ بن عوف نے اپنے بعد جو مال ترکہ میں چھوڑا ہے، کعب اس کے متعلق تمہاری کیا رائے ہے، حضرت کعب نے کہا اگر اس میں اللہ کا حق پہنچ گیا ہے تو کوئی حرج نہیں۔ یہ سنتے ہی ابوذرؓ نے لاٹھی اٹھا کر کعبؓ کے ماری اور بولے میں نے رسول اللہ ﷺ سے سنا تھا آپ فرما رہے تھے اگر میرے پاس پہاڑ کے برابر سونا ہو میں اللہ کی راہ میں اس کو خرچ کر دوں اور اللہ قبول فرمالے تو مجھے پسند نہیں۔ اس میں سے چھ اوقیہ بھی اپنے بعد چھوڑ کر جاؤں۔ عثمانؓ میں تم کو اللہ کی قسم دے کر پوچھتا ہوں کیا تم نے بھی رسول اللہ ﷺ سے یہ حدیث سنی ہے۔ حضرت ابوذرؓ نے یہ سوال تین بار کیا۔ حضرت عثمانؓ نے فرمایا ہاں، رواہ احمد۔

حضرت ابوہریرہؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ حضرت بلالؓ کے پاس تشریف لے گئے۔ بلالؓ کے پاس اس وقت چھواروں کا ڈھیر لگا ہوا تھا، حضور ﷺ نے پوچھا بلالؓ یہ کیا ہے؟ بلالؓ نے عرض کیا میں نے کل کے لئے رکھ چھوڑا ہے فرمایا کیا تم کو ڈر نہیں کہ اس (ذخیرہ) کی بھاپ (دھواں) دوزخ کے اندر کل تم کو محسوس ہوگی۔ بلال خرچ کرو اور عرش والے کی طرف سے کمی کرنے کا اندیشہ نہ کرو۔ بیہقی فی شعب الایمان۔

حضرت ابوہریرہؓ نے عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ کون سا صدقہ (خیرات) سب سے افضل ہے، فرمایا تنگدست کی محنت کی کمائی سے بقدر طاقت (خیرات کرنا سب سے افضل ہے) اور دینا شروع اپنے عیال سے کرو۔ رواہ ابوداؤد۔

سعید بن مسیب کے نزدیک لا تسرفوا کا مطلب ہے صدقہ کو نہ روکو یعنی روکنے اور نہ دینے میں اتنی حد سے نہ بڑھو کہ واجب صدقہ بھی ادا نہ کرو۔

مقاتل نے کہا لا تسرفوا سے یہ مراد ہے کہ کھیتی اور چوپایوں میں بتوں کو شریک نہ بناؤ۔ زہری نے کہا اسراف نہ کرنے کا یہ مطلب ہے کہ گناہ کے کام میں خرچ نہ کرو۔ مجاہد نے کہا اسراف سے مراد ہے اللہ کے حق میں کوتاہی کرنا اگر کوہ ابوقبیس کے برابر کسی کے پاس سونا ہو اور وہ اللہ کی طاعت میں سب خرچ کر دے تو مسرف نہ ہوگا، لیکن اللہ کی نافرمانی میں ایک درہم یا ایک سیر بھی صرف کیا تو مسرف ہو جائے گا۔ ایاس بن معاویہ نے کہا اللہ کے حکم کی حد سے تجاوز اسراف ہے۔

ابن وہب نے ابن زید کا قول نقل کیا ہے کہ لا تسرفوا کے مخاطب حکام ہیں اللہ نے حاکموں کو حکم دیا ہے کہ اپنے حق سے زائد نہ لیں۔ اس قول پر آیت کا مطلب وہی ہوگا جو حدیث ایاکم وکرائم اموال الناس کا ہے (لوگوں کا سب سے بڑھیا مال زکوٰۃ میں وصول کرنے سے اجتناب کرو)۔

وَمِنَ الْاَنْعَامِ حَمُوْلَةً وَّفَرْشًا ۭ كُلُوْا مِمَّا رَزَقَكُمُ اللّٰهُ وَلَا تَتَّبِعُوْا خُطُوٰتِ الشَّيْطٰنِ ۭ اِنَّهٗ لَكُمْ عَدُوٌّ مُّبِيْنٌ ۝

(اور مویشیوں میں اونچے قد کے اور چھوٹے قد کے جو کچھ اللہ نے تم کو دیا ہے کھاؤ اور شیطان کے قدم بقدم مت چلو بلاشبہ وہ تمہارا صریح دشمن ہے)۔

حمولۃ سواری یا بار برداری کے جانور جیسے اونٹ بیل۔ فرشًا وہ پست قد چھوٹے جانور جو سواری یا بار برداری کے کام میں نہیں آتے جیسے بھیڑ بکری اور اونٹ اور گائے کے بچے۔ کلوا میں امر اباحت کے لئے ہے یعنی کھا سکتے ہو کھانے کی اجازت ہے۔ مِمَّا میں مِن تبعیضیہ ہے کیونکہ اللہ نے جو رزق دیا ہے وہ سب تو نہیں کھایا جا سکتا۔ شیطان کی پیروی نہ کرو کا یہ مطلب ہے کہ شیطانی راستہ پر چل کر حرام کو حلال اور حلال کو حرام قرار دینے لگو۔ حمولۃً اور فرشًا کا عطف جنّٰت پر ہے یعنی اللہ

نے یہ جانور بھی پیدا کئے۔

ثَمٰنِيَةَ اَزْوَاجٍ ۚ مِنَ الضَّاْنِ اثْنَيْنِ وَمِنَ الْمَعْزِ اثْنَيْنِ ۗ قُلْ ءٰٓالذَّكَرَيْنِ حَرَّمَ اَمِ الْاُنْثَيَيْنِ اَمَّا اشْتَمَلَتْ عَلَيْهِ اَرْحَامُ الْاُنْثَيَيْنِ ۗ نَبِّئُوْنِيْ بِعِلْمٍ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ۝ وَمِنَ الْاِبِلِ اثْنَيْنِ وَمِنَ الْبَقَرِ اثْنَيْنِ ۗ قُلْ ءٰٓالذَّكَرَيْنِ حَرَّمَ اَمِ الْاُنْثَيَيْنِ اَمَّا اشْتَمَلَتْ عَلَيْهِ اَرْحَامُ الْاُنْثَيَيْنِ

اور یہ مواشی (آٹھ نر مادہ (پیدا کئے) یعنی بھیڑ (اور دنبہ) میں دو قسم (نر مادہ) اور بکری میں دو قسم (نر مادہ) آپ ان سے کہئے کہ کیا اللہ نے ان دونوں نروں کو حرام کیا ہے یا دونوں مادہ کو یا اس بچہ کو جس کو دونوں مادہ اپنے پیٹ میں لئے ہوئے ہوں تم مجھے کسی دلیل سے تو بتلاؤ اگر تم سچے ہو اور اونٹ میں دو قسم اور گائے (بھینس) میں دو قسم، آپ کہئے کہ اللہ نے ان دونوں نروں کو حرام کیا ہے یا دونوں مادہ کو یا اس بچہ کو جس کو دونوں مادہ اپنے پیٹ میں لئے ہوئے ہوں۔ ثَمٰنِيَةَ اَزْوَاجٍ حَمُوْلَةً وَّفَرْشًا سے بدل ہے یا کُلُوْا کا مفعول ہے یا مَا سے حال ہے اور اَزْوَاجٍ سے مراد ہیں مختلف یا متعدد۔ زوج وہ واحد (مذکر یا مونث) جس کا ہم جنس کوئی جوڑا ہو (مذکر یا مونث) ایسی دو (ہم جنس) کے مجموعہ کو بھی زوج کہا جاتا ہے یہاں مراد اول معنی ہے۔ ضَاْنٌ اسم جنس ہے (مذکر مونث واحد جمع سب پر اس کا اطلاق ہوتا ہے) اس کی جمع ضَئِيْنٌ ہے یا ضَاْنٌ، ضَائِنٌ کی جمع ہے جس کا مونث ضَائِنَةٌ اور ضَائِنَةٌ کی جمع ضَوَائِنُ ہے اون والی بھیڑ کو ضان کہتے ہیں۔ اثْنَيْنِ دو یعنی مذکر اور مونث مذکر مینڈھا مونث بھیڑ۔ مَعْزٌ بالوں والی بکری یا بکرا۔ مَعْزٌ مَاعِزٌ کی جمع ہے جیسے صَحْبٌ صَاحِبٌ کی۔ بغویؒ نے لکھا ہے کہ معز جمع ہے مگر اس کا واحد نہیں، ماعز کی جمع معزی اور ماعزہ کی جمع مواعز آتی ہے۔ اول الذکرین سے مینڈھا اور بکرا مراد ہیں اور اول الانثیین سے بھیڑ اور بکری اور مَا اشْتَمَلَتْ عَلَيْهِ اَرْحَامُ الْاُنْثَيَيْنِ سے مراد ہیں بھیڑ بکری کے پیٹ کے اندر کے بچے خواہ نر ہوں یا مادہ اسی طرح الْاِبِلِ اور الْبَقَرِ ہیں (دونوں کا اطلاق نر مادہ پر ہوتا ہے) خلاصہ مطلب یہ ہے کہ کیا اللہ نے بھیڑ مینڈھا یا ان کے نسل کی نر مادہ بچے حرام کئے ہیں یا بکری بکرا یا ان کے پیٹ کے بچے یا اونٹنی اونٹ گائے بیل اور ان کے نسلی بچے۔ اگر اللہ کی طرف سے بھیجا ہوا کوئی حکم ہو جس سے تمہارے خود ساختہ حرام کی اللہ کی طرف سے حرمت ثابت ہو رہی ہو تو پیش کرو اور تحریم کے دعویٰ میں سچے ہو تو اللہ کا حکم لاؤ۔ بات یہ تھی کہ مشرک کہتے تھے هٰذِهٖٓ اَنْعَامٌ وَّحَرْثٌ حِجْرٌ (یہ چوپائے اور کھیتی ممنوع الاستعمال ہیں) اور یہ بھی کہتے تھے مَا فِيْ بُطُوْنِ هٰذِهِ الْاَنْعَامِ خَالِصَةٌ لِّذُكُوْرِنَا وَمُحَرَّمٌ عَلٰٓى اَزْوَاجِنَا ان چوپایوں کے پیٹ سے جو بچے زندہ برآمد ہوں وہ صرف مردوں کے لئے حلال ہیں عورتوں کے لئے حرام ہیں اور اگر مردہ برآمد ہوں تو سب کے لئے حلال ہیں، وہ بحیرہ، سائبہ، وصیلہ اور حام میں سے بھی بعض کو عورتوں کے لئے اور بعض کو مردوں اور عورتوں سب کے لئے حرام قرار دیتے تھے۔ احکام اسلامی کے نزول کے بعد ابوالاحوص مالک بن عوف جشمی رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کیا، محمد ہم کو اطلاع ملی ہے کہ تم ہمارے باپ دادا کے بعض اعمال و افعال کو حرام قرار دیتے ہو۔ حضور ﷺ نے فرمایا تم نے بعض قسم کے چوپایوں کو بے دلیل حرام بنا رکھا ہے اللہ نے یہ آٹھوں طرح کے جانور کھانے اور فائدہ حاصل کرنے کے لئے پیدا کئے ہیں یہ حرمت کس طرف سے آئی نر کی طرف سے یا مادہ کی طرف سے۔ مالک بن عوف متحیر ہو کر لاجواب ہو گیا نہ یہ کہتے بن پڑی کہ نر کی طرف سے حرمت آئی ورنہ سب نروں کو حرام کہنا پڑتا نہ یہ کہ سکا کہ حرمت مادہ کی طرف سے آئی ورنہ ہر مادہ کی حرمت کا قائل ہونا پڑتا اور اگر پیٹ کے اندر (پیدا) ہونے کی وجہ سے حرمت کا قائل ہوتا تو نر مادہ سب کو حرام کہنا پڑتا پانچویں ساتویں حمل کی تخصیص کی کوئی وجہ نہیں نہ اس کی کوئی وجہ کہ عورتوں کے لئے حلال اور مردوں کے لئے حرام قرار دیا جائے۔ روایت میں آیا ہے کہ حضور ﷺ نے مالک سے فرمایا مالک بولتے کیوں نہیں (بات کہو) مالک نے کہا آپ بولتے جائیے میں آپ کی بات سن رہا ہوں۔

اَمْ كُنْتُمْ شُهَدَآءَ اِذْ وَصّٰىكُمُ اللّٰهُ بِهٰذَا ۚ فَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرٰى عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا لِّيُضِلَّ النَّاسَ بِغَيْرِ عِلْمٍ ۗ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِى الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ ۝

(کیا تم اس وقت حاضر تھے جس وقت اللہ نے تم کو

اس (تحلیل و تحریم) کا حکم دیا (ہرگز ایسا نہیں) تو اس سے زیادہ کون ظالم ہوگا جو اللہ پر بلا دلیل جھوٹی تہمت لگائے تاکہ لوگوں کو گمراہ کرے بے شک اللہ ایسے ظالموں کو ہدایت نہیں کرتا۔

اَمْ منقطعہ بمعنی بَلْ ہے۔ کُنْتُمْ سے خطاب اہل مکہ کو ہے۔ خطاب سے اشارہ تحریم کی جانب ہے۔ مِمَّنِ افْتَرٰی سے مراد عمرو بن لحی اور وہ لوگ ہیں جو بعد کو اس کے طریقہ پر چلے۔ خلاصہ مطلب یہ ہے کہ اے اہل مکہ کیا تم اس وقت حاضر اور موجود تھے جب اللہ نے تم کو اس تحریم کا حکم دیا تھا۔ تمہارا ایمان تو نہ کسی نبی پر ہے نہ اللہ کی کسی کتاب پر۔ پھر جاننے کا طریقہ سوائے دیکھنے اور سننے کے اور کوئی نہیں (لامحالہ تم کو اس وقت موجود ہونا چاہئے اور موجود نہ تھے تو علم کس طرح ہوا) جو شخص تحریم و تحلیل کے سلسلہ میں اللہ پر جھوٹی افترا بندی کرے اس سے بڑھ کر ظالم (بے باک) اور کوئی نہیں ہو سکتا۔ اس کی افترا بندی کی غرض صرف یہ (ہو سکتی) ہے کہ راہ مستقیم سے وہ لوگوں کو بہکا دے ایسے ظالموں کو اللہ ہدایت نہیں کرتا۔

روایت میں آیا ہے کہ اس کے بعد لوگوں نے دریافت کیا کہ حرام کیا چیزیں ہیں تب مندرجہ ذیل آیت کا نزول ہوا۔

قُلْ لَّآ اَجِدُ فِیْ مَآ اُوْحِیَ اِلَیَّ ______ (آپ کہہ دیجئے میں نہیں پاتا ان ہدایات میں جو مجھے وحی کی گئی ہیں)۔ اس جگہ وحی سے مراد صرف قرآنی وحی نہیں بلکہ عام وحی مراد ہے۔ مشرکوں نے بحیرہ وغیرہ کی از خود تحریم کر رکھی تھی اللہ کے حکم کا ان کو علم نہ تھا ان کی تردید کے لئے اس آیت کا نزول ہوا اور مکمل تردید اسی وقت ہوگی جب عام وحی مراد لی جائے کیونکہ کلام کا اصل غرض یہ ہے کہ تحریم و تحلیل وغیرہ کا علم وحی سے ہی معلوم ہو سکتا ہے اپنی طرف سے نہیں کیا جا سکتا۔

اَجِدُ اس جگہ افعال قلوب میں سے ہے جو دو مفعول چاہتا ہے پہلا مفعول (طعامًا) محذوف ہے اور دوسرا مفعول مُحَرَّمًا ہے یعنی میں کسی غذا کو حرام نہیں جانتا۔

مُحَرَّمًا عَلٰی طَاعِمٍ یَّطْعَمُهٗٓ (کسی کھانے والے کے لئے جو اس کو کھائے) اکثر اہل تفسیر نے مُحَرَّمًا سے پہلے طعامًا محذوف مانا ہے تاکہ آئندہ تقریر کا اس سے استثناء متصل صحیح ہو جائے۔

اِلَّآ اَنْ یَّكُوْنَ مَیْتَةً (مگر یہ کہ وہ غذا مردار ہو) مَیْتَةً وہ مردار جانور جو بغیر کسی انسان کے فعل کے خود (بغیر مارے) مر گیا ہو۔ اس تعریف سے معلوم ہو جاتا ہے کہ جو جانور ڈنڈے یا پتھر کی ضرب سے یا اوپر سے لڑھک کر یا سینگ کی ٹکر سے مر گیا ہو یا کسی درندے نے اس کو کھایا ہو مَیْتَةً میں داخل نہ ہوگا۔ سورۂ مائدہ کی آیت حُرِّمَتْ عَلَیْكُمُ الْمَیْتَةُ پر (مذکورہ اقسام کا) عطف اسی پر دلالت کر رہا ہے۔ اس کے علاوہ یہ بات بھی اسی قول کی تائید کرتی ہے کہ کافروں نے رسول اللہ ﷺ سے کہا تھا محمد ﷺ تم کہتے ہو کہ تمہارا اور تمہارے ساتھیوں کا قتل کیا ہوا جانور تو حلال ہے اور جس کو کتے یا شکاری پرندے نے قتل کیا ہو وہ بھی حلال ہے اور جس کو اللہ نے (بغیر انسانی عمل اور شکاری جانور کے شکار کرنے کے) مار ڈالا ہو وہ حرام ہے۔ مذکورہ بالا جانوروں کی حرمت دوسری آیت سے ثابت ہوتی ہے (اس آیت سے ثابت نہیں ہوتی)۔

اَوْ دَمًا مَّسْفُوْحًا (یا بہتا ہوا خون ہو) حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا اس سے مراد وہ سیال خون ہے جو زندہ جانور کی گردن کی رگوں سے ذبح کرتے وقت نکلتا ہے۔ اس میں جگر اور طحال داخل نہیں ہے کیونکہ یہ دونوں جامد خون ہوتے ہیں۔ شریعت کی صراحت اور اجماع علماء نے دونوں کو حلال کہا ہے وہ خون بھی اس میں شامل نہیں ہے جو گوشت کے ساتھ مخلوط رہ جاتا ہے کیونکہ وہ سیال نہیں ہوتا۔

اَوْ لَحْمَ خِنْزِیْرٍ فَاِنَّهٗ رِجْسٌ (یا خنزیر کا گوشت ہو کیونکہ بلاشبہ وہ گندگی ہے) یعنی خنزیر ناپاک ہے۔ قرب کی وجہ سے ہٗ ضمیر خنزیر کی طرف راجع ہے۔ اس آیت سے ثابت ہو رہا ہے کہ خنزیر عین نجاست ہے اسی لئے اس کے کسی جزء کی بیع یا اس سے انتفاع درست نہیں۔

اَوْ فِسْقًا اُهِلَّ لِغَیْرِ اللّٰهِ بِهٖ (یا جو (جانور) فسق کا ذریعہ ہو کہ غیر اللہ کے نامزد کر دیا گیا ہو)۔

فِسْقًا کا عطف خنزیر پر ہے اور اُهِلَّ لِغَیْرِ اللّٰهِ بِهٖ۔ فِسْقًا کی صفت ہے اور فَاِنَّهٗ رِجْسٌ جملہ معترضہ ہے بتوں کے

نام پر بعینہٖ کئے ہوئے جانور کو اللہ نے فسق اس لئے فرمایا کہ اس فعل کا فسق میں انتہائی توغل ہے۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ فِسْقًا اُهِلَّ بِهٖ کا مفعول ہو اور اُهِلَّ کا عطف یَكُوْنَ پر ہو اور جو یَكُوْنَ کا اسم ہے وہی اُهِلَّ کا نائب فاعل ہو اس وقت ترجمہ اس طرح ہو گا یا وہ غیر اللہ کے نام پر اللہ کے حکم کی مخالفت کر کے ذبح کیا گیا ہو۔

فَمَنِ اضْطُرَّ (پھر جو بیتاب ہو جائے) یعنی ضرورت اس کو مذکورۂ بالا اشیاء میں سے کسی چیز کو کھانے پر مجبور کر دے۔

غَيْرَ بَاغٍ بشرطیکہ (لذت اور خواہش کا طالب نہ ہو۔

وَّلَا عَادٍ (اور نہ (قدر ضرورت سے) تجاوز کرنے والا ہو۔

فَاِنَّ رَبَّكَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝ (تو بلاشبہ آپ کا رب بخشنے والا مہربان ہے) اس کا مواخذہ نہ کرے گا۔ سورۂ بقرہ میں بھی اسی مضمون کی آیت گزر چکی ہے اور ہم نے اس سے متعلق مباحث کا وہاں ذکر کر دیا ہے۔

مسئلہ :- بعض علماء کا قول ہے کہ اس آیت میں جن چیزوں کو کھانے کی ممانعت کر دی گئی ہے صرف انہی کو کھانا نص قرآنی سے حرام ہے۔ خبر احاد سے قرآن کے حکم کو منسوخ قرار دینا جائز نہیں۔ حضرت عائشہؓ اور حضرت ابن عباسؓ کی طرف بھی اسی قول کی نسبت بعض روایات میں کی گئی ہے اور امام مالکؒ کا بھی یہی مسلک ہے۔ حدیث میں جن جن چیزوں کی ممانعت آئی ہے۔ امام مالکؒ کے نزدیک اس ممانعت سے کراہت مراد ہے (یعنی ممانعت تحریمی نہیں ہے) ان علماء کے نزدیک گلا گھونٹے ہوئے جانور اور کسی ضرب سے کوٹے ہوئے جانور کا شمار بھی میتہ میں ہے بلکہ سورۂ مائدہ میں جن جانوروں کی ممانعت کی گئی ہے وہ سب ان کے نزدیک میتہ میں داخل ہیں۔ [1]

میں کہتا ہوں ان اقسام کا جن کا ذکر سورۂ مائدہ میں آیا ہے مَیْتَہ میں شمار نہیں کیا جا سکتا اس کی وجہ ہم نے اوپر ذکر کر دی ہے (کہ ان اقسام کا عطف مَیْتَہ پر کیا گیا ہے اور معطوف کو معطوف علیہ سے مغایر ہونا چاہئے) امام ابو حنیفہؒ، امام شافعیؒ، امام احمد اور اکثر علماء قائل ہیں کہ حکم تحریم انہی چیزوں میں محدود نہیں ہے جن کا ذکر اس آیت میں آیا ہے۔ بیضاویؒ نے لکھا ہے کہ یہ آیت منسوخ نہیں ہے محکم ہے کیونکہ اس آیت سے تو اتنا ثابت ہوتا ہے کہ اس آیت کے وقتِ نزول تک کسی اور چیز کی حرمت وحی میں نہیں آئی۔ اس سے یہ نہیں ثابت ہوتا کہ کسی اور چیز کی تحریم (کبھی) نہیں ہوئی لہٰذا خبر واحد سے آیت قرآنی کا منسوخ ہونا لازم نہیں آتا۔ میرے نزدیک بیضاوی کا یہ قول غلط ہے کیونکہ کوئی آیت ہو یا حدیث اگر اس کے اندر کوئی حکم دیا گیا ہو اور دوامی یا وقتی کی کوئی قید نہ لگائی گئی ہو تو بظاہر استصحاب (کسی حکم کو سابق حالت پر چھوڑ دینا) پر نظر کرتے ہوئے وہ حکم دوامی ہو گا اور اللہ کے علم میں وہ ایک معین وقت کے لئے ہو گا اسی قسم کی نص قابل نسخ ہوتی ہے پس ناسخ حقیقت میں مدت حکم کا اظہار ہوتا ہے اس لئے نسخ کو بیان تبدیل کہا جاتا ہے ورنہ لازم آئے گا کہ اللہ کو جدید حکم کی خوبی اب معلوم ہوئی پہلے سے معلوم نہ تھی اور یہ محال ہے اور یہ حقیقت ہے کہ اس آیت سے اشیاء مذکورہ کے علاوہ ہر چیز کی حلت معلوم ہو رہی ہے اور حلت غیر مقید ہے نہ اس میں دوامی کی قید ہے نہ وقتی کی۔ اسی لئے بحیرہ وغیرہ کی تحریم کی اس آیت سے تردید ہو رہی ہے اور بعض حلال

[1] علامہ جلال الدین سیوطیؒ نے اتقان میں لکھا ہے کہ امام شافعیؒ نے اس آیت کی تشریح میں حسب ذیل صراحت کی ہے کافروں نے جب اللہ کے حرام کردہ کو حلال اور حلال کردہ کو حرام قرار دیا تو ان کے خلاف یہ آیت نازل ہوئی گویا اللہ نے اس طرح فرمایا کہ جن چوپایوں (بحیرہ، سائبہ، وصیلہ، حام وغیرہ) کو تم نے حرام قرار دے رکھا ہے وہ تو حلال ہی ہیں اور جن چیزوں (مردار، بہتا ہوا خون، خنزیر کا گوشت وغیرہ) کو تم نے حلال بنا رکھا ہے وہ حرام ہی ہیں اگر کوئی کسی سے کہے آج تم مٹھائی نہ کھاؤ اور وہ جواب میں کہے میں تو آج مٹھائی ہی کھاؤں گا اور کچھ نہیں کھاؤں گا تو یہ حکم دینے والے کے حکم کی ضد کا اظہار ہو گا۔ یہ آیت بھی اسی ذیل میں داخل ہے۔ اس میں بھی کافروں کی خود ساختہ تحلیل و تحریم کی ضد کا اظہار مقصود ہے حقیقۃً (مطلق) نفی و اثبات مقصود نہیں ہے۔ امام الحرمین نے اس تاویل کو پسند کیا ہے اور لکھا ہے یہ بہت اچھا مطلب ہے۔

چیزوں کی آئندہ تحریم کا احتمال باقی ہے لیکن تحریم بعض اشیاء کا یہ احتمال اس امر کے منافی اور مخالف نہیں کہ مذکورہ اقسام کے علاوہ تمام اشیاء کی حلت حکم شرعی ہے جو قرآن کی صراحت سے ثابت ہے۔ پس اس کے بعد حدیث میں جو بعض دوسری اشیاء کی حرمت کا حکم آیا ہے وہ یقیناً اس حلت کا ناسخ ہوگا اور نسخ کتاب بحدیث۔ یہ لازم آجائے گا۔ لہٰذا بہترین جواب یہ ہے کہ اس جگہ آیت عام ہے اور سورۂ مائدہ والی آیت میں جو مُنْخَنِقَةُ اور مَوْقُوذَةُ وغیرہ کی حرمت کا ذکر آیا ہے اس نے اس عام حلت سے بعض اقسام کی حرمت کو خاص کر لیا گیا بلکہ تحریم شراب کو بھی اسی نے خاص کر لیا گیا کیونکہ شراب بھی طعام ہی کی ایک قسم ہے اللہ نے شراب کے متعلق ہی فرمایا ہے لَيْسَ عَلَى الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ جُنَاحٌ فِيمَا طَعِمُوا گویا یہ آیت اب عام مطلق نہیں بلکہ عام مخصوص البعض ہو گئی۔ مگر یہ تخصیص دوسری آیت سے ہوئی ہے اس کے بعد اس عام مخصوص البعض کی مزید تخصیص خبر احاد سے ہو گئی اور یہ جائز ہے بلکہ عام مخصوص البعض کی مزید تخصیص تو قیاس سے بھی ہو سکتی ہے اگر دونوں تخصیص ایک وقت میں ہونے کی شرط لگائی جائے تو یہ شرط قابل تسلیم نہیں۔ تخصیص میں اختلاف زمانہ جائز ہے کلام مستقل کے حکم سے جو جدید حکم بعض افراد کو خارج کر دے وہ مخصوص ہے خواہ ایک زمانہ میں دونوں حکم ہوں یا آگے پیچھے مختلف اوقات میں۔ اس سے ظاہر ہوا کہ یہ تخصیص ہے (نزول کتاب کی تخصیص کتاب کے ذریعہ سے پھر کتاب کے عام مخصوص البعض کی تخصیص حدیث کے ذریعہ سے) نسخ نہیں ہے ناسخ تو وہ ہوگا جو تمام افراد سے حکم کو سلب کر دے اور اگر دونوں تخصیصوں کے ہم زمانہ ہونے کی شرط مان بھی لی جائے تب بھی کہا جا سکتا ہے کہ دم وغیرہ کے علاوہ تمام حیوانات کی حلت جو اس آیت سے مستفاد ہو رہی ہے وہ تحریم خبائث والی آیت سے منسوخ ہے اللہ نے فرمایا ہے يَأْمُرُهُمْ بِالْمَعْرُوفِ وَيَنْهَاهُمْ عَنِ الْمُنْكَرِ وَيُحِلُّ لَهُمُ الطَّيِّبَاتِ وَيُحَرِّمُ عَلَيْهِمُ الْخَبَائِثَ مگر طیبات اور خبائث میں اجمال ہے جو بیان کا محتاج ہے اور اس کا بیان اس حدیث میں آ گیا ہے جس میں درندوں اور خانگی گدھوں کے گوشت کی حرمت ظاہر کی گئی ہے (گویا حدیث نہ قرآن کی ناسخ ہے نہ مخصص بلکہ کتاب کے مجمل کا بیان ہے) یا ہم یہ کہیں گے کہ یہ احادیث اگرچہ اخبار احاد میں سے ہیں مگر تمام امت نے ان کو قبول کیا ہے یہاں تک کہ امام مالکؒ جو تحریم سباع وغیرہ کے قائل نہیں ہیں انہوں نے بھی ان کو صحیح مانا ہے کیونکہ انہی احادیث کی بناء پر آپ سباع وغیرہ کو مکروہ تحریمی کہتے ہیں لہٰذا ان احادیث کی صحت اجماع مسلمہ ہو گئی اور اس اجماعی تسلیم کی وجہ سے ان کو قطعیت کا درجہ حاصل ہو گیا پس ان احادیث سے کتاب کے حکم کا منسوخ ہو جانا جائز ہو گیا۔

بجو، لومڑی، گھونس اور گوہ کے متعلق جو علماء کا اختلاف ہے وہ امام ابو حنیفہؒ کے خلاف نہیں جاتا کیونکہ امام صاحب بجو اور لومڑی کو درندوں میں اور گھونس اور گوہ کو حشرات میں شمار کرتے ہیں اور سباع و حشرات کی حرمت میں کسی کا کوئی اختلاف نہیں اختلاف تو صرف اس امر میں ہے کہ یہ جانور سباع و حشرات میں داخل ہیں یا نہیں۔ حلال و حرام جانوروں کے مسائل کی تفصیل ہم نے سورۂ مائدہ کی آیت اَلْيَوْمَ اُحِلَّ لَكُمُ الطَّيِّبَاتُ کی تفسیر کے ذیل میں کر دی ہے۔

وَعَلَى الَّذِينَ هَادُوا حَرَّمْنَا كُلَّ ذِي ظُفُرٍ (اور یہودیوں پر ہم نے تمام ناخن والے جانور حرام کر دیئے تھے) یعنی جن جانوروں کی انگلیاں ہوتی ہیں جیسے اونٹ درندے اور پرندے۔ قتیبی نے کہا پرندوں میں سے ناخن والا وہ پرندہ ہے جس کا پنجہ ہوتا ہے اور چوپایوں میں سے ناخن والا وہ چوپایہ ہے جو ٹاپ والا ہوتا ہے۔ قتیبی نے اس تشریح کی نسبت بعض اہل تفسیر کی طرف کی ہے۔ ٹاپ کو ناخن کہنا مجازاً ہے۔

شاید ظلم کی وجہ سے یہودیوں کے لئے عموماً یہ تمام جانور حرام کر دیئے گئے تھے ورنہ ان میں سے بعض جانوروں کی حرمت تو اسلام میں بھی ہے (البتہ یہ حرمت کسی جرم کی سزا کے طور پر نہیں ہے)۔

وَمِنَ الْبَقَرِ وَالْغَنَمِ حَرَّمْنَا عَلَيْهِمْ شُحُومَهُمَا إِلَّا مَا حَمَلَتْ ظُهُورُهُمَا أَوِ الْحَوَايَا أَوْ مَا اخْتَلَطَ بِعَظْمٍ (اور گائے اور بکری کے اجزاء میں سے ان دونوں کی چربیاں ہم نے ان پر حرام کر دی تھیں سوائے اس چربی کے جو ان جانوروں کی پشت پر ہو یا انتڑیوں میں لگی ہو یا جو ہڈی سے ملی ہو۔ مَا حَمَلَتْ ظُهُورُهُمَا سے مراد وہ چربی ہے جو ان جانوروں کی پشت یا پہلو پر ہو۔

اَلْحَوَایَا حاویہ کی جمع ہو یا الحاویاء کی اس کا عطف شُحُوْمُهُمَآ پر ہے یعنی جو چربی انتڑیوں سے چپکی ہو۔ مَا اخْتَلَطَ بِعَظْمٍ سے مراد پٹھے اور سرین کی چربی ہے، اس کا اتصال دم کی ہڈی اور حرام مغز سے ہوتا ہے۔ استثناء کے بعد حرام چربی صرف پیٹ کی اور گردوں کی رہ گئی۔

ذٰلِكَ جَزَيْنٰهُمْ بِبَغْيِهِمْ ۖ وَاِنَّا لَصٰدِقُوْنَ (ہم نے (تحریم کی) یہ سزا ان کو ان کی شرارت کی وجہ سے دی تھی اور ہم سچے ہیں)۔ انبیاء کا قتل، راہ خدا سے روکنا، سود لینا، بغیر کسی حق کے لوگوں کا مال کھانا یہ ان کی شرارتیں تھیں۔

ایک شبہ

مذکورہ جرائم کے ارتکاب کرنے والوں کو حکم تحریم کی پرواہ نہیں تھی پھر اس حکم سے ان کو سزا کیا ملی۔

ازالہ

شاید آخرت کا عذاب بڑھانے کے لئے یہ حکم تحریم دیا گیا۔ حضرت جابرؓ بن عبداللہ کا بیان ہے کہ فتح مکہ کے سال جب رسول اللہ ﷺ مکہ میں تھے میں نے خود سنا، حضور ﷺ فرما رہے تھے اللہ نے شراب، مردار، خنزیر اور بتوں کی تجارت کو حرام کر دیا ہے، عرض کیا گیا مردار کی چربی کا کیا حکم ہے اس سے تو کشتیوں پر پالش اور چمڑے پر روغن کیا جاتا ہے اور اس کو چراغ میں جلایا جاتا ہے، فرمایا نہیں، مردار کی چربی حرام ہے۔ پھر فرمایا یہودیوں پر اللہ کی لعنت، جب اللہ نے ان پر مردار کی چربی حرام کر دی تو انہوں نے چربی کو پگھلا کر اور تیل بنا کر فروخت کیا اور اس کی قیمت کھائی، رواہ البخاری وغیرہ۔ واللہ اعلم۔

وَاِنَّا لَصٰدِقُوْنَ کا یہ مطلب ہے کہ عذاب کی وعید و ثواب کے وعدہ اور واقعات کے خبر دینے میں ہم بالکل سچے ہیں۔

فَاِنْ كَذَّبُوْكَ فَقُلْ رَّبُّكُمْ ذُوْ رَحْمَةٍ وَّاسِعَةٍ ۚ (پھر اگر وہ (یہودی) آپ کو جھوٹا کہیں تو آپ کہہ دیجئے کہ تمہارا رب وسیع رحمت والا ہے) یعنی آپ کے پاس جو آیات کے ذریعہ سے جزئیات بھیجی گئی ہیں اگر یہودی ان کی تکذیب کریں تو ان سے کہہ دیجئے کہ اللہ بڑی وسیع رحمت والا ہے کہ باوجود تمہاری تکذیب کے اس نے تم کو مہلت دے رکھی ہے۔ اللہ کے مہلت دینے سے تم فریب نہ کھاؤ، وہ مہلت دیتا ہے چھوڑ نہیں دے گا (گرفت آخر میں ضرور کرے گا)۔

وَلَا يُرَدُّ بَاْسُهٗ عَنِ الْقَوْمِ الْمُجْرِمِيْنَ (اور (جب وقت آجائے گا) اس کا عذاب مجرموں سے لوٹایا نہیں جائے گا)۔ یا یہ مطلب ہے کہ اللہ مؤمنوں کے لئے وسیع رحمت والا اور تکذیب کرنے والوں کو سخت عذاب دینے والا ہے۔ اس آخری فقرہ کی جگہ فرمایا اس کا عذاب مجرموں سے نہیں لوٹایا جائے گا۔

سَيَقُوْلُ الَّذِيْنَ اَشْرَكُوْا لَوْ شَآءَ اللّٰهُ مَآ اَشْرَكْنَا وَلَآ اٰبَآؤُنَا وَلَا حَرَّمْنَا مِنْ شَيْءٍ ؕ

(عنقریب مشرک کہیں گے کہ اگر اللہ چاہتا تو نہ ہم شرک کرتے نہ ہمارے باپ دادا نہ ہم کسی (حلال) چیز کو حرام قرار دیتے)۔ یہ مستقبل کے متعلق اطلاع ہے اور معجزہ ہے خبر کے مطابق آئندہ واقعہ ہوا، جب مشرک دلیل کا جواب دینے سے عاجز ہو گئے تو انہوں نے اپنے طریقہ کے مطابق مشیت اور پسندیدہ ہونے پر بصورت بالا استدلال کیا اگر اللہ چاہتا یعنی اگر ہمارے طریقہ عمل کے خلاف خدا چاہتا۔ مطلب یہ کہ اللہ کو قدرت حاصل ہے کہ وہ ہم کو ہمارے معمولات سے روک دے اور ہم جو کچھ کر رہے ہیں اس کو نہ کر پائیں۔ اگر اس کو ہمارا یہ طریقہ اور عمل پسندیدہ نہ ہوتا اور اس کے خلاف ہم سے کرانا چاہتا تو ضرور ہم کو اس طریقہ سے روک دیتا۔ یہ استدلال مشرکوں کی جہالت پر مبنی ہے انہوں نے ارادے اور پسندیدگی میں فرق نہیں کیا اللہ کے ارادہ اور مشیت کا تعلق تو ہر خیر و شر سے ہے، اللہ جو چاہتا ہے ہوتا ہے جس کو نہیں چاہتا نہیں ہوتا، لیکن پسندیدگی کا تعلق کفر سے نہیں اللہ بندوں کے کافر ہونے کو پسند نہیں کرتا۔

كَذٰلِكَ كَذَّبَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ حَتّٰى ذَاقُوْا بَاْسَنَا ؕ (اسی طرح ان لوگوں نے (پیغمبروں کی) تکذیب کی تھی جو ان سے پہلے گزر گئے آخر انہوں نے ہمارے عذاب کا مزہ چکھا)۔

یعنی اللہ نے شرک کی ممانعت فرمائی ہے اس کو شرک پسند نہیں اور جن چیزوں کو مشرکوں نے از خود حرام بنا رکھا ہے اللہ نے ان کو حرام نہیں کیا مگر مشرکوں نے اس حکم کی تکذیب کی۔ اسی طرح اللہ کے پیغمبروں کی تکذیب پہلے لوگ بھی کر چکے ہیں آخر اس تکذیب کے نتیجہ میں ان پر اللہ کا عذاب آگیا اور انہوں نے عذاب خداوندی کا مزہ چکھ لیا۔

قُلْ هَلْ عِنْدَكُمْ مِّنْ عِلْمٍ فَتُخْرِجُوْهُ لَنَا ۭ اِنْ تَتَّبِعُوْنَ اِلَّا الظَّنَّ وَاِنْ اَنْتُمْ اِلَّا تَخْرُصُوْنَ ۝ (آپ کہئے کیا تمہارے پاس کوئی دلیل ہے تو اس کو ہمارے سامنے ظاہر کرو، تم لوگ محض خیالی باتوں پر چلتے ہو اور اٹکل سے باتیں بناتے ہو)۔

علم سے مراد ہے وہ علم جو (اللہ کی) کسی کتاب سے حاصل کیا گیا ہو۔ یا دلیل مراد ہے جو یہ ثابت کرے کہ اللہ شرک کو پسند کرتا ہے اور جن چیزوں کو انہوں نے حرام بنا رکھا ہے ان کی تحریم اللہ کی طرف سے ہے۔ یا علم سے مراد ہے معلوم (مصدر بمعنی اسم مفعول) یعنی کوئی ایسا امر معلوم جس کو دعویٰ کے ثبوت میں پیش کیا جائے فَتُخْرِجُوْهُ یعنی کیا تم ہمارے سامنے ظاہر کرو گے کہ یہ علم تم کو کہاں سے ہوا لیکن ایسا نہیں ہے وہ قائل ہی نہیں ہیں کہ ہم جو کچھ کہتے ہیں دلیل و علم سے کہتے ہیں۔ ظن سے مراد ہے وہ علم جو بغیر کسی دلیل کے محض باپ دادا کی تقلید سے حاصل ہو۔ تَخْرُصُوْنَ (تم اٹکل چلاتے ہو) یعنی جھوٹ بات کہتے ہو۔

قُلْ فَلِلّٰهِ الْحُجَّةُ الْبَالِغَةُ ۚ فَلَوْ شَاۗءَ لَهَدٰىكُمْ اَجْمَعِيْنَ ۝ (آپ کہیے کہ پوری غالب دلیل تو اللہ ہی کی رہی پس اگر وہ چاہتا تو تم سب کو ہدایت یاب کر دیتا)۔ یعنی اللہ نے اپنے اوامر و نواہی کی جو دلیل بیان کی وہ تو تمہارے خلاف کافی ہے اور تم نے جو اللہ کی مشیت کے مسئلہ کو استدلال میں پیش کیا ہے وہ استدلال ناقص ہے کیونکہ مشیت کے لئے رضامندی لازم نہیں۔ اللہ جو چاہتا ہے اپنی حکمت کے مطابق کرتا ہے اور جیسا ارادہ کرتا ہے ویسا حکم دیتا ہے اس سے کسی بات کی بازپرس نہیں کی جا سکتی وہ سب بندوں سے بازپرس کرے گا اس سے سوال کون کر سکتا ہے۔

فرقہ معتزلہ کہتا ہے کہ کفر اللہ کی مشیت اور ارادہ سے نہیں ہوتا بندہ کی مشیت سے ہوتا ہے۔ معتزلہ نے اسی آیت سے اپنے قول پر استدلال کیا ہے اگر واقع میں کفر اللہ کی مشیت سے ہوتا تو پھر کافروں کا قول لَوْ شَاۗءَ اللّٰهُ مَآ اَشْرَكْنَا صحیح تھا اس کو غلط کیوں قرار دیا اور کیوں اس کی تکذیب کی۔

ہماری تفسیر سے معتزلہ کی اس دلیل کی غلطی واضح ہو رہی ہے ہر چیز کا وجود مشیت خدا پر موقوف ہے اس کی تکذیب تو اللہ نے نہیں کی بلکہ آیت کا آخری جملہ فَلَوْ شَاۗءَ لَهَدٰىكُمْ اَجْمَعِيْنَ عموم مشیت کی تائید کر رہا ہے۔ اللہ نے مشرکوں کی مذمت صرف اس بات پر کی کہ انہوں نے پیغمبروں کی تکذیب کی اور اس تکذیب پر اللہ کے رضامند ہونے کا دعویٰ کیا اور جس چیز کو اللہ نے حرام نہیں کیا اس کو از خود حرام کرنے پر اللہ کو راضی قرار دیا اور یہ بات کہی کہ چونکہ بحیرہ، سائبہ وغیرہ کی تحریم اللہ کی مشیت کے زیر اثر ہے اس لئے وہ ضرور اس پر راضی ہے (گویا اللہ نے مشرکوں کی تکذیب مشیت اور رضامندی میں فرق نہ کرنے پر کی، کفر شرک اور تحریم سائبہ بحیرہ کو مشیت کے زیر اثر قرار دینے پر نہیں کی)۔

قُلْ هَلُمَّ شُهَدَاۗءَكُمُ الَّذِيْنَ يَشْهَدُوْنَ اَنَّ اللّٰهَ حَرَّمَ هٰذَا ۚ (آپ کہہ دیجئے کہ اپنے پیشواؤں کو لاؤ جو اس بات کی شہادت دیں کہ اللہ نے ان چیزوں کو حرام کر دیا ہے)۔ هَلُمَّ لاؤ، حاضر کرو۔ یہ اسم فعل ہے اور اس کی گردان اہل حجاز کے استعمال میں نہیں آتی۔ واحد اور جمع سب کے لئے اسی کا استعمال ہوتا ہے۔ شُهَدَاۗءَكُمْ یعنی اس قول میں جو تمہارے پیشوا ہیں ان کو بلاؤ تاکہ سب پر اتمام حجت ہو جائے اور سب کی گمراہی ظاہر ہو جائے کیونکہ مقلدوں کی طرح پیشواؤں کے پاس بھی اس قول کی دلیل نہیں ہے۔ حَرَّمَ هٰذَا یعنی وہ شہادت دیں کہ جس چیز کو تم حرام کہتے ہو اللہ نے اس کو حرام قرار دیا ہے۔

فَاِنْ شَهِدُوْا فَلَا تَشْهَدْ مَعَهُمْ ۚ (پھر اگر وہ (جھوٹی) شہادت دے بھی دیں تب بھی آپ ان کے ساتھ شہادت نہ دینا) یعنی ان کی تصدیق نہ کرنا بلکہ ان کی شہادت کی خرابی ظاہر کرتے رہنا۔

وَلَا تَتَّبِعْ اَهْوَآءَ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا وَالَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ وَهُمْ بِرَبِّهِمْ يَعْدِلُوْنَ ۝

(اور آپ ایسے لوگوں کے باطل خیالات کا اتباع نہ کریں جو ہماری آیتوں کو جھوٹا کہتے ہیں اور آخرت پر ایمان نہیں رکھتے اور وہ اپنے رب کے برابر دوسروں کو ٹھہراتے ہیں)۔ اَهْوَآءَ الَّذِيْنَ اصل میں اَهْوَآءَهُمْ تھا (هُمْ) ضمیر کی جگہ اسم ظاہر (اَلَّذِيْنَ كَذَّبُوْا) کو ذکر کرنے سے اس طرف اشارہ کرنا مقصود ہے کہ آیات الٰہیہ کو جھوٹا کہنے والے حقیقت میں اپنی نفسانی خواہشات کا اتباع کرنے والے ہیں۔

جب تحریم اشیاء کے سلسلہ میں مشرکوں کے قول کی غلطی ظاہر ہو گئی تو لوگوں نے رسول اللہ ﷺ سے دریافت کیا کہ اللہ نے کیا کیا چیزیں حرام کی ہیں اس پر آیت ذیل نازل ہوئی۔

قُلْ تَعَالَوْا اَتْلُ مَا حَرَّمَ رَبُّكُمْ عَلَيْكُمْ اَلَّا تُشْرِكُوْا بِهٖ شَيْئًا وَّبِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا ۚ

(آپ کہہ دیجئے آؤ میں تم کو وہ چیزیں پڑھ کر سناؤں جو تمہارے لئے تمہارے رب نے حرام کر دی ہیں وہ یہ کہ اللہ کے ساتھ کسی چیز کو شریک نہ ٹھہراؤ اور ماں باپ کے ساتھ بہت اچھا سلوک کیا کرو)۔ قُلْ سے خطاب رسول اللہ ﷺ کو ہے۔ تَعَالَوْا تَعَالٰی (باب تفاعل) سے امر حاضر جمع کا صیغہ ہے اس کی اصل وضع تو اس موقع کے لئے ہے جب کوئی شخص اوپر ہو اور نیچے والے آدمی سے کہے اوپر آجاؤ لیکن استعمال میں اس کے معنی عام ہو گئے۔ آؤ۔ مَا حَرَّمَ میں مَا موصولہ ہے (وہ چیز جو) یا مصدریہ ہے (یعنی تحریم) دونوں صورتوں میں اَتْلُ کا مفعول ہے یا مَا استفہامیہ ہے اور حَرَّمَ کا مفعول ہے پھر پورا جملہ اَتْلُ کا مفعول ہے عَلَيْكُمْ کا تعلق حَرَّمَ سے ہے یا اَتْلُ سے یا یہ اسم فعل ہے جس کا استعمال کسی کام پر برانگیختہ کرنے کے لئے کیا جاتا ہے یعنی اپنے اوپر لازم کر لو۔ اَلَّا تُشْرِكُوْا میں اَنْ مصدریہ ہے جبکہ عَلَيْكُمْ کو اسم فعل یعنی اِلْزَمُوْا کے کہا جائے ورنہ یہ فعل تلاوت کی تشریح ہے۔ میں یہ پڑھ کر سناتا ہوں کہ شریک نہ کرو اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اَلَّا تُشْرِكُوْا اسم فعل محذوف کا مفعول ہو اُوْصِيْكُمْ اَلَّا تُشْرِكُوْا میں تم کو نصیحت کرتا ہوں کہ شرک نہ کرو یا اَنْ مصدری ہو اور لَا تُشْرِكُوْا میں لا زائدہ ہو اللہ نے شرک کرنا تم پر حرام کر دیا ہے۔ شَيْئًا (مفعول مطلق ہے مگر ہم نے ترجمہ مفعول بہ کا کیا ہے یعنی) کسی طرح کا شرک نہ کرو نہ جلی (کھلا ہوا) نہ خفی یا مفعول بہ ہے یعنی کسی چیز کو (اسی کے مطابق ترجمہ کیا گیا ہے، مترجم) بِالْوَالِدَيْنِ کا تعلق محذوف فعل سے ہے یعنی اچھا سلوک کرو والدین کے ساتھ۔ اصل میں ماں باپ کے ساتھ بدسلوکی کی ممانعت مقصود ہے لیکن اس طرف اشارہ کرنا بھی ہے کہ بدسلوکی نہ کرنا کافی نہیں ہے والدین سے اچھا سلوک نہ کرنا بھی بجائے خود برا سلوک ہے اور تنبیہ اس نکتہ کلام میں زور پیدا کرنے کے لئے فرمایا کہ اچھا سلوک کرو، اس مطلب پر بِالْوَالِدَيْنِ کا اَلَّا تُشْرِكُوْا پر عطف ہو گا لیکن اگر اَلَّا تُشْرِكُوْا میں لا کو زائد مانا جائے گا تو کلام کا مطلب اس طرح ہو گا اللہ نے تم پر شرک کرنے کو حرام کر دیا ہے اور والدین کے ساتھ برا سلوک کرنے کو بھی اور والدین کے ساتھ خوب اچھا سلوک کرو۔

وَلَا تَقْتُلُوْٓا اَوْلَادَكُمْ مِّنْ اِمْلَاقٍ ۭ نَحْنُ نَرْزُقُكُمْ وَاِيَّاهُمْ ۚ (اور ناداری (کے اندیشہ) سے اپنی اولاد کو قتل نہ کرو یعنی لڑکیوں کو زندہ دفن نہ کرو ہم تم کو بھی کھانے کو دیں گے اور ان کو بھی)۔ حضرت معاذؓ کا بیان ہے کہ مجھے رسول اللہ ﷺ نے دس باتوں کی نصیحت فرمائی کسی کو اللہ کا ساجھی نہ بنا خواہ تجھے قتل کر دیا جائے یا تو جلا دیا جائے اور والدین کی نافرمانی نہ کرنا خواہ ماں باپ تجھے تیری بیوی اور تیرے مال سے تعلق منقطع کر لینے کا حکم دیں۔ رواہ احمد۔

حضرت ابن مسعودؓ کی روایت ہے ایک شخص نے عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ اللہ کے نزدیک سب سے بڑا گناہ کون سا ہے فرمایا یہ کہ تو کسی کو اللہ کا مثل قرار دے باوجودیکہ تجھے پیدا اللہ ہی نے کیا ہے۔ سائل نے عرض کیا اس کے بعد فرمایا اس اندیشہ کی وجہ سے اولاد کو قتل کر دے کہ وہ تیرے ساتھ تیرے کھانے میں شریک ہو جائے گی الی آخر الحدیث (متفق علیہ)

وَلَا تَقْرَبُوا الْفَوَاحِشَ مَا ظَهَرَ مِنْهَا وَمَا بَطَنَ ۚ (اور بے حیائی کے کاموں کے قریب بھی نہ جاؤ خواہ وہ علانیہ ہوں (بیرونی) یا پوشیدہ (اندرونی)۔

الْفَوَاحِشَ سے مراد ہیں کبیرہ گناہ یا صرف بدکاری۔ ظاہر گناہوں سے مراد وہ گناہ ہیں جو بیرونی اعضاء جسم سے طلب کئے جاتے ہیں اور پوشیدہ گناہ وہ ہیں جو بیرونی اعضاء سے صادر (ہاتھ پاؤں آنکھ وغیرہ) سے کئے جاتے ہیں مگر چھپ کر نفاق (حسد کینہ) وغیرہ جن کا تعلق دل سے ہے یہ بھی باطنی فواحش میں داخل ہے۔

وَلَا تَقْتُلُوا النَّفْسَ الَّتِي حَرَّمَ اللَّهُ إِلَّا بِالْحَقِّ (اور جس شخص کے قتل کرنے کو اللہ نے حرام کردیا ہے اس کو قتل نہ کرو)۔ خواہ وہ مسلمان ہو یا غیر مسلم معاہد یعنی اگر کسی سے کوئی ایسا جرم ہو جائے جس کی وجہ سے اس کو قتل کرنا جائز ہو جاتا ہے مثلاً کوئی مسلمان مرتد ہو جائے یا کوئی عمداً قتل کردے یا کوئی محصن زنا کرلے یا مسلمانوں سے کئے ہوئے معاہدہ کو کوئی حربی توڑ دے یا اسلامی حکومت کے خلاف کوئی باغی ہو جائے یا کوئی رہزنی کرے تو ایسی صورتوں میں مجرم کو قتل کرنا مباح ہے۔

حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جو شخص شہادت دے رہا ہو کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور میں اللہ کا رسول ہوں اس کا خون حلال نہیں مگر تین صورتوں میں سے کسی ایک امر کی وجہ سے یا تو وہ شادی شدہ زانی ہو یا جان کے بدلے جان یا اپنے دین کو چھوڑ دینے والا اور (مسلمانوں کی) جماعت سے الگ ہو جانے والا ہو رواہ البغوی۔ اللہ نے فرمایا ہے وَإِنْ نَكَثُوا أَيْمَانَهُمْ مِنْ بَعْدِ عَهْدِهِمْ وَطَعَنُوا فِي دِينِكُمْ فَقَاتِلُوا أَئِمَّةَ الْكُفْرِ الخ (یعنی معاہدہ شکن کافروں کو قتل کرو) دوسری آیت میں فرمایا فَإِنْ بَغَتْ إِحْدَاهُمَا عَلَى الْأُخْرَى فَقَاتِلُوا الَّتِي تَبْغِي (یعنی باغی مسلمانوں کو قتل کرنا جائز ہے) تیسری آیت میں آیا ہے إِنَّمَا جَزَاءُ الَّذِينَ يُحَارِبُونَ اللَّهَ الخ (یعنی ڈاکوؤں اور رہزنوں کا قتل درست ہے)۔

ذَٰلِكُمْ وَصَّاكُمْ بِهِ لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُونَ (اس کا اللہ نے تم کو تاکیدی حکم دیا ہے تاکہ تم سمجھو) یعنی اس کی نگہداشت کا تم کو حکم دیا ہے تاکہ تم سمجھ لو اور رشد حاصل کرو۔ تکمیل عقل ہی رشد ہے، رشد کی ضد کا نام سفاہت یعنی سبک سری ہے۔

ل حضرت علی بن ابی طالب کی روایت ہے کہ اللہ نے اپنے رسول کو قبائل عرب کے پاس جانے اور ان کو تبلیغ کرنے کا حکم دیا تو آپ منیٰ کو تشریف لائے میں اور حضرت ابوبکر ہمراہ تھے حضرت ابوبکرؓ انساب عرب سے واقف تھے حضور منیٰ میں قبائل کی فرودگاہوں اور ڈیروں پر جا کر ٹھہرے اور سلام کیا انھوں نے سلام کا جواب دیا ان لوگوں میں مفروق بن عمرو، ہانی بن قبیصہ، مثنیٰ بن حارثہ اور نعمان بن شریک موجود تھے حضرت ابوبکرؓ سے سب سے زیادہ قریب مفروق تھا جو فصاحت اور لسانی میں سب پر غالب تھا اس نے رسول اللہ ﷺ کی طرف التفات کیا اور پوچھا قریشی بھائی آپ ہم کو کس چیز کی دعوت دے رہے ہیں۔ حضور آگے بڑھے اور آپ کے سر پر حضرت ابوبکرؓ نے اپنے کپڑے سے سایہ کرلیا پھر حضورؐ نے فرمایا میں تم کو دعوت دیتا ہوں کہ تم اس امر کی شہادت دو کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں وہ وحدہ لاشریک ہے اور میں اس کا رسول ہوں اور تم لوگ مجھے ٹھکانہ دو اور مدد کرو اور میری حفاظت کرو کہ میں اللہ کی طرف سے اس پیام کو پہنچادوں جس کا حکم اس نے مجھے دیا ہے کیونکہ قریش نے اللہ کے امر کے خلاف اجتماع کرلیا ہے اور اس کے رسول کو جھوٹا قرار دیا ہے اور حق کے خلاف باطل کی مدد کی ہے وَاللَّهُ هُوَ الْغَنِيُّ الْحَمِيدُ۔ مفروق نے کہا ہمارے لئے تمہارا پیام و دعوت اور کیا ہے، حضور نے جواب میں آیت قُلْ تَعَالَوْا أَتْلُ مَا حَرَّمَ رَبُّكُمْ عَلَيْكُمْ سے تَتَّقُونَ تک تلاوت فرمائی۔ مفروق نے کہا قریشی بھائی اور کس چیز کی طرف ہم کو بلاتے ہو خدا کی قسم یہ زمین والوں کا کلام نہیں ہے اگر اہل زمین کا کلام ہوتا تو ہم ضرور پہچان لیتے اس پر حضور نے تلاوت فرمایا إِنَّ اللَّهَ يَأْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْإِحْسَانِ الخ مفروق نے کہا قریشی خدا کی قسم تم تو بزرگ اخلاق اور اچھے کاموں کی دعوت دے رہے ہو تمہاری قوم جھوٹی ہے جس نے تمہاری تکذیب کی اور تمہارے خلاف گٹھ جوڑ کیا۔ ہانی بن قبیصہ کہنے لگا قریشی بھائی میں نے تمہاری بات سنی اور تمہارے قول کو پسند کیا اور جو کچھ تم نے کہا میرے دل نے اس کو اچھا سمجھا اس کے بعد رسول اللہ ﷺ نے ان سے فرمایا تم لوگوں کو زیادہ مدت ٹھہرنا نہیں پڑے گا کہ اللہ تم کو ان کے ملک اور ان کی اولاد کا وارث فرما دے گا۔ یعنی سرزمین فارس اور کسریٰ کی نہریں عنایت کردے گا اور ان کی لڑکیوں کو تمہاری بستری بنا دے گا کیا اس کے بعد تم اللہ کی تسبیح و تقدیس بیان کرو گے۔ نعمان بن شریک نے کہا اے قریشی یہ اور تم کو یہ کہاں سے معلوم ہوا؟ حضور نے آیت إِنَّا أَرْسَلْنَاكَ شَاهِدًا وَمُبَشِّرًا وَنَذِيرًا وَدَاعِيًا إِلَى اللَّهِ بِإِذْنِهِ وَسِرَاجًا مُنِيرًا تلاوت فرمادی، پھر آپ حضرت ابوبکرؓ کا ہاتھ پکڑے اٹھ کھڑے ہوئے۔ انتہیٰ

وَلَا تَقْرَبُوْا مَالَ الْيَتِيْمِ اِلَّا بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ حَتّٰى يَبْلُغَ اَشُدَّهٗ ۚ (اور یتیم کے مال کے پاس بھی نہ جاؤ مگر ایسے طریقہ سے جو کہ مستحسن ہے یہاں تک کہ وہ سن بلوغ کو پہنچ جائے)۔ وَلَا تَقْرَبُوْا یعنی یتیم کے مال کو کھانا اور تباہ کرنا تو درکنار اس کے مال کے پاس بھی نہ جاؤ۔ مگر اس طریقہ سے جس سے اس کے مال کی نگہداشت درستی اور ترقی ہوتی ہو۔ بعض نے کہا اَلَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ سے مراد تجارت ہے۔ اَشُدَّ، شدة کی جمع ہے جیسے افلس فلس کی جمع ہے۔ یعنی بلوغ اور بلوغ کے بعد پوری سمجھ کے تمام اوصاف یتیم کو حاصل ہو جائیں۔ بعض کے نزدیک اَشُدّ مفرد ہے جس کا معنی ہے (قوت و توانائی کا) کمال۔ اَشُدّ تک پہنچنے کی شرط احترازی نہیں عادی ہے۔ اسلام سے پہلے یتیم کے مال میں اس کے بچپن کے زمانہ میں ہر طرح کا تصرف کر لیا کرتے تھے لیکن جب وہ طاقتور ہو جاتا اور اس کے قویٰ مکمل ہو جاتے تو وہ خود دوسروں کو اپنے مال میں تصرف کرنے سے روک دیتا تھا اس پر اللہ نے فرمایا کہ یتیم کے بچپن کے زمانہ میں بھی اس کے مال کے پاس نہ جاؤ اور اس کے بعد تو وہ خود ہی تم کو دور دبا دے گا تم تصرف کر ہی نہ سکو گے۔ بغوی نے لکھا ہے (معنی کے لحاظ سے) عبارت آیت اس طرح ہے کہ یتیم کے مال کے پاس بھی نہ جاؤ مگر ایسے طریقہ سے جو مستحسن ہے یہاں تک کہ جب وہ قوت کو پہنچ جائے تو اس کا مال اس کو دیدو بشرطیکہ وہ سمجھدار ہو۔ میں کہتا ہوں ممکن ہے کہ حتیٰ مستثنیٰ کی غایت ہو اور مطلب اس طرح ہو یتیم کے مال سے اچھا معاملہ کرو یہاں تک کہ وہ اپنے سن بلوغ کو پہنچ جائے (تو اچھے تصرف سے بھی دست کش ہو جاؤ)۔

وَاَوْفُوا الْكَيْلَ وَالْمِيْزَانَ بِالْقِسْطِ ۚ (اور ناپ تول پوری پوری انصاف کے ساتھ کیا کرو)۔

بِالْقِسْطِ عدل، کمی بیشی نہ کرنا۔ امر کو بعد نہی کے لایا گیا ہے مطلب یہ ہے کہ تول ناپ میں کمی نہ کرو اس سے پورا پورا دینے کی اہمیت معلوم ہو گئی کیونکہ کسی چیز کی ممانعت سے التزاماً یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ اس چیز کی ضد کا حکم دیا گیا ہے۔

لَا نُكَلِّفُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا ۚ (ہم کسی شخص کو اس کی سمائی (امکان) سے زیادہ مکلف نہیں کرتے)۔ پورا پورا دینے کے حکم کے بعد اس جملہ نے اس طرف اشارہ کیا ہے کہ جس پر حق ہو وہ مقدار حق سے زیادہ اگر حقدار کو دیدے تو زیادہ بہتر ہے زیادتی وہ خود اپنی طرف سے کر دے۔ ابن مردویہ نے ضعیف سند سے سعید بن مسیب کی مرسل روایت نقل کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جس نے اپنے ہاتھ پر ناپ تول پوری کی اور اس نے پوری کرنے کی نیت کی واللہ جانتا ہے اس کا مواخذہ نہ ہو گا (خواہ تول ناپ میں ناواقفی کی بیشی ہو گئی ہو) اور وسعہا سے یہی مراد ہے۔ احمد، ابوداؤد، ترمذی، نسائی، ابن ماجہ اور حاکم نے حضرت سوید بن قیس رضی اللہ عنہ کی روایت سے لکھا ہے اور حاکم نے اس کو صحیح کہا ہے کہ رسول اللہ ﷺ پر ایک گھوڑے کی قیمت واجب تھی آپ نے اس کی ادائگی کے سلسلہ میں فرمایا وزن کر کے (قیمت) دیدو اور جھکتی ہوئی دیدو۔

صحیحین میں حضرت ابوہریرہؓ کی روایت سے آیا ہے کہ ایک آدمی رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں اپنے قرض کا تقاضا کرنے آیا اور کلام میں کچھ درشتی کی، بعض صحابیوں نے اس (کو مارنے) کا ارادہ کیا لیکن حضور ﷺ نے فرمایا جانے دو حقدار کو کہنے کا حق ہے پھر فرمایا جس عمر کا اس کا (اونٹ) تھا اسی عمر کا اس کو دیدو صحابہؓ نے عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ اگر ہم عمر نہ ملے بلکہ اس سے بہتر ملے فرمایا وہی دیدو کیونکہ تم میں سب سے اچھا وہ آدمی ہے جو ادائگی قرض میں سب سے اچھا ہو۔ مسلم نے حضرت ابورافع کی روایت سے اسی کی ہم معنی حدیث بیان کی ہے۔ حضرت ابوہریرہؓ کی روایت ہے کہ ایک شخص سے رسول اللہ ﷺ نے آدھا وسق (تقریباً تین من) قرض لیا تھا وہ تقاضا کرنے آیا حضور ﷺ نے اس کو ایک وسق (تقریباً چھ من) دے دیا اور فرمایا آدھا وسق تیرا ہے اور آدھا وسق میری طرف سے ہے۔ پھر ایک شخص ایک وسق کا تقاضا کرنے آیا آپ نے اس کو دو وسق دیئے اور فرمایا ایک وسق تیرا ہے اور ایک وسق میری طرف سے ہے۔ رواہ البزار۔ اس حدیث کی سند میں کوئی سقم نہیں ہے۔

اسی لئے صاحب حق کے لئے افضل یہ ہے کہ اپنے حق سے کم واپس لے۔ حضرت جابرؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اللہ کی رحمت ہو اس جوانمرد پر جو فروخت کرنے والا سخی ہو جب بیچے خریدے اور (قرض کا) مطالبہ کرنے کے وقت جوانمردی کرتا ہے۔ رواہ البخاری۔

چونکہ صاحب حق کے حق سے زیادہ ادا کرنا اور اپنے حق سے کم لینا اور اس پر راضی ہو جانا لوگوں کی طبیعتوں پر گراں گزرتا ہے اس لئے اللہ نے نہ زیادہ دینا واجب کیا نہ کم لینا۔ لَا نُكَلِّفُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا کا یہی مطلب ہے۔ ان تمام احادیث سے امام شافعی کے مسلک کی تائید ہوتی ہے۔ امام شافعی کا قول ہے کہ اگر قرض دہندہ قرض خواہ کو کوئی چیز ہدیہ میں دیدے یا اس کو سواری کے لئے (بلا کرایہ) کوئی جانور دیدے یا اپنے مکان میں (بلا کرایہ) رکھ لے تو جائز ہے بشرطیکہ یہ شرط پہلے سے قرض لینے کے وقت طے نہ کی گئی ہو۔ باقی تینوں اماموں کے نزدیک یہ تمام صورتیں مکروہ تحریمی ہیں کوئی بھی جائز نہیں۔ سورۂ بقرہ کی آیت مداینت کی تفسیر میں یہ مسئلہ گزر چکا ہے۔

وَاِذَا قُلْتُمْ فَاعْدِلُوْا وَلَوْ كَانَ ذَا قُرْبٰى (اور جب تم بات کہو (خواہ تجارت اور فیصلہ ہو یا شہادت) تو انصاف رکھا کرو گو وہ شخص (جس کے بارہ میں یا جس کے خلاف ہے تمہارا) قرابت دار ہو) اس جملہ سے مقصود بھی جھوٹی گواہی اور جھوٹی شہادت دینے کی ممانعت تاکید کے ساتھ کرنی ہے۔ یہیں سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ گمان اور راجح خیال کی بنیاد پر بھی شہادت دینا ناجائز ہے بلکہ شہادت کے لئے پورا پورا یقین ہونا ضروری ہے۔ لفظ شہادت (حضور اور معاینہ) اسی پر دلالت کرتا ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے تین بار فرمایا جھوٹی شہادت شرک کے مساوی ہے۔ پھر حضور ﷺ نے یہ آیت تلاوت فرمائی فَاجْتَنِبُوا الرِّجْسَ مِنَ الْاَوْثَانِ وَاجْتَنِبُوْا قَوْلَ الزُّوْرِ حُنَفَآءَ لِلّٰهِ غَيْرَ مُشْرِكِيْنَ بِهٖ۔ رواہ ابو داؤد وابن ماجہ عن خریم بن فاتک و احمد والترمذی عن ایمن بن خریم۔ ابن ماجہ نے رسول اللہ ﷺ کی قرأت کا ذکر نہیں کیا ہے۔ حضرت بریدہ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا قاضی تین (قسم کے) ہوتے ہیں ایک جنت میں جائے گا اور دو دوزخ میں۔ جنت میں وہ قاضی جائے گا جس نے حق کو پہچانا اور حق کے مطابق ہی فیصلہ کیا اور جس نے حق کو پہچان لیا مگر فیصلہ میں ظلم کیا وہ دوزخ میں جائے گا اور جس نے جہالت کے باوجود فیصلہ کیا وہ بھی دوزخ میں جائے گا۔ رواہ ابو داؤد۔

وَبِعَهْدِ اللّٰهِ اَوْفُوْا (اور اللہ سے کیا ہوا عہد پورا کرو)۔ عہد اللہ سے مراد یا نذر اور قسم ہے یا تمام اوامر و نواہی کی پابندی احکام شرعی کی ادائیگی اور عدل پر کاربند رہنے کا قرار۔ اَوْفُوْا امر کا صیغہ ہے جس سے مقصود ہے عہد سے پورے طور پر وابستہ رہنا۔ مقصود یہ ہے کہ اللہ سے کئے ہوئے مضبوط عہد کی خلاف ورزی نہ کرو اور پختہ قسموں کو نہ توڑو۔ اوامر و نواہی کی مضبوط پابندی کا تقاضا ہے کہ آدمی ان چیزوں سے بھی پرہیز رکھے جن کی حرمت و حلت مشتبہ ہو۔ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا حلال واضح ہے اور حرام بھی واضح اور حلال و حرام کے درمیان کچھ امور غیر واضح ہیں جن کو بہت آدمی نہیں جانتے ہیں جو شخص ان مشتبہ امور سے بچا رہا وہ اپنی آبرو اور دین کو بے داغ بچا لے گیا اور جو مشتبہات میں پڑ گیا وہ (آخر کار) حرام میں پڑ جائے گا جیسے کوئی چرواہا اگر محفوظ چراگاہ کے آس پاس چراتا ہے تو قریب ہے کہ وہ چراگاہ کے اندر بھی جا پڑے الخ متفق علیہ من حدیث النعمان بن بشیر۔ طبرانی نے صغیر میں صحیح سند سے حضرت عمر کی مرفوع روایت نقل کی ہے کہ حلال بھی واضح ہے اور حرام بھی واضح ہے جو چیز شک آفریں ہو اس کو چھوڑ دو اور اس چیز کو اختیار کرو جو شک آفریں نہ ہو۔

ذٰلِكُمْ وَصّٰىكُمْ بِهٖ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُوْنَ ۝ وَاَنَّ هٰذَا صِرَاطِيْ مُسْتَقِيْمًا فَاتَّبِعُوْهُ ۚ

(ان سب کا اللہ تعالیٰ نے تم کو تاکیدی حکم دیا ہے تاکہ تم یاد رکھو (اور عمل کرو) اور یہ کہ یہ دین میرا راستہ ہے سیدھا سو اسی پر چلو۔ حمزہ نے کہا وَاِنَّ هٰذَا (سے پہلے فعل محذوف ہے) اصل میں وَاتْلُ عَلَيْكُمْ اَنَّ هٰذَا تھا اور میں تم کو سناتا ہوں کہ یہ میرا راستہ ہے۔ مُسْتَقِيْمًا، صِرَاطِيْ سے حال ہے۔ هٰذَا سے اشارہ اس مجموعہ مضامین کی طرف ہے جن کا ذکر اس سورت میں آیا ہے یعنی توحید، نبوت، انبیاء کا دین میرا راستہ اور میرا دین ہے۔

میں کہتا ہوں اَنَّ سے پہلے حرف جر بھی محذوف ہو سکتا ہے اور اس وقت اس کا عطف بِہٖ پر ہوگا۔ بیضاوی نے لام کو محذوف قرار دیا ہے کیونکہ اس کے بعد فَاتَّبِعُوْهُ آیا ہے راستہ کا مستقیم ہونا اتباع کی علت ہے۔ بعض علماء کے نزدیک هٰذَا سے اشارہ (صرف) ان مضامین کی طرف ہے جن کا ذکر ان آیات میں کیا گیا ہے۔ بغوی نے لکھا ہے یہ آیات محکم ہیں کوئی آیت ان

کی ناسخ نہیں، تمام مذاہب میں یہ امور حرام ہیں۔ یہی اصول کتاب ہیں جو ان پر چلے گا جنت میں جائے گا جو ان کو ترک کرے گا دوزخی ہو گا انتہی کلامہ۔

وَلَا تَتَّبِعُوا السُّبُلَ فَتَفَرَّقَ بِكُمْ عَنْ سَبِيلِهِ ذَٰلِكُمْ وَصَّاكُمْ بِهِ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ ۝

(اور دوسری راہوں پر مت چلو کہ وہ راہیں تم کو اللہ کی راہ سے جدا کر دیں گی اس کا تم کو اللہ تعالیٰ نے تاکیدی حکم دیا ہے تاکہ تم (اس کے خلاف کرنے سے) احتیاط رکھو)۔

یعنی اپنی اپنی من مانی مختلف راہوں پر نہ چلو ورنہ یہ خواہش پرستی کی راہیں تم کو اتباع وحی کے راستہ سے پراگندہ کر دیں گی اتباع کتاب و سنت شریعت کا تقاضا ہے۔ عقل و دانش کی رسائی وہاں تک ہو سکے یا نہ ہو سکے اور خود تراشیدہ نظریات فاسدہ کا تقاضا ہے کہ کتاب و سنت اگر خواہش پرست طبقہ کے خیالات کے مطابق ہوں تو ان کو مان لیا جائے مخالف ہوں تو نہ مانا جائے اور جہاں تک ہو سکے کتاب و سنت کی صراحتوں کی توجیہ کی جائے۔ فرقہ پرستی اور گروہ بندی کا یہی سنگ بنیاد ہے۔ رافضی، خارجی، مجسمہ، جبریہ، قدریہ اور مختلف فرقے اسی نظریہ کے زیر اثر وجود میں آئے۔ میں نے سورۂ بقرہ کی آیت كُلَّمَا أَضَاءَ لَهُمْ مَشَوْا فِيهِ وَإِذَا أَظْلَمَ عَلَيْهِمْ قَامُوا کی تفسیر کے ذیل میں یہ مسئلہ تفصیل سے لکھ دیا ہے۔ اللہ نے تم کو اتباع وحی کی نصیحت اس لئے کی ہے کہ تم گمراہی اور تفرق عن الحق سے بچ جاؤ۔

حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ہمارے سامنے ایک لکیر کھینچی اور فرمایا یہ اللہ کا راستہ ہے پھر اس لکیر سے دائیں بائیں مختلف لکیریں کھینچیں اور فرمایا یہ مختلف راستے ہیں ان میں سے ہر راستہ پر ایک شیطان بیٹھا ہے اور لوگوں کو اس راستہ کی طرف بلا رہا ہے پھر حضور نے آیت أَنَّ هَٰذَا صِرَاطِي مُسْتَقِيمًا فَاتَّبِعُوهُ الخ تلاوت فرمائی۔ رواہ احمد والنسائی والدارمی۔

حضرت عبداللہ بن عمرو کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تم میں سے کوئی بھی اس وقت تک مؤمن نہ ہو گا جب تک اس کا دلی جھکاؤ اس (دین) کا تابع نہ بن جائے جو میں لے کر آیا ہوں۔ رواہ البغوی فی شرح السنۃ۔ نووی نے اربعین میں لکھا ہے یہ حدیث صحیح ہے۔

ثُمَّ آتَيْنَا مُوسَى الْكِتَابَ　　(پھر ہم نے موسیٰؑ کو کتاب (یعنی توریت) دی)

(ایک شبہ ثم کلام عربی میں تراخی کے لئے آتا ہے یعنی ثُمَّ کے بعد والے کلام کا وقوع ثم سے پہلے والے کلام کے وقوع سے بعد کو ہوتا ہے لیکن اس جگہ ایسا نہیں حضرت موسیٰؑ کی کتاب توان مذکورہ نصائح سے بہت پہلے نازل ہو چکی تھی۔

اس شبہ کا جواب بوجوہ دیا جا سکتا ہے) آتَيْنَا کا عطف وَصَّاكُمْ بِهِ پر ہے اور ثم صرف تاخیر بیان کے لئے مستعمل ہوا ہے (واقعی تقدیم و تاخیر مقصود نہیں ہے) یعنی مذکورہ بالا نصیحت کرنے کے بعد اب ہم تم کو بتاتے ہیں کہ ہم نے موسیٰؑ کو کتاب دی تھی یا مرتبہ کے تفاوت کے لئے ہے (یعنی عموم سے خصوص کی طرف ترقی کی گئی ہے) مطلب یہ کہ مذکورہ نصائح تو اللہ نے پرانے اور نئے زمانوں میں یکساں کی ہیں پھر سب سے بڑھ کر یہ کہ اللہ نے موسیٰؑ کو کتاب دی اور اس کتاب میں کچھ مزید احکام بھی بیان کئے۔

تَمَامًا عَلَى الَّذِي أَحْسَنَ　　(جس سے اچھی طرح عمل کرنے والوں پر نعمت پوری ہو) مفسرؒ نے مطلب اس طرح بیان کیا ہے تاکہ تکمیل نعمت ہو جائے ان لوگوں پر جو سابق شریعتوں پر کاربند رہے ہوں لیکن جو شخص کہ اللہ وحدہ لاشریک پر ایمان ہی نہ لایا ہو اور گزشتہ شریعتوں کی پابندی کی ہو اس کو نہ توریت سے کچھ فائدہ ہو سکتا تھا نہ قرآن سے نہ اس پر نعمت کی تکمیل ہوئی۔ الَّذِي أَحْسَنَ سے حضرت موسیٰؑ مراد ہیں یعنی تاکہ توریت سے موسیٰؑ پر جنہوں نے گزشتہ شرائع کی بحسن و خوبی پابندی کی، نعمت کی تکمیل ہو جائے۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ الَّذِي کا اطلاق واحد اور جمع سب پر ہوتا ہے اور اس سے مراد امت موسویہ کے وہ تمام افراد ہیں جنہوں نے (ایمان کے ساتھ) نیک عمل کئے۔ حضرت ابن مسعودؓ کی قرأت الَّذِينَ

صَدَفَ خود رکتا اور دوسروں کو روکتا۔ سُوْٓءَ الْعَذَابِ شدت عذاب۔ یعنی جب اللہ کی آیات نازل ہونے کی تمنا تھی اور آیات کا اللہ کی طرف سے نازل ہونا بالکل واضح بھی ہو گیا اب اگر کوئی ان کو نہیں مانتا اور تکذیب کرتا ہے یا دوسروں کو روکتا ہے تو اس سے بڑا ناحق کوش کوئی نہیں۔

هَلْ يَنْظُرُوْنَ اِلَّآ اَنْ تَاْتِيَهُمُ الْمَلٰٓئِكَةُ اَوْ يَاْتِيَ رَبُّكَ اَوْ يَاْتِيَ بَعْضُ اٰيٰتِ رَبِّكَ

یہ لوگ صرف اس امر کے منتظر ہیں کہ ان کے پاس فرشتے آجائیں یا آپ کا رب آجائے یا آپ کے رب کی کوئی بڑی نشانی آجائے۔ هَلْ يَنْظُرُوْنَ میں استفہام انکاری ہے یعنی اہل مکہ قرآن پر ایمان لانے کے لئے بس اس بات کے منتظر ہیں کہ الخ۔ اَلْمَلٰٓئِكَةُ سے موت کے یا عذاب کے فرشتے مراد ہیں یا وہ ملائکہ مراد ہیں جو روبرو آکر رسول اللہ کی صداقت اور قرآن مجید کی حقانیت کی شہادت دیں۔ خلاصہ مطلب یہ ہے کہ جس چیز کی اہل مکہ آرزو مند تھے وہ آگئی لیکن وہ ایمان نہ لائے تو شاید ایمان لانے کے لئے وہ ملائکہ کے آنے کے منتظر ہیں حالانکہ فرشتوں کے آنے کے بعد کوئی ایمان مفید نہ ہوگا۔ بیضاوی نے اس آیت کی تشریح میں لکھا ہے کہ (حقیقت میں وہ لوگ منتظر نہیں تھے بلکہ) ان کی حالت منتظر کی سی حالت تھی اس لئے بطور تشبیہ يَنْظُرُوْنَ فرمایا۔ یہ بھی ممکن ہے کہ ملائکہ کے آنے سے مراد ہو قیامت کے دن میدان حشر میں فرشتوں کا آسمان سے اترنا، اس کی تائید یاتی ربک کے فقرہ سے ہو رہی ہے۔ قیامت کے دن میدان حشر میں مخلوق کا فیصلہ کرنے کے لئے اللہ رونق افروز ہوگا۔ جس کی رونق افروزی بے کیفیت ہوگی۔ اسی کی مثل سورۂ بقرہ میں آیت هَلْ يَنْظُرُوْنَ اِلَّآ اَنْ يَّاْتِيَهُمُ اللّٰهُ فِيْ ظُلَلٍ مِّنَ الْغَمَامِ وَالْمَلٰٓئِكَةُ وَقُضِيَ الْاَمْرُ گزر چکی ہے اور اس کی تفسیر میں سلف خلف کا جو اختلاف تھا وہ وہاں ذکر کر دیا گیا ہے۔ فمن شاء فلیرجع۔

ایٰتِ ربک سے مراد ہیں خصوصی علامات قیامت۔ بغوی نے لکھا ہے اس سے مراد ہے آفتاب کا پچھم کی طرف سے نکلنا اکثر اہل تفسیر کا یہی قول ہے حضرت ابو سعید خدری کی مرفوع روایت بھی اسی طرح کی آئی ہے[1]

فصل :- "علامات قیامت" حضرت حذیفہؓ بن اسید غفاری کا بیان ہے کہ ہم قیامت کے متعلق باہم گفتگو میں مشغول تھے کہ رسول اللہ ﷺ برآمد ہوئے اور فرمایا جب تک قیامت سے پہلے تم دس نشانیاں نہیں دیکھ لوگے قیامت نہیں آئے گی۔ پھر آپ نے (مندرجہ ذیل امور کا) ذکر فرمایا دھواں، دجال، دابۃ الارض، مغرب سے سورج کا طلوع، عیسیٰ بن مریم کا اترنا، یاجوج ماجوج کا خروج، تین مرتبہ زمین کا دھنسنا ایک بار مشرق میں ایک بار مغرب میں ایک بار جزیرۂ عرب میں آخر میں یمن سے ایک آگ نکلنا جو لوگوں کو میدان حشر کی طرف کھدیڑ کر لے جائے گی۔ دوسری روایت میں ہے کہ قعر عدن سے ایک آگ برآمد ہوگی جو لوگوں کو میدان حشر کی طرف ہنکا کر لے جائے گی۔ ایک اور روایت میں آیا ہے کہ دسویں چیز ایک ہوائی طوفان ہوگا جو لوگوں کو سمندر میں پھینک دے گا۔ رواہ مسلم۔

حضرت عبداللہ بن عمرو کا بیان ہے میں نے خود سنا رسول اللہ ﷺ فرما رہے تھے سب سے پہلی نشانی مغرب سے طلوع آفتاب اور دن چڑھے دابۃ الارض کا خروج ہوگا ان دونوں علامتوں میں سے جو بھی پہلے ہو جائے گی فوراً اس کے پیچھے دوسری علامت بھی آجائے گی۔ رواہ مسلم۔ حضرت نواس بن سمعان کا بیان ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے دجال کا ذکر کیا اور فرمایا اگر میری موجودگی میں وہ برآمد ہو گیا تو میں تمہاری طرف سے اس سے نمٹ لوں گا اور اگر میں نہ ہوا اور وہ نکلا تو اس وقت ہر شخص اپنا دفاع کرے اور مسلمان کا میرے بعد (براہ راست) اللہ نگہبان ہے۔ دجال جوان زلف دار موٹی ہوگا۔ جس کی ایک آنکھ باہر کو ابھری ہوئی

---

[1] حضرت ابن عباسؓ کا بیان ہے کہ ایک بار حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے خطبہ میں فرمایا لوگو! اس امت میں عنقریب کچھ ایسے لوگ ہوں گے جو رجم کا انکار کریں گے خروج دجال کی تکذیب کریں گے پچھم کی طرف سے آفتاب کے طلوع (کی اطلاع) کو جھوٹا قرار دیں گے، عذاب قبر کی بھی تکذیب کریں گے اور شفاعت کے بھی قائل نہ ہوں گے اور اس بات کو بھی نہیں مانیں گے کہ دوزخ سے کچھ لوگوں کو جلنے کے بعد نکالا جائے گا۔

یعنی پھولی ہوئی ہو گی گویا عبدالعزیٰ بن قطن سے میں اس کو تشبیہ دے سکتا ہوں۔ اگر تم میں سے کوئی اس کو پالے تو سورۂ کہف کی ابتدائی آیات اس پر پڑھے وہ آیات وہیں کے فتنہ سے پڑھنے والے کے لئے بچاؤ ہو جائیں گی۔ دجال شام و عراق کے درمیان خلہ میں برآمد ہو گا۔ دائیں بائیں تباہی مچائے گا۔ اللہ کے بندو تم (ایمان پر) جمے رہنا۔ ہم نے عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ اس کا قیام زمین پر کتنی مدت ہو گا فرمایا چالیس روز اس میں ایک دن ایک سال کے برابر ایک دن ایک ماہ کے برابر ایک دن ایک ہفتہ کے برابر اور باقی دن تمہارے انہی دنوں کی طرح ہوں گے ہم نے عرض کیا جو دن ایک سال کے برابر ہو گا کیا اس میں ایک دن کی نمازیں ہوں گی فرمایا نہیں اس کا اندازہ کر لینا۔ ہم نے عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ وہ زمین میں کتنی تیز رفتار سے چلے گا فرمایا جیسے ہوا اپنے پیچھے بدلی لاتی ہے بعض لوگوں کی طرف سے جب اس کا گزر ہو گا تو وہ اس پر ایمان لے آئیں گے اس پر آسمان اس کے حکم سے ان پر مینہ برسائے گا اور زمین سبزہ پیدا کر دے گی ان کے مویشی شام کو جنگل سے واپس آئیں گے تو ان کے تھن (دودھ سے) خوب بھرپور اور کوکھیں پھولی ہوں گی (یعنی موٹے ہو جائیں گے) پھر کچھ اور لوگوں کی طرف سے گزرے گا اور ان کو دعوت دے گا مگر وہ دجال کی دعوت کو رد کر دیں گے جب دجال ان کے پاس سے واپس ہو گا تو وہ سب کال میں مبتلا ہو چکے ہوں گے مال بالکل ختم ہو چکا ہو گا ان کے پاس کچھ نہ ہو گا دجال ویرانے کی طرف سے گزرے گا وہ اپنے دفینے باہر نکال دے گا فوراً سارے خزانے اس کے پیچھے ہو لیں گے جیسے شہد کی مکھیاں یعسوب کے پیچھے ہوتی ہیں۔ پھر دجال ایک شخص کو بلائے گا جو جوانی سے بھرپور ہو گا تلوار سے اس کے دو ٹکڑے کر کے (الگ الگ) بقدر نشانہ تیر پھینک دے گا پھر اس کو بلائے گا تو وہ شگفتہ رو ہنستا ہوا سامنے سے آجائے گا۔ دجال اپنی اسی حالت میں ہو گا کہ اللہ مسیح بن مریم کو بھیج دے گا مسیح دمشق کے شرقی جانب سفید منارہ کے پاس دو فرشتوں کے بازوؤں پر دونوں ہاتھوں کا سہارا دیئے اتریں گے سر جھکائیں گے تو چاندی کے موتیوں کی طرح (پسینہ کے) قطرے ٹپکیں گے اور سر اٹھائیں گے تب بھی موتیوں کی طرح (چہرے سے) قطرے بہیں گے۔ جس کافر کو ان کے سانس کی ہوا پہنچے گی وہ مر جائے گا اور ان کے سانس کی رسائی وہاں تک ہو گی جہاں تک نظر کی پہنچ ہو گی مسیح دجال کو ڈھونڈیں گے اور باب لد کے پاس اس کو پا کر قتل کر دیں گے۔ پھر عیسیٰ کے پاس کچھ لوگ آئیں گے جن کو اللہ نے دجال سے محفوظ رکھا ہو گا عیسیٰ ان کے چہروں سے غبار صاف کریں گے اور جنت میں (ملنے والے) ان کے مراتب بیان کریں گے۔

اس کے بعد اللہ عیسیٰ کے پاس وحی بھیجے گا کہ اب میں نے اپنے کچھ بندے ایسے پیدا کر دیئے ہیں جن سے لڑنے کی کسی میں طاقت نہیں تم میرے ان بندوں کو سمیٹ کر طور کی طرف لے جاؤ اس کے بعد اللہ یاجوج ماجوج کو بھیج دے گا جو ہر ٹیلہ کے پیچھے سے پھیلتے جائیں گے (ان کی تعداد اتنی ہو گی کہ) ان کا اگلا گروہ جب بحیرہ طبریہ پر گزرے گا تو سب پانی پی جائے گا اور آخری لوگ جب وہاں سے گزریں گے تو کہیں گے یہاں کبھی پانی تھا یاجوج ماجوج چلتے پھرتے جب کوہ خمر یعنی کوہ بیت المقدس تک آئیں گے تو کہیں گے ہم نے زمین کے باشندوں کو تو قتل کر دیا اب ہم آسمان والوں کو قتل کرنا چاہتے ہیں چنانچہ وہ اپنے چھوٹے تیر آسمان کی طرف پھینکیں گے اور اللہ ان کے تیروں کو خون سے رنگین کر کے واپس کر دے گا (تو وہ بہت خوش ہوں گے) اللہ کا نبی اور اس کے ساتھی (اس پوری مدت میں کوہ طور پر) محصور رہیں گے یہاں تک کہ ایک بیل کی سری ان کے لئے اس سے زیادہ بہتر ہو گی جتنے آج کل سو دینار تمہارے لئے اس کے بعد اللہ کے نبی عیسیٰ اور ان کے ساتھی دعا کریں گے تو اللہ یاجوج ماجوج کی گردنوں میں گلٹیاں پیدا کر دے گا جن کی وجہ سے سب کے سب ایک آدمی کی طرح صبح کو مر جائیں گے پھر عیسیٰ نبی اللہ اور ان کے ساتھی نیچے اتر کر آئیں گے لیکن زمین پر بالشت بھر جگہ ان کو ایسی نہیں ملے گی جو سڑاند اور تعفن سے بھری نہ ہو عیسیٰ نبی اللہ اور ان کے ساتھی اللہ سے دعا کریں گے تو اللہ کچھ پرندوں کو بھیج دے گا جو بختی اونٹوں کی گردنوں کی طرح (لمبے لمبے) ہوں گے یہ پرندے ان کو اٹھا کر لے جائیں گے اور جہاں اللہ کی مرضی ہو گی پھینک دیں گے۔ ایک روایت میں آیا ہے کہ اللہ ان کو نہبل میں پھینک دے گا[1] اور مسلمان یاجوج ماجوج کی کمانوں تیروں اور تیردانوں کو سات برس تک ایندھن کے طور پر استعمال

[1] صاحب قاموس نے لکھا ہے کہ ترمذی میں حدیث دجال میں نہبل کا لفظ آیا ہے مگر یہ غلط ہے صحیح میم کے ساتھ ہے۔

کریں گے پھر اللہ بارش کر دے گا جو ساری زمین کو دھو کر باغ کی طرح کر دے گا۔ کسی کچے مکان یا ڈیرے کی چھت تک کو نہیں رہنے گی اس کے بعد زمین کو حکم ہو گا اپنی سبزی اگا اور پیداوار کو لوٹا کر دیدے چنانچہ اس زمانہ میں ایک انار ایک جماعت کے لئے کافی ہو گا اور انار کے چھلکے سے لوگ سائبان بنا لیں گے دودھ میں برکت ہو جائے گی دودھ دینے والی ایک اونٹنی ایک بڑے گروہ کے لئے دودھ دینے والی ایک گائے ایک قبیلہ کے لئے اور دودھ دینے والی ایک بکری قبیلہ کے ایک خاندان کے لئے کافی ہو گی اسی حالت میں اللہ ایک خوشگوار ہوا بھیجے گا جو لوگوں کی بغلوں کے نیچے لگے گی اور ہر مومن و مسلم کی روح قبض ہو جائے گی صرف شریر لوگ باقی رہ جائیں گے جو کھلے فساد اور گڑبڑ کریں گے جیسے گدھے آپس میں کرتے ہیں انہی پر قیامت بپا ہو گی رواہ مسلم مسلم کی روایت میں ثم یطرحھم بالنھبل سے سبع سنین تک نہیں ہے اور ترمذی کی روایت میں یہ بھی مذکور ہے۔

حضرت حذیفہؓ راوی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا دجال خروج کرے گا اس کے ساتھ پانی بھی ہو گا اور آگ بھی لوگ جس کو پانی خیال کریں گے وہ آتش سوزاں ہو گی اور جس کو آگ سمجھیں گے وہ ٹھنڈا میٹھا پانی ہو گا تم لوگوں میں جو شخص اس کو پائے تو جس کو آگ سمجھتا ہو اسی میں پڑ جائے وہ حقیقت میں شیریں پاکیزہ پانی ہو گا (متفق علیہ) مسلم کی روایت میں اتنا زائد ہے کہ دجال کی ایک آنکھ پٹ ہو گی ایک موٹا ناخونہ اس پر چڑھا ہو گا اس کی دونوں آنکھوں کے درمیان لفظ کافر لکھا ہو گا جس کو ہر مومن پڑھ سکے گا لکھنے والا ہو یا لکھنے والا نہ ہو۔

صحیحین میں حضرت ابوہریرہؓ کی روایت سے آیا ہے کہ دجال کے ساتھ جنت و دوزخ کی شبیہ (یعنی راحت و دکھ کی چیزیں) ہوں گی جس کو وہ جنت کہے گا وہ دوزخ ہو گی۔ حضرت حذیفہؓ کی روایت سے مسلم نے بھی ایسا ہی لکھا ہے۔ مسلم نے حضرت ابوسعیدؓ کی روایت سے لکھا ہے کہ اس کو یعنی دجال کو جب مومن دیکھے گا تو کہے گا لوگو! یہ وہی دجال ہے جس کا ذکر رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تھا دجال کے حکم سے اس کو سر کی مانگ سے نیچے تک آرے سے چیر کر دونوں ٹانگیں الگ الگ کر دی جائیں گی، پھر دجال دونوں ٹکڑوں کے درمیان جا کر کہے گا اٹھ جا، مومن زندہ ہو کر سیدھا کھڑا ہو جائے گا۔ دجال اس سے کہے گا کیا (اب) تجھے میرا یقین ہوا مومن کہے گا تیرے اس فعل سے تو میری بصیرت اور بڑھ گئی (یقیناً تو دجال ہے)۔ الحدیث۔

امام احمدؒ نے حضرت اسماء بنت یزیدؓ کی روایت سے ذکر کیا ہے کہ دجال کے شدید ترین فتنوں میں سے ایک فتنہ یہ ہو گا کہ دجال ایک اعرابی سے دعویٰ کرے گا کہ میں تیرے اونٹ زندہ کر دوں تو کیا تو جب بھی مجھے رب نہ جانے گا اعرابی کہے گا ضرور، فوراً شیطان اس کے اونٹوں کے بھیس میں اس کے سامنے آ جائے گا ان کے لمبے لمبے خوبصورت تھن اور اونچے اونچے کوہان ہوں گے ایک شخص کا بھائی اور باپ مر چکا ہو گا دجال اس سے کہے گا اگر میں تیرے باپ اور بھائی کو زندہ کر دوں تو کیا تو مجھے اپنا رب تسلیم کر لے گا۔ وہ شخص کہے گا بے شک ہاں فوراً شیطان اس کے باپ اور بھائی کی شکل میں نمودار ہو جائے گا۔ الحدیث

فصل :- (امام) مہدی کا ظہور مذکورہ بالا نشانیوں سے پہلے ہو گا حضرت ابن مسعودؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اگر دنیا کی عمر کا صرف ایک دن رہ جائے گا تب بھی اللہ اس دن کو اتنا لمبا کر دے گا کہ ایک شخص کو مبعوث فرما دے جو مجھ سے ہو گا یا فرمایا وہ میرے اہل بیت میں سے ہو گا اس کا نام میرے نام کے اور اس کے باپ کا نام میرے باپ کے نام کے موافق ہو گا (یعنی وہ بھی محمد بن عبداللہ ہو گا) جس طرح (اس زمانہ میں) زمین ظلم اور ناانصافی سے بھری ہو گی وہ اسی طرح زمین کو انصاف اور عدل سے بھر دے گا ترمذی کی روایت کے الفاظ یہ ہیں دنیا ختم نہ ہو گی جب تک عرب کا مالک ایک ایسا شخص نہ ہو جائے گا جو میرے اہل بیت میں سے ہو گا اور اس کا نام میرا نام ہو گا۔

حضرت ام سلمہؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ایک خلیفہ کے مرنے پر لوگوں میں اختلاف ہو جائے گا تو اہل مدینہ میں سے ایک شخص بھاگ کر مکہ کو چلا جائے گا وہاں مکہ والے اس کو (گھر کے اندر سے) نکال کر باہر لائیں گے وہ پسند نہ کرے گا مگر اس کی ناگواری کے باوجود رکن اور مقام ابراہیمؑ کے درمیان اس کی بیعت کریں گے۔ اس کے پاس ایک فوج شام سے بھیجا جائے گا مکہ اور مدینہ کے درمیان بیداء میں اللہ اس کو زمین کے اندر دھنسا دے گا لوگ جب یہ حالت دیکھیں گے تو پھر

جن کے پاس شام کے ابدال اور اہل عراق کی جماعتیں آئیں گی اور اس کی بیعت کریں گے۔ یہ شخص نبی کی سنت پر عمل کرے گا اور اسلام اپنا سینہ زمین پر ٹکا دے گا (یعنی ساری زمین پر اسلام چھا جائے گا) سات برس تک یہ شخص رہے گا پھر اس کی وفات ہو جائے گی اور مسلمان اس کی نماز جنازہ پڑھیں گے۔ رواہ ابوداؤد۔

ابوداؤد کی روایت ہے کہ حضرت علیؓ نے اپنے صاحبزادے (امام) حسنؓ کی طرف دیکھ کر فرمایا میرا یہ بیٹا سید ہے جیسا کہ رسول اللہ ﷺ نے سید (کے لفظ) کے ساتھ اس کو نامزد فرمایا تھا اس کی پشت سے ایک آدمی پیدا ہوگا تمہارے نبی کا نام اس کا نام ہوگا اور خو خصلت میں تمہارے نبی کے مشابہ ہوگا اگرچہ جسمانی بناوٹ میں آپ کے مشابہ نہ ہوگا وہ زمین کو انصاف سے بھر دے گا۔

حضرت ابوسعید خدریؓ کا بیان مہدی کے قصہ کے سلسلہ میں آیا ہے پھر ایک شخص آکر مہدی سے کہے گا مہدی مجھے کچھ دیجئے مجھ کو عنایت کیجئے مہدی لپوں سے بھر کر (یعنی دونوں ہاتھوں سے بھر کر) اس کے کپڑے میں ڈال دیں گے جتنا وہ اٹھا سکتا ہوگا۔ (رواہ الترمذی) حاکم نے مستدرک میں لکھا ہے آسمان کے رہنے والے اور زمین کے رہنے والے اس سے راضی ہوں گے آسمان سے خوب موسلادھار بارشیں ہوں گی اور زمین اپنے اندر کی ہر سبزی باہر نکال دے گی یہاں تک کہ زندے مردوں کی تمنا کریں گے (کہ کاش وہ بھی زندہ ہوتے اور یہ فراوانی دیکھتے) مہدی اس حالت میں سات یا آٹھ یا نو سال رہیں گے (پھر آپ کی وفات ہو جائے گی)۔

يَوْمَ يَأْتِي بَعْضُ آيَاتِ رَبِّكَ لَا يَنْفَعُ نَفْسًا إِيمَانُهَا لَمْ تَكُنْ آمَنَتْ مِنْ قَبْلُ أَوْ كَسَبَتْ فِي إِيمَانِهَا خَيْرًا ۗ

(جس روز آپ کے رب کی بڑی نشانی آپہنچے گی کسی ایسے شخص کا ایمان اس کے کام نہ آئے گا جو پہلے سے ایمان نہیں رکھتا یا اس نے اپنے ایمان میں کوئی نیک عمل نہ کیا ہو) مثلاً جو شخص مرد ہو اور یقینی موت نظر کے سامنے آگئی ہو تو اس حالت میں ایمان غیر مفید ہے کیونکہ ایمان بالغیب واجب ہے (مشاہدہ موت اور معاینہ ملائکہ موت کی حالت میں ایمان بالغیب نہیں رہتا)۔

لَمْ تَكُنْ آمَنَتْ نَفْسًا کی صفت ہے اور كَسَبَتْ کا عطف آمَنَتْ پر ہے (یعنی كَسَبَتْ بھی نفی کے تحت ہے)

بعض علماء قائل ہیں کہ صرف ایمان جو عمل سے بالکل خالی ہو غیر مفید اور ناقابل اعتبار ہے کیونکہ اس آیت کا معنی یہ ہے کہ جو شخص پہلے سے ایمان نہ لایا ہو مرنے کے وقت اس کا ایمان فائدہ بخش نہیں یا ایمان تو پہلے سے لا چکا ہو مگر اس نے ایمان کے مطابق کوئی عمل نہ کیا ہو اس کا ایمان بھی غیر مفید ہے۔

ہم کہتے ہیں کہ آیت کا مفہوم یہ نہیں کہ ایمان کی حالت میں اور مؤمن ہونے کے بعد اگر کسی نے کوئی نیکی نہ کی تو اس کا ایمان بالکل غیر مفید ہے بلکہ مراد یہ ہے کہ صرف اس روز اس کا وہ سابقہ ایمان جو عمل صالح سے خالی ہو کارآمد نہ ہوگا۔ یوں بھی جواب دیا جا سکتا ہے کہ اگر دو امور مذکور ہوں اور نکرہ ہوں اور ایک نفی کے دائرہ میں داخل ہو تو نفی کا ورود دوسرے پر بھی قرار دیا جاتا ہے جیسے آیت وَلَا تُطِعْ مِنْهُمْ آثِمًا أَوْ كَفُورًا میں آثما اور کفورا دونوں کی اطاعت کی ممانعت کی گئی ہے آثما لا کے تحت ہے اور کفورا او کے بعد آیا ہے مگر ممانعت اطاعت کا تعلق دونوں سے ہے پس اس صورت میں آیت کا معنی یہ ہوگا کہ جو شخص ایمان نہ لایا ہو اس کو بھی موت کے وقت ایمان لانا مفید نہ ہوگا اور جس نے نیکی نہ کی ہو اس کو بھی مرنے کے وقت ایمان لانے سے فائدہ نہ ہو۔ بغویؒ نے لکھا ہے آیت کا معنی یہ ہے کہ ایسے وقت میں نہ کافر کا ایمان مقبول ہے نہ فاسق کی توبہ۔

اس قول پر فِي إِيمَانِهَا میں ایمان سے بطور عموم مجاز توبہ مراد ہوگی کیونکہ لفظ توبہ دونوں قسموں کو حاوی ہے، کفر سے توبہ، گناہوں سے توبہ۔ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا اللہ نے مغرب میں توبہ کا ایک دروازہ بنایا ہے جس کی چوڑائی ستر سال کے راستے کے برابر ہے جب تک سورج کا طلوع اس طرف سے نہ ہوگا وہ دروازہ بند نہیں کیا جائے گا یہی مراد ہے اللہ کے اس فرمان کی يَوْمَ يَأْتِي بَعْضُ آيَاتِ رَبِّكَ لَا يَنْفَعُ نَفْسًا إِيمَانُهَا لَمْ تَكُنْ آمَنَتْ مِنْ قَبْلُ (یعنی آیت میں بعض آیات سے مغرب سے آفتاب کا طلوع مراد ہے) رواہ الترمذی و ابن ماجۃ من حدیث صفوان بن عسال۔ مسلم نے حضرت ابو موسیٰ اشعری

کی روایت سے لکھا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اللہ (قبول توبہ کے لئے) رات میں اپنا ہاتھ پھیلاتا ہے تاکہ دن کا گناہ گار (رات کو) توبہ کر لے اور دن میں ہاتھ پھیلاتا ہے تاکہ رات کا گناہ گار (دن کو) توبہ کر لے یہ سلسلہ اس وقت تک رہے گا جب آفتاب پچھم کی طرف سے نکلے گا۔ حضرت ابوہریرہؓ کی روایت سے مسلم نے لکھا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جس نے مغرب کی طرف سے سورج نکلنے سے پہلے توبہ کر لی اللہ اس کی توبہ قبول فرمالے گا۔ احمد، دارمی اور ابوداؤد نے حضرت معاویہؓ کی روایت سے لکھا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہجرت منقطع نہ ہوگی جب تک توبہ بند نہ ہو جائے اور توبہ بند نہ ہوگی جب تک سورج مغرب کی طرف سے برآمد نہ ہو جائے۔

ان تمام احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ آیت لَا يَنْفَعُ نَفْسًا اِيْمَانُهَا میں ایمان سے مراد توبہ ہے لیکن کچھ احادیث میں ایمان سے توبہ کے علاوہ دوسرا معنی بھی مراد لیا گیا ہے۔ بغوی نے اپنی سند سے حضرت ابوہریرہؓ کی روایت سے بیان کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا قیامت بپا نہ ہوگی جب تک سورج مغرب کی طرف سے برآمد نہ ہو جائے جب سورج (مغرب سے) نکل آئے گا اور لوگ اس کو دیکھ لیں گے تو سب کے سب ایمان لے آئیں گے لیکن جو پہلے سے ایمان نہ لایا ہوگا یا ایمان کی حالت میں اس نے کوئی نیکی نہ کی ہوگی اس وقت اس کا ایمان لانا مفید نہ ہوگا۔ مسلم نے حضرت ابوہریرہؓ کی روایت سے لکھا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تین امور ہیں جب وہ ظاہر ہو جائیں گے تو جو پہلے سے ایمان نہ لایا ہوگا یا ایمان کی حالت میں اس نے کوئی نیکی نہ کی ہوگی اس وقت اس کا ایمان مفید نہ ہوگا۔ دجال، دابۃ الارض اور آفتاب کا مغرب سے طلوع۔

ان احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ آیت لَا يَنْفَعُ نَفْسًا اِيْمَانُهَا میں ایمان سے مراد یہ ہے کہ جو شخص اس وقت سے پہلے مومن نہ ہو گیا ہو اس وقت اس کا ایمان لانا معتبر نہ ہوگا۔

فائدہ:- اس آیت سے بظاہر صرف اتنا معلوم ہوتا ہے کہ جو شخص بعض آیات کے ظہور سے پہلے کافر ہو ایمان نہ لایا ہو اور اس وقت ایمان لائے تو اس کا ایمان قبول نہ ہوگا لیکن جس شخص کی پیدائش ہی بعض آیات کے ظہور کے بعد ہوئی یا علامات کے نمودار ہونے کے بعد وہ عاقل بالغ ہوا اور اس کے بعد ایمان لایا تو ظاہر ہے کہ اس کا ایمان معتبر ہوگا۔ ابن جوزی نے کتاب الوفاء میں حضرت ابن عمرؓ کی روایت سے لکھا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا عیسیٰ بن مریمؑ زمین پر اتریں گے نکاح کریں گے ان کی اولاد ہوگی اور ۴۵ برس (زندہ) رہیں گے پھر مر جائیں گے اور میرے ساتھ میری قبر میں دفن کئے جائیں گے میں اور عیسیٰ بن مریم ایک قبر سے ابوبکرؓ و عمرؓ کے درمیان اٹھیں گے۔

قُلِ انْتَظِرُوْٓا اِنَّا مُنْتَظِرُوْنَ ﴿۱۵۸﴾ (آپ کہہ دیجئے (اے مکہ والو) تم انتظار رکھو ہم بھی بلاشبہ منتظر ہیں کہ یہ اہل مکہ کو عذاب کی دھمکی ہے یعنی اس وقت ہم کو کامیابی حاصل ہوگی اور تم عذاب میں مبتلا ہو گے۔

اِنَّ الَّذِيْنَ فَرَّقُوْا دِيْنَهُمْ (بلاشبہ جنہوں نے اپنے دین کو جدا جدا کر دیا)۔

یعنی دین کے بعض حصوں پر ایمان لائے اور بعض کا انکار کر دیا یہ مطلب کہ مختلف فرقے بن گئے۔ مجاہد، قتادہ اور سدی نے کہا اس سے یہودی اور عیسائی مراد ہیں کچھ لوگ یہودی بن گئے اور کچھ عیسائی حالانکہ دین (سب کا) ایک ہی تھا۔ یہ قول غلط ہے کیونکہ یہودیت کی بنا حضرت موسیٰؑ کی نبوت و شریعت پر ہے اور نصرانیت کی بنا حضرت عیسیٰؑ کی بعثت پر ہے دونوں کے دینی اصول ایک ہی تھے یعنی حضرت ابراہیم کے دین کے اصول ہی دونوں کے اصول تھے۔ پھر یہودیوں نے حضرت عیسیٰؑ کی نبوت کا چونکہ انکار کر دیا اس لئے اور عیسائیوں نے حضور اکرم محمد رسول اللہ ﷺ کی رسالت کو نہیں مانا اس لئے وہ بھی کافر ہو گئے۔ مگر آیت کا مطلب یہ نہیں ہے بلکہ مراد یہ ہے کہ انہوں نے اصلی دین حق کے ساتھ اپنی من پسند چیزوں کو شامل کر لیا خواہ شیطانی اغواء سے یا اپنی نفسانی خواہشات کے دباؤ سے بہرحال دین میں خلط ملط کر کے اپنے اپنے گروہ بنا لئے۔ اس مطلب پر تفریق دین کرنے والوں سے مراد صرف گزشتہ فرقے نہ ہوں گے بلکہ مختلف ہوں یا اسلام میں اہل بدعت کو شامل کرنے والے سب ہی کو یہ لفظ شامل ہوگا۔ حضرت عبداللہ بن عمرؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا میری امت پر بھی قدم بقدم ویسے ہی واقعات

آ جائیں گے جو بنی اسرائیل پر آئے یہاں تک کہ اگر بنی اسرائیل بہتر فرقوں میں بٹ گئے اور میری امت کے پھٹ کر تہتر فرقے ہو جائیں گے، جن میں سے سوائے ایک کے سب دوزخی ہوں گے۔ صحابہؓ نے عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ وہ کون سا فرقہ ہوگا فرمایا (وہ فرقہ وہ ہوگا جو) اسی طریقہ پر ہوگا جس پر میں اور میرے ساتھی ہیں رواہ الترمذی۔ احمد اور ابوداؤد نے حضرت معاویہؓ کی روایت سے بیان کیا ہے بہتر (فرقے) دوزخ میں اور ایک جنت میں جائے گا اور وہ (جنتی فرقہ) جمہور کا ہوگا عنقریب میری امت میں کچھ ایسے لوگ پیدا ہو جائیں گے جن کے اندر نفسانی خواہشات اس طرح نفوذ کریں گی جس طرح کتا اپنے مالک کے ساتھ ہر کوچے اور موڑ میں گھستا پھرتا ہے ابوداؤد، ترمذی، ابن ماجہ، ابن حبان اور حاکم رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت ابوہریرہؓ کی روایت سے بیان کیا ہے اور ترمذی و حاکم نے اس کو صحیح بھی کہا ہے کہ یہود کے اکہتر فرقے ہو گئے جن میں سے ایک کے سوا سب گڑھے (دوزخ) میں جائیں گے اور عیسائیوں کے بہتر فرقے ہو گئے جن میں سے ایک کے سوا سب گڑھے (دوزخ) میں جائیں گے۔ بغویؒ نے حضرت عمر بن خطاب کی روایت سے لکھا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے حضرت عائشہؓ سے فرمایا عائشہؓ جن لوگوں نے دین کو پارہ پارہ کیا اور گروہ گروہ بن گئے وہ اس امت میں بدعتی ہوا پرست ہیں (یعنی اس امت میں جو بدعتی اور اصحاب الہویٰ ہیں وہ اس آیت کے ذیل میں آتے ہیں) اخرجہ الطبرانی وغیرہ بسند جید۔ طبرانی نے حضرت ابوہریرہؓ کی روایت سے بھی عمدہ سند کے ساتھ ایسی ہی حدیث نقل کی ہے۔ احمد، ابوداؤد، ترمذی اور ابن ماجہ نے حضرت عرباض بن ساریہؓ کا بیان نقل کیا ہے کہ ایک روز رسول اللہ ﷺ نے ہم کو نماز پڑھائی نماز کے بعد ہماری طرف رخ کر کے ایسا بلیغ وعظ فرمایا جس کو سن کر دل ڈر گئے اور آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے ارشاد فرمایا میں تم کو اللہ سے ڈرتے رہنے کی نصیحت کرتا ہوں اور اس بات کی کہ (امیر کی) اطاعت کرنا خواہ وہ حبشی غلام ہی ہو میرے بعد تم میں سے جو شخص زندہ رہے گا وہ (مسلمانوں میں) بڑا اختلاف دیکھے گا مگر تم میرے طریقہ اور ان خلفاء راشدین کے طریقہ پر جو ہدایت کار اور ہدایت یافتہ ہوں گے جمے رہنا اس پر مضبوط گرفت رکھنا اور اس کو دانتوں سے پکڑے رہنا اور نئی باتوں سے بچتے رہنا کیونکہ (دین کے اندر پیدا کی ہوئی) ہر نئی بات بدعت ہے اور ہر بدعت گمراہی ہے، ترمذی اور ابن ماجہ کی روایت میں نماز پڑھانے کا ذکر نہیں ہے باقی حدیث موجود ہے۔ صاحب مصابیح نے حضرت ابن عمرؓ کی روایت سے ذکر کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا عظمت والے گروہ کی پیروی کرو جو (اس سے) چھڑا چھٹ کر دوزخ میں گیا۔ ابن ماجہ نے یہ حدیث حضرت انسؓ کی روایت سے لکھی ہے، ترمذی نے حضرت ابن عمرؓ کی روایت سے لکھا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا میری امت گمراہی پر متفق نہ ہوگی۔ جمہور پر اللہ کا ہاتھ ہے جو (جمہور سے) چھڑا وہ چھٹ کر دوزخ میں گیا۔

حضرت معاذ بن جبلؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا گھاٹیوں سے (یا مختلف ٹولیوں سے) پرہیز رکھو اور جماعت و جمہور کو اختیار کرو۔ حضرت ابوذرؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جو بالشت بھر جماعت سے علیحدہ ہوا اس نے اسلام کی رسی اپنے گلے سے نکال دی۔ رواہ احمد و ابوداؤد۔ جماعت سے مراد ہے صوفیہ اور صحابہؓ کے پیچھے چلنے والوں کی جماعت۔

اللہ نے رسول اللہ ﷺ کو اپنی کتاب دے کر مبعوث فرمایا اور کتاب کے ساتھ ہی اور علم بھی وحی کے ذریعہ سے عنایت کیا لیکن اس وحی کے الفاظ اللہ کے نہ تھے معانی کی تعلیم اللہ کی طرف سے تھی (اور الفاظ حضرت جبرئیل کے یا رسول اللہ کے تھے اسی وحی کو غیر متلو یا غیر منطوق وحی کہتے ہیں) کتاب کے اندر کچھ عبارت اور کلمات تو محکم تھے جن کی مراد (سمجھنے) میں کوئی شبہ نہ تھا کچھ نص الظاہر اور عبارت بھی تھی کچھ مشکل یا مجمل یا متشابہ آیات تھیں مگر ان سب کے مقصد کی وضاحت اللہ نے اپنے پیغمبر کے لئے کر دی خود ہی فرما دیا ثُمَّ اِنَّ عَلَیْنَا بَیَانَهٗ پھر رسول اللہ ﷺ نے اپنے صحابہؓ کو اور صحابہؓ نے اپنے شاگردوں کو اس کی تعلیم دی اور یہی عمل رہا۔ تعلیم و تعلم کا سلسلہ ہم تک پہنچا۔ اللہ کی کتاب اس کے رسول کی سنت اور صحابہؓ و تابعین کے اجماعی اقوال کو ماننا اور ان پر چلنا ہمارے لئے لازم ہے اور جو آیات و احادیث ایسی ہیں جن کی مراد ظاہر نہیں ہے ان کی تشریح کی مراد کو قرار دینا ضروری ہے جو صحابہؓ نے اختیار کی ہو۔ جو لوگ پرستاران نفس ہیں وہ دنیا داروں اور خواہش کے پیچھے چلتے ہیں قرآن کا جو حصہ ان کی رائے کے مطابق ہوتا ہے اس کو لے لیتے ہیں اور مانتے ہیں اور جس حصہ کو ان کی خواہش رد کرنے سے مراد ہوتا ہے اس کا انکار

کر دیتے ہیں (یعنی اپنی رائے کے مطابق بنانے کے لئے اس کی تاویلیں کرتے اور رسول و صحابہ کی تفسیر سے موڑ دیتے ہیں) چنانچہ آخرت میں اللہ کے دیدار کا عذاب قبر کا وزن اعمال کا پل صراط اور حساب کا انکار کرتے ہیں اور اللہ کے کلام کو مخلوق کہتے ہیں حالانکہ یہ سب اقوال ایسے ہیں جن کے خلاف کتاب اللہ اور حدیث رسول اللہ ﷺ کی صراحتیں اور صحابہؓ کا اجماعؓ موجود ہے انہوں نے دین کو چھوڑ دیا اللہ کی کتاب کو پارہ پارہ کر دیا بعض حصہ کو مانا بعض کو ترک کیا۔ فرقہ معتزلہ اسی ربقت کا راہی ہے۔ بہت سے معتزلی تو اس کے بھی قائل ہیں کہ اللہ پر وہی کام کرنا واجب ہے جو بندوں کے لئے مفید ہو۔ یہ لوگ تقدیر کے بھی منکر ہیں اور گناہوں کی مغفرت کو بھی ناممکن کہتے ہیں یہ بھی ان کا قول ہے کہ بندہ اپنے افعال کا خود خالق ہے اللہ (اگرچہ بندہ کا خالق ہے مگر) بندہ کے افعال کا خالق نہیں ہے اسی لئے اس گروہ کو امت اسلامیہ کے مجوسی کہا گیا ہے (مجوسی خیر اور نور کا خالق یزداں کو اور شر و ظلمت کا خالق اہرمن کو قرار دیتے ہیں اس طرح دو طاقتوں کو خالق کہتے ہیں ایک خیر کی طاقت، ایک شر کی طاقت معتزلہ بھی دو خالق مانتے ہیں ان کے نزدیک ساری کائنات اور تمام انسانوں کا خالق گرچہ اللہ ہے مگر بندوں کے افعال کے خالق بندے خود ہیں) رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے قدریہ (یعنی معتزلہ جو بندہ کو اپنے تمام افعال کا قادر مطلق جانتے ہیں) اس امت کے مجوسی ہیں اگر یہ بیمار ہو جائیں تو ان کی بیمار پرسی نہ کرو مر جائیں تو جنازہ میں شرکت نہ کرو (رواہ احمد وابو داؤد عن حدیث ابن عمرؓ۔

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا میری امت کے دو قسم کے لوگوں (یعنی دو فرقوں) کا اسلام میں کوئی حصہ نہیں مرجیہ اور قدریہ (مرجیہ فرقہ قائل ہے کہ صرف ایمان ہر قسم کے عذاب سے بچانے کے لئے کافی ہے عمل کی کوئی ضرورت نہیں، ایمان کی موجودگی میں کوئی گناہ ضرر رساں نہیں) رواہ الترمذی۔

حضرت عائشہؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا چھ (طرح کے لوگ) ہیں جن پر میں نے بھی لعنت کی اور اللہ نے بھی اور ہر مقبول الدعا نبی نے بھی۔ اللہ کی کتاب میں بیشی کرنے والا، تقدیر خداوندی کا انکار کرنے والا، زبردستی لوگوں پر تسلط جمانے والا تاکہ جن لوگوں کو اللہ نے عزت دی ہے ان کو ذلیل کر دے اور جن کو اللہ نے ذلت دی ہے ان کو معزز بنا دے، اللہ کی حرام کردہ چیزوں کو حلال قرار دینے والا میری عترت (اولاد و نسل) کے ساتھ اس عمل کو حلال سمجھنے والا جس کو اللہ نے حرام کر دیا ہے اور میرے طریقے کو چھوڑنے والا، یہ حدیث رزین نے اپنی کتاب میں اور بیہقی نے المدخل میں ذکر کی ہے۔

میں کہتا ہوں اللہ کی کتاب میں بیشی کرنے والے رافضی ہیں جن کا عقیدہ ہے کہ پورا قرآن اس موجودہ مصحف سے زائد تھا کچھ حصہ صحابہؓ نے اس میں سے نکال دیا ہے، آیت اِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ پر رافضیوں کا ایمان نہیں ہے اور تقدیر خداوندی کے منکر قدریہ فرقہ والے ہیں (جو انسان کو اپنے افعال کا قادر مطلق جانتے ہیں اور اللہ کو افعال عباد کا خالق نہیں مانتے) اور عترت رسول سے (ممنوعہ) سلوک کو حلال سمجھنے والے خارجی ہیں اور طریقہ رسول کو چھوڑنے والے تمام بدعتی ہیں جو اپنی رائے پر چلتے ہیں اور قرآن کی آیت متشابہات کی خود ساختہ تاویلیں کرتے ہیں اور سلف صالحین نے ان آیات کی جو تفسیر کی ہے اس کو نہیں مانتے یہ مشبہ اور مجسمہ (اللہ کے اندر مخلوق کی سی صفات ماننے والے اور اللہ کا جسم قرار دینے والے) فرقے ہیں اور باقی کی طرح جو دوسرے گروہ ہیں ان کا شمار بھی طریقہ رسول کے ترک کرنے والوں میں ہے۔ رافضیوں نے تو دین کو ہی چھوڑ دیا کیونکہ دین کا حصول قرآن حدیث اور اجماع سے ہی ہوتا ہے اور انہوں نے قرآن کو چھوڑ دیا بلکہ اس پر اعتماد کرنے کے ہی منکر ہو گئے ان کا قول ہے کہ حضرت عثمانؓ نے اصل قرآن کا تقریباً ایک چوتھائی حصہ حذف کر دیا اور جو کچھ بڑھانا چاہا بڑھا دیا۔ انہوں نے سنت رسول ﷺ کو بھی ترک کر دیا یہ سب صحابہؓ کو کافر اور مرتد کہتے ہیں اور ظاہر ہے کہ آنے والوں کو حدیث کا علم صرف انہی لوگوں کے ذریعہ سے ہو سکتا ہے جنہوں نے خود سنکر نقل کیا ہو اور نقل کرنے والے صحابہؓ ہی ہو سکتے ہیں اس لئے حدیث کا علم بغیر صحابہؓ کے ممکن نہیں اور جب صحابہؓ کو کافر مرتد قرار دے دیا تو حدیث کا انکار ہو گیا۔ انہوں نے اجماع صحابہؓ کا بھی انکار کر دیا اور خود ساختہ احادیث و اقوال کی نسبت حضرت امام جعفر صادقؒ اور حضرت امام محمد باقرؒ اور ان کے اسلاف کرام کی طرف کر دی اور چونکہ تواتر سے ثابت ہو گیا کہ ان سچے اصولوں کے اقوال آثار صحابہؓ کے مطابق ہیں (اور اس مطابقت کی کوئی

جان پر بن پڑی) تو تقیہ کی فرضیت کا قول گھڑ لیا (اور کہہ دیا کہ ان سچے اماموں نے تقیہ کر لیا تھا) ان کا ظاہری کلام صحابہ کی روایات کے مطابق ہے اور حقیقت میں انہوں نے تقیہ کیا تھا ہمارے اسلاف کو اماموں نے پوشیدہ طور پر اصل حقیقت سے واقف کر دیا تھا اور ہدایت کر دی تھی کہ ان اسرار کو ظاہر نہ کرنا ہو اور ولیاء کے بھی کان ہوتے ہیں احتیاط رکھنا۔ اور یہ بات ناقابل شک ہے کہ جو بات اخفاء اور اسرار کے طور پر کہی جائے اس کی روایت شہرت و تواتر کی حد تک نہیں ہو سکتی۔ اخبار احاد خواہ ان کے راوی کتنے ہی قابل بھروسہ اور ثقہ ہوں پھر بھی ظن کی حد سے آگے نہیں بڑھتیں اور یقین عطا نہیں کرتیں اور یہاں تو راویوں کے ثقہ ہونے کا کوئی احتمال ہی نہیں۔ مشہور دروغ گو شیطان ان اقوال کے راوی ہیں جن کی نسبت ائمہ کرام کی طرف کی گئی ہے جیسے عبداللہ بن سبا منافق یہودی، ہشام بن سالم، ہشام بن حکم، زید بن جہیم الہلالی، شیطان طاق اور یک اجن شاعر وغیرہ ہم نے ان کے اور دوسرے رافضی راویوں کے احوال السیف المسلول میں لکھ دیئے ہیں۔ شاید قرآن کا یہ بھی ایک معجزہ ہے کہ اس نے رافضیوں کی طرف جو اپنے آپ کو شیعہ کہتے ہیں آیت ذیل میں اشارہ کر دیا۔

وَكَانُوا شِيَعًا (اور ہو گئے وہ گروہ) ہر گروہ اپنے خود ساختہ لیڈر کا شیعہ (پیرو تبع) بن گیا۔ حضرت علیؓ کا بیان ہے کہ مجھ سے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تیرے اندر عیسیٰؑ کی (حالت کی) مشابہت ہے عیسیٰ سے یہودیوں نے اتنا بغض کیا کہ ان کی ماں پر بھی تہمت لگائی اور نصاریٰ نے ان سے اتنی محبت کی کہ ان کا اتنا (اونچا) مرتبہ قرار دیا جو ان کے لئے جائز نہ تھا (یعنی خدا کا بیٹا مانا) حضرت علیؓ نے فرمایا میرے سلسلہ میں دو (قسم کے) آدمی تباہ ہو گئے ایک تو حد سے بڑھ کر محبت کرنے والا جو میرے اندر ایسے (اعلیٰ) اوصاف بتاتا ہے جو میرے اندر نہیں ہیں دوسرا مجھ سے بغض رکھنے والا جس کو میری دشمنی اس امر پر آمادہ کرتی ہے کہ وہ مجھ پر تہمت تراشی کرتا ہے۔ رواہ احمد۔

حضرت علیؓ کا بیان ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا میری امت کے کچھ لوگ ہوں گے جن کو رافضی کہا جائے گا وہ اسلام کو چھوڑ دیں گے۔ رواہ البیہقی۔

حضرت علیؓ کا بیان ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا عنقریب میرے بعد کچھ لوگ ہوں گے جن کو رافضی کہا جائے گا اگر تم ان کو پاؤ تو قتل کر دینا وہ یقیناً مشرک ہوں گے میں نے عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ ان کی شناخت کیا ہے فرمایا وہ حد سے بڑھ کر تمہارے ایسے اوصاف قرار دیں گے جو تمہارے اندر نہیں ہیں اور سلف پر نکتہ چینی کریں گے۔ رواہ الدار قطنی۔ دار قطنی نے دوسرے طریق روایت سے بھی یہ حدیث بیان کی ہے اس روایت میں اتنا زائد ہے وہ ہماری یعنی ہمارے اہل بیت کی محبت کے دعویدار ہوں گے مگر واقع میں وہ ایسے نہیں ہوں گے ان کی شناخت یہ ہوگی کہ وہ ابوبکرؓ و عمرؓ کو گالیاں دیں گے۔ اس موضوع کی حدیثیں اور بھی ہیں جن کو السیف المسلول میں ہم نے ذکر کیا ہے۔

لَسْتَ مِنْهُمْ فِي شَيْءٍ (آپ کا ان سے کوئی تعلق نہیں)

یعنی اے محمد ﷺ آپ کا ان سے اور ان کا آپ سے کوئی تعلق نہیں۔ لَسْتَ مِنْهُمْ کا یہ مطلب عربی محاورہ کے مطابق ہے۔ عرب محاورہ میں کہتے ہیں اگر تو نے ایسا کیا تو تو مجھ سے اور میں تجھ سے نہیں یعنی میرا تیرا کوئی تعلق نہیں۔ میں تجھ سے الگ اور تو مجھ سے الگ۔

إِنَّمَا أَمْرُهُمْ إِلَى اللَّهِ (ان (کی سزا اور بدلے) کا معاملہ اللہ ہی کے ذمہ ہے) یعنی حق سے روٹھنے والوں کو اللہ تعالیٰ ان کو سزا دے گا۔

ثُمَّ يُنَبِّئُهُم بِمَا كَانُوا يَفْعَلُونَ (پھر (قیامت کے دن) اللہ ان کو جتا دے گا جو کچھ وہ کرتے تھے) یعنی پہلے ان کو دنیا میں پھوٹ ڈالنے اور بداعتقاد ہونے کی سزا دی جائے گی پھر بداعمالی اور گمراہی کی۔

مَن جَاءَ بِالْحَسَنَةِ فَلَهُ عَشْرُ أَمْثَالِهَا (جو ایک نیکی لے کر آئے گا اس کو اس جیسی دس نیکیوں کا ثواب ملے گا)۔ میرے خیال میں اس جگہ ایک شبہ ہو سکتا ہے جس کی تفصیل یہ ہے کہ نیکی بدی کا بدلہ صرف خدا کا مقرر کردہ

ہے دراصل یہ سمجھ کہ اس میں کوئی دخل نہیں کیونکہ کسی عمل اور اس کے بدلہ میں کوئی مشابہت نہیں (نیکی یا گناہ ایک قول یا عمل ہے اور اس کا بدلہ جنت کی نعمت اور دوزخ کے عذاب کی شکل میں ہوگا اور عمل و قول کی نعمت و عذاب سے کوئی مشابہت نہیں کا ایک مزدور کو کام کے عوض روپیہ دیا جاتا ہے کام اور روپیہ کا باہم شکل نہیں ہوتا صرف مزدور اور کام لینے والا کام کی اجرت روپیہ کو قرار دے لیتے ہیں۔ جب اچھائی برائی کے بدلہ کی مقدار اللہ کی مقرر کردہ ہے تو پھر کسی نیکی کے بدلہ کا دس گنا ہونا قابل تصور بھی نہیں ہے اس کا تصور اسی وقت کیا جا سکتا ہے جب کسی ایک شخص کو نیکی کا بدلہ کسی خاص مقدار میں دیا جائے اور دوسرے آدمی کو اس مقدار کا دس گنا دے دیا جائے، مثلاً ایک کام کی اجرت ایک مزدور کو طے شدہ تجویز کے تحت ایک روپیہ دیا جائے اور دوسرے مزدور کو اسی کام کے دس روپیہ دیئے جائیں لیکن اگر سب کو دس دس روپیہ دیئے جائیں تو یہ نہیں کہا جا سکتا کہ مزدوری کا دس گنا دی گئی دس کا اعتبار اسی وقت ہو سکتا ہے جب ایک روپیہ طے شدہ ہو پس کسی نیکی کا دس گنا ثواب اسی وقت دیا جا سکتا ہے جب کسی ایک شخص کو اسی نیکی کا ایک ثواب دیا جائے لیکن جب از روئے آیت حکم میں عموم مانا جائے اور ہر شخص کو ایک نیکی کا دس گنا ثواب قرار دیا جائے تو چونکہ دس گنے کی مقدار کا تعین ہی نہیں کیا جا سکتا اس لئے آیت کا مطلب واضح نہیں ہوتا۔ اس شبہ کو دور کرنے کے لئے میرے نزدیک ظاہر یہ ہے کہ آیت کے حکم میں عموم نہیں ہے بعض لوگوں کو نیکی کے ثواب کی کوئی مقدار بھی دی جائے گی جو اللہ کے علم میں طے شدہ ہے پھر دوسرے لوگوں کا جتنا اخلاص نیت بڑھتا جائے گا اللہ کی مہربانی جس کسی کے حال پر زیادہ ہوتی جائے گی اتنا ہی اجر بڑھتا جائے گا۔ جس کو چاہے گا دس گنا دے گا اور جس کو چاہے گا ستر گنا اور جس کو چاہے گا سات سو گنا بلکہ اور چند در چند ان گنت بے حساب۔

حضرت ابوہریرہؓ کی روایت کردہ حدیث اسی مفہوم پر دلالت کر رہی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جب کوئی اپنے اسلام کو خوب ٹھیک کرلے تو پھر اگر ایک نیکی کرے گا تو اس کے لئے اسی جیسی نیکیاں دس گنے سے لے کر سات سو گنا تک لکھی جائیں گی اور اگر کوئی بدی کرے گا تو اتنی ہی بدی لکھی جائے گی یہاں تک کہ وہ اللہ سے جا ملے (متفق علیہ) اس فرمان میں رسول اللہ ﷺ نے چند گنا کرنے کو حسن اسلام سے وابستہ کیا اور حسن اسلام صرف دل کی صفائی اور نفس کے تزکیہ سے حاصل ہوتا ہے اور ان دونوں کا تعلق اخلاص عمل سے ہے تزکیہ قلب و نفس کے بعد ہی عمل میں اخلاص پیدا ہوتا ہے۔

ایک جواب یہ بھی دیا جا سکتا ہے کہ گزشتہ امتوں کے لئے ایک نیکی کا جتنا ثواب مقرر کیا گیا تھا اس سے دس گنا ثواب اس نیکی کا امت محمدیہ کے لئے مقرر کیا گیا ہے حضرت ابن عمرؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تم لوگوں کی میعاد گزشتہ امتوں کی میعاد کی نسبت سے ایسی ہے جیسے عصر سے مغرب تک کا وقت اور یہود و نصاریٰ کی حالت کے مقابلہ میں تم لوگوں کی حالت ایسی ہے جیسے کسی شخص نے کام کرنے کے لئے کچھ مزدور لگے اور کہہ دیا کہ جو شخص دوپہر تک کام کرے گا اس کو ایک ایک قیراط ملے گا۔ یہودیوں نے اس قول کے مطابق ایک ایک قیراط مزدوری پر آدھے دن کام کیا پھر اس شخص نے کہا اب جو شخص دوپہر سے عصر کی نماز تک کام کرے گا اس کو ایک ایک قیراط ملے گا اس قول کے مطابق نصاریٰ نے دوپہر سے عصر تک ایک ایک قیراط پر کام کیا، پھر اس شخص نے کہا اب جو شخص عصر کی نماز سے سورج غروب ہونے تک کام کرے گا اس کو دو دو قیراط ملیں گے۔ سنو تم ہی وہ لوگ ہو جو عصر سے مغرب تک کام کرو گے اور دوہرا اجر پاؤ گے۔ یہ فیصلہ سن کر یہودی اور عیسائی ناراض ہو گئے اور بولے کام تو ہمارا زیادہ اور اجرت سب سے کم اللہ نے فرمایا تو کیا میں نے تمہاری کچھ حق تلفی کی۔ انہوں نے جواب دیا یہ بات تو نہیں ہوئی اس پر اللہ نے فرمایا پھر یہ میری مہربانی ہے جس کو چاہتا ہوں عطا کرتا ہوں رواہ البخاری۔

میں کہتا ہوں اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ اس امت کے نیک عمل کا گزشتہ امتوں کے نیک اعمال سے دوگنا ثواب ملے گا دس گنا ثواب ملنا اس سے ثابت نہیں ہوتا اس لئے اول الذکر جواب ہی زیادہ صحیح ہے۔ یہ بھی ایسا ہو سکتا ہے کہ اس امت کے کوئی نیکوکار کو گزشتہ امتوں کے نیکوکاروں کے مقابلہ میں کم سے کم دوہرا ثواب دیا جائے پھر عمل میں جتنا خلوص بڑھتا جائے اور اللہ کی مہربانی میں جس قدر اضافہ ہوا اتنی ہی مرتبہ میں ترقی ہوتی جائے۔

وَمَنْ جَآءَ بِالسَّيِّئَةِ فَلَا يُجْزٰٓى اِلَّا مِثْلَهَا (اور جو بدی لے کر آئے گا اس کو اتنی ہی سزا دی جائے گی)۔ کسی کی بدی (کی سزا) میں اضافہ نہیں کیا جائے گا۔

وَهُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ ۝ (اور ان کی حق تلفی نہیں کی جائے گی (ان پر ظلم نہیں کیا جائے گا)۔

حضرت ابوذرؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اللہ نے ارشاد فرمایا ہے مَنْ جَآءَ بِالْحَسَنَةِ فَلَهٗ عَشْرُ اَمْثَالِهَا اور میں اس پر زیادتی کرتا ہوں (کہ اللہ نے وحی غیر متلو میں یہ بھی فرمایا ہے) کہ جو شخص بدی لے کر آئے گا اس کی بدی کی سزا بقدر بدی ہوگی اور میں معاف بھی کر دوں گا (جس کو چاہوں گا) جو بالشت بھر میرے قریب آئے گا میں ایک ہاتھ اس کے قریب آجاؤں گا اور جو ایک ہاتھ میرے قریب آئے گا میں ایک گز اس سے قریب ہو جاؤں گا جو میرے پاس معمولی چال سے آئے گا میں اس کے پاس لپک کر آؤں گا اور جو مجھ سے زمین بھر گناہوں کے ساتھ ملے گا بشرطیکہ مشرک نہ ہو۔ میں اس سے اتنی ہی مغفرت کے ساتھ ملوں گا۔ رواہ البغوی۔

اس آخری جملہ کا معنی یہ ہے کہ اگر میں چاہوں گا تو اتنی ہی مغفرت کے ساتھ اس سے ملوں گا (یعنی گناہوں کو بخشنا لازم نہیں بلکہ میری مشیت پر موقوف ہے۔ میں چاہوں گا تو سارے گناہ معاف کر دوں گا اور مغفرت کرنا نہ چاہوں گا تو گناہوں کی سزا دوں گا) کیونکہ جَزٰٓؤُا سَيِّئَةٍ بِمِثْلِهَا بھی اللہ کا قول ہے (کہ گناہ کے بقدر گناہ کی سزا ہوگی۔ بغوی نے لکھا ہے کہ حضرت ابن عمرؓ نے فرمایا آیت میں صدقات کے علاوہ دوسری نیکیاں مراد ہیں کیونکہ صدقات کا ثواب تو سات سو گنا تک چند در چند ہوتا جائے گا۔

میں کہتا ہوں کہ حضرت ابن عمرؓ کی اس تشریح کی علت یہ ہے کہ اللہ نے فرمایا ہے مَثَلُ الَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ كَمَثَلِ حَبَّةٍ اَنْۢبَتَتْ سَبْعَ سَنَابِلَ فِيْ كُلِّ سُنْۢبُلَةٍ مِّائَةُ حَبَّةٍ ۗ وَاللّٰهُ يُضٰعِفُ لِمَنْ يَّشَآءُ اور حضرت ابن عمرؓ کے نزدیک یہ حکم صرف صدقات کے ساتھ مخصوص ہے (یعنی اس آیت میں جو سات سو گنا ثواب ملنے کی صراحت فرمائی ہے وہ صرف مالی خیرات سے تعلق رکھتی ہے) حالانکہ مالی صدقات کے ساتھ اس حکم کی خصوصیت نہیں ہے۔

رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے ہر تسبیح (ایک بار سبحان اللہ پڑھنا) صدقہ ہے ہر تحمید (ایک بار الحمد للہ کہنا) صدقہ ہے ہر تہلیل (ایک بار لا الہ الا اللہ کہنا) صدقہ ہے اور ہر تکبیر (ایک بار اللہ اکبر کہنا صدقہ ہے۔ رواہ مسلم وابوداؤد وابن ماجۃ من حدیث ابی ذرؓ بلکہ اللہ کے ذکر کا ثواب صدقات سے زائد ہے۔ حضرت ابوالدرداءؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کیا میں تم کو ایسی چیز بتاؤں جو تمہارے سارے اعمال سے بہتر اور تمہارے مالک کے نزدیک پاکیزہ تر اور تمہارے درجات کو سب اعمال سے زیادہ اونچا کرنے والی ہے اور سونا چاندی خیرات کرنے سے بھی اعلیٰ ہے اور دشمن کا مقابلہ کر کے ان کی گردنیں کاٹنے اور اپنے گلے کٹوانے سے بھی افضل ہے صحابہؓ نے عرض کیا ضرور فرمایئے ارشاد فرمایا اللہ کی یاد۔ رواہ ابن ماجۃ والحاکم والترمذی واحمد۔ طبرانی نے الاوسط میں حضرت ابن عباسؓ کی روایت سے لکھا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اللہ کے ذکر سے افضل کوئی صدقہ نہیں۔ واللہ اعلم۔

قُلْ اِنَّنِيْ هَدٰىنِيْ رَبِّيْٓ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ۚ (آپ کہہ دیجئے کہ میرے رب نے مجھے ایک سیدھا راستہ بتایا ہے۔ یعنی فطری اور تخلیقی طور پر بھی معصوم بنایا ہے پھر وحی اور دلائل واضحہ کے ذریعہ سے بھی ہدایت فرمادی ہے۔

دِيْنًا قِيَمًا مِّلَّةَ اِبْرٰهِيْمَ حَنِيْفًا ۚ وَمَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ ۝ (کہ وہ ایک دین ہے مستحکم جو طریقہ ہے ابراہیم کا ابراہیم میں کوئی کجی نہ تھی اور نہ وہ مشرکوں میں سے تھے) قِيَمًا مخفف ہے مصدر ہے بمعنی صفت، اصل میں قِيَمًا تھا چونکہ مادہ واوی ہے اس لئے قِيَمًا کی اصل بھی قِوَمًا تھی جیسے قیام کی اصل قوام تھی۔ بغویؒ نے لکھا ہے کہ مستقیم اور قیم ہم معنی ہیں۔ مِلَّةَ اِبْرٰهِيْمَ عطف بیان ہے اور حَنِيْفًا اِبْرٰهِيْمَ سے حال ہے یعنی ابراہیم مشرک نہ تھے پس اے لوگو تم اپنے باپ کے طریقے کے خلاف شرک کیوں کرتے ہو تم تو ابراہیم کے طریقے پر چلنے کے دعویدار ہو۔

قُلْ اِنَّ صَلَاتِیْ وَنُسُکِیْ وَمَحْیَایَ وَمَمَاتِیْ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ﴿۱۶۲﴾ (آپ کہہ دیجئے کہ بالیقین میری نماز اور میری ساری عبادت اور میرا جینا اور میرا مرنا سب اللہ ہی کا ہے جو سارے جہان کا مالک ہے)۔

نُسُک سے مراد ہے حج و عمرہ میں قربانی۔ مقاتل نے کہا حج مراد ہے۔ بعض نے دین مراد لیا ہے۔ بعض نے عبادت۔ یہ سب معانی قاموس و صحاح میں مذکور ہیں۔ مَحْیَا اور مَمَات مصدر ہیں یعنی موت و حیات۔ زندگی اور موت کا مالک اللہ ہے یعنی وہی زندہ کرتا اور مارتا ہے۔ بعض علماء نے کہا مطلب یہ ہے کہ ایمان و طاعت جس پر میں زندہ ہوں اور جس پر میں مروں گا سب اللہ کے لئے ہے۔ یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ مَحْیَا سے مراد ہیں زندگی کی طاعتیں جیسے نماز روزہ وغیرہ اور مَمَات سے مراد ہیں وہ طاعتیں جن کا تعلق مرنے سے ہے جیسے وصیت اور مرنے کے بعد غلاموں کی آزادی یعنی غلاموں کو مدبر بنانا۔ بعض نے یہ مطلب بیان کیا کہ زندگی میں میری ساری بندگیاں اللہ کے لئے ہیں اور مرنے کے بعد ان کا ثواب اللہ کے ذمہ ہے۔ بعض نے اس طرح تفسیر کی کہ عمل صالح کے ساتھ میری زندگی اور ایمان کے ساتھ میری موت اللہ ہی کے قبضہ میں ہے۔

لَا شَرِیْکَ لَہٗ (اس کا کوئی شریک نہیں) یعنی اس کے ساتھ میں کسی کو شریک نہیں قرار دیتا۔

وَبِذٰلِکَ اُمِرْتُ (اور اسی (اقرار و اخلاص) کا مجھے حکم دیا گیا ہے)۔

وَاَنَا اَوَّلُ الْمُسْلِمِیْنَ ﴿۱۶۳﴾ (اور میں سب ماننے والوں سے پہلا ہوں)۔ یعنی اس امت میں سب سے پہلا مسلم ہوں اور جس بات کو تم سے پہلے میں حاصل کر چکا ہوں اسی کی تم کو دعوت دیتا ہوں اس سے تم کو سمجھ لینا چاہئے کہ میں تمہارا اب بھی خیر خواہ ہوں۔

بغوی نے لکھا ہے کہ کفار قریش رسول اللہ ﷺ سے درخواست کرتے تھے کہ آپ ہمارے مذہب کی طرف لوٹ آئیے اس کے جواب میں اللہ نے فرمایا۔

قُلْ اَغَیْرَ اللّٰہِ اَبْغِیْ رَبًّا وَّھُوَ رَبُّ کُلِّ شَیْءٍ (آپ کہہ دیجئے کہ کیا میں اللہ کے سوا کسی اور کو رب بنانے کے لئے تلاش کروں حالانکہ وہ ہر چیز کا مالک ہے)۔ استفہام انکاری ہے اور وَھُوَ رَبُّ کُلِّ شَیْءٍ حال ہے مگر علت انکار کی جگہ اس کو ذکر کیا گیا ہے (گویا واو تعلیل کا ہے) مطلب یہ ہے کہ کیا اللہ کی عبادت میں کسی اور کو شریک کروں اور دوسرے کو رب بنانے کی خواہش کروں میں ایسا نہیں کر سکتا کیونکہ وہ ہر چیز کا رب ہے اور میری طرح کائنات کی ہر چیز اسی کی مربوب ہے معبود ہونے کی صلاحیت کسی میں نہیں۔ سابق آیت میں حکم دیا تھا کہ آپ کہہ دیں میرا دین ابراہیم کا دین ہے اس سے وہم ہو سکتا تھا کہ شاید رسول اللہ ﷺ نے دین ابراہیم کو بطور تقلید اختیار کیا ہے اور جس طرح کفار آباء و اجداد کے دین کی تقلید کرتے تھے اسی طرح آپ بھی دین اسلاف کے پابند تھے اس وہم کو اَغَیْرَ اللّٰہِ اَبْغِیْ رَبًّا وَّھُوَ رَبُّ کُلِّ شَیْءٍ کہہ کر زائل فرما دیا۔ بغوی نے حضرت ابن عباسؓ کی روایت سے لکھا ہے کہ ولید بن مغیرہ کہتا تھا میرے راستہ پر چلو تمہارا بار (گناہ) اپنے اوپر اٹھانے کا میں ذمہ دار ہوں اس کی تردید میں اللہ نے فرمان صادر فرمایا۔

وَلَا تَکْسِبُ کُلُّ نَفْسٍ اِلَّا عَلَیْھَا (اور جو شخص بھی کوئی عمل کرتا ہے وہ اسی پر رہتا ہے) یعنی جو شخص کوئی جرم کرے گا اس کا گناہ بھی وہی اٹھائے گا اگر کوئی اللہ کے سوا کسی اور کو رب بنانے کا طلب گار ہوگا تو اس کا وبال تو اسی پر پڑے گا کسی دوسرے کا ذمہ دار بننا کچھ فائدہ نہیں پہنچائے گا۔

وَلَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰی (اور کوئی اٹھانے والا دوسرے کا بوجھ (اپنے اوپر) نہیں اٹھائے گا) وَازِرَةٌ اور اُخْرٰی کا موصوف محذوف ہے یعنی نفس وازرۃ اور نفس اخری یعنی گنہگار نفس کے گناہوں کا بوجھ کوئی اپنے اوپر نہیں اٹھائے گا۔

ثُمَّ اِلٰی رَبِّکُمْ مَّرْجِعُکُمْ فَیُنَبِّئُکُمْ بِمَا کُنْتُمْ فِیْہِ تَخْتَلِفُوْنَ ﴿۱۶۴﴾ (پھر تم سب کو اپنے رب کے پاس لوٹ کر جانا ہوگا پھر وہ تم کو جتلا دے گا جس چیز میں تم اختلاف کرتے تھے) یعنی قیامت کے دن تم سب کو اپنے رب کے پاس

لوٹ کر جانا ہے تمہارے اندر جو دینی اختلاف ہے اس میں کون حق پر ہے کون باطل پر اس کا فیصلہ اس روز اللہ کر دے گا اور ہر ایک کو اس کے عمل اور اعتقاد کے بموجب سزا جزا دے گا۔

وَهُوَ الَّذِي جَعَلَكُمْ خَلَائِفَ الْأَرْضِ (اور وہ ایسا ہے جس نے تم کو زمین پر (پہلی قوموں کی جگہ) با اختیار بنایا) یعنی اے امت محمد ﷺ اللہ نے گزشتہ قوموں کی ہلاکت کے بعد تم کو اس زمین کا مالک و وارث بنا دیا۔

وَرَفَعَ بَعْضَكُمْ فَوْقَ بَعْضٍ دَرَجَاتٍ لِيَبْلُوَكُمْ فِي مَا آتَاكُمْ (اور اس نے تم میں سے بعض سے بعض کے درجے اونچے کیے تاکہ اللہ نے جو کچھ تم کو عطا فرمایا ہے اس میں (ظاہراً) تمہاری جانچ کرے) یعنی جو جاہ و مال تم کو دیا ہے اس میں ظاہر ہو جائے کہ تم شرک کرتے ہو (یا شکر)۔

إِنَّ رَبَّكَ سَرِيعُ الْعِقَابِ وَإِنَّهُ لَغَفُورٌ رَحِيمٌ (بلاشبہ آپ کا رب جلد سزا دینے والا ہے اور بلاشبہ وہ بڑی مغفرت اور مہربانی کرنے والا (بھی) ہے)۔

یعنی جب چاہے گا سرکشوں پر فوراً عذاب لے آئے گا موت کے بعد یا قیامت کے دن تک عذاب کو موخر کرنے سے یہ نہ سمجھنا چاہئے کہ عذاب دور ہے کوئی آنے والی چیز دور نہیں ہوتی۔ اللہ نے آیت إِنَّ رَبَّكَ میں سرعت کی نسبت عذاب کی طرف کی (کیونکہ سَرِيعُ الْعِقَابِ کا معنی ہے سریع عقابہ) براہ راست اپنی ذات کی طرف کی (کیونکہ سَرِيعُ الْعِقَابِ اللہ کی صفت ہے مگر صفت بحال متعلق ہے) اور مغفرت و رحمت کی نسبت اپنی ذات کی طرف مبالغہ کے صیغہ اور لام تاکید کے ساتھ براہ راست کی۔ اس سے یہ بات معلوم ہوئی کہ اللہ بذات خود تو رحیم و غفور ہے لیکن صفت ربوبیت کا تقاضا ہے کہ مجموعہ کا نظم درست ہو اس لئے بالعرض سرکشوں کو عذاب دینے والا بھی ہے۔ اس کی رحمت کثیر ہے اور عذاب قلیل بیشتر درگزر فرماتا ہے۔

حضرت ابن عمرؓ راوی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا مجھ پر سورۂ انعام پوری ایک ہی مرتبہ میں اتری اس کی مشایعت میں ستر ہزار فرشتے تھے جن کی تسبیح و تحمید کا ایک غلغلہ تھا۔ رواہ الطبرانی فی المعجم الصغیر وابو نعیم فی الحلیۃ وابن مردویہ فی التفسیر۔

حضرت انسؓ کا بیان ہے کہ رسول اللہ ﷺ پر جب سورۃ الانعام نازل ہوئی تو آپ ﷺ نے سبحان اللہ پڑھا، پھر فرمایا اس سورت کے پیچھے اتنے فرشتے تھے کہ آسمان کے کنارے انہوں نے بند کر دیئے تھے (یعنی پورے آسمان پر کناروں تک چھا گئے تھے) رواہ الحاکم فی المستدرک۔ یہ حدیث بھی دلالت کر رہی ہے کہ سورۃ انعام یکدم پوری اتری تھی۔ مختلف آیات کے اسباب نزول جو الگ الگ بیان کئے گئے ہیں شاید اس کی صورت یہ ہوئی کہ مختلف واقعات قریب قریب اوقات میں ظاہر ہوئے اور چونکہ بعض آیات کا بعض اسباب سے اور دوسری بعض آیات کا دوسرے اسباب سے ربط اور تناسب تھا اس لئے آیت کے نزول کا سبب اس واقعہ کو قرار دے دیا گیا اور کہہ دیا گیا کہ یہ آیت فلاں واقعہ کے متعلق اور یہ آیت فلاں سبب کے تحت نازل ہوئی ورنہ احادیث مذکورہ سے معلوم ہو رہا ہے کہ پوری سورت ایک ہی وقت میں نازل ہوئی۔[1]

۱۹ ربیع الثانی ۱۱۹۹ھ کو اس جگہ تک تفسیر مظہری کی تالیف

ختم ہوئی اور بعون اللہ ۲۸ جمادی الاول ۱۳۸۳ھ کو یہاں تک

ترجمہ پورا ہوا۔

[1] حضرت عمر بن خطابؓ نے فرمایا سورۃ الانعام قرآن مجید کی بزرگ ترین سورتوں میں سے ہے۔ بیہقی نے شعب الایمان میں مجہول سند سے حضرت علیؓ کا قول موقوفاً نقل کیا ہے کہ سورۃ الانعام جس بیمار پر پڑھی جائے گی اللہ اس کو شفاء مرحمت فرمائے گا۔

سورۃ الاعراف

بیشتر آیات مکہ میں نازل ہوئیں کچھ آیات مدنی بھی ہیں کل ۲۰۵ آیات ہیں

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الٓمّٓصٓ ۝ سورۂ بقرہ میں ایسے الفاظ کی تشریح کردی گئی ہے۔

کِتٰبٌ اُنْزِلَ اِلَیْكَ (یہ ایک کتاب ہے جو آپ ﷺ کے اوپر اتاری گئی ہے)۔ کِتٰبٌ خبر ہے مبتدا محذوف ہے یعنی ھٰذَا کِتٰبٌ یا الٓمّٓصٓ مبتدا ہے اگر اس سے سورت یا قرآن مراد ہو اور کِتٰبٌ اس کی خبر ہے اُنْزِلَ اِلَیْكَ، کِتٰبٌ کی صفت ہے۔

فَلَا یَكُنْ فِیْ صَدْرِكَ حَرَجٌ مِّنْهُ (آپ کے دل میں اس سے بالکل تنگی نہ ہونا چاہئے) حَرَجٌ کا لغوی معنی ہے تنگی۔ مجاہد کے نزدیک اس جگہ شک مراد ہے کیونکہ دل کی تنگی شک کا سبب ہے اور سینہ کی کشائش یقین کا سبب۔ سینہ کی کشائش اور تنگی کی بحث سورۂ انعام کی آیت فَمَنْ یُّرِدِ اللّٰهُ اَنْ یَّهْدِیَهٗ یَشْرَحْ صَدْرَهٗ لِلْاِسْلَامِ کی تفسیر کے ذیل میں گزر چکی ہے۔ ابو العالیہ نے کہا کہ تبلیغ قرآن کی راہ میں لوگوں کے خوف کا دل پر جو حرج ہے یعنی یہ بات سے ڈر کر تبلیغ میں کمی نہ کرو کہ لوگ مخالفت کریں گے اور ایذا پہنچائیں گے کیونکہ اگر کوئی کام کرنے میں ڈر لگا ہو تو آدمی بشاشت خاطر اور چستی سے اس کام کو نہیں کرتا اور اس کام کے لئے سینہ میں کشائش نہیں پیدا ہوتی۔ بعض نے کہا قرآن کا پورا پورا حق ادا کرنے سے ڈرنا مراد ہے۔

اصل خطاب رسول اللہ ﷺ کو ہے (یعنی آپ ایسا نہ کریں) لیکن ممانعت میں زور پیدا کرنے کے لئے نہی کا رخ حرج کی طرف پھیر دیا گیا اور فرمایا کہ تمہارے دل میں تنگی نہ ہو مراد آیت یہ ہے کہ آپ اس کتاب کے منزل من اللہ ہونے میں شک نہ کریں۔ یا کسی شخص سے نہ ڈریں، کسی کی پرواہ نہ کریں ہم آپ کے محافظ ہیں۔ یا حقوق کتاب کو پورے طور پر ادا نہ کرنے کا آپ اندیشہ نہ کریں ہم آپ کو اس کی سہولت فراہم کردیں گے اور ادائے حقوق کی توفیق عطا کریں گے۔

لِتُنْذِرَ بِهٖ (تاکہ اس کے ذریعہ سے آپ (منکروں اور نافرمانوں کو) ڈرائیں)۔ لِتُنْذِرَ کا تعلق اُنْزِلَ سے ہے (کتاب اس لئے نازل کی گئی کہ آپ ڈرائیں) یا لَا یَكُنْ سے مربوط ہے کیونکہ جب رسول اللہ ﷺ کو یہ یقین ہو جائے گا کہ یہ کتاب اللہ کی طرف سے آئی ہے تو جرأت کے ساتھ لوگوں کو نافرمانی سے ڈرائیں گے یا کافروں سے بالکل خوف نہ کریں گے یا اس بات کا یقین کرلیں گے کہ اللہ اس کتاب کی تبلیغ و اقامت میں میری مدد کرے گا مجھے توفیق عطا فرمائے گا (یہ تینوں شقیں جدا جدا مؤلف نے حرج کے مرادی معنی کے اختلاف سے پیش نظر بیان کی ہیں۔

وَ ذِكْرٰى لِلْمُؤْمِنِیْنَ ۝ اور اہل ایمان کے لئے یادداشت یعنی نصیحت ہے۔ ذِکْرٰی کا عطف کِتٰبٌ پر ہے یا مبتدا محذوف کی خبر ہے یا محذوف فعل کا مفعول ہے یا محل لِتُنْذِرَ پر معطوف ہونے کی وجہ سے مجرور ہے۔

اِتَّبِعُوْا مَاۤ اُنْزِلَ اِلَیْكُمْ مِّنْ رَّبِّكُمْ (رسول کے ذریعہ سے) جو ہدایت تم پر تمہارے رب کی طرف سے اتاری گئی ہے اس پر چلو۔ جیسا کہ وحی جلی ہو یا خفی۔ مَاۤ اُنْزِلَ کے تحت حدیث بھی آگئی۔

وَلَا تَتَّبِعُوْا مِنْ دُوْنِهٖۤ اَوْلِیَآءَ (اور اللہ تعالیٰ کو چھوڑ کر دوسرے رفیقوں کا اتباع نہ کرو) یعنی جن و انس کی

نجاعت اللہ کی معصیت میں مدد کرو۔ بس دونہ کے لفظ سے انبیاء و اولیاء کے اتباع کی ممانعت آیت کے حکم سے خارج ہو گئی کیونکہ اس مقدس گروہ کی اطاعت کا حکم تو اللہ کی طرف سے ہے۔

قَلِيلًا مَّا تَذَكَّرُونَ ۝ (تم لوگ بہت ہی کم نصیحت مانتے ہو)۔

قلیلا کا موصوف محذوف ہے یعنی تذکرا قلیلا یا زمانا قلیلا لفظ ما کی زیادتی قلت کی تاکید کے لئے ہے یہ ما مصدری نہیں ہے ورنہ قلیلا تذکرون کا معمول نہیں ہو سکتا۔ قلت تذکر کا مخاطب پورا انسانی گروہ ہے اس گروہ میں سے کچھ لوگ یعنی اہل ایمان تذکر کی کثرت رکھتے ہیں۔

وَكَم مِّن قَرْيَةٍ أَهْلَكْنَاهَا فَجَاءَهَا بَأْسُنَا بَيَاتًا أَوْ هُمْ قَائِلُونَ ۝ (اور بہت بستیوں کو ہم نے تباہ کر دیا اور ان پر ہمارا عذاب رات کے وقت پہنچا ایسی حالت میں کہ دوپہر کے وقت وہ آرام میں تھے)۔ ہلاک کرنے سے مراد ہے بستی والوں کو تباہ کرنے کا ارادہ کر لیا ان کو بے مدد چھوڑ دیا یا ہلاک ہی کر دیا۔ بیاتا مصدر ہے بمعنی اسم فاعل (جب وہ رات کو آرام کر رہے تھے) قائلون دوپہر کو آرام کے لئے لیٹنے والے خواہ نیند ہو یا نہ ہو جاؤ بیاتا، اہلکناہا سے حال ہے اس صورت میں ہلاک کرنے کی تشریح اور توضیح اس سے ہو رہی ہے جیسے کہا جاتا ہے تم نے میرے ساتھ احسان کیا کہ مجھے اتنا مال دے دیا۔

خلاصہ مطلب یہ ہے کہ بہت بستیاں ایسی تھیں کہ جب ان کے باشندوں کو ہلاک کرنے کا ہم نے ارادہ کیا اور وہ غفلت کی حالت میں پڑے تھے ان کو کوئی اندیشہ تھا اس وقت کو رات کے وقت سوتے میں ہی ہمارے عذاب نے آلیا جیسے قوم لوط پر آیا اور کبھی دوپہر کو آرام کے وقت بھی عذاب آگیا جیسے قوم شعیب پر آیا رات اور دوپہر کے وقت کا خصوصی ذکر بستی والوں کی انتہائی غفلت کو ظاہر کرنے کے لئے کیا گیا ہے۔

فَمَا كَانَ دَعْوَاهُمْ إِذْ جَاءَهُم بَأْسُنَا إِلَّا أَن قَالُوا إِنَّا كُنَّا ظَالِمِينَ ۝ (سو جس وقت ان پر ہمارا عذاب آیا اس وقت ان کے منہ سے بجز اس کے کوئی بات نہیں نکلی تھی کہ واقعی ہم ظالم تھے)۔ دعویٰ بمعنی قول۔ دعاء، گڑگڑانا۔ سیبویہ نے کہا عرب کہتے ہیں اے اللہ مسلمانوں کے اپنے دعوے میں تم ہم کو شامل کر دے۔ یعنی اپنی دعاؤں میں۔ مقصد یہ ہے کہ عذاب کو رد کر دینے کی توان میں طاقت نہیں تھی مجبوراً اپنی ناحق کوشیوں کا ان کو اقرار کرنا پڑا مگر ایسے وقت میں اعتراف سودمند نہ تھا۔

فَلَنَسْأَلَنَّ الَّذِينَ أُرْسِلَ إِلَيْهِمْ وَلَنَسْأَلَنَّ الْمُرْسَلِينَ ۝ (پھر ہم ان لوگوں سے ضرور پوچھیں گے جن کے پاس پیغمبروں کو بھیجا گیا تھا اور پیغمبروں سے بھی ضرور پوچھیں گے)۔

بیہقی نے ابو طلحہ کی سند سے بیان کیا کہ حضرت ابن عباسؓ نے اس آیت کی تفسیر میں فرمایا ہم لوگوں سے پوچھیں گے کہ پیغمبروں کی دعوت کا تم نے کیا جواب دیا اور پیغمبروں سے سوال کریں گے کہ تم نے ہمارے احکام کو پہنچایا یا نہیں۔ ابن مبارک نے وہب (بن منبہ) کا قول بیان کیا کہ قیامت کے دن اسرافیل کو طلب کیا جائے گا اسرافیل لرزتے کانپتے حاضر ہوں گے دریافت کیا جائے گا۔ لوح محفوظ نے جو کچھ تم کو دیا تھا تم نے اس کا کیا کیا۔ اسرافیل عرض کریں گے میں نے جبرئیل کو پہنچا دیا۔ جبرئیل کو بلایا جائے گا۔ جبرئیل عرض کریں گے میں نے پیغمبروں کو پہنچا دیا۔ پیغمبروں کی پیشی ہو گی اور دریافت کیا جائے گا جبرئیل نے تم کو جو کچھ پہنچایا تھا تم نے اس کے متعلق کیا کیا۔ پیغمبر عرض کریں گے ہم نے لوگوں تک پہنچا دیا۔ یہی مطلب ہے آیت فَلَنَسْأَلَنَّ الَّذِينَ أُرْسِلَ إِلَيْهِمْ وَلَنَسْأَلَنَّ الْمُرْسَلِينَ کا۔

مسلم نے حضرت جابرؓ کی روایت سے لکھا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے حج وداع کے خطبہ میں فرمایا تم سے میرے متعلق دریافت کیا جائے گا تم کیا کہو گے۔ حاضرین نے عرض کیا ہم شہادت دیں گے کہ آپ نے (اللہ کا پیام) پہنچا دیا، ادا کر دیا اور نصیحت کر دی۔ حضور ﷺ نے فرمایا اے اللہ تو گواہ رہ۔ امام احمد نے حضرت معاویہ بن حیدہؓ کی روایت سے بیان کیا ہے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا میرا رب مجھے بلائے گا اور پوچھے گا کیا تو نے میرے بندوں کو (میرا پیام) پہنچا دیا۔ میں جواب دوں گا بے شک

میں نے ان کو پہنچا دیا۔ لہٰذا جو لوگ موجود ہیں وہ غیر موجود لوگوں تک یہ پیام پہنچا دیں۔ پھر (قیامت کے دن) تم کو طلب کیا جائے گا اس وقت تمہارے منہ بند ہوں گے (کچھ بول نہ سکو گے) سب سے پہلے تمہاری ران اور ہتھیلی (بولے گی اور) کا اظہار حال کرے گی۔

ابوالشیخ نے العظمۃ میں ابوسنان کا قول نقل کیا ہے کہ قیامت کے دن حساب فہمی کے لئے سب سے پہلے لوح کو طلب کیا جائے گا۔ لوح لرزاں ترساں حاضر ہو گی دریافت کیا جائے گا کہ تو نے (میرے احکام) پہنچا دیئے۔ لوح عرض کرے گی جی ہاں! اللہ فرمائے گا تیرا گواہ کون ہے لوح عرض کرے گی اسرافیل۔ اسرافیل کو طلب کیا جائے وہ لرزتے کپکپاتے حاضر ہوں گے اللہ فرمائے گا کیا لوح نے تجھے پہنچا دیا اسرافیل عرض کریں گے جی ہاں اس پر لوح کہے گی اللہ کا شکر ہے کہ اس نے مجھے محاسبہ کے برے نتیجہ سے محفوظ رکھا۔

ابن مبارک نے الزہد میں ابوجبلہ کا بیان نقل کیا ہے کہ قیامت کے دن سب سے پہلے اسرافیل کو طلب کیا جائے گا اور اللہ فرمائے گا کیا تو نے میرا حکم پہنچا دیا اسرافیل عرض کریں گے جی ہاں میں نے جبرئیل کو پہنچا دیا۔ جبرئیل کی طلبی ہو گی اور ان سے اللہ پوچھے گا کیا اسرافیل نے تجھے میرا حکم پہنچا دیا۔ جبرئیل عرض کریں گے جی ہاں اس پر اسرافیل کی چھوٹ ہو جائے گی پھر جبرئیل سے اللہ فرمائے گا تو نے میرے حکم کے متعلق کیا کیا۔ جبرئیل عرض کریں گے پروردگار میں نے پیغمبروں کو پہنچا دیا۔ اس پر پیغمبر بلائے جائیں گے اور ان سے دریافت ہو گا کہ کیا میرا حکم جبرائیل نے تم کو پہنچا دیا پیغمبر عرض کریں گے جی ہاں دریافت کیا جائے گا پھر تم نے کیا کیا پیغمبر عرض کریں گے ہم نے امتوں کو پہنچا دیا۔ امتوں سے دریافت کیا جائے گا کہ پیغمبروں نے تم کو پہنچا دیا تھا۔ اس پر کچھ لوگ پیغمبروں کے قول کی تکذیب کریں گے اور کچھ تصدیق۔ پیغمبر عرض کریں گے ہمارے پاس اپنے قول کے گواہ ہیں جو ان (تکذیب کرنے والوں) کے خلاف شہادت دے سکتے ہیں۔ اللہ فرمائے گا وہ کون ہیں پیغمبر عرض کریں گے محمد ﷺ کی امت۔ اس پر امت محمدیہ ﷺ کی طلبی ہو گی اور اس سے دریافت کیا جائے گا کیا تم شہادت دیتے ہو کہ پیغمبروں نے اپنی امتوں کو میرا حکم پہنچا دیا تھا۔ امت محمدیہ جواب دے گی جی ہاں! انبیاء کی امتیں کہیں گی جو لوگ ہمارے زمانہ میں نہیں ہوئے وہ ہمارے خلاف کیسے شہادت دیتے ہیں۔ اللہ امت محمدیہ سے فرمائے گا تم ان پر کس طرح شہادت دیتے ہو تم ان کے زمانہ میں موجود نہ تھے۔ وہ عرض کریں گے اے ہمارے رب تو نے ہمارے پاس پیغمبر بھیجا تھا اور اپنی کتاب بھی اتاری تھی جس میں تو نے بیان فرمادیا تھا کہ پیغمبروں نے اپنی امتوں کو تیرا پیام پہنچا دیا آیت وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا الخ کا یہی مطلب ہے۔ سورۂ بقرہ کی اس آیت کی تفسیر کے ذیل میں ہم نے حضرت ابوسعید خدریؓ کی روایت کردہ حدیث جس کا تعلق شہادت امت سے ہے ذکر کر دی ہے وہاں مطالعہ کرو۔

وَلَنَسْـَٔلَنَّ الْمُرْسَلِيْنَ کا یہ مطلب بھی ہو سکتا ہے کہ ہم پیغمبروں سے پوچھیں گے تمہاری امتوں نے کیا جواب دیا۔ یہی مضمون دوسری آیت میں آیا ہے فرمایا ہے يَوْمَ يَجْمَعُ اللّٰهُ الرُّسُلَ فَيَقُوْلُ مَاذَآ اُجِبْتُمْ قَالُوْا لَا عِلْمَ لَنَا اِنَّكَ اَنْتَ عَلَّامُ الْغُيُوْبِ اس آیت کی تفسیر سورۂ مائدہ میں گزر چکی ہے۔

فَلَنَقُصَّنَّ عَلَيْهِمْ بِعِلْمٍ وَّمَا كُنَّا غَآئِبِيْنَ ۝ (پھر چونکہ ہم پوری خبر رکھتے تھے ان کے روبرو بیان کردیں گے اور ہم بے خبر نہ تھے کہ ہم جب پیغمبر کہیں گے ہم کو کوئی علم نہیں یعنی جب امتیں تبلیغ کا انکار کریں گی اور امت محمدیہ شہادت دے گی تو ہم پیغمبروں اور ان کی امتوں کے روبرو بیان کر دیں گے۔ بعلم کا مطلب یہ ہے کہ ہم کو چونکہ معلوم تھا یا ہم ان کے ظاہر و باطن کو جانتے تھے (اول صورت میں مصدر بمعنی اسم مفعول اور دوسری صورت میں بمعنی اسم فاعل ہوگا) ہم غائب نہ تھے کا مطلب یہ ہے کہ پیغمبروں کی تبلیغ سے یا امتوں کے جواب اور امت محمدیہ ﷺ کی شہادت سے بے خبر نہ تھے مگر کافروں کو زجر و سرزنش کرنا انبیاء اور مسلمانوں کے شرف کو ظاہر کرنا اور شہادت دلوا کر امت محمدیہ کو فضیلت عطا کرنا چونکہ مقصود ہوگا اس لئے یہ سوالات کئے جائیں گے۔

وَالْوَزْنُ يَوْمَئِذِنِ الْحَقُّ ۚ (اور ٹھیک ٹھیک تول اس روز ہوگی)۔

یعنی جس روز پیغمبروں سے اور ان کی امتوں سے سوال ہوگا اس روز میزان عدل سے اعمال کا ٹھیک ٹھیک وزن ضرور ہوگا۔ اَلْوَزْنُ مبتدا ہے اور یَوْمَئِذٍ خبر اور اَلْحَقُّ مبتدا کی صفت۔ اَلْحَقُّ سے مراد ہے ٹھیک برابر یا اَلْحَقُّ خبر ہے اور مبتدا محذوف ہے، یعنی وہ حق ہے اس میں کوئی شک نہیں اس پر ایمان لانا واجب ہے۔

حدیث جبرئیل میں حضرت عمرؓ بن خطاب کی روایت سے آیا ہے کہ حضرت جبرئیلؑ نے کہا محمد ﷺ ایمان (سے مراد) کیا ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا (ایمان یہ ہے کہ) تم اللہ کو اس کے فرشتوں اور اس کے پیغمبروں کو مانو اور جنت و دوزخ اور میزان پر یقین رکھو اور مرنے کے بعد حشر جسمانی کو تسلیم کرو اور اس بات پر ایمان رکھو کہ ہر اچھی بری چیز قدر (الٰہی) کے اندر ہے (یعنی اللہ کی تقدیر سابق سے کوئی چیز خارج نہیں) اگر تم نے ایسا کر لیا تو بس قطعی مومن ہو۔ حضرت جبرئیلؑ نے کہا جی ہاں آپ نے سچ فرمایا۔ رواہ البیہقی فی البعث عن ابن عمر۔ ابن مبارک نے الزہد میں اور الاجری نے الشریعۃ میں حضرت سلمان کی روایت سے اور ابوالشیخ نے اپنی تفسیر میں حضرت ابن عباسؓ کے حوالے سے لکھا ہے کہ میزان کی ایک زبان اور دو پلڑے ہوں گے۔

وزن کس چیز کا اور کس طرح ہوگا اس کے متعلق علماء کے اقوال مختلف ہیں۔ بعض علماء نے کہا اعمال نامے تولے جائیں گے۔ ترمذی، ابن ماجہ، ابن حبان، حاکم اور بیہقی نے حضرت ابن عمرؓ کی روایت سے لکھا ہے اور حاکم نے اس کو صحیح بھی کہا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا قیامت کے دن میری امت کے ایک آدمی کو سب کے سامنے لایا جائے گا اور اس کے ننانوے اعمال نامے کھولے جائیں گے ہر اعمال نامہ کی لمبائی بقدر رسائی نگاہ ہوگی۔ اللہ اس سے فرمائے گا کیا تجھے ان میں سے کسی بات کا انکار ہے۔ کیا میرے نگراں محرروں نے (لکھنے میں) کچھ تیری حق تلفی کی ہے، وہ شخص جواب دے گا، نہیں میرے مالک (حق تلفی نہیں کی) اللہ فرمائے گا کیوں نہیں۔ تیری ایک نیکی ہمارے پاس موجود ہے اور آج تجھ پر ظلم نہیں کیا جائے گا۔ اس کے بعد ایک چھوٹا پرچہ نکالا جائے گا جس میں اشہد ان لا الٰہ الا اللہ واشہد ان محمدا عبدہ ورسولہ لکھا ہوگا وہ شخص عرض کرے گا میرے مالک ان دفتروں کے مقابلہ میں اس چھوٹے پرچے کی کیا حقیقت ہے۔ اللہ فرمائے گا تجھ پر ظلم نہیں ہوگا پھر تمام دفاتر اعمال ایک پلڑے میں اور وہ چھوٹا پرچہ دوسرے پلڑے میں رکھ دیا جائے گا دفاتر اعمال والا پلڑا اوپر اٹھ جائے گا اور پرچہ والا پلڑا بھاری نکلے گا اللہ کے نام سے کوئی چیز بھاری نہیں ہے۔

امام احمد نے حسن سند سے لکھا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا قیامت کے دن ترازوئیں قائم کی جائیں گے پھر ایک آدمی کو لا کر ایک پلڑے میں رکھ دیا جائے گا اور اس چیز کو بھی اس پلڑے میں رکھ دیا جائے گا جس میں اس کے اعمال کا گنتی کے ساتھ اندراج کیا گیا تھا ترازو اس کو لے کر جھک جائے گی نتیجہ میں اس کو دوزخ کی طرف بھیج دیا جائے گا یوں ہی اس کی پشت پھرائی جائے گی۔ رحمٰن کی طرف سے ایک منادی بلند آواز سے پکارے گا جلدی نہ کرو۔ ابھی اس کا کچھ رہ گیا ہے، چنانچہ ایک چھوٹا پرچہ لایا جائے گا جس میں لا الٰہ الا اللہ لکھا ہوگا وہ پرچہ (دوسرے پلڑے میں) اس آدمی کے ساتھ رکھ دیا جائے گا، فوراً ترازو ادھر کو جھک جائے گی۔

ابن ابی الدنیا نے حضرت عبداللہ بن عمروؓ کا بیان نقل کیا ہے کہ قیامت کے دن اللہ کی طرف سے حضرت آدمؑ کے ٹھہرنے کا ایک خاص مقام ہوگا۔ دو سبز کپڑے پہنے وہ ایسے معلوم ہوں گے جیسے کوئی کھجور کا لمبا درخت۔ اپنی جگہ کھڑے کھڑے دوزخ کی طرف جانے والوں کو دیکھتے ہوں گے اسی اثناء میں امت محمدی کے ایک شخص کو دوزخ کی طرف لے جاتا دیکھ کر پکاریں گے، احمد، میں جواب دوں گا ابوالبشر میں یہ ہوں۔ حضرت آدمؑ کہیں گے تمہاری امت کے اس آدمی کو دوزخ کی طرف لے جایا جارہا ہے میں یہ سنتے ہی فوراً جلد جلد تیاری کر کے فرشتوں کے پیچھے جاؤں گا اور کہوں گا اے اللہ کے قاصدو ٹھہر جاؤ فرشتے کہیں گے ہم سخت خو اور طاقتور ہیں اللہ جو حکم دیتا ہے اس کے خلاف نہیں کر سکتے جیسا حکم ملتا ہے ویسا ہی کرتے ہیں (راوی نے کہا) جب رسول اللہ ﷺ ناامید ہو جائیں گے تو بائیں ہاتھ کی مٹھی میں ریش مبارک پکڑ کر عرش کی طرف رخ

کر کے عرض کریں گے میرے مالک تو نے مجھ سے وعدہ کیا تھا کہ مجھے میری امت میں رسوا نہ کرے گا (فوراً عرش سے ندا آئے گی۔ محمد کا کہنا مانو اور مقام (میزان) کی طرف اس بندہ کو واپس لے آؤ (حضور نے فرمایا) پھر میں پوروے برابر ایک سفید پرچہ اپنی پوروے سے نکال کر بسم اللہ کہہ کے ترازو کے دائیں پلڑے میں ڈالوں گا جس سے نیکیوں کا پلڑا جھک جائے گا فوراً ندا ہوگی کامیاب ہو گیا۔ اس کی کوشش کامیاب ہو گئی (اس کی نیکیوں کا وزن) بھاری نکلا اس کو جنت کو لے جاؤ وہ شخص (فرشتوں سے) کہے گا اے میرے رب کے کارندو ذرا ٹھہر جاؤ میں اس معزز بندہ سے کچھ دریافت کر لوں جس کی بارگاہ الٰہی میں اتنی عزت ہے پھر (رسول اللہ کی طرف رخ کر کے) کہے گا آپ پر میرے ماں باپ قربان۔ آپ کون ہیں آپ کا چہرہ کتنا حسین اور آپ کے اخلاق کتنے اچھے ہیں آپ نے مجھے لوٹا دیا اور میری آبرو پر رحم فرمایا میں۔ جواب دوں گا میں تیرا نبی محمد ﷺ ہوں اور یہ تیرے درود ہیں جو تو مجھ پر پڑھتا تھا آڑے وقت میں یہ تیرے کام آئیں۔

بعض علماء کا قول ہے کہ (اعمال کو نہیں) اشخاص کو تولا جائے گا۔ صحیحین میں حضرت ابوہریرہؓ کی روایت سے آیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کچھ بڑے قد آور موٹے آدمی قیامت کے دن ایسے ہوں گے کہ اللہ کے نزدیک ان کا وزن مچھر کے پر کے برابر بھی نہ ہوگا۔ پھر حضور ﷺ نے آیت فَلَا نُقِيمُ لَهُمْ يَوْمَ الْقِيَامَةِ وَزْنًا تلاوت فرمائی۔ ابو نعیم اور آجری نے بیان کیا ہے کہ رسول اللہ نے اس آیت کی تشریح کے ذیل میں فرمایا کہ (بعض) لمبا تڑنگا قوی الجثہ بہت کھانے پینے والے آدمیوں کو ترازو میں رکھا جائے گا۔ تو ان کا وزن جو برابر بھی نہیں نکلے گا۔ فرشتہ ایسے ستر ہزار آدمیوں کو ایک دم دھکا دے کر دوزخ میں پھینک دے گا۔

بعض علماء کا قول ہے کہ اعمال کو مجسم بنا دیا جائے گا اور پھر ان کو تولا جائے گا۔ کیونکہ بخاری نے حضرت ابوہریرہؓ کی روایت سے لکھا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا دو کلمے ہیں جو زبان پر ہلکے ہیں (لیکن) میزان میں بھاری (اور) اللہ کو پیارے ہیں سبحان الله وبحمده سبحان الله العظيم۔ اصبہانی نے الترغیب میں حضرت ابن عمرؓ کی روایت سے لکھا ہے کہ رسول اللہ فرما رہے تھے سبحان الله ترازو کے آدھے پلڑے کو اور الحمد لله پوری ترازو کو بھر دے گا۔ مسلم نے حضرت ابومالک اشعری کی روایت سے لکھا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا طہارت نصف ایمان ہے اور الحمد لله ترازو کو پر کر دے گا۔ ابن عساکر نے حضرت ابوہریرہؓ کی روایت سے بھی ترغیب کی روایت کی طرح حدیث نقل کی ہے۔ بزاز اور حاکم نے حضرت ابن عمرؓ کی روایت سے بیان کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا حضرت نوحؑ نے اپنی وفات کے وقت دو بیٹوں کو بلایا اور فرمایا میں تم کو لا اله الا الله کے یقین رکھنے اور اعتراف کرنے کا حکم دیتا ہوں کیونکہ آسمانوں اور زمین کو مع اس کی موجودات کے اگر میزان کے ایک پلڑے میں رکھا جائے اور دوسرے پلڑے میں لا اله الا الله کو رکھا جائے تو یہ (موخر الذکر) پلڑا بھاری پڑے گا۔ ابو یعلیٰ، ابن حبان اور حاکم نے حضرت ابو سعید خدریؓ کی روایت سے بیان کیا ہے اور حاکم نے اس کو صحیح بھی کہا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا اللہ نے (حضرت موسیٰؑ سے) فرمایا موسیٰؑ اگر تمام آسمان اور میرے علاوہ ان کی ساری موجودات اور ساتوں زمینیں ایک پلڑے میں ہوں اور دوسرے پلڑے میں لا اله الا الله ہو تو یہ ان (آسمان و زمین) کو لے جھکے گا (یعنی ان کا پلڑا اونچا ہو جائے گا)۔

طبرانی نے حضرت ابن عباسؓ کی روایت سے لکھا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا قسم ہے اس کی جس کے ہاتھ میں میری جان ہے اگر تمام آسمان و زمین اور ان کے اندر کی موجودات اور دونوں کے درمیان کی کائنات اور زمینوں کے نیچے کی مخلوقات سب کو لا کر میزان کے ایک پلڑے میں اور لا اله الا الله کی شہادت دوسرے پلڑے میں رکھ دی جائے تو یہ ان سب سے وزنی ہوگی۔ ابوداؤد، ترمذی اور ابن حبان نے حضرت ابوالدرداء کی روایت سے لکھا ہے اور ترمذی نے اس کو صحیح کہا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا حسن اخلاق سے زیادہ بھاری میزان میں کوئی چیز نہیں (ہوگی)۔ بزاز، طبرانی، ابو یعلیٰ، ابن ابی الدنیا اور بیہقی نے حسن سند سے بیان کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے (حضرت ابوذرؓ سے) فرمایا ابوذر کیا میں تجھے دو خصلتیں نہ بتاؤں جو

پشت پر تو ہلکی ہیں (یعنی جن کو اٹھانا آسان ہے) مگر میزان میں تمام دوسری چیزوں سے بھاری ہوں گی۔ حضرت ابوذرؓ نے عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ ضرور ارشاد فرمائیے۔ فرمایا حسن خلق اور زیادہ خاموشی کو اختیار کر، قسم ہے اس کی جس کے ہاتھ میں میری جان ہے ان دونوں کے برابر مخلوق کا کوئی عمل نہیں۔ امام احمدؒ نے الزہد میں حازم نامی ایک شخص کی روایت سے لکھا ہے کہ حضور اقدس ﷺ کی خدمت میں ایک شخص (بیٹھا) رو رہا تھا اتنے میں حضرت جبرئیلؑ آئے اور پوچھا یہ کون ہے۔ حضور ﷺ نے فرمایا فلاں شخص ہے۔ حضرت جبرئیلؑ نے کہا اولاد آدم کے تمام اعمال کا وزن ہو سکتا ہے صرف رونے کا وزن نہیں ہو سکتا، اللہ ایک آنسو سے آگ کے سمندر بجھا دے گا۔ بیہقی نے حضرت معقل بن یسار کی روایت سے بیان کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جب آنکھ آنسو بہاتی ہے تو اللہ تمام جسم کو (اس کی وجہ سے) دوزخ پر حرام کر دیتا ہے اور جب آنسو رخسار پر بہتا ہے تو اس چہرہ پر بدرونقی اور ذلت نہیں چھائے گی۔ ہر چیز (یعنی عمل) کا ایک اندازہ اور وزن ہے مگر کسی قوم میں سے اگر کوئی شخص (اللہ کے سامنے) اس کے خوف سے روتا ہے تو اس کا ایک آنسو آگ کے سمندروں کو بجھا دیتا ہے۔

میں کہتا ہوں مذکورۂ بالا احادیث سے بظاہر یہی سمجھ میں آتا ہے کہ نفس اعمال کا وزن کیا جائے گا لیکن ان ہی احادیث کا یہ مطلب بھی ہو سکتا ہے کہ اعمال ناموں کا اور اعمال کرنے والوں کا وزن کیا جائے گا۔ اعمال کو مجسم بنا کر تولنے کا ثبوت مندرجہ ذیل روایات سے ملتا ہے۔

بیہقی نے شعب الایمان میں (بطریق سدی صغیر از کلبی از ابو صالح) حضرت ابن عباسؓ کا قول نقل کیا ہے کہ میزان کی ایک زبان اور دو پلڑے ہوں گے نیکیاں اور بدیاں اسی میں تولی جائیں گی۔ نیکیوں کو حسین ترین شکل میں لا کر میزان کے پلڑے میں رکھ دیا جائے گا اور بدیوں کے پلڑے سے اس کا وزن زیادہ نکلے گا تو اس خوبصورت شکل کو لے کر جنت کے اندر اس کے مقام پر رکھ دیا جائے گا پھر مومن سے کہا جائے گا اپنے عمل سے جا کر مل جا۔ مومن جنت کی طرف چلا جائے گا اور وہاں اپنا مقام اپنے عمل کی وجہ سے پہچان لے گا (کیونکہ اس کا عمل حسین شکل میں وہاں پہلے سے موجود ہو گا) اور بدیوں کو مکروہ ترین شکل میں لا کر ترازو کے ایک پلڑے میں رکھا جائے گا۔ یہ پلڑا ہلکا نکلے گا اور باطل کا وزن ہلکا ہوتا ہی ہے پھر اس کو جہنم میں اس کے مقام پر پھینک دیا جائے گا اور اس (گناہ گار بدکار) سے کہا جائے گا جا دوزخ میں اپنے عمل سے جا کر مل جا۔ وہ دوزخ میں چلا جائے گا اور اپنے عمل کو دیکھ کر ہی اپنا مقام اور طرح طرح کے ان عذابوں کو پہچان جائے گا جو اللہ نے اس کے لئے فراہم کر رکھے ہوں گے۔ حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا لوگ جمعہ کے دن (جمعہ کی نماز کے بعد) گھروں کو لوٹتے ہیں اور اپنے اپنے مقاموں کو پہچانتے ہیں۔ دوزخی اور جنتی دوزخ اور جنت کے اندر اپنے اعمال کی موجودگی کی وجہ سے اپنے اپنے مقاموں کو ان نمازیوں سے بھی زیادہ جانتے ہوں گے چونکہ اس حدیث کی روایت سدی صغیر کے طریق سند سے ہے اس لئے یہ حدیث ضعیف ہے۔

ابن مبارک نے حماد بن ابی سلیمان کا بیان نقل کیا ہے کہ قیامت کے دن ایک شخص کو اپنا عمل حقیر دکھائی دے گا اتنے میں ایک چیز بادل کی طرح آ کر میزان کے پلڑے میں گر جائے گی اور (فرشتہ یا کوئی اور) کہے گا یہ وہ نیکی ہے جس کی تعلیم تو لوگوں کو دیتا تھا تیرے بعد وہ نیکی نسل در نسل چلتی رہی (یہاں تک کہ آج) اسی کا تجھے اجر دیا جا رہا ہے۔ ابن عبدالرزاق نے ابراہیم نخعی کی روایت سے بھی یہ قول نقل کیا ہے۔

طبرانی نے حضرت ابن عباسؓ کا بیان نقل کیا ہے۔ حضرت ابن عباسؓ کا بیان ہے میں نے خود سنا رسول اللہ ﷺ فرما رہے تھے جو شخص کسی جنازہ کے ساتھ جائے گا اس کے لئے میزان میں (نیکی کے) دو قیراط جو کوہ احد کے برابر ہوں گے رکھے جائیں گے۔ اصبہانی نے حضرت انسؓ کی روایت سے لکھا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا فرض نماز کا اللہ کے نزدیک ایک وزن ہے جو شخص فرض نماز میں کچھ کمی کرے گا اس سے اس کمی کا حساب لیا جائے گا۔ ابوداؤد نے حضرت ابوہریرہؓ کی مرفوع حدیث نقل کی ہے کہ فرض نماز میں اگر کچھ نقصان ہو جاتا ہے تو اللہ تعالیٰ (فرشتوں سے) فرماتا ہے دیکھو میرے بندہ کے کچھ نوافل ہیں اگر کچھ نوافل ہوں تو فرض کی کمی نوافل سے پوری کر دی جاتی ہے۔

بعض احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ عمل سے تعلق رکھنے والے جسم کا وزن کیا جائے گا۔ طبرانی نے الاوسط میں حضرت جابرؓ کی روایت سے لکھا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا قیامت کے دن بندہ کی ترازو میں سب سے پہلے اس نفقہ کو رکھا جائے گا جو بندہ نے اپنے گھر والوں کے لئے کیا ہوگا۔ صحیحین میں حضرت ابوہریرہؓ کی روایت سے آیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جس نے اللہ کے وعدہ کو سچا جانتے ہوئے اور ایمان رکھتے ہوئے کوئی گھوڑا (اپنے جہاد یا دوسرے مسلمان مجاہد کے لئے) روک رکھا ہوگا تو اس گھوڑے کا کھانا پینا، لید اور پیشاب (سب کچھ) قیامت کے دن اس کی میزان (کے نیکیوں کے پلڑے) میں رکھا جائے گا۔ طبرانی نے حضرت علیؓ کی روایت سے لکھا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جس نے کوئی گھوڑا اللہ کی راہ میں جہاد کرنے کے لئے باندھ رکھا تو گھوڑے کا چارہ اور نشانات قدم قیامت کے دن اس کی (نیکیوں کی) میزان میں رکھے جائیں گے۔ اصبہانی نے حسن سند سے حضرت علیؓ کی روایت سے بیان کیا کہ رسول اللہ ﷺ نے حضرت فاطمہؓ سے فرمایا اٹھو اور اپنی قربانی (ذبح) ہونے کے وقت اس کے پاس خود موجود رہو جو قطرہ اس کے خون کا ٹپکے گا وہ تمہارے لئے ہر گناہ کی مغفرت کا سبب ہوگا۔ خوب سن لو اس کا خون اور گوشت لا کر ستر گنا کر کے تمہاری میزان میں (قیامت کے دن وزن کے وقت) رکھ دیا جائے گا۔ یہ سن کر ابو سعید نے عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ کیا یہ حکم آل محمد ﷺ کے لئے مخصوص ہے فرمایا آل محمد ﷺ کے لئے بھی ہے اور عام مسلمانوں کے لئے بھی۔ بیہقی نے حضرت ابن مسعودؓ کی روایت سے اور ابن حبان نے حضرت ابوذرؓ کی روایت سے اور ابن عساکر نے ضعیف سند سے حضرت ابوہریرہؓ کی روایت سے بیان کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جس نے وضو کر کے صاف کپڑے سے (وضو کا پانی) پونچھ لیا تو کوئی حرج نہیں اور اگر ایسا نہیں کیا (یعنی وضو کا پانی نہ پونچھا) تو یہ افضل ہے کیونکہ قیامت کے دن دوسرے اعمال کے ساتھ وضو کو بھی طلب کیا جائے گا۔ ابن ابی شیبہ نے مصنف میں لکھا ہے کہ سعید بن مسیب نے وضو کے بعد رومال کو پسند نہیں کیا اور فرمایا اس کا بھی (نیکیوں کے ساتھ) وزن کیا جائے گا۔

طبرانی نے لکھا ہے کہ حضرت عمر بن خطابؓ نے فرمایا میں نے ایک اونٹنی اللہ کی راہ میں دے دی پھر اس کا بچہ خریدنے کا ارادہ کیا اور رسول اللہ ﷺ سے مسئلہ دریافت کیا فرمایا رہنے دو، قیامت کے دن یہ اور اس کی اولاد سب تمہاری میزان میں آئے گی۔ ترمذی نے حضرت عمران بن حصینؓ کی روایت سے لکھا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا قیامت کے دن علماء کی روشنائی اور شہیدوں کے خون کا وزن کیا جائے گا۔ علماء کی روشنائی شہیدوں کے خون سے بھاری نکلے گی۔

فَمَنْ ثَقُلَتْ مَوَازِينُهُ فَأُولَٰئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ ۝ (سو جن لوگوں (کی نیکیوں) کے پلڑے بھاری ہوں گے تو ایسے ہی لوگ (پورے پورے) کامیاب ہوں گے۔

مَوَازِينُ مَوْزُونٌ کی جمع ہے یعنی تولے جانے والے اعمال مراد ہیں نیکیاں، مجاہد کا یہی قول ہے۔ یا مَوَازِينُ میزان کی جمع ہے اور اس سے مراد ہے میزان کا نیکیوں والا پلڑا اس توجیہ پر ماننا پڑے گا کہ آیت کی روشنی میں ہر شخص کی میزان جدا جدا ہے۔ الْمُفْلِحُونَ سے مراد یہ ہے کہ یہی لوگ نجات اور ثواب پائیں گے (باقی مسلمان گناہگار جن کی مغفرت ہو جائے گی وہ اگرچہ عذاب سے نجات پائیں گے مگر چونکہ ان کے پاس نیکیاں نہ ہوں گی اس لئے ثواب نہیں پائیں گے۔

وَمَنْ خَفَّتْ مَوَازِينُهُ فَأُولَٰئِكَ الَّذِينَ خَسِرُوا أَنفُسَهُم بِمَا كَانُوا بِآيَاتِنَا يَظْلِمُونَ ۝ (اور جن (کی نیکیوں) کے پلڑے ہلکے ہوں گے سو وہ لوگ وہی ہوں گے جنہوں نے خود اپنا نقصان کر لیا ہماری آیتوں کی حق تلفی کرنے کے سبب)۔

مَوَازِينُ سے اس جگہ بھی نیکیاں یا نیکیوں کا پلڑا مراد ہے۔ بظاہر اس آیت کے عموم میں بدکار کافر بھی داخل ہیں اور وہ مومن بھی جن کی بدیوں کا پلڑا نیکیوں کے پلڑے سے بھاری ہوگا لیکن اس جگہ صرف کفار مراد ہیں کیونکہ قرآنی بیان کا اسلوب ہی یہ ہے کہ نیکوکار مومنوں کے مقابلہ میں کافروں کا تذکرہ کرتا ہے باقی جو مسلمان مخلوط الاعمال ہیں نیکیاں بھی کرتے ہیں اور بدیاں بھی ان کا ذکر عموماً نہیں کیا جاتا۔ الَّذِينَ خَسِرُوا سے یہ مراد ہے کہ ان لوگوں نے اپنی پیدائشی فطرت سلیمہ کو کھو دیا اور

عذاب آخرت اعمال کا ارتکاب کیا اور آیات کی تصدیق کرنے کے بجائے تکذیب کرنے لگے۔ اس طرح آیات کے ساتھ ظلم کیا۔ سورۃ القارعہ کی آیت فَمَنْ ثَقُلَتْ مَوَازِيْنُهٗ فَهُوَ فِيْ عِيْشَةٍ رَّاضِيَةٍ وَاَمَّا مَنْ خَفَّتْ مَوَازِيْنُهٗ فَاُمُّهٗ هَاوِيَةٌ کی تفسیر کے ذیل میں ہم نے حاضر الذکر آیت کے مضمون کی تشریح کر دی ہے۔

حضرت ابوبکر صدیقؓ نے وفات کے وقت حضرت عمر فاروقؓ کو نصیحت کرتے ہوئے فرمایا تھا قیامت کے دن جس کی میزان بھاری ہوگی وہ صرف اس وجہ سے بھاری ہوگی کہ دنیا میں وہ حق کا اتباع کرتا تھا جس میزان میں کل حق کو رکھا جائے گا اس کو بھاری ہونا ہی چاہئے اور جس کی میزان قیامت کے دن ہلکی ہوگی اس کے ہلکے ہونے کی وجہ صرف یہ ہوگی کہ وہ دنیا میں باطل کا اتباع کرتا تھا اور جس میزان میں باطل کو رکھا جائے گا اس کو ہلکا ہونا ہی چاہئے۔

میں کہتا ہوں اس میں میزان سے مراد ہے نیکیوں کا پلڑا اور باطل سے مراد ہیں وہ باطل عقائد و اعمال جن کو اہل باطل نیکیاں سمجھتے ہیں مگر اللہ کے نزدیک وہ سراسر کفریات اور بدعات ہیں اللہ کے نزدیک ان کا کوئی وزن نہیں، جیسے لق و دق بیابان میں سراب جس کو دور سے دیکھنے والا پیاسا پانی سمجھتا ہے اور قریب جاتا ہے تو کچھ نہیں پاتا اسی طرح کافر اور مبتدع کو اللہ کے پاس جا کر کچھ نہیں ملے گا اور اللہ تعالیٰ اس سے پوری پوری حساب فہمی کرے گا۔

وَلَقَدْ مَكَّنّٰكُمْ فِي الْاَرْضِ (اور بے شک ہم نے تم کو زمین پر جمایا) یعنی زمین پر رہنے بسنے اور دوسرے کاروبار کرنے کی ہم نے تم کو قدرت عطا کی۔

وَجَعَلْنَا لَكُمْ فِيْهَا مَعَايِشَ ۭ (اور ہم نے تمہارے لئے اس میں سامان زندگی پیدا کیا)۔

مَعَايِشَ، معیشۃ کی جمع ہے یعنی زندگی بسر کرنے کے اسباب کھیتی باڑی، مویشی، کھانے پینے کا سامان، تجارت اور کمائی کے پیشے وغیرہ۔

قَلِيْلًا مَّا تَشْكُرُوْنَ ۝ (مگر تم لوگ بہت ہی کم شکر کرتے ہو)۔ یعنی میرے ان احسانات کا تم تھوڑا شکریہ یا تھوڑے وقت شکریہ ادا کرتے ہو۔

وَلَقَدْ خَلَقْنٰكُمْ (اور ہم نے تمہارا اندازہ کیا) یعنی اپنے علم میں ہم نے تمہارا اندازہ کر لیا تھا جبکہ تم (عالم وجود و مادیت میں آنے سے پہلے) اعیان ثابتہ (حقائق کونیہ، ماہیات امکانیہ اور مرتبہ تقرر) میں تھے (اعیان ثابتہ کا مرتبہ موجود ہونے سے پہلے کا تھا جب کہ ہر ممکن الوجود چیز اللہ کے کشفی ازلی علم کے اندر اپنی تمام کیفیات و کمیات کے ساتھ متقرر تھی)۔

ثُمَّ صَوَّرْنٰكُمْ (پھر تمہاری صورت بنائی) یعنی تمہارے باپ آدمؑ کی صورت بنائی مطلب یہ کہ تمہاری تخلیق اور صورت سازی کا آغاز اس طرح کیا کہ تمہارے باپ آدمؑ کا ازلی علمی اندازہ کیا پھر اس کی صورت بنائی یہی تمہاری تخلیق و صورت گری کی ابتدا ہوئی۔ حضرت ابن عباسؓ، قتادہؒ، ضحاکؒ اور سدیؒ نے آیت کی تشریح اس طرح کی کہ ہم نے تمہارے اصول و آباء کو پیدا کیا۔ پھر ماؤں کے پیٹوں میں تمہاری صورتیں بنائیں۔ مجاہد نے کہا ہم نے تم کو یعنی تمہارے باپ آدمؑ کو بنایا، پھر آدمؑ کی پشت میں تمہاری صورتیں بنائیں۔ آدمؑ چونکہ ابوالبشر تھے اس لئے ان کی تخلیق کو تمام نسل کی تخلیق قرار دیا۔ بعض نے صَوَّرْنٰكُمْ کا مطلب اس طرح لکھا ہے کہ روز میثاق میں تمہاری صورتیں پیدا کیں جبکہ چیونٹیوں کی طرح تم کو برآمد کیا۔

عکرمہ نے کہا ہم نے باپوں کی پشت میں تم کو پیدا کیا پھر ماؤں کے پیٹوں کے اندر تمہاری شکلیں پیدا کیں۔ یمان نے کہا رحم کے اندر انسان کو بنایا پھر اس کی صورت گری کی۔ کان، آنکھیں اور انگلیاں چیریں۔ بعض علماء کے نزدیک آیت میں لفظ ثُمَّ (تراخی کے لئے نہیں ہے بلکہ) واؤ کی طرح صرف عطف کے لئے ہے یعنی تم کو پیدا کیا اور تمہاری صورت بنائی (یہ صراحت کرنے کی وجہ یہ ہے کہ) بعض مخلوقات کو صورت نہیں دی گئی ہے جیسے ارواح (اور ہوائیں)۔

ثُمَّ قُلْنَا لِلْمَلٰۗىِٕكَةِ اسْجُدُوْا لِاٰدَمَ ڤ فَسَجَدُوْٓا اِلَّآ اِبْلِيْسَ ۭ لَمْ يَكُنْ مِّنَ السّٰجِدِيْنَ ۝

(پھر ہم نے فرشتوں کو حکم دیا کہ آدم کو سجدہ کرو سو سب نے سجدہ کیا بجز ابلیس کے کہ وہ سجدہ کرنے والوں میں شامل نہ ہوا)۔ اگر مخاطب کی ضمیر (جمع) سے صرف آدم مراد ہوں تو کسی تاویل کی ضرورت نہیں اور اگر نسل آدم مراد ہو تو (اعتراض کیا جا سکتا ہے کہ نسل آدم کو پیدا کرنے کے بعد تو سجدہ کرنے کا فرشتوں کو حکم نہیں دیا گیا) اس وقت توجیہ کرلی ہوگی۔ اس صورت میں بعض کے نزدیک ثم مطلق عطف کے لئے ہوگا اور بعض کے نزدیک آیت کا مطلب یہ ہوگا کہ تم کو پیدا کرنے کے بعد ہم نے تم کو اطلاع دی کہ ہم نے فرشتوں کو سجدۂ آدم کا حکم دیا تھا۔ آیت کی پوری تفسیر سورۂ بقرہ میں گزر چکی ہے۔

قَالَ مَا مَنَعَكَ اَلَّا تَسْجُدَ اِذْ اَمَرْتُكَ ؕ اللہ نے فرمایا (اے ابلیس) جب میں نے تجھ کو حکم دے دیا تو سجدہ نہ کرنے کی وجہ مانع کونسی ہے۔ اَلَّا تَسْجُدَ میں لا زائد ہے جیسے لِئَلَّا يَعْلَمَ میں ہے جس فعل پر لا داخل ہوا ہے اس کو مضبوط کر رہا ہے اور اس بات پر تنبیہ کر رہا ہے کہ ترک سجود موجب سرزنش ہے۔ بعض نے کہا کہ (لا زائد نہیں ہے) جس شخص کو کسی کام سے روک دیا جائے تو وہ اس کام کے خلاف کام کرنے پر مجبور ہوتا ہے گویا اس وقت مطلب اس طرح ہوگا۔ کس چیز نے تجھے سجدہ نہ کرنے پر مجبور کیا۔ بعض نے کہا کلام کا کچھ حصہ محذوف ہے۔ اصل کلام اس طرح تھا تجھے تعمیل حکم سے کس چیز نے روکا اور سجدہ نہ کرنے کا باعث کیا ہے۔ تعمیل حکم نہ کرنے کی وجہ معلوم تھی لیکن باوجود علم کے اس لئے استفسار کیا کہ ابلیس کو سرزنش ہو اور اس سے عناد و کفر اور غرور کا اظہار ہو جائے۔ آیت سے ثابت ہو رہا ہے کہ مطلق امر وجوب کے لئے ہوتا ہے (یعنی امر کا صیغہ اگر استعمال کیا جائے اور خلاف وجوب کوئی قرینہ موجود نہ ہو تو اس کی تعمیل لازم ہے)۔

قَالَ اَنَا خَيْرٌ مِّنْهُ ۚ خَلَقْتَنِيْ مِنْ نَّارٍ وَّخَلَقْتَهٗ مِنْ طِيْنٍ ﴿۱۲﴾ (ابلیس نے کہا میں اس سے افضل ہوں تو نے مجھے آگ سے بنایا ہے اور اس کو مٹی سے) یہ کلام بظاہر لفظ کے اعتبار سے تو سوال کا جواب نہیں ہے مگر معنی کے لحاظ سے سوال کا پورا جواب ہے اسی لئے جملہ کو (بغیر حرف ربط کے) بصورت استقلال ذکر کیا گویا ابلیس نے اپنی ہستی کو آدم کے سامنے سجدہ ریز ہونے سے بہت بعید قرار دیتے ہوئے کہا کہ میرے لئے سجدہ سے مانع میری افضلیت اور برتری ہے افضل کا مفضول کو سجدہ کرنا زیبا نہیں اس لئے مفضول کے سامنے سجدہ ریز ہونے کا افضل کو حکم دینا نامناسب ہے۔ ابلیس کے کلام میں اللہ کے حکم پر اعتراض ہے۔ نار سے مراد ہے روح کے جنے والا نورانی جوہر اور طین سے پیچھے کرنے والا تاریک تیرہ مراد ہے۔ حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا سب سے پہلے ابلیس نے قیاس سے کام لیا اور قیاس میں غلطی کی لہٰذا جو شخص دین کا قیاس اپنی رائے پر کرتا ہے اللہ ابلیس سے اس کا جوڑ لگا دے گا۔ ابن سیرینؒ نے فرمایا سورج کی پوجا بھی قیاس کے ہی گھوڑے دوڑانے کی بنا پر کی گئی۔

میں کہتا ہوں ان دونوں قولوں سے قیاس کا بے حقیقت ہونا ثابت نہیں ہوتا بلکہ ابلیس کے قیاس کا غلط ہونا ظاہر کیا گیا ہے (صحیح قیاس کی ممانعت نہیں کی گئی) کیونکہ ابلیس نے نص شرعی کے مقابل اپنے قیاس سے کام لیا تھا اسی لئے حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا من قاس الدین بشیء من رأیہ یعنی شرعی نصوص کے مقابل اور مخالف جس نے اپنی رائے چلائی اس کو اللہ ابلیس کا قرین اور ساتھی بنا دے گا پھر یہ بات خود بھی بیہودہ غلط ہے کہ برتری اور افضلیت کی بنیاد روشنی اور بلندی کی جانب حرکت کو قرار دیا جائے (جیسا کہ آگ میں ہوتا ہے اور اسی علت کو ابلیس نے اپنی دلیل میں پیش کیا) بلکہ عطائے برتری اللہ کے ہاتھ میں ہے جس کو چاہتا ہے افضلیت سے نوازتا ہے۔ اللہ نے اپنی مشیت سے آدم کو تمام مخلوق پر برتری عطا فرمائی اپنے دست قدرت سے خصوصی طور پر ان کو بنایا اپنی روح (کا ایک جلوہ) ان کے اندر پھونک دیا ان کو تمام اسماء کو سیکھنے کے قابل بنایا اپنی تجلیات کی پرتو اندازی کی مورد ان کو کردیا۔ تجلیات کی عنایت اور اکتساب کمالات کے ساتھ فرائض و نوافل کی توفیق کے ذریعے سے ان کو اپنا قرب عطا فرمایا وہ امانت جس کو برداشت کرنے سے آسمان و زمین اور پہاڑ بھی خوف زدہ ہو گئے تھے ان کا حامل ان کو بنا دیا۔

ایک شبہ

اجتہادی خطا تو معاف ہے پھر قیاسی غلطی کی سے شیطان کی کیوں گرفت کی گئی۔

ازالہ

اجتہادی غلطی معاف ہے بشرطیکہ اجتہاد کرنے والا حق کا طلب گار ہو اور حق کی تلاش میں اپنی امکانی اجتہادی کوشش صرف کر دے۔ اس شخص کی اجتہادی خطا معاف نہیں جو سرکش ہو، ہمہ طور اپنے حریف پر غالب آجانے کا خواستگار ہو اپنے تفوق کا طالب ہو۔ دیکھو اِنِّیْ جَاعِلٌ فِی الْاَرْضِ خَلِیْفَةً کے جواب میں فرشتوں نے بھی تو کہا تھا اَتَجْعَلُ فِیْهَا مَنْ یُّفْسِدُ فِیْهَا وَیَسْفِكُ الدِّمَآءَ وَنَحْنُ نُسَبِّحُ بِحَمْدِكَ وَنُقَدِّسُ لَكَ اور اس قیاس میں انہوں نے غلطی بھی کی تھی اسی لئے اللہ نے ان کے قول کی تردید میں فرمایا اِنِّیْۤ اَعْلَمُ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ مگر چونکہ فرشتوں کا قول غرور تکبر اور سرکشی کے زیر اثر نہ تھا بلکہ طلب حق اور استفہام حکمت کے ماتحت تھا اس لئے ان کو مردود نہیں بنایا فرشتوں کے گویائے حق ہونے اور سرکشی نہ کرنے کا ثبوت ان کے آخری قول سے ملتا ہے جس میں انہوں نے کہا تھا سُبْحٰنَكَ لَا عِلْمَ لَنَاۤ اِلَّا مَا عَلَّمْتَنَا اِنَّكَ اَنْتَ الْعَلِیْمُ الْحَكِیْمُ۔ اہل دانش کا قول ہے کہ مٹی کی سرشت میں وزن وقار، برداشت اور صبر داخل ہے۔ یوں تو آدم کے لئے پہلے سے ہی ازلی سعادت مقدر تھی مگر مٹی کی سرشت ہی ان کو توبہ، عجز اور زاری کی طرف لے گئی اور اسی فطرت کی وجہ سے ان کو توبہ، ہدایت اور برگزیدگی نصیب ہوئی۔ اور آگ کی فطرت میں ہلکا پن، اضطراب، تیزی اور بلند طلبی داخل ہے۔ ابلیس کے لئے یوں تو پہلے سے بدبختی مقدر ہو چکی تھی مگر اس کی آتشیں فطرت نے ہی اس کو تکبر اور ضد پر آمادہ کیا اور لعنت و شقاوت کا حق دار بنایا۔ اس سے آگ پر مٹی کی برتری ثابت ہوتی ہے۔ آگ پر مٹی کی فضیلت اس وجہ سے بھی ہے کہ مٹی اشیاء کو سمیٹتی اور جمع کرتی ہے اور آگ منتشر اور پراگندہ کرتی ہے مٹی نباتات کی زندگی کا سبب ہے اور آگ نباتات کو تباہ کر دیتی ہے۔

انسان کی مکمل ساخت مٹی کی اور شیطان کی پوری بناوٹ آگ کی اگرچہ نہیں ہے لیکن انسان کی ساخت میں بیشتر حصہ مٹی کا اور شیطان کی ساخت میں بیشتر حصہ آگ کا ہے اور دونوں کا غالب عنصر مٹی اور آگ ہے۔ اس لئے اول الذکر کو مٹی کا ساخت اور مؤخر الذکر کو آگ کا ساختہ قرار دیا۔ مِنْ طِیْنٍ کے لفظ سے معلوم ہو رہا ہے کہ انسان کا امتیازی نشان عالم خلق (یعنی مادی عنصر) ہے عالم امر (یعنی روح اور اس کی غیر مادی طاقتیں) عالم خلق کا تابع ہے اس کو خیر و شر سے متصف عالم خلق کی نیکی و بدی کی وجہ سے ہی تسلیم کر لیا جاتا ہے اور عالم خلق کے رنگ ہی سے عالم امر رنگ جاتا ہے جیسے سورج کا عکس اگر آئینہ پر پڑتا ہے تو آئینہ کی جیسی شکل ہوتی ہے سورج کی روشنی کی بھی وہی شکل ہو جاتی ہے (یعنی روح سورج کی شعاعوں کی طرح ہے اور جسم آئینہ کی طرح)

حضرت مجدد نے فرمایا عالم امر کی وجہ سے انسان کی انتہائی ترقی صفات کے پرتو تک ہوتی ہے (صفات تک پہنچ نہیں ہوتی) بابا مرتبہ انسان کی ترقی بعض صفات تک ہو جاتی ہے اور ہو سکتی ہے، آگے نہیں، عنصر کی ترقی کا منتہیٰ ظاہر صفات ہے (ظاہر صفات اور باطن صفات کا فرق یہ ہے کہ ظاہر صفات تک اس بات کا عرفان ممکن ہے کہ ان صفات کا قیام کی ذات سے ہے نہیں اور باطن صفات میں ذات کے ساتھ صفات کا قیام محسوس ہوتا ہے) اور مرتبہ ذات تک ترقی صرف عنصر خاک کے ساتھ مخصوص ہے جیسے قلب کی شعاعیں لطیف ترین چیز میں نمایاں نہیں ہوتیں اندر گھس کر نکل جاتی ہیں اور کثیف جسم پر پڑتی ہیں تو نمایاں ہوتی ہیں۔

قَالَ فَاهْبِطْ مِنْهَا (یعنی اللہ نے ابلیس سے) فرمایا یہاں (یعنی جنت یا آسمان) سے اتر جا۔ یعنی جب تو مغرور ہے تو اتر جا یہ جگہ اہل تواضع اور اطاعت شعار بندوں کی ہے۔

فَمَا یَكُوْنُ لَكَ اَنْ تَتَكَبَّرَ فِیْهَا (تو نہیں ملتا کہ آسمان میں رہ کر تو تکبر کرے)۔ یعنی تیرے لئے آسمان میں رہ کر تکبر جائز نہیں۔ اس جملہ میں اس امر پر تنبیہ ہے کہ اہل جنت کے لئے تکبر زیبا نہیں۔ کبریائی تو اللہ ہی کے لئے ہے۔ ابلیس تکبر کی وجہ سے ہی راندۂ درگاہ ہوا اور آسمان سے نکالا گیا۔ حضرت ابن مسعودؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جس کے دل میں رائی کے دانہ کے برابر (بھی) غرور ہوگا وہ جنت میں نہیں جائے گا (رواہ مسلم) مسلم کی دوسری روایت میں اس کے بعد یہ بھی آیا

ہے کہ ایک شخص نے عرض کیا یا رسول اللہ بعض لوگ (اپنے لئے) اچھا کپڑا اور اچھا جوتا پسند کرتے ہیں (کیا یہ بھی غرور کی علامت ہے) فرمایا اللہ (خود) جمیل ہے، جمال کو پسند فرماتا ہے۔ غرور تو حق کے مقابلہ میں اکڑنا اور لوگوں کی تحقیر کرنا ہے۔
حضرت حارثہ بن وہبؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا میں تم کو بتاؤں کہ جنتی کون ہے اور دوزخی کون۔ وہ کمزور آدمی جس کو لوگ کمزور سمجھتے ہیں (یعنی ذلیل سمجھتے ہیں) لیکن اگر وہ اللہ کے اعتماد پر قسم کھالیتا ہے تو اس کی قسم پوری کر دیتا ہے (جنتی ہے) اور ہر بد خلق، درشت خو، تند مزاج، مغرور دوزخی ہے۔ متفق علیہ۔ حضرت ابوہریرہؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا (اللہ کا ارشاد ہے کہ) بڑائی میری چادر اور بڑائی میری لنگی ہے جو شخص ان دونوں میں سے کسی ایک کے لئے بھی مجھ سے کشاکشی کرے گا میں اس کو دوزخ میں داخل کر دوں گا۔ دوسری روایت میں ہے میں اس کو دوزخ میں پھینک دوں گا۔ رواہ مسلم۔

فَاخْرُجْ إِنَّكَ مِنَ الصَّاغِرِينَ ۝ (یہاں سے) نکل جا بلا شبہ تو ذلت پانے والوں میں سے ہے) یعنی اللہ اور اللہ کے دوستوں کی نظر میں ذلیل ہے۔ ہر شخص تجھے برا کہے گا اور ہر زبان تجھ پر لعنت کرے گی۔ قاموس اور دوسری لغت کی کتابوں میں ہے کہ صاغر وہ شخص ہوتا ہے جو اپنے ذلیل مقام پر خوش ہو۔ اسی سے معلوم ہوتا ہے کہ غرور کرنے اور بڑائی کا جھوٹا دعویٰ کرنے کے لئے ذلت و حقارت لازم ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا جو اللہ کے لئے فروتنی کرتا ہے اللہ اس کو اونچا کرتا ہے وہ خود اپنے کو تو چھوٹا سمجھتا ہے مگر لوگوں کی نظروں میں بڑا ہوتا ہے اور جو تکبر کرتا ہے اللہ اس کو پست کر دیتا ہے وہ اپنے خیال میں تو بڑا ہوتا ہے مگر لوگوں کی آنکھوں میں کتے اور سور سے بھی زیادہ ذلیل ہوتا ہے۔ رواہ البیہقی فی شعب الایمان از عمرؓ۔ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا برا ہے وہ بندہ جو غرور کرتا اور اتراتا ہے اور اللہ بزرگ و برتر کو بھول جاتا ہے۔ ترمذی نے حضرت اسماءؓ کی روایت سے اس حدیث کو نقل کیا ہے لیکن صراحت کر دی ہے کہ یہ حدیث غریب ہے اس کی سند قوی نہیں ہے۔

قَالَ أَنْظِرْنِي إِلَىٰ يَوْمِ يُبْعَثُونَ ۝ (ابلیس نے کہا مجھے اس دن تک چھوٹ دے دے جس دن لوگوں کو اٹھایا جائے گا) یعنی تو میری میعاد زندگی طویل کر دے اور روز بعثت تک یعنی اس روز تک کہ دوبارہ صور پھونکا جائے اور لوگوں کو قبروں سے اٹھایا جائے مجھ پر موت کو مسلط نہ کر۔

قَالَ إِنَّكَ مِنَ الْمُنْظَرِينَ ۝ (اللہ نے فرمایا یقیناً تو مہلت پانے والوں میں سے ہے) یعنی تجھے موت سے چھوٹ دے دی گئی۔

یہاں وقت مہلت کی حد بندی نہیں کی گئی مگر دوسری آیت میں مہلت زندگی کی تعیین فرما دی ہے فرمایا ہے إِنَّكَ مِنَ الْمُنْظَرِينَ إِلَىٰ يَوْمِ الْوَقْتِ الْمَعْلُومِ وقت معلوم کے دن تک تجھے چھوٹ دے دی گئی۔ وقت معلوم سے مراد یا تو وہ وقت ہے جس کا علم اللہ کے علم میں ہے (تم کو نہیں بتایا گیا) یا وہ وقت مراد ہے جب پہلا صور پھونکنے سے سب لوگ مر جائیں گے۔ آیت سے ثابت ہو رہا ہے کہ دعا کی قبولیت صرف فرماں بردار اور اطاعت گزاروں کے لئے ہی مخصوص نہیں ہے نہ یہ ضروری ہے کہ دعا کرنے والا مقبول بندہ ہو بلکہ کبھی کافر کی دعا ڈھیل دینے کے لئے بھی قبول کر لی جاتی ہے۔ اس میں بندوں کا امتحان ہوتا ہے اور یہ اس طرف اشارہ ہوتا ہے کہ بہتری اس کی دعا کے خلاف کرنے میں ہی ہوتی ہے۔

قَالَ فَبِمَا أَغْوَيْتَنِي لَأَقْعُدَنَّ لَهُمْ صِرَاطَكَ الْمُسْتَقِيمَ ۝ (وہ کہنے لگا اب چونکہ تو نے مجھے گمراہ کر دیا ہے تو میں بھی قسم کھاتا ہوں کہ میں ان کو گمراہ کرنے کے لئے تیرے سیدھے راستہ پر بیٹھوں گا)۔ فَبِمَا میں ف تعقیب اور باسببیہ ہے۔ فعل قسم مقدر ہے اور ما مصدری ہے یعنی اب جب کہ تو نے مجھے مہلت دے دی اور ان انسانوں کے سبب سے گمراہ بنا دیا میں تیری قسم کھاتا ہوں کہ جس طریقہ سے مجھ سے ممکن ہو گا میں ان کو بے راہ کرنے کی کوشش کروں گا چونکہ لَأَقْعُدَنَّ میں لام تاکیدی موجود ہے اس لئے بِمَا کا تعلق أَقْعُدَنَّ سے نہیں ہو سکتا۔ بعض علماء کا قول ہے کہ بِمَا أَغْوَيْتَنِي میں ب قسمیہ ہے یعنی تیرے اغواء کرنے کی قسم، مراد یہ ہے کہ تیری نافذ حکم قدرت کی قسم۔

لَاَقْعُدَنَّ جواب قسم ہے اور صراط سے مراد ہے اسلام۔ صِرَاطَكَ میں حرف جر مقدر ہے جیسے عسل الطريق الثعلب لومڑی راستہ میں تیز بھاگی۔ یہ حرف جر نکال لیا گیا ہے اور مجرور کو منصوب کر دیا گیا ہے جیسے ضرب زيد الظهر والبطن زید نے پشت اور پیٹ پر مارا۔ راستے پر بیٹھنے سے مراد ہے راہ روی سے روکنے کی انتہائی کوشش کرنا۔ جیسے رہزن قافلہ کے لئے بیٹھے ہوتے ہیں۔

ثُمَّ لَاٰتِیَنَّهُمْ مِّنْۢ بَیْنِ اَیْدِیْهِمْ وَ مِنْ خَلْفِهِمْ وَ عَنْ اَیْمَانِهِمْ وَ عَنْ شَمَآىِٕلِهِمْ (پھر ان پر حملہ کروں گا ان کے سامنے سے بھی اور پیچھے سے بھی اور ان کے داہنی اور بائیں جانب سے بھی) دشمن کے آنے اور حملہ کرنے کی جہات چار ہی ہیں بطور تشبیہ ان ہی چہار جہات کا ذکر کیا۔ مطلب یہ ہے کہ جس طریقہ سے گمراہ کرنا اور بہکانا ممکن ہو گا میں بہکاؤں گا۔ اسی لئے جہت فوق و تحت کا ذکر نہیں کیا (کیونکہ دشمن کا حملہ عموماً ان چار جہات سے ہی ہوتا ہے) بعض علماء نے کہا کہ جہت فوق کا ذکر اس لئے نہیں کیا کہ اوپر سے رحمت آتی ہے اور جہت تحت کا ذکر اس لئے نہیں کیا کہ نیچے سے آنا باعث توحش ہے۔ آگے پیچھے کے ساتھ لفظ مِنْ ذکر کیا جو ابتداء غایت کے لئے ہے اور اَیْمَان و شَمَآىِٕل کے ساتھ لفظ عَنْ ذکر کیا کیونکہ عَنْ کا معنی ہے تجاوز کرنا یعنی دائیں بائیں ہٹنا۔

بغویؒ نے علی بن طلحہؓ کی روایت سے حضرت ابن عباسؓ کا قول نقل کیا ہے کہ مِنْۢ بَیْنِ اَیْدِیْهِمْ سے مراد ہے من قبل الاخرة یعنی آخرت کے معاملہ میں ان کو شک میں ڈال دوں گا اور مِنْ خَلْفِهِمْ سے مراد ہے من دنیاھم یعنی دنیا کی رغبت دلاؤں گا اور عَنْ اَیْمَانِهِمْ سے مراد ہے امر دین یعنی امر دین کو مشتبہ بنا دوں گا اور عَنْ شَمَآىِٕلِهِمْ سے مراد ہیں گناہ یعنی گناہوں کی طرف راغب کروں گا۔ عطیہ کی روایت میں حضرت ابن عباسؓ کا تفسیری قول اس طرح آیا ہے۔ مِنْۢ بَیْنِ اَیْدِیْهِمْ دنیا کی طرف سے یعنی دنیا کو ان کے دلوں میں رچا دوں گا۔ مِنْ خَلْفِهِمْ آخرت کی طرف سے یعنی ان سے کہوں گا کہ نہ جنت ہے نہ دوزخ نہ کبھی حشر ہو گا۔ عَنْ اَیْمَانِهِمْ نیکیوں کی طرف سے۔ عَنْ شَمَآىِٕلِهِمْ بدیوں کی طرف سے۔ قتادہ کا قول بھی یہی ہے اس کے بعد حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا اے انسان ابلیس ہر طرف سے تیرے پاس پہنچا مگر اوپر سے نہیں پہنچا کیونکہ اس میں یہ طاقت نہیں کہ اللہ کی رحمت اور تیرے درمیان حائل ہو سکے کذا ذکرہ السیوطی قول ابن عباسؓ۔

مجاہدؒ نے مِنْۢ بَیْنِ اَیْدِیْهِمْ وَ عَنْ اَیْمَانِهِمْ کی تشریح میں کہا یعنی ادھر سے آؤں گا جدھر وہ دیکھتے ہوں گے اور مِنْ خَلْفِهِمْ وَ عَنْ شَمَآىِٕلِهِمْ کی تشریح میں کہا یعنی اس طرف سے آؤں گا جہاں وہ نہیں دیکھتے ہوں گے۔ ابن جریج نے مجاہد کے قول کی تشریح میں کہا دیکھتے ہوں گے اور نہیں دیکھتے ہوں گے یعنی دانستہ خطا کرتے ہوں گے یا نادانستہ۔

وَ لَا تَجِدُ اَكْثَرَهُمْ شٰكِرِیْنَ۝ (اور تو ان میں سے اکثر کو شکر گزار (یعنی مومن) نہیں پائے گا)۔ ابلیس نے یہ بات اپنے ظن کے اعتبار سے کہی تھی (اس کو علم غیب نہ تھا) کیونکہ دوسری آیت میں آیا ہے وَ لَقَدْ صَدَّقَ عَلَیْهِمْ اِبْلِیْسُ ظَنَّهٗ فَاتَّبَعُوْهُ اِلَّا فَرِیْقًا (اس آیت میں صراحت ہے کہ ابلیس نے اپنے ظن کو انسانوں کے متعلق سچا پایا چنانچہ ایک خاص گروہ کو چھوڑ کر اکثر نے شیطان کی پیروی کی۔

قَالَ اخْرُجْ مِنْهَا مَذْءُوْمًا مَّدْحُوْرًا (اللہ نے فرمایا (جنت یا آسمان سے) نکل جا ذلیل و خوار ہو کر۔

قاموس میں ہے ذَأَمَہٗ جیسے مَنَعَہٗ اس کو حقیر کر دیا، برا قرار دے دیا، دھتکار کر نکال دیا اور رسوا کر دیا۔

ہدایت :- جوہری نے لکھا ہے ذَأَمَہٗ ذَأْمًا یعنی ہمزہ کے ساتھ اور ذَامَہٗ ذَیْمًا بعنی یاء کے ساتھ اور ذَمَّہٗ ذَمًّا یعنی میم کی تشدید کے ساتھ تینوں ہم معنی ہیں۔ بغویؒ نے لکھا ہے ذیم اور ذأم سخت ترین مذمت کرنا (یعنی بغویؒ کے نزدیک ذم کے معنی سے ذیم اور ذأم کے معنی میں شدت ہے) مَدْحُوْر کا معنی ہے دور دور دھتکارا ہوا۔

لَمَنْ تَبِعَكَ مِنْهُمْ لَاَمْلَـَٔنَّ جَهَنَّمَ مِنْكُمْ اَجْمَعِیْنَ۝ (ان میں سے (یعنی آدمیوں میں سے) جو تیرے پیچھے چلیں گے۔ میں تم سب سے جہنم کو بھر دوں گا)۔ یعنی ابلیس سے اور ابلیس کی پیروی کرنے والوں سے۔

وَيٰٓاٰدَمُ اسْكُنْ اَنْتَ وَزَوْجُكَ الْجَنَّةَ فَكُلَا مِنْ حَيْثُ شِئْتُمَا وَلَا تَقْرَبَا هٰذِهِ الشَّجَرَةَ فَتَكُوْنَا مِنَ الظّٰلِمِيْنَ ۝

اور اے آدم تم اور تمہاری بی بی جنت میں رہو پھر جس جگہ سے چاہو کھاؤ مگر دونوں اس درخت کے پاس نہ جانا ورنہ ان لوگوں کی شمار میں آجاؤ گے جو بے جا کام کرتے ہیں)۔ اس آیت کی تفسیر سورۂ بقرہ میں گزر چکی ہے وہاں مطالعہ کرنا چاہئے۔

فَوَسْوَسَ لَهُمَا الشَّيْطٰنُ لِيُبْدِيَ لَهُمَا مَا وٗرِيَ عَنْهُمَا مِنْ سَوْاٰتِهِمَا (پھر شیطان نے دونوں کے دلوں میں وسوسہ ڈالا تاکہ ان کے پردہ کا بدن جو اب تک دونوں سے پوشیدہ تھا دونوں کے روبرو کردے)۔ قاموس میں ہے دل کے اندر پیدا ہونے والا یا شیطان کا ڈالا ہوا ایسا خیال جو غیر مفید ہو وسوسہ ہے۔ بغویؒ نے لکھا ہے وسوسہ وہ بات جو شیطان دل میں ڈال دیتا ہے۔ وسوسہ کا اصل لغوی معنی ہے زیور کی آواز اور پست آہٹ۔ لَهُمَا میں لام اجلیہ ہے دونوں کے لئے۔ لِيُبْدِيَ میں لام تنبیہ ہے یا لام غرض کیونکہ کشف ستر کرا کے شیطان کو دونوں سے برائی کرنی مقصود ہی تھی۔ سَوْاٰتِهِمَا یعنی قابل ستر اعضاء جن کو دونوں میں سے کوئی بھی نہیں دیکھتا تھا نہ اپنے نہ دوسرے کے۔ اس فقرہ سے اس امر پر روشنی پڑ رہی ہے کہ بے ضرورت تنہائی میں ہو یا شوہر کے سامنے اپنی عورت کھولنا طبعاً بھی قبیح ہے اور شرعاً و عقلاً بھی۔

وَقَالَ مَا نَهٰىكُمَا رَبُّكُمَا عَنْ هٰذِهِ الشَّجَرَةِ اِلَّآ اَنْ تَكُوْنَا مَلَكَيْنِ اَوْ تَكُوْنَا مِنَ الْخٰلِدِيْنَ ۝ وَقَاسَمَهُمَآ اِنِّيْ لَكُمَا لَمِنَ النّٰصِحِيْنَ ۝ (اور کہنے لگا تمہارے رب نے تم دونوں کو اس درخت سے اور کسی سبب سے نہیں روکا مگر صرف اس وجہ سے کہ تم دونوں کہیں فرشتہ ہو جاؤ یا ہمیشہ ہمیشہ رہنے والوں میں سے ہو جاؤ اور دونوں کے سامنے قسم کھائی کہ یقین جانئے میں تم دونوں کا خیر خواہ ہوں)۔

اِلَّآ اَنْ تَكُوْنَا اور تَكُوْنَا سے پہلے لا محذوف ہے یا لفظ کراہیۃ مقدر ہے۔ یعنی ابلیس نے آدم و حوا سے کہا تمہارے رب نے جو اس درخت کے پاس جانے کی ممانعت کی ہے اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ کہیں تم دونوں فرشتے نہ ہو جاؤ یا ہمیشہ کی زندگی تم کو نہ مل جائے یا یہ مطلب ہے کہ اس کو تمہارا فرشتہ ہو جانا یا دوامی زندگی پانا پسند نہ تھا صرف اس لئے درخت کے پاس جانے کی ممانعت کر دی۔ بعض لوگوں نے اس آیت سے انبیاء پر ملائکہ کی فضیلت کو ثابت کیا ہے مگر یہ غلط ہے اس سے انبیاء پر ملائکہ کی کسی وجہ کلی فضیلت ثابت نہیں ہوتی، صرف اتنا معلوم ہوتا ہے کہ آدم و حوا کو ان کمالات و فضائل کی رغبت تھی جو فرشتوں کو حاصل تھے کھانے پینے اور دوسرے لوازم بشری سے بے نیازی ملائکہ کی خصوصیت ہے اور فضیلت عمومی کا معیار یہ نہیں بلکہ اللہ کا مقرب ترین ہونا فضیلت تامہ کا معیار ہے (جو ملائکہ کو حاصل نہ تھا آدم کو حاصل تھا)۔

قَاسَمَهُمَا یعنی ابلیس نے آدم و حوا کے سامنے اللہ کی پرزور قسم کھائی۔ قَاسَمَ (باب مفاعلت) کا استعمال مبالغہ کے لئے ہے۔ پورا قصہ سورۂ بقرہ میں گزر چکا ہے۔ قتادہ نے کہا شیطان نے اللہ کی قسم کھا کر دونوں کو دھوکہ دے دیا اور اللہ کے نام پر مؤمن کبھی فریب بھی کھا جاتا ہے کہنے لگا میں تم سے پہلے پیدا ہوا ہوں اور تم سے زیادہ علم رکھتا ہوں تم دونوں میرے کہے پر چلو میں تمہاری صحیح رہنمائی کروں گا۔ ابلیس نے ہی سب سے پہلے اللہ کی جھوٹی قسم کھائی۔ آدم علیہ السلام کا گمان تھا کہ کوئی بھی اللہ کی جھوٹی قسم نہیں کھا سکتا اس لئے دھوکہ کھا گئے۔

فَدَلّٰىهُمَا بِغُرُوْرٍ (پس ان دونوں کو فریب سے نیچے لے آیا)۔

بغویؒ نے لکھا ہے یعنی ابلیس نے دونوں کو فریب دیا۔ عرب کہتے ہیں ما زال فلان يدلي بفلان بغرور یعنی وہ اس کو برابر فریب دیتا اور اس سے چکنی چپڑی باتیں کرتا رہا۔ غرور سے مراد ہے بے حقیقت (فریب)۔ بعض علماء کا قول ہے کہ دَلّٰىهُمَا (کا مصدر تدلیہ ہے، تدلیۃ اور ادلاء کا معنی ہے نیچے اتار دینا) اس سے مراد یہ ہے کہ ابلیس نے آدم و حوا کو اونچے درجے سے نیچے درجہ پر اتار دیا، مقام طاعت سے مقام معصیت پر لا گرایا۔

فَلَمَّا ذَاقَا الشَّجَرَةَ بَدَتْ لَهُمَا سَوْاٰتُهُمَا وَطَفِقَا يَخْصِفٰنِ عَلَيْهِمَا مِنْ وَّرَقِ الْجَنَّةِ

(پھر جب ان دونوں نے اس درخت (کے پھل) کا مزہ چکھ لیا تو دونوں کے پوشیدہ اعضاء ایک دوسرے پر بے پردہ ہوگئے اور (شرم کے مارے) کاپنے برہنہ شدہ اعضاء پر جنت کے پتے چپکانے لگے)۔ مطلب یہ ہے کہ پورے طور پر کھانے بھی نہ پائے تھے تھوڑا مزہ ہی چکھا تھا کہ نافرمانی کی نحوست سے دونوں برہنہ ہوگئے، سزا میں پکڑے گئے اور بدنا سے (جنت کا) لباس اتر گیا۔ عبد بن حمید نے وہب بن منبہ کا قول نقل کیا ہے کہ دونوں کا لباس نور کا تھا۔ ابن ابی حاتم نے بروایت سدی فریابی کا قول اور ابن ابی شیبہ، عبد بن حمید، ابن جریر، ابن المنذر، ابن ابی حاتم، ابوالشیخ، ابن مردویہ، بیہقی اور ابن عساکر نے حضرت ابن عباسؓ کا قول نقل کیا ہے کہ آدم و حوا کا لباس ناخن کا تھا لیکن درخت کا مزہ چکھنے کے بعد وہ کل لباس اتر گیا صرف ناخن رہ گئے۔ جنت کے ورق سے مراد ہیں انجیر کے پتے۔ ابن ابی شیبہ، عبد بن حمید، ابن جریر، ابن المنذر، ابن ابی حاتم، ابوالشیخ، ابن مردویہ، بیہقی اور ابن عساکر نے حضرت ابن عباسؓ کی طرف اس قول کی نسبت کی ہے۔

حضرت ابی بن کعبؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا آدمؑ دراز قامت ایسے تھے جیسے کھجور کا بڑا لمبا درخت، سر کے بال بڑے بڑے تھے۔ جب گناہ میں پڑ گئے اور پوشیدہ اعضاء ظاہر ہوگئے اور پہلے کوئی ان اعضاء کو نہیں دیکھتا تھا تو بھاگ کر آپ ایک باغ میں پہنچے، باغ کے ایک درخت نے ان کے بالوں کو الجھا لیا آدم نے کہا مجھے چھوڑ دے۔ درخت نے جواب دیا میں تم کو چھوڑنے والا نہیں۔ اس پر اللہ کی آواز آئی آدمؑ کیا مجھ سے بھاگ رہا ہے۔ آدمؑ نے کہا نہیں میرے رب بلکہ مجھے تجھ سے شرم آرہی ہے۔

وَنَادٰىهُمَا رَبُّهُمَآ اَلَمْ اَنْهَكُمَا عَنْ تِلْكُمَا الشَّجَرَةِ وَاَقُلْ لَّكُمَآ اِنَّ الشَّيْطٰنَ لَكُمَا عَدُوٌّ مُّبِيْنٌ۝

(اور ان کے رب نے دونوں کو ندا دی کیا میں نے تم دونوں کو اس درخت (کے پاس بھی جانے) سے منع نہیں کر دیا تھا اور کیا تم سے نہیں کہہ دیا تھا کہ شیطان تم دونوں کا صریحی دشمن ہے)۔ اس نے خود اقرار کیا تھا کہ میں ان کو گمراہ کرنے کے لئے تیرے سیدھے راستہ پر بیٹھوں گا۔ اس آیت میں ممانعت کی خلاف ورزی کرنے اور دشمن کی بات سے فریب کھانے پر عتاب کیا گیا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ (اگر استحباب، ندب وغیرہ کا قرینہ نہ ہو اور) ممانعت غیر مشروط ہو تو اس کا تقاضا وجوب ہے۔ محمد بن قیس نے کہا اللہ نے ندا دی آدمؑ تو نے کیوں کھایا، میں نے تو تجھے منع کر دیا تھا۔ آدم نے عرض کیا مجھے حوا نے کھلا دیا۔ اللہ نے حواؑ سے فرمایا تو نے کیوں کھلایا۔ حوا نے عرض کیا مجھے سانپ نے مشورہ دیا تھا۔ سانپ سے سوال ہوا تو نے کیوں مشورہ دیا۔ سانپ نے عرض کیا مجھے ابلیس نے مشورہ دیا تھا۔ اللہ نے فرمایا حوا تو نے درخت کو خون آلود کیا تو بھی ہر ماہ خون آلود ہے گی اور اے سانپ تیرے پاؤں میں کاٹ دیتا ہوں تو منہ کے بل چلے گا اور تجھے جو بھی پائے گا تیرا سر پھاڑ دے گا اور اے ابلیس تو ملعون و مردود ہے۔

قَالَا رَبَّنَا ظَلَمْنَآ اَنْفُسَنَا (آدم و حوا نے عرض کیا پروردگار ہم نے اپنی جانوں پر خود ظلم کیا)۔ گناہ کر کے اور جنت سے نکالے جانے کا سامان کر کے خود اپنا نقصان کیا ہے کوئی تیرا کیا۔

وَاِنْ لَّمْ تَغْفِرْ لَنَا وَتَرْحَمْنَا لَنَكُوْنَنَّ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ۝ (اگر تو ہماری خطا معاف نہیں کرے گا اور ہم پر رحم نہیں فرمائے گا تو ہم تباہ ہو جائیں گے)۔

اس آیت سے ثابت ہو رہا ہے کہ اگر صغیرہ گناہ معاف نہ کئے تو ان کی سزا ہو سکتی ہے۔ معتزلہ کے نزدیک صغیرہ گناہوں کی سزا نہیں دی جائے گی (خواہ ان کو معاف نہ کیا گیا ہو) بشرطیکہ کبیرہ گناہوں سے آدمی اجتناب رکھتا ہو (کبیرہ کا مرتکب نہ ہو)۔

قَالَ اهْبِطُوْا بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ ۚ وَلَكُمْ فِي الْاَرْضِ مُسْتَقَرٌّ وَّمَتَاعٌ اِلٰى حِيْنٍ۝

(اللہ نے فرمایا تم سب باہم دشمن ہونے کی حالت میں نیچے اترو۔ تمہیں زمین میں ٹھہرنا اور ایک وقت تک نفع اندوز ہونا ہے)۔ اهبطوا اگرچہ جمع کا صیغہ ہے مگر مخاطب صرف آدم و حواؑ ہیں۔ ابلیس کو اس سے پہلے اتارا جا چکا ہے شاید (دو کے لئے)

جمع کا صیغہ اس لئے استعمال کیا گیا کہ ان دونوں کا نزول ساری نسل کے نزول کا سبب ہے (یعنی تم دونوں اور آئندہ ہونے والی تمہاری نسل سب اترو) بعض کے نزدیک ابلیس کو بھی ذیلی طور پر اس وقت بھی خطاب میں داخل کر لیا گیا (اور تینوں کو حکم دیا گیا) تاکہ یہ معلوم ہو جائے کہ ہمیشہ (دنیا میں) ان کو ساتھ رہنا ہے۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ الگ الگ جو حکم ان کو دیا گیا تھا اس کے مجموعہ کی خبر اس آیت میں (اِهْبِطُوْا میں) دے دی گئی۔ بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ جملہ حالیہ ہے۔ مُسْتَقَرٌّ مصدر ہے (ٹھہرنا) یا ظرف مکان (ٹھہرنے کی جگہ) مَتَاعٌ مصدر ہے (فائدہ اندوز ہونا) اِلٰى حِيْنٍ سے مراد ہے مرنے کے وقت تک۔

قَالَ فِيْهَا تَحْيَوْنَ وَفِيْهَا تَمُوْتُوْنَ وَمِنْهَا تُخْرَجُوْنَ ۝ (یہ بھی فرما دیا کہ) زمین میں ہی تم زندگی بسر کرو گے وہیں مرو گے اور اسی سے (پھر) نکالے جاؤ گے۔

يٰبَنِيْٓ اٰدَمَ قَدْ اَنْزَلْنَا عَلَيْكُمْ لِبَاسًا يُّوَارِيْ سَوْاٰتِكُمْ وَرِيْشًا ۭ وَلِبَاسُ التَّقْوٰى ۙ ذٰلِكَ خَيْرٌ ۭ ذٰلِكَ مِنْ اٰيٰتِ اللّٰهِ لَعَلَّهُمْ يَذَّكَّرُوْنَ ۝ (اے اولاد آدم ہم نے تمہارے لئے لباس پیدا کیا جو تمہارے واجب الستر اعضاء کو چھپاتا بھی ہے اور موجب زینت بھی ہے اور تقویٰ کا لباس سب سے بڑھ کر ہے یہ اللہ کے احکام میں سے ہے تاکہ لوگ یاد رکھیں)۔

بغوی نے لکھا ہے جاہلیت کے زمانہ میں لوگ کعبہ کا طواف برہنہ ہو کر کیا کرتے تھے مرد دن میں اور عورتیں رات میں۔ ان کا قول تھا کہ جن کپڑوں میں ہم نے گناہ کئے ہیں ان کو پہنے ہوئے ہم طواف نہیں کریں گے۔ اس پر آیت مذکورہ نازل ہوئی۔ قتادہؒ نے کہا عورت دوران طواف میں اپنی شرمگاہ پر ہاتھ رکھے ہوئے رہتی تھی اور کہتی تھی آج اس کا کچھ حصہ کھلا ہو یا سب برہنہ ہو میں اس کو کسی کے لئے حلال نہیں کروں گی اس پر اللہ نے کپڑے پہننے کا حکم دیا اور فرمایا ہم نے تمہارے لئے لباس پیدا کیا ہے۔
سَوْاٰتِكُمْ قابل ستر اعضاء یہ سوءۃ کی جمع ہے۔ واجب الستر حصہ کا کھلنا برا معلوم ہوتا ہے اس لئے اس کو سوءۃ کہا جاتا ہے۔ اَنْزَلْنَا سے مراد (یہ نہیں ہے کہ براہ راست لباس آسمان سے اتارا بلکہ مراد) یہ ہے کہ اسباب سماوی اور انتظام علوی کے زیر اثر ہم نے لباس پیدا کیا ہے۔ ایسا ہی دوسری آیت میں بھی آیا ہے فرمایا ہے وَاَنْزَلَ لَكُمْ مِّنَ الْاَنْعَامِ تمہارے لئے مویشی اتارے۔ وَاَنْزَلْنَا الْحَدِيْدَ اور ہم نے لوہا اتارا۔ یہ مطلب بھی ہو سکتا ہے کہ ہم نے تم پر لباس پہننے کا حکم اتارا۔ شاید حضرت آدم کا قصہ اس بات کی تمہید ہے کہ کشف عورت ممنوع ہے شیطان کی طرف سے پہلی مصیبت انسان پر جو آئی وہ بے پردہ ہونے کی شکل میں ہی آئی۔ شیطان نے ہی حضرت آدم و حوا کو اغوا کر کے برہنہ کر دیا اور ان کی اولاد کو بھی اسی طرح اغوا کر رہا ہے۔

وَرِيْشًا عمدہ لباس (قاموس) یا جمال (بیضاوی) یا مال (حضرت ابن عباسؓ، مجاہد، ضحاک، سدی) تَرَيَّشَ الرَّجُلُ وہ آدمی مالدار ہو گیا۔ لباس تقویٰ سے کیا مراد ہے اس کے متعلق علماء کے اقوال مختلف ہیں۔ قتادہ اور سدی کے نزدیک لباس تقویٰ ایمان ہے۔ حسن بصریؒ کے نزدیک حیا ہے، کیونکہ حیا ہی موجب تقویٰ ہے۔ عطیہ نے حضرت ابن عباسؓ کا قول نقل کیا ہے کہ عمل صالح لباس تقویٰ ہے۔ حضرت عثمان بن عفانؓ کا قول آیا ہے کہ خوبصورت خصلت مراد ہے۔ عروہ بن زبیر نے خشیۃ اللہ کو لباس تقویٰ قرار دیا ہے۔ کلبی نے پاک دامنی کو یعنی صاحب تقویٰ کے لئے پاک دامنی سب سے خوبصورت لباس ہے۔ ابن الانباری نے کہا لباس التقویٰ سے مراد وہی لباس ہے جس کا ذکر اوپر سے پہلے فقرہ میں آ چکا ہے، غرض یہ ہے کہ برہنہ طواف کرنے سے کپڑے پہن کر اعضاء پوشیدنی کو چھپانا بہتر ہے اور برہنگی کے گناہ سے بچنے کا سبب لباس ہے۔ زید بن علی نے فرمایا لباس تقویٰ سے مراد جنگی لباس ہے جو جنگ میں حفاظت کے لئے پہنا جاتا ہے۔ زرہ خود بکتر پیٹی تلیں۔ بعض نے کہا لباس تقویٰ بالوں کے کھردرے موٹے موٹے کپڑے ہیں جو زاہد لوگ پہنتے ہیں۔
آیات اللہ سے مراد (یا احکام ہیں یا وہ) نشانیاں ہیں جو اللہ کی رحمت و مہربانی پر دلالت کر رہی ہیں۔ یاد رکھنے سے مراد ہے اللہ کی نعمتوں کا اقرار کر کے برائیوں سے بچا رہنا۔

يٰبَنِيْٓ اٰدَمَ لَا يَفْتِنَنَّكُمُ الشَّيْطٰنُ كَمَآ اَخْرَجَ اَبَوَيْكُمْ مِّنَ الْجَنَّةِ يَنْزِعُ عَنْهُمَا لِبَاسَهُمَا لِيُرِيَهُمَا سَوْاٰتِهِمَا ۭ (اے اولاد آدم شیطان تم کو دھوکہ نہ دینے پائے (اور گمراہ کر کے جنت سے محروم نہ کر دے) جیسے تمہارے ماں باپ کو (یعنی آدم وحوا کو دھوکہ دے کر) جنت سے نکلوانے کا سبب بنا ایسی حالت میں کہ ان کا لباس بھی ان سے اتروا دیا تاکہ ان کو ان کا پردہ کا بدن دکھائی دینے لگے)۔ بظاہر شیطان کو ممانعت ہے لیکن حقیقت میں اولاد آدم کو گمراہ ہونے سے نہی ہے۔ یعنی تم دھوکہ نہ کھاؤ اور شیطان کے پیچھے چل کر راستہ سے نہ بھٹکو۔ شیطان چونکہ آدم وحوا کے بدن سے جنت کا لباس اتروانے کا سبب تھا اس لئے نزع کی نسبت اس کی طرف کر دی گئی۔

اِنَّهٗ يَرٰىكُمْ هُوَ وَقَبِيْلُهٗ مِنْ حَيْثُ لَا تَرَوْنَهُمْ ۭ (بلاشبہ وہ اور اس کے گروہ والے تم کو اس طور پر دیکھتے ہیں کہ تم ان کو نہیں دیکھتے)۔ حضرت ابن عباسؓ کے نزدیک قبیلہ سے مراد ہے ابلیس کی اولاد۔ اور قتادہؒ کے نزدیک گروہ جن مراد ہے۔ غرض پورا جملہ تحذیری کا ہے جس میں شیطان اور اس کے مددگاروں کی فریب دہی سے ڈرایا گیا ہے کیونکہ ایسا دشمن ہے جو ہم کو نظر نہیں آتا اور جو دشمن ہم کو دیکھ رہا ہو مگر ہم کو نظر نہ آ رہا ہو اس سے اللہ ہی محفوظ رکھے تو حفاظت ہو سکتی ہے۔ ذوالنونؒ نے فرمایا اگر شیطان تم کو دیکھتا ہو اور تم کو نظر نہیں آتا تو تم اس ذات سے مدد کی درخواست کرو جو شیطان کو دیکھ رہی ہے اور شیطان اس کو نہیں دیکھ سکتا۔

اِنَّا جَعَلْنَا الشَّيٰطِيْنَ اَوْلِيَاۗءَ لِلَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ ۝ (ہم شیطانوں کو ان لوگوں کا رفیق بنا دیتے ہیں جو ایمان نہیں لاتے)۔ رفیق بنانے کی صورت یہ ہوتی ہے کہ باطل کی پیروی اور حق سے نفرت دونوں فریق میں مشترک قائم رکھی جاتی ہے یا شیطانوں کو بے ایمانوں پر مسلط کر دیا جاتا ہے اور قدرت دے دی جاتی ہے کہ وہ ان کو فریب دیتے رہیں اور اس فریب کاری پر ان کو آمادہ رکھیں۔

وَاِذَا فَعَلُوْا فَاحِشَةً قَالُوْا وَجَدْنَا عَلَيْهَآ اٰبَاۗءَنَا وَاللّٰهُ اَمَرَنَا بِهَا ۭ (اور وہ لوگ جب کوئی بے حیائی کا کام (شرک یا برہنہ طواف وغیرہ) کرتے ہیں تو کہتے ہیں ہم نے اپنے باپ دادا کو اسی پر پایا ہے اور اللہ نے ہم کو یہی حکم دیا ہے)۔ فاحشۃ حد سے زیادہ بری بات۔ اس سے مراد ہے شرک۔ لیکن حضرت ابن عباسؓ اور مجاہدؒ کے نزدیک برہنہ ہو کر کعبہ کا طواف کرنا مراد ہے۔ بظاہر لفظ فاحشۃ کے اندر ہر کبیرہ گناہ داخل ہے۔ یعنی جب وہ حد سے زیادہ کوئی بری حرکت کرتے ہیں اور ان کو منع کیا جاتا ہے تو اس کے جواز کی دو دلیلیں بیان کرتے ہیں۔ کہتے ہیں ہم نے اپنے باپ دادا کو یوں ہی کرتے پایا (لہٰذا یہ عمل صحیح ہے) اور اللہ نے بھی ہم کو اس کا حکم دیا ہے۔ پہلی دلیل کی تردید اس جگہ نہیں کی کیونکہ اس کی بے ہودگی ظاہر ہی تھی۔ پھر دوسری جگہ آیت میں اس کی تردید (طرز اسلوب کے ساتھ) آچکی ہے۔ فرمایا ہے اَوَلَوْ كَانَ اٰبَاۗؤُهُمْ لَا يَعْقِلُوْنَ شَيْـــًٔـا وَّلَا يَهْتَدُوْنَ دوسری دلیل کی تردید مندرجہ ذیل آیت میں فرمائی۔

قُلْ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَاْمُرُ بِالْفَحْشَاۗءِ ۭ اَتَقُوْلُوْنَ عَلَي اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ۝ (آپ کہہ دیجئے کہ اللہ بے حیائی کا حکم نہیں دیتا کیا خدا کے ذمے ایسی بات لگاتے ہو جس کی سند کا تم کو علم نہیں)۔

کیونکہ بری بات کا حکم دینا بھی برا ہے۔ اس آیت میں ثبوت ہے اس امر کا کہ اشیاء کی اچھائی برائی اگرچہ خدا کی پیدا کردہ ہے لیکن عقل سے اس کو سمجھا جاتا ہے۔ قبیح سے مراد اس جگہ وہ امر شنیع ہے جس سے طبع سلیم نفرت کرتی اور دانش صحیح جس کو برا سمجھتی ہے۔ بعض اہل تفسیر نے لکھا ہے کہ آیت مذکورہ میں دونوں جملے دو مرتب سوالوں کے جواب ہیں گویا کلام یوں تھا سوال: تم نے اس امر قبیح کا ارتکاب کیوں کیا۔ جواب: ہم نے باپ دادا کو ایسا ہی کرتے پایا ہے۔ سوال: تمہارے باپ دادا کو کہاں سے حکم ملا۔ جواب: ان کو اللہ نے اس کا حکم دیا تھا (اور ان کی وساطت سے اللہ کا وہ حکم ہم تک پہنچا پس اللہ ہی نے ہم کو اس کا حکم دیا) بہر حال آیت سے اسلاف کا بے دلیل اندھا دھند اتباع ممنوع قرار پاتا ہے۔ لیکن ہر تقلید آباء کی حرمت ثابت نہیں ہوتی (اگر آباء کا قول از روئے شریعت حق ہو تو اس پر چلنا اور اس کی تقلید کرنا تو ضروری ہے)۔

اتقولون علی اللہ یعنی کیا تم اللہ پر بغیر یقینی آفریں دلیل کے بہتان بندی کرتے ہو۔ یہ استفہام انکاری ہے مگر انکار حکم نہی میں ہے یعنی اللہ پر افترا بندی نہ کرو۔

قُلْ اَمَرَ رَبِّيْ بِالْقِسْطِ وَاَقِيْمُوْا وُجُوْهَكُمْ عِنْدَ كُلِّ مَسْجِدٍ وَّادْعُوْهُ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ

(آپ کہہ دیجئے کہ میرے رب نے انصاف کرنے کا حکم دیا ہے اور یہ (بھی کہہ دیجئے) کہ تم ہر سجدہ کے وقت اپنا رخ سیدھا رکھا کرو اور اللہ کی عبادت اس طور پر کرو کہ اس عبادت (یا اطاعت) کو خالص اللہ ہی کے واسطے رکھا کرو۔

حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا القسط سے مراد لا الہ الا اللہ ہے۔ ضحاک نے کہا توحید مراد ہے۔ مجاہدؒ اور سدیؒ کے نزدیک عدل مراد ہے۔ لغت میں قسط کا معنی ہے امر متوسط جس کا جھکاؤ طرفین میں سے کسی ایک کی جانب زیادہ نہ ہو۔ افراط و تفریط کے درمیانی امر کا نام قسط ہے۔

اَقِیْمُوْا معطوف ہے فعل محذوف پر یعنی اللہ نے فرمایا ہے کہ اقامت وجوہ کرو۔ یا قُلْ کا مفعول ہے یعنی آپ یہ جملہ کہہ دیں۔ اَقِیْمُوْا وُجُوْهَکُمْ یعنی خالص اللہ کے لئے سجدہ کرو۔ عِنْدَ کُلِّ مَسْجِدٍ یعنی ہر نماز اور سجدہ کے وقت یا ہر مقام سجود میں (اول مطلب پر لفظ مسجد ظرف زمان اور دوسرے مطلب پر ظرف مکان ہوگا) مجاہدؒ اور سدیؒ نے آیت کا تفسیری مطلب اس طرح بیان کیا جہاں بھی ہو نماز کے اندر اپنا رخ کعبہ کی طرف رکھو۔ ضحاک نے کہا اگر تم کسی مسجد کے پاس ہو اور نماز تیار ہو تو مسجد میں جا کر نماز پڑھ لو یہ نہ کہو کہ میں اپنی مسجد میں جا کر پڑھوں گا۔ امام ابو حنیفہؒ کا یہی مسلک ہے لیکن اتنی تفصیل ہے کہ اگر کوئی کسی دوسری مسجد کا امام ہو یا ایسا شخص ہو کہ اس کی غیر حاضری سے دوسری مسجد کی جماعت کے نظام میں خلل پڑ جائے تو ایسے شخص کے لئے مسجد سے اذان کے بعد بھی چلا جانا درست ہے۔ بعض علماء نے آیت کا مطلب اس طرح بیان کیا اللہ کی عبادت کی طرف سیدھے متوجہ ہو جاؤ کسی دوسرے کی طرف رخ نہ موڑو۔ وَادْعُوْهُ یعنی اس کی عبادت کرو۔ مُخْلِصِیْنَ لَہُ الدِّیْنَ اطاعت اور عبادت کو ہر شرک ریا اور شہرت طلبی سے پاک صاف رکھ کر۔

كَمَا بَدَاَكُمْ تَعُوْدُوْنَ ؕ (جس طرح اس نے تم کو پہلی بار پیدا کیا اسی طرح تم دوبارہ لوٹو گے۔)

یعنی جس طرح اس نے پہلے تم کو مٹی سے، پھر نطفہ سے پیدا کیا اسی طرح مرنے کے بعد تم دوبارہ زندہ کئے جاؤ گے اور اللہ تمہارے اعمال کے موافق بدلہ دے گا۔ تخلیق ثانی کو تخلیق اول سے تشبیہ دینے کی غرض یہ ہے کہ تخلیق ثانی ممکن ہے اور تخلیق اول کی طرح اللہ تخلیق دوم پر قادر ہے۔ بعض علماء نے آیت کا مطلب اس طرح بیان کیا ہے کہ جس طرح اول بار تم کو برہنہ پا برہنہ بدن غیر مختون پیدا کیا تھا اسی طرح تم اس کے پاس لوٹو گے۔ حضرت عائشہؓ کی حدیث ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا قیامت کے دن برہنہ پا برہنہ بدن اٹھائے جاؤ گے۔ میں نے عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ مرد بھی اور عورتیں بھی۔ فرمایا عائشہؓ اس روز معاملہ اس سے بہت سخت ہوگا (یعنی کسی کو کسی کی طرف دیکھنے کی فرصت نہ ہوگی) صحیحین۔

بخاریؒ اور مسلمؒ نے صحیحین میں اور ترمذی نے سنن میں حضرت ابن عباسؓ کا بیان نقل کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ خطبہ دے رہے تھے اور فرما رہے تھے لوگو! تم برہنہ پا پیدل، برہنہ بدن، غیر مختون اللہ کے پاس لے جائے جاؤ گے۔ پھر حضور ﷺ نے تلاوت فرمائی كَمَا بَدَاْنَآ اَوَّلَ خَلْقٍ نُّعِيْدُهٗ۔ سب سے پہلے حضرت ابراہیمؑ کو لباس پہنایا جائے گا۔ اس بحث کی صحیح احادیث بکثرت آئی ہیں۔ لیکن ابو داؤد، ابن حبان، بیہقی اور حاکم نے نقل کیا اور حاکم نے اس کو صحیح بھی کہا ہے کہ حضرت ابو سعید خدریؓ نے انتقال کے قریب نئے کپڑے طلب کئے اور پہن کر فرمایا میں نے رسول اللہ ﷺ سے سنا ہے کہ میت کو انہی کپڑوں میں اٹھایا جائے گا جن کو پہنے ہوئے اس کا انتقال ہوا ہوگا۔ ابن ابی الدنیا نے حسن سند سے بیان کیا ہے کہ حضرت معاذ بن جبلؓ نے نئے کپڑوں کا اپنی ماں کو کفن دلوایا اور فرمایا اپنے مردوں کو کفن اچھے دیا کرو وہ قیامت کے دن انہی کپڑوں میں ان کو اٹھایا جائے گا۔ سعید بن منصور نے سنن میں بیان کیا ہے کہ حضرت عمر بن خطاب نے فرمایا اپنے مردوں کو کفن اچھے دیا کرو، قیامت کے دن انہی میں ان کو اٹھایا جائے گا۔ یہ تینوں احادیث قوت میں ان احادیث کی طرح نہیں ہیں جن میں برہنہ اٹھائے جانے کی صراحت آئی ہے۔ اکثر علماء

نے مؤخر الذکر احادیث کا مصداق شہیدوں کو قرار دیا ہے۔ حضرت ابو سعید خدریؓ نے شہید کے متعلق حدیث سنی تھی مگر (اجتہادی غلطی سے) عام مردوں کے لئے اس کو سمجھ لیا۔ بیہقی نے ان متعارض احادیث کو باہم توفیق دینے کے لئے کہا کہ بعض لوگوں کو برہنہ بدن اٹھایا جائے گا اور بعض کو کپڑوں میں۔

بعض لوگوں کا قول ہے کہ قبروں سے نکلتے وقت لوگ کپڑے پہنے ہوں گے پھر ان کے کپڑے ابتداء حشر کے وقت بدن سے گر جائیں گے اور میدان حشر میں ان کو برہنہ لے جایا جائے گا۔ بعض علماء نے کہا جو حدیث آئی کہ میت کو اس کے کپڑوں میں اٹھایا جائے گا اس میں (کپڑوں سے) مراد نیک عمل ہیں جیسے (دوسری آیت میں تقویٰ کو لباس قرار دیا ہے اور) فرمایا ہے وَلِبَاسُ التَّقْوٰى ذٰلِكَ خَيْرٌ۔

حضرت جابرؓ نے آیت کا معنی یہ بیان کیا کہ جن اعمال پر لوگ مریں گے انہی پر ان کو اٹھایا جائے گا، ہذہ رواہ مسلم فی صحیحہ وابن ماجہ والبغوی۔ حضرت جابرؓ کا بیان ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہر بندہ کو اسی حالت پر اٹھایا جائے گا جس پر وہ مرا ہو گا، مؤمن کو ایمان پر اور کافر کو کفر پر۔ حضرت ابن عباسؓ نے آیت کی تشریح میں فرمایا اللہ نے پہلی تخلیق میں اولاد آدم کو مؤمن اور کافر بنایا، فرمایا هُوَ الَّذِي خَلَقَكُمْ فَمِنْكُمْ كَافِرٌ وَمِنْكُمْ مُؤْمِنٌ پھر قیامت کے دن ان کی بعثت بھی گزشتہ ایمان و کفر کی حالت پر ہو گی۔ ابو العالیہ نے تَعُوْدُوْنَ کی تشریح میں فرمایا لوگ اسی حالت کی طرف لوٹیں گے جو حالت ان کی اللہ کے علم (ازلی) میں ہو گی۔ سعید بن جبیرؓ نے آیت کا مطلب اس طرح بیان کیا جیسا اللہ نے تمہارے لئے لکھ دیا ہے تم ویسے ہی ہو جاؤ گے۔ محمد بن کعب نے کہا جس کی ابتدائی تخلیق اللہ نے بدبختی پر کی ہے وہ مآل کار شقاوت کی طرف چلا جائے گا خواہ اس نے اہل سعادت کے کام کئے ہوں جیسے ابلیس اہل سعادت کے اعمال کیا کرتا تھا پھر شقاوت کی طرف چلا جائے گا اور جس کی ابتدائی تخلیق سعادت پر ہوئی وہ سعادت کی طرف (مآل میں) چلا جائے گا خواہ اس نے اہل شقاوت کے کام کئے ہوں جیسے حضرت موسیٰ کے مقابلہ پر آنے والے جادوگر اہل شقاوت کے کام کرتے تھے پھر آخر میں سعادت کی طرف آگئے۔ حضرت سہل بن سعد کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا آدمی دوزخیوں کے کام کرتا ہے اور جنتیوں میں ہوتا ہے اور اہل جنت کے کام کرتا ہے مگر دوزخی ہوتا ہے خاتمہ کے اعمال کا اعتبار ہے، بخاری و مسلم۔ یہ تشریح آیت کے آخری حصہ کے بھی مناسب ہے فرمایا ہے۔

فَرِيْقًا هَدٰى وَفَرِيْقًا حَقَّ عَلَيْهِمُ الضَّلٰلَةُ (بعض لوگوں کو تو اللہ نے ہدایت کر دی ہے اور بعض پر گمراہی کا ثبوت ہو چکا ہے) یعنی اللہ نے تم میں سے ایک فریق کو اپنے قدیم علم میں ہدایت یاب کرنے کا ارادہ کر لیا تھا تو اس کو ایمان اور نیک اعمال کی توفیق عطا کر دی اور ایک فریق کو گمراہ کر دیا جس کے لئے اللہ کے قدیم سابق فیصلہ میں گمراہی طے ہو چکی تھی۔

اِنَّهُمُ اتَّخَذُوا الشَّيٰطِيْنَ اَوْلِيَآءَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَيَحْسَبُوْنَ اَنَّهُمْ مُّهْتَدُوْنَ ۝

(ان لوگوں نے شیطانوں کو رفیق بنا لیا اللہ کو چھوڑ کر اور خیال ان کا یہ ہے کہ وہ راہ راست پر چل رہے ہیں)۔

اس آیت سے ثابت ہو رہا ہے کہ جہالت عذر نہیں ہے اور کافر خواہ قصداً اور عناداً کافر ہو یا بلا قصد دونوں مذمت کے مستحق ہیں۔ مسلم نے حضرت ابن عباسؓ کا قول نقل کیا ہے کہ اسلام سے پہلے عورتیں برہنہ ہو کر کعبہ کا طواف کرتی تھیں اور دوران طواف میں ایک ہاتھ شرمگاہ پر رکھتی تھیں اور کہتی تھیں آج یہ سب کھل جائے یا کچھ حصہ کھل جائے میں اس کو کسی کے تصرف میں نہیں دے سکتی، اس پر آیت ذیل نازل ہوئی۔

يٰبَنِيْٓ اٰدَمَ خُذُوْا زِيْنَتَكُمْ عِنْدَ كُلِّ مَسْجِدٍ اور قُلْ مَنْ حَرَّمَ زِيْنَةَ اللّٰهِ الخ بھی نازل ہوئی۔ اے اولاد آدم تم مسجد کی ہر حاضری کے وقت اپنا لباس پہن لیا کرو۔ باجماع اہل تفسیر زینت سے مراد وہ لباس ہے جس سے ستر عورت ہو جائے۔ مجاہدؓ نے کہا جس سے تیرا ستر عورت ہو جائے خواہ چوغہ ہو۔ کلبی کا بھی یہی قول ہے۔ اس آیت کی تشریح میں بیہقی نے حضرت ابن عباسؓ کا قول نقل کیا ہے کہ زینت سے مراد کپڑے ہیں اور مسجد سے سجود ہی مراد ہے اسی لئے آیت کا

مطلب اس طرح بیان کیا گیا ہے کہ طواف یا نماز کے لئے مسجد میں لباس لے لو۔ اسی بنیاد پر ابن الہمام نے کہا ہے کہ آیت کا نزول برہنہ طواف کرنے کی حرمت کے لئے ہوا۔ اعتبار اگرچہ الفاظ کے عموم کا ہوتا ہے خصوصیت سبب مدار حکم نہیں ہوتی لیکن سبب میں سب سے پہلے براہ راست حکم کا تحقق ہونا ضروری ہے (اگرچہ حکم کا حصر اسی سبب میں ہی نہیں) کیونکہ سب سے پہلے اسی سبب میں حکم کا تعلق مقصود ہوتا ہے اور پھر بالواسطہ (الفاظ کے عموم کے پیش نظر) دوسری صورتوں کے لئے بھی وہ حکم عام ہو جاتا ہے اور ہمارے نزدیک طواف کرنے میں ستر عورت تو واجب ہے مگر طواف کی شرط نہیں ہے اگر برہنہ طواف کرے گا تو طواف واجب کی ادائیگی ہو جائے گی مگر گناہگار ہوگا اسی طرح فرض نماز کی ادائیگی بھی برہنہ بدن نماز پڑھنے سے ہو جائے گی کیونکہ نماز کی حالت میں ستر عورت ہونا واجب ہے مگر شرط نہیں ہے ہاں گناہگار ضرور ہوگا (پس آیت سے تو استدلال نہیں کیا جا سکتا کہ تنہائی میں بھی برہنہ بدن طواف یا نماز کا فرض ادا نہ ہوگا) البتہ اجماع علماء ہے کہ نماز میں ستر عورت ہونا فرض ہے (بغیر ستر عورت کے نماز نہیں ہوتی خلوت میں ہو یا جلوت میں) بعض علماء مالکیہ (جیسے قاضی اسمٰعیل) کا قول اس کے خلاف بھی آیا ہے مگر اجماع کے خلاف منفرد قول ناقابل اعتبار ہے۔ حضرت عائشہؓ کی مرفوع روایت بھی ہے کہ اللہ بالغ عورت کی نماز بغیر اوڑھنی کے قبول نہیں فرماتا۔ رواہ ابوداؤد والترمذی والحاکم وابن خزیمہ۔ ترمذی نے اس حدیث کو حسن اور حاکم نے صحیح کہا ہے۔ میرے نزدیک ظاہر یہ ہے کہ مسجد مصدر میمی ہے سجدہ کرنا اور اس سے مراد نماز ہے۔ جزبول کر کل مراد لے لیا جاتا ہے۔ جیسے آیت وَارْكَعُوا مَعَ الرَّاكِعِينَ میں رکوع سے مراد نماز ہے اسی طرح آیت فَاقْرَءُوا مَا تَيَسَّرَ مِنَ الْقُرْآنِ میں قرآن سے مراد بھی نماز ہے (رکوع اور قرأت نماز کے اجزاء ہیں) اس مطلب پر آیت کی عبارت دلالت کر رہی ہے کہ صرف نماز میں ستر عورت واجب ہے (یعنی طواف سے آیت کا کوئی تعلق نہ ہوگا)۔

عرب دور جاہلیت میں برہنہ ہو کر کعبہ کا طواف کرتے تھے اور کہتے۔ جن کپڑوں کو پہن کر ہم نے اللہ کی نافرمانیاں کی ہیں ان کو پہن کر طواف نہیں کریں گے۔ عورتیں بھی برہنہ طواف کرتی تھیں۔ یہ کل واقعات آیت يَا بَنِي آدَمَ قَدْ أَنْزَلْنَا عَلَيْكُمْ لِبَاسًا يُوَارِي سَوْآتِكُمْ سے ..... مَا بَطَنَ تک کے نزول کا سبب تھا بلکہ حضرت آدمؑ کا قصہ بھی اسی کی تمہید کے طور پر ذکر کیا گیا ہے تاکہ معلوم ہو جائے کہ سب سے پہلا دکھ جو شیطان کی طرف سے انسان کو پہنچا وہ پوشیدنی اعضاء کی برہنگی کی شکل میں نمودار ہوا۔ تمام آیات بتا رہی ہیں کہ پوشیدنی اعضا کو چھپانے کے لئے لباس کی تخلیق اللہ کی عظیم الشان نعمت ہے اور یہی تقویٰ ہے۔ بے پردگی اور پوشیدنی اعضاء کی برہنگی عظیم الشرمنی اور شیطانی اغواء ہے، جس کا شکار ابلیس نے پہلے تمہارے باپ آدمؑ کو کیا اور اب تم کو کر رہا ہے۔ یہ کھلی بے حیائی ہے جس کا ارتکاب باپ دادا کی پیروی میں عرب کرتے تھے اور اللہ پر بہتان باندھتے تھے کہ خدا نے ان کو اس کا حکم دیا ہے۔ اللہ بے حیائی کے کاموں کا حکم نہیں دیا کرتا اس نے تو ایک فریق کو ہدایت یاب کر دیا اور ایک فریق پر گمراہی کا ثبوت ہو گیا۔ یہ تمام آیات بتا رہی ہیں کہ پوشیدنی اعضاء کی پردہ کشائی بے حیائی ہے، مطلقاً حرام ہے۔ شریف طبیعتیں اس کو برا اور قابل عیب جانتی ہیں اور دانشمند اس کو قبیح سمجھتے ہیں۔ اس بے حیائی کا ارتکاب طواف اور دوسری عبادات میں تو اور بھی برا ہے۔ اس کی حرمت تو بدرجہ اولیٰ ہے اور عرب جو دعویٰ کرتے تھے کہ طواف کے وقت کپڑے پہنے رہنا درست نہیں اور حج میں گوشت اور چکنائی کھانا حرام ہے۔ یہ دعویٰ بالکل غلط ہے۔ اللہ نے اس کی تردید میں فرمادیا ہے قُلْ مَنْ حَرَّمَ زِينَةَ اللَّهِ الَّتِي الخ اور فرمایا ہے إِنَّمَا حَرَّمَ رَبِّيَ الْفَوَاحِشَ الخ تمام بے حیائی کی باتیں اللہ نے حرام کر دی ہیں۔ کشف عورت بھی بے حیائی ہے اللہ نے اس کو بھی حرام کر دیا لیکن باوجود کشف عورت کی حرمت اور ستر عورت کے وجوب کے یہ بات کسی آیت میں نہیں بتائی کہ پوشیدنی اعضاء کو چھپائے رکھنا (صحت) طواف کی شرط ہے (کہ اس کے بغیر طواف ادا نہ ہو) اسی لئے امام اعظمؒ نے فرمایا کہ اگر کوئی برہنہ طواف کرے گا تو گناہگار ضرور ہوگا مگر فرض طواف ادا ہو جائے گا۔ ہاں اکثر ائمہ فرض طواف کی ادائیگی کے بھی قائل نہیں کیونکہ حضرت ابوہریرہؓ کا بیان ہے کہ حج وداع سے ایک سال پہلے جب رسول اللہ ﷺ نے حضرت ابوبکرؓ کو امیر حج بنا کر بھیجا تو آپ نے مجھے ایک جماعت کے ساتھ مقرر فرما کر حکم دیا قربانی کے دن

سب لوگوں میں اعلان کر دیں اس سال کے بعد کوئی مشرک حج نہیں کرے گا اور کوئی برہنہ طواف کرے گا، متفق علیہ۔ امام اعظمؒ کے خلاف ائمہ کی عقلی دلیل یہ ہے کہ برہنہ طواف کرنے کی شرعاً ممانعت ہے لہٰذا ایسی حالت میں طواف کرنے سے فرض ادا نہ ہوگا جیسے قربانی کے دن روزہ رکھنے سے فرض روزہ کی قضا نہیں ہوتی یا طلوع و غروب اور زوال کے وقت نماز پڑھنے سے قضاء فوائت نہیں ہوتی۔

رہی آیت خُذُوْا زِيْنَتَكُمْ عِنْدَ كُلِّ مَسْجِدٍ تو اس کا تقاضا صرف اتنا ہے کہ نماز میں ستر عورت شرط ہے۔ ستر عورت کے بغیر نماز نہیں ہوتی۔ عام ستر عورت کا فرض ہونا اور کشف عورت کا حرام ہونا دوسری آیات سے ثابت ہے۔ اس آیت کا کوئی تعلق طواف سے نہیں ہے البتہ ایک حدیث میں رسول اللہ ﷺ کا ارشاد گرامی آیا ہے کہ کعبہ کا طواف کرنا بھی نماز ہے مگر اس میں بات کرنا اللہ نے مباح فرمادیا ہے۔ حضرت ابن عباسؓ کی روایت سے یہ حدیث ترمذی، حاکم، دار قطنی، ابن خزیمہ اور ابن حبان نے بیان کی ہے اور ابن خزیمہ و ابن حبان نے اس کو صحیح بھی کہا ہے۔ اس حدیث کو اگر آیت سے ملا دیا جائے تو آیت کا تعلق طواف سے بھی ہو جائے گا اگر یہ بات مان لی جائے کہ منجملہ دوسری آیات کے اس آیت کا نزول بھی عام کشف عورت کی برائی ظاہر کرنے کے لئے ہوا اور کعبہ کا برہنہ طواف کرنے کی روایت کو اس آیت کا سبب نزول بھی قرار دیا جائے تب بھی یہ نہیں ثابت ہوتا کہ اس آیت کا نزول بھی طواف ہی کے سلسلہ میں ہوا اگر کسی واقعہ کے متعلق یا کسی سوال کے جواب میں کوئی حکم نازل ہو تو اس واقعہ کا فیصلہ اور اس سوال کا جواب ضرور اس حکم سے مفہوم ہو جائے گا لیکن مورد نزول سے آگے بڑھ کر کوئی اور حکم معلوم نہ ہو سکے ایسا کہنا درست نہیں اور اس میں کوئی شک نہیں کہ برہنہ طواف نہ کرنے کا حکم اس آیت کے علاوہ دوسری آیات سے بھی معلوم ہوتا ہے اس لئے ابن ہمام کا وزن کیا ہوا اشکال درست نہیں۔

مسئلہ :- روضۃ الاحد میں ذکر کیا گیا ہے کہ امام ابو حنیفہؒ، امام شافعیؒ اور امام احمدؒ کے نزدیک ستر عورت نماز کی شرط ہے امام مالکؒ کے شاگردوں میں (امام مالک کے مسلک کے متعلق) روایت کا اختلاف ہے۔ بعض کا قول تو جمہور کے قول کے موافق ہے کہ اگر ستر عورت پر قدرت ہو اور اس کے باوجود پوشیدنی اعضاء کو برہنہ چھوڑ کر نماز پڑھے گا تو نماز صحیح نہ ہوگی گویا ستر عورت صحت نماز کی شرط ہے۔ بعض کا قول ہے کہ ستر عورت اگرچہ بجائے خود واجب ہے لیکن صحت نماز کی ضروری شرط نہیں ہے لہٰذا ستر عورت کی قدرت رکھتے ہوئے اگر کوئی برہنہ نماز پڑھے گا تو نماز فرض کی ادائیگی ہو جائے گی۔ مگر ستر عورت ترک کرنے کا گناہ اس پر ہوگا۔ متاخرین مالکیہ کے نزدیک بغیر ستر عورت کے کسی حال میں نماز صحیح نہیں۔ ابن ہمام نے اسی قول پر اجماع سلف نقل کیا ہے پچھلے زمانہ میں اگر آراء کا اختلاف ہو جائے تو اس سے اجماع سلف نہیں ٹوٹ سکتا۔

فصل

آیت سے اتنا تو معلوم ہو گیا کہ نماز میں ستر عورت واجب ہے لیکن عورت (یعنی پوشیدنی اعضاء کون سے ہیں اور کن اعضاء کے کتنے حصہ کو چھپانا واجب ہے اس معاملہ میں آیت مجمل ہے احادیث میں اس کا بیان آیا ہے۔

بیان حسب ذیل ہے

مسئلہ :- امام ابو حنیفہؒ اور امام شافعیؒ کے نزدیک مرد کے لئے ناف سے زانو تک چھپا رکھنا واجب ہے۔ امام احمدؒ و امام مالکؒ کے دو مختلف قول مروی ہیں ایک قول امام ابو حنیفہؒ کے موافق ہے اور دوسرے قول میں یہ ہے کہ صرف عضو مخصوص اگلا اور پچھلا چھپا رکھنا واجب ہے۔ اس قول کے استدلال میں حضرت انسؓ کی روایت کردہ حدیث پیش کی گئی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے خیبر پر چڑھائی کی آخر اللہ ... اس حدیث میں آیا ہے پھر رسول اللہ ﷺ نے اپنی ران سے تہبند ہٹایا، حضور ﷺ کی ران کی سفیدی اب بھی میری نظروں کے سامنے پھر رہی ہے۔ (رواہ البخاری) مسلم اور احمد کی روایت میں ہے پھر تہبند ہٹ گیا۔ حضرت عائشہؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ گھر کے اندر دونوں رانیں یا دونوں پنڈلیاں کھولے لیٹے ہوئے تھے اتنے میں حضرت ابو بکرؓ نے

والفاظ کی اجازت طلب کی آپ نے اسی حالت پر (لیٹے لیٹے) اجازت دے دی، پھر عمرؓ داخل ہونے کے خواستگار ہوئے آپ نے اسی حالت میں ان کو بھی اجازت دے دی، کچھ دیر کے بعد عثمانؓ طالب اجازت ہوئے تو آپ کپڑوں کو ٹھیک کر کے بیٹھ گئے۔ رواہ مسلم۔ اس حدیث میں چونکہ رانیں یا پنڈلیاں کوئی ایک لفظ وثوق کے ساتھ نہیں آیا ہے اس لئے ناقابل استدلال ہے۔ مگر امام احمدؒ نے چونکہ صرف رانیں کھولے لیٹنے کا ذکر کیا ہے اور حضرت حفصہؓ کی روایت سے امام احمدؒ نے جو حدیث ذکر کی ہے اس میں بھی صرف رانوں کا لفظ آیا ہے اس لئے حدیث قابل حجت ہے۔

طحاوی اور بیہقی نے ام المومنین حفصہؓ بنت عمرؓ کا بیان نقل کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ ایک روز میرے پاس دونوں رانوں سے کپڑا ہٹائے (لیٹے) ہوئے تھے اتنے میں حضرت ابوبکرؓ آ گئے۔

حضرت ابو موسیٰؓ کی روایت ہے کہ ایک جگہ جہاں پانی موجود تھا رسول اللہ ﷺ اپنے پائجامہ زانو کھولے بیٹھے ہوئے تھے جب حضرت عثمانؓ آئے تو حضور ﷺ نے زانو ڈھانک لیا۔ رواہ البخاری۔

جمہور کے قول کی دلیل حضرت علیؓ کی حدیث ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اپنی ران ظاہر نہ کرو اور کسی زندہ مردہ کی ران نہ دیکھو۔ رواہ ابوداؤد وابن ماجہ والحاکم والطبرانی۔ بعض علماء نے اس حدیث کو صحیح کہا ہے اس کی سند اس طرح ہے ابن جریج از حبیب بن ثابت از عاصم بن ضمرہ۔ حافظ نے لکھا ہے اس سند میں ابن جریج اور حبیب کے درمیان انقطاع ہے۔ ابو حاتم نے العلل میں لکھا ہے کہ ابن جریج اور حبیب کے درمیان واسطہ حسن بن ذکوان ہے اور یہ ضعیف ہے پھر عاصم سے حبیب کا سماع بھی ثابت نہیں یہ دوسری خرابی ہے۔ ابن معین نے کہا حبیب نے عاصم سے خود نہیں سنا دونوں کے درمیان ایک ایسا راوی ہے جو ثقہ نہیں ہے۔ بزار نے کہا دونوں کے درمیان راوی عمرو بن خالد واسطی ہے۔

حضرت ابن عباسؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ کا گزر ایک شخص کی طرف سے ہوا اس شخص کی ران کھلی ہوئی تھی حضور ﷺ نے فرمایا ران کو ڈھانپ لو ران بھی پوشیدنی حصہ ہے۔ رواہ الترمذی والحاکم واحمد۔ بعض علماء نے اس کو صحیح قرار دیا ہے لیکن اس کی سند میں ابو یحییٰ قتات راوی ہے جو ضعیف ہے۔

رسول اللہ ﷺ حضرت جرہدؓ کی طرف سے گزرے، جرہدؓ مسجد میں تھے اور ان کی ران کھلی ہوئی تھی۔ فرمایا جرہدؓ اپنی ران ڈھانک لو ران بھی پوشیدنی حصہ ہے رواہ احمد۔ اس حدیث کی سند میں ابو زرعہ مجہول راوی ہے۔

حضرت محمد بن جحشؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ حضرت معمرؓ کی طرف سے گزرے معمر جیوبہ ہٹائے بیٹھے تھے ران کا کچھ حصہ کھلا ہوا تھا۔ حضور ﷺ نے فرمایا معمر اپنی ران ڈھانک لو ران بھی پوشیدنی عضو ہے۔ رواہ احمد والبخاری فی التاریخ والحاکم فی المستدرک۔ حافظ نے کہا اس حدیث کے تمام راوی سوائے ابو کثیر کے صحیح کے راوی ہیں ابو کثیر کی روایت ایک جماعت نے لی ہے اور اس کے متعلق میں نے کسی کی طرف سے جرح اور تعدیل نہیں پائی۔

حضرت ابو ایوبؓ کی روایت ہے میں نے سنا رسول اللہ ﷺ فرما رہے تھے زانو سے اوپر عورت ہے اور ناف سے نیچے عورت ہے رواہ الدار قطنی۔ اس کی سند میں عباد بن کثیر اور سعید بن راشد ہیں اور دونوں متروک ہیں۔ عمرو بن شعیب کے والد کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اگر تم میں سے کوئی اپنے غلام کا نکاح کرائے الخ۔ اس حدیث میں ہے کہ ناف کے نیچے سے زانو تک پوشیدنی حصہ ہے رواہ الدار قطنی۔ اس کی سند میں سوار بن داؤد راوی ہے جس کو عقیلی نے نرم (یعنی ضعیف) قرار دیا ہے مگر ابن معین نے اس کو ثقہ کہا ہے۔

اگرچہ یہ حقیقت ہے کہ ان احادیث میں سے کوئی حدیث کشف ران والی حدیث سے نہیں ٹکراتی لیکن چونکہ ان احادیث میں سے ایک دوسری کی مؤید ہے اور امت نے اس کو قبول کیا ہے اس لئے بطور احتیاط ہم نے اس کو لے لیا ہے، اسی بنیاد پر

۱؎ سرینوں کی نوک پر دونوں پاؤں کھڑے کر کے پنڈلیوں کو رانوں سے ملا کر بیٹھنے کی شکل کو حبوہ کہتے ہیں کمر کے پیچھے سے کسی رومال یا چادر کو گھما کر لانے اور سامنے کے رخ پر پنڈلیوں پر گھما کر باندھنے سے تکیہ کی طرح پشت کو سہارا مل جاتا ہے۔

بخاری نے کہا ہے کہ انس والی حدیث کی سند زیادہ قوی ہے اور جرہد والی حدیث میں احتیاط زیادہ ہے اور چونکہ حضرت انس والی حدیث زیادہ قوی ہے بلکہ دو احادیث بھی زیادہ قوی ہیں جو حدیث انسؓ کی ہم معنی ہیں اس لئے امام ابو حنیفہؒ نے فرمایا برہنہ آدمی بیٹھ کر نماز پڑھے شرمگاہ پر ہاتھ رکھے اور رکوع سجود کرے سے اشارہ کرے یعنی ستر عورت جو نماز کے اندر اور باہر فرض ہے اس کی رعایت امام اعظمؒ نے کی ہے اور قیام و رکوع، سجود کو اس کی رعایت سے ترک کرنے کا حکم دے دیا ہے۔

مسئلہ:- امام اعظمؒ کے نزدیک زانو بھی پوشیدنی اعضاء میں داخل ہے۔ حضرت علیؓ کی روایت ہے میں نے رسول اللہ ﷺ سے سنا آپ فرما رہے تھے زانو پوشیدنی اعضا میں سے ہے۔ اس حدیث کی روایت میں عقبہ بن علقمہ راوی ہے جس کو ابو حاتم رازی اور نضر بن منصور نے ضعیف کہا ہے ابو حاتم نے کہا یہ مجہول ہے، منکر احادیث نقل کرتا ہے۔ ابن حبان نے کہا یہ ناقابل حجت ہے۔

امام شافعیؒ اور امام احمدؒ نے حضرت ابو ایوب اور عمرو بن شعیب کے دادا کی روایت کردہ احادیث مندرجہ بالا کی بناء پر زانو کو عورت میں داخل نہیں قرار دیا ہے۔ ہم کہتے ہیں زانو وہ جوڑ کا مقام ہے جہاں بالائی طرف سے پوشیدنی حصہ کی ہڈی اور نچلی طرف سے پنڈلی کی ہڈی ملتی ہے۔ اس سے اوپر کا حصہ کھلا رکھنا حرام ہے اور نیچے کا حصہ کھلا رکھنا جائز ہے۔ ہم نے بطور احتیاط حرمت کو حلت پر ترجیح دی ہے۔

مسئلہ:- آزاد عورت کا پورا جسم پوشیدنی ہے۔ امام اعظمؒ کے نزدیک چہرہ دونوں قدم اور (گٹوں سے نیچے) دونوں ہاتھ پوشیدنی اعضاء میں داخل نہیں ہیں۔ ایک روایت میں امام شافعیؒ، امام مالکؒ اور امام احمدؒ کا بھی یہی قول ہے۔ دوسری روایت میں ان ائمہ کے نزدیک صرف چہرہ اور قدم مستثنیٰ ہیں دونوں پنجے یعنی گٹوں سے نیچے ہاتھ عورت ہیں۔

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا بالغہ کی نماز بغیر اوڑھنی کے قبول نہیں کی جاتی۔ یہ بھی فرمایا عورت (سراسر) پوشیدنی ہے۔ رواہ الترمذی من حدیث ابن مسعودؓ۔ ابو داؤد نے مرسلاً بیان کیا ہے کہ لڑکی جب بالغ ہو جائے تو اس کے چہرے اور پہنچوں سے دونوں ہاتھوں کے علاوہ دیکھا جانا درست نہیں۔

حضرت ام سلمہؓ کا بیان ہے کہ میں نے رسول اللہ ﷺ سے دریافت کیا۔ کیا عورت صرف کرتہ اور اوڑھنی پہن کر بغیر تہبند کے نماز پڑھ سکتی ہے، فرمایا (پڑھ سکتی ہے) اگر کرتہ اتنا لمبا ہو کہ قدموں کی پشت کو ڈھانک رہا ہو۔ رواہ الدارقطنی۔ اس روایت کی سند میں ایک شخص عبدالرحمن بن عبداللہ ہے جس کو یحییٰ نے ضعیف کہا ہے۔ ابو حاتم نے کہا اس کی روایت ناقابل احتجاج ہے۔ ظاہر یہ ہے کہ اس حدیث کو مرفوع قرار دینے میں غلطی کی ہے کیونکہ امام مالکؒ اور ایک جماعت نے اس کو حضرت ام سلمہؓ کا قول قرار دیا ہے۔

مسئلہ:- النوازل میں ہے کہ عورت کی آواز کا بھی پردہ ہے، اسی لئے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ مردوں کے لئے سبحان اللہ پڑھنا ہے اور عورتوں کے لئے تالی بجانا۔ ابن ہمام نے کہا اگر اسی بنیاد پر کوئی کہے کہ نماز میں عورت اگر جہر کے ساتھ قرأت کرے تو نماز فاسد ہو جاتی ہے تو غلط نہ ہوگا۔

مسئلہ:- امام اعظمؒ کے نزدیک باندی کے پردہ کے اعضاء مرد کے پردہ کے اعضاء کی طرح ہیں، لیکن پیٹ اور پشت بھی پوشیدنی اعضاء میں داخل ہیں۔ امام مالکؒ، امام شافعیؒ اور امام احمدؒ کے نزدیک باندی کے پردہ کے اعضاء بالکل مرد کی طرح ہیں کوئی فرق نہیں (یعنی پیٹ اور پیٹھ پردہ کے اعضاء میں داخل نہیں) بعض اصحاب شافعیؒ نے کہا سر کلائیوں اور پنڈلیوں کے علاوہ باندی کے باقی اعضاء پردہ کے ہیں۔

بیہقی نے بروایت نافع لکھا ہے کہ صفیہ بنت ابی عبید نے بیان کیا کہ ایک عورت اوڑھنی پہنے چادر ڈالے نکلی۔ حضرت عمرؓ نے پوچھا یہ کون ہے جواب دیا گیا آپ ہی کی اولاد میں سے فلاں شخص کی باندی ہے۔ آپ نے حضرت حفصہؓ کے پاس پیام بھیجا اور فرمایا کیا وجہ کہ تم نے اوڑھنی اور چادر پہنا کر باندی کو بیاہتا آزاد عورتوں جیسا بنا دیا یہاں تک کہ میں اس کو آزاد شوہر والی عورتوں

میں سے سمجھے گا اور آزاد شوہر والی خیال کر کے قریب تھا کہ میں اس کی گرفت کرتا۔ باندیوں کو آزاد شوہر والی عورتوں جیسا نہ بنایا کرو۔ بیہقی نے لکھا ہے حضرت عمرؓ سے اس کے متعلق اقوال صحیح (الروایت) ہیں۔

مسئلہ :۔ امام احمدؒ کے نزدیک فرض نماز میں مونڈھے ڈھانکنا بھی فرض ہے۔ نفل میں مثبت منفی دونوں قول مروی ہیں۔ حضرت ابوہریرہؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کوئی شخص ایک کپڑا پہنے اس طرح نماز نہ پڑھے کہ مونڈھوں پر کپڑے کا کوئی حصہ نہ ہو۔ (رواہ احمد) صحیحین میں بھی ایسی ہی روایت آئی ہے مگر بخاری نے مونڈھوں کی جگہ تنہ کا اور مسلم نے کاندھوں کا لفظ لکھا ہے۔ جمہور کے نزدیک یہ ممانعت تنزیہی ہے (تحریمی نہیں) (کرمانی) بظاہر ممانعت کا تقاضا تحریم ہے (کیونکہ جب نہی مطلق ہو تو تحریمی ہی پر اس کو محمول کیا جاتا ہے) لیکن مونڈھے کھلے رکھنے کے جواز پر اجماع ہو چکا ہے (اس لئے نہی کو تنزیہی کہا جائے گا) حافظ نے بھی کرمانی سے یہی لیا ہے۔ اس کے بعد خود نووی کا بیان نقل کیا ہے کہ امام احمد مونڈھے کھلے رکھنے کو حرام کہتے ہیں۔ کرمانی کو خود کو اول بیان کے وقت یہ دوسرا بیان یاد نہیں رہا ورنہ اجماع کا دعویٰ نہ کرتے۔ ابن منذر نے بھی لکھا ہے کہ محمد بن علی مونڈھے کھلے رکھنے کو ناجائز قرار دیتے تھے۔ طحاوی نے شرح معانی الآثار میں اس مسئلہ کے متعلق ایک باب مستقل قائم کیا ہے اور حضرت ابن عمرؓ کا قول بروایت طاؤس وہی نقل کیا ہے اور بعض لوگوں نے ابن وہب اور ابن جریر کی روایت سے بھی لکھا ہے (کہ مونڈھے کھلے رکھنا ناجائز ہے) شیخ تقی الدین سبکی نے تو امام شافعیؒ کی عبارت اس کے وجوب کے متعلق نقل کی ہے اور اسی قول کو معتمد بھی قرار دیا ہے مگر شوافع کی عام کتابوں میں اس کے خلاف منقول ہے اور ستر مونڈھوں کو واجب نہیں قرار دیا گیا ہے)۔

مسئلہ :۔ اپنے اچھے کپڑے پہن کر نماز پڑھنا مستحب ہے آیت میں اسی کی طرف اشارہ ہے کیونکہ آیت میں لباس کی تعبیر لفظ زینت سے فرمائی ہے اور زینت کو پہن کر نماز پڑھنے کا حکم دیا ہے، لہٰذا واجب مقدار اگرچہ اتنی ہے جس سے ستر عورت ہو جائے لیکن اس سے زیادہ لباس مستحب ہے۔ طحاوی نے حضرت ابن عمرؓ کی روایت سے لکھا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جب تم میں سے کوئی نماز پڑھے تو دو کپڑے پہن لیا کرے کیونکہ اللہ اس کا زیادہ مستحق ہے کہ اس کے سامنے آنے کے وقت زینت کی جائے (یعنی پورا لباس پہنا جائے) بخاری نے حضرت ابوہریرہؓ کی روایت سے لکھا ہے کہ ایک شخص کھڑا ہوا اور رسول اللہ ﷺ سے صرف ایک کپڑا پہن کر نماز پڑھنے کا حکم دریافت کیا حضور ﷺ نے فرمایا کیا تم میں سے ہر ایک کے پاس دو کپڑے ہوتے ہیں (یعنی ہر شخص کو تو دو کپڑے اور پورا جوڑا پہننے کی توفیق نہیں پھر ایک کپڑا ہی پہن کر نماز پڑھے گا) پھر مدت کے بعد ایک شخص نے حضرت عمرؓ سے یہی مسئلہ پوچھا تو آپ نے فرمایا جب اللہ نے کشائش عطا فرما دی ہے تو تم لوگوں نے بھی کشائش سے کام لیا لوگوں نے پورے کپڑے پہن کر نماز پڑھی۔ کسی نے تہبند اور چادر پہن کر، کسی نے تہبند اور قمیص پہن کر، کسی نے تہبند اور قبا پہن کر، کسی نے پائجامہ اور چادر پہن کر، کسی نے پائجامہ اور کرتہ پہن کر، کسی نے پائجامہ اور چوغہ پہن کر، کسی نے تبان اور قبا، تبان اور قمیص پہن کر اور شاید یہ بھی فرمایا کسی نے تبان اور چوغہ پہن کر۔

بغویؒ نے کلبی کا بیان نقل کیا ہے کہ (جاہلیت کے زمانہ میں) حج کی مدت میں بنی عامر صرف اتنا کھاتے تھے کہ زندگی باقی رہ جائے اور چربی یا چکنائی نہیں کھاتے تھے یہ فعل حج کی عظمت کے پیش نظر کرتے تھے۔ مسلمانوں نے کہا (تعظیم حج کے) تو ہم زیادہ مستحق ہیں ہم بھی ایسا ہی کریں گے اس پر آیت ذیل نازل ہوئی۔

وَّكُلُوْا (اور کھاؤ یعنی گوشت اور چربی کھاؤ۔

وَاشْرَبُوْا وَلَا تُسْرِفُوْا ۚ اِنَّهٗ لَا يُحِبُّ الْمُسْرِفِيْنَ ﴿٣١﴾ (اور پیو اور حد سے مت نکلو، حد سے نکلنے والوں کو یقیناً اللہ پسند نہیں کرتا)۔ یعنی گوشت اور چربی کھانا اور لباس پہننا اللہ نے حلال کیا ہے اس کو حرام بنا کر حد سے نہ نکلو۔

ابن منذر نے عکرمہ کا بیان نقل کیا ہے کہ آیت قَدْ اَنْزَلْنَا عَلَيْكُمْ لِبَاسًا يُّوَارِيْ سَوْاٰتِكُمْ کا نزول قریش کے خمس اور بنی عامر بن صعصعہ اور کنانہ بن بکر کے مختلف بطون کے متعلق ہوا، جو حج کے زمانہ میں گوشت نہیں کھاتے تھے اور گھروں میں (دروازوں سے) نہیں داخل ہوتے تھے بلکہ گھروں کے پیچھے کی طرف سے جاتے تھے۔ حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا

جو دل چاہے کھا جو دل چاہے پہن، لیکن دو باتوں سے پرہیز رکھ، حد سے تجاوز اور اترانا۔ اخرجہ ابن ابی شیبۃ فی المصنف و عبد بن حمید فی التفسیر [1]

حضرت ابن عمرؓ کی مرفوع روایت ہے کھاؤ اور پیو اور خیرات کرو اور پہنو بغیر اسراف اور اترانے کے۔ رواہ احمد بسند صحیح و ابن ماجۃ والحاکم [2]

روایت میں آیا ہے کہ ہارون رشید کے پاس ایک عیسائی طبیب حاذق تھا ایک روز اس نے علی بن حسین بن واقد سے کہا تمہاری کتاب میں علم طب کے متعلق کچھ نہیں ہے حالانکہ علم دو ہی ہیں بدن کا علم اور دین کا علم۔ علی نے جواب دیا اللہ نے ساری طب کو آدھی آیت میں جمع کر دیا ہے، فرمایا ہے "كُلُوا وَاشْرَبُوا وَلَا تُسْرِفُوا" طبیب بولا تمہارے رسول ﷺ کا کوئی قول طب کے متعلق نہیں آیا۔ علیؒ نے کہا ہمارے رسول ﷺ نے بھی ساری طب کو چند الفاظ میں جمع کر دیا ہے، فرمایا ہے "معدہ مرض کا گھر ہے۔ پرہیز ہر علاج کا سر ہے ہر بدن کو وہی چیز دو جس کا تم نے اس کو عادی بنا دیا ہو۔" طبیب بولا تمہاری کتاب اور تمہارے رسول نے تو جالینوس کے لئے طب چھوڑی ہی نہیں۔

قُلْ مَنْ حَرَّمَ زِيْنَةَ اللّٰهِ الَّتِيْٓ اَخْرَجَ لِعِبَادِهٖ (اے محمد ﷺ) آپ کہئے کہ جو زینت اللہ نے اپنے بندوں کے لئے پیدا کی ہے اس کو حرام کرنے والا کون)۔ یہ استفہام انکاری ہے یعنی اللہ نے لباس کا سامان پیدا کیا، روئی، پوست السن (یعنی السی) ریشم (کا جن سے پیدا کی، اون، بھیڑ، بکری کی کھال سے اور ریشم کیڑے سے پیدا کی۔ بندوں کے لئے پیدا کرنے سے مراد ہے۔ بندوں کے فائدے اور آرائش کے لئے پیدا کرنا۔

وَالطَّيِّبٰتِ مِنَ الرِّزْقِ (اور لذیذ چیزیں کھانے پینے کی پیدا کیں)۔

یعنی اللہ جو ان سب کا خالق اور مالک ہے اس نے تو ان چیزوں کو حرام نہیں قرار دیا پھر اور کون ان کو حرام و حلال بنا سکتا ہے۔ وہی کیا وجہ ہے کہ کافر مشرک دوران طواف میں کپڑے پہنے رہنا اور ایام حج میں گوشت اور چربی کھانا اور سوائب وغیرہ کو کام میں لانا حرام قرار دیتے ہیں۔ اس آیت سے ثابت ہو رہا ہے کہ اگر اللہ نے حرام نہ قرار دیا ہو تو ہر چیز (اصل تخلیق کے لحاظ سے) حلال ہے (اسی لئے کہا جاتا ہے کہ اصل اشیاء میں حلت ہے)۔

قُلْ هِيَ لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا خَالِصَةً يَّوْمَ الْقِيٰمَةِ (آپ کہہ دیجئے کہ یہ چیزیں اس طور پر کہ قیامت کے دن بھی خالص رہیں دنیوی زندگی میں خاص اہل ایمان کے لئے ہیں) یعنی یہ لباس آرائش اور پاک لذیذ کھانے پینے کی چیزیں دنیا میں اہل ایمان کے لئے پیدا کی گئی ہیں کہ وہ ان سے فائدہ اندوز ہوں اور ان کو استعمال کر کے اللہ کی عبادت کے لئے جسمانی طاقت حاصل کریں اور اللہ کا شکر ادا کریں۔ براہ راست کافروں کے لئے ان کو نہیں پیدا کیا گیا۔ مسلمانوں کے ساتھ کافروں کو ان نعمتوں میں اللہ نے بطور آزمائش شریک بنا لیا ہے تاکہ ان کو ڈھیل مل گئی ہے۔

خالصۃ سے یہ مراد ہے کہ قیامت کے دن یہ نعمتیں ہر کدورت و آلائش (خوف انقطاع) اور غم سے پاک صاف ہوں گی۔ دنیا میں ضرور یہ کدورت آمیز اور غم آگیں ہیں یا خالصۃ کا یہ مطلب ہے کہ قیامت کے دن یہ صرف اہل ایمان کو ملیں گی

---

[1] حسن کی روایت ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ اپنے آخری بیٹے عبداللہ رضی اللہ عنہ کے پاس تشریف لے گئے ان کے پاس گوشت رکھا ہوا تھا پوچھا یہ گوشت کیسا ہے عبداللہؓ نے جواب دیا یہ گوشت ہے جو مجھے پسند ہے، فرمایا جس کو تیرا دل چاہے گا (کیا) اس کو کھائے گا۔ آدمی کی یہ بڑی فضول خرچی ہے کہ جس چیز کو دل چاہے اس کو کھا لے۔

[2] حضرت عمر بن خطاب (رضی اللہ عنہ) نے فرمایا پیٹ بھر کر کھانے پینے سے پرہیز رکھو، یہ جسم کو بگاڑتا ہے، بیماری پیدا کرتا ہے، نماز میں سستی کا ذریعہ ہے۔ کھانے پینے میں کمی کا التزام کرو یہ جسمانی تندرستی کا ذریعہ ہے اور اسراف سے بہت دور رکھنے والا ہے۔ اللہ موٹے جسم کو پسند نہیں کرتا، آدمی جب تک اپنے دین پر خواہش کو ترجیح نہیں دے گا تباہ نہیں ہوگا۔

کافر محروم رہیں گے (اگرچہ دنیا میں دونوں مشترک ہیں)۔
كَذٰلِكَ نُفَصِّلُ الْاٰيٰتِ لِقَوْمٍ يَّعْلَمُوْنَ۝ (ہم اسی طرح تمام آیات کو سمجھ داروں کے لئے صاف صاف بیان کرتے ہیں) جس طرح ہم نے حرام کو حلال سے جدا کر دیا۔ حلال کو اختیار کرنے کی اور حرام سے بچنے کی ہدایت کر دی اسی طرح ہم تفصیل احکام ان لوگوں کے لئے کرتے ہیں جو اللہ کو وحدہٗ لاشریک جانتے ہیں۔
قُلْ اِنَّمَا حَرَّمَ رَبِّيَ الْفَوَاحِشَ مَا ظَهَرَ مِنْهَا وَمَا بَطَنَ وَالْاِثْمَ وَالْبَغْيَ بِغَيْرِ الْحَقِّ وَاَنْ تُشْرِكُوْا بِاللّٰهِ مَا لَمْ يُنَزِّلْ بِهٖ سُلْطٰنًا وَّاَنْ تَقُوْلُوْا عَلَى اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ۝ ((اے محمد ﷺ) آپ کہہ دیجئے کہ البتہ میرے رب نے حرام کیا ہے تمام بے حیائی کی باتوں کو ان میں جو علانیہ ہیں ان کو بھی اور جو پوشیدہ ہیں ان کو بھی اور ہر گناہ کی بات کو ناحق کسی پر ظلم کرنے کو بھی اور اس بات کو بھی کہ اللہ کے ساتھ کسی ایسی چیز کو شریک بناؤ جس کی اللہ نے کوئی سند نہیں نازل کی اور اس بات کو کہ تم اللہ کے ذمہ کوئی ایسی بات لگا دو جس کی کوئی سند نہ ہو)۔
اَلْفَوَاحِشَ یعنی وہ باتیں جن کے اندر برائی بہت زیادہ ہے۔ ظاہر فواحش جیسے مردوں کا برہنہ ہو کر دن میں طواف کرنا۔ پوشیدہ فواحش جیسے عورتوں کا برہنہ ہو کر رات میں طواف کرنا۔ بعض لوگوں نے کہا چھپ کر اور علانیہ زنا کرنا مراد ہے۔
حضرت ابن مسعودؓ کی مرفوع روایت ہے اللہ سے زیادہ کوئی غیرت مند نہیں، اسی لئے اس نے تمام چھپی کھلی بے حیائیوں کو حرام کر دیا ہے اور اللہ سے زیادہ کوئی اپنی تعریف کو پسند کرنے والا بھی نہیں ہے اسی لئے خود اس نے اپنی تعریف کی ہے۔
اَلْاِثْمَ سے موجب اثم مراد ہے یعنی گناہ اور اللہ کی نافرمانی۔ یہ لفظ عام ہے فواحش بھی اس میں داخل ہیں۔ خاص کے بعد (حکم کی ہمہ گیری ظاہر کرنے کے لئے) عام کا ذکر کر دیا جاتا ہے۔ ضحاک نے کہا اثم سے مراد ہے وہ گناہ جس کی کوئی سزا مقرر نہیں۔ حسن نے کہا اثم شراب ہے۔ ایک شاعر کا قول ہے میں نے اثم کو اتنا پیا کہ میری عقل غائب ہو گئی۔ اثم سے عقل جاتی ہی رہتی ہے۔
اَلْبَغْيَ سے مراد ہے ظلم یا تمرد یا عادل بادشاہ کے خلاف بغاوت۔ بِغَيْرِ الْحَقِّ کا تعلق اَلْبَغْيَ سے ہے اس سے مفہوم بغی کی معنوی تاکید ہو رہی ہے اَنْ تُشْرِكُوْا میں اَنْ مصدری ہے شریک قرار دینا۔
سُلْطٰنًا دلیل۔ اس لفظ سے مشرکوں کا مذاق اڑایا گیا ہے اور اس امر پر تنبیہ کی گئی ہے کہ بے دلیل بات کا اتباع حرام ہے۔ وَاَنْ تَقُوْلُوْا عَلَى اللّٰهِ یعنی بحیرہ جانوروں کی (خود ساختہ) حرمت کو اللہ کے ذمہ باندھنا اور برہنہ طواف کو اللہ کا حکم قرار دینا۔ مقاتل نے کہا دین میں بغیر یقین کے کوئی بات کہنے کی اس لفظ نے عمومی تحریم کر دی۔
وَلِكُلِّ اُمَّةٍ اَجَلٌ (اور ہر گروہ کے لئے ایک میعاد معین ہے)۔ یعنی کافروں کے ہر گروہ پر عذاب نازل ہونے کا اللہ کے علم میں ایک مقرر وقت اور معین مدت ہے۔ بیضاوی کے ترجمہ پر عذاب کی دھمکی ہے۔
فَاِذَا جَآءَ اَجَلُهُمْ لَا يَسْتَاْخِرُوْنَ سَاعَةً وَّلَا يَسْتَقْدِمُوْنَ۝ (سو جس وقت ان کی میعاد معین آجائے گی تو فوراً ہی ایک گھڑی نہ پیچھے ہٹ سکیں گے نہ آگے بڑھ سکیں گے)۔
یعنی قلیل ترین وقت کی بھی ان کو مہلت نہیں دی جائے گی، خواہ وہ مہلت کے طالب ہوں اور نہ وقت سے پہلے ان پر عذاب آئے گا خواہ وہ نزول عذاب کے خواستگار ہوں جیسے کافروں نے کہا تھا اے اللہ اگر یہ تیری جانب سے حق ہے تو ہم پر آسمان سے پتھر برسا یا کوئی اور دکھ کا عذاب ہم پر نازل کر دے[1]۔
يٰبَنِيْٓ اٰدَمَ اِمَّا يَاْتِيَنَّكُمْ رُسُلٌ مِّنْكُمْ يَقُصُّوْنَ عَلَيْكُمْ اٰيٰتِيْ فَمَنِ اتَّقٰى وَاَصْلَحَ فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ

[1] سعید بن مسیب کا بیان ہے کہ جب حضرت عمرؓ کے نیزہ مارا گیا اور آپ زخمی ہو گئے تو حضرت کعب نے کہا اگر حضرت عمرؓ اللہ سے اپنی زندگی کے لئے دعا کریں تو اللہ دعا رد نہیں کرے گا اور آپ کا آیا ہوا وقت ٹال دے گا۔ کعب سے کہا گیا کیا اللہ نے یہ نہیں فرمایا (بقیہ اگلے صفحہ پر)

وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ ⓐ (اے اولاد آدم جب تمہارے پاس (میرے) پیغمبر آئیں گے جو تم ہی میں سے ہوں گے (اور) تم سے میرے احکام بیان کریں گے سو جو لوگ پرہیز رکھیں گے اور درستی کریں گے ان کو کچھ اندیشہ نہ ہوگا نہ وہ غمگین ہوں گے)۔

اما میں ما زائدہ ہے جس کو تاکید شرط کے لئے زیادہ کیا گیا۔ لفظ ان جو شک کے لئے آتا ہے (باوجودیکہ پیغمبروں کا آنا یقینی تھا) اس لئے استعمال کیا گیا کہ پیغمبروں کو بھیجنا اللہ کے ذمہ واجب نہیں۔ اللہ پر کوئی چیز بھی واجب نہیں (کسی کا اس پر کوئی لازمی واجب الادا حق نہیں) جب ہر شخص کو اس نے عقل و فہم اور تمام علمی و عملی طاقتیں عطا فرما دیں اور انفسی، آفاقی، داخلی اور خارجی دلیلیں قائم کر دیں تو سوچ سمجھ کر ایمان و اعمال کی درستی سب پر واجب ہو گئی۔ ہدایت نامے اور انبیاء کی بعثت ضروری نہیں رہی مگر اللہ نے اپنی مہربانی سے کتابیں اور پیغمبر بھیجے)۔

منکم یعنی آدمیوں میں سے۔ ایاتی یعنی اللہ کی کتابوں کی آیات۔ فمن اتقی یعنی جو شخص شرک اور تکذیب انبیاء سے بچا رہا۔ واصلح یعنی اس نے اپنے اعمال کو درست کر لیا اور اللہ کے حکم کے مطابق خالص اللہ ہی کی خوشنودی کے لئے کام کئے۔ فلا خوف یعنی قبر میں اور قیامت کے دن جب دوسرے لوگوں کو خوف ہوگا ان کو کوئی خوف نہ ہوگا۔ ولا ھم یحزنون یعنی جب دوزخ کے اندر دوسرے لوگ حزن میں مبتلا ہوں گے (اور گزشتہ زندگی تباہ کرنے کا ان کو غم ہوگا) ان کو کوئی غم نہ ہوگا۔

وَالَّذِينَ كَذَّبُوا بِآيَاتِنَا وَاسْتَكْبَرُوا عَنْهَا أُولَٰئِكَ أَصْحَابُ النَّارِ هُمْ فِيهَا خَالِدُونَ ⓐ (اور جو لوگ ہمارے احکام کی تکذیب کریں گے اور ان سے تکبر کریں گے وہ دوزخی ہوں گے اور دوزخ میں ہمیشہ رہیں گے)۔ تکبر کریں گے یعنی ایمان لانے سے غرور کریں گے۔ فلا خوف میں فاء کو ذکر کرنا اور اولئک کو بغیر فاء کے لانا (باوجودیکہ دونوں جزاء شرط ہیں) وعدہ ثواب کی قوت اور وعید عذاب کی سختی کو ظاہر کر رہا ہے۔

فَمَنْ أَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرَىٰ عَلَى اللَّهِ كَذِبًا أَوْ كَذَّبَ بِآيَاتِهِ (پس اس سے زیادہ ظالم کون جو اللہ پر دروغ بندی کرتا ہے یا اللہ کی آیات کو جھوٹا قرار دیتا ہے) یعنی اللہ کے لئے شریک اور بیوی بچے قرار دیتا ہے اور سائبہ اور دوسرے بتوں کے ناموں پر چھوڑے ہوئے جانوروں کی حرمت کا قائل ہے اور برہنہ طواف کرنے کو ضروری کہتا ہے (اور ان احکام کی نسبت اللہ کی طرف کرتا ہے) آیت کے عموم میں روافض بھی داخل ہیں جو اللہ پر اور اللہ کے پیغمبروں پر دروغ بندی کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اللہ نے تو قرآن میں کچھ آیات اور بھی اتاری تھیں مگر صحابہؓ نے ان کو قرآن سے ساقط کر دیا۔

او کذب بایتہ میں حرف او تردید کے لئے ہے لیکن یہ تردید جمع کی نہیں بلکہ خلو کی ہے (یعنی یہ دونوں باتیں ساتھ ساتھ ہو سکتی ہیں کہ ایک شخص اللہ پر دروغ بندی بھی کرے اور جو احکام اللہ کے نہیں ہیں ان کی نسبت اللہ کی طرف کر دے اور واقعی جو اللہ کے احکام ہیں ان کو نہ مانے۔ ہاں اظلم ہونے کے لئے ان دونوں باتوں میں سے کسی ایک کا ہونا لازم ہے یعنی جو ایک کام کرے یا دوسرا وہ ضرور اظلم ہوگا۔

أُولَٰئِكَ يَنَالُهُمْ نَصِيبُهُم مِّنَ الْكِتَابِ حَتَّىٰ إِذَا جَاءَتْهُمْ رُسُلُنَا يَتَوَفَّوْنَهُمْ قَالُوا أَيْنَ مَا كُنتُمْ تَدْعُونَ مِن دُونِ اللَّهِ (دنیا میں) ان کے نصیب کا جو کچھ ہے ان کو مل جائے گا یہاں تک کہ جب ان

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) ہے کہ فَإِذَا جَاءَ أَجَلُهُمْ لَا يَسْتَأْخِرُونَ سَاعَةً وَلَا يَسْتَقْدِمُونَ- آیا ہوا وقت موت آگے پیچھے نہیں ہو سکتا۔ حضرت کعبؓ نے فرمایا اللہ نے یہ بھی تو فرمایا ہے وَمَا يُعَمَّرُ مِن مُّعَمَّرٍ وَلَا يُنقَصُ مِنْ عُمُرِهِ إِلَّا فِي كِتَابٍ جس کسی کی عمر زیادہ ہو یا عمر میں کمی کر دی جائے سب کا اندراج لوح محفوظ میں ہوتا ہے اللہ جس کو چاہتا ہے پیچھے کر دیتا ہے اور (جس کو چاہتا ہے) قدم کر دیتا ہے پھر جب معین وقت آ جاتا ہے تو آگے پیچھے نہیں ہوتا۔ ابو طیبہ کی روایت ہے کہ جب حضرت عمرؓ نیزہ سے زخمی ہو گئے تو کعب آکر رونے لگے اور بولے کاش امیر المومنین اللہ پر بھروسہ کرتے ہوئے قسم کھا لیتے کہ اللہ ان کا آیا ہوا وقت ٹال دے گا تو اللہ ضرور ٹال دیتا (آپ کی قسم کو اللہ جھوٹا نہ ہونے دیتا) ابن عباسؓ نے حضرت عمرؓ سے جا کر کہہ دیا کہ کعبؓ نے ایسی بات کہی ہے امیر المومنین نے فرمایا اس صورت میں تو بخدا میں اللہ سے (تاخیر اجل کی) دعا نہیں کروں گا۔

کے پاس ہمارے بھیجے ہوئے فرشتے آئیں گے (اور) ان کی جانیں قبض کریں گے تو پوچھیں گے وہ کہاں گئے جن کی پوجا تم اللہ کے علاوہ کرتے تھے۔ یہ فرشتوں کی طرف سے استفہام بطور سرزنش ہوگا یعنی وہ بت وغیرہ کہاں گئے جن کو تم پوجتے تھے۔

قَالُوا ضَلُّوا عَنَّا وَشَهِدُوا عَلَىٰ أَنفُسِهِمْ أَنَّهُمْ كَانُوا كَافِرِينَ ﴿٣٧﴾ (وہ جواب دیں گے (آج) وہ سب غائب ہوگئے اور (معائنہ عذاب کے وقت) وہ خود اپنے کافر ہونے کا اعتراف کریں گے۔

قَالَ ادْخُلُوا فِي أُمَمٍ قَدْ خَلَتْ مِن قَبْلِكُم مِّنَ الْجِنِّ وَالْإِنسِ فِي النَّارِ ۖ كُلَّمَا دَخَلَتْ أُمَّةٌ لَّعَنَتْ أُخْتَهَا ۖ ((قیامت کے دن اللہ یا موت کے وقت فرشتے) کہے گا تم سے پہلے جن و انس کے جو فرقے گزر چکے ہیں ان کے ساتھ شامل ہو کر تم بھی دوزخ میں چلے جاؤ جس وقت بھی (دوزخ میں) کوئی جماعت داخل ہوگی وہ اپنی جیسی دوسری جماعت پر لعنت کرے گی یعنی اس جماعت پر لعنت کرے گی جو اسی کی طرح گمراہ ہوگی اور جس کی پیروی کی وجہ سے یہ گمراہ ہوئی ہوگی۔ یہودی یہودیوں پر اور عیسائی عیسائیوں پر اور تمام گمراہ گمراہ کرنے والے لیڈروں پر لعنت کریں گے۔

حَتَّىٰ إِذَا ادَّارَكُوا فِيهَا جَمِيعًا قَالَتْ أُخْرَاهُمْ لِأُولَاهُمْ رَبَّنَا هَٰؤُلَاءِ أَضَلُّونَا فَآتِهِمْ عَذَابًا ضِعْفًا مِّنَ النَّارِ ۖ قَالَ لِكُلٍّ ضِعْفٌ وَلَٰكِن لَّا تَعْلَمُونَ ﴿٣٨﴾ (یہاں تک کہ جب دوزخ کے اندر (پچھلی اور اگلی) سب جماعتیں جمع ہو جائیں گی تو پچھلی جماعت پہلی جماعت کے متعلق کہے گی اے ہمارے مالک انہوں نے ہم کو گمراہ کیا ان کو دوزخ کا دوگنا عذاب دے (گمراہ ہونے کا اور گمراہ کرنے کا) اللہ فرمائے گا تم میں سے ہر ایک کے لئے دوگنا عذاب ہے، لیکن تم (ابھی) واقف نہیں۔ یعنی جتنا بظاہر دوسروں کو عذاب نظر آرہا ہے حقیقت میں اس سے دوگنا ہے۔ ہر عذاب کی ایک ظاہری شکل و مقدار ہوگی جو دوسروں کو دکھائی دے گی ایک باطنی کیفیت و مقدار ہوگی جو دوسروں کو نہیں دکھائی دے گی اور نہ دیکھنے کی وجہ سے خیال کیا جائے گا کہ اندرونی طور پر اس پر عذاب نہیں ہے۔ یا یہ مطلب ہے کہ گمراہی کا تقاضا جس عذاب کا ہے اس سے دوگنا عذاب ہر فریق پر ہوگا۔ رہنماؤں پر ایک عذاب تو ان کے کفر کا ہوگا اور دوسرا عذاب گمراہ کرنے کا اور جماعتوں کے تابعین پر ایک عذاب اپنے کفر کا ہوگا اور دوسرا اہل حق کو چھوڑ کر اہل باطل کی تقلید کرنے کا۔

وَقَالَتْ أُولَاهُمْ لِأُخْرَاهُمْ فَمَا كَانَ لَكُمْ عَلَيْنَا مِن فَضْلٍ فَذُوقُوا الْعَذَابَ بِمَا كُنتُمْ تَكْسِبُونَ ﴿٣٩﴾ (اور پہلی جماعت پچھلی جماعت سے کہے گی اب تم کو ہم پر کوئی برتری نہیں لہٰذا اپنے کئے کا مزہ چکھو۔ پہلی جماعت اپنے کلام کو اللہ کے کلام پر مرتب کرتے ہوئے کہے گی اللہ کے کلام سے ثابت ہو گیا کہ تم کو ہم پر کوئی برتری حاصل نہیں۔ سب استحقاق عذاب میں برابر ہیں لہٰذا اپنے کئے کی سزا بھگتو۔ فَذُوقُوا الْعَذَابَ رہنماؤں کے کلام کا جز ہے یا اللہ کا وہ کلام ہے جو دونوں فریقوں سے ان کی باہمی گفتگو کے بعد اللہ فرمائے گا۔

إِنَّ الَّذِينَ كَذَّبُوا بِآيَاتِنَا وَاسْتَكْبَرُوا عَنْهَا لَا تُفَتَّحُ لَهُمْ أَبْوَابُ السَّمَاءِ وَلَا يَدْخُلُونَ الْجَنَّةَ حَتَّىٰ يَلِجَ الْجَمَلُ فِي سَمِّ الْخِيَاطِ ۚ (جن لوگوں نے ہماری آیات کی تکذیب کی اور ان پر ایمان لانے سے سرتابی کی ان کے لئے آسمان کے دروازے نہیں کھولے جائیں گے اور نہ وہ جنت میں داخل ہوں گے یہاں تک کہ اونٹ سوئی کے ناکے میں نہ گھس جائے) یعنی ان کے اعمال اور روحوں کے لئے آسمان کے دروازے نہیں کھولے جائیں گے۔ حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا ان کی روحوں کے لئے نہیں کھولے جائیں گے کیونکہ ان کی روحیں گندی ہوں گی ان کو اوپر نہیں چڑھایا جائے گا بلکہ نیچے سجین میں پھینک دیا جائے گا۔

امام احمد، نسائی اور بیہقی نے حضرت براء بن عازب کی روایت سے ایک طویل حدیث نقل کی ہے جس میں کافر بندے کے متعلق رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے کہ ملک الموت کافر کی روح قبض کرنے کے بعد ٹاٹ میں لپیٹ دیتے ہیں اس سے بدترین مردار کی ایسی بدبو نکلتی ہے پھر اس کو لے کر اوپر چڑھتے ہیں اور ملائکہ کے جس گروہ کی طرف سے ان کا گزر ہوتا ہے تو وہ پوچھتے ہیں یہ گندی روح کون ہے روح کے قابض ملائکہ اس مردہ کا بدترین دنیوی نام لے کر کہتے ہیں فلاں بن فلاں کی ہے۔ آخر

ساتویں آسمان تک اس کو لے جایا جاتا ہے اور دروازہ کھلوانے کی درخواست کی جاتی ہے لیکن دروازہ نہیں کھولا جاتا۔ پھر حضور ﷺ نے آیت لَا تُفَتَّحُ لَهُمْ أَبْوَابُ السَّمَاءِ وَلَا يَدْخُلُونَ الْجَنَّةَ حَتَّىٰ يَلِجَ الْجَمَلُ فِي سَمِّ الْخِيَاطِ تلاوت فرمائی۔ پھر اللہ فرماتا ہے اس کی کتاب نچلی زمین کے قید خانہ (سجین) میں درج کرلو۔ حسب الحکم اس روح کو سجین میں) پھینک دیا جاتا ہے۔ اس کے بعد حضور ﷺ نے آیت وَمَن يُشْرِكْ بِاللَّهِ فَكَأَنَّمَا خَرَّ مِنَ السَّمَاءِ فَتَخْطَفُهُ الطَّيْرُ أَوْ تَهْوِي بِهِ الرِّيحُ فِي مَكَانٍ سَحِيقٍ تلاوت فرمائی۔ ابن ماجہ نے حضرت ابوہریرہؓ کی روایت سے بھی ایسی ہی حدیث نقل کی ہے۔

حتی یلج الجمل یعنی اونٹ کی برابر کوئی چیز سوئی کے سوراخ میں داخل ہو جائے اور ایسا ہونا تو کبھی ممکن نہیں لہٰذا ان کا جنت میں داخلہ بھی کبھی ممکن نہیں۔

وَكَذَٰلِكَ نَجْزِي الْمُجْرِمِينَ ۝ لَهُم مِّن جَهَنَّمَ مِهَادٌ وَمِن فَوْقِهِمْ غَوَاشٍ ۚ وَكَذَٰلِكَ نَجْزِي الظَّالِمِينَ ۝ اور ہم (سخت سزا اور رحمت سے محرومی) کی طرح ہم مجرموں کو سزا دیں گے ان کا بچھونا اوڑھنا جہنم کا ہوگا اور ایسی ہی ہم ظالموں کو سزا دیں گے) مہاد بستر۔ غواش (غاشیہ کی جمع ہے) اوڑھنے کی چیز۔ یعنی آگ ان کو ہر طرف سے محیط ہوگی۔ دوسری آیت میں بھی اسی مضمون کو ادا کیا ہے فرمایا ہے مِن فَوْقِهِمْ ظُلَلٌ مِّنَ النَّارِ وَمِن تَحْتِهِمْ ظُلَلٌ۔ جنت سے محرومی کے ساتھ مجرمین کا لفظ اور عذاب نار کے ساتھ ظالمین کا لفظ ذکر کیا اس سے اس بات پر تنبیہ ہوگئی کہ ظلم کا درجہ جرم سے بڑا ہے۔

اس کے آگے حسب اسلوب قرآنی اہل ایمان کے ثواب کا ذکر کیا اور فرمایا۔

وَالَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ لَا نُكَلِّفُ نَفْسًا إِلَّا وُسْعَهَا أُولَٰئِكَ أَصْحَابُ الْجَنَّةِ ۖ هُمْ فِيهَا خَالِدُونَ ۝ (اور جو ایمان لائے اور نیک کام کئے ایسے ہی لوگ جنتی ہیں جنت کے اندر وہ ہمیشہ رہیں گے ہم کسی کو اس کی گنجائش سے زیادہ مکلف نہیں کرتے)۔ الصالحات جمع ہے اور جب جمع کے صیغے پر الف لام آجائے تو صیغہ استغراقی بن جاتا ہے۔ اس لئے عَمِلُوا الصَّالِحَاتِ کے کہنے سے یہ شبہ ہو سکتا تھا کہ جنت کا وعدہ انہی مومنوں سے کیا گیا ہے جنہوں نے تمام زندگی نیکیاں کی ہوں کبھی گناہ نہ کیا ہو یا تمام نیکیاں کی ہوں کوئی نیکی نہ چھوڑی ہو۔ اس شبہ کو دور کرنے کے لئے درمیان میں لَا نُكَلِّفُ نَفْسًا إِلَّا وُسْعَهَا بطور جملہ معترضہ فرمادیا (ہم نے اس جملہ کا ترجمہ جملہ کاملہ کے ترجمہ کے بعد اردو زبان کی رعایت سے کیا ہے) وسع سے مراد طاقت، بغیر تنگی اور دشواری کے برداشت۔

وَنَزَعْنَا مَا فِي صُدُورِهِم مِّنْ غِلٍّ (اور جو خلش ان کے دلوں میں باہم تھی ہم اس کو نکال دیں گے)۔

نَزَعْنَا بصیغہ ماضی یعنی ہم ضرور نکال دیں گے۔ غل وہ حسد اور دشمنی جو ان کے آپس میں دنیا میں تھی۔ یہاں تک کہ ان کے آپس میں دوستی ہی دوستی اور محبت پیدا ہو جائے گی۔ اگر اللہ ایک کو کسی خصوصی نعمت سے سرفراز فرمائے گا اور دوسرے کو وہ چیز نہیں عطا کی گئی ہوگی تو اس کو اپنے بھائی سے حسد نہ ہوگا۔ (گویا جذبۂ حسد ہی ختم ہو جائے گا) سعید بن منصور، ابونعیم، ابن ابی شیبہ، طبرانی اور ابن مردویہ نے بیان کیا کہ حضرت علیؓ نے فرمایا۔ مجھے امید ہے کہ میں اور عثمانؓ اور طلحہؓ اور زبیرؓ انہی لوگوں میں سے ہوں گے (یعنی وہ خلش جو دنیا میں باہم ہمارے دلوں میں تھی وہ آخرت میں دور ہو جائے گی اور دل صاف ہو جائیں گے)۔

میں کہتا ہوں حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے یہ اس لئے فرمایا کہ حضرت عثمانؓ کی شہادت کے قضیہ میں ان بزرگوں کے درمیان کچھ غلط فہمی پیدا ہو گئی تھی۔

بخاری اور اسماعیلی نے حضرت ابو سعید خدریؓ کی روایت سے لکھا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے آیت وَنَزَعْنَا مَا فِي صُدُورِهِم مِّنْ غِلٍّ إِخْوَانًا عَلَىٰ سُرُرٍ مُّتَقَابِلِينَ کی تشریح میں فرمایا مومنوں کو دوزخ سے الگ کرلیا جائے گا پھر دوزخ اور جنت کے درمیانی پل پر روک لیا جائے گا اور بعض کے حقوق بعض سے دلوائے جائیں گے یہاں تک کہ جب سب صاف ستھرے ہو جائیں گے تو ان کو جنت میں داخل ہونے کی اجازت دی جائے گی۔ قسم ہے اس کی جس کے ہاتھ میں محمد ﷺ کی

جاتا ہے دنیا میں ان کو جتنا اپنے گھر کا راستہ معلوم تھا اس سے زیادہ وہ اپنے جنتی مکان کے راستے سے واقف ہوں گے۔ دلاوی
حضرت قتادہؓ نے کہا ان کی حالت ان لوگوں کے مشابہ ہوگی جو جمعہ کی نماز پڑھ کر اپنے گھروں کو لوٹتے ہیں (اور کوئی اپنے گھر کو یا گھر کے راستے کو نہیں بھولتا)۔

ابن ابی حاتم نے حسن بصری کا قول نقل کیا ہے مجھے اطلاع ملی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا صراط سے گزرنے کے بعد اہل جنت کو روک لیا جائے گا یہاں تک کہ جو حقوق ایک کے دوسرے پر ہوں گے وہ دلوائے جائیں گے پھر جنت کے اندر اس حالت میں بھیجا جائے گا کہ آپس میں ان کے دلوں میں کوئی غلش باقی نہ ہوگی۔ قرطبی نے لکھا ہے یہ ان لوگوں کے لئے ہوگا جن کو دوزخ میں داخل ہی نہیں کیا گیا ہوگا باقی جو لوگ دوزخ میں داخل ہونے کے بعد پھر رہائی پا کر آئیں گے ان کا (باہم صراط پر یا صراط کے بعد) کوئی محاسبہ نہ ہوگا بلکہ جب دوزخ سے نکلیں گے فوراً ان کو جنت میں داخل کر دیا جائے گا۔ ابن حجر نے لکھا ہے کہ (حضرت ابو سعیدؓ کی روایت کردہ حدیث میں جو آیا ہے) مؤمنوں کو دوزخ سے الگ کر لیا جائے گا اس سے مراد یہ ہے کہ دوزخ سے محفوظ کر دیا جائے گا اور دوزخ میں گرنے کے بغیر وہ صراط سے گزر جائیں گے۔ حدیث میں جو لفظ قَنْطَرہ (پل) آیا ہے اس سے مراد بعض کے نزدیک صراط کا وہ کنارہ ہے جو جنت پر ہے۔ بعض کے نزدیک یہ پل صراط سے الگ ہے۔ قرطبی نے اسی کو اختیار کیا ہے اور سیوطی نے اول کو۔

میں ہوں یا بیاد رہے دینار و درہم تو موجود نہ ہوگا آپس کا بدلہ نیکیوں اور بدیوں کے لین دین کی شکل میں ہوگا اگر ظالم کا کوئی نیک عمل ہوگا تو مظلوم کے حق کے بقدر وہ مظلوم کو دلوا دیا جائے گا اگر ظالم کی کوئی نیکی نہ ہوگی تو مظلوم کے گناہ بقدر حق ظالم پر ڈال دیئے جائیں گے۔ بخاری نے حضرت ابوہریرہؓ کی روایت سے رسول اللہ ﷺ کا ارشاد اسی طرح نقل کیا ہے۔ مسلم اور ترمذی کی روایت میں حدیث کے الفاظ اس طرح آئے ہیں حقوق کا پورا بدلہ لینے سے پہلے ہی اگر اس کی نیکیاں ختم ہو جائیں گی تو مظلوم کے کچھ گناہ لے کر ظالم پر ڈالے جائیں گے۔ پھر اس کو دوزخ میں پھینک دیا جائے گا۔ اور دوزخ میں پھینکا جانا پل صراط سے عبور کامل کے بعد ممکن نہیں (اس لئے قنطرہ سے مراد پل صراط کے علاوہ کوئی دوسرا پل ہے)۔

تنبیہ

سینوں سے غلش کو دور کر دینا آپس میں بدلہ دلوانے پر ہی محدود نہ ہوگا بلکہ بقول بغوی اس کے بغیر بھی ہو سکے گا۔ سدی نے اس آیت کی تشریح میں بیان کیا کہ اہل جنت جب جنت کی طرف بڑھیں گے تو جنت کے دروازہ کے پاس ان کو ایک درخت ملے گا جس کی جڑ میں دو چشمے ہوں گے وہ جب ایک چشمہ کا پانی پئیں گے تو دلوں کے اندر جو باہمی غلش ہوگی وہ نکل جائے گی یہی شراب طہور ہوگی اور دوسرے چشمہ سے غسل کریں گے تو ان پر نَضْرَةَ النَّعِيمِ (رونق عیش) آجائے گی اس کے بعد کبھی نہ وہ پراگندہ مو ہوں گے نہ کبھی چہرہ کا رنگ بگڑے گا۔

تَجْرِي مِنْ تَحْتِهِمُ الْأَنْهَارُ (جنت میں داخل ہونے کے بعد) ان کے (گھروں کے) نیچے نہریں بہتی ہوں گی) یہ جملہ حالیہ ہے۔

وَقَالُوا الْحَمْدُ لِلَّهِ الَّذِي هَدَانَا لِهَٰذَا وَمَا كُنَّا لِنَهْتَدِيَ لَوْلَا أَنْ هَدَانَا اللَّهُ ۖ لَقَدْ جَاءَتْ رُسُلُ رَبِّنَا بِالْحَقِّ ۖ (اور وہ کہیں گے اللہ کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ اس نے ہم کو یہاں تک پہنچایا اور ہم کبھی یہاں تک نہ پہنچتے اگر اللہ ہم کو نہ پہنچاتا بے شک ہمارے رب کے پیغمبر سچی باتیں لے کر آئے تھے) هَدَانَا لِهَٰذَا یعنی اس نے ہم کو جنت تک پہنچایا۔ سفیان ثوری نے کہا ایسے عمل کی اس نے ہدایت کی جس کا یہ ثواب ہے۔ لِنَهْتَدِيَ میں لام تاکید ہے جو ما بعد کی نفی کو موکد کرنے کیلئے لایا گیا ہے اور ان ناصبہ مصدریہ محذوف ہے جیسے مَا كَانَ اللَّهُ لِيُعَذِّبَهُمْ میں ہے۔ لَوْلَا کی جزا محذوف ہے جس پر کلام سابق دلالت کر رہا ہے یعنی اگر اللہ نے ہم کو ہدایت نہ کی ہوتی تو ہم ہرگز ہدایت یاب نہ ہوتے۔ لَقَدْ جَاءَتْ رُسُلُ رَبِّنَا

بالحق یعنی اللہ کے پیغمبر برحق آئے تھے اور حق پیام لائے تھے انہی کی رہنمائی سے ہم ہدایت یاب ہوئے۔ پیغمبروں کے دیئے ہوئے وعدہ کے مطابق اپنی آنکھوں سے ثواب کا معائنہ کرنے کے بعد خوش ہو کر اہل جنت یہ بات کہیں گے۔

وَنُودُوا أَنْ تِلْكُمُ الْجَنَّةُ أُورِثْتُمُوهَا بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُونَ ﴿٤٣﴾ (اور ان سے پکار کر کہا جائے گا کہ جنت تم کو تمہارے اعمال کے بدلہ میں دی گئی ہے۔ یعنی اہل جنت کو ندا کی جائے گی۔ کہاں سے اور کس وقت ندا کی جائے گی اس کے متعلق علماء کے دو قول ہیں۔

(۱) جب اہل جنت دور سے جنت کو دیکھیں گے تو اس وقت یہ ندا کی جائے گی (۲) جنت کے اندر ندا کی جائے گی۔ بیہقی نے بدور سافرہ میں اسی قول کو پسند کیا ہے۔ أُورِثْتُمُوهَا بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُونَ یعنی تمہارے اعمال کے سبب سے یہ جنت تم کو عطا کر دی گئی۔ صاحب مدارک نے لکھا ہے کہ عطاء جنت کو لفظ میراث سے تعبیر کرنا بتا رہا ہے کہ جس طرح میراث بغیر کسی معاوضہ کے مفت وارث کو ملتی ہے اسی طرح جنت بھی محض اللہ کے فضل سے بغیر کسی استحقاق کے دی جائے گی (اگرچہ ظاہر میں اعمال عطاء جنت کا سبب ہوں گے مگر حقیقت میں محض اللہ کی مہربانی پر اس کا مدار ہوگا)۔

مسلم نے حضرت ابو سعید خدری اور حضرت ابو ہریرہؓ کی روایت سے لکھا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ایک منادی پکارے گا آئندہ تمہارے لئے تندرستی رہنا ہے کبھی بیمار نہ ہوگے۔ تمہیں زندہ رہنا ہے کبھی نہیں مرو گے۔ تمہارے لئے جوانی رہنا ہے کبھی بوڑھے نہ ہو گے۔ تمہارے لئے عیش میں رہنا ہے کبھی دکھ نہیں پاؤ گے یہی مطلب ہے اللہ کے فرمان کا وَنُودُوا أَنْ تِلْكُمُ الْجَنَّةُ أُورِثْتُمُوهَا بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُونَ۔ ابن ماجہ اور بیہقی نے صحیح سند کے ساتھ حضرت ابو ہریرہؓ کی روایت سے لکھا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تم میں سے ہر ایک کے دو گھر ہیں ایک گھر جنت میں ایک گھر دوزخ میں اگر مر کر دوزخ میں چلا جاتا ہے تو اہل جنت اس کے (جنتی) گھر کے وارث ہو جاتے ہیں یہی معنی ہے آیت أُولَٰئِكَ هُمُ الْوَارِثُونَ کا۔

وَنَادَىٰ أَصْحَابُ الْجَنَّةِ أَصْحَابَ النَّارِ أَنْ قَدْ وَجَدْنَا مَا وَعَدَنَا رَبُّنَا حَقًّا فَهَلْ وَجَدْتُمْ مَا وَعَدَ رَبُّكُمْ حَقًّا ۖ قَالُوا نَعَمْ ۚ (اور جنت والے دوزخ والوں سے پکار کر کہیں گے کہ ہمارے رب نے ہم سے جس ثواب کا وعدہ کیا تھا ہم نے تو اس کو واقعی پا لیا تو کیا تمہارے رب نے جس عذاب کی تم کو وعید دی تھی تم نے بھی اس کو واقعی پا لیا دوزخی کہیں گے ہاں)۔ مَا وَعَدَنَا سے مراد ہے ثواب اور مَا وَعَدَ رَبُّكُمْ سے مراد ہے عذاب اہل جنت دوزخ والوں سے مذکورہ بالا سوال صرف اپنی مسرت کو ظاہر کرنے اور دوزخیوں کو جلانے کے لئے کریں گے۔ مَا وَعَدَ رَبُّكُمْ میں وَعَدَ کا مفعول یعنی کُم محذوف ہے۔

فَأَذَّنَ مُؤَذِّنٌ بَيْنَهُمْ أَنْ لَعْنَةُ اللَّهِ عَلَى الظَّالِمِينَ ﴿٤٤﴾ الَّذِينَ يَصُدُّونَ عَنْ سَبِيلِ اللَّهِ وَيَبْغُونَهَا عِوَجًا وَهُمْ بِالْآخِرَةِ كَافِرُونَ ﴿٤٥﴾ (پھر ایک پکارنے والا دونوں کے درمیان پکارے گا کہ اللہ کی پھٹکار ہو ان بے جا حرکتیں کرنے والوں پر جو اللہ کی راہ سے روگرداں تھے (اور دوسروں کو روکتے تھے) اور اس میں کجی تلاش کرتے رہتے تھے اور وہ آخرت ہی کے منکر تھے)۔

يَصُدُّونَ (لازم بھی ہے (اعراض کرتے تھے) اور متعدی بھی) دوسروں کو روکتے تھے۔ حضرت ابن عباسؓ نے يَبْغُونَهَا عِوَجًا کی تشریح میں فرمایا اللہ کے سوا دوسروں کے (دکھانے کے) لئے نماز پڑھتے تھے اور جس کی تعظیم کا حکم اللہ نے نہیں دیا اس کی تعظیم کرتے تھے۔

میں کہتا ہوں يَصُدُّونَ سے پہلے كَانُوا محذوف ہے (اور ماضی بعید کا صیغہ ہے) کیونکہ وہ دنیا میں ایسا کرتے تھے قیامت کے دن ایسا نہیں کریں گے۔ عِوَجًا مصدر بمعنی عام ہے کسی طرح کی کجی ہو معانی میں ہو یا الفاظ میں، وجود ذات میں جو گمراہ ہوں جیسے دین میں کجی ہوتی ہے لیکن عوج میں صرف ان مادی چیزوں کی کجی کو کہتے ہیں جو کھڑی ہوں جیسے دیوار یا نیزہ کی کجی۔

وَبَيْنَهُمَا حِجَابٌ ۚ وَعَلَى الْاَعْرَافِ رِجَالٌ يَّعْرِفُوْنَ كُلًّا بِسِيْمٰىهُمْ ۚ (اور ان دونوں کے درمیان ایک آڑ ہوگی اور اعراف کے اوپر بہت سے آدمی ہوں گے وہ لوگ (اہل جنت اور اہل جہنم میں سے) ہر فریق کو علامت سے پہچانیں گے)۔

بَيْنَهُمَا یعنی جنت و دوزخ یا اہل جنت و اہل جہنم کے درمیان حجاب یعنی وہ آڑ دیوار جس کا ذکر سورہ حدید کی آیت فَضُرِبَ بَيْنَهُمْ بِسُوْرٍ لَّهٗ بَابٌ میں آیا ہے اور وہاں ہم نے اس کی تشریح کر دی ہے۔ اَلْاَعْرَافِ، عرف کی جمع ہے یعنی حجاب کی چوٹیاں یہ لفظ عرف الفرس (گھوڑے کے ایال) یا عرف الدیک (مرغ کی کلغی) سے ماخوذ ہے۔ بعض علماء نے کہا عرف کسی چیز کے بالائی حصہ کو کہتے ہیں کیونکہ (معرفت اور عرفان کا معنی ہے پہچاننا اور) کسی چیز کی چوٹی سب سے نمایاں اور قابل شناخت ہوتی ہے۔

اعراف پر کون لوگ ہوں گے، علماء کے اقوال اس کے متعلق مختلف ہیں۔ ابن مردویہ نے حضرت جابر بن عبداللہؓ کی روایت سے رسول اللہ ﷺ کا فرمان نقل کیا ہے کہ یہ وہ لوگ ہوں گے جن کی نیکیاں اور بدیاں برابر ہوں گی۔ نیکیاں جہنم میں جانے سے روکیں گی لیکن اتنی بھی نہیں ہوں گی کہ جنت میں لے جائیں۔ ابن جریر اور بیہقی نے بطریق طلحہ حضرت ابن عباسؓ کی روایت نقل کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اعراف جنت اور دوزخ کے درمیان دیوار ہوگی۔ اعراف والے وہ لوگ ہوں گے جن کے بڑے بڑے گناہ ہوں گے جن کی وجہ سے اللہ ان کو اعراف پر روک دے گا چہروں کی سیاہی سے وہ دوزخیوں کو اور سفیدی سے جنتیوں کو پہچان لیں گے۔ اہل جنت کو دیکھ کر جنت میں پہنچ جانے کی ان کو طمع ہوگی لیکن دوزخ کو دیکھیں گے تو اس سے پناہ مانگیں گے۔ آخر اللہ ان کو جنت میں داخل فرما دے گا۔ یہی مراد ہیں آیت هٰٓؤُلَآءِ الَّذِيْنَ اَقْسَمْتُمْ لَا يَنَالُهُمُ اللّٰهُ بِرَحْمَةٍ ۭ اُدْخُلُوا الْجَنَّةَ لَا خَوْفٌ عَلَيْكُمْ وَلَآ اَنْتُمْ تَحْزَنُوْنَ میں۔

ہناد بن السری، ابن ابی حاتم اور ابو الشیخ نے اپنی اپنی تفسیروں میں عبداللہ بن حارث کی وساطت سے حضرت ابن عباسؓ کا قول نقل کیا ہے کہ اعراف جنت و دوزخ کے درمیان ایک دیوار ہوگی اور اصحاب اعراف وہ لوگ ہوں گے جن کو اللہ وہاں روک دے گا پھر جب اللہ ان کو معاف کرنا چاہے گا تو سب سے پہلے ان کو ایک نہر کی طرف لے جائے گا جس کا نام نہر حیات ہوگا جس کے دونوں کنارے سونے کے موتیوں سے جڑے ہوئے ہوں گے ہر اس کی مٹی مشک کی ہوگی اس نہر میں اصحاب اعراف کو ڈالا جائے گا (نہانے ہی) ان کے رنگ درست ہو جائیں گے اور سینے پر ایک سفید چمکدار تل نمودار ہو جائے گا تو اللہ ان کو طلب فرما کر دریافت فرمائے گا کہ اب تمہاری کیا تمنا ہے جو چاہو مانگو۔ وہ لوگ اپنی تمنا ظاہر کریں گے جب ان کی ساری تمنائیں ختم ہو جائیں گی (اور کوئی تمنا کرنا باقی نہ رہے گی) تو اللہ فرمائے گا تم کو وہ چیزیں دی گئیں جن کی تم نے تمنا کی اور اتنی ہی اور بھی اور ستر گنا مزید۔ چنانچہ وہ جنت میں داخل کر دیئے جائیں گے ان کے سینوں پر ایک سفید تل چمکتا ہوگا اسی سے ان کی پہچان ہوگی، یہ لوگ مساکین اہل جنت (جنتیوں میں مسکین) کہلائیں گے۔

ابوالشیخ نے ابن منکدر کے طریقے سے ایک عربی شخص کی روایت نقل کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ سے اعراف کے متعلق دریافت کیا گیا، فرمایا یہ وہ لوگ ہوں گے جو باپ کی اجازت کے بغیر جہاد کو گئے ہوں گے اور باپ کی نافرمانی کرنے کی حالت میں ہی جہاد میں شہید ہو گئے ہوں گے۔ چونکہ باپ کے نافرمان تھے اس لئے ان کو جنت سے روک دیا جائے گا لیکن راہ خدا میں شہید ہوئے تھے اس لئے دوزخ میں بھی نہیں بھیجا جائے گا۔

طبرانی نے ضعیف سند سے حضرت ابو سعید خدریؓ کی روایت نقل کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ سے اصحاب اعراف کے متعلق دریافت کیا گیا فرمایا یہ وہ لوگ ہوں گے جو باپ کی نافرمانی کی حالت میں راہ خدا میں مارے گئے ہوں گے شہادت ان کو دوزخ میں جانے سے روک دے گی اور باپ کی نافرمانی جنت میں نہیں جانے دے گی۔ ان کا گوشت اور چربی پگھل جائے گی یہاں تک کہ اللہ جب سب مخلوق کے حساب سے فارغ ہو جائے گا اور ان کے علاوہ اور کوئی باقی نہیں رہے گا تو اس کی رحمت ان کو بھی ڈھانک لے گی اور اپنی رحمت سے ان کو بھی جنت میں داخل فرمائے گا۔

طبرانی اور بیہقی نے نیز حارث بن اسامہ نے اپنی مسند میں اور سعید بن منصور، ابن جریر، ابن ابی حاتم، ابن مردویہ اور ابوالشیخ نے اپنی تفسیروں میں حضرت عبدالرحمٰن مزنی کی روایت سے بیان کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ سے اصحاب اعراف کے متعلق دریافت کیا گیا فرمایا وہ ایسے لوگ ہوں گے جو راہ خدا میں مارے گئے ہوں گے میں کہتا ہوں شاید ان شہداء سے مراد وہی شہداء ہیں جنہوں نے باپوں کی نافرمانی کی حالت میں جہاد کیا ہوگا۔ اس طرح مذکورہ بالا دونوں حدیثوں میں مطابقت ہو جاتی ہے یہ بھی سمجھ لینا چاہئے کہ مذکورہ شمار بطور تمثیل کیا گیا ہے یہ ان لوگوں کی جماعت کے کچھ افراد ہوں گے جن کی نیکیاں اور بدیاں برابر ہوں گی۔ یہ مقصد نہیں ہے کہ اصحاب اعراف بس یہی لوگ ہوں گے دوسرے نہیں ہوں گے۔ اس کا ثبوت بعض ان احادیث سے ملتا ہے جن کا ذکر اوپر آچکا ہے کہ اصحاب اعراف وہ لوگ ہوں گے جن کی نیکیاں بدیاں برابر ہوں گی۔ ابن ابی داؤد اور ابن جریر نے بن عمر بن جرم بن جریر کی روایت سے بیان کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ سے اصحاب اعراف کے متعلق دریافت کیا گیا فرمایا یہ وہ بندے ہوں گے جن کا فیصلہ سب سے آخر میں ہوگا جب رب العالمین تمام بندوں کے فیصلے سے فارغ ہو جائے گا تو ان سے فرمائے گا کہ تمہاری نیکیوں نے دوزخ سے تو تم کو نکال لیا (یعنی بچا لیا) اور تم جنت میں بھی (نیکیوں کی کمی کی وجہ سے) نہیں جا سکے۔ اب تم آزاد ہو جنت میں جہاں چاہو سیر کرتے پھرو۔ بیہقی نے کہا یہ روایت مرسل حسن ہے۔ ابن مردویہ اور ابوالشیخ نے دو طریقوں سے حضرت جابر بن عبداللہ کی روایت سے لکھا ہے کہ رسول اللہ ﷺ سے ان لوگوں کا حکم پوچھا گیا جن کی نیکیاں بدیاں برابر ہوں گی فرمایا یہی اصحاب اعراف ہوں گے جو جنت میں نہیں جا سکے ہوں گے مگر داخلہ جنت کی طمع رکھتے ہوں گے۔

بیہقی نے حضرت حذیفہؓ کی روایت سے لکھا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا قیامت کے دن اللہ سب کو جمع کرے گا۔ اہل جنت کو جنت میں جانے کا اور دوزخیوں کو دوزخ کا حکم دے دیا جائے گا۔ پھر اصحاب اعراف سے فرمائے گا تم لوگ کس چیز کا انتظار ہے وہ عرض کریں گے ہم تیرے حکم کے منتظر ہیں۔ ارشاد ہوگا تمہاری نیکیوں نے دوزخ میں جانے سے تو تم کو بچا لیا (مگر) تمہارے جرائم جنت میں جانے سے بھی تمہارے لئے آڑ بن گئے اب جاؤ میری مغفرت اور رحمت سے (جنت میں) چلے جاؤ۔ سعید بن منصور، ابن جریر، ابوالشیخ، بیہقی، ہناد اور حذیفہ کا بیان ہے کہ اعراف والے وہ لوگ ہوں گے جن کی بدیاں جنت تک پہنچانے سے قاصر ہوں گی اور نیکیاں دوزخ سے ان کو بچالیں گی۔ ایسے لوگوں کو ٹھہرا لیا جائے گا یہاں تک کہ اللہ جب لوگوں کا فیصلہ کر چکے گا تو اپنے تک ان کو لے کر فرمائے گا اٹھو تم بھی جنت میں چلے جاؤ میں نے تمہیں بخش دیا۔

عبدالرزاق نے حضرت حذیفہؓ کا قول نقل کیا ہے کہ اعراف والے وہ لوگ ہوں گے جن کی نیکیاں بدیاں برابر ہوں گی وہ جنت و دوزخ کی درمیانی دیوار پر فروکش ہوں گے اور جنت میں داخلہ کے آرزو مند (آخر) جنت میں داخل ہو جائیں گے۔ بغوی نے اپنی سند سے بروایت سعید بن جبیر حضرت ابن مسعودؓ کا قول نقل کیا ہے کہ قیامت کے دن لوگوں کا حساب ہوگا جن کی نیکی ایک بھی زائد ہوگی وہ جنت میں چلا جائے گا اور جس کی بدیاں زائد ہوں گی وہ دوزخ میں پہنچ جائے گا اللہ نے فرمایا۔ فَمَنْ ثَقُلَتْ مَوَازِينُهُ فَأُولٰئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ وَمَنْ خَفَّتْ مَوَازِينُهُ فَأُولٰئِكَ الَّذِينَ خَسِرُوا أَنفُسَهُم پھر فرمایا ذرہ برابر وزن کی نیکیوں اور بدیوں سے بھی میزان کا پلہ بھاری ہو جائے گا۔ پھر آپ نے فرمایا جس کی نیکیاں بدیاں برابر ہوں گی وہ اعراف والے ہوں گے۔ صراط (کے آخری سرے) پر ان کو روک دیا جائے گا (جہاں سے) وہ اہل جنت اور اہل نار کو پہچان لیں گے۔ جب جنتیوں کو دیکھیں گے تو پکار کر کہیں گے سلام علیکم اور جب دوزخیوں کی طرف نظر پھیر کر دیکھیں گے تو کہیں گے اے ہمارے رب ہم کو ان ظالموں کے ساتھ نہ کر دینا نیکیوں والوں کو ایک نور عطا فرمایا جائے گا جو ان کے داہنی طرف اور سامنے کی جانب رواں ہوگا اس روز ہر بندہ کو نور دیا جائے گا جب لوگ پل صراط پر آئیں گے تو اللہ ہر منافق مرد و عورت کا نور سلب کرے گا منافقوں کی اس حالت کو دیکھ کر مومن عرض کریں گے اے ہمارے رب ہمارے نور کو پورا فرمانا۔ رہے اصحاب اعراف تو ان کے سامنے کا نور سلب نہیں کیا جائے گا لیکن ان کے گناہ ان کو چلنے سے روک دیں گے مگر

سامنے کا نور چونکہ سلب نہیں ہو گا اس لئے ان کے دل میں طمع باقی رہے گی۔ اسی کے متعلق اللہ نے فرمایا ہے لَمْ یَدْخُلُوْھَا وَھُمْ یَطْمَعُوْنَ آخر ان کو بھی جنت میں داخل کر دیا جائے گا جنت کے اندر سب سے آخر میں داخل ہونے والے یہی ہوں گے۔

ہناد نے مجاہد کا قول بیان کیا ہے کہ اصحاب اعراف وہ لوگ ہوں گے جو نیکوکار فقہاء اور علماء ہوں گے اور اعراف جنت و دوزخ کے درمیان ایک دیوار ہو گی شاید اس قول کی مراد یہ ہے کہ وہ مومن فقہاء اور علماء جنہوں نے گناہوں کا ارتکاب کیا ہو گا اور جن کی نیکیاں بدیوں برابر ہوں گی اچھے برے عمل مخلوط ہوں گے امید ہے کہ اللہ ان پر رحم فرما دے گا۔

ثعلبی نے ابو مجلز کا قول نقل کیا ہے کہ اعراف ایک اونچی جگہ ہو گی جہاں ملائکہ فروکش ہوں گے اور وہیں سے اہل جنت اور اہل نار کو دیکھ کر ہر فریق کو اس کی علامات سے پہچان لیں گے۔ یہ قول غلط ہے کیونکہ اصحاب اعراف کو رجال (مرد) فرمایا اور ملائکہ مرد نہیں۔ علاوہ ازیں مذکورہ بالا احادیث بھی اس قول کی تردید کر رہی ہیں۔

بعض لوگوں کا خیال ہے کہ اصحاب اعراف انبیاء یا شہداء ہوں گے جو اہل جنت و اہل نار کو دیکھ کر پہچان لیں گے۔ اس قول کی تردید بھی گزشتہ احادیث اور آئندہ آیات سے ہوتی ہے۔

بعض کے نزدیک مشرکوں کے بچے اہل اعراف ہوں گے یہ قول بھی غلط ہے۔ اللہ نے اصحاب اعراف کو رجال فرمایا ہے اور گزشتہ احادیث بھی اس قول کے خلاف ہیں۔

سیما یا سوم اسلہ سے ماخوذ (گھوڑوں کو چراگاہ میں نشان لگا کر چھوڑ دیا) یا وسم علی القلب سے ماخوذ ہے (دل پر نشان لگا دیا) اس آخری صورت میں مادہ مثال واوی (وسم) ہو گا جیسے جاہ وجہ سے بنایا گیا ہے۔

وَنَادَوْا اَصْحٰبَ الْجَنَّةِ اَنْ سَلٰمٌ عَلَیْكُمْ لَمْ یَدْخُلُوْھَا وَھُمْ یَطْمَعُوْنَ ۝

(اور اہل اعراف جنت والوں سے پکار کر کہیں گے تم پر سلامتی ہو (اس وقت تک وہ جنت میں داخل نہیں ہوئے ہوں گے مگر (داخلہ کے) آرزو مند ہوں گے) حسن نے کہا اللہ ان کو امید دلائے گا کیونکہ ان پر کرم کرنا مقصود ہو گا (ورنہ کافروں کی امید تو منقطع ہی کر دے گا) لَمْ یَدْخُلُوْھَا الخ جملہ مستانفہ ہے یا کلام سابق کا کوئی احتمال نہیں ہے یا رجال کی صفت ہے یا نادوا کی ضمیر فاعل سے حال ہے۔ جو لوگ قائل ہیں کہ اصحاب اعراف انبیاء اور ملائکہ ہوں گے ان کے نزدیک اَصْحٰبَ الْجَنَّةِ سے حال ہو گا۔

وَاِذَا صُرِفَتْ اَبْصَارُھُمْ تِلْقَآءَ اَصْحٰبِ النَّارِ قَالُوْا رَبَّنَا لَا تَجْعَلْنَا مَعَ الْقَوْمِ الظّٰلِمِیْنَ ۝

(اور جب ان کی نگاہیں دوزخ والوں کی طرف موڑ دی جائیں گی تو وہ (اللہ کی پناہ مانگیں گے، رحمت کی درخواست کریں گے اور) کہیں گے اے ہمارے رب ہم کو ان ظالم لوگوں کے ساتھ شامل نہ کر دینا)۔ یعنی کافروں کے ساتھ دوزخ میں نہ ڈال دینا۔

صرفت کا لفظ اشارہ کر رہا ہے کہ اصحاب اعراف کی نظروں کو دوزخیوں کی طرف پھیرنے والا کوئی اور ہو گا (یعنی خدا تعالیٰ) تاکہ وہ دوزخیوں کے حال کو دیکھیں اور پناہ مانگیں۔

رفتار کلام بتا رہی ہے کہ اعراف والے امید و بیم کی حالت میں ہوں گے۔ یہی ان کی نیکیوں اور بدیوں کے برابر ہونے کا تقاضا ہو گا اور یہ حالت انبیاء، شہداء اور صلحاء کی نہیں ہو سکتی ان کو تو اس روز کوئی خوف ہو گا نہ رنج۔

وَنَادٰۤی اَصْحٰبُ الْاَعْرَافِ رِجَالًا یَّعْرِفُوْنَھُمْ بِسِیْمٰىھُمْ قَالُوْا مَاۤ اَغْنٰی عَنْكُمْ جَمْعُكُمْ وَمَا كُنْتُمْ تَسْتَكْبِرُوْنَ ۝

(اور اعراف والے کچھ لوگوں کو ان کی علامات سے پہچان کر پکار کر کہیں گے کہ (آج) تمہارے جتھے اور وہ چیزیں جن پر تم غرور کیا کرتے تھے تم کو کوئی فائدہ نہیں پہنچا سکے)۔ غرور کرنے سے مراد ہے حق کو حقیر سمجھ کر اعراض کرنا یا مخلوق کے مقابلہ میں غرور کرنا۔ اعراف والے جن لوگوں سے یہ کلام کریں گے وہ ایسے کافر ہوں گے جو دنیا میں بڑے مانے جاتے تھے۔ جمع سے مراد ہے قوم برادری، اولاد اور مددگاروں کے جتھوں کی کثرت اور مال جمع کرنا۔ کلبی نے

یاد دیوار اعراف پر سے پکاریں گے اے ولید بن مغیرہ اے ابوجہل بن ہشام اے فلاں۔ اے فلاں پھر جنت کی طرف دیکھیں گے تو جنت کے اندر وہ فقراء اور کمزور لوگ نظر آئیں گے جن سے کافر استہزاء کرتے تھے جیسے سلمان فارسیؓ، صہیب رومیؓ، بلال حبشیؓ، خبابؓ تو اس وقت دوزخی کافروں سے کہیں گے۔

اَهٰٓؤُلَآءِ الَّذِيْنَ اَقْسَمْتُمْ لَا يَنَالُهُمُ اللّٰهُ بِرَحْمَةٍ

(کیا یہ وہی (فقراء و حقیر) لوگ ہیں (جن کے متعلق) تم قسم کھا کر کہتے تھے کہ ان کو اللہ کی رحمت نہیں پہنچے گی (وہ تو جنت میں داخل ہو گئے) پھر اہل اعراف سے کہا جائے گا۔

اُدْخُلُوا الْجَنَّةَ لَا خَوْفٌ عَلَيْكُمْ وَلَآ اَنْتُمْ تَحْزَنُوْنَ ۝

((اب تم) جنت میں چلے جاؤ تم پر نہ کوئی خوف ہے اور نہ تم رنجیدہ ہو گے)

میں کہتا ہوں ممکن ہے کہ اُدْخُلُوا الْجَنَّةَ الخ بھی اصحاب اعراف کے کلام کا تتمہ ہو یعنی اعراف والے کہیں گے کیا یہ فقراء و ضعیف لوگ وہی ہیں جن کے متعلق تم نے کہا تھا کہ اللہ کی رحمت ان کو نہیں مل سکتی حالانکہ ان کو تو (آج) حکم دے دیا گیا کہ جنت میں چلے جاؤ اور کوئی خوف و حزن نہ کرو۔

بغوی نے لکھا ہے کہ بعض اہل تفسیر نے ایک اور مطلب بیان کیا ہے وہ یہ کہ اصحاب اعراف جب اہل جہنم سے مذکورہ بالا بات کہیں گے تو وہ جواب دیں گے اگر وہ (ضعفاء) جنت میں چلے گئے تو تم کو کیا تم تو نہیں پہنچ سکے اور قسم کھائیں گے کہ تم دوزخ میں ضرور جاؤ گے یہ سن کر وہ ملائکہ جو اصحاب اعراف کو پل صراط پر روکے ہوئے ہوں گے کافروں سے کہیں گے کیا یہ اصحاب اعراف وہی لوگ ہیں جن کے متعلق تم نے کہا تھا کہ ان کو خدا کی رحمت نہیں ملے گی۔ پھر اصحاب اعراف کی طرف رخ کر کے کہیں گے جاؤ تم جنت میں بے خوف و رنج چلے جاؤ۔

بغوی نے معاذ کی روایت سے لکھا ہے کہ حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا اصحاب اعراف جب جنت میں چلے جائیں گے تو دوزخیوں کو بھی یہ شوق پیدا ہو جائے گا اور عرض کریں گے پروردگار ہمارے کچھ رشتہ دار جنت میں ہیں ہمیں اجازت مل جائے کہ ہم ان کو دیکھ لیں اور بات چیت کر لیں۔ چنانچہ (اجازت کے بعد) وہ اپنے جنتی قرابت داروں اور ساتھیوں اور دوستوں کی حالت کو دیکھ لیں گے اور پہچان لیں گے مگر وہ جنتی ان دوزخیوں کے چہروں کی سیاہی کی وجہ سے ان کو نہیں پہچانیں گے۔

وَنَادٰٓى اَصْحٰبُ النَّارِ اَصْحٰبَ الْجَنَّةِ اَنْ اَفِيْضُوْا عَلَيْنَا مِنَ الْمَآءِ اَوْ مِمَّا رَزَقَكُمُ اللّٰهُ

(اور دوزخ والے اہل جنت (کے نام لے کر ان) کو پکار کر (اپنی رشتہ داریاں جتا کر) کہیں گے کہ ہماری طرف کچھ پانی بہاؤ اور جو اللہ نے تم کو عطا فرمایا ہے ہم کو بھی اس میں سے کچھ دے دو) مِمَّا رَزَقَكُمُ اللّٰهُ سے مراد یا شربت ہے کیونکہ اَفِيْضُوْا (بہاؤ) کا لفظ اسی کو چاہتا ہے یا طعام جنت مراد ہے جیسے عربی محاورہ میں آتا ہے علفتها تبنا وماء باردا میں نے اونٹنی کو کھلایا بھوسہ اور ٹھنڈا پانی۔

قَالُوْٓا اِنَّ اللّٰهَ حَرَّمَهُمَا عَلَي الْكٰفِرِيْنَ ۝ الَّذِيْنَ اتَّخَذُوْا دِيْنَهُمْ لَهْوًا وَّلَعِبًا وَّغَرَّتْهُمُ الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا

(وہ کہیں گے اللہ نے قطعاً یہ دونوں چیزیں ان کافروں کے لئے حرام کر دی ہیں، جنہوں نے اپنے دین کو کھیل کود بنا رکھا تھا اور دنیوی زندگی نے ان کو فریب دے رکھا تھا)۔ بیضاوی نے لکھا ہے حرام سے مراد یہ ہے کہ یہ دونوں چیزیں اللہ نے کافروں سے روک دی ہیں (ممانعت فرما دی ہے) جیسے مکلف کو حرام کی ممانعت کر دی جاتی ہے۔ صاحب مدارک نے لکھا ہے یہاں تحریم بمعنی منع ہے جیسے وَحَرَّمْنَا عَلَيْهِ الْمَرَاضِعَ میں حَرَّمْنَا کا معنی ہے منعنا۔ میں کہتا ہوں آیت حَرٰمٌ عَلٰى قَرْيَةٍ اَهْلَكْنٰهَآ اَنَّهُمْ لَا يَرْجِعُوْنَ میں بھی حرام کا معنی منع کیا ہے۔

ابن ابی الدنیا اور بیہقی نے زید بن رفیع کا بیان نقل کیا ہے کہ دوزخی دوزخ میں داخل ہو کر مدت تک آنسوؤں سے روئیں گے پھر مدت تک خون کے آنسو بہائیں گے۔ دوزخ کے داروغہ ان سے کہیں گے بدبختو تم دنیا میں نہیں روئے آج تم کس

محض، عقل یہ تمام مجردات عرش سے بالاتر ہیں مگر انسانی اور ملکی اور شیطانی نفوس میں اس طرح سرایت کئے ہوئے ہیں جیسے آئینہ کے اندر سورج۔ چونکہ اللہ نے ان کو بغیر مادہ کے صرف لفظ کُنْ سے پیدا کیا ہے اس لئے ان کو عالم امر کہا جاتا ہے۔ بغوی نے لکھا ہے کہ سفیان بن عیینہ نے فرمایا خلق اور امر میں فرق ہے جس نے دونوں کو ایک کہا وہ کافر ہو گا۔

تَبٰرَكَ اللّٰهُ رَبُّ الْعٰلَمِيْنَ ۝ (بڑی خوبیوں سے بھرا ہوا ہے اللہ جو سارے جہان کا رب ہے)۔

یعنی وحدت الوہیت میں برتر اور ربوبیت میں منفرد ہے یہ لفظ برکۃ سے مشتق ہے جس کا معنی ہے بڑھوتری اور بڑھوتری کیلئے عظمت و برتری لازم ہے اس لئے برکت کا معنی ہو گا برتری اور عظمت۔ پس تبارک کا ترجمہ ہوا (برتر ہے عظمت والا ہے)۔

بعض نے کہا تبارک کا یہ مطلب ہے کہ برکت اس کے ذکر سے حاصل ہوتی ہے۔ حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا وہ ہر برکت کو لایا ہے۔ حسن نے کہا برکت اس کی طرف سے ہے۔ بعض نے کہا تبارک یعنی وہ پاک ہے برکت کا معنی ہے قدس اور قدس کا معنی ہے پاک ہونا۔ بعض نے کہا اللہ کا نام مبارک ہے اور ہر چیز میں اس کی برکت ہے۔ اہل تحقیق نے لکھا ہے معنی یہ ہے کہ اللہ دائم الوجود لازوال ہے ہمیشہ سے ہے ہمیشہ رہے گا، کیونکہ برکت کا اصل معنی ہے جمار ہنا (جو پانی اکٹھا کر لیا جائے اور ہر طرف سے گھیر کر اس کو جمع کر لیا جائے یعنی حوض یا تالاب بنا لیا جائے اس کو برکہ اسی مناسبت سے کہتے ہیں)۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ تبارک اللہ کہنا تو درست ہے مگر لفظ مبارک کا اطلاق خدا پر نہیں کیا جا سکتا کیونکہ اللہ کے تمام اسماء صفات سمعی شرعی ہیں اور یہ لفظ ان ناموں میں شامل نہیں ہے)۔

اُدْعُوْا رَبَّكُمْ تَضَرُّعًا وَّخُفْيَةً (اپنے رب سے دعا کیا کرو گڑگڑا کر اور چپکے چپکے)۔

یعنی اس کا ذکر کرو، اس کی عبادت کرو، اس سے دعا کرو۔ تَضَرُّعًا مصدر بمعنی اسم فاعل ہے اس کا مجرد ضرع ہے۔ ضرع الرجل ضراعۃ وہ آدمی کمزور اور عاجز ہو گیا۔ ضارع اور ضرع کمزور عاجز۔ تضرع اس نے کمزوری اور عاجزی ظاہر کی (زاری کی، گڑگڑایا) قاموس میں ہے ضرع الیہ ضرعا و ضراعۃ اس کے سامنے خشوع کیا، عاجزی کی اور مسکنت کا اظہار کیا۔ خفیۃ پوشیدہ عبادت اور دعا خلوص کی دلیل ہے اور ریاکاری کے شائبہ سے پاک ہے اس لئے خفیہ دعا کا حکم دیا۔ اگر ذکر سری ہو یا جہری ہو مگر ریاکاری کی اس میں آمیزش نہ ہو تو عبادت ہے۔

حضرت ابوہریرہؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا میں اپنے بندے کے گمان کے مطابق ہوتا ہوں۔ اگر وہ میری یاد دل میں کرتا ہے تو میں بھی اس کا ذکر اپنے باطن میں کرتا ہوں اور اگر وہ میرا ذکر جماعت میں کرتا ہے تو میں اس کا ذکر ایسی جماعت میں کرتا ہوں جو اس کی جماعت سے برتر ہوتی ہے (یعنی ملائکہ کی جماعت) متفق علیہ۔

اس حدیث سے ذکر جہری و خفی دونوں کا جواز ثابت ہوتا ہے۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ اس حدیث سے جہری ذکر کی سری ذکر سے برتری ثابت ہوتی ہے مگر یہ استدلال غلط ہے۔ اللہ کسی کا ذکر سری کرے یا جماعت کے سامنے دونوں برابر ہیں بلکہ ذکر سری کو جہری پر فضیلت حاصل ہے۔ ایک اور آیت ہے اللہ نے فرمایا ہے فَاذْكُرُوا اللّٰهَ كَذِكْرِكُمْ اٰبَآءَكُمْ اَوْ اَشَدَّ ذِكْرًا۔ اس میں بھی جہری ذکر مراد نہیں ہے، بلکہ کثرت ذکر کا حکم ہے۔

علماء کا اجماع ہے کہ سری ذکر افضل ہے اور جہری ذکر بدعت ہے ہاں چند مقامات میں جہری ذکر کی ضرورت ہے جیسے اذان، اقامت، تکبیرات تشریق، امام کے لئے نماز میں تکبیرات انتقال (نیز تکبیر تحریمہ) اگر نماز کے اندر کوئی حادثہ ہو جائے تو مقتدی کا سبحان اللہ کہنا، حج میں لبیک کہنا وغیرہ۔ ہدایہ کے حواشی میں ابن ہمام نے لکھا ہے کہ تکبیرات تشریق کی حد بندی میں امام ابو حنیفہؒ نے حضرت عبد اللہ بن مسعودؓ کے مسلک کو اختیار کیا ہے آپ عرفہ کے دن (یعنی نو ذی الحجہ) کی فجر سے یوم نحر کی نماز عصر تک تکبیر کہتے تھے رواہ ابن ابی شیبہ۔ اور صاحبینؒ نے حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے مسلک کو اختیار کیا ہے آپ یوم عرفہ کی فجر کے بعد سے آخری ایام تشریق کی نماز عصر تک تکبیر کہتے تھے رواہ ابن ابی شیبہ وکذا روی محمد بن الحسن عن

ابی حنیفۃ بمدہ۔ اس کے بعد ابن ہمام نے لکھا ہے جو شخص صاحبین کے قول پر فتویٰ دیتا ہے وہ تقاضاء ترجیح کے خلاف کرتا ہے
کیونکہ امام اور صاحبین کا اختلاف محض تکبیر کہنے میں نہیں ہے بلکہ بلند آواز سے یعنی جہری تکبیر کہنے میں بھی ہے (صاحبین جہر
کے اور امام صاحب سر کے قائل ہیں) اور ذکر میں اصل اخفاء ہے جہر سے ذکر کرنا بدعت ہے اور جب جہر اور اخفاء میں تعارض
پڑ جائے (دونوں کا روایتی ثبوت ملتا ہے) تو اخفاء قابل ترجیح ہے (لہٰذا صاحبین کے قول پر فتویٰ تقاضاء ترجیح کے خلاف ہے) سری
ذکر افضل ہے۔ صحابہ اور تابعین کا اسی پر اتفاق رہا ہے۔ حسنؒ کا قول ہے کہ سری دعا اور جہری دعا میں ستر درجہ کا فرق ہے۔
مسلمان بہت کوشش سے دعا کیا کرتے تھے مگر ان کی آواز سنائی نہیں دیتی تھی صرف لبوں کی سرسراہٹ محسوس ہوتی تھی
کیونکہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے اُدْعُوْا رَبَّكُمْ تَضَرُّعًا وَّخُفْيَةً اور عبد صالح کے تذکرہ میں فرمایا ہے اِذْ نَادٰى رَبَّهٗ نِدَآءً خَفِيًّا۔
حضرت سعد بن ابی وقاصؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا بہترین ذکر خفی ہے اور بہترین رزق وہ ہے جو بقدر کفایت
ہو۔ رواہ احمد وابن حبان فی صحیحہ والبیہقی فی شعب الایمان۔

حضرت ابو موسیٰؓ کا بیان ہے کہ جب رسول اللہ ﷺ نے خیبر پر جہاد کیا تو راستہ میں مسلمان ایک وادی سے گزرے اور
انہوں نے چلا کر تکبیریں کہیں۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اپنے لئے سکون اختیار کرو تم کسی بہرے یا غیر حاضر کو نہیں پکار رہے
ہو بلکہ اس کو پکار رہے ہو جو سننے والا اور قریب ہے۔ رواہ البغوی۔

میں کہتا ہوں اس حدیث سے اگرچہ ذکر خفی کی افضلیت ثابت ہوتی ہے مگر اپنے لئے سکون اختیار کرو کا لفظ بتا رہا ہے
کہ ذکر خفی کا حکم اور ذکر جہری کی ممانعت صرف تقاضائے شفقت کے زیر اثر تھی یہ وجہ نہ تھی کہ ذکر جہری جائز ہی نہ ہو۔

فصل

ذکر کے تین اقسام ہیں: ۱۔۔۔ بلند آواز سے ذکر کرے۔ یہ عام صورتوں میں باتفاق علماء مکروہ ہے ہاں خاص صورتوں میں
اگر مصلحت و دانش کا تقاضا ہو تو درست (بلکہ ضروری) ہے اور خود سے افضل ہے جیسے اذان کہنا اور حج میں لبیک پڑھنا۔ شاید
چشتی صوفیہ نے مبتدی کو جہری ذکر کی تلقین مصلحت ہی کے تحت کی ہے۔ شیطان کو بھگانا، غفلت دور کرنا، نسیان کو زائل
کرنا، دل میں گرمی پیدا کرنا، آتش محبت کو ریاضت کے ذریعے سے تیز کرنا اور دوسرے فوائد اسی سے وابستہ ہیں لیکن ریاکاری اور
شہرت طلبی سے اجتناب ضروری ہے۔

۲۔۔۔ زبان سے چپکے چپکے ذکر کرنا۔ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے ہمیشہ اللہ کے ذکر سے تیری زبان تر و تازہ رہے۔ رواہ
الترمذی وابن ماجہ۔ اسی حدیث میں یہی ذکر مراد ہے۔ امام احمد اور ترمذی کی روایت ہے کہ عرض کیا گیا سب سے بڑھیا عمل کون
سا ہے فرمایا (سب سے افضل عمل) یہ ہے کہ دنیا کو چھوڑتے وقت تمہاری زبان اللہ کے ذکر سے تروتازہ ہو۔ حضرت ابوہریرہؓ کی
روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اللہ کے کچھ فرشتے راستوں میں گھومتے اور اہل ذکر کو تلاش کرتے رہتے ہیں اگر کچھ
لوگوں کو ذکر خدا میں مشغول پاتے ہیں تو باہم ایک دوسرے کو پکارتا ہے اور آؤ مقصد مل گیا، چنانچہ سب آ کر اہل ذکر کو اپنے
پروں سے گھیر لیتے ہیں اور دنیوی آسمان تک یوں ہی سلسلہ جوڑ لیتے ہیں ان کا رب ان سے پوچھتا ہے باوجودیکہ وہ خود ان سے
زیادہ واقف ہوتا ہے۔ میرے بندے کیا کہہ رہے تھے فرشتے عرض کرتے ہیں وہ تیری پاکی، تیری بڑائی، تیری حمد اور تیری
بزرگی بیان کر رہے تھے (یعنی سبحان اللہ، اللہ اکبر، الحمد للہ اور لا الہ الا اللہ کہہ رہے تھے) اللہ فرماتا ہے کیا انہوں نے مجھے دیکھا ہے
فرشتے عرض کرتے ہیں نہیں بخدا انہوں نے تجھے نہیں دیکھا۔ اللہ فرماتا ہے پھر اگر وہ مجھے دیکھ لیتے تو ان کی کیا حالت ہوتی۔
فرشتے عرض کرتے ہیں اگر وہ تجھے دیکھ پاتے تو تیری عبادت اور قوت سے کرتے، تیری بزرگی بہت زیادہ بیان کرتے اور تیری
پاکی کا اظہار اور کثرت سے کرتے۔ اللہ فرماتا ہے وہ کیا مانگتے تھے فرشتے عرض کرتے ہیں وہ تجھ سے جنت کے خواستگار تھے۔ اللہ
فرماتا ہے کیا انہوں نے جنت کو دیکھا ہے۔ فرشتے عرض کرتے ہیں نہیں پروردگار انہوں نے جنت کو نہیں دیکھا۔ اللہ فرماتا

ہے۔ پھر اگر وہ جنت کو دیکھ لیتے تو ان کی کیا حالت ہوتی۔ فرشتے عرض کرتے ہیں اگر وہ جنت کو دیکھ پاتے تو ان کو جنت کی حرص رغبت اور طلب اور زیادہ ہو جاتی۔ اللہ فرماتا ہے وہ کس چیز سے پناہ مانگتے تھے۔ فرشتے عرض کرتے ہیں دوزخ سے۔ اللہ فرماتا ہے کیا انہوں نے دوزخ کو دیکھا ہے۔ فرشتے عرض کرتے ہیں نہیں پروردگار بخدا انہوں نے دوزخ کو نہیں دیکھا۔ اللہ فرماتا ہے پھر اگر وہ دیکھ پاتے تو ان کی کیا کیفیت ہوتی۔ فرشتے عرض کرتے ہیں اگر دیکھ پاتے تو دوزخ سے فرار و خوف ان کا اور زیادہ ہو جاتا۔ اللہ فرماتا ہے تم کو اہو کر میں نے ان کو بخش دیا۔ جماعت ملائکہ میں سے ایک فرشتہ عرض کرتا ہے۔ ان ذکر میں ایک شخص ایسا بھی تو جو ذکر میں شریک نہ تھا اپنے کسی کام سے آیا تھا۔ اللہ فرماتا ہے وہ سب ساتھ بیٹھے ہوئے تھے اور ان کے ساتھ بیٹھنے والا بدنصیب نہیں ہو سکتا۔ رواہ البخاری۔ مسلم نے بھی اسی طرح کی حدیث نقل کی ہے۔

ﷺ..... بغیر زبان کے صرف قلبی اور روحی اور نفسی ذکر کرنا۔ یہی ذکر خفی ہے۔ جس کو اعمال نامے لکھنے والے فرشتے بھی نہیں سن پاتے۔ ابو یعلی نے حضرت عائشہؓ کی روایت سے لکھا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا وہ ذکر خفی جس کو اعمالنامہ کے لکھنے والے فرشتے بھی نہیں سن پاتے (ذکر جلی سے) ستر گنا درجے فضیلت رکھتا ہے۔ جب قیامت کا دن ہوگا اور اللہ حساب کیلئے سب لوگوں کو جمع کرے گا اور فرشتے اعمالنامے اور تحریرات لیکر حاضر ہوں گے تو اللہ ان سے فرمائے گا دیکھو (اس بندہ کی) کوئی چیز رہ تو نہیں گئی۔ فرشتے عرض کرینگے ہم کو جو کچھ معلوم ہوا اور ہماری نگرانی میں جو کچھ ہوا ہم نے سب کا احاطہ کر لیا اور لکھ لیا کوئی بات نہیں چھوڑی۔ اللہ فرماتا ہے اس کی ایک نیکی ایسی بھی ہے جس کا تم کو علم نہیں میں تم کو بتاتا ہوں وہ نیکی ذکر خفی ہے۔

میں کہتا ہوں اس ذکر کا سلسلہ نہیں ٹوٹتا نہ اس میں کوئی سستی آتی ہے (یعنی ذکر قلبی ہمہ وقت جاری رہ سکتا ہے۔

اِنَّهٗ لَا يُحِبُّ الْمُعْتَدِيْنَ ﴿﴾ (اللہ ان لوگوں کو ناپسند کرتا ہے جو (دعا میں) حد (ادب سے) نکل جاتے ہیں)۔ بعض علماء کے نزدیک معتدین سے مراد وہ لوگ ہیں جو ایسی بے کار دعائیں کرتے ہیں جن کا ہونا عقل میں آتا ہے نہ ضابطہ قدرت میں جیسے منازل انبیاء کی طلب، آسمان پر پہنچ جانے کی دعا، مرنے سے پہلے جنت میں پہنچ جانے کا سوال۔ بغوی نے اپنی سند سے ابو داؤد سجستانی کے سلسلہ سے حسب روایت ابو نعامہ بیان کیا ہے کہ حضرت عبداللہ بن مغفلؓ نے اپنے بیٹے کو یوں دعا مانگتے سنا اے اللہ میں تجھ سے درخواست کرتا ہوں کہ جب میں جنت میں جاؤں تو مجھے جنت کے دائیں جانب سفید محل عطا فرمانا۔ حضرت عبداللہؓ نے فرمایا بیٹے اللہ سے جنت کی دعا کر اور دوزخ سے اس کی پناہ طلب کر۔ میں نے رسول اللہ ﷺ سے سنا تھا آپ فرما رہے تھے اس امت میں آئندہ کچھ ایسے لوگ ہوں گے جو طہارت اور دعا میں حد (سنت) سے آگے بڑھ جائیں گے۔ کذا رواہ ابن ماجۃ وابن حبان فی صحیحہ۔

ابو یعلی نے مسند میں حضرت سعدؓ کی روایت سے لکھا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا عنقریب کچھ لوگ ایسے ہوں گے جو دعا میں حدود (سنت) سے تجاوز کریں گے، آدمی کے لئے اتنا کہنا کافی ہے اے اللہ میں تجھ سے جنت کا اور اس قول و عمل کا جو جنت سے قریب کر دے خواستگار ہوں اور دوزخ سے اور دوزخ کے قریب لے جانے والے قول و عمل سے تیری پناہ چاہتا ہوں۔ ابو یعلی نے کہا آدمی کے لئے اتنا کہنا کافی ہے۔ آخر کلام تک۔ معلوم نہیں یہ حضرت سعد کا قول ہے یا فرمان نبوی کا حصہ ہے۔

عطیہ نے کہا اَلْمُعْتَدِيْنَ سے وہ لوگ مراد ہیں جو ناجائز طور پر مسلمانوں کے لئے بددعائیں کرتے ہیں۔ مثلاً یوں کہتے ہیں اے اللہ ان پر لعنت بھیج۔ ایسی بددعائیں کرنے میں سب سے آگے رافضی ہیں جو صحابہ کرام اور بعض اہل بیت پر لعنت کرتے ہیں۔ ابن جریج نے کہا اعتداء سے مراد ہے چیخ چیخ کر دعا کرنا جس کی ممانعت اس فرمان رسول میں آئی ہے جو حضرت ابو موسیٰؓ کی روایت سے منقول ہے۔ حضور نے فرمایا اپنے اوپر نرمی اختیار کرو، تم نہ کسی بہرے کو پکار رہے ہو نہ کسی غیر حاضر کو۔

میں کہتا ہوں اعتداء سے مراد ہے حد شریعت سے تجاوز کرنا۔ اس کے اندر تمام مذکورہ بالا صورتیں بھی آجاتی ہیں اور ایسی دعا کرنا بھی اس میں شامل ہے جس میں کوئی گناہ یا قطع رحم ہو رہا ہو اور یہ الفاظ بھی اعتداء ہی کے ذیل میں آتے ہیں۔ میں نے دعا کی مگر میری دعا قبول نہ ہوئی، میں دعا کر رہا ہوں اور میری دعا ضرور قبول ہوگی یا اللہ سے ایسے نام لے کر

جو شریعت (قرآن و حدیث) میں مذکور نہیں ہیں (مثلاً بجلی ماؤں، بہ پاٹمانا، الشور وغیرہ)۔

وَلَا تُفْسِدُوْا فِی الْاَرْضِ بَعْدَ اِصْلَاحِهَا (اور دنیا میں اور درستی کر دینے کے بعد فساد (بگاڑ) نہ پیدا کرو) یعنی جب اللہ نے پیغمبروں کو بھیج دیا، شریعت واضح کر دی، اللہ کی اطاعت کی دعوت دے دی اور دعا میں حدود سے تجاوز کرنے کی ممانعت کر دی اور اس طرح زمین کی اصلاح کر دی تو اس کے بعد کفر، معصیت، بدعت اور غیر اللہ کی طاعت کی دعوت دے کر اس میں بگاڑ پیدا کرو۔ بغوی نے حسن، ضحاک، سدی اور کلبی کے قول کے یہی معنی بیان کیے ہیں۔ عطیہ نے آیت کے مطلب کی توضیح اس طرح کی کہ اللہ کی نافرمانی نہ کرو ورنہ اللہ بارش روک دے گا اور تمہارے گناہوں کے سبب کھیتی کو تباہ کر دے گا (اور اس طرح زمین میں بگاڑ پیدا ہو جائے گا) اس توضیح پر بَعْدَ اِصْلَاحِهَا کا مطلب یہ ہوگا کہ جب اللہ نے بارش اور سبزی سے زمین کی درستی کر دی تو اس کے بعد اس کی خرابی نہ کرو۔

وَادْعُوْهُ خَوْفًا وَّطَمَعًا ؕ اِنَّ رَحْمَتَ اللّٰهِ قَرِیْبٌ مِّنَ الْمُحْسِنِیْنَ ۝ (اور بیم و امید کی حالت میں اللہ کی عبادت کرو بے شک اللہ کی رحمت نیک کام کرنے والوں سے قریب ہے)۔

اس آیت میں امید کی بیم پر ترجیح کا اظہار ہے اور زیادہ اجابت دعا (حسن ظن) کی ترغیب ہے اور اس امر کی طرف اشارہ ہے کہ کریم اور رحیم مالک کی طرف سے دعا کو رد کر دینا محض تمہاری بداعمالی کی نحوست اور نیکوکاری کو ترک کرنے کی وجہ سے ہوتا ہے (ورنہ وہ رحیم اور داتا ہے کسی کی دعا رد نہیں کرتا)۔

رسول اللہ ﷺ نے ایک بار کسی شخص کا (بطور تمثیل) ذکر فرمایا کہ طویل سفر کرتا ہے پراگندہ مو اور غبار آلود چہرہ والا ہے، آسمان کی طرف ہاتھ پھیلا کر دعا کرتا ہے اے میرے رب اے میرے رب مگر اس کا کھانا حرام کا ہے، اس کا پینا حرام کا ہے، اس کا لباس حرام کا ہے، اس کی پرورش ہی حرام سے ہے۔ ایسے شخص کی دعا کیسے قبول ہوگی، رواہ مسلم والترمذی من حدیث ابی ہریرہؓ۔ مسلم اور ترمذی نے حضرت ابوہریرہؓ کی روایت سے یہ بھی نقل کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا بندہ کی دعا برابر قبول ہوتی ہے بشرطیکہ وہ گناہ کی اور قطع رحم کی دعا نہ کرے اور دعا میں جلد بازی سے بھی کام نہ لے، عرض کیا گیا یا رسول اللہ ﷺ جلد بازی سے کیا مراد ہے فرمایا مثلاً کہنے لگے میرے خیال میں دعا قبول نہیں ہوگی یہ خیال کر کے تھک کر دعا کرنا چھوڑ دے۔ امام احمد نے حضرت عبداللہ بن عمرؓ کی روایت سے بیان کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا دل ظروف ہیں بعض بعض سے زیادہ سمائی والے ہیں۔ لوگو! اللہ سے دعا کرتے وقت یقین رکھا کرو کہ تمہاری دعا ضرور قبول ہوگی۔ اللہ اس بندہ کی دعا قبول نہیں کرتا جو بے توجہ دل سے کی ہو۔ غفلت کی ترمذی نے حضرت ابوہریرہؓ کی روایت سے بھی یہ حدیث نقل کی ہے۔

ایک شبہ اور اس کا ازالہ

اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ قبول دعا کا یقین رکھتے ہوئے دعا کی جائے لیکن اَلْمُعْتَدِیْنَ کی تفسیر میں بیان کیا گیا تھا کہ یہ کہنا درست نہیں ہے کہ میری دعا قبول ہو جائے گی۔ یہ ایک شبہ کیا جا سکتا ہے جس کا ازالہ یہ ہے کہ قبول دعا کا یقین رکھنے کا مطلب یہ ہے کہ اس بات کا یقین رکھے کہ خدا کریم ہے دیتا ہے، بخل نہیں کر سکتا لیکن دعا کے قبول نہ ہونے کا سبب انسان کی معصیت اور خطاکاری ہے گویا اللہ کی رحمت و جود پر نظر رکھتے ہوئے تو دعا قبول ہونے کا یقین رکھا جائے اور اپنے اعمال کی نحوست کو دیکھتے ہوئے دعا کے رد ہونے کا اندیشہ دل گیر رہے۔

قریب کو بصیغہ مذکر لانے کی وجہ یہ ہے کہ رحمت بمعنی رحم ہے یا موصوف مذکر محذوف ہے۔ یعنی امر قریب۔ یا یوں کہا جائے کہ فعیل (صیغہ صفت) فعیل مصدری کے (وزن میں) مشابہ ہے جیسے نقیض (اور فعیل مصدری مذکر بھی ہے اور مؤنث بھی) یا یہ کہا جائے کہ قربت نسبی سے جو لفظ قریب آتا ہے وہ مذکر ہے اور قرب مسافت سے جو لفظ قریب بنتا ہے وہ مذکر بھی ہے اور مؤنث بھی (اور یہاں قرب مکانی ہی مراد ہے) ابو عمرو بن العلاء نے کہا کہ قرابت نسب مقصود

ہو تو عورت کے لئے قریبۃ کہا جاتا ہے اور قرب مسافت مراد ہو تو عورت کے لئے بھی قریب بولا جاتا ہے۔

وَهُوَ الَّذِي يُرْسِلُ الرِّيَاحَ بُشْرًا بَيْنَ يَدَيْ رَحْمَتِهِ (اور وہ اللہ ایسا ہے کہ باران رحمت سے پہلے خوشخبری دینے کے لئے ہواؤں کو بھیج دیتا ہے)۔

بُشْرًا یہ لفظ بشرا کا مخفف ہے اور بُشُرًا بشیر کی جمع ہے۔ رحمت سے مراد بارش ہے۔ باد مشرق (پروا ہوا) ابر کو اٹھا کر لاتی ہے باد شمالی ابر کو جمع کرتی ہے باد جنوبی ابر کو چلا دیتی ہے اور باد مغرب (پچھوا ہوا) بادل کو منتشر کر دیتی ہے۔ حضرت ابوہریرہؓ کا بیان ہے میں نے خود سنا رسول اللہ ﷺ فرما رہے تھے ہوا اللہ کی بھیجی ہوئی راحت ہے یہ رحمت کو بھی لاتی ہے اور عذاب کو بھی (اس کو برا نہ کہو اور اللہ سے اس کی خیر کی طلب کرو اور اس کی خرابی سے اللہ کی پناہ کے خواستگار ہو۔ رواہ البخاری فی الادب وابو داؤد وابن ماجہ ورواہ البغوی من طریق الشافعی و عبدالرزاق۔ حاکم نے اس کو صحیح کہا ہے۔

حَتَّى إِذَا أَقَلَّتْ سَحَابًا ثِقَالًا سُقْنَاهُ لِبَلَدٍ مَيِّتٍ فَأَنْزَلْنَا بِهِ الْمَاءَ فَأَخْرَجْنَا بِهِ مِنْ كُلِّ الثَّمَرَاتِ (یہاں تک کہ جب ہوائیں بھاری بادلوں کو اٹھا لیتی ہیں تو کسی خشک سرزمین کی طرف ہم ان کو ہانک لے جاتے ہیں پھر اس بادل سے پانی برساتے ہیں پھر اس پانی سے ہر قسم کے پھل پیدا کرتے ہیں)

أَقَلَّتْ ہوائیں اٹھا کر لاتی ہیں یہ لفظ قلت سے ماخوذ ہے کسی چیز کو اٹھانے والا اس کو قلیل (اور آسان اور حقیر) سمجھتا ہے۔ ثِقَالًا پانی کی وجہ سے بوجھل۔ یہ لفظ ثقیل کی جمع ہے چونکہ سَحَاب، سحابۃ کے معنی میں ہے اس لئے ثقالاً بصیغہ جمع ذکر کیا۔ سُقْنَاهُ چونکہ لفظ سحاب مفرد ہے اس لئے واحد مذکر کی ضمیر ذکر کی۔ لبلد سرزمین کے لئے یا اس کو سرسبز کرنے کے لئے یا سیراب کرنے کے لئے۔ بعض کے نزدیک لبلد میں لام بمعنی الیٰ ہے یعنی خشک زمین کی طرف۔ مَيِّتٍ وہ زمین جس میں سبزی نہ ہو۔ فَأَنْزَلْنَا بِهِ یعنی بالبلد اس وقت با سببیت کے لئے ہوگی یا بہ کی ضمیر سحاب یا ہوا کی طرف راجع ہے اس وقت با الصاق کی ہوگی یعنی بادل یا ہوا کے ساتھ ہم نے پانی اتارا۔ فَأَخْرَجْنَا بِهِ میں ضمیر اگر بلد کی طرف راجع قرار دی جائے تو با ظرفیت کے لئے ہوگی یعنی خشک زمین میں اور اگر سحاب یا ہوا کی طرف راجع ہو تو با سببیت کے لئے ہوگی۔

كَذَلِكَ نُخْرِجُ الْمَوْتَى لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُونَ (یوں ہی ہم مردوں کو نکال کھڑا کریں گے (یہ بیان اس لئے کیا) تاکہ تم سمجھو)۔

كَذَلِكَ یعنی پھلوں کو پیدا کرنے یا خشک زمین کو سرسبز بنانے کی طرح۔ نُخْرِجُ الْمَوْتَى یعنی قبروں سے مردوں کو نکالیں گے۔ تَذَكَّرُونَ تاکہ تم سمجھو اور اس امر پر استدلال کرو کہ اللہ کو جب اس کائنات کو پیدا کرنے کی قدرت ہے تو آخرت میں دوبارہ پیدا کرنے کی قدرت بھی ہونی ہی چاہئے (دوسری تخلیق، اول تخلیق سے مشکل نہیں) بغوی نے لکھا ہے کہ حضرت ابوہریرہؓ اور حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا جب سب لوگ اول صور پھونکنے سے مر جائیں گے تو اللہ زیر عرش سے پانی برسائے گا جس کا نام آب حیات ہوگا۔ جیسے مردوں کی منی۔ اس بارش سے لوگ قبروں کے اندر کھیتی کی طرح اگیں گے جب اجسام کی تکمیل ہو جائے گی تو ان کے اندر روح پھونک دے گا پھر ان پر ایک نیند طاری کر دی جائے گی جس کی وجہ سے وہ قبروں سے اٹھیں گے اس وقت سروں اور آنکھوں میں ان کو نیند کا اثر محسوس ہو رہا ہوگا اور کہیں گے ہائے افسوس ہم کو خواب گاہ سے (یا خواب سے) کس نے اٹھا دیا۔ صحیحین میں حضرت ابوہریرہؓ کی روایت سے آیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا دونوں مرتبہ صور پھونکنے کی درمیانی مدت چالیس ہوگی لوگوں نے پوچھا ابوہریرہ کیا چالیس دن کی مدت ہوگی۔ حضرت ابوہریرہؓ نے فرمایا مجھے اس سے انکار ہے لوگوں نے کہا تو کیا چالیس مہینے کی فرمایا مجھے اس سے بھی انکار ہے لوگوں نے کہا تو کیا چالیس سال کی فرمایا مجھے اس سے بھی انکار ہے (یعنی رسول اللہ نے چالیس کا لفظ فرمایا دن مہینہ یا برس کی صراحت نہیں فرمائی) پھر اللہ آسمان سے پانی برسائے گا جس سے انسان سبزی کی طرح اگیں گے۔ انسان کی ہر چیز گل جاتی ہے صرف ایک ہڈی رہ جاتی ہے دم گزے کی ہڈی اسی سے

قیامت کے دن تمام (اعضاء اور اجزاء) جوڑ دیے جائیں گے۔ ابن ابی داؤد نے بھی البعث میں یہ حدیث نقل کی ہے اس کی روایت میں اتنی صراحت ہے کہ دونوں مرتبہ صور پھونکنے کی درمیانی مدت چالیس سال کی ہو گی اسی چلہ میں مینہ بارش کرے گا۔
ابن ابی حاتم نے حضرت ابن عباس کا بیان نقل کیا ہے کہ دونوں مرتبہ پھونکنے کی درمیانی مدت میں جو چالیس کی ہوگی زیر عرش سے پانی کا ایک دریا جاری ہو جائے گا (منی کی بارش ہوگی) انتہی۔ انسان چوپائے اور پرندے کا ہر فنا شدہ حصہ جسم اُگ آئے گا اگر پہلے کسی نے ان کو دیکھا ہو گا تو اُگنے کے بعد دیکھ کر پہچان لے گا۔ پھر روحوں کو چھوڑ کر اجسام سے ان کا جوڑ لگا جائے گا آیت وَإِذَا النُّفُوسُ زُوِّجَتْ کا یہی معنی ہے۔ ابن جریر نے سعید بن جبیرؒ کی روایت سے بھی یہ اثر نقل کیا ہے۔ بیہقی نے کہا تمام روایات کا اتفاق ہے کہ دونوں مرتبہ صور پھونکے جانے کی درمیانی مدت چالیس سال ہو گی۔ ابن مبارک نے مرسلاً حسن کی روایت سے بھی ایسا ہی نقل کیا ہے۔

وَالْبَلَدُ الطَّيِّبُ يَخْرُجُ نَبَاتُهُ بِإِذْنِ رَبِّهِ ۖ وَالَّذِي خَبُثَ لَا يَخْرُجُ إِلَّا نَكِدًا ۚ كَذَٰلِكَ نُصَرِّفُ الْآيَاتِ لِقَوْمٍ يَشْكُرُونَ ﴿٥٨﴾

(اور جو سرزمین ستھری ہوتی ہے اس کی پیداوار اس کے رب کے حکم سے (خوب) نکلتی ہے اور جو (زمین) خراب ہے اس کی پیداوار نہیں نکلتی (اگر نکلی بھی) تو تھوڑی سی، اسی طرح ہم دلائل کو طرح طرح سے ان لوگوں کے لئے بیان کرتے ہیں جو قدر کرتے ہیں)۔

اَلْبَلَدُ الطَّيِّبُ اچھی مٹی والی زمین۔ بِإِذْنِ رَبِّهِ اللہ کی مشیت اور توفیق سے۔ اس لفظ سے یہ بتانا ہے کہ اس زمین کی پیداوار زیادہ اچھی اور زیادہ بخش ہوتی ہے اس کے مقابل جو الَّذِي خَبُثَ فرمایا ہے اس سے بھی یہی معلوم ہو رہا ہے کہ يَخْرُجُ نَبَاتُهُ بِإِذْنِ رَبِّهِ سے پیداوار کی کثرت اور خوبی بیان کرنا مقصود ہے۔ الَّذِي خَبُثَ یعنی بری شور کھاری زمین۔ نَكِدًا قلیل غیر مفید۔ قاموس میں ہے نَكِدَ بالکسر، نکد عطاء باب نصر بھی آیا ہے۔ عطاء منکود قلیل عطاء نکد عیشہ اس کی زندگانی تنگ ہو گئی۔ نکدت البئر کنویں کا پانی کم ہو گیا۔ نکد زید حاجۃ عمرو زید نے اس کی حاجت پوری نہیں کی اس کو منع کر دیا۔ نکد زید فلانا زید نے اس کا سوال پورا نہیں کیا یا تھوڑا دیا۔ رجل نکد و نکد بخیل، متعسر تنگدست۔ يَشْكُرُونَ جو اللہ کی نعمت کا شکر کرتے ہیں۔

سابقہ آیات میں اللہ کی قدرت کاملہ اور رحمت شاملہ کا اظہار کیا گیا تھا اس آیت میں یہ بتایا کہ رب فیاض کی رحمت اگرچہ عمومی ہے لیکن قبول کرنے والوں میں قابلیت کا تفاوت ہے۔ قبول فیض کی کمی قابلیت کی کمی کی وجہ سے ہوتی ہے جیسے بارش کا فیضان ایک جیسا ہے لیکن زمین کی صلاحیت و قابلیت کی تفاوت کی وجہ سے پیداوار میں کمی بیشی ہوتی ہے۔

اسی طرح انعامہ آیات، بیان دلائل اور بعثت انبیاء اگرچہ سب انسانوں میں عمومی رحمت ہے مگر اس رحمت سے بہرہ اندوز ہونا صرف ان مومنوں کی خصوصیت ہے جو ان نعمتوں کے قدردان ہیں جن کی فطری صلاحیتیں اللہ کے اسم ہادی کے پرتو سے مستفاد ہیں اور اپنی صلاحیتوں اور قابلیتوں کے ذریعے سے وہ ہدایت یاب ہوتے، دلائل پر غور کرتے اور آیات سے سبق حاصل کرتے ہیں۔ شیخین نے صحیحین میں حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ کی روایت سے لکھا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اللہ نے جو ہدایت و علم عطا فرما کر مجھے بھیجا ہے اس کی مثال کثیر بارش کی طرح ہے جو زمین کے کسی اچھے ٹکڑے پر پڑتی ہے تو وہ خطہ اس کو قبول کر لیتا ہے جس سے سبزہ اور چارہ خوب پیدا ہوتا ہے اور کسی تنگ بنجر خطے پر پڑتی ہے تو وہ بھی (اپنے احاطہ میں) پانی کو روک لیتا ہے (گو پی نہیں سکتا اس لئے اس میں سبزہ نہیں پیدا ہوتا بلکہ) آدمی اس کو پیتے جانوروں کو پلاتے اور کھیتوں کو سینچتے اور ایک تیسرے ٹکڑے پر پڑتی ہے جو چٹیل سخت ہموار میدان ہوتا ہے وہ نہ تو اپنے احاطہ میں پانی کو روکتا ہے (کہ دوسروں کو بھی فائدہ ہو) نہ خود پیتا ہے کہ سبزہ پیدا ہو جائے۔ پس یہ مثال ہے ان لوگوں کی جو دین کی سمجھ رکھتے ہیں۔ میری لائی ہوئی ہدایت سے فائدہ اٹھاتے ہیں۔ خود سمجھتے ہیں دوسروں کو سکھاتے ہیں اور ان لوگوں کی جو میرے پیام کی طرف قطعاً التفات نہیں کرتے اور خدا کی عطا کی ہوئی ہدایت کو قبول نہیں کرتے۔

لَقَدْ اَرْسَلْنَا نُوْحًا اِلٰى قَوْمِهٖ (یقیناً ہم نے نوح کو ان کی قوم کی طرف پیغمبر بنا کر بھیجا)۔

لَقَدْ اَرْسَلْنَا محذوف قسم کا جواب ہے۔ یہ لام تقریباً بغیر قَدْ کے مستعمل نہیں کیونکہ اس قسم کا جملہ سننے کے بعد مخاطب کو مضمون جملہ کے وقوع کی توقع ہو جاتی ہے لہٰذا قَدْ کا آنا ضروری قرار پایا۔ حضرت نوحؑ کا نسب نامہ حسب ذیل ہے۔

نوح بن لامک یا ملک بن متوشلخ یا متوشلح بن خنوخ یا اخنوخ۔ ماں کا نام قینوش بنت براکیل بن محویل بن خنوخ تھا۔ اخنوخ کا اسمائی نام ہی حضرت ادریس تھا۔ آپ ہی سب سے پہلے نبی ہیں، جنہوں نے قلم سے لکھنے کی ایجاد کی۔ اخنوخ بن یرد بن مہلائیل تھے۔ مہلائیل کا باپ قینن یا قینان یا قینن تھا۔ قینان کا باپ انوش یا یانش تھا۔ یانش کے باپ حضرت شیث بن حضرت آدمؑ تھے۔

مستدرک میں حضرت ابن عباسؓ کا قول آیا ہے کہ نوح سے آدم تک دس پشتیں تھیں۔ طبرانی نے حضرت ابوذر کی روایت سے مرفوعاً بھی یہی لکھا ہے۔ اس تفصیل سے واضح ہو گیا کہ حضرت ادریس حضرت نوح سے پہلے تھے اکثر صحابہ کا یہی مسلک ہے۔ بغوی نے لکھا ہے کہ حضرت نوح کا نام سکن یا شاکر یا یشکر تھا۔ حضرت آدمؑ کے بعد آپ ہی کی ذات کی طرف لوگوں کا رجوع ہوا آپ سب کے ماوی اور مسکن تھے اس لئے سکن نام ہو گیا۔ سیوطی نے اتقان میں مستدرک کے حوالے سے لکھا ہے کہ نوح کا نام عبدالغفار تھا۔ چونکہ آپ نے اپنے اوپر اپنی قوم کے لئے کثرت سے گریہ کیا اس لئے نوح لقب ہو گیا یا آیات کے نزول سے آپ پر گریہ کی کیفیت بہت طاری ہو جاتی تھی اس لئے نوح کہا گیا۔ بعض روایات میں آیا ہے کہ آپ نے ایک بدصورت کتے کو دیکھ کر فرمایا اخسأ یا قبیح یعنی برا ہے۔ اللہ نے کتے کو گویا کر دیا کتے نے کہا یہ عیب میرا خود ساختہ ہے یا خالق کی طرف سے ہے۔ یہ کلام سنتے ہی حضرت نوح بیہوش ہو گئے اور پھر ہوش آنے کے بعد خوب روئے۔ بغوی نے لکھا ہے کہ آپ نے کوئی جذامی کتا دیکھ کر فرمایا خبیث دور ہو۔ اس پر وحی آئی کہ تو نے کتے پر عیب لگایا یا مجھ پر۔ بعض نے کہا چونکہ آپ نے اپنی قوم کے لئے بددعا کی تھی اور سب کو غرق کرا دیا تھا اس لئے خوب روئے یا اس بات پر گریہ کرتے تھے کہ میں نے اپنے بیٹے کنعان کو ڈوبنے سے بچانے کے لئے اللہ سے گفتگو میں لوٹ پھیر کیا تھا۔

چالیس سال کی عمر میں آپ کو نبوت سے سرفراز کیا گیا۔ مستدرک میں حاکم نے حضرت ابن عباسؓ کی مرفوع روایت نقل کی ہے کہ چالیس سال کی عمر میں اللہ نے نوح کو نبی بنایا اور نو سو پچاس برس تک آپ اپنی قوم میں رہے اور ان کے لئے بددعا کرتے رہے اور طوفان کے بعد ساٹھ برس زندہ رہے۔

خواجہ الیسر کی بعض روایات میں آیا ہے کہ پچاس برس کی عمر میں آپ کو نبوت ملی اور طوفان کے بعد ۳۵۰ برس زندہ رہے کل عمر ۱۰۵۰ برس ہوئی۔ بعض کا قول ہے چار سو اسی یا ساٹھ برس کی عمر میں نبی ہوئے۔ نبوت کے وقت ۳۵۰ برس کے تھے اور طوفان کے بعد ۲۵۰ برس رہے کل عمر ۱۵۵۰ برس کی ہوئی۔ مقاتل کا قول ہے کہ سو سال کی عمر میں نبوت ملی۔ ابن جریر کا بیان ہے کہ حضرت نوح کی ولادت حضرت آدمؑ کی پیدائش سے ۱۰۵۶ برس بعد ہوئی تھی۔ حدیث میں آیا ہے کہ حضرت آدمؑ کی عمر ۹۶۰ برس ہوئی کیونکہ آپ نے اپنی عمر میں سے ۴۰ برس حضرت داؤد کو دے دیئے تھے۔ نووی نے تہذیب میں ذکر کیا ہے کہ تمام انبیاء سے آپ کی عمر زیادہ ہوئی۔

فَقَالَ يٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرُهٗ ۭ اِنِّىْٓ اَخَافُ عَلَيْكُمْ عَذَابَ يَوْمٍ عَظِيْمٍ ۝

(پس نوح نے کہا اے میری قوم اللہ واحد کی عبادت کرو تمہارا اس کے سوا کوئی معبود نہیں (اگر اللہ واحد کی عبادت ترک کرو گے تو) مجھے تم پر ایک بڑے سخت دن (یعنی روز قیامت یا روز طوفان) کا تمہارے متعلق خوف ہے۔

قَالَ الْمَلَاُ مِنْ قَوْمِهٖٓ اِنَّا لَنَرٰىكَ فِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ۝ (قوم کے سرداروں نے کہا ہم جانتے ہیں تم صریح گمراہی میں پڑ گئے ہو)۔ الملاء سرداران جماعت۔ جب ایک جگہ جمع ہو جاتے ہیں تو لوگوں کی آنکھوں میں ان کی ہیبت بھر جاتی ہے اسی لئے ان کو ملا کہا جاتا ہے۔

قَالَ يٰقَوْمِ لَيْسَ بِيْ ضَلٰلَةٌ وَّلٰكِنِّيْ رَسُوْلٌ مِّنْ رَّبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝ اُبَلِّغُكُمْ رِسٰلٰتِ رَبِّيْ وَاَنْصَحُ لَكُمْ وَاَعْلَمُ مِنَ

اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ۝ اَوَعَجِبْتُمْ اَنْ جَآءَكُمْ ذِكْرٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ عَلٰى رَجُلٍ مِّنْكُمْ لِيُنْذِرَكُمْ وَلِتَتَّقُوْا وَلَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ ۝ (نوح نے کہا اے میری قوم مجھے کوئی بہکاوا نہیں بلکہ میں پروردگار عالم کا پیامبر ہوں تم کو اپنے رب کے احکام پہنچاتا ہوں اور تمہاری خیر خواہی کرتا ہوں اور خدا کی طرف سے ان امور کی خبر رکھتا ہوں جن کی تم کو خبر نہیں کیا (تم مجھے جھوٹا کہتے ہو اور) اس بات سے تعجب کرتے ہو کہ تمہارے رب کی طرف سے تم میں سے ہی ایک آدمی کی معرفت تمہارے پاس ایک یاد داشت آگئی تاکہ وہ تم کو (اللہ کی نافرمانی سے) ڈرائے اور تم پرہیزگار بن جاؤ اور تم پر رحم کیا جائے)۔

ضَلٰلَةٌ کوئی ادنیٰ گمراہی۔ ضلال گمراہی، چونکہ قوم والوں نے زور دار الفاظ میں حضرت نوحؑ کو گمراہ قرار دیا تھا اس لئے آپ نے بھی پرزور لہجہ میں گمراہی کی بالکل نفی کر دی اور فرمایا مجھ میں ذرا سی بھی گمراہی نہیں گویا قوم والوں پر تعریض کی کہ گمراہ تم ہو۔ وَلٰكِنِّيْ رَسُوْلٌ یہ نفی گمراہی کی پرزور تاکید ہے۔ اللہ کا رسول جو اللہ کے احکام کا پیامبر ہو لامحالہ ہدایت یافتہ اور صراط مستقیم پر گامزن ہوگا (اس کا گمراہ ہونا ناممکن ہے)۔

اُبَلِّغُكُمْ رِسٰلٰتِ رَبِّيْ رسالۃ کی جمع ہے۔ رسٰلٰت کو بصیغہ جمع ذکر کرنے کی وجوہ یہ ہیں۔ (۱) اوقات رسالت مختلف تھے۔ (۲) معانی رسالت میں تنوع تھا۔ کسی کا عقیدہ سے تعلق تھا کسی کا عمل سے کوئی وعظ تھا کوئی حکم۔ (۳) یا مراد وہ تمام پیامات و ہدایات ہیں جو گزشتہ انبیاء کو دیئے گئے تھے مثلاً حضرت شیثؑ اور حضرت ادریسؑ کے صحیفے وَاَنْصَحُ لَكُمْ۔ نصح کا معنی ہے کسی کی خیر خواہی خواہ عملی ہو یا قولی۔ بغوی نے لکھا ہے کہ اس سے مراد وہ بہتری اور خیر ہوتی ہے جو آدمی اپنے لئے پسند کرتا ہے اور دوسروں کے لئے بھی اسی کا طلب گار ہوتا ہے۔

باب بغیر لام کے بھی متعدی ہوتا ہے مگر لام کا اضافہ خلوص خیر خواہی پر دلالت کر رہا ہے۔ مِنَ اللّٰهِ سے مراد یا تو مِنْ جِهَةِ اللّٰهِ ہے یعنی اللہ کی طرف سے وحی کے ذریعہ سے، یہ مراد ہے کہ میں اللہ کی ذات کو اور ثواب و عذاب پر اس کی قدرت کو اور ناقابل برداشت ربانی گرفت کو اتنا جانتا ہوں کہ تم نہیں جانتے۔ اَوَعَجِبْتُمْ میں ہمزہ استفہام انکار کے لئے ہے اور واؤ عاطفہ ہے اور معطوف علیہ محذوف ہے یعنی کیا تم مجھے جھوٹا قرار دیتے ہو اور تعجب کرتے ہو۔

ذِكْرٌ حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا یعنی نصیحت۔ بعض نے کہا بیان۔ بعض نے کہا رسالت، پیام۔ عَلٰى رَجُلٍ مِّنْكُمْ تمہاری جماعت میں سے یا تمہاری اولاد نسل میں سے یعنی ایک آدمی پر۔ کفار کو آدمی کے پیغمبر ہونے سے تعجب ہوتا تھا وہ کہتے تھے اگر اللہ چاہتا تو فرشتوں کو بھیجتا ایسی بات تو ہم نے پچھلے باپ دادا میں ہوتی نہیں سنی۔ لِيُنْذِرَكُمْ تاکہ تم کو کفر و معصیت کے برے انجام سے ڈرائے۔ وَلِتَتَّقُوْا اور تاکہ تم اس عذاب سے ڈرو جو کفر و معصیت کے لئے مقرر کیا گیا ہے۔ وَلَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ اور تاکہ تم پر رحم کیا جائے جب کہ تم تقویٰ اختیار کرو۔ لَعَلَّ حرف امید اس لئے ذکر کیا کہ تقویٰ موجب رحمت نہیں۔ رحمت تو اللہ کی ایک مہربانی ہے (جس کے حصول کا ذریعہ اللہ نے تقویٰ کو بنایا ہے ورنہ تقویٰ سے قطعی طور پر مستحق رحمت ہو جانا اور رحمت کا واجب ہو جانا ضروری نہیں) متقی کو اپنے تقویٰ پر کامل اعتماد کر کے بے غم نہ ہونا چاہئے بلکہ تقوے کے باوجود اللہ کے عذاب سے ڈرتے رہنا چاہئے۔

ابو نعیم نے حضرت علیؓ کی روایت سے لکھا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اللہ نے بنی اسرائیل کے ایک پیغمبر کے پاس وحی بھیجی کہ تمہاری امت میں جو طاعت گزار لوگ ہوں ان سے کہہ دو کہ اپنے اعمال پر بھروسہ نہ کرلیں۔ قیامت کے دن حساب کے وقت میں جس کو عذاب دینا چاہوں گا عذاب دوں گا اور تمہاری امت میں جو گنہگار ہیں ان سے کہہ دو کہ اپنے کو خود ہلاکت میں نہ ڈالو (یعنی ہلاکت کا یقین کر کے رحمت سے ناامید نہ ہو) کیونکہ میں بڑے بڑے گناہ بخش دوں گا اور مجھے پرواہ نہ ہوگی۔

فَكَذَّبُوْهُ فَاَنْجَيْنٰهُ وَالَّذِيْنَ مَعَهٗ فِي الْفُلْكِ وَاَغْرَقْنَا الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا ۚ اِنَّهُمْ كَانُوْا قَوْمًا عَمِيْنَ ۝ ع ۱۵

(پھر انہوں نے نوح کی تکذیب کی (تو ہم نے طوفان بھیج دیا) پس نوح کو اور ان کے ساتھیوں کو کشتی میں

بچا لیا اور جنہوں نے ہماری آیات کو جھوٹا قرار دیا تھا ان کو غرق کر دیا بے شبہ وہ اندھے لوگ تھے)۔

فَاَنْجَيْنٰهُ ہم نے نوح کو طوفان سے بچا لیا وَالَّذِيْنَ مَعَهٗ یہ چالیس مرد اور چالیس عورتیں تھیں یا آٹھ مرد یا دس مرد یا بحر توی یا صرف تین بیٹے سام و حام و یافث اور ان کی تین بیویاں یا تین بیٹے اور چھ دوسرے مؤمن۔ یہ مختلف اقوال آئے ہیں۔ فِي الْفُلْكِ اس کا تعلق مَعَهٗ سے ہے یعنی نوح کے ساتھ جو لوگ کشتی میں تھے یا اَنْجَيْنٰهُ سے تعلق ہے یعنی ہم نے کشتی میں نوح کو اور ان کے ساتھیوں کو بچا لیا۔ قَوْمًا عَمِيْنَ یعنی کافر کے دل اللہ کی معرفت اور حق و باطل میں امتیاز کرنے سے اندھے تھے عَمِيْنَ اَعْمٰى کی جمع ہے۔ اصل میں عمیین تھا تخفیفاً ایک یاء کو حذف کر دیا۔

وَاِلٰى عَادٍ اَخَاهُمْ هُوْدًا ۭ (اور ہم نے بھیجا (قوم) عاد کی طرف ان کے بھائی ہود کو)۔

عاد سے مراد قبیلۂ عاد ہے۔ عاد بن عوص بن ارم بن سام بن نوح کی ذریت عاد اولیٰ کہلاتی ہے۔ اَخَاهُمْ هُوْدًا یعنی نسب (اور قومیت) کے اعتبار سے بھائی۔ دین کے لحاظ سے بھائی ہونا مراد نہیں ہے۔

حضرت ہود کا باپ عبداللہ بن رباح بن خلود بن عاد بن عوص تھا۔ ابن اسحاق نے ہود کو شالخ بن ارفخشد بن سام بن نوح کا بیٹا کہا ہے۔ شیخ ابو بکر نے شرح خلاصۃ السیر میں لکھا ہے کہ ہود کا نام عابر یا عابر یا عیبر یا غبیر تھا اور آپ شالخ بن قینان بن ارفخشد بن سام بن نوح کے بیٹے تھے۔ تمام کتب الانساب میں اسی طرح آیا ہے، لیکن ایک شاذ روایت یہ بھی آئی ہے کہ ہود بن خالد بن خلود بن عیص بن عملیق بن عاد بن عوص بن ارم بن سام بن نوح تھے۔ ہود کی ماں کا نام مرجب بنت عوظم بن سام بن نوح تھا۔ حضرت ہود کی پیشانی میں رسول اللہ ﷺ کا نور چمکتا تھا جس کو دیکھ کر لوگ کہتے تھے یہ شخص اللہ وحدہ لا شریک کی عبادت کرے گا، بتوں کو توڑے گا۔ اس خیال کے زیر اثر لوگ آپ کی تعظیم کرتے تھے۔ آپ کے بعد سو برس تک کوئی پیغمبر مبعوث نہیں ہوا۔ سو برس کے بعد حضرت صالح کی بعثت ہوئی۔ اس درمیانی زمانہ میں راجا اور پرجا سب بت اور سورج کی پوجا کرتے تھے اور کچھ لوگ آتش پرست بھی تھے۔ آخر اللہ نے حضرت صالح کو ثمود کی ہدایت کے لئے بھیجا۔ حضرت ہود حضرت نوح کی شریعت پر تھے۔ آپ کی عمر ۴۰۰ برس یا ۴۶۰ برس ہوئی۔ تاریخ شامی میں ابن حبیب کا قول نقل کیا ہے کہ ہود کی عمر ۴۴ سال ہوئی۔ ابن کلبی نے ۴۶۴ برس کی عمر بتائی ہے اور ماں کا نام مرجانہ لکھا ہے۔ آپ کی قبر حضرموت میں اور بعض کے نزدیک مکہ میں ہے۔ انتہی کلام الشیخ ابی بکر۔

بغویؒ نے حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی روایت سے لکھا ہے کہ ہود کی قبر حضرموت میں سرخ ٹیلے پر واقع ہے۔ عبدالرحمٰن بن سابط کا بیان ہے کہ رکن اور مقام اور زمزم کے درمیان ننانوے پیغمبروں کی قبریں ہیں انہی میں ہودؑ، صالحؑ اور شعیبؑ کی بھی قبریں ہیں۔ یہ بھی روایت میں آیا ہے کہ جب کسی پیغمبر کی امت (عذاب سے) تباہ ہو جاتی تو وہ پیغمبر مؤمنوں کی جماعت لے کر مکہ میں چلا آتا تھا اور اسی جگہ مرتے دم تک سب لوگ اللہ کی عبادت میں مشغول رہتے تھے اور یہیں مر کر دفن ہو جاتے تھے۔ بھائی ہونے سے مراد ابن اسحاق کے نزدیک تو نسبی بھائی ہے اور شیخ ابو بکر کے نزدیک قوم عاد کا ہم جنس ہونا۔ عاد میں سے ہی ایک شخص کو پیغمبر بنانے کی وجہ یہ تھی کہ وہ لوگ اپنے آدمی کی بات کو خوب سمجھ سکتے تھے اس کے حال کو خوب جانتے تھے اور اسی کی پیروی کرنے کی ان کو رغبت ہو سکتی تھی (غیر کی بات نہ کوئی سمجھتا ہے نہ اس کے حال کو جانتا ہے نہ حمیت جاہلی کسی غیر کی پیروی کرنے دیتی ہے)۔

قَالَ يٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرُهٗ ۭ اَفَلَا تَتَّقُوْنَ ۝ قَالَ الْمَلَاُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ قَوْمِهٖٓ اِنَّا لَنَرٰىكَ فِيْ سَفَاهَةٍ وَّاِنَّا لَنَظُنُّكَ مِنَ الْكٰذِبِيْنَ ۝ (ہود نے کہا اے میری قوم (تنہا) اللہ کی پوجا کرو اس کے سوا تمہارا کوئی واقعی معبود نہیں کیا تم (دوسروں کی پوجا کرتے ہو اور اس کے عذاب سے) نہیں ڈرتے۔ قوم ہود کے کافروں میں سے بڑے لوگوں نے جواب دیا کوئی شک نہیں کہ ہم تم کو حماقت میں مبتلا پاتے ہیں اور ہم یقین رکھتے ہیں کہ تم جھوٹوں کے گروہ میں سے ہو)۔

قَالَ یٰقَوْمِ جملہ استینافیہ ہے اسی لئے فَقَالَ نہیں فرمایا۔ تَتَّقُوْنَ کا مفعول محذوف ہے یعنی کیا تم اللہ کے عذاب سے نہیں ڈرتے۔ حضرت ہودؑ کی قوم حضرت نوحؑ کی قوم سے ملتی جلتی تھی۔ الذین کفروا الملأ کی صفت تقییدی ہے۔ اس شرط کو بڑھانے کی وجہ یہ ہے کہ حضرت ہودؑ کی قوم کے کچھ سردار ایمان لے آئے تھے جیسے مرثد بن سعد اور حضرت نوحؑ کی قوم کا کوئی سردار ایمان نہیں لایا تھا (اس لئے حضرت نوحؑ کے قصہ میں الملأ کے بعد کفروا کی شرط لگانے کی ضرورت نہیں تھی) فِیْ سَفَاهَةٍ سفاہت، سبک سری، حماقت یعنی سرداروں نے کہا تم احمق ہو۔ اپنی قوم کے دین کو تم نے چھوڑ دیا اور ایک ناممکن امر یعنی رسالت کا دعویٰ کر بیٹھے یہ سبک سری ہے۔ فِیْ سَفَاهَةٍ کہنے سے اس طرف اشارہ ہے کہ سفاہت پر تم جم گئے یہ سبک سری تم سے کبھی دور نہیں ہوئی۔ مِنَ الْكٰذِبِيْنَ یعنی رسالت کا دعویٰ کرنے میں تم جھوٹے ہو۔

قَالَ يٰقَوْمِ لَيْسَ بِيْ سَفَاهَةٌ وَّلٰكِنِّيْ رَسُوْلٌ مِّنْ رَّبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝ اُبَلِّغُكُمْ رِسٰلٰتِ رَبِّيْ وَاَنَا لَكُمْ نَاصِحٌ اَمِيْنٌ ۝

(ہودؑ نے کہا اے میری قوم مجھ میں کوئی حماقت نہیں ہے بلکہ میں تو رب العلمین کا پیغامبر ہوں اپنے رب کے احکام تم کو پہنچا رہا ہوں اور تمہارا خیر خواہ ہوں اور (پیغام رسالت کا) امین ہوں)۔

وَاَنَا لَكُمْ نَاصِحٌ یعنی میں جس امر کی تم کو دعوت دے رہا ہوں اس میں تمہارا مخلص، خیر خواہ ہوں۔ کافروں نے جملہ اسمیہ بولا تھا اور کہا تھا اِنَّا لَنَظُنُّكَ اس کے مقابلہ میں حضرت ہودؑ نے بھی نَاصِحٌ بصیغہ اسم فاعل فرمایا۔ کلبی نے کہا اس کا مطلب یہ ہے کہ میں آج تک تمہارے اندر رہا اور امین رہا اللہ اب مجھ پر جھوٹے ہونے کی بدگمانی کرنے کی کوئی وجہ نہیں۔ حضرت انبیاء واقف تھے کہ کافر انتہائی گمراہ اور احمق ہیں لیکن انہوں نے تہذیب اور حلم سے کام لے کر مقابلہ سے پہلو تہی کی اس سے معلوم ہوتا ہے کہ انبیاء اپنی امتوں کے کتنے بڑے خیر خواہ، کافروں پر کتنے مہربان، قوت برداشت میں کتنے کامل اور حسن خطاب کے ذریعہ دلوں کو ہدایت کی طرف کس قدر کھینچنے والے تھے۔ اس گفتگو کو نقل کر کے اللہ نے بندوں کو تعلیم دی ہے کہ بے وقوفوں سے کس طرح خطاب کیا جائے۔

اَوَعَجِبْتُمْ اَنْ جَآءَكُمْ ذِكْرٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ عَلٰى رَجُلٍ مِّنْكُمْ لِيُنْذِرَكُمْ ۭ وَاذْكُرُوْٓا اِذْ جَعَلَكُمْ خُلَفَاۗءَ مِنْۢ بَعْدِ قَوْمِ نُوْحٍ وَّزَادَكُمْ فِي الْخَلْقِ بَصْۜطَةً ۚ فَاذْكُرُوْٓا اٰلَاۗءَ اللّٰهِ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ۝

(کیا (تم نے تکذیب کی اور) اس بات سے تمہیں تعجب ہوا کہ تم میں سے ایک آدمی پر تمہارے رب کی طرف سے ایک یاد داشت آگئی تاکہ وہ تم کو (کفر و معصیت کے عذاب سے) ڈرائے اور یاد کرو کہ قوم نوحؑ (کو ہلاک کرنے) کے بعد اس نے تم کو ان کا جانشین بنایا اور ڈیل ڈول میں تم کو لمبائی چوڑائی زیادہ عطا کی۔ اللہ کے ان احسانات کو یاد کرو تاکہ تم کو فلاح حاصل ہو)۔

بَصْۜطَةً لمبائی اور قوت۔ کلبی اور سدی نے کہا قوم میں سب سے لمبا آدمی سو ہاتھ کا اور سب سے چھوٹا ستر ہاتھ کا ہوتا تھا۔ ابو حمزہ ثمالی نے صرف ستر ہاتھ کہا ہے۔ حضرت ابن عباسؓ کے قول میں اسی ۸۰ ہاتھ مروی ہے۔ مقاتل نے بارہ ہاتھ کی لمبائی بتائی ہے۔ وہب نے کہا ان آدمیوں کے سر گنبد معلوم ہوتے تھے اور آنکھیں اور ناک کان کے سوراخ اتنے بڑے تھے کہ بجو ان میں بچے دیتے۔ آلاء کا واحد اِلْیٌ ہے۔ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ یعنی نعمت کو یاد کرو، نعمت کی یاد موجب شکر ہوگی اور شکر موجب فلاح۔

قَالُوْٓا اَجِئْتَنَا لِنَعْبُدَ اللّٰهَ وَحْدَهٗ وَنَذَرَ مَا كَانَ يَعْبُدُ اٰبَاۗؤُنَا ۚ فَاْتِنَا بِمَا تَعِدُنَآ اِنْ كُنْتَ مِنَ الصّٰدِقِيْنَ ۝

(قوم والوں نے کہا کیا تو ہمارے پاس (جیسا تیرا دعویٰ ہے آسمان سے) اس لئے آیا ہے کہ ہم صرف اللہ ہی کی پوجا کریں اور جن (بتوں وغیرہ) کی ہمارے باپ دادا پوجا کرتے تھے ان کی پوجا چھوڑ دیں اگر تو سچا ہے تو جس (عذاب) کی تو ہم کو دھمکی دے رہا ہے اس کو ہم پر لے آ)۔ اَجِئْتَنَا سے مراد ہے اور آنے سے مراد ہے کسی دوسری جگہ سے آنا یا آسمان سے آنا۔ صوفیا الذکر کے معنی اس وقت مراد ہوگا جب یہ لفظ کافروں نے بطور استہزاء کہا ہو یا قصد کرنا بطور مجاز ہو یعنی تیرا ارادہ یہ ہے کہ ہم بتوں کو چھوڑ کر صرف اللہ کی پوجا کریں۔ بِمَا تَعِدُنَآ سے عذاب کی وہ دھمکی مراد ہے جو اَفَلَا تَتَّقُوْنَ سے

مستعمل ہوتی ہے یہ ممکن ہے حضرت ہودؑ نے ان کو دھمکی صراحۃً دی ہو۔

قَالَ قَدْ وَقَعَ عَلَيْكُمْ مِّنْ رَّبِّكُمْ رِجْسٌ وَّغَضَبٌ ؕ اَتُجَادِلُوْنَنِيْ فِيْۤ اَسْمَآءٍ سَمَّيْتُمُوْهَاۤ اَنْتُمْ وَاٰبَآؤُكُمْ مَّا نَزَّلَ اللّٰهُ بِهَا مِنْ سُلْطٰنٍ ؕ فَانْتَظِرُوْۤا اِنِّيْ مَعَكُمْ مِّنَ الْمُنْتَظِرِيْنَ ۝

(ہودؑ نے) کہا بس اب تم پر تمہارے رب کی طرف سے عذاب اور غضب آ ہی پہنچا ہے کیا تم مجھ سے ایسے (فرضی معبودوں کے) ناموں کے باب میں جھگڑتے ہو جو تم نے اور تمہارے باپ دادا نے (خود ہی) رکھ لئے ہیں اللہ نے ان کی (صداقت و حقانیت کی) کوئی دلیل نہیں اتاری سو تم منتظر رہو میں بھی تمہارے ساتھ (انتظار کر رہا ہوں)۔ قَدْ وَقَعَ یعنی عذاب واجب ہو چکا یا استحقاق عذاب ہو چکا عنقریب آنے والا ہے گویا آ ہی گیا۔ مستقبل میں یقینی ہونے والے فعل کی تعبیر ماضی سے کی جاتی ہے۔

رِجْسٌ عذاب یہ لفظ ارتجاس سے نکلا ہے جس کا معنی ہے اضطراب۔ بعض اہل لغت کے نزدیک رجس کا معنی نجاست کے آتا ہے اصل لفظ رجز ہے س میں ز سے بدلی گئی ہے۔ رجس اور رجز کا معنی ہے عذاب۔ غَضَبٌ غضب یعنی انتقام کا ارادہ۔ اسماء یعنی وہ بت جن کے نام رکھ لئے ہیں گویا اسم سے مراد مسمّٰی ہے۔ اسماء سے مراد ایسے نام ہیں جن کے مسمّٰی محض فرضی اور بے حقیقت ہیں جیسے یونانی فلاسفہ نے عقول عشرہ (دس عقلیں) کا وجود مان رکھا ہے اور مجوسی جیسے نام خود گھڑ لئے ہیں اور ان کا خیال ہے کہ یہ فرضی ہستیاں ان بتوں کے اندر حلول کئے ہوئے ہیں۔

سُلْطٰنٍ دلیل اور برہان جو ان کا معبود ہونا یا مستحق عبادت ہونا ثابت کر رہی ہو۔ اس قول کی بنیاد یہ ہے کہ وہ اللہ کو آسمان و زمین کا خالق تو مانتے تھے مگر الوہیت اور خالقیت یا استحقاق عبادت میں دوسروں کو بھی شریک سمجھتے تھے کیونکہ ان کے خیال میں بعض مخلوق اللہ سے ان کی سفارش کرنے والی تھی لہٰذا وہ بھی مستحق قرار پاتی تھی۔ حضرت ہودؑ نے اس پر فرمایا تمہارے اس دعوے کی کوئی عقلی نقلی دلیل اللہ کی طرف سے نہیں یہ سب تمہاری اور تمہارے باپ دادا کی من گھڑت ہے بس جس عذاب کی میں نے تم کو دھمکی دی ہے اور جس کے آنے کی تم درخواست کر رہے ہو اس کے منتظر رہو۔

فَاَنْجَيْنٰهُ وَالَّذِيْنَ مَعَهٗ بِرَحْمَةٍ مِّنَّا وَقَطَعْنَا دَابِرَ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا وَمَا كَانُوْا مُؤْمِنِيْنَ ۝

(غرض (عذاب آیا) اور ہم نے ہودؑ کو اور ان کے ساتھیوں کو اپنی رحمت سے (عذاب سے) بچا لیا اور ان لوگوں کی جڑ کاٹ دی جنہوں نے ہماری آیتوں کو جھٹلایا تھا اور ایمان دار نہ تھے)۔

دَابِر جڑ یا پیچھے آنے والی (نسل) جڑ کاٹ دینے سے مراد ہے بیخ و بن سے اکھیڑ پھینکنا اور سب کو ہلاک کر دینا کہ کوئی بھی باقی نہ رہا۔ وَمَا كَانُوْا مُؤْمِنِيْنَ اس سے در پردہ ان لوگوں کی حالت کا بیان ہو گیا جو ایمان لے آئے تھے اور اس بات پر تنبیہ بھی ہو گئی کہ ایمان ہی نجات و ہلاکت کے درمیان فارق تھا (مومن کو بچا لیا گیا اور غیر مومن کو ہلاک کر دیا گیا)۔

قوم عاد کا قصہ

محمد بن اسحاق وغیرہ نے لکھا ہے کہ احقاف یعنی عمان و حضرموت کے درمیان ریگستان میں قوم عاد رہتی تھی۔ اللہ نے اس کو ڈیل ڈول اور جسمانی طاقت بہت زیادہ عطا فرمائی تھی لیکن انہوں نے عدد اور طاقت سے ملک میں تباہی پھیلا رکھی تھی اور چاروں طرف کے لوگوں کو روند ڈالا تھا۔ یہ لوگ بتوں کی پوجا کرتے تھے ان کے تین بت تھے صداء، صمود، ہباء۔ اللہ نے ان کے ایک درمیانی خاندان کے ایک شخص ہودؑ کو ہدایت کے لئے مبعوث فرمایا۔ حضرت ہودؑ اگرچہ متوسط النسب تھے مگر اخلاق و فضائل ذاتی میں سب سے برتر تھے۔ حضرت ہودؑ نے قوم کو توحید کی دعوت دی اور حکم دیا کہ کسی پر ظلم نہ کرو اس سے زیادہ اور کسی بات کا حکم نہیں دیا۔ قوم نے آپ کی تکذیب کی اور بولے ہم سے زیادہ طاقتور کون ہے۔ ان لوگوں نے عظیم الشان عمارتیں اور کارخانے بنائے تھے اور جابرانہ اقتدار پر قبضہ کر رکھا تھا۔ اس سرکشی کی پاداش میں اللہ نے تین برس تک ان سے بارش روک لی جس کی وجہ سے لوگ سخت دکھ اور بے چینی میں مبتلا ہو گئے۔ اس زمانہ کا دستور تھا کہ جب کوئی لاینحل مصیبت آتی تو (مشرک بھی) اللہ کی

طرف رجوع کرتے تھے اور کعبہ کو جا کر مسلم اور مشرک سب مختلف مذاہب لوگ حرم میں جمع ہو کر دعا کرتے تھے۔ مکہ میں اس زمانہ میں عمالقہ یعنی عملیق بن لاود بن سام بن نوح کی اولاد رہتی تھی جن کا سردار معاویہ بن بکر تھا۔ معاویہ کی ماں کلہدہ بنت الخیبر تھی۔ الخیبر قوم عاد ہی کا ایک فرد تھا گویا معاویہ بن بکر کی ننھیال قوم عاد میں تھی۔ اسی ناطہ سے قیل بن عنز اور نعیم بن ہزال بن ہزیل اور عقیل بن ضد بن عاد اکبر اور مرثد بن سعد بن عفیر (یہ شخص در پردہ مؤمن تھا) اور معاویہ بن بکر کا ماموں جلہمہ بن خیبر ہر ایک اپنے اپنے قبیلہ کے کچھ لوگوں کو لے کر مکہ کو چل دیا۔ پھر لقمان بن عاد اصغر بن عاد اکبر کو عاد والوں نے بھیج دیا، غرض مجموعی تعداد ستر ہو گئی سب لوگ مکہ پہنچ کر معاویہ بن بکر کے پاس ٹھہرے اور ایک مہینہ تک ٹھہرے رہے روز شرابیں پیتے اور معاویہ بن بکر کی دو خوش آواز گانے والی باندیاں جن کو جرادتین کہا جاتا تھا ان کو گانا سناتی تھیں۔ اس طرح دو مہینے گزر گئے۔ ایک مہینہ میں تو پہنچے ہی تھے اور ایک مہینہ قیام میں گزرا۔ معاویہ بن بکر نے کہا یہ لوگ آئے تو فریاد اور دعا کرنے کو غفلت میں پڑے ہوئے ہیں۔ وہاں میرے ننھیال والے تباہ ہو رہے ہیں لیکن کیا کیا جائے یہ مہمان ہیں ان کو نکالتے ہوئے مجھے شرم آتی ہے اگر میں ان سے کہتا ہوں کہ جس کام کے لئے آئے تھے اس کی تکمیل کے لئے جاؤ تو یہ خیال کریں گے کہ میں ان کی مہمانی سے تنگ آ گیا ہوں۔ ادھر لوگ بھوکے پیاسے مر رہے ہوں گے۔ اسی کشمکش میں تھا کہ اپنی باندیوں سے مشورہ طلب کیا باندیوں نے کہا آپ کچھ شعر کہہ دیں۔ ہم وہ شعر یاد کر کے ان کے سامنے گائیں گی۔ گانا سن کر ضرور ان میں حرکت پیدا ہو گی اور معلوم بھی نہ ہو گا کہ ان شعروں کا تصنیف کرنے والا کون ہے۔ معاویہ نے اس رائے کو پسند کیا اور حسب ذیل شعر کہے۔

"اے قیل اور تم اٹھو شاید اللہ بارش سے ہم کو سیراب فرما دے جس سے قوم عاد سیراب ہو ان لوگوں کی تو ایسی حالت ہو گئی ہے کہ سخت پیاس کی وجہ سے بات بھی نہیں کر سکتے نہ بوڑھے کی امید ہے نہ بچے کی۔ پہلے مرد اور عورتیں عافیت سے تھیں مگر اب عورتیں بھی سخت پیاسی ہو گئیں۔ قوم عاد کو کھانے کے لئے علی الاعلان درندے گشت کر رہے ہیں اور کسی عادوالے کے تیروں کا ان کو اندیشہ نہیں اور تم لوگ یہاں حرے میں سارے دن رات گزار رہے ہو اے وفد والو تمہارا برا ہو تم کو سلامتی اور خوش آمدید نصیب نہ ہو۔"

باندیوں نے یہ اشعار گائے تو وفد والے آپس میں کہنے لگے تم کو قوم نے آئی ہوئی مصیبت کو ٹالنے کی دعا کرنے بھیجا تھا اور تم نے یہاں تاخیر کر دی۔ اب حرم میں چلو اور قوم کے لئے بارش کی دعا کرو۔ مرثد بن مسعود بن عفیر جو در پردہ مؤمن ہو گیا تھا بولا خدا کی قسم تمہاری دعاؤں سے بارش نہیں ہو گی ہاں اگر اپنے نبی کا حکم مانو گے اور اپنے رب سے توبہ کرو گے تو بارش ہو گی۔ اس وقت مرثد نے اپنا اسلام ظاہر کر دیا اور مندرجہ ذیل شعر کہے۔

"عاد نے اپنے پیغمبر کی نافرمانی کی جس کی وجہ سے پیاسے ہو گئے آسمان ان پر ایک قطرہ نہیں برساتا ان کا ایک بت ہے جس کو صمود کہا جاتا ہے اور اس کے سامنے صداء اور ہبا بھی ہیں۔ اللہ نے رسول کے ذریعہ سے ہم کو راہ ہدایت دکھائی ہم نے سیدھا راستہ دیکھ لیا اور نابینائی جاتی رہی تو معبود ہود کا ہے وہی میرا معبود ہے اللہ ہی پر بھروسہ ہے اور اسی سے آس ہے۔"

اہل وفد نے معاویہ بن بکر سے کہا مرثد کو روک لو یہ ہمارے ساتھ مکہ کو نہ جائے۔ لیکن مرثد بن سعد معاویہ کے گھر سے نکل گیا اور وفد والوں کو دعا کرنے سے پہلے ہی جا پکڑا۔ جس مصیبت کو دور کرنے کی دعا کرنے کے لئے نکلے تھے اگر دعا کر چکتے تو اس سے سنگین مصیبت میں سب گرفتار ہو جاتے۔ مگر دعا کرنے سے پہلے ہی مرثد آ پہنچا۔ ادھر اہل وفد دعا کرنے کو کھڑے ہوئے اور ادھر مرثد نے علیحدہ دعا کرنی شروع کی۔ اے اللہ تعالیٰ میرا سوال میرے لئے پورا کر دے اور وفد والے جو دعا کر رہے ہیں اس میں مجھے شامل نہ فرما۔ قیل بن عنز وفد کا سردار تھا اس لئے وفد والوں نے دعا کی اے اللہ قیل کی دعا قبول فرما اور ہماری درخواست کو اس کی دعا کے ساتھ شامل کر دے۔ اس دعا کے وقت لقمان بن عاد جو قوم عاد کا ایک سردار تھا الگ رہا جب وفد والے دعا کر چکے

تو لقمان نے دعا کی الٰہی میں تیرے سامنے تنہا اپنی گزارش لے کر آیا ہوں میری دعا قبول فرما۔ یہ کہہ کر لقمان نے اپنے لئے درازیٔ عمر کی دعا کی چنانچہ اس کی عمر سات گدھوں کی برابر ہوئی۔ قیل بن عنز نے دعا کی تھی الٰہی اگر ہود سچے ہیں تو ہم کو سیراب فرما ہم مرے جا رہے ہیں۔ دعا کے نتیجہ میں اللہ نے تین رنگ کے بادل نمودار فرمائے سفید، سرخ، سیاہ اور ابر میں سے ایک منادی نے ندا دی۔ اے قیل اپنے اور اپنی قوم کے لئے ان بادلوں میں سے ایک کا انتخاب کر لے۔ قیل نے کہا میں کالے بادل کا انتخاب کرتا ہوں، کالی گھٹا سے خوب بارش ہوتی ہے۔

منادی نے ندا دی تو نے راکھ لے لی، قوم عاد میں سے کوئی باقی نہیں رہے گا۔ اس کے بعد وہ کالا بادل جس کا انتخاب قیل نے کیا تھا اپنے سارے عذاب کو لے کر عاد کی طرف روانہ ہو گیا اور قوم کی بستیوں پر پہنچ کر کالی گھٹا بن گیا لوگ دیکھ کر بہت خوش ہوئے اور کہنے لگے اس ابر سے ہم پر ضرور بارش ہوگی۔ اللہ نے ان کے جواب میں فرمایا نہیں بلکہ یہ وہ عذاب ہے جس کے جلد آ جانے کے تم خواستگار تھے یہ ایک آندھی ہے جس کے اندر دردناک عذاب ہے۔ یہ آندھی اپنے رب کے حکم سے ہر چیز کو تباہ کر دے گی۔ بادل کے اندر سب سے پہلے ایک عورت کو جس کا نام مہدد تھا تباہ کن طوفان دکھائی دیا اور طوفان کو دیکھ کر وہ بیہوش ہو گئی کچھ دیر کے بعد ہوش میں آئی اور لوگوں نے پوچھا تجھے کیا نظر آیا تو کہنے لگی میں نے آگ کے شعلوں کی طرح ایک ایک آندھی دیکھی جس کو کچھ لوگ (جانور کی طرح) کھینچ کر لا رہے تھے اللہ نے یہ طوفان قوم عاد پر سات رات اور آٹھ دن مسلط رکھا جس نے ہر چیز کو تباہ کر دیا۔ قوم عاد میں سے کوئی زندہ نہ بچا البتہ حضرت ہود اور آپ کے مومن ساتھی ایک باڑہ بنا کر اس کے اندر بیٹھ کر امن سے رہے۔ طوفانی ہوا اندر آئی تو نرم ہوا بن کر بدن پر لگتی اور یہ نشاط نفس کا سبب بن جاتی تھی اور عادی ہوئی تو بستیوں کو لگتی تو اٹھا کر اوپر لے جاتی اور کہیں پتھروں سے جا پٹکتی تھی۔ دعا کرنے کے بعد مکہ سے لوٹ کر عاد کا وفد پھر معاویہ بن بکر کے پاس جا کر ٹھہر گیا۔ عاد کی مصیبت کو تیسرا روز تھا کہ ایک اونٹنی سوار چاندنی رات میں وفد کے پاس آ پہنچا اور واقعہ کی اطلاع دی۔ اہل وفد نے پوچھا جب تم روانہ ہوئے تھے تو ہود اور ان کے ساتھی کہاں تھے مخبر نے کہا میں نے ان کو سمندر کے ساحل پر چھوڑا تھا اور لوگوں کو اس کے بیان میں شک ہوا لیکن ہزیلہ بنت بکر نے کہا رب کعبہ کی قسم اس نے سچ کہا ہے۔

اہل روایت نے لکھا ہے کہ مرثد بن سعد لقمان بن عاد اور قیل بن عنز کی دعائیں مکہ میں قبول ہو گئی تھیں اور ان سے کہہ دیا گیا تھا کہ تمہاری درخواستیں منظور ہیں تم اپنے لئے سوائے موت کا انتخاب کر لو، ہاں موت ضرور آئے گی دوامی زندگی حاصل ہونے کا کوئی راستہ نہیں۔ چنانچہ مرثد نے دعا کی الٰہی مجھے سچائی اور نیکی عطا کر، اس کی دعا قبول ہو گئی۔ لقمان نے دعا کی الٰہی مجھے عمر عطا کر دریافت کیا گیا کتنی؟ پسند کرو۔ لقمان نے سات گدھوں کی عمر پسند کی، دعا قبول ہوئی۔ لقمان نے یہ دستور بنا لیا کہ گدھ کا بچہ انڈے سے نکلا ہوا پکڑ لیتا تھا اور اس کو اپنے پاس رکھتا تھا جب اپنی عمر پوری کر کے مر جاتا تو دوسرا بچہ پکڑ لیتا تھا اس طرح سات بچے اس نے ایک کے بعد ایک پکڑ کر پالے، ہر گدھ کی عمر اسی سال ہوئی آخری گدھ لبد تھا جب لبد بھی مر گیا تو لقمان کا بھی اس کے ساتھ انتقال ہو گیا۔ قیل نے کہا جو حال میری قوم کا ہو وہی میرا ہو۔ ندا آئی ان کے لئے تو ہلاکت مقدر ہے۔ قیل نے کہا مجھے پرواہ نہیں ان کے بعد زندہ رہنے کی ضرورت نہیں چنانچہ جو عذاب قوم پر آیا تھا وہی اس پر آیا اور یہ بھی ہلاک ہو گیا۔

سدی کا بیان ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان پر بغیر بارش کا ایک طوفان مسلط کیا تھا۔ جب انہوں نے دیکھا کہ اونٹوں کو ان کے بار سمیت طوفان اٹھا کر آسمان اور زمین کے درمیان لے جا رہا ہے تو بھاگ کر گھروں میں گھس گئے اور دروازے بند کر لئے مگر طوفان نے وہاں بھی نہ چھوڑا اور دروازے اکھاڑ کر اندر گھس کر سب کو ہلاک کر دیا اور لاشوں کو باہر لا کر پھینک دیا۔ اس کے بعد اللہ نے سیاہ رنگ کے پرندے بھیجے انہوں نے لاشوں کو اٹھا کر سمندر میں جا پھینکا۔ ایک روایت میں آیا ہے کہ طوفان نے ان پر ریت پاٹ دیا۔ سات رات اور آٹھ دن وہ ریت میں دبے رہے ریت کے اندر سے ان کے کراہنے کی آواز آتی تھی۔ پھر ہوا نے ان کے اوپر سے ریت اڑا دیا اور اٹھا کر ان کو سمندر میں جا ڈالا۔ بیشک ہوا ایک خاص اندازے سے چلتی ہے مگر اس روز اس کی رفتار کا کوئی اندازہ نہیں ہو سکا اندازہ کرنے والے بھی اندازہ کرنے سے عاجز ہو گئے۔

وَاِلٰی ثَمُوْدَ اَخَاهُمْ صٰلِحًا (اور ہم نے ثمود کی طرف ان کے (نسبی) برادر صالح کو بھیجا)۔ دینی بھائی مراد نہیں ہے۔ ثمود بن عاثر بن ارم بن سام کی اولاد تھی ثمود کے نام سے موسوم ہے۔ پانی کی کمی کی وجہ سے اس قبیلہ کا نام ثمود ہوا کیونکہ ثمد الماء کا معنی ہے پانی کم ہو گیا۔ ثمود کی بستیاں حجاز اور شام کے درمیان حجر میں وادی قریٰ تک تھیں۔ حضرت صالح عبید بن آسف بن ماسخ بن عبید بن حاذر بن ثمود کے بیٹے تھے۔

قَالَ یٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَیْرُهٗ (صالح نے کہا اے میری قوم (تم) اللہ کو پوجو اس کے سوا تمہارا کوئی معبود نہیں ہے)۔

قَدْ جَآءَتْكُمْ بَیِّنَةٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ هٰذِهٖ نَاقَةُ اللّٰهِ لَكُمْ اٰیَةً فَذَرُوْهَا تَاْكُلْ فِیْۤ اَرْضِ اللّٰهِ وَلَا تَمَسُّوْهَا بِسُوْٓءٍ فَیَاْخُذَكُمْ عَذَابٌ اَلِیْمٌ۝ تمہارے پاس تمہارے رب کی طرف سے ایک واضح دلیل آچکی ہے۔ یہ اونٹنی ہے اللہ کی جو تمہارے لئے دلیل ہے سو اس کو چھوڑ دو کہ اللہ کی زمین میں کھاتی پھرا کرے اس کو برائی کے ساتھ ہاتھ بھی نہ لگانا کبھی تم کو دردناک عذاب آپکڑے۔ بینة واضح دلیل جو معجزہ ہونے کی وجہ سے سچائی پر دلالت کر رہی ہے۔ هٰذِهٖ نَاقَةُ اللّٰهِ جملہ استینافیہ ہے۔ نَاقَةُ اللّٰهِ میں اضافت اونٹنی کی عظمت کو ظاہر کر رہی ہے یا اللہ کی اونٹنی ہونے کا یہ معنی ہے کہ بغیر معمولی اسباب اور مقررہ ذرائع کے براہ راست اللہ نے اس کو پیدا کیا ہے اسی بناء پر وہ اللہ کی قدرت کی خاص نشانی ہے۔ اٰیَةً حال ہے۔ تَاْكُلْ فِیْۤ اَرْضِ اللّٰهِ (مفعول محذوف ہے) یعنی اللہ کی زمین میں چارہ کھاتی رہے۔ لَا تَمَسُّوْهَا بِسُوْٓءٍ کسی قسم کا دکھ پہنچانے کے لئے ہاتھ لگانا ضروری ہے اور جب برائی کے ساتھ چھونے کی ممانعت کر دی تو ہر قسم کا دکھ دینے کی بدرجۂ اولیٰ ممانعت ہو گئی۔ فَیَاْخُذَكُمْ نہی کا جواب ہے (ورنہ تم کو آپکڑے گا)۔

وَاذْكُرُوْۤا اِذْ جَعَلَكُمْ خُلَفَآءَ مِنْۢ بَعْدِ عَادٍ وَّبَوَّاَكُمْ فِی الْاَرْضِ تَتَّخِذُوْنَ مِنْ سُهُوْلِهَا قُصُوْرًا وَّتَنْحِتُوْنَ الْجِبَالَ بُیُوْتًا فَاذْكُرُوْۤا اٰلَآءَ اللّٰهِ وَلَا تَعْثَوْا فِی الْاَرْضِ مُفْسِدِیْنَ۝

(اور تم یہ حالت یاد کرو کہ اللہ نے تم کو عاد کے بعد آباد کیا اور تم کو زمین پر رہنے کو ٹھکانا دیا کہ نرم زمین پر محل بناتے ہو اور پہاڑوں کو تراش تراش کر ان میں گھر بناتے ہو، سو اللہ کے ان احسانوں کو یاد کرو اور زمین میں تباہی پھیلاتے مت پھرو)۔

بَوَّاَكُمْ تم کو جگہ دی، تم کو بسایا۔ فِی الْاَرْضِ یعنی حجر کی سرزمین میں۔ تَتَّخِذُوْنَ تم بناتے ہو، تعمیر کرتے ہو۔ مِنْ سُهُوْلِهَا یعنی میدانی زمین میں (مِنْ بمعنی فی ہے) یا نرم زمین سے یعنی نرم زمین کی اینٹیں کچی یا پکی بنا کر۔ تَنْحِتُوْنَ پہاڑوں کے اندر سوراخ اور غار بناتے ہو۔ بُیُوْتًا مفعول بہ ہو جائے گا یا بُیُوْتًا حال مقدرہ ہے جیسے خطت هذا الثوب قمیصا۔ قوم ثمود والے گرمی کے زمانہ میں مٹی (کچی پکی اینٹوں) کے مکانوں میں رہتے تھے اور سردی میں پہاڑوں کے اندر غار کھود کر ان کو کمروں کی طرح بنا کر رہتے تھے۔ وَلَا تَعْثَوْا عثو (مصدر) سخت ترین فساد۔

قَالَ الْمَلَاُ الَّذِیْنَ اسْتَكْبَرُوْا مِنْ قَوْمِهٖ لِلَّذِیْنَ اسْتُضْعِفُوْا لِمَنْ اٰمَنَ مِنْهُمْ اَتَعْلَمُوْنَ اَنَّ صٰلِحًا مُّرْسَلٌ مِّنْ رَّبِّهٖ قَالُوْۤا اِنَّا بِمَاۤ اُرْسِلَ بِهٖ مُؤْمِنُوْنَ۝ قَالَ الَّذِیْنَ اسْتَكْبَرُوْۤا اِنَّا بِالَّذِیْۤ اٰمَنْتُمْ بِهٖ كٰفِرُوْنَ۝

(صالح کی قوم میں جو متکبر سردار تھے انہوں نے غریب لوگوں میں سے ان لوگوں سے جو ایمان لے آئے تھے کہا کیا تم کو اس بات کا یقین ہے کہ صالح اپنے رب کے فرستادہ ہیں۔ غریب مومنوں نے کہا بے شک ہم تو اس پر پورا یقین رکھتے ہیں جو ان کو دے کر بھیجا گیا ہے۔ متکبر لوگ کہنے لگے تم کو جس بات کا یقین ہو گیا ہے ہم اس کے منکر ہیں)۔

الَّذِیْنَ اسْتَكْبَرُوْا سے بڑے سردار اور لیڈر مراد ہیں جو حضرت صالح پر ایمان لانے کو اپنی ذلت سمجھتے تھے اور اس سے ناک منہ چڑھاتے تھے۔ الَّذِیْنَ اسْتُضْعِفُوْا سے کمزور غریب طبقہ مراد ہے جن کو مغرور لوگ حقیر اور ضعیف سمجھتے تھے۔ لِمَنْ اٰمَنَ یا الَّذِیْنَ اسْتُضْعِفُوْا سے بدل کل ہے یعنی الَّذِیْنَ اسْتُضْعِفُوْا وہی مومن لوگ تھے یا بدل بعض ہے یا کمزور

غریبوں میں سے صرف مومنوں سے کہتے تھے۔ اَتَعْلَمُوْنَ اَنَّ صٰلِحًا یہ بات انہوں نے صرف استہزاء کے طور پر کہی تھی۔ قَالُوْٓا اِنَّا اس تفصیلی جواب کی ضرورت نہ تھی صرف ہاں کہہ دینا کافی تھا لیکن تفصیلی جواب دے کر اہل ایمان نے جتا دینا چاہتے تھے کہ صالح کی نبوت تو ایسی یقینی چیز ہے کہ کسی سمجھدار آدمی کو اس میں شک کرنا ہی نہ چاہئے۔ قَالَ الَّذِيْنَ اسْتَكْبَرُوْٓا یہ بطور مقابلہ مومنوں کے قول کی تردید ہے اُرْسِلَ بِهٖ کی جگہ اٰمَنْتُمْ بِهٖ کہنے سے اس بات پر تنبیہ تھی کہ جو تمہارا مسلمہ ہے وہ محض مفروضہ ہے جو واقع کے خلاف ہے۔

فَعَقَرُوا النَّاقَةَ وَعَتَوْا عَنْ اَمْرِ رَبِّهِمْ وَقَالُوْا يٰصٰلِحُ ائْتِنَا بِمَا تَعِدُنَآ اِنْ كُنْتَ مِنَ الْمُرْسَلِيْنَ ۝

(غرض انہوں نے اس اونٹنی کو مار ڈالا اور اپنے رب کے حکم سے سرکشی کی اور کہنے لگے اے صالح جس (عذاب) کی تو ہم کو دھمکی دیتا تھا اس کو ہم پر لے آ اگر تو پیغمبر ہے۔)

عَقَرُوْا یعنی انہوں نے قتل کر دیا۔ ازہری نے کہا عقر کا معنی ہے اونٹ کی کونچیں کاٹ دینا پھر اونٹ کو ذبح کرنے کو بھی کہا جانے لگا کیونکہ جو اونٹ بھاگ جاتا تھا اول اس کی کونچیں کاٹی جاتی تھیں پھر اس کو قتل کیا جاتا تھا (بغیر کونچ کاٹے وہ قابو میں نہ آتا تھا) قاموس میں ہے عقر زخمی کر دینا اور اونٹ یا گھوڑے کی ٹانگ کو مجروح کر دینا۔ صحاح میں ہے عقر الدار اصل مکان عقر الحوض حوض کی جڑ۔ اسی سے ہے عقرت النخل میں نے کھجور کا درخت جڑ سے کاٹ دیا۔ عقرت البعیر میں نے اونٹ کو نحر کر دیا۔

قتل کرنے والا اگرچہ صرف قدار بن سالف تھا لیکن چونکہ سب کی رضامندی سے یہ فعل ہوا تھا اس لئے قتل کی نسبت سب کی طرف کر دی۔ قدار ایک ٹھگنا نیلی آنکھوں والا سرخ رنگ کا آدمی تھا جیسے فرعون تھا۔ رسول اللہ ﷺ نے حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے فرمایا تھا گذشتہ لوگوں میں سب سے بڑا شقی صالح کی اونٹنی کو قتل کرنے والا تھا اور آنے والے لوگوں میں سب سے بڑا شقی تیرا قاتل ہوگا۔

عَتَوْا عتو کا معنی ہے باطل میں غلو کرنا حد سے زیادہ باطل میں گھس جانا۔ عَتٰی يَعْتُوْ عُتُوًّا مغرور ہو گیا۔ قاموس میں ہے عتوا عتوا عتیا (تینوں مصدر ہیں) غرور کرنا حد سے آگے بڑھ جانا۔ عَنْ اَمْرِ رَبِّهِمْ یعنی اپنے رب کے حکم کی تعمیل کرنے سے۔ حکم وہی تھا جو حضرت صالح ؑ نے ان کو پہنچایا تھا اور فرمایا تھا۔ فَذَرُوْهَا تَاْكُلْ الخ۔

فَاَخَذَتْهُمُ الرَّجْفَةُ فَاَصْبَحُوْا فِيْ دَارِهِمْ جٰثِمِيْنَ ۝ (پس زلزلہ نے ان کو آ پکڑا جس کی وجہ سے وہ اپنے گھر (بستی) میں اوندھے کے اوندھے پڑے رہ گئے۔)

الرَّجْفَةُ زلزلہ بھونچال۔ قوم ثمود کی ہلاکت ایک سخت چیخ (کڑک) اور زلزلے سے ہوئی تھی۔ دَارِهِمْ دار سے مراد ہے وطن۔ بعض کے نزدیک ان کی سرزمین اور ان کی بستی مراد ہے (یعنی مکان مراد نہیں ہے) اسی لئے دار بصیغہ مفرد ذکر کیا ہے (اگر مکان اور گھر مراد ہوتا تو دیار یا دور بصیغہ جمع ذکر کیا جاتا) جٰثِمِيْنَ بے جان مردے۔ قاموس میں ہے جثم الانسان والطیر والابل انسان پرندہ اور اونٹ اپنی جگہ چمٹ کے رہ گیا اپنی جگہ سے ہٹ نہ سکا۔ بعض کے نزدیک جٰثِمِيْنَ سے مراد یہ ہے کہ بیٹھے کے بیٹھے رہ گئے جیسے بیٹھے تھے ویسے ہی مرے رہ گئے۔ الناس جثم کا معنی یہ ہے کہ لوگ بیٹھے ہیں جن میں کوئی حرکت نہیں نہ کوئی بات کرتا ہے۔ بعض نے کہا سب مردہ ہو کر منہ کے بل گر پڑے۔

فَتَوَلّٰى عَنْهُمْ وَقَالَ يٰقَوْمِ لَقَدْ اَبْلَغْتُكُمْ رِسَالَةَ رَبِّيْ وَنَصَحْتُ لَكُمْ وَلٰكِنْ لَّا تُحِبُّوْنَ النّٰصِحِيْنَ ۝

(اس وقت صالح ان سے منہ موڑ کر چلے اور کہا اے میری قوم میں نے تو تم کو اپنے رب کا حکم پہنچا دیا تھا اور تمہاری خیر خواہی کی تھی لیکن تم خیر خواہوں کو پسند نہیں کرتے تھے۔)

ایک شبہ

زلزلہ سے ساری قوم ہلاک ہو چکی تو پھر ان مردوں کو حضرت صالحؑ نے کس طرح مخاطب بنایا اور لَقَدْ اَبْلَغْتُكُمْ الخ کس سے فرمایا۔

ازالہ

مردوں سے خطاب رسول اللہ ﷺ نے بھی کیا تھا۔ بدر کے مقتولین کو جب ایک گڑھے میں ڈال دیا گیا تو رسول اللہ ﷺ نے (نام لے لے کر) ان کو مخاطب بنایا۔ صحیحین میں حضرت ابو طلحہؓ کی روایت سے آیا ہے کہ بدر کے تیسرے دن رسول اللہ ﷺ نے اونٹنی کسوانے کا حکم دیا، اونٹنی پر پالان باندھ دیا گیا۔ پھر آپ صحابہؓ کو لے کر پیدل چل دیئے۔ صحابہؓ کو خیال ہوا کہ کسی ضروری کام سے کہیں تشریف لئے جا رہے ہیں لیکن آپ جا کر اس کنویں کے کنارے کھڑے ہو گئے (جس کے اندر مقتولین کی لاشیں پھینک دی گئی تھیں) اور پکارنے لگے اے ابوجہل بن ہشام، اے امیہ بن خلف، اے عتبہ بن ربیعہ، اے شیبہ بن ربیعہ کیا تمہارے لئے اس وقت یہ امر باعث مسرت ہوتا کہ کاش تم نے اللہ اور اس کے رسول کا حکم مان لیا ہوتا، اللہ اور اس کے رسول نے جس چیز کی تم کو وعید کی تھی کیا تم نے اس کو صحیح پالیا۔ میں نے تو اس وعدہ کو حق پایا جو اللہ نے مجھ سے کیا تھا۔ تم اپنے نبی کے بدترین قبیلہ ہو تم نے میری تکذیب کی اور دوسرے لوگوں نے مجھے سچا جانا تم مجھ سے لڑے اور دوسرے لوگوں نے میری مدد کی۔ اے گروہ شر تم کو اللہ نے میری طرف سے سزا دے دی۔ میں امین تھا تم نے مجھے خائن قرار دیا، میں سچا تھا تم نے مجھے جھوٹا کہا۔ حضرت عمرؓ نے عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ کیا تین روز کے بعد آپ ان کو پکار رہے ہیں یہ بے جان لاشیں ہیں آپ کس طرح کلام فرما رہے ہیں۔ فرمایا تم میری بات کو ان سے زیادہ نہیں سن رہے ہو جو کچھ میں ان سے کہہ رہا ہوں اس وقت یہ سن رہے ہیں لیکن لوٹا کر جواب نہیں دے سکتے۔ بعض علماء کا قول ہے کہ حضرت صالحؑ نے مردوں کو خطاب اس لئے کیا کہ آنے والے لوگوں کو عبرت ہو۔ بعض کا قول ہے کہ آیت میں تقدیم و تاخیر ہے (جو واقعہ پہلے ہوا ترتیب عبارت میں اس کو پیچھے ذکر کیا ہے اور جو واقعہ پیچھے ہوا ترتیب عبارت میں اس کو پہلے ذکر کر دیا) اصل کلام اس طرح تھا فَتَوَلّٰى عَنْهُمْ وَقَالَ يٰقَوْمِ لَقَدْ اَبْلَغْتُكُمْ رِسَالَةَ رَبِّيْ وَنَصَحْتُ لَكُمْ وَلٰكِنْ لَّا تُحِبُّوْنَ النّٰصِحِيْنَ فَاَخَذَتْهُمُ الرَّجْفَةُ فَاَصْبَحُوْا فِيْ دَارِهِمْ جٰثِمِيْنَ۔

قصہ ثمود

محمد بن اسحاق، وہب بن منبہ، ابن جریر اور حاکم نے اسناد کے ساتھ حضرت عمرو بن خارجہؓ کی روایت سے بیان کیا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جب قوم عاد تباہ کر دی گئی تو ثمود ان کی بستیوں میں بس گئے اور ان کے جانشین ہو گئے یہ خوب پھلے پھولے، انہوں نے لمبی لمبی عمریں پائیں، یہ لوگ مٹی (کچی پکی اینٹوں) کے مکان بناتے تھے، مکان گر جاتے تھے مگر بنانے والا زندہ رہتا تھا مجبور ہو کر انہوں نے پہاڑوں کو تراش تراش کر غاروں کے اندر مکان بنا لئے، معاش کی طرف سے یہ لوگ بڑی کشائش میں تھے آخر ملک میں انہوں نے تباہی پھیلائی اور اللہ کے سوا دوسروں کو پوجنے لگے۔ اللہ نے ان کی ہدایت کے لئے صالحؑ کو پیغمبر بنا کر بھیجا یہ لوگ خالص عرب تھے اور صالحؑ نسبی لحاظ سے متوسط درجہ کے تھے، مگر اخلاق فاضلہ کے لحاظ سے سب سے برتر تھے۔ صالحؑ ابتداء رسالت کے وقت نوجوان تھے اور قوم کو اللہ کی طرف بلاتے بلاتے سفید مو ہو گئے مگر سوائے قلیل آدمیوں کے کسی نے آپ کی پیروی نہیں کی اور قلیل بھی وہ تھے جن کو کمزور سمجھا جاتا تھا (یعنی غریب تھے) صالحؑ برابر سمجھاتے رہے اور تبلیغ کرتے رہے اور اللہ کے عذاب سے بہت زیادہ ڈراتے اور خوف دلاتے رہے۔ آخر قوم والوں نے کہا کوئی ایسی نشانی دکھاؤ جس سے تمہارے قول کی سچائی ثابت ہو۔ حضرت صالحؑ نے فرمایا کونسی نشانی چاہتے ہو۔ قوم والوں نے کہا کل تم ہمارے ساتھ ہمارے تہوار کے میلے میں چلو یہ تہواری میلہ سال میں ایک معین دن ہوتا تھا جہاں لوگ اپنے بتوں کو لے کر جاتے تھے پھر تم اپنے معبود سے دعا کرو اور ہم اپنے معبودوں سے دعائیں کریں اگر تمہاری دعا قبول ہو گئی تو ہم تمہارے ساتھ ہو جائیں گے اور اگر

ہماری دعا قبول ہو گئی تو تم ہمارے ساتھ ہو جانا۔ حضرت صالحؑ نے فرمایا بہت اچھا۔ چنانچہ قوم والے میلہ کو بت لے کر گئے اور صالحؑ بھی ان کے ساتھ گئے قوم والوں نے بتوں سے دعائیں کیں کہ صالحؑ کی دعا قبول نہ ہو۔ پھر جندع بن عمرو بن جواس نے جو ثمود کا سردار تھا، حضرت صالحؑ سے کہا یہ پتھر جو حجر کے ایک گوشہ میں الگ تھلگ پڑا ہے جس کو کاثبہ کہا جاتا ہے اس کے اندر سے بختی اونٹ کی شکل کی ایک بڑے پیٹ والی دس ماہہ گابھن خوب بالوں سے بھرپور اونٹنی برآمد کر دو اگر ایسا کر دو گے تو ہم تم کو سچا مان لیں گے اور تم پر ایمان لے آئیں گے۔ حضرت صالحؑ نے ان سے ایمان کا پختہ وعدہ لے لیا تو کھڑے ہو کر دو رکعت نماز پڑھی اور پھر اللہ سے دعا کی۔ یکایک پتھر میں سے ایک ایسی آواز نکلنے لگی جیسی پیدائش کے وقت بچہ والی اونٹنی کی نکلتی ہے پھر اس ٹیلے سے وہی آواز نکلنے لگی یکدم پتھر شق ہو گیا اور اس کے اندر سے فرمائش کے مطابق اونٹنی برآمد ہو گئی اس کے دونوں پہلوؤں کی درمیانی چوڑائی بہت زیادہ تھی پھر اس کے پیٹ سے اسی کی طرح ایک بچہ پیدا ہوا۔ یہ دیکھ کر جندع بن عمرو اور اس کے قبیلہ کے کچھ لوگ مسلمان ہو گئے اور سرداران ثمود نے بھی ایمان لانے کا ارادہ کر لیا۔ لیکن ذواب بن عمرو بن لبید اور حباب مجاور اصنام اور رباب بن صعر کاہن نے ان کو منع کر دیا۔ یہ تینوں شخص ثمود کے سردار تھے۔ حضرت صالحؑ نے قوم والوں سے کہا ایک دن یہ اونٹنی پانی پئے گی اور ایک دن تمہارے جانوروں کو پانی کا نوبت ملے گا۔ اس کے بعد کچھ مدت تک اونٹنی اپنے بچہ کے ساتھ آزادانہ پھرتی اور کھیتوں کی چٹان چرتی اور پانی پیتی رہی، مگر ایک دن ناغہ کر کے پانی پیتی تھی اور اس طرح پیتی تھی کہ کنوئیں میں سر ڈال کر سب پانی پی جاتی، ایک قطرہ بھی باقی نہ چھوڑتی تھی اور اس دوران میں ٹانگیں چیر کر کھڑی ہو جاتی تھی اور لوگ جتنا چاہتے اس کا دودھ دوہ لیتے، جتنا چاہا جاتا پیتے اور جتنے برتن تھے سب بھر کر رکھ لیتے تھے پھر اونٹنی بغیر ٹانگیں چیرے سے باہر نکل آتی۔ معاملہ یوں ہی چلتا رہا گرمی کے زمانے میں اونٹنی وادی کے اوپر آ جاتی اور اس کے خوف سے تمام مویشی، بکریاں، گائے اور اونٹ بھاگ کر وادی کے اندر چلے جاتے اور سردی کے زمانہ میں اونٹنی وادی کے اندر اتر جاتی تو تمام جانور اوپر آ جاتے (اس طرح اونٹنی تو گرمی سردی کی تکلیف سے بچ جاتی اور) تمام جانور گرمی اور سردی کی طرف سے دکھی رہتے۔ اس سے مویشیوں کو نقصان پہنچا اور لوگوں کو یہ بات اتنی کھلی کہ وہ اللہ کے حکم سے سرکشی کرنے لگے اور اونٹنی کو قتل کر ڈالنے کے درپے ہو گئے۔ یہاں تک کہ اونٹنی کو مار ڈالنے پر متفق الرائے ہو گئے۔ قبائل ثمود میں دو عورتیں تھیں ایک کا نام صدوف اور دوسری کا نام عنیزہ تھا۔ عنیزہ کی کنیت ام غنم تھی یہ غنم بن مجلز کی بیٹی اور ذواب بن عمرو کی بیوی تھی اور بڑھیا سال خوردہ ہو گئی تھی اس کی متعدد خوبصورت بیٹیاں تھیں۔ ان کے پاس اونٹ گائے اور بکریاں بھی بہت تھیں بڑی مالدار تھی۔ صدوف محیا کی بیٹی تھی بڑی خوبصورت جوان تھی اس کے پاس بھی اونٹ گائے اور بکریاں بہت تھیں بڑی مالدار تھی۔ دونوں کو حضرت صالحؑ سے سخت عداوت تھی اور چونکہ اونٹنی سے ان کے جانوروں کو سخت ضرر پہنچتا تھا اس لئے اونٹنی کو قتل کرا دینے کی دونوں خواستگار تھیں۔ صدوف نے ایک ثمودی شخص کو جس کا نام حباب تھا آمادہ کیا اور کہا تو اگر اونٹنی کو قتل کر دے تو میں تیری ہو جاؤں گی حباب نے انکار کر دیا صدوف نے اپنے چچا کے بیٹے سے جس کا نام مصدع بن مہرج بن محیا تھا یہی کہا اور چونکہ صدوف بہت حسین اور بڑی مالدار تھی اس لئے مصدع نے صدوف کی درخواست منظور کر لی۔ ام غنم عنیزہ بنت غنم نے قدار بن سالف سے کہا اگر تو اونٹنی کو قتل کر دے تو پھر میری جس بیٹی کو چاہے لے لینا۔ قدار سرخ رنگ، نیلگوں چشم، پستہ قد آدمی تھا اہل روایت کا خیال ہے کہ وہ حرامی تھا، سالف کے بستر پر پیدا ہوا تھا۔ اس لئے اس کو قدار بن سالف کہا جاتا تھا۔ یہ شخص قوم میں باعزت اور طاقتور تھا۔ رسول اللہ ﷺ نے آیت اذ انبعث اشقاھا کی تفسیر کے ذیل میں فرمایا قدار ابو زمعہ کی طرح اپنی قوم میں باعزت صاحب عزم اور طاقتور تھا۔ رواہ البخاری من حدیث عبد اللہ بن زمعہ۔ غرض مصدع اور قدار تیار ہو گئے قبیلہ ثمود میں سے اپنی مدد کے لئے سات آدمی انہوں نے اور اپنے ساتھ لئے اور چل دئیے۔ قدار اونٹنی کی واپسی کی راہ میں ایک پتھر کی آڑ لے کر گھات لگا کر بیٹھ گیا اور مصدع دوسرے راستے میں جا چھپا، اونٹنی مصدع کی طرف سے گزری مصدع نے تیر مارا جس سے اونٹنی کی ٹانگ کا عضلہ چھد گیا اور ام غنم عنیزہ اپنی حسین ترین بیٹی کو لے کر قدار کے پاس آ پہنچی اور قدار کو بھڑکایا اور گھات کی جگہ سے اس کو اٹھا کر لے آئی۔ قدار نے آگے کی

اونٹنی پر تلوار کا وار کیا جس سے اس کی کونچ کٹ گئی اور اونٹنی بھاگی اور اپنے بچہ کو متنبہ کرنے کے لئے اس نے ایک چیخ ماری۔ قدار نے اس کے سینہ پر برچھا مارا اور اونٹنی کو قتل کر دیا پھر بستی والوں نے آ کر اس کا گوشت بانٹ لیا اور پکالیا۔ بچے نے ماں کی یہ حالت دیکھی تو بھاگ کر ایک محفوظ پہاڑ پر چلا گیا اس پہاڑ کا نام کسی نے صور لکھا ہے اور کسی نے قارہ۔ حضرت صالحؑ تشریف لائے تو بستی والوں نے کہا یا نبی اللہ ہمارا کوئی قصور نہیں فلاں شخص نے اونٹنی کو قتل کیا ہے۔ حضرت صالحؑ نے فرمایا بچہ کو تلاش کرو اگر وہ تم کو مل جائے تو ممکن ہے تم سے عذاب ٹل جائے۔ لوگ بچہ کی تلاش میں نکلے اور پہاڑ کے اوپر دیکھ کر پکڑنے کے لئے چڑھے مگر اللہ نے پہاڑ کو اتنا اونچا کر دیا کہ پرندے بھی اس کی چوٹی تک نہ پہنچ سکیں۔

روایت میں آیا ہے کہ بچہ نے حضرت صالحؑ کو دیکھا تو آنسوؤں سے رو دیا اور تین چیخیں ماریں پھر ایک پتھر پھٹا اور بچہ اس میں گھس گیا۔ حضرت نے فرمایا بچہ کی ہر چیخ تمہارے لئے ایک دن کی مہلت (کی طرف اشارہ) ہے صرف تین دن تک گھروں میں رہ سکتے ہو، یہ وعدہ عذاب غلط نہیں ہو سکتا۔

ابن اسحاق کی روایت میں آیا ہے کہ جو نو آدمی اونٹنی کو قتل کرنے کے لئے نکلے تھے ان میں سے چار شخص بچہ کو قتل کرنے نکلے ان میں مصدع بن مہرج اور اس کا بھائی ذواب بن مہرج بھی تھا۔ مصدع نے اس کے تیر مارا جس سے اس کا دل چھد گیا مصدع نے اس کو ٹانگ پکڑ کر کھینچا اور سب نے نیچے اتار کر ماں کی طرح اس کا گوشت بھی آپس میں بانٹ لیا۔ حضرت صالحؑ نے فرمایا تم لوگوں نے حرمت خداوندی کو توڑا اب اللہ کے عذاب اور انتقام کے لئے تیار ہو جاؤ۔ لوگوں نے آپ کی بات کا مذاق بنایا اور استہزاء کے طور پر کہنے لگے صالحؑ عذاب کب آئے گا اس کی علامت کیا ہوگی۔ ثمودیوں کی زبان میں اتوار کو اول، پیر کو اہون، منگل کو دبار، بدھ کو جبار، جمعرات کو مونس، جمعہ کو عروبہ اور سنیچر کو شیار کہتے تھے۔ بدھ کے روز انہوں نے اونٹنی کو قتل کیا تھا۔ حضرت صالحؑ نے جواب میں فرمایا جب مونس کی صبح ہوگی تو تمہارے چہرے زرد ہوں گے، عروبہ کی صبح کو اٹھو گے تو تمہارے چہرے سرخ ہوں گے اور شیار کی صبح کو تمہارے منہ کالے ہو جائیں گے پھر اول (اتوار) کے دن صبح کو تم پر عذاب آ جائے گا۔ یہ بات سن کر وہ نو آدمی جنہوں نے اونٹنی کو قتل کیا تھا آپس میں کہنے لگے آؤ صالحؑ کو ہی ختم کر دیں اگر یہ سچا ہے تو (عذاب آنے سے) پہلے ہی ہم اس کو قتل کر چکیں گے اور جھوٹا ہے تو اونٹنی کے پاس اس کو بھیج دیں گے۔ اس مشورہ کے بعد رات کو شب خون مارنے کے لئے حضرت صالحؑ کے مسکن پر پہنچے لیکن فرشتوں نے پتھر مار مار کر ان کو ذبح کر دیا۔ جب ان کے ساتھ والوں نے دیکھا کہ دیر ہو گئی اور وہ واپس نہیں لوٹے تو صالحؑ کے گھر پہنچے دیکھا کہ ان کے آدمی پتھروں سے کچلے پڑے ہیں۔ کہنے لگے صالحؑ تو نے ان کو قتل کیا ہے یہ سمجھ کر حضرت صالحؑ کو قتل کرنے کا ارادہ کیا لیکن دوسرے ساتھ والوں نے جو سنگین تھے ان سے کہا تم صالحؑ کو بھی قتل نہیں کر سکتے صالحؑ نے وعدہ کیا ہے کہ تین روز کے بعد تم پر عذاب آئے گا اگر یہ سچے ہیں تو ان کو قتل کرنے کا ارادہ کر کے تم اپنے رب کے غضب کو اور بڑھا رہے ہو اور اگر یہ جھوٹے ہیں تو جو کچھ تمہارا ارادہ ہے وہ اس کے بعد ہو جائے گا۔ یہ تقریر سن کر لوگ اس رات کو منتشر ہو گئے۔ پھر جمعرات کی صبح ہوئی تو ان کے چہرے زرد ہو گئے معلوم ہوتا تھا کہ چھوٹے بڑے عورت مرد ہر ایک کے چہرہ پر خلوف (ایک زرد خوشبو) مل دی گئی ہے۔ یہ علامت دیکھ کر ان کو عذاب کا یقین ہو گیا اور سمجھ گئے کہ صالحؑ نے سچی بات کہی تھی (پھر توبہ کرنے کے بجائے) حضرت صالحؑ کو قتل کرنے کے لئے تلاش کرنے لگے لیکن آپ بھاگ کر ثمود کے قبیلہ بنی غنم میں پہنچ کر قبیلہ کے سردار کے پاس جس کا نام نفیل تھا اور کنیت ابو ہدب تھی ٹھہرے تھے۔ یہ شخص مشرک ضرور تھا مگر اس نے آپ کو چھپا لیا اس لئے تلاش کرنے والوں کی دسترس سے آپ باہر رہے اور صبح کو حضرت صالحؑ کے مؤمن ساتھیوں کے پاس جا کر ان کو طرح طرح سے تکلیفیں دے کر صالحؑ کا پتہ پوچھنے لگے ایک شخص نے جس کا نام مبدع بن ہرم تھا حضرت سے دریافت کیا یا نبی اللہ یہ لوگ آپ کا پتہ بتانے کے لئے ہم کو اذیتیں دے رہے ہیں کیا ہم ان کو آپ کا پتہ نشان بتا دیں۔ آپ نے فرمایا ہاں تم کہہ دو کہ میرے پاس صالحؑ ہے مگر تم اس پر دسترس نہیں پا سکتے (اس شخص نے حسب اجازت کہہ دیا مگر) لوگ اس کو چھوڑ کر چل دیئے اور جس عذاب میں مبتلا تھے اس نے ان کو آگے

کچھ کرنے کا موقع ہی نہیں دیا بلکہ ایک دوسرے کو دیکھ کر اس کے چہرے کی زردی بتاتا تھا اس میں شام ہو گئی تو سب چیخ پڑے، میعاد مقررہ کا ایک دن گزر گیا جب دوسرے دن کی صبح ہوئی تو ان کے چہرے سرخ ہو گئے معلوم ہوتا تھا خون سے رنگے ہوئے ہیں یہ دیکھ کر چیخنے چلانے اور رونے لگے شام ہوئی تو چیخی میعاد کے دو دن گزر گئے اب عذاب آہی پہنچا تیسرے دن کی صبح ہوئی تو سب کے منہ کالے ہو گئے جیسے تارکول مل دیا گیا ہو، یہ دیکھ کر (مزید) روئے پیٹے شام ہوئی تو حضرت صالحؑ مسلمانوں کو اپنے ساتھ لے کر شام کی طرف چل دیئے اور فلسطین کے ایک ریگستان میں جا کر فروکش ہو گئے اتوار کی صبح ہوئی تو لوگوں نے کفن پہن لئے، مردوں کی خوشبو مل لی اور زمین پر پڑ گئے کبھی آسمان کی طرف دیکھتے تھے کبھی زمین کی طرف سمجھ نہ سکے کہ عذاب کدھر سے آئے گا جب خوب دن چڑھ گیا تو زلزلہ نے آدبوچا اور سب گھروں کے اندر پڑے کے پڑے رہ گئے۔ اور ایک ایسی زور کی چیخ آسمان کی طرف سے آئی جس میں ابر کی ہر کڑک اور زمین کی ہر تڑک سے زیادہ قوت تھی جس سے سب کے دل سینوں کے اندر پھٹ گئے اور ہر بچہ بڑا ہلاک ہو گیا صرف ایک اپاہج لڑکی بچ گئی جس کا نام ذریعہ بنت سلف تھا یہ کافر تھی اور حضرت صالحؑ سے اس کو سخت دشمنی تھی عذاب کو دیکھتے ہی اس کے پاؤں یکدم کھل گئے اور تیزی سے بھاگ کر یہ قرح یعنی وادی القری میں پہنچ گئی اور عذاب کی جو کیفیت اس نے دیکھی تھی وادی القری کے باشندوں سے بیان کر دی پھر پانی مانگا اور پانی پیتے ہی مر گئی۔

سدی نے قتل ناقہ کے سلسلہ میں بیان کیا ہے کہ اللہ نے حضرت صالحؑ کے پاس وحی بھیجی تیری قوم عنقریب اونٹنی کو قتل کر دے گی۔ حضرت نے قوم سے یہی بات کہہ دی قوم والوں نے کہا ہم ہرگز ایسا نہیں کر سکتے۔ حضرت صالحؑ نے فرمایا اس مہینہ میں ایک لڑکا پیدا ہو گا اور آئندہ وہ قتل کرے گا اور اسی کے سبب تمہاری ہلاکت ہو گی۔ کہنے لگے اس مہینہ میں ہمارا جو بچہ پیدا ہو گا ہم اس کو قتل کر دیں گے چنانچہ اس مہینہ میں دس لڑکے پیدا ہوئے تو نو کو تو انہوں نے قتل کر دیا ایک نیلی گوں چشم سرخ رنگ والا بچہ بچ گیا اور اس کا بڑھاؤ بہت تیزی سے ہوا مقتول بچوں کے باپ جب اس کو دیکھتے تو کہتے ہمارے بچے بھی اگر زندہ ہوتے تو ایسے ہی ہوتے یہ سوچ سوچ کر ان کو حضرت صالحؑ پر غصہ آیا کہ یہی شخص ہمارے بچوں کے قتل کا سبب ہے۔ پھر انہوں نے قسم کھا کر باہم معاہدہ کر لیا کہ ہم رات کو جا کر اس کو اور اس کے گھر والوں کو ضرور مار ڈالیں گے پھر مشورہ ہوا کہ ہم کو بستی سے نکل جانا چاہئے لوگ ہم کو جاتے دیکھ کر خیال کریں گے کہ ہم سفر کو جا رہے ہیں ہم باہر جا کر کسی غار میں چھپ جائیں گے اور صالحؑ جس وقت (رات کو) مسجد کو جائیں گے ہم آکر ان کو قتل کر دیں گے پھر لوٹ کر غار میں چلے جائیں گے پھر صبح کو گھروں کو واپس آجائیں گے اور کہیں گے ہم تو قتل کے وقت موجود بھی نہ تھے لوگ ہم کو سچا سمجھیں گے کیونکہ ان کا تو یہی خیال ہو گا کہ ہم سفر کو گئے ہوئے تھے۔

حضرت صالحؑ قوم کے ساتھ بستی میں نہیں سوتے تھے بلکہ اپنی مسجد میں۔ جس کو مسجد صالحؑ کہا جاتا تھا جا کر رات گزارتے تھے اور صبح کو آکر لوگوں کو وعظ و نصیحت کرتے تھے شام ہوتی تو پھر مسجد کو جا کر رات کو وہیں رہتے۔ غرض وہ لوگ جن کے بچے قتل ہوئے تھے بستی سے باہر جا کر ایک غار میں گھس گئے اور اللہ کے حکم سے غار ان پر گر پڑا اور سب مر گئے اسی کو اللہ نے فرمایا ہے وَمَكَرُوا مَكْرًا وَّمَكَرْنَا مَكْرًا وَّهُمْ لَا يَشْعُرُونَ۔

کچھ لوگ جو اس بات سے واقف تھے نکل کر گئے جا کر دیکھا کہ سب لوگ کچلے پڑے ہیں تو انہوں نے بستی میں آکر شور مچا دیا اللہ کے بندو! صالحؑ نے بچوں کے قتل پر ہی بس نہیں کیا بلکہ ان لوگوں کو بھی مار ڈالا۔ یہ سن کر بستی والے اونٹنی کو قتل کرنے پر متفق ہو گئے۔ ابن اسحاق نے کہا اونٹنی کو قتل کرنے کے بعد ان نو آدمیوں نے شبخون مار کر حضرت صالحؑ کو قتل کرنے کا معاہدہ کیا تھا یعنی قتل ناقہ کا واقعہ حضرت صالحؑ کو قتل کرنے کے معاہدہ سے پہلے ہو چکا تھا۔

سدی وغیرہ کا بیان ہے دسواں بچہ قدار جب قتل ہونے سے بچ گیا تو تیزی سے بڑھنے لگا ایک دن میں اتنا بڑھ جاتا جتنا دوسرے بچے ایک ہفتہ میں بڑھتے ہیں اور ایک ماہ میں اتنا بڑھ جاتا جتنا دوسرے بچے ایک سال میں بڑھتے ہیں جب بڑا ہو گیا تو لوگوں کے ساتھ ایک روز شراب پینے بیٹھا اور شراب بنانے کے لئے پانی کی ضرورت ہوئی اور چونکہ دو دن اونٹنی کے پانی پینے کا تھا

اس لئے پانی نہیں ملا یہ بات ان لوگوں کو بہت گراں گزری اور کہنے لگے ہم دودھ کا کیا کریں ہمیں تو اس پانی کی ضرورت ہے جو یہ اونٹنی پی جاتی ہے تاکہ مویشیوں کو پلائیں اور کھیتیاں سینچیں۔ قدار بولا کیا میں تمہارے لئے اس اونٹنی کو قتل کر دوں۔ کل مجلس نے کہا ہاں اچھا چنانچہ سب نے اونٹنی کو قتل کر دیا۔

عبداللہ بن دینار کے بچا کے بیٹے کی روایت سے بخاری نے صحیح میں بیان کیا ہے کہ غزوۂ تبوک میں جب رسول اللہ ﷺ حجر میں فروکش ہوئے تو حکم دیا لوگ یہاں کے کنویں کا پانی نہ پئیں نہ جانوروں کو پلائیں۔ لوگوں نے عرض کیا ہم نے تو اس پانی سے آٹا گوندھ لیا ہے اور پانی لے بھی لیا ہے فرمایا گوندھے ہوئے آٹے کو پھینک دو اور پانی کو بہادو۔

بغوی نے حضرت ابن عمرؓ کی روایت سے بیان کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے حکم دیا تھا کہ حجر کے کنویں سے لیا ہوا پانی بہادیں اور گوندھا ہوا آٹا اونٹوں کو کھلا دیں اور اس کنویں کا پانی لیں جس کا پانی اونٹنی پیتی تھی۔ بغوی نے لکھا ہے کہ ابو الزبیر نے حضرت جابرؓ کا قول نقل کیا کہ جب غزوۂ تبوک میں رسول اللہ ﷺ کا گزر حجر سے ہوا تو صحابہ کو حکم دیا تم میں سے کوئی اس (ویران) بستی میں نہ جائے نہ ان کا پانی پیو۔ ان عذاب یافتہ لوگوں کی طرف سے گزرو تو روتے ہوئے ڈرتے ڈرتے کہیں تم پر بھی وہی عذاب نہ آجائے جو ان پر آیا تھا۔ پھر فرمایا تم اپنے رسول سے معجزات نہ طلب کرو۔ یہ صالحؑ کی قوم تھی جس نے اپنے رسول سے معجزہ طلب کیا تھا تو اللہ نے ایک اونٹنی بر آمد کر دی جو اس پہاڑی راستہ سے پانی پر جاتی اور (پانی پی کر) اس راستے سے واپس آتی تھی اور اپنی باری کے دن ان کا (سارا) پانی پی جاتی تھی۔ ان لوگوں نے اپنے رب کے حکم سے سرتابی کی اور اونٹنی کو قتل کر دیا۔ نتیجہ میں اللہ نے ان سب لوگوں کو ہلاک کر دیا جو اس سرزمین میں مشرق سے لے کر مغرب تک آسمان کے خیمہ کے نیچے رہتے تھے صرف ایک آدمی بچا جس کو ابو رغال کہا جاتا تھا یہ اسی قبیلہ ثقیف کا مورث اعلیٰ تھا یہ اس وقت حرم کے اندر تھا اور حرم میں ہونے کی وجہ سے اللہ کے عذاب سے بچ گیا لیکن جب حرم سے باہر نکلا تو اس پر بھی وہی عذاب آیا جو دوسروں پر آیا تھا اور وہیں دفن ہو گیا دفن ہونے کے وقت اس کے پاس سونے کی ایک سلاخ بھی تھی جو اسی کے ساتھ زمین میں دب گئی۔ حضور ﷺ نے صحابہ کو ابو رغال کی قبر بھی دکھائی اور لوگوں نے تلواروں سے (کرید کر) زمین کھود کر سونے کی وہ ڈنڈی برآمد کرلی۔ قوم ثمود میں سے جو لوگ حضرت صالحؑ پر ایمان لائے تھے ان کی تعداد چار ہزار تھی۔ حضرت صالحؑ ان لوگوں کو لے کر حضرموت چلے گئے حضرموت میں پہنچ کر آپ کی وفات ہو گئی اسی لئے اس بستی کا نام حضرموت ہو گیا۔ پھر ان لوگوں نے ایک بستی بسائی جس کا نام حاصورا ہوا۔ بعض علماء روایت کا قول ہے کہ حضرت صالحؑ کی وفات مکہ میں ہوئی وفات کے وقت آپ کی عمر ۵۸ سال کی تھی آپ صرف بیس سال اپنی قوم میں رہے تھے۔

وَلُوْطًا اِذْ قَالَ لِقَوْمِهٖٓ اَتَاْتُوْنَ الْفَاحِشَةَ مَا سَبَقَكُمْ بِهَا مِنْ اَحَدٍ مِّنَ الْعٰلَمِيْنَ ۝ اِنَّكُمْ لَتَاْتُوْنَ الرِّجَالَ شَهْوَةً مِّنْ دُوْنِ النِّسَآءِ ؕ بَلْ اَنْتُمْ قَوْمٌ مُّسْرِفُوْنَ ۝ (اور ہم نے لوطؑ کو بھیجا جب کہ انہوں نے اپنی قوم سے کہا تم ایسی بے حیائی کا کام کرتے ہو جس کو تم سے پہلے سارے جہان میں کسی نے نہیں کیا۔ تم عورتوں کو چھوڑ کر مردوں سے شہوت رانی کرتے ہو۔ حقیقت تم حد (انسانیت عقل) سے گزر گئے ہو)۔ لوط بن ہاران (یا ہاران) بن تارخ حضرت ابراہیمؑ کے بھتیجے تھے۔ قوم لوط سے مراد سدوم والے ہیں۔

وَلُوْطًا اَرْسَلْنَا محذوف کا مفعول ہے اور اِذْ قَالَ اس کا ظرف۔ یا اُذْكُرْ محذوف ہے (یاد کرو) اور اِذْ قَالَ اس سے بدل ہے۔ اَتَاْتُوْنَ میں زجر آمیز انکار استفہامی ہے۔ اَلْفَاحِشَةَ یعنی مردوں سے لواطت۔ بِهَا میں ب تعدیہ کی ہے مِنْ اَحَدٍ میں مِنْ زائد ہے مگر نفی میں تاکید اور عموم پیدا کر رہا ہے۔ مِنَ الْعٰلَمِيْنَ میں مِنْ تبعیضیہ ہے عمرو بن دینار کا قول ہے کہ دنیا میں کوئی نر کسی نر پر نہیں دیکھا گیا۔ قوم لوط سے ہی اس فعل کی ابتداء ہوئی۔ اِنَّكُمْ سے اَتَاْتُوْنَ الْفَاحِشَةَ کے انکار و زجر کی مزید کامل تاکید ہو رہی ہے۔ لَتَاْتُوْنَ الرِّجَالَ یعنی مردوں سے جماع کرتے ہو۔ اتی المرءۃ اس عورت سے جماع کیا یہ عرب کا محاورہ ہے۔ شَهْوَةً مفعول لہ ہے یعنی محض شہوت رانی کے لئے بغیر کسی مصلحت و قوبل کے یا مفعول مطلق ہے تو بجائے حال

کے واقعہ ہوتا ہے یعنی ناکارہ بے سود شہوت رانی کے طور پر۔ مِنْ دُوْنِ النِّسَآءِ دُوْنِ بمعنی غیر ہے یعنی عورتوں کو چھوڑ کر دوسروں سے۔ مراد یہ ہے کہ عورتوں سے قربت میں تو حکمت ہے اولاد کی پیدائش اور نسل کا بقاء وغیرہ اور مردوں سے قربت میں کچھ فائدہ نہیں اس ٹکڑے میں قوم لوط کی انتہائی مذمت ہے کہ تم (انسانی فکر و دانش سے بالکل خالی) محض (بے عقل) جانور ہو۔ اس آیت سے بطور دلالت نص ثابت ہو رہا ہے کہ عورتوں سے لواطت بھی حرام ہے کیونکہ گندہ اور بے سود ہونا دونوں کا ایک ہی طرح ہے۔ اس مسئلہ کی تفصیل سورۂ بقرہ کی آیت فَاْتُوْا حَرْثَكُمْ اَنّٰى شِئْتُمْ کی تفسیر میں گزر چکی ہے۔ بَلْ اَنْتُمْ قَوْمٌ مُّسْرِفُوْنَ یعنی تمہاری عادت ہی ہے کہ شریعت و دانش کی حدود سے نکل جاتے ہو کہ حدود نکاح سے تجاوز کر کے تم نے ایسے فعل کی طرف توجہ کی جو انسانی عادت کے خلاف اور فائدہ سے خالی ہے۔ اس آیت میں انکار سے اعراض اور اخبار کی طرف کلام کا رخ پھیر دیا گیا ہے اور انکار سے مذمت کی طرف اعراض ہے۔ اصل کلام اس طرح تھا کہ اس قبیح فعل کا تمہارے پاس کوئی عذر نہیں صرف یہی نہیں بلکہ تمہاری عادت ہی حد انسانیت سے تجاوز کرنے کی ہے۔

وَمَا كَانَ جَوَابَ قَوْمِهٖۤ اِلَّاۤ اَنْ قَالُوْۤا اَخْرِجُوْهُمْ مِّنْ قَرْيَتِكُمْ ۚ اِنَّهُمْ اُنَاسٌ يَّتَطَهَّرُوْنَ ۝ فَاَنْجَيْنٰهُ وَاَهْلَهٗۤ اِلَّا امْرَاَتَهٗ ۖ كَانَتْ مِنَ الْغٰبِرِيْنَ ۝ وَاَمْطَرْنَا عَلَيْهِمْ مَّطَرًا ۗ فَانْظُرْ كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُجْرِمِيْنَ ۝

(اور ان کی قوم سے کوئی جواب بن نہ پڑا سوائے اس کے کہ آپس میں کہنے لگے ان لوگوں کو اپنی بستی سے نکال باہر کرو، یہ لوگ بڑے پاک صاف بنتے ہیں، سو (ہم) نے لوط کو اور ان کے متعلقین کو بچالیا سوائے لوط کی بیوی کے وہ انہی لوگوں میں رہی جو عذاب میں رہ گئے تھے اور ہم نے ان پر ایک نئی طرح کا مینہ برسایا سو دیکھو تو مجرموں کا کیسا انجام ہوا)۔

وَمَا كَانَ جَوَابَ یعنی کوئی ایسی بات پیش نہ کر سکے جو صحیح جواب بن سکتی اِلَّاۤ اَنْ قَالُوْا اس میں اِلَّا کا معنی ہے لیکن اَخْرِجُوْهُمْ یعنی لوط کو اور ان کے مومن ساتھیوں کو۔ اِنَّهُمْ اُنَاسٌ يَّتَطَهَّرُوْنَ یعنی یہ فحش کاموں سے پاک بنتے ہیں۔ یہ کلام انہوں نے استہزاءً کہا تھا۔ وَاَهْلَهٗۤ اہل سے مراد مومن ساتھی ہیں۔ بعض نے کہا حضرت لوط کی دو بیٹیاں مراد ہیں۔ اِلَّا امْرَاَتَهٗ یہ اَهْلَهٗ سے استثناء ہے۔ حضرت لوط کی بیوی منافق تھی دل میں کفر چھپائے ہوئے تھی۔ مِنَ الْغٰبِرِيْنَ یعنی ان لوگوں میں سے تھی جو اپنے گھروں میں رہ گئے تھے اور عذاب سے ہلاک کر دیئے گئے تھے۔ یا ان لوگوں میں سے تھی جو عذاب میں رہ گئے تھے یا ان بوڑھے مشرک لوگوں میں سے تھی جو مدت دراز سے زندہ تھے پھر ہلاک ہونے والوں کے ساتھ ہلاک ہو گئی۔

مَطَرًا (مفعول مطلق ہے) یعنی عجیب طرح کی بارش۔ نکلے پتھروں کی بارش جن میں سے ہر پتھر ہر مجرم کے لئے نشان زدہ تھا۔ وہب نے کہا گندھک اور آگ کی بارش ابو عبیدہ کی تحقیق ہے کہ عذاب کے لئے اَمْطَرَ (باب افعال سے) اور رحمت کے لئے مطر (ثلاثی مجرد سے) بولا جاتا ہے۔ اَلْمُجْرِمِيْنَ مجرموں سے مراد ہیں کافر۔

روایت میں آیا ہے کہ حضرت لوطؑ اپنے چچا حضرت ابراہیمؑ کے ساتھ بابل سے ہجرت کر کے شام کی طرف جاتے ہوئے اردن میں اتر گئے اللہ نے ان کو پیغمبر بنا کر سدوم کو بھیجا تاکہ اہل سدوم کو اللہ کی طرف آنے کی دعوت دیں اور ان کی ایجاد کردہ بے حیائی سے باز داشت کریں۔ آپ نے تبلیغ کی مگر وہ باز نہ آئے آخر اللہ نے ان پر پتھروں کی بارش کی اور سب ہلاک ہو گئے۔

اسحاق بن بشیر اور ابن عساکر نے حضرت ابن عباسؓ کا بیان نقل کیا ہے۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ جو لوگ اپنے وطن میں مقیم تھے ان کو تو زمین کے اندر دھنسا دیا گیا یعنی زمین ان کو لے کر دھنس گئی اور جو کسی سفر میں تھے ان پر پتھروں کی بارش ہوئی۔

محمد بن اسحاق کا بیان ہے کہ اہل سدوم کے پھلدار باغات اور (سرسبز) بستیاں ایسی تھیں جو اس سرزمین میں کہیں نہیں تھیں، لوگ ان کو آکر دیکھتے تھے (اور ان کے باغوں سے پھل توڑتے اور چرا لیتے تھے) آخر ابلیس آدمی کی شکل میں ان کے

اور آخرت دونوں کا فائدہ تھا اس لئے وَلَا تُفْسِدُوا فِي الْأَرْضِ بَعْدَ إِصْلَاحِهَا ذَٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ فرمایا۔ إِن كُنتُم مُّؤْمِنِينَ یعنی اگر تم مجھے سچا جانتے ہو تو جو حکم میں دے رہا ہوں اس کی تعمیل کرو۔ اور وہ لوگ واقف ہیں کہ شعیب جھوٹ بھی نہیں بولتے (ان کا یہ خیال حضرت شعیبؑ کی نبوت سے پہلے تھا۔ نبوت کے بارے میں وہ جھوٹا ہی سمجھتے تھے)۔

روایت میں آیا ہے کہ اہل مدین سر راہ بیٹھ جاتے اور جو شخص مسلمان ہونے کے لئے حضرت شعیب کے پاس جانا چاہتا اس کو روکتے اور کہتے شعیب بڑا جھوٹا ہے کہیں تجھے دین کی طرف سے بہکا نہ دے۔ یہ لوگ مسلمانوں کو بھی ڈراتے اور قتل کر ڈالنے کی دھمکیاں دیتے تھے۔ کذا اخرجہ ابن جریر و ابن المنذر و ابن ابی حاتم عن ابن عباس (رضی اللہ عنہما)۔

وَلَا تَقْعُدُوا بِكُلِّ صِرَاطٍ تُوعِدُونَ وَتَصُدُّونَ عَن سَبِيلِ اللَّهِ مَنْ آمَنَ بِهِ وَتَبْغُونَهَا عِوَجًا ۚ وَاذْكُرُوا إِذْ كُنتُمْ قَلِيلًا فَكَثَّرَكُمْ ۖ وَانظُرُوا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُفْسِدِينَ ﴿٨٦﴾ (اور تم راستوں پر اس غرض سے نہ بیٹھا کرو کہ اللہ پر ایمان لانے والوں کو دھمکیاں دو اور اللہ کی راہ سے روکو اور اس میں کجی کی تلاش کرو اور یاد کرو کہ جب تم کم تھے تو اللہ نے تمہاری تعداد بڑھا دی اور دیکھو کہ تخریب کاروں کا انجام کیسا ہوا)۔

تُوعِدُونَ اور تَصُدُّونَ دونوں لَا تَقْعُدُوا کی ضمیر فاعل سے حال ہیں۔

تَبْغُونَهَا عِوَجًا یعنی اللہ کی راہ میں کجی کی تلاش کرتے ہو، مطلب یہ ہے کہ اس میں شبہ ڈالتے ہو یا لوگوں کے سامنے ظاہر کرتے ہو کہ یہ راستہ ٹیڑھا ہے (بہر حال لوگوں کو بہکاتے ہو)۔

بعض علماء کے نزدیک صراط سے مراد ہے دین کا راستہ۔ دین کا راستہ اگرچہ ایک ہی ہے لیکن اس کی شاخیں متعدد ہیں۔ عقائد و معارف کی شاخ، احکام کی شاخ، حدود و تعزیرات کی شاخ (گویا دین کی ہر شاخ ایک راستہ ہے) قوم شعیب والے جب کسی کو دین کی کسی شاخ میں کوشش کرتے دیکھتے تو راہ ڈالتے اور روک دینے کی دھمکی دیتے تھے۔ اس صورت میں تَصُدُّونَ عَن سَبِيلِ اللَّهِ کی تشریح بِكُلِّ صِرَاطٍ کا بیان ہوگا اس سے ان کی حرکت شنیعہ کی انتہائی خرابی اور اپنی راہ پر قائم رہنے کی مذمت مستفاد ہوگی۔ قَلِيلًا تعداد میں کم یا سامان میں کم۔ فَكَثَّرَكُمْ اللہ نے تم کو بڑھا دیا یعنی اولاد و مال میں برکت عطا فرمادی۔ عَاقِبَةُ الْمُفْسِدِينَ یعنی گزشتہ سرکش قوموں کا انجام جیسے حضرت لوط کی قوم کا اور دوسری تخریب کار قوموں کا انجام کیسا ہوا۔

وَإِن كَانَ طَائِفَةٌ مِّنكُمْ آمَنُوا بِالَّذِي أُرْسِلْتُ بِهِ وَطَائِفَةٌ لَّمْ يُؤْمِنُوا فَاصْبِرُوا حَتَّىٰ يَحْكُمَ اللَّهُ بَيْنَنَا ۚ وَهُوَ خَيْرُ الْحَاكِمِينَ ﴿٨٧﴾ (اور اگر تم میں سے بعض لوگ اس حکم پر جس کو دے کر مجھے بھیجا گیا ہے ایمان لے آئے ہیں اور بعض لوگ ایمان نہیں لائے تو ذرا ٹھہرے رہو تا آنکہ اللہ ہمارے درمیان (عنقریب) فیصلہ کئے دیتا ہے وہی سب سے بہتر فیصلہ کرنے والا ہے۔

فَاصْبِرُوا تو تم ٹھہرے رہو یعنی انتظار کرو حَتَّىٰ يَحْكُمَ اللَّهُ بَيْنَنَا کہ اللہ فیصلہ کردے جو اہل حق ہیں ان کو فتحیاب کردے گا جو باطل پرست ہیں ان کو تباہ کردے گا۔ اس میں اہل ایمان کے لئے (کامیابی کی) بشارت اور کافروں کے لئے (تباہی کی) دھمکی ہے۔ وَهُوَ خَيْرُ الْحَاكِمِينَ۔

وہ سب سے اچھا حاکم ہے اس کے حکم کو کوئی پلٹ نہیں سکتا

آٹھواں پارہ بعونہ ختم ہوا۔ اس سے

آگے نواں پارہ شروع ہے

بتوفیقہ تعالیٰ

نواں پارہ شروع

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

قَالَ الْمَلَأُ الَّذِينَ اسْتَكْبَرُوا مِنْ قَوْمِهِ لَنُخْرِجَنَّكَ يَا شُعَيْبُ وَالَّذِينَ آمَنُوا مَعَكَ مِنْ قَرْيَتِنَا أَوْ لَتَعُودُنَّ فِي مِلَّتِنَا ۚ قَالَ أَوَلَوْ كُنَّا كَارِهِينَ ﴿۸۸﴾ (شعیب کی قوم کے متکبر سرداروں نے کہا اے شعیب ہم تم کو اور تمہارے ساتھ جو ایمان والے ہیں ان کو اپنی بستی سے ضرور نکال دیں گے ورنہ تم سب ہمارے مذہب میں لوٹ آؤ۔ شعیبؑ نے جواب دیا کیا تم ہم کو اپنے مذہب میں لوٹا لوگے خواہ ہم اس سے بیزار ہی ہوں یا کراہت کریں) یعنی دو کاموں میں سے ایک کام ضرور ہوگا۔ یا بستی سے تمہارا نکالا جانا یا دوبارہ کفر میں لوٹ آنا۔

حضرت شعیب اگرچہ کبھی مذہب کفر پر نہ تھے (اس لئے ان کا کفر کی طرف واپس آجانا کوئی معنی نہیں رکھتا) انبیاء کا کبھی کافر ہونا (خواہ نبوت سے پہلے ہی ہو) درست نہیں۔ لیکن حضرت شعیبؑ پر ایمان لانے والے اکثر اشخاص چونکہ کفر چھوڑ کر ایمان لائے تھے اس لئے خطاب میں اکثر کی حالت کو ترجیح دی گئی اور آئندہ جواب میں بھی حضرت شعیبؑ نے اسی کو پیش نظر رکھا۔ بعض کے نزدیک لَتَعُودُنَّ کا معنی ہے لَتَصِيرُنَّ۔ عَادَ بمعنی صَارَ کے آتا ہے یعنی یا ہم تم کو نکال دیں گے یا تم ہمارے مذہب میں آ جاؤ گے۔ اَوَلَوْ كُنَّا میں ہمزہ انکار کے لئے اور واؤ عطف کے لئے ہے اور پورا جملہ حالیہ ہے۔ اصل کلام اس طرح تھا کیا تم ہم کو اپنے مذہب میں لوٹا لو گے خواہ ہم پسند کریں یا ناپسند کریں۔ اول ٹکڑے کو حذف کر دیا گیا اور استفہام کا تعلق دوسرے جملہ سے کر دیا گیا تاکہ نفی حکم کامل طور پر ہو جائے۔

قَدِ افْتَرَيْنَا عَلَى اللَّهِ كَذِبًا إِنْ عُدْنَا فِي مِلَّتِكُمْ بَعْدَ إِذْ نَجَّانَا اللَّهُ مِنْهَا ۚ وَمَا يَكُونُ لَنَا أَنْ نَعُودَ فِيهَا إِلَّا أَنْ يَشَاءَ اللَّهُ رَبُّنَا ۚ وَسِعَ رَبُّنَا كُلَّ شَيْءٍ عِلْمًا ۚ عَلَى اللَّهِ تَوَكَّلْنَا ۚ رَبَّنَا افْتَحْ بَيْنَنَا وَبَيْنَ قَوْمِنَا بِالْحَقِّ وَأَنْتَ خَيْرُ الْفَاتِحِينَ ﴿۸۹﴾ (ہم اللہ پر بڑی جھوٹی تہمت لگانے والے ہو جائیں گے اگر خدانہ کرے ہم تمہارے مذہب میں آجائیں بعد اس کے کہ اللہ نے ہم کو اس سے نجات دے دی ہے اور ہم سے ممکن نہیں کہ تمہارے مذہب میں آجائیں ہاں اگر اللہ ہی کی مشیت ہو جو ہمارا مالک ہے (تو دوسری بات ہے) ہمارے رب کا علم ہر چیز کو محیط ہے ہم اللہ ہی پر بھروسہ رکھتے ہیں۔ اے ہمارے مالک ہمارے اور ہماری قوم کے درمیان حق کے موافق فیصلہ کر دے تو سب سے اچھا فیصلہ کرنے والا ہے)۔

قَدِ افْتَرَيْنَا ہم تحقیق کے ساتھ دروغ بندی کریں گے۔ عَلَى اللَّهِ كَذِبًا اللہ کے ساتھ دوسروں کو شریک قرار دیں گے۔ اِنْ عُدْنَا یہ شرط ہے جس کے جواب پر سابق جملہ (قَدِ افْتَرَيْنَا) دلالت کر رہا ہے۔ اِفْتَرَيْنَا ماضی کا صیغہ ہے مگر مستقبل کے معنی میں ہے تحقق وقوع کی وجہ سے مستقبل کی تعبیر ماضی کے صیغے سے کر دی گئی ہے اور چونکہ ماضی قریب مراد ہے اور حال سے متصل ہے اس لئے قَدْ کا لفظ استعمال کیا گیا۔ جب اللہ نے کفر سے ہم کو نجات دے دی اور ظاہر فرما دیا کہ جس مذہب پر ہم پہلے تھے وہ باطل ہے اور جو مذہب ہم نے اختیار کیا ہے وہ حق ہے تو اب اگر سابق مذہب کی طرف ہم نے لوٹنے کا

ارادہ کیا تو ہم دروغ گو اور اللہ پر تہمت تراشنے والے ہوں گے۔ یہاں کوئی لفظ بھی ہمارے لئے ممکن نہیں ایسا ہم سے کبھی نہیں ہو سکتا یہ جملہ بے اسلام پر قائم رہنے اور کفر سے اجتناب رکھنے کے عزم کا اور چونکہ اس جملہ سے کسی قدر اپنے آپ کو پاک سمجھنے کی بو آرہی تھی اور بڑائی کی طرف سے اپنی ذات کی ترجیح ہو رہا تھا اس لئے آگے استثناء کر دیا اور کہہ دیا الا ان یشاء اللہ مگر ہمارے مقدر میں ہی اگر اللہ نے کفر کو لکھ دیا ہو اور ہمارے مرتد ہو جانے کی اسی کی مشیت ہو اور وہی ہماری مدد نہ کرے تو بات دوسری ہے یہ استثناء بتا رہا ہے کہ کفر بھی اللہ کی مشیت سے ہوتا ہے (پس معتزلہ کا قول غلط ہے جو امر اور مشیت میں فرق نہیں کرتے اور کہتے ہیں کہ کفر اور گناہ اللہ کی مشیت سے نہیں ہوتا کیونکہ اس نے کفر و گناہ کو ترک کرنے کا حکم دیا ہے) بعض علماء نے لکھا ہے کہ یہ جملہ استثنائیہ بول کر کافروں کو ناامید بنا دینا مقصود ہے کیونکہ حضرت شعیبؑ نے اپنی جماعت کے ارتداد کو ایسی چیز سے وابستہ کیا جو کبھی ہونے والی نہ تھی (اور شرط اگر مستحیل الوقوع ہو تو مشروط کا وقوع بھی ناممکن ہوتا ہے) وَسِعَ رَبُّنَا یعنی اللہ کا علم ہمہ گیر ہے وہی جانتا ہے کہ آخر کار کون بندہ کفر کی طرف جاتا ہے اور کون اسلام کی طرف آتا ہے۔

حضرت ابن مسعودؓ کی روایت سے صحیحین میں مذکور ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا قسم ہے اس کی جس کے سوا کوئی معبود نہیں کہ تم میں سے کچھ لوگ (ساری عمر) دوزخیوں کے کام کرتے ہیں یہاں تک کہ ان کے اور دوزخ کے درمیان صرف ہاتھ بھر فاصلہ رہ جاتا ہے (آخر میں) کتاب کا لکھا غالب آتا ہے اور وہ اہل جنت کے عمل کرنے لگتے ہیں اور جنت میں چلے جاتے ہیں۔ عَلَى اللّٰهِ تَوَكَّلْنَا اللہ ہی پر ہمارا بھروسہ ہے کہ وہ ہم کو ایمان پر قائم رکھے گا اور یقین میں زیادتی کی توفیق دے گا۔ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ تمام بنی آدم کے دل ایک دل کی طرح رحمٰن کی چٹکی میں ہیں جس طرف کو چاہتا ہے موڑ دیتا ہے۔ پھر آپ نے دعا کی اے اللہ اے دلوں کو موڑنے والے ہمارے دلوں کو اپنی طاعت پر موڑ دے۔ رواہ مسلم۔

حضرت شعیبؑ جب کافروں کی طرف سے مایوس ہو گئے تو بددعا کی اور رَبَّنَا افْتَحْ اے ہمارے رب ہمارا فیصلہ کر دے افتح فتاحۃ سے مشتق ہے فتاحۃ فیصلہ کر دینا، حکم دے دینا۔ فتّاح وہ حاکم ہوتا ہے جو امر کا فیصلہ کرتا ہے یا افتح سے مراد ہے اپنے امر کو ظاہر کر دے کہ حق کا ظہور ہو جائے اور دھاندلی سے جدا ہو جائے اس وقت لفظ افتح فتح المشکل (مشکل کو کھول دیا) سے ماخوذ ہوگا۔

وَقَالَ الْمَلَاُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ قَوْمِهٖ لَئِنِ اتَّبَعْتُمْ شُعَيْبًا اِنَّكُمْ اِذًا لَّخٰسِرُوْنَ ۝

(شعیبؑ کی قوم کے کافروں نے (نچلے اور زیردست طبقہ سے) کہا اگر تم شعیب کے پیچھے چلو گے (اور اپنے مذہب کو چھوڑ کر اس کا دین اختیار کر لو گے) تو بلاشبہ اس صورت میں گھاٹے میں رہو گے)۔ اپنی سیدھی چال کو چھوڑ کر اس کی لائی ہوئی گمراہی اختیار کر لو گے یہ مطلب کہ جو دنیوی فائدے تم کو حاصل ہوتے ہیں ناپ تول میں کمی کر کے جو نفع مل جاتا ہے وہ جاتا رہے گا۔

فَاَخَذَتْهُمُ الرَّجْفَةُ فَاَصْبَحُوْا فِيْ دَارِهِمْ جٰثِمِيْنَ ۝ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا شُعَيْبًا كَاَنْ لَّمْ يَغْنَوْا فِيْهَا ۛ اَلَّذِيْنَ كَذَّبُوْا شُعَيْبًا كَانُوْا هُمُ الْخٰسِرِيْنَ ۝ (ترجمہ یہ ہوا کہ ان کو زلزلہ نے آ پکڑا اور اپنے گھر میں اوندھے کے اوندھے پڑے رہ گئے، جنہوں نے شعیب کو جھوٹا کہا تھا ان کی ایسی حالت ہو گئی گویا ان گھروں میں کبھی بسے ہی نہ تھے یہ تکذیب کرنے والے ہی سراسر خسارہ میں رہے)۔

ع

اَلرَّجْفَةُ کلبی نے کہا اس سے مراد ہے زلزلہ۔ فِيْ دَارِهِمْ یعنی اپنی بستی میں۔ جٰثِمِيْنَ مردہ مرے رہ گئے۔ حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا اللہ نے ان پر جہنم کا دروازہ کھول دیا اور ایسی سخت گرمی میں مبتلا کر دیا کہ دم گھٹنے لگے۔ نہ سایہ سے فائدہ ہوتا تھا نہ پانی سے ٹھنڈک حاصل کرنے کے لئے تہ خانوں میں گھستے تھے اور وہاں اوپر سے زیادہ گرمی پا کر پھر باہر نکل آتے تھے اور بھاگ کر میدانوں میں چلے جاتے تھے ایک بار باہر میدان میں بھاگ کر پہنچے تو اللہ نے ایک بادل بھیج دیا جس کے اندر بڑی خوشگوار ہوا تھی ابر نے ان پر سایہ کر لیا۔ اَلظُّلَّةُ (جس کا ذکر دوسری آیت میں آیا ہے) یہی ابر تھا ابر کے نیچے کچھ خنکی اور ہوا

محسوس ہوئی تو ایک نے دوسرے کو پکار کر سب کو ابر کے نیچے جمع کر لیا جب سب عورتیں مرد بچے بڑے جمع ہو گئے تو (بادل کے اندر سے) اللہ نے آگ کے شعلے پیدا کر دیئے۔ نیچے زمین تپ رہی تھی اور اوپر سے آگ تھی۔ سب بھنی ہوئی ٹڈی کی طرح جل بھن کر رہ گئے۔

یزید جریری کا قول ہے کہ (نزول) سات روز تک اللہ نے ان پر ہوا کے طوفان کو مسلط رکھا پھر گرمی چھا گئی سامنے دور سے ایک پہاڑ نظر آیا ایک آدمی نے جا کر دیکھا تو وہاں نہریں اور چشمے جاری تھے۔ سب پہاڑ کے نیچے جمع ہو گئے پھر پہاڑ ان پر گر پڑا اسی کو یَوْمُ الظُّلَّةِ کہا گیا ہے (یعنی الظلة سے مراد ہے پہاڑ کا سایہ) قتادہؒ کا قول ہے اللہ نے شعیبؑ کو اصحاب الایکہ کی ہدایت کے لئے بھی بھیجا تھا اور اصحاب مدین کی طرف بھی ایک (بن میں رہنے والے تو (ابر یا پہاڑ کے) سایہ (میں جمع ہو کر اس) سے ہلاک کئے گئے اور مدین والوں کو زلزلے نے آپکڑا جبرئیلؑ نے ایک چیخ ماری جس سے سب ہلاک ہو گئے

كَاَنْ لَّمْ يَغْنَوْا یعنی چیخ، زمین سے ان کی بربادی ہو گئی، ایسا معلوم ہونے لگا کہ وہاں رہتے ہی نہ تھے وہاں کوئی آبادی ہی نہ تھی۔ غنیت بالمکان میں نے اس جگہ قیام کیا۔ مغانی، مکانات، قیامگاہیں اس کا واحد مغنی ہے۔ هُمُ الْخٰسِرِيْنَ یعنی دنیا اور آخرت میں خاسر ہو گئے۔ ہاں جن لوگوں نے حضرت شعیبؑ کی تصدیق کی اور آپ کے پیچھے چلے وہ دونوں جہان میں فائدے میں رہے۔ قوم شعیبؑ کے خاسر ہونے کی علت اور تخصیص خسران کے سبب پر متنبہ کرنے کے لئے الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا شُعَيْبًا دوبار فرمایا تاکہ یہ معلوم ہو جائے کہ شعیب کی تکذیب ہی خسران کی علت تھی۔

فَتَوَلّٰى عَنْهُمْ وَقَالَ يٰقَوْمِ لَقَدْ اَبْلَغْتُكُمْ رِسٰلٰتِ رَبِّيْ وَنَصَحْتُ لَكُمْ ۚ فَكَيْفَ اٰسٰى عَلٰى قَوْمٍ كٰفِرِيْنَ ۝

((جب عذاب آگیا تو حضرت شعیبؑ نے عالم تحیر میں) ان کی طرف سے منہ پھیر لیا اور کہا اے میری قوم میں نے تم کو اپنے رب کے پیام پہنچا دیئے تھے اور تمہاری خیر خواہی کی تھی اب کس طرح میں کافر قوم (کے ہلاک ہو جانے کا رنج کروں کیونکہ جو عذاب ان پر آیا وہ اسی کے مستحق تھے کوئی حق نہیں رکھتا کہ اس کے ہلاک ہونے کا رنج کیا جائے) حضرت شعیبؑ نے نَصَحْتُ لَكُمْ تک جو کچھ فرمایا وہ انتہائی رنج اور افسوس کے ماتحت تھا لیکن پھر سنبھل گئے اور خود اپنے خلاف فیصلہ کیا اور آخری جملہ فرمایا یہ آخری فقرہ اپنی شدت حزن کی معذرت کے طور پر فرمایا۔ مطلب یہ کہ میں نے اللہ کے احکام پہنچانے اور تمہاری خیر خواہی کرنے کی حد کر دی مگر تم نے میرا کہنا نہ مانا اور عذاب کو خود پسند کیا اب میں ایسے لوگوں کے مرنے کا کیا افسوس کروں۔

وَمَآ اَرْسَلْنَا فِيْ قَرْيَةٍ مِّنْ نَّبِيٍّ اِلَّآ اَخَذْنَآ اَهْلَهَا بِالْبَاْسَآءِ وَالضَّرَّآءِ لَعَلَّهُمْ يَضَّرَّعُوْنَ ۝ ثُمَّ بَدَّلْنَا مَكَانَ السَّيِّئَةِ الْحَسَنَةَ حَتّٰى عَفَوْا وَّقَالُوْا قَدْ مَسَّ اٰبَآءَنَا الضَّرَّآءُ وَالسَّرَّآءُ فَاَخَذْنٰهُمْ بَغْتَةً وَّهُمْ لَا يَشْعُرُوْنَ ۝

(اور ہم نے کسی بستی میں کوئی نبی نہیں بھیجا کہ وہاں کے رہنے والوں کو ہم نے محتاجی اور بیماری میں نہ پکڑا ہو، تاکہ وہ ڈھیلے پڑ جائیں پھر ہم اس بدحالی کی جگہ خوش حالی لے آئے کہ ان کو خوب ترقی ہوئی اور اس وقت وہ کہنے لگے ہمارے باپ دادا کو بھی دکھ سکھ پیش آیا تھا اب ہم نے ان کو اچانک پکڑ لیا اور ان کو خبر بھی نہ تھی)۔

وَمَآ اَرْسَلْنَا فِيْ قَرْيَةٍ مِّنْ نَّبِيٍّ اس جگہ ایک جملہ محذوف ہے۔ یعنی کسی بستی میں ہم نے کوئی نبی نہیں بھیجا (پھر بستی والوں نے اس کی تکذیب کی) مگر اہل قریہ کی ہم نے گرفت کی۔ بِالْبَاْسَآءِ وَالضَّرَّآءِ بغویؒ نے لکھا ہے کہ حضرت ابن مسعودؓ کے نزدیک بَاْسَآء سے مراد فقیری ہے ضَرَّآء سے مراد بیماری ہے۔ بعض کے نزدیک بَاْسَآء سے جنگ اور ضَرَّآء سے قحط مراد ہے۔ لَعَلَّهُمْ يَضَّرَّعُوْنَ تاکہ (وہ گڑگڑائیں) توبہ کریں، اللہ کی طرف رجوع کریں۔ اس جگہ لفظ لعل کا استعمال بتا رہا ہے کہ ان لوگوں کا قول غلط ہے جو کہتے ہیں کہ اللہ کے کلام میں عَسٰى، ہَکَذَا اور لَعَلَّ کا استعمال جس جگہ ہوا ہے اس کا وقوع ضروری ہے (اللہ کے لئے لفظ امید، شاید، عنقریب کا استعمال درست نہیں اللہ کی قدرت اور ارادہ اور علم ہمہ گیر ہے۔ امید یا شک

باطنی تو کسی کو ہوتا ہے جو ناقص القدرۃ، ضعیف الارادہ اور ناقص العلم ہو۔ ہذا الضرء نے جس جملہ کو لفظ عسٰی یا کاد یا لعل سے بیان کیا ہے اس سے مراد مضمون جملہ کا وقوع ہوتا ہے جو وقوع پذیر نہیں ہوتا (اکثر لوگوں نے مالی اور جسمانی دکھ میں مبتلا ہو کر بھی توبہ نہیں کی)۔

اَلسَّیِّئَۃُ مالی اور جسمانی دکھ اَلْحَسَنَۃُ مال کی کثرت اور سرسبزی۔ یعنی ان کو ہم نے بدحالی اور دکھ کے بجائے دونوں طرح سے امن اور چین دے دیا۔ حَتّٰی عَفَوْا یہاں تک کہ ان کی تعداد خوب بڑھ گئی اور مال کی بھی فراوانی ہوگئی۔ عَفَتِ النَّبْتُ سبزہ خوب ہو گیا۔ اعفاء اللحیۃ داڑھی کو خوب بڑھانا۔ قَالُوْا قَدْ مَسَّ یعنی انہوں نے کہا کہ یہ دکھ سکھ کا دور ہمارے باپ دادا پر بھی آتا رہتا ہے، زمانہ کا دستور ہی یہی ہے کبھی دکھ کبھی سکھ باری باری سے آتا رہتا ہے۔ وہ لوگ خالق کو بھول گئے اور راحت و مصیبت کو پیدا کرنے والے کا انہوں نے تصور بھی نہ کیا۔ وَهُمْ لَا يَشْعُرُوْنَ اور ان کو عذاب آنے کا (پتہ بھی نہ تھا) احساس بھی نہ تھا۔

وَلَوْ أَنَّ أَهْلَ الْقُرَىٰ آمَنُوا وَاتَّقَوْا لَفَتَحْنَا عَلَيْهِم بَرَكَاتٍ مِّنَ السَّمَاءِ وَالْأَرْضِ وَلَٰكِن كَذَّبُوا فَأَخَذْنَاهُم بِمَا كَانُوا يَكْسِبُونَ ﴿٩٦﴾ (اور اگر ان بستیوں کے رہنے والے ایمان لے آتے اور ڈرتے رہتے تو ہم ان پر آسمان و زمین کی برکتیں کھول دیتے لیکن انہوں نے تو پیغمبروں کی تکذیب کی اس لئے ہم نے بھی ان کے کرتوت کی وجہ سے ان کو پکڑ لیا)۔

اَلْقُرٰی میں الف لام عہد خارجی کا ہے یعنی جن بستیوں والے جن کی ہدایت کے لئے پیغمبروں کو بھیجا گیا تھا۔ وَاتَّقَوْا اور اللہ کے عذاب سے ڈرتے جس کی صورت یہ تھی کہ اس کے حکم پر چلتے اور نافرمانی کو ترک کر دیتے۔

مِّنَ السَّمَاءِ وَالْأَرْضِ یعنی ہر طرف سے ہر خیر کے دروازے ان پر کھول دیتے اور اس خیر کو قائم رکھتے۔ بعض علماء کے نزدیک آسمان کی برکتوں سے مراد ہے بارش اور زمین کی برکتوں سے مراد ہے سبزی، پھل، غلہ۔ برکت کا لغوی معنی ہے زیادتی اور کسی چیز کا دوام۔ وَلٰكِنْ كَذَّبُوا الرُّسُلَ مگر انہوں نے پیغمبروں کی تکذیب کی۔ فَأَخَذْنَاهُمْ تو ہم نے ان کو سزا میں گرفتار کیا۔ بِمَا كَانُوا يَكْسِبُونَ اس کفر و معصیت کی سزا میں جو وہ کرتے تھے۔

أَفَأَمِنَ أَهْلُ الْقُرَىٰ أَن يَأْتِيَهُم بَأْسُنَا بَيَاتًا وَهُمْ نَائِمُونَ ﴿٩٧﴾ أَوَأَمِنَ أَهْلُ الْقُرَىٰ أَن يَأْتِيَهُم بَأْسُنَا ضُحًى وَهُمْ يَلْعَبُونَ ﴿٩٨﴾ (کیا پھر بھی ان بستیوں میں رہنے والے اس بات سے بے فکر ہیں کہ ان پر ہمارا عذاب جب کہ یہ رات میں غافل پڑے سوتے ہوں آجائے اور کیا ان (موجودہ) بستیوں کے رہنے والے اس بات سے بے فکر ہیں کہ ان پر ہمارا عذاب دن دوپہری میں آپڑے جب کہ وہ کھیل کود میں ہوں)۔

أَفَأَمِنَ اس کا عطف فَأَخَذْنَاهُم بَغْتَةً پر ہے دونوں کے درمیان کی عبارت معترضہ ہے۔ مطلب یہ ہے کہ گزشتہ انبیاء کی تکذیب کرنے والی بستیوں کی تباہی اور عذاب میں گرفتاری کے بعد بھی کیا ان کافروں کو ڈر نہیں لگتا جو محمد رسول اللہ ﷺ کی نبوت کا انکار کرتے ہیں کہ رات کو سوتے میں یا دن کو کھیل کود میں غافل ہونے کے اوقات میں ان پر اللہ کا عذاب ناگہانی آجائے۔ اس جگہ أَهْلُ الْقُرَىٰ سے مراد ہیں مکہ اور اطراف مکہ کے رہنے والے۔

بَيَاتًا یا تبییت (مصدر تفعیل) کے معنی میں ہے یا وقت بیات مراد ہے یعنی رات یا اسم فاعل کے معنی میں ہے اور بَأْسُنَا سے حال ہے یا اسم مفعول کے معنی میں ہے اور هُمْ سے حال ہے (مطلب بہر طور قریب ہے) اصل میں لفظ بیات (مصدر لازم) بیتوتت کے معنی میں ہے لیکن جس طرح لفظ سلام (لازم) بمعنی تسلیم (مصدر متعدی) کے آجاتا ہے اسی طرح لفظ بیات بمعنی تبییت (متعدی) بھی آتا ہے۔ وَهُمْ نَائِمُونَ سونے سے مراد ہے غفلت کی حالت میں ہونا، عذاب کی طرف سے غافل ہونا۔

أَفَأَمِنَ اور أَوَأَمِنَ میں استفہام زجری ہے۔ ضُحًى سے مراد دن ہے اس کا لغوی معنی ہے دھوپ چڑھنے کا وقت۔

وَهُمْ يَلْعَبُونَ یعنی جب کہ وہ غفلت کی حالت میں بے ہودہ کاموں میں مشغول ہوں۔

اَفَاَمِنُوْا مَكْرَ اللّٰهِ ۚ فَلَا يَاْمَنُ مَكْرَ اللّٰهِ اِلَّا الْقَوْمُ الْخٰسِرُوْنَ ﴿٩٩﴾ (تو کیا یہ لوگ اللہ کی ناگہانی پکڑ سے بے فکر ہوگئے سو (یاد رکھو کہ) اللہ کی نامعلوم پکڑ سے صرف وہی لوگ بے فکر ہوتے ہیں جن کی شامت آگئی ہو)۔

مَكْرَ اللّٰهِ اللہ کی دی ہوئی ڈھیل کہ ایک وقت تک راحت و نعمت میں رکھتا ہے، پھر اچانک نامعلوم راستہ سے عذاب میں مبتلا کر دیتا ہے جس طرح کہ پہلی قوموں سے اس نے کیا۔ الْقَوْمُ الْخٰسِرُوْنَ یعنی جنہوں نے کفر و معصیت کا ارتکاب کیا اور فکر و بصیرت سے کام لے کر اپنے حال کا گزشتہ اقوام کے حال سے تو لنا نہیں کیا۔

اَوَلَمْ يَهْدِ لِلَّذِيْنَ يَرِثُوْنَ الْاَرْضَ مِنْۢ بَعْدِ اَهْلِهَآ اَنْ لَّوْ نَشَآءُ اَصَبْنٰهُمْ بِذُنُوْبِهِمْ ۚ وَنَطْبَعُ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ فَهُمْ لَا يَسْمَعُوْنَ ﴿١٠٠﴾ (اور کیا ان لوگوں کو جو اس زمین پر سابق باشندوں کی جگہ رہتے ہیں ان واقعات نے یہ بات نہیں بتائی کہ اگر ہم چاہتے تو ان کے جرائم کی پاداش میں ان کو تباہ کر ڈالتے۔ ہم ان کے دلوں پر بند لگائے ہوئے ہیں اسی لئے وہ (حق کی آواز) نہیں سنتے)۔

يَرِثُوْنَ الْاَرْضَ زمین کے وارث ہوتے ہیں یعنی سکونت کے اعتبار سے (ملک مراد نہیں ہے) مِنْۢ بَعْدِ اَهْلِهَا یعنی پچھلے باشندوں کی ہلاکت کے بعد۔ چونکہ اس جگہ ہدایت کا معنی ہے بیان کرنا اس لئے يَهْدِ کے بعد لام آیا ہے اَنْ لَّوْ نَشَآءُ مخفف ہے اور اس کے بعد والا جملہ (بتاویل مفرد ہو کر) يَهْدِ کا فاعل ہے۔ اَصَبْنٰهُمْ یعنی عذاب اور سزا میں ان کو پکڑ لیتے بِذُنُوْبِهِمْ ان کے گناہوں کے بدلے میں۔ وَنَطْبَعُ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ اس جملہ کا عطف اس مفہوم پر ہے جو اَوَلَمْ يَهْدِ سے مستفاد ہو رہا ہے یعنی وہ غفلت کرتے ہیں اور ہم ان کے دلوں پر بند لگا دیتے ہیں۔ زجاج نے کہا یہ جملہ بالکل علیحدہ ہے (سابق پر عطف نہیں ہے وہ استینافیہ ہے عاطفہ نہیں ہے) فَهُمْ لَا يَسْمَعُوْنَ یعنی وہ دل سے کو نہیں سنتے اور نصیحت کو نہیں قبول کرتے۔

تِلْكَ الْقُرٰى نَقُصُّ عَلَيْكَ مِنْ اَنْۢبَآئِهَا ۚ وَلَقَدْ جَآءَتْهُمْ رُسُلُهُمْ بِالْبَيِّنٰتِ ۚ فَمَا كَانُوْا لِيُؤْمِنُوْا بِمَا كَذَّبُوْا مِنْ قَبْلُ ۚ كَذٰلِكَ يَطْبَعُ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِ الْكٰفِرِيْنَ ﴿١٠١﴾ وَمَا وَجَدْنَا لِاَكْثَرِهِمْ مِّنْ عَهْدٍ ۚ وَاِنْ وَّجَدْنَآ اَكْثَرَهُمْ لَفٰسِقِيْنَ ﴿١٠٢﴾ (ان بستیوں کے کچھ کچھ واقعات ہم آپ سے بیان کر رہے ہیں ان سب کے پاس ان کے پیغمبر معجزات لے کر آئے تھے پھر جس بات کو پہلی بار انہوں نے جھوٹا کہہ دیا (پیغمبروں کے بعد بھی) اس پر ایمان لانے والے نہ ہوئے اللہ اسی طرح کافروں کے دلوں پر بند لگا دیتا ہے اور اکثر لوگوں میں ہم نے وفاء عہد نہ دیکھا اور اکثر لوگوں کو ہم نے بے حکم ہی پایا)۔

تِلْكَ الْقُرٰى یعنی گزشتہ اقوام کی بستیاں قوم نوح، قوم عاد، قوم ثمود، قوم لوط اور قوم شعیب کی بستیاں مِنْ اَنْۢبَآئِهَا مِنْ تبعیضیہ ہے یعنی کچھ واقعات بعض خبریں۔ الْبَيِّنٰتِ معجزات اور وہ دلائل جو ان کی رسالت کو ثابت کرتی ہیں۔ مَا كَانُوْا لِيُؤْمِنُوْا یعنی لِاَنْ يُّؤْمِنُوْا تھا اَنْ مصدریہ کو حذف کر دیا گیا۔ لام جحود تاکید نفی ایمان کے لئے اور مصدر اسم فاعل کے معنی میں ہے یعنی وہ ایماندار نہ تھے۔ بِمَا كَذَّبُوْا مِنْ قَبْلُ یعنی پیغمبروں کی بعثت سے پہلے جو توحید کی تکذیب کرتے تھے اس پر برابر قائم رہے ایمان نہ لائے۔ یا یہ مطلب کہ پیغمبر جس شریعت اور رسالت کو لے کر ان کے پاس پہنچے۔ انہوں نے اس کی تکذیب کی اور پھر اس تکذیب پر ساری عمر قائم رہے پیغمبروں کی دعوت نے ان پر کوئی اثر نہ کیا نہ پیہم معجزات سے ان کی انکاری حالت بدلی۔

بغوی نے لکھا ہے کہ حضرت ابن عباسؓ اور سدی نے آیت کے مطلب کی توضیح اس طرح کی ہے کہ بروز میثاق جو ان سے ایمان کا عہد لیا گیا تھا اور زبانوں سے انہوں نے اقرار کیا تھا مگر دلوں میں تکذیب پوشیدہ رکھی تھی تو پیغمبروں کی بعثت کے بعد بھی وہ ایمان لانے والے تھے نہ ایمان لائے۔ پس اللہ نے ان کو ہلاک کر دیا۔ مجاہد نے کہا آیت کا مطلب یہ ہے کہ ہلاک

کئے جانے سے پہلے جس طرح انہوں نے تکذیب کی تھی اگر ہم ہلاکت کے بعد ان کو پھر زندہ کر دیتے تب بھی وہ ایمان لانے والے نہ تھے۔ تقریباً ایسا ہی مضمون دوسری آیت میں آیا ہے فرمایا ہے وَلَوْ رُدُّوْا لَعَادُوْا لِمَا نُهُوْا عَنْهُ۔

یمان بن رباب نے توضیح مطلب اس طرح کی ہر نبی نے اپنی قوم کو عذاب سے ڈرایا لیکن انہوں نے پیغمبر کی تصدیق نہیں کی۔ نتیجہ میں اللہ نے ان کو ہلاک کر دیا۔ پھر ان کے بعد دوسری قومیں آئیں اور ان کے پیغمبروں نے عذاب سے ڈرایا لیکن انہوں نے بھی گزشتہ اقوام کی طرح اس چیز کی تکذیب کی جس کی تکذیب گزشتہ قومیں کرتی چلی آئی تھیں۔ اسی کی مثل دوسری آیت آئی ہے فرمایا ہے مَآ اَتَى الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ مِّنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا قَالُوْا سَاحِرٌ اَوْ مَجْنُوْنٌ۔

كَذٰلِكَ اسی طرح یعنی جس طرح گزشتہ کافروں کے دلوں پر ہم نے بند لگا دیئے تھے اسی طرح آپ کی قوم کے کافروں کے متعلق ہم نے لکھ دیا ہے کہ وہ ایمان نہیں لائیں گے۔ لہٰذا اتمام نشانیاں اور ڈراوے دیکھنے کے بعد بھی ان کے دل نرم نہیں پڑیں گے۔ وَمَا وَجَدْنَا لِاَكْثَرِهِمْ یعنی اکثر لوگوں کا ہلاک کردہ قوموں میں سے اکثر کا۔ اول صورت میں یہ جملہ مستقل اور اعتراضیہ ہو جائے گا۔ مِّنْ عَهْدٍ (مضاف محذوف ہے) یعنی ایفاء عہد۔ عہد سے مراد ہے، عہد میثاق، جو حضرت آدم کی پشت سے تمام ذریات کو نکال کر لیا گیا تھا یا وہ عہد مراد ہے کہ مصیبت اور دشمنوں کے خوف سے گھر کر جب ان لوگوں نے کہا تھا لَئِنْ اَنْجَيْتَنَا مِنْ هٰذِهٖ لَنَكُوْنَنَّ مِنَ الشّٰكِرِيْنَ اگر تو ہم کو اس سے بچائے گا تو ہم شکر ادا کرنے والوں میں سے (یعنی مومنوں اور طاعت گزاروں میں سے) ہو جائیں گے۔ وَاِنْ وَّجَدْنَآ اَكْثَرَهُمْ لَفٰسِقِيْنَ علماء کوفہ کا قول ہے کہ اِنْ اس جگہ نافیہ ہے اور لَ بمعنی الا (یعنی استثنائیہ) ہے۔ علمائے بصرہ کے نزدیک یہ اِنْ مخففہ ہے اس صورت میں وَجَدْنَا کا معنی ہوگا علمنا کیونکہ ان مخففہ صرف ان افعال پر داخل ہوتا ہے جو مبتدا خبر پر داخل ہوتے ہوں۔

ثُمَّ بَعَثْنَا مِنْۢ بَعْدِهِمْ مُّوْسٰى بِاٰيٰتِنَآ اِلٰى فِرْعَوْنَ وَمَلَا۟ئِهٖ فَظَلَمُوْا بِهَا ۚ فَانْظُرْ كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُفْسِدِيْنَ ۝ (پھر ان کے بعد ہم نے موسیٰ کو اپنی نشانیاں دے کر فرعون اور اس کے درباریوں کے پاس بھیجا لیکن انہوں نے ہماری نشانیوں کا بالکل حق ادا نہ کیا سو دیکھو تو ان تخریب کاروں کا کیا انجام ہوا)۔ مِنْۢ بَعْدِهِمْ، هُمْ ضمیر پیغمبروں کی طرف راجع ہے یعنی نوح، ہود، صالح، لوط، شعیبؑ کی طرف راجع ہے ان کا ذکر آیت وَلَقَدْ جَآءَتْهُمْ رُسُلُهُمْ میں آچکا ہے۔ موسیٰ کے والد کا نام عمران تھا۔

بِاٰيٰتِنَا آیات سے مراد معجزے ہیں جن کا ذکر آئندہ آیات میں کیا گیا ہے۔ فرعون شاہ مصر کا لقب فرعون تھا جیسے شاہ فارس کا لقب کسریٰ تھا اس فرعون کا نام قابوس یا ولید بن مصعب بن ریان تھا۔ مَلَا۟ئِهٖ اشراف قوم، سرداران، امراء۔ فَظَلَمُوْا بِهَا ظلم کا لغوی معنی ہے کسی چیز کو بے محل رکھ دینا۔ آیات واضح کا تقاضا تھا کہ ان پر ایمان لایا جاتا لیکن فرعونیوں نے ان کو سحر مانا اور بجائے ایمان کے کفر کیا اس لئے یہ ظلم ہو گیا۔ كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُفْسِدِيْنَ۔ سب کا انجام برا ہوا سب کو دریا میں غرق کر دیا گیا

وَقَالَ مُوْسٰى يٰفِرْعَوْنُ اِنِّيْ رَسُوْلٌ مِّنْ رَّبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝ حَقِيْقٌ عَلٰٓى اَنْ لَّآ اَقُوْلَ عَلَى اللّٰهِ اِلَّا الْحَقَّ ۭ قَدْ جِئْتُكُمْ بِبَيِّنَةٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ فَاَرْسِلْ مَعِيَ بَنِيْٓ اِسْرَاۗءِيْلَ ۝ قَالَ اِنْ كُنْتَ جِئْتَ بِاٰيَةٍ فَاْتِ بِهَآ اِنْ كُنْتَ مِنَ الصّٰدِقِيْنَ ۝ (اور موسیٰ نے (فرعون سے) کہا اے فرعون میں رب العالمین کا رسول (فرستادہ) ہوں (اللہ نے مجھے تیرے پاس بھیجا ہے) میرے لئے یہی زیبا ہے کہ بجز حق کے اللہ کی طرف کوئی بات منسوب نہ کروں میں تم لوگوں کے پاس تمہارے رب کی طرف سے ایک بڑی دلیل بھی لے کر آیا ہوں لہٰذا بنی اسرائیل کو (چھوڑ دے اور) میرے ساتھ (ارض مقدسہ کو) چلے جانے کے لئے آزاد کر دے۔ (فرعون نے) کہا اگر تو کوئی معجزہ لے کر آیا ہے تو پیش کر اگر سچا ہے (تو ثبوت سامنے لا) وَقَالَ مُوْسٰى یعنی جب حضرت موسیٰ فرعون کے پاس پہنچے تو کہا۔ حَقِيْقٌ عَلٰى۔ بعض علماء کا خیال ہے کہ عَلٰى اس جگہ عَلَيَّ تھا چونکہ خلاف مقصود کا کلام میں وہم بھی نہیں ہو سکتا تھا اس لئے یاء متکلم کو حذف کر دیا گیا یا عَلٰى حرف جر ہے حَقِيْقٌ کے بعد اگرچہ باء آنا چاہئے تھی اور حَقِيْقٌ بِيْ کہنا چاہئے تھا لیکن شدت تمکن اور پورے بچاؤ کے مفہوم کو ظاہر کرنے

کے لئے عَلٰی کو ذکر کیا جیسے رَمَيْتُ بِالْقَوْسِ (میں نے کمان سے تیر پھینکا) کی جگہ رَمَيْتُ عَلَى الْقَوْسِ (میں نے کمان کو مضبوط پکڑ کے تیر پھینکا) بولا جاتا ہے یا یوں کہا جائے کہ چونکہ اس جگہ حَقِيقٌ کے اندر حَرِيصٌ کا معنی بھی ہے (میں حریص ہوں اور مجھ پر لازم ہے اس لئے حَقِيقٌ کے بعد عَلٰی ذکر کر دیا گیا کیونکہ حریص کے بعد عَلٰی آتا ہے۔ بِبَيِّنَةٍ یعنی ایسا ثبوت جو میرے رسول ہونے کی شہادت دے رہا ہے۔ فَأَرْسِلْ مَعِيَ یعنی بنی اسرائیل کو چھوڑ دے، ارض مقدسہ کو چلے جانے کی ممانعت اٹھا لے وہ ان کے اسلاف کا اصلی وطن ہے۔ فرعون نے بنی اسرائیل کو گویا قید بنا رکھا تھا انہیں بنانے، اٹھانے اور مٹی ڈھونے اور اسی طرح کے سخت محنت کرنے کے کام ان سے لیتا تھا (اور یہ سب خدمتیں جبریہ تھیں گویا سب کو غلام یا قیدی سمجھتا تھا) قَالَ فرعون نے موسیٰ کو جواب دیا۔ إِنْ كُنْتَ مِنَ الصّٰدِقِيْنَ اگر تو اپنے دعوے رسالت میں سچا ہے۔

فَأَلْقٰى عَصَاهُ فَإِذَا هِيَ ثُعْبَانٌ مُّبِيْنٌ ۝ وَّنَزَعَ يَدَهٗ فَإِذَا هِيَ بَيْضَآءُ لِلنّٰظِرِيْنَ ۝

(پس موسیٰ نے اپنا عصا (زمین پر) ڈال دیا تو وہ فوراً ایک کھلا ہوا اژدہا بن گیا اور (جیب کے اندر سے) اپنا ہاتھ نکالا تو دیکھنے والوں کو وہ سفید نور (بہت ہی چمکدار روشنی والا) دکھائی دینے لگا۔

ثُعْبَانٌ بڑا اژدہا، چھوٹے سانپ کی طرح لہراتا اور حرکت کرتا تھا اسی لئے دوسری آیت میں آیا ہے كَأَنَّهَا جَآنٌّ گویا وہ حرکت کرتا ہوا چھوٹا سانپ تھا۔ حضرت ابن عباسؓ اور سدی کی طرف اس قول کی نسبت کی گئی ہے کہ حضرت موسیٰ کی لاٹھی اژدہا بن گئی یہ اژدہا زرد رنگ کا تھا اس کے اوپر بال تھے سر پر کلغی تھی [illegible] کھولے تھا، دونوں جبڑوں کے درمیان اسّی ہاتھ کا فاصلہ تھا۔ ایک میل زمین سے اونچا تھا۔ نیچا جبڑا زمین پر اور بالا جبڑا قصر کی دیوار کے اوپر رکھے تھا اور لہرا کر فرعون کی طرف بڑھتا تھا۔ روایت میں آیا ہے کہ اژدہے نے فرعون کا قبہ منہ میں بھر لیا اور فرعون دم دبا کر بھاگا (اور ڈر کے مارے اس کو چار سو بار اسہال ہوئے۔ سانپ نے لوگوں پر حملہ کر دیا لوگ چیخیں مار کر بھاگے۔ پچیس آدمی آپس میں کچل کر مر بھی گئے۔ فرعون گھر میں گھس گیا اور چیخا۔ موسیٰ میں تجھے اسی کا واسطہ دیتا ہوں جس نے تجھے بھیجا ہے کہ اس کو پکڑ لے میں تجھ پر ایمان لے آؤں گا اور تیرے ساتھ بنی اسرائیل کو بھی بھیج دوں گا۔ حضرت موسیٰ نے سانپ کو پکڑ لیا تو وہ پھر سابق کی طرح لاٹھی بن گئی معمر کے طریق سے قتادہ کا بیان عبدالرزاق، ابن جریر، ابن المنذر اور ابن ابی حاتم نے اسی طرح نقل کیا ہے۔ پھر فرعون نے کہا کیا تیرے پاس کوئی اور معجزہ بھی ہے حضرت موسیٰ نے فرمایا ہاں۔ وَنَزَعَ يَدَهٗ اور گریبان کے اندر ہاتھ ڈال کر باہر نکالا۔ فَإِذَا هِيَ بَيْضَآءُ لِلنّٰظِرِيْنَ وہ ہاتھ بالکل نور تھا جس کی سفیدی غیر معمولی تھی اس کی شعاعیں چکا چوند پیدا کر رہی تھیں اور سورج کی کرنوں سے تیز تھیں لیکن باعث خوف نہ تھیں دیکھنے والوں کے لئے جاذب نظر تھیں۔ پھر حضرت موسیٰ نے گریبان کے اندر ہاتھ ڈال لیا تو ہاتھ جیسا تھا ویسا ہی ہو گیا۔

قَالَ الْمَلَاُ مِنْ قَوْمِ فِرْعَوْنَ إِنَّ هٰذَا لَسٰحِرٌ عَلِيْمٌ ۝ يُّرِيْدُ أَنْ يُّخْرِجَكُمْ مِّنْ أَرْضِكُمْ فَمَاذَا تَأْمُرُوْنَ ۝
قَالُوْٓا أَرْجِهْ وَأَخَاهُ وَأَرْسِلْ فِي الْمَدَآئِنِ حٰشِرِيْنَ ۝ يَأْتُوْكَ بِكُلِّ سٰحِرٍ عَلِيْمٍ ۝

(قوم فرعون کے سرداروں نے (آپس میں) کہا کوئی شک نہیں کہ یہ بڑا ماہر جادوگر ہے جو تم کو تمہارے ملک سے نکال باہر کر دینا چاہتا ہے اب تم لوگوں کو (اس کے متعلق) کیا مشورہ ہے انہوں نے کہا اس کو اور اس کے بھائی کو ابھی مہلت دو اور شہروں میں (جادوگروں کو) جمع کرنے والے آدمیوں کو بھیج دو تاکہ وہ تمہارے پاس بڑے سے بڑے ماہر جادوگر کو لے آئیں۔

عَلِيْمٌ سے مراد ہے ماہر جادوگر جو نظر بندی کر کے لوگوں کو لاٹھی کا سانپ اور ہاتھ کی معمولی جلد کو چکدار شعاع ریز بنا کر دکھاتا ہے اور غیر واقعی چیز کو دیکھنے میں واقعی بنا دیتا ہے اس جگہ اس قول کا قائل سرداروں کو قرار دیا اور سورۂ شعراء میں اس قول کی نسبت فرعون کی طرف کی گئی ہے بظاہر معلوم ہوتا ہے کہ یہ قول بطریق مشورہ سب کا تھا فرعون کا بھی اور سرداروں کا بھی یا فرعون نے شروع میں کہا تھا اور سرداروں نے یہی بات آپس میں مشورہ میں طے کر دی اور اپنے ماتحتوں سے بھی کہہ دی۔ يُّرِيْدُ أَنْ يُّخْرِجَكُمْ یہ چاہتا ہے کہ اے قبطیو! تم کو یہاں سے نکال دے۔ مِنْ أَرْضِكُمْ یعنی مصر۔ فَمَاذَا تَأْمُرُوْنَ یہ کلام یا تو اسی

قول کا حصہ ہے جو سرداروں نے فرعون سے اور خاص خاص امراء سے کہا تھا اس صورت میں امر بمعنی حکم حقیقۃً ہوگا (کیونکہ حقیقت میں فرعون اور اس کے خاص امراء کے ہاتھوں میں قوت آمرہ تھی) کیا یہ آخری فقرہ انہوں نے آپس میں اور اپنے ماتحتوں سے کہا تھا تو اس وقت امر کا معنی ہوگا مشورہ دینا کیونکہ مشورہ دینے والا امر تجاتا ہے مشورہ طلب بات کی تعلیم دیتا ہے گویا حکم دیتا ہے یہ بھی ہو سکتا ہے کہ فَمَاذَا تَأْمُرُوْنَ ان لوگوں کا قول ہو جن سے سرداروں نے کہا تھا اِنَّ هٰذَا لَسٰحِرٌ عَلِيْمٌ یعنی سرداروں نے کہا یہ بڑا جادوگر ہے تو انہوں نے جواب دیا پھر آپ لوگوں کا کیا مشورہ یا کیا حکم ہے (کیا تدبیر کی جائے) اس صورت میں یہ فرعون کا اور اس کے دوسرے سرداروں کا قول ہوگا یا اول فرعون کا پھر دوسرے لوگوں کا کلام ہوگا اور آخر میں بالاتفاق سب کا مشورہ ہو گیا اور سب نے فرعون سے کہا اَرْجِهْ وَاَخَاهُ اس کو اور اس کے بھائی کو مہلت دیجئے (اَرْجِهْ اصل میں اَرْجِئْه تھا) صاحب قاموس نے لکھا ہے اَرْجَأَ الْاَمْرَ اس کام کو مؤخر کر دیا یعنی موسیٰؑ پر نہ ایمان لانے میں جلدی کرو نہ ان کو قتل کرنے میں عجلت سے کام لو (ابھی کچھ مدت یونہی رہنے دو) تاکہ حقیقت امر ظاہر ہو جائے۔ فِي الْمَدَائِنِ یعنی صعید علاقہ مصر کی بستیوں میں کچھ سپاہیوں اور سرکاری آدمیوں کو بھیج دو۔ اس علاقہ میں بڑے بڑے جادوگر رہتے تھے۔ حٰشِرِيْنَ یعنی پولیس اور دوسرے کارندوں کو جو جادوگروں کو جمع کریں۔

يَأْتُوْكَ یہ جواب امر ہے یعنی اگر آپ بھیج دیں گے تو وہ بڑے سے بڑے جادوگروں کو جمع کر لائیں گے۔ ان کے مقابلہ میں اگر موسیٰؑ غالب ہو گئے تو ہم اس پر ایمان لے آئیں گے۔ اگر جادوگروں کو غلبہ حاصل ہو گیا تو ہم سمجھ لیں گے موسیٰ جادوگر ہے۔ بغویؒ نے حضرت ابن عباسؓ سدی اور ابن اسحٰق کے حوالے سے لکھا ہے کہ جب فرعون نے موسیٰ کی لاٹھی میں بڑی قوت دیکھ لی تو کہنے لگا ہم موسیٰؑ کی قوم کے آدمیوں کے بغیر اس پر غالب نہیں آ سکتے۔ چنانچہ بنی اسرائیل کے کچھ لڑکوں کو غرما کی بستی میں جادو سیکھنے بھیج دیا جادوگروں نے ان کو خوب جادو سکھایا اور موسیٰؑ سے کچھ مدت ٹھہرے رہنے کا معاہدہ کر لیا جب وہ لوگ جادو سیکھ گئے تو ان کو استاد سمیت طلب کیا اور پوچھا تم نے کیا کیا انہوں نے جواب دیا ہم نے جو جادو سیکھا ہے روئے زمین کے سارے جادوگر اس کا مقابلہ نہیں کر سکتے ہاں اگر کوئی آسمان سے آئی ہوئی چیز ہو تو ہم میں مقابلہ کی طاقت نہیں۔ اس کے بعد فرعون نے اپنی قلمرو کے تمام جادوگروں کو جمع کیا۔ مقاتل نے ان کی تعداد ۷۲ بتائی ہے جن میں ستر اسرائیلی اور دو قبطی تھے قبطیوں میں سے ایک شمعون تھا جو سب کا سرگروہ تھا۔ کلبی نے کہا یہ جادوگر ستر تھے اور ایک ان کا سرگروہ تھا انہوں نے ان دو آدمیوں سے جادو سیکھا تھا جو نینوا کے باشندے تھے مگر فرعون کے جیل خانہ میں بند تھے۔ کعب نے بارہ ہزار اور سدی نے کچھ اوپر تیس ہزار، عکرمہ نے ستر ہزار اور محمد بن منکدر نے اسی ہزار تعداد بیان کی ہے۔

وَجَاءَ السَّحَرَةُ فِرْعَوْنَ قَالُوْا إِنَّ لَنَا لَأَجْرًا إِنْ كُنَّا نَحْنُ الْغٰلِبِيْنَ ۝ قَالَ نَعَمْ وَإِنَّكُمْ لَمِنَ الْمُقَرَّبِيْنَ ۝ قَالُوْا يٰمُوْسٰى إِمَّا أَنْ تُلْقِيَ وَإِمَّا أَنْ نَّكُوْنَ نَحْنُ الْمُلْقِيْنَ ۝ قَالَ أَلْقُوْا

(اور وہ جادوگر فرعون کے پاس آئے اور کہنے لگے اگر غالب آ گئے تو ہم کو بہت بڑا صلہ ہوگا، فرعون نے کہا ہاں (بہت بڑا انعام ملے گا) اور (مزید یہ کہ) تم مقرب لوگوں میں سے ہو جاؤ گے پھر جادوگروں نے موسیٰ علیہ السلام سے کہا آپ (پہلے) ڈالئے اور یا ابتداء میں ڈالنے والے ہم ہی ہوں، موسیٰؑ نے کہا تم ہی ڈالو) وَجَاءَ السَّحَرَةُ یعنی سپاہیوں اور کارندوں کے ساتھ جادوگر فرعون کے پاس آ گئے۔ قَالُوْا یہ جملہ استینافیہ ہے ایک محذوف سوال کا جواب ہے گویا کسی نے پوچھا پھر جادوگروں نے کیا کہا تو جواب دیا کہ جادوگروں نے یہ بات کہی۔ إِنَّ لَنَا لَأَجْرًا یہ کلام خبری ہے یعنی اگر ہم غالب آ جائیں تو ہمارا حق الخدمت بہت بڑا ہے۔ وَإِنَّكُمْ لَمِنَ الْمُقَرَّبِيْنَ اس جملہ کا عطف محذوف جملہ پر ہے یعنی فرعون نے کہا تمہارا حق الخدمت بہت بڑا ہوگا اور تم میرے مقربوں میں سے ہو جاؤ گے تمہارا مرتبہ اونچا ہو جائے گا۔ فرعون نے جواب میں اضافہ کو مقابلہ کی ترغیب دینے کے لئے کیا (ورنہ نعم کہہ دینا کافی تھا)۔

مقاتل کا بیان ہے کہ فرعون کی موجودگی میں حضرت موسیٰؑ نے ان کے بڑے جادوگر سے کہا اگر میں غالب آ جاؤں گا

ہو جاتے ہیں)۔

وَاُلْقِيَ السَّحَرَةُ سٰجِدِيْنَ گرا دیے گئے یعنی اللہ نے ان کو سجدہ میں گرا دیا۔ یہ نہیں فرمایا کہ وہ سجدہ میں گر گئے بلکہ صیغہ مجہول استعمال کیا تاکہ یہ معلوم ہو جائے کہ ظہور حق نے ان کو بے اختیار سجدہ میں گرا دیا اور وہ بے قابو ہو گئے۔ بعض نے یہ مطلب بیان کیا ہے کہ اللہ نے ان کے دلوں میں سجدہ میں گر پڑنے کا ارادہ پیدا کر دیا جس کی وجہ سے وہ سجدہ میں گر پڑے۔ اخفش نے کہا وہ فوراً ہی سجدہ میں گر پڑے معلوم ہوتا تھا کہ کسی نے ان کو سجدہ میں گرا دیا۔

رَبِّ مُوْسٰى وَهٰرُوْنَ رب العلمین کے بعد رب موسیٰ وہارون کہنے سے اس خیال کو دور کرنا مقصود ہے کہ شاید رب العلمین سے ان کی مراد فرعون ہو۔ حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا جب جادوگر ایمان لے آئے تو حضرت موسیٰ کے پیچھے چھ لاکھ بنی اسرائیل ہو گئے۔ اٰمَنْتُمْ بِهٖ یعنی اللہ پر یا موسیٰ پر تم ایمان لے آئے۔ اِنَّ هٰذَا حقیقت میں یہ فعل ایک سازش تھی جو تم نے اور موسیٰ نے مل کر تیار کی تھی۔ فِي الْمَدِيْنَةِ یعنی تاریخ مقررہ پر یہاں آنے سے پہلے مصر کے اندر تم نے یہ سازش کی تھی۔ لِتُخْرِجُوْا مِنْهَآ اَهْلَهَا کہ مصر سے اہل مصر یعنی قبطیوں کو نکال دو اور ملک مصر تمہارا اور بنی اسرائیل کا ہو جائے۔ فَسَوْفَ تَعْلَمُوْنَ تم نے جو حرکت کی اس کا نتیجہ تم کو ابھی معلوم ہو جائے گا۔ اس جملہ میں فرعون نے مبہم دھمکی دی جس کی توضیح آگے کلام میں کر دی۔

لَاُقَطِّعَنَّ اَيْدِيَكُمْ وَاَرْجُلَكُمْ مِّنْ خِلَافٍ ثُمَّ لَاُصَلِّبَنَّكُمْ اَجْمَعِيْنَ ۝ قَالُوْٓا اِنَّآ اِلٰى رَبِّنَا مُنْقَلِبُوْنَ ۝ وَمَا تَنْقِمُ مِنَّآ اِلَّآ اَنْ اٰمَنَّا بِاٰيٰتِ رَبِّنَا لَمَّا جَآءَتْنَا ؕ رَبَّنَآ اَفْرِغْ عَلَيْنَا صَبْرًا وَّتَوَفَّنَا مُسْلِمِيْنَ ۝

(میں تمہارے ایک طرف کے ہاتھ اور دوسری طرف کے پاؤں کاٹ دوں گا پھر تم سب کو سولی پر چڑھا دوں گا انہوں نے جواب دیا (کچھ پرواہ نہیں) ہم اپنے رب کے پاس ضرور لوٹ کر جائیں گے اور تو نے ہم میں کونسا عیب دیکھا بجز اس کے کہ ہم نے اپنے رب کے احکام کو مان لیا جب وہ احکام ہمارے پاس آ گئے۔ اے ہمارے رب ہم پر صبر کا فیضان فرما اور ہماری جانیں حالت اسلام پر نکال)۔

مِّنْ خِلَافٍ یعنی ایک طرف کا ہاتھ دوسری طرف کا پاؤں لَاُصَلِّبَنَّكُمْ یعنی دریائے مصر کے کنارے درختوں کے تنوں پر تم کو صلیب پر لٹکا دوں گا تاکہ تمہاری رسوائی اور دوسروں کو عبرت ہو۔

حضرت ابن عباسؓ کا ایک قول ابن جریر، ابن منذر اور ابن ابی حاتم نے نقل کیا ہے کہ سب سے پہلے سولی چڑھانے کا طریقہ فرعون نے ہی ایجاد کیا۔ قَالُوْا یعنی جادوگروں نے فرعون سے کہا اِنَّآ اِلٰى رَبِّنَا مُنْقَلِبُوْنَ ہم کو تیری دھمکی کی پروا نہیں مرنے کے بعد آخر ہمیں اپنے رب کے پاس ہی لوٹ کر جانا ہے یا یہ مطلب ہے کہ ہم کو تم کو سب کو رب کے پاس لوٹ کر جانا ہے وہی ہمارا آپس کا فیصلہ کرے گا۔ وَمَا تَنْقِمُ یعنی تجھے ہمارے اندر اور کوئی بات بری نظر نہیں آئی صرف اتنی بات ہوئی کہ ہم ایمان لے آئے اور ایمان بہترین عمل ہے اس کو عیب قرار دینا جائز نہیں۔ لہٰذا تیری خوشنودی حاصل کرنے اور تیری دھمکی سے مرعوب ہونے کی وجہ سے ہم ایمان سے منہ نہیں موڑ سکتے۔ پھر اللہ کی طرف انہوں نے کلام کا رخ موڑا اور دعا کی۔ اَفْرِغْ عَلَيْنَا صَبْرًا ہم پر صبر بہا دے، صبر کا فیضان کر دے تاکہ فرعون کی دھمکی ہم کو ایمان سے نہ روک سکے۔ وَتَوَفَّنَا مُسْلِمِيْنَ اور مرنے کے وقت ہم کو ایمان پر ثابت قدم رکھ۔ کلبی کا بیان ہے کہ دھمکی کے مطابق فرعون نے مومن جادوگروں کے ہاتھ پاؤں کٹوا دیے اور صلیب پر لٹکوا دیا۔ لیکن دوسرے علماء کا قول ہے کہ فرعون ایسا نہ کر سکا کیونکہ اللہ نے فرمایا تھا لَا يَصِلُوْنَ اِلَيْكُمَا ۚ بِاٰيٰتِنَآ اَنْتُمَا وَمَنِ اتَّبَعَكُمَا الْغٰلِبُوْنَ ان کی دسترس تم دونوں تک نہ ہوگی تم دونوں اور تمہاری پیروی کرنے والے ہی غالب رہیں گے۔

وَقَالَ الْمَلَاُ مِنْ قَوْمِ فِرْعَوْنَ اَتَذَرُ مُوْسٰى وَقَوْمَهٗ لِيُفْسِدُوْا فِي الْاَرْضِ وَيَذَرَكَ وَاٰلِهَتَكَ ؕ قَالَ سَنُقَتِّلُ اَبْنَآءَهُمْ وَنَسْتَحْيٖ نِسَآءَهُمْ ۚ وَاِنَّا فَوْقَهُمْ قٰهِرُوْنَ ۝ (قوم فرعون کے سرداروں نے (فرعون

سے) کہا کیا آپ موسیٰ کو اور اس کی قوم کو (یونہی آزاد) چھوڑے رکھیں گے کہ وہ ملک میں فساد کرتے رہیں اور آپ سے اور آپ کے معبودوں سے بیزار رہیں فرعون نے کہا ہم ضرور ان کے (نوزائیدہ) لڑکوں کو قتل کرادیں گے اور ان کی (نوزائیدہ) لڑکیوں کو جیتا چھوڑ دیں گے اور ہم ان پر پورا قابو رکھتے ہیں)۔ لِيُفْسِدُوْا فِي الْاَرْضِ یعنی تیرے خلاف لوگوں کو آمادہ کرتے اور بگاڑتے رہیں۔ وَاٰلِهَتَكَ یعنی تیری دیویوں کو مقصد یہ کہ نہ تیری پوجا کریں نہ تیری دیویوں کی۔ حضرت ابن عباسؓ کا بیان ہے کہ فرعون کے پاس ایک گائے تھی جس کی وہ پوجا کرتا تھا اور اسے حکم دے رکھا تھا کہ جو خوبصورت گائے ملے تو اس کی پوجا کی جائے (گویا تمام قبطی ہندوؤں کی طرح گائے کے پجاری تھے) اسی لئے سامری نے بچھڑا بنا کر بنی اسرائیل کو اس کی پوجا کرنے کا مشورہ دیا تھا۔ حسن کا بیان ہے فرعون نے اپنے گلے میں ایک صلیب لٹکا رکھی تھی جس کی پوجا کرتا تھا۔ سدی نے کہا فرعون نے کچھ بت بنوا کر رکھوا دیئے تھے اور اپنی قوم کو ان کی پوجا کرنے کا حکم دیا تھا اور کہہ دیا تھا یہ تمہارے معبود ہیں مگر تمہارا اور ان سب کا رب میں ہوں اسی لئے اس نے قوم سے کہا تھا اَنَا رَبُّكُمُ الْاَعْلٰى یہ بھی کہا گیا ہے کہ قبطی ستارہ پرست یا سورج پرست تھے۔

سَنُقَتِّلُ باب تفعیل تکثیر کے لئے ہے یعنی ہم ان کے بہت بچوں کو قتل کردیں گے۔ وَنَسْتَحْيٖ یعنی اور ان کی لڑکیوں کو زندہ چھوڑ دیں گے جیسے (موسیٰؑ کی پیدائش سے) پہلے کرتے تھے۔ وَاِنَّا فَوْقَهُمْ قٰهِرُوْنَ ہم ان پر غالب ہیں وہ ہم سے زیردست ہیں۔ حضرت ابن عباسؓ کا بیان ہے کہ موسیٰؑ کی پیدائش کے سال فرعون بچوں کو قتل کراتا تھا۔ فرعون نے پھر قتل اطفال کا حکم دے دیا کہ بنی اسرائیل میں ایک لڑکا پیدا ہوگا جس کے ہاتھوں فرعون کی حکومت تباہ ہوگی اگر موسیٰؑ وہی شخص ہوتا تو اب جب کہ (موسیٰؑ موجود ہے) قبطی بنی اسرائیل پر کیوں غالب رہتے۔

فرعون نے جب قتل بنی اسرائیل کا دوسرا دور شروع کردیا تو بنی اسرائیل نے یہ دکھ حضرت موسیٰؑ سے بیان کیا۔

قَالَ مُوْسٰى لِقَوْمِهِ اسْتَعِيْنُوْا بِاللّٰهِ وَاصْبِرُوْا ۚ اِنَّ الْاَرْضَ لِلّٰهِ ۙ يُوْرِثُهَا مَنْ يَّشَاۤءُ مِنْ عِبَادِهٖ ۭ وَالْعَاقِبَةُ لِلْمُتَّقِيْنَ ۝ (موسیٰ نے اپنی قوم سے کہا اللہ سے مدد کی دعا کرو اور صبر رکھو بلاشبہ ساری زمین اللہ کی ہے وہی اپنے بندوں میں سے جس کو چاہتا ہے اس کا وارث بنا دیتا ہے لیکن اچھا انجام پرہیزگاروں کا ہوتا ہے)۔

اِسْتَعِيْنُوْا یعنی اللہ سے گڑگڑا کر مدد کی دعا کرو اور اسی پر بھروسہ رکھو۔ وَاصْبِرُوْا یعنی فرعون اور اس کی قوم کی طرف سے جو دکھ اور اذیت تم کو پہنچ رہی ہے اس پر صبر کرو یہ سب کچھ اللہ کے فیصلے، مشیت اور امتحان کے زیر اثر ہو رہا ہے۔ اِنَّ الْاَرْضَ لِلّٰهِ یعنی سارا ملک اللہ کا ہے وہ جس کو چاہتا ہے دیتا ہے کوئی کافر ہو یا مسلم سب کو دے دیتا ہے۔ اس پر اعتراض کرنا درست نہیں۔ وَالْعَاقِبَةُ لِلْمُتَّقِيْنَ یعنی نیکیوں کا لازوال ثواب اور دوامی سعادت اور جنت متقیوں کے لئے ہے۔ لہٰذا آخرت کی طلب کرو جو لازوال ہے اور دنیوی مصائب پر صبر کرو جو فناپذیر ہیں۔

عُقْبٰى اور عَاقِبَةٌ پیچھے آنے والی چیز۔ فعل کے بعد اس کا بدلہ آتا ہے اس لئے اس کو عقبیٰ یا عاقبت کہا جاتا ہے مگر عرف عام میں عقبیٰ عاقبت اور عقب کے الفاظ صرف اچھے بدلے اور ثواب کے لئے مستعمل ہیں اور عقوبت، معاقبت اور عقاب کا استعمال صرف عذاب، سزا اور برے عوض کے لئے ہوتا ہے۔ اللہ نے فرمایا ہے اُولٰٓئِكَ لَهُمْ عُقْبَى الدَّارِ۔ وَنِعْمَ عُقْبَى الدَّارِ۔ وَخَيْرٌ عُقْبًا (یعنی ثواب و جزاء) فَحَقَّ عِقَابِ۔ شَدِيْدُ الْعِقَابِ۔ وَاِنْ عَاقَبْتُمْ فَعَاقِبُوْا بِمِثْلِ مَا عُوْقِبْتُمْ بِهٖ (یعنی دکھ اور تکلیف) یہ بھی ہو سکتا ہے کہ الْاَرْضَ سے مراد ملک مصر ہو یعنی فرعون کے بعد ملک مصر کا وارث اللہ تم کو کردے گا اور آخرت میں تم کو کامیابی اور فتح حاصل ہوگی۔

قَالُوْٓا اُوْذِيْنَا مِنْ قَبْلِ اَنْ تَاْتِيَنَا وَمِنْۢ بَعْدِ مَا جِئْتَنَا ۭ قَالَ عَسٰى رَبُّكُمْ اَنْ يُّهْلِكَ عَدُوَّكُمْ وَيَسْتَخْلِفَكُمْ فِي الْاَرْضِ فَيَنْظُرَ كَيْفَ تَعْمَلُوْنَ ۝ (انہوں نے کہا ہم تو ہمیشہ مصیبت میں ہی رہے آپ کے آنے سے پہلے بھی اور آپ کے آنے کے بعد بھی موسیٰ نے کہا بہت جلد اللہ تمہارے دشمن کو ہلاک کردے گا اور بجائے

ان۔ کہ تم کو اس سرزمین کا مالک بنا دے پھر تمہارا طرز عمل دیکھے گا)۔

مِنْ قَبْلِ اَنْ تَاْتِيَنَا یعنی آپ کے پیغمبر ہو کر آنے سے پہلے ہم کو دکھ پہنچایا گیا۔ ہمارے (نوزائیدہ) لڑکوں کو قتل کیا گیا وَمِنْ بَعْدِ مَا جِئْتَنَا اب آپ کی بعثت کے بعد پورے دن بیگار لی جاتی ہے۔ کلبی نے ذکر کیا ہے کہ حضرت موسیٰ کی بعثت سے پہلے فرعون بنی اسرائیل سے [illegible] پتھر ڈھونے کی خدمت لیتا تھا مگر مٹی گارا فراہم کرنے کا انتظام خود کرتا تھا اور حضرت کی بعثت کے بعد حکم دے دیا کہ بنی اسرائیل خود اپنے پاس سے مٹی گارے کا بھی انتظام کریں اور اینٹیں بھی بنائیں۔

وَيَسْتَخْلِفَكُمْ یعنی فرعون کو ہلاک کر کے ملک میں ان کی جگہ تم کو قائم کر دے۔ فَيَنْظُرَ كَيْفَ تَعْمَلُوْنَ اور پھر دیکھے کہ تم شکر اور طاعت کرتے ہو یا ناشکری اور معصیت۔ اللہ نے بنی اسرائیل کو فتحیاب بنانے اور ان کی مدد کرنے کا وعدہ فرمایا لیکن اس بات کی طرف اشارہ کر دیا کہ ان کی آزمائش دونوں طرح سے کی جائے گی راحت سے بھی اور تکلیف سے بھی حصول خیر کے وقت شکر واجب ہے اور مصیبت آنے پر صبر ضروری ہے۔ یہ وعدہ اللہ نے پورا کر دیا فرعون کو غرق کر دیا قبطیوں کے ملک اور مال و جائداد کا مالک بنی اسرائیل کو کر دیا لیکن انہوں نے بچھڑے کی پوجا کی۔ روایت میں آیا ہے کہ حضرت داؤد کے زمانہ میں مصر پر بنی اسرائیل کا قبضہ ہوا۔

وَلَقَدْ اَخَذْنَآ اٰلَ فِرْعَوْنَ بِالسِّنِيْنَ وَنَقْصٍ مِّنَ الثَّمَرٰتِ لَعَلَّهُمْ يَذَّكَّرُوْنَ ۝ فَاِذَا جَآءَتْهُمُ الْحَسَنَةُ قَالُوْا لَنَا هٰذِهٖ ۚ وَاِنْ تُصِبْهُمْ سَيِّئَةٌ يَّطَّيَّرُوْا بِمُوْسٰى وَمَنْ مَّعَهٗ ۗ اَلَآ اِنَّمَا طٰٓئِرُهُمْ عِنْدَ اللّٰهِ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ ۝

(اور ہم نے فرعون والوں کو قحط سالیوں میں اور پھلوں کی پیداوار کی کمی میں مبتلا کر دیا تاکہ وہ نصیحت پکڑیں۔ لیکن جب ان پر خوشحالی آتی تو کہتے یہ تو ہمارے لئے ہونا ہی چاہئے اور اگر کوئی بدحالی پیش آتی تو موسیٰ اور ان کے ساتھیوں کو نحوست بتاتے یاد رکھو ان کی نحوست کا سبب اللہ کے علم میں ہے لیکن اکثر لوگ نہیں جانتے تھے)

بِالسِّنِيْنَ قحط سالی، کال۔ اَلسَّنَةُ عام تغلیب استعمال میں اس کا معنی ہو گیا قحط سالی خشک سال کیونکہ قحط سالی ہی آئندہ کے لئے یادگاری سال اور تاریخی وقت ہو جاتا ہے پھر اَلسَّنَةُ سے مشتقات استعمال کئے جانے لگے مثلاً کہا جاتا ہے اَسْنَتَ الْقَوْمُ وہ لوگ قحط میں مبتلا ہو گئے مَسَّتْهُمُ السَّنَةُ ان پر کال پڑ گیا۔ بعض اہل تفسیر نے اَلسِّنِيْنَ کو بصیغہ جمع ذکر کرنے سے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ آیت میں پیہم کال مراد ہے یعنی سال در سال مسلسل قحط۔ وَنَقْصٍ مِّنَ الثَّمَرٰتِ پھلوں کی کمی۔ یعنی آفت (ارضی و سماوی) آفات و مہلکات کے ذریعہ پھلوں کی بربادی۔ قتادہ نے کہا قحط سالی (یعنی غلہ کی پیداوار میں کمی) تو دیہاتیوں کے لئے ہوئی اور پھلوں کی پیداوار میں کمی شہریوں کے لئے۔ لَعَلَّهُمْ يَذَّكَّرُوْنَ تاکہ وہ متنبہ ہو جائیں اور سمجھ جائیں کہ یہ قحط سالیاں اور پھلوں کی بربادیاں ان کے کفر و معصیت کی نحوست کی وجہ سے آئی ہے۔ یہ مطلب ہے کہ ان کے دلوں میں نرمی پیدا ہو جائے اور وہ اللہ سے توبہ کریں۔ اَلْحَسَنَةُ سرسبزی، خوشحالی، عافیت۔ قَالُوْا لَنَا یعنی فرعون والوں نے کہا۔ هٰذِهٖ یہ ہماری وجہ سے ہے ہم اس کے مستحق ہیں ہم یوں ہی فراخ حال چلے آتے ہیں ہماری یہ معمولی حالت ہے مطلب یہ کہ انہوں نے فراغ حالی کو اللہ کی دین اور نعمت نہ سمجھا نہ شکر گزار ہوئے۔ سَيِّئَةٌ کوئی ناگوار مصیبت، کال، بدحالی۔ يَّطَّيَّرُوْا بِمُوْسٰى وَمَنْ مَّعَهٗ یعنی جب تک یہ لوگ نہ تھے ہم پر کبھی یہ مصیبت نہیں آئی معلوم ہوا کہ موسیٰ اور اس کی قوم کی نحوست ہی کی وجہ سے ہم پر یہ بلا آئی۔

سعید بن جبیر اور محمد بن منکدر کا بیان ہے کہ فرعون کی بادشاہت چار سو برس رہی اور چھ سو بیس برس کی عمر تک اس کو کبھی کوئی دکھ نہیں ہوا اگر کسی دن اس کو بھوک پیاس یا بخار یا گھڑی بھر کے لئے بھی درد کی تکلیف پہنچ جاتی تو وہ رب ہونے کا دعویٰ نہ کر سکتا مگر رب کا یہ دعویٰ اور فرعون دونوں کا مندرجہ بیت قول اس بات کی علامت ہے کہ وہ انتہائی حماقت میں مبتلا تھے اور ان کے دل پتھر کی طرح سخت ہو گئے تھے کہ پیہم مشاہدہ آیات بھی ان پر کوئی اثر نہ ڈالتا تھا وہ نہ سمجھے کہ حالات کا فروغ اور خوش معاشی تو اللہ کی مہربانی اور امتحان ہے جب اللہ کی اس نعمت کا شکر انہوں نے ادا نہیں کیا اور اللہ کے رسول نے شکر و طاعت کی ان

کو دعوت دی اور معجزات بھی پیش کئے مگر انہوں نے اس دعوت کو بھی ٹھکرا دیا اور برابر عصیان کوشیوں میں غرق رہے تو اللہ نے بطور سزا ان کے اعمال کی نحوست کی وجہ سے ان پر قحط کو مسلط کر دیا۔

اِنَّمَا طٰٓئِرُهُمْ عِنْدَ اللّٰهِ یعنی ان کی نحوست ان کے کفر اور تکذیب کی وجہ سے (بصورت قحط) اللہ کی طرف سے آئی ہے کذا قال ابن عباسؓ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ لَا یَعْلَمُوْنَ لیکن ان میں سے اکثر لوگ اپنی انتہائی حماقت کے سبب نہیں جانتے کہ جو قحط وغیرہ ان پر مسلط کیا گیا وہ اللہ کی طرف سے عذاب ہے۔ یا طائر سے مراد ہے نصیب خیر و شر جو من عند اللہ ہے۔ قاموس میں ہے کہ طائر کا معنی ہے اچھا برا شگون نصیب۔ آدمی کا عمل آدمی کا رزق۔ یا سبب خیر و شر مراد ہے یعنی اللہ کا حکم۔ یا سبب نحوست مراد ہے یعنی ان کی وہ بداعمالیاں جو اللہ کے پاس لکھی ہوئی ہیں اور جو ان بدحالیوں کا سبب ہیں۔ بعض علماء کے نزدیک آیت کا مطلب یہ ہے کہ ان کی بڑی بدبختی تو وہ ہے جو اللہ کے پاس ہے یعنی دوزخ کا عذاب۔

بیضاویؒ نے لکھا ہے کہ اَلْحَسَنَةُ کو لام تعریف کے ساتھ ذکر کیا اور سَیِّئَةٌ کو بصورت نکرہ پھر اَلْحَسَنَةُ کے ساتھ اِذَا ذکر کیا جو فعل کے تحقق و وقوع پر دلالت کرتا ہے اور سَیِّئَةٌ کے ساتھ اِنْ ذکر کیا جو شک کو ظاہر کرتا ہے اس فرق کی وجہ یہ ہے کہ بھلائی کا وقوع تو بکثرت ہو رہا تھا اور اللہ نے اپنی وسیع رحمت کے سبب بالارادہ ان کو بھلائی عطا فرمائی تھی اور برائی کا وقوع نادر تھا اور بالواسطہ ارادۂ الٰہیہ کا تعلق بھی اس سے نہ تھا اس لئے اول کو لام تعریف اور اِذَا کے ساتھ اور ثانی کو بصورت نکرہ اور اِنْ کے ساتھ ذکر کیا۔

وَقَالُوْا مَهْمَا تَاْتِنَا بِهٖ مِنْ اٰیَةٍ لِّتَسْحَرَنَا بِهَا فَمَا نَحْنُ لَكَ بِمُؤْمِنِیْنَ ۝ فَاَرْسَلْنَا عَلَیْهِمُ الطُّوْفَانَ وَالْجَرَادَ وَالْقُمَّلَ وَالضَّفَادِعَ وَالدَّمَ اٰیٰتٍ مُّفَصَّلٰتٍ (انہوں نے کہا تم جو عجیب بات بھی ہم پر جادو کرنے کے لئے پیش کرتے ہو ہم اس کی سچائی کا یقین کرنے والے نہیں پھر ہم نے ان پر طوفان بھیجا اور ٹڈیاں اور گھن کے کیڑے اور مینڈکیں اور خون کہ یہ سب کھلے کھلے معجزے تھے)۔

قَالُوْا یعنی فرعون اور اس کے گروہ نے حضرت موسیٰؑ سے کہا۔ مِنْ اٰیَةٍ یعنی معجزہ اور دعوئے رسالت کی سچائی کی نشانی۔ حضرت موسیٰؑ کے پیش کئے ہوئے معجزہ کو انہوں نے آیت (علامت صداقت) یا تو اس لئے کہا کہ حضرت موسیٰؑ کا یہی دعویٰ تھا یا بطور استہزاء کہا اسی لئے آئندہ فقرہ میں اس کو سحر قرار دیا۔ لِّتَسْحَرَنَا بِهَا تاکہ تم ہماری نظر بندی کر دو اور ہم کو ہمارے مذہب سے پھیر دو۔ بِمُؤْمِنِیْنَ ہم ہرگز تصدیق نہیں کریں گے۔ بِهٖ (ضمیر مذکر) بِهَا (ضمیر مؤنث) مَهْمَا کے اندر جو مَا ہے اس کی طرف راجع ہے لفظ مَا مذکر ہے۔ لہٰذا مذکر کی ضمیر راجع کی اور معنوی اعتبار سے مَا سے مراد آیت ہے اس لئے مؤنث کی ضمیر راجع کی۔ مُفَصَّلٰتٍ واضح نشانیاں جن کے عذاب الٰہی ہونے میں کسی عقل مند کو شبہ نہیں ہو سکتا تھا یا مُفَصَّلٰتٍ سے مراد ہے الگ الگ یعنی کچھ کچھ فصل سے۔ ابن ابی حاتم اور سعید بن جبیر نے کہا ہر دو معجزات کے درمیان ایک ماہ کی مدت ہوتی تھی۔ ابن المنذر نے حضرت ابن عباسؓ کا قول نقل کیا ہے کہ ہر نوع کا عذاب سنیچر سے سنیچر تک ایک ہفتہ رہتا تھا پھر ایک مہینے کے لئے اٹھا لیا جاتا (پھر دوسرا عذاب آتا تھا) یہ بھی روایت ہے کہ جادوگروں کے مغلوب ہونے کے بعد حضرت موسیٰؑ ان کے اندر بیس برس ٹھہرے اور کچھ وقفہ کے بعد معجزہ دکھاتے رہے۔

حضرت ابن عباسؓ، قتادہؒ، سعید بن جبیر اور محمد ابن اسحاق کا بیان بغویؒ نے نقل کیا ہے کہ جب جادوگر ایمان لے آئے اور فرعون اور اس کے ساتھی سب شکست کھا کر واپس چلے گئے اور کفر و شر سے کسی طرح باز نہ آئے تو اللہ نے پے درپے قحط سالیوں میں مبتلا کر دیا اور پھلوں کی پیداوار گھٹ گئی اس طرح چار آیات قدرت یعنی عصاء موسیٰ، ید بیضاء، قحط سالیاں اور پیداوار کی کمی دیکھنے کے بعد بھی ان کو عبرت نہ ہوئی اور کفر پر بدستور اڑے رہے، تو حضرت موسیٰؑ نے بددعا کی اے اللہ زمین پر تیرا بندہ فرعون مغرور اور سرکش ہو گیا اور حد سے آگے بڑھ چکا اور اس کی قوم نے بھی تیرے عہد کو توڑ دیا۔ تو ان کو عذاب میں گرفتار کر دے جو ان کے لئے سزا اور میری قوم کے لئے نصیحت اور آنے والے لوگوں کے لئے ایک نشان اور عبرت ہو (حضرت موسیٰؑ

کی بددعا قبول ہوئی اور) اللہ نے طوفان بھیج دیا۔ طوفان آیا تھا ایسی بارش ہوئی کہ قبطیوں کے گھروں میں پانی بھر گیا (نہ لیٹنے کی جگہ رہی نہ بیٹھنے کی) سب گھروں کے اندر پانی میں کھڑے ہو گئے بنی اسرائیل اور قبطیوں کے مکان باہم متصل اور مخلوط تھے مگر (بنی اسرائیل کے مکان محفوظ رہے اور) قبطیوں کے گھروں کے اندر پانی ہنسلی تک چڑھ آیا اور کھیتوں میں بھی پانی ٹھہر گیا کہ نہ زمین جوت سکتے تھے نہ کچھ بو سکتے تھے۔ یہ طوفان سنیچر سے سنیچر تک سات روز رہا۔ مجاہد اور عطاء نے کہا طوفان سے مراد موت ہے۔ ابن جریر نے حضرت عائشہؓ کی روایت سے یہی قول مرفوعاً نقل کیا ہے۔ وہب نے کہا یمنی زبان میں طوفان طاعون کو کہتے ہیں۔ ابو قلابہ نے کہا طوفان سے مراد ہے چیچک۔ سب سے پہلے چیچک کے عذاب میں قبطی ہی مبتلا ہوئے پھر چیچک کا مرض اس زمین پر رہ گیا (اور سب لوگ مبتلا ہونے لگے) مقاتل نے کہا پانی کا طوفان تھا جو ان کے کھیتوں پر چڑھ گیا تھا۔ ابو ظبیان نے حضرت ابن عباسؓ کا قول نقل کیا ہے کہ طوفان اللہ کا ایک حکم تھا جس کو طائف کہا گیا ہے فرمایا ہے فَطَافَ عَلَيْهَا طَائِفٌ مِّن رَّبِّكَ وَهُمْ نَائِمُونَ۔

علمائے کوفہ نے صراحت کی ہے کہ رُجحان اور نقصان کی طرح طوفان بھی مصدر ہے جس کی جمع نہیں آتی۔ علماء بصرہ کے نزدیک طوفان جمع ہے اس کا واحد طوفانۃ ہے۔

آخر قبطیوں نے حضرت موسیٰؑ سے کہا آپ اپنے رب سے بارش بند ہو جانے کی دعا کیجئے اگر ہمارے سروں سے بارش کی یہ مصیبت ہٹ گئی تو ہم آپ پر ایمان لے آئیں گے اور بنی اسرائیل کو آپ کے ساتھ چھوڑ دیں گے حضرت موسیٰؑ نے دعا کی اللہ نے طوفان دور کر دیا اور اس سال ایسی کھیتی پھل اور گھاس اللہ نے پیدا کی کہ اس سے پہلے کبھی نہیں ہوئی تھی تمام ملک سرسبز ہو گیا۔ قبطی یہ حالت دیکھ کر کہنے لگے یہ پانی تو ہمارے لئے نعمت ثابت ہوا تمام ملک سرسبز ہو گیا (پھر کیسا عذاب اور موسیٰ کو ماننے کا نتیجہ نہ تھا) غرض ایمان نہ لائے اور ایک ماہ چین میں رہے۔ اس کے بعد اللہ نے ان پر ٹڈی دل بھیجا۔ ٹڈیوں نے قبطیوں کی تمام کھیتیاں، پھل اور درختوں کے پتے چٹ کر ڈالے، گھاس اور سبزی کھا لی، یہاں تک کہ لکڑی کے کیواڑ، مکانوں کی چھتیں، کڑیاں، تختے، گھر کا سامان اور کیواڑوں میں لگی ہوئی لوہے کی کیلیں بھی چٹ کر گئیں اور پھر بھی ان کو سیری نہ ہوئی یہ مصیبت صرف قبطیوں پر پڑی۔ بنی اسرائیل امن سے رہے، قبطی چیخ پڑے اور اللہ کا واسطہ دے کر مضبوط عہد و پیمان کر کے حضرت موسیٰؑ سے درخواست کی کہ اپنے رب سے دعا کر کے اس مصیبت کو دور کرا دیجئے اگر یہ عذاب ٹل گیا تو ہم آپ پر ایمان لے آئیں گے۔ قبطیوں پر ٹڈی دل کا عذاب سنیچر سے سنیچر تک سات دن رہا۔ آخر حضرت نے دعا کی اور اللہ نے وہ عذاب دور فرما دیا۔ ایک روایت میں آیا ہے کہ ہر ٹڈی کے سینہ پر لکھا ہوا تھا "جُنْدُ اللهِ الْأَعْظَم"۔ یہ بھی منقول ہے کہ حضرت موسیٰؑ نے شہر کے باہر میدان میں نکل کر مشرق و مغرب کی طرف اپنی لاٹھی سے اشارہ کیا اور ٹڈی دل جس طرف سے آیا تھا اسی طرف واپس چلا گیا۔ اس عذاب سے جو کھیتیاں، غلہ اور پیداوار بچی رہ گئی تھی (کیونکہ تکمیل عذاب سے پہلے حضرت موسیٰؑ کی دعا سے عذاب ٹل گیا تھا) قبطی کہنے لگے جو کچھ بچ گیا ہے وہ ہمارے گزارے کے لئے کافی ہے ہم اپنے مذہب کو نہیں چھوڑیں گے۔ اپنا عہد انہوں نے پورا نہیں کیا اور بداعمالی پر بدستور قائم رہے اور اس طرح چین سے ایک مہینہ گزار لیا۔ ایک ماہ کے بعد اللہ نے قمّل کا عذاب مسلط کیا۔ سعید بن جبیرؓ نے حضرت ابن عباسؓ کا قول نقل کیا ہے کہ قمّل سے مراد گیہوں کا گھن ہے۔ مجاہد، سدی، قتادہ اور کلبی نے کہا قمّل چھوٹی ٹڈیاں تھیں جن کے پر نہ تھے اور ٹڈی ان بچوں پر رہ ٹڈیوں کا تھا۔ عکرمہ نے قمّل کو ٹڈیوں کے بچے کہا ہے۔ ابو عبیدہ نے کہا قمّل حمنان کو کہتے ہیں اور حمنان ایک قسم کی چچڑی ہوتی ہے۔ عطاء خراسانی نے کہا قمّل کا معنی ہے جوئیں۔

روایت میں آیا ہے کہ اللہ نے حضرت موسیٰؑ کو حکم دیا کہ قریہ عین الشمس علاقہ مصر میں (فلاں) ٹیلے پر جا کر ریت کے ٹیلے کی طرف جاؤ۔ حضرت موسیٰؑ نے حکم کی تعمیل کی، وہ ٹیلہ ریت والا تھا۔ حضرت موسیٰؑ نے اس پر لاٹھی ماری تو قمّل اس کے اندر سے نکل کر پھیل گئیں اور قبطیوں کی جو کچھ کھیتیاں اور درخت اور سبزیاں رہ گئی تھیں سب کو چٹ کر گئیں پھر ان

کے اندر گھس کر بدن کو کاٹتی تھیں اور کھانا کھاتے میں کھانے میں بھر جاتی تھیں۔ سعید بن مسیب کا قول ہے کہ قمل سے مراد غلہ کا گھن ہے اگر کوئی شخص دس تھیلے گیہوں چکی کو لے جاتا تھا تو تین تھیلے آٹا واپس ملتا تھا ایسی مصیبت قبطیوں پر کبھی نہیں آئی تھی بدن کے بال گر گئے، پلکوں اور ابرو کے بال جھڑ گئے، بدن کی کھال پر قمل چیچک کی طرح بھر گئی اور سونا، آرام کرنا حرام کر دیا۔ قبطی چیخ پڑے اور فریاد لے کر موسیٰؑ کے پاس گئے اور درخواست کی ہم توبہ کرتے ہیں آپ اپنے رب سے دعا کر دیجئے کہ وہ یہ مصیبت دور کر دے۔ حضرت موسیٰؑ نے دعا کر دی اور اللہ نے ایک ہفتہ تک عذاب قمل میں مبتلا رکھنے کے بعد عذاب سے نجات دے دی۔ یہ عذاب بھی سنیچر سے سنیچر تک رہا۔ قبطیوں نے پھر عہد شکنی کی اور بدترین اعمال میں مشغول ہو گئے اور کہنے لگے موسیٰؑ کے جادوگر ہونے کا یقین ہم کو اتنا پہلے نہیں ہوا تھا جتنا اس مرتبہ ریت کو کیڑوں کی شکل میں بدل دینے سے پیدا ہو گیا ایک مہینہ تک خوش رہے۔ حضرت موسیٰؑ نے پھر بددعا کی اور اللہ نے مینڈکوں کا عذاب بھیجا تمام گھر، آنگن، میدان، کھانے، برتن، مینڈکوں سے بھر گئے، ہر کھانے اور ہر برتن میں مینڈک ہی مینڈک نظر آنے لگے آدمی ٹھوڑی تک مینڈکوں میں بیٹھتا تھا بولنے کے لئے لب کھولے اور مینڈک کود کر منہ میں پہنچا، کود کود کر ہانڈیوں اور چولھوں میں جا پڑتے، کھانوں کو برباد کر دیتے اور آگ کو بجھا دیتے۔ آدمی سونے کو لیٹتا تو مینڈکیاں اس پر چڑھ جاتیں اور مینڈکوں کا ایک تودہ جمع ہو جاتا کہ وہ کروٹ بھی نہ لے سکتا۔ کھانا کھانے کے لئے منہ کھولتا تو لقمہ سے پہلے مینڈکی منہ میں کود کر گھس جاتی آٹا گوندھا جاتا تو بکثرت مینڈکیاں اس میں چپک جاتیں۔ غرض ایک عظیم دکھ تھا جو کسی طرح دور نہ ہوتا تھا۔ عکرمہ نے حضرت ابن عباسؓ کا قول نقل کیا ہے کہ مینڈک پہلے خشکی کا جانور تھا لیکن جب فرعون کی قوم پر اللہ نے ان کو مسلط کیا اور انہوں نے اللہ کے حکم کی تعمیل اس حد تک کی کہ جلتی ہانڈیوں اور بھڑکتے تنوروں میں گرنے سے بھی تامل نہ کیا، تو اللہ نے اس حسن اطاعت کے عوض ان کو پانی کا جانور بنا دیا (اور وہ آرام سے پانی میں رہنے لگے)۔

قبطیوں نے مینڈکوں کے عذاب کا دکھڑا حضرت موسیٰؑ سے رویا اور کہنے لگے ہم اس مرتبہ (پکی) توبہ کرتے ہیں دوبارہ ایسی حرکتیں نہیں کریں گے۔ حضرت موسیٰؑ نے پختہ عہد و پیمان لے کر بارگاہ الٰہی میں دعا کی اور سات روز کے بعد اللہ نے اس عذاب کو بھی دور کر دیا۔ یہ عذاب بھی سنیچر سے سنیچر تک رہا۔ مصیبت دور ہونے کے بعد وہ لوگ ایک مہینہ تک چین سے رہے لیکن پھر عہد توڑ دیا اور کفر کی طرف لوٹ گئے۔ آخر حضرت موسیٰؑ کی بددعا سے اللہ نے خون کا عذاب مسلط کر دیا۔ ان کے لئے دریائے نیل خون ہو گیا کنویں اور نہریں خون بن گئیں کنووں اور نہروں سے جو پانی لیتے تھے وہ خالص تازہ خون ہوتا تھا۔ فرعون سے شکایت کی تو اس نے کہا موسیٰؑ نے تم پر جادو کر دیا ہے (یعنی تمہاری نظر بندی کر دی ہے) لوگوں نے کہا جادو کہاں کر دیا ہم تو اپنی آنکھوں سے بجائے پانی کے خون ہی خون دیکھتے ہیں (یہ نظر بندی نہیں) یہاں تک نوبت پہنچ گئی کہ اسرائیلی اور قبطی ایک برتن میں (پانی لینے کو) آمنے سامنے ہو کر پہنچتے تھے قبطی کی طرف کا پانی خون ہو جاتا تھا اور اسرائیلی کی طرف کا پانی پانی ہی رہتا تھا۔ ایک کنویں پر (ایک ساتھ) کھڑے ہو کر اسرائیلی اور قبطی پانی کھینچتے تھے اسرائیلی کا نکالا ہوا پانی پانی رہتا تھا اور قبطی کا نکالا ہوا پانی خون۔ پیاس سے بیتاب ہو کر قبطی عورت اسرائیلی عورت کے پاس آتی کہ مجھے پینے کے لئے پانی دو، اسرائیلی عورت قبطی عورت کے برتن میں پانی انڈیل دیتی مگر اس کے برتن میں پہنچ کر پانی خون ہو جاتا تو قبطی عورت اسرائیلی عورت سے کہتی تھی پانی اپنے منہ میں لے کر میرے منہ میں کلی کر دے، اسرائیلی عورت ایسا کرتی تھی مگر قبطی عورت کے منہ میں پہنچ کر کلی کا پانی خون ہو جاتا تھا۔ فرعون بھی پیاس سے اتنا بے تاب ہوا کہ درختوں کی تر پتیاں چبانے لگا لیکن چباتے ہی پتیوں کا عرق بالکل نمکین پانی ہو جاتا۔ تو خون پینے کی یہ کیفیت ان کی سات روز رہی۔ زید بن اسلم کے نزدیک خون سے مراد ہے نکسیر پھوٹنا۔ اللہ کی طرف سے نکسیر کا مرض قبطیوں پر مسلط ہو گیا تھا۔ آخر کار مجبور ہو کر پھر حضرت موسیٰؑ کی خدمت میں حاضر ہو کر عذاب دور ہونے کی دعا کی درخواست کی اور کہا آپ اپنے رب سے دعا کریں یہ مصیبت دور ہو جائے گی تو ہم آپ پر ایمان لے آئیں گے اور آپ کے ساتھ بنی اسرائیل کو بھیج دیں گے۔ حضرت موسیٰؑ کی دعا سے یہ عذاب بھی اللہ نے دور کر دیا لیکن

فَاسْتَكْبَرُوا وَكَانُوا قَوْمًا مُّجْرِمِينَ ۝ (پھر بھی (موسیٰ پر ایمان لانے سے) انہوں نے غرور کیا اور وہ تھے ہی مجرم لوگ)

وَلَمَّا وَقَعَ عَلَيْهِمُ الرِّجْزُ قَالُوا يَا مُوسَى ادْعُ لَنَا رَبَّكَ بِمَا عَهِدَ عِندَكَ لَئِن كَشَفْتَ عَنَّا الرِّجْزَ لَنُؤْمِنَنَّ لَكَ وَلَنُرْسِلَنَّ مَعَكَ بَنِي إِسْرَائِيلَ ۝ فَلَمَّا كَشَفْنَا عَنْهُمُ الرِّجْزَ إِلَىٰ أَجَلٍ هُم بَالِغُوهُ إِذَا هُمْ يَنكُثُونَ ۝

(اور جب ان پر کوئی عذاب واقع ہوتا تو کہتے موسیٰ ہمارے لئے اپنے رب سے دعا کر دو جس کا اس نے آپ سے وعدہ کر رکھا ہے اگر آپ ہم سے اس عذاب کو ہٹا دیں گے تو ہم ضرور ضرور آپ کے کہنے سے ایمان لے آئیں گے اور بنی اسرائیل کو بھی آپ کے ساتھ جانے دیں گے پھر جب ہم ان سے اس عذاب کو ایک وقت خاص تک کہ اس تک ان کو پہنچنا تھا ہٹا دیتے تو وہ فوراً ہی عہد کے خلاف کرنے لگتے)۔

وَلَمَّا وَقَعَ عَلَيْهِمُ الرِّجْزُ اور جب ان پر عذاب مذکور یعنی طوفان وغیرہ نازل ہو گیا۔ سعید بن جبیر کے نزدیک رجز سے مراد طاعون ہے پانچ آیات کے ظہور کے بعد یہ چھٹی آیت عذاب تھی جس سے ایک دن میں ستر ہزار آدمی مر گئے اور باہم دفن کرتے کرتے ان کو شام ہو گئی۔ بخاری و مسلم نے صحیحین میں اور ترمذی و بغوی نے حضرت اسامہ بن زید کی روایت سے لکھا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا طاعون ایک عذاب ہے جو اللہ نے بنی اسرائیل پر اور تم سے پہلی قوموں پر بھیجا تھا اس لئے اگر کسی جگہ طاعون ہو تو خود وہاں نہ جاؤ اور اگر وہاں پیدا ہو جائے جہاں تم ہو تو وہاں سے مت بھاگو۔ امام احمد اور بخاری نے حضرت عائشہؓ کی روایت سے لکھا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا طاعون ایک عذاب ہے جس پر چاہتا ہے اللہ بھیج دیتا ہے مگر مومنوں کے لئے اللہ نے اس کو رحمت بنا دیا ہے اگر کسی بستی میں طاعون پڑا ہو اور کوئی (مسلمان) وہاں باامید ثواب صبر کے ساتھ رہے اور یہ یقین رکھتا ہو کہ اللہ نے جو کچھ لکھ دیا ہے وہی اس کو پہنچے گا (اور طاعون میں مبتلا ہو کر مر جائے) تو اس کو شہید کی طرح ثواب ملے گا۔

میں کہتا ہوں یہ دونوں حدیثیں بتا رہی ہیں کہ طاعون بنی اسرائیل پر بھیجا گیا تھا۔ پہلی قوموں پر بصورت عذاب آنا ان حدیثوں سے نہیں معلوم ہوتا۔ شاید فرعون کے بعد بنی اسرائیل پر طاعون کا عذاب آیا ہے۔

اگر سعید بن جبیر کا قول صحیح مان لیا جائے تو عصا اور ید بیضاء کے بعد تیسرا معجزہ کال اور پھلوں کی بربادی قرار پائے گا قحال دیہات والوں کے لئے اور پھلوں کی تباہی شہریوں کے لئے۔ اس کے بعد طوفان سے رجز تک چھ معجزات ہوں گے آیت وَلَقَدْ آتَيْنَا مُوسَىٰ تِسْعَ آيَاتٍ میں یہی نو نشانیاں مراد ہیں۔

قَالُوا یعنی فرعون اور اس کے ساتھیوں نے کہا بِمَا عَهِدَ عِندَكَ یعنی اس وعدہ کے مطابق جو اللہ نے آپ سے کیا ہے کہ اگر ہم ایمان لے آئیں گے تو اللہ عذاب دور کر دے گا۔ عطاء کے نزدیک بِمَا عَهِدَ عِندَكَ سے مراد ہے نبوت۔ بعض کے نزدیک بِمَا عَهِدَ عِندَكَ سے مراد ہے موسیٰؑ کی دعا کے قبول ہونے کا وعدہ۔ بہرحال بما کا تعلق ادع سے ہے یا ادع کی ضمیر سے حال ہے یعنی اپنی نبوت یا قبول دعا کے وعدہ کا سہارا لے کر دعا کر دو یا فعل محذوف سے تعلق ہے یعنی ہماری درخواست بحق نبوت قبول کیجئے یا بِمَا عَهِدَ میں ب قسمیہ ہے جس کا جواب لَئِن كَشَفْتَ ہے یعنی ہم اس عہد کی قسم کھاتے ہیں جو اللہ نے آپ سے کیا ہے کہ اگر آپ عذاب دور کر دیں گے تو ہم ایمان لے آئیں گے۔ وَلَنُرْسِلَنَّ اور ہم ملک شام کو آپ کے ساتھ بنی اسرائیل کو جانے دیں گے۔ فَلَمَّا كَشَفْنَا یعنی جب موسیٰؑ کی دعا سے ہم نے دور کر دیا إِلَىٰ أَجَلٍ یعنی اس وقت تک کے لئے جس میں ان پر عذاب کا آنا یا ہلاک ہونا یقینی تھا یعنی غرق ہونے یا مرنے کے وقت تک کے لئے۔ بعض کے نزدیک إِلَىٰ أَجَلٍ سے وہ وقت مراد ہے جو انہوں نے اپنے ایمان کے لئے مقرر کر رکھا تھا۔ إِذَا هُمْ يَنكُثُونَ یہ لما کا جواب ہے یعنی جب ہم نے عذاب دور کر دیا تو وہ فوراً ہی توڑ عہد سے پھر گئے اور کفر پر جمے رہے۔

فَانتَقَمْنَا مِنْهُمْ فَأَغْرَقْنَاهُمْ فِي الْيَمِّ بِأَنَّهُمْ كَذَّبُوا بِآيَاتِنَا وَكَانُوا عَنْهَا غَافِلِينَ ۝

(پھر ہم نے ان سے بدلہ لیا یعنی دریا میں ان کو غرق کر دیا کیونکہ وہ ہماری آیتوں کو جھٹلاتے تھے اور ان سے بالکل ہی بے توجہی

کرتے تھے)۔

فَانْتَقَمْنَا یعنی ہم نے ان کو عذاب میں پکڑا۔ اَلنِّقْمَۃُ عذاب۔ فِی الْیَمِّ یعنی سمندر میں ہم نے ان کو ڈبو دیا۔ یَم سے مراد ہے بحر شور کا گہرا اور وسیع حصہ۔ یم کا لفظ تیمم سے ماخوذ ہے تیمم کا معنی ہے قصد کرنا۔ سمندر سے فائدہ اٹھانے والے سمندر کا سفر بالارادہ کرتے ہیں۔ بِاَنَّھُمْ میں باء سببیہ ہے اور عَنْھَا کی ضمیر آیات کی طرف راجع ہے وہ ہماری آیات سے غافل تھے یعنی آیات پر انہوں نے کبھی غور نہیں کیا تو گویا غافلوں کی طرح تھے۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ عنہا کی ضمیر نقمۃ کی طرف راجع ہے جس پر فَانْتَقَمْنَا کا لفظ دلالت کر رہا ہے۔

وَاَوْرَثْنَا الْقَوْمَ الَّذِیْنَ كَانُوْا یُسْتَضْعَفُوْنَ مَشَارِقَ الْاَرْضِ وَمَغَارِبَهَا الَّتِیْ بٰرَكْنَا فِیْهَا ؕ وَتَمَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ الْحُسْنٰى عَلٰى بَنِیْۤ اِسْرَآءِیْلَ ۙ۬ بِمَا صَبَرُوْا ؕ وَدَمَّرْنَا مَا كَانَ یَصْنَعُ فِرْعَوْنُ وَقَوْمُهٗ وَمَا كَانُوْا یَعْرِشُوْنَ ۝

(اور ہم نے ان لوگوں کو جو بالکل کمزور شمار کیے جاتے تھے اس سرزمین کا پورب سے لے کر پچھم تک وارث بنا دیا جس میں ہم نے برکت رکھی تھی اور آپ کے رب کا اچھا وعدہ بنی اسرائیل کے حق میں ان کے صبر کی وجہ سے پورا ہو گیا اور ہم نے فرعون اور اس کی قوم کے ساختہ پرداختہ کارخانوں کو اور جو کچھ وہ اونچی اونچی عمارتیں بناتے تھے سب کو درہم برہم کر دیا)۔

اَلْقَوْمَ یعنی بنی اسرائیل۔ اَلَّذِیْنَ كَانُوْا یُسْتَضْعَفُوْنَ جن کو غلام بنایا جاتا تھا۔ ان کی عورتوں سے خدمت لی جاتی تھی اور لڑکوں کو قتل کیا جاتا تھا۔ اَلْاَرْضِ یعنی مصر و شام کی سرزمین۔ الَّتِیْ بٰرَكْنَا فِیْهَا جس کے اندر ہم نے برکت پیدا کی تھی یعنی دریا تھے درخت اور پھل تھے، سرسبزی اور راحت زندگی تھی اور ارزانی تھی۔ فرعونیوں کے بعد مصر میں اور عمالقہ کے بعد شام میں بنی اسرائیل کو اقتدار حاصل ہوا اور ان ملکوں کا سارا علاقہ ان کے قبضہ میں آگیا۔

اَلْحُسْنٰی کَلِمَۃ کی صفت ہے اس کا مذکر اَحْسَن ہے۔ تَمَّتْ یعنی اللہ کی بات پوری ہو گئی، محاورہ میں کہا جاتا ہے تَمَّ الْاَمْرُ فلاں کام پورا ہو گیا، کامیابی سے ہمکنار ہو گیا۔ یہاں کلمہ حسنیٰ سے مراد ہے بنی اسرائیل کو غالب اور کامران کرنے کا وعدہ جس کا ذکر سورۂ القصص کی آیت وَنُرِیْدُ اَنْ نَّمُنَّ ...... مَا كَانُوْا یَحْذَرُوْنَ میں اور آیت عَسٰی رَبُّكُمْ اَنْ یُّهْلِكَ عَدُوَّكُمْ وَیَسْتَخْلِفَكُمْ فِی الْاَرْضِ میں کیا گیا ہے۔ بِمَا صَبَرُوْا یعنی چونکہ بنی اسرائیل اپنے دین پر جمے رہے اور فرعون اور قوم فرعون کے شدائد و مصائب پر صبر کیا اس لئے اللہ کی طرف سے نصرت و کامیابی کا وعدہ پورا ہو کر رہا۔ مَا كَانُوْا یَصْنَعُوْنَ یعنی محلات اور اونچی اونچی عمارتیں۔ مَا كَانُوْا یَعْرِشُوْنَ حسن نے کہا وہ بیلیں جن کو باغوں میں وہ ٹٹیوں پر چڑھاتے تھے جیسے انگور کی بیلیں۔ مجاہد نے کہا اونچی عمارتیں مراد ہیں جیسے ہامان کی بنائی ہوئی عمارت اور دوسرے قصور و محلات۔

فرعون اور اس کی قوم کا قصہ اس آیت پر ختم ہو گیا اس سے آگے بنی اسرائیل کی بدترین حرکات اور اعمال شنیعہ کا بیان ہے جب کہ اللہ نے ان کو اپنی آیات قدرت دکھا دیں اور عظیم الشان نعمتیں عطا فرما دی تھیں، پھر بھی انہوں نے نافرمانی کی اس سے غرض یہ ہے کہ قوم کی طرف سے لائے ہوئے شدائد پر رسول اللہ ﷺ کو تسکین خاطر حاصل ہو جائے اور مسلمان ہر وقت بیدار رہیں اپنے اعمال کا جائزہ لیتے اور نفس کی نگرانی رکھنے سے غفلت نہ کریں۔ بِمَا صَبَرُوْا کا لفظ صبر کی ترغیب دے رہا ہے اور یہ بات بتا رہا ہے کہ جو شخص شدائد کا مقابلہ صبر سے کرتا ہے اللہ مصائب کو دور کر دیتا ہے اس کے دشمن کو تباہ کر دیتا ہے اور جو گھبرا کر بے صبر ہو جاتا ہے اللہ اس کی مدد سے ہاتھ اٹھا لیتا ہے اور اس کو اسی کے حوالے کر دیتا ہے۔

وَجٰوَزْنَا بِبَنِیْۤ اِسْرَآءِیْلَ الْبَحْرَ فَاَتَوْا عَلٰی قَوْمٍ یَّعْكُفُوْنَ عَلٰۤی اَصْنَامٍ لَّهُمْ ۚ (اور ہم نے بنی اسرائیل کو دریا کے پار کر دیا پھر ان کا گزر ایسے لوگوں کی طرف سے ہوا جو اپنے بتوں کی عبادت پر جمے ہوئے تھے)۔ کلبی کا بیان ہے کہ فرعون اور اس کی قوم کی ہلاکت کے بعد حضرت موسیٰؑ بنی اسرائیل کو عاشورا کے دن دریا کے پار لے کر پہنچے تھے اور آپ نے عاشورہ کا روزہ اس کے شکریہ میں رکھا تھا۔

يَّعْكُفُوْنَ جو قائم تھے جمے ہوئے تھے۔ عَلٰٓى اَصْنَامٍ لَّهُمْ ابن جریرؒ نے لکھا ہے گائے کی مورتیاں تھیں۔ گوسالہ پرستی کی اول بنیاد اسی سے پڑی۔ ابن جریر اور ابن المنذر نے ابن جریج کا قول بھی یہی نقل کیا ہے اس روایت میں تماثیل کا لفظ آیا ہے یعنی وہ مورتیاں تانبے (پیتل) کی تھیں۔ جس قوم کو بنی اسرائیل نے بت پرستی میں مشغول دیکھا تھا بعض علماء کے نزدیک وہ عمالقہ تھی اور ابن ابی حاتم نیز ابو الشیخ نے ابی عمران جونی کا قول نقل کیا ہے کہ وہ لخم و جذام کے قبائل تھے۔ بغویؒ نے قتادہؒ کا قول لکھا ہے کہ وہ قوم لخم کا قبیلہ تھا

قَالُوْا يٰمُوْسَى اجْعَلْ لَّنَآ اِلٰهًا كَمَا لَهُمْ اٰلِهَةٌ ۭ قَالَ اِنَّكُمْ قَوْمٌ تَجْهَلُوْنَ ۝ اِنَّ هٰٓؤُلَاۗءِ مُتَبَّرٌ مَّا هُمْ فِيْهِ وَبٰطِلٌ مَّا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ۝ (کہنے لگے موسیٰؑ ہمارے لئے بھی کوئی ایسا ہی معبود مقرر کر دو جیسے ان کے معبود ہیں موسیٰؑ نے جواب دیا یقیناً تم لوگ جاہل ہو، یہ لوگ جس (مذہب) میں ہیں وہ تباہ ہونے والا ہے اور جو کچھ کر رہے ہیں وہ بے حقیقت اور بے کار ہے۔

یعنی اللہ کا قرب اس سے ہمیں ملے گا۔ اِلٰهًا یعنی مورتی جس کی ہم پوجا کریں۔ بغویؒ نے لکھا ہے کہ بنی اسرائیل کی یہ درخواست اس بناء پر نہ تھی کہ ان کو اللہ کی وحدانیت میں کوئی شک تھا بلکہ وہ اپنی عقل کی کمزوری اور انتہائی جہالت سے یہ سمجھ بیٹھے تھے کہ اس عمل سے دینداری میں کوئی خرابی نہیں آئے گی اور ہم مقرر کردہ مورتی کی تعظیم کر کے اللہ سے مقرب ہو جائیں گے۔ اتنی آیات قدرت دیکھنے کے بعد جب بنی اسرائیل نے ایسی جاہلانہ درخواست کی تو حضرت موسیٰؑ نے بطور تعجب، قَالَ کہا کہ حقیقت میں تم جاہل ہو۔ مُتَبَّرٌ تباہ و برباد یعنی اللہ ان کے دین کو تباہ کر دیگا اور ان کی مورتیوں کو ڈھا دیگا اور ریزہ ریزہ کرے گا۔

مَّا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ یعنی یہ جو مورتیوں کی پوجا کرتے ہیں بے حقیقت اور باطل ہے۔ مُتَبَّرٌ اور بٰطِلٌ دونوں خبروں کو مبتدا سے پہلے ذکر کرنا یہ بتانے کے لئے ہے کہ ان کی بربادی ضرور ہوگی اور ان کی گزشتہ عبادت گزاریاں نابود اور ناقابل اعتبار ہوں گی۔ در حقیقت یہ بات بنی اسرائیل کو ان کی درخواست سے باز داشت کرنے اور روکنے کے لئے حضرت موسیٰؑ نے فرمائی۔

قَالَ اَغَيْرَ اللّٰهِ اَبْغِيْكُمْ اِلٰهًا وَّهُوَ فَضَّلَكُمْ عَلَى الْعٰلَمِيْنَ ۝ (موسیٰؑ نے (بطور زجر و تعجب) کہا کیا میں تمہارے لئے کوئی دوسرا معبود طلب کروں حالانکہ اللہ ہی نے تم کو (اس زمانہ کے) سب لوگوں پر برتری عطا فرمائی ہے)۔ یعنی تم کو ایسی نعمتوں سے نوازا ہے کہ اس زمانہ میں کسی کو ایسا نہیں نوازا۔ حضرت موسیٰؑ کے اس قول میں تنبیہ ہے کہ تم نے اللہ کی ان نعمتوں کا جو اس نے صرف تم کو عطا فرمائیں اور بغیر استحقاق کے محض اپنے کرم سے عطا فرمائیں، برا بدلہ دیا کہ اللہ کی بجائے مخلوق کو استحقاق معبودیت میں اللہ سے جا ملایا حالانکہ اس کی کوئی مثل نہیں۔ حضرت واقد لیثیؓ کا بیان ہے کہ ایک بار حنین کی جانب ہم رسول اللہ ﷺ کے ہمرکاب جا رہے تھے راستہ میں ہمارا گزر سدرہ کی طرف سے ہوا جاہلیت کے زمانہ میں کفار اپنے اسلحہ سدرہ (درخت بیر) سے لٹکا کر گرداگرد طواف کرتے تھے ہم نے عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ جیسی کافروں کے لئے انواط والی (بیری) معبود ہے ہمارے لئے بھی آپ کوئی ذات انواط (درخت بیر جس پر اسلحہ لٹکائے جاتے ہوں) مقرر فرما دیجئے۔ حضور ﷺ نے فرمایا "اللہ اکبر" یہ قول تو ایسا ہی ہے جیسا بنی اسرائیل نے موسیٰؑ سے کہا تھا اجْعَلْ لَّنَآ اِلٰهًا كَمَا لَهُمْ اٰلِهَةٌ تم لوگ یقیناً پہلوں کے راستہ پر چلو گے۔ رواہ البغوی۔

وَاِذْ اَنْجَيْنٰكُمْ مِّنْ اٰلِ فِرْعَوْنَ يَسُوْمُوْنَكُمْ سُوْۗءَ الْعَذَابِ ۚ يُقَتِّلُوْنَ اَبْنَاۗءَكُمْ وَيَسْتَحْيُوْنَ نِسَاۗءَكُمْ ۭ وَفِيْ ذٰلِكُمْ بَلَاۗءٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ عَظِيْمٌ ۝ (اور وہ وقت یاد کرو جب ہم نے تم کو فرعون والوں کے ظلم سے بچایا جو تم کو بڑی سخت تکلیفیں پہنچاتے تھے تمہارے بیٹوں کو بکثرت مار ڈالتے تھے اور تمہاری عورتوں کو (اپنی بیگار اور خدمت کے لئے) زندہ چھوڑ دیتے تھے اور اس میں تمہارے رب کی طرف سے تمہاری بڑی آزمائش تھی)۔

ع ۱۴ / ۲

وَاِذْ اور اس احسان کو یاد کرو جو اللہ نے تمہارے ساتھ کیا تھا (یعنی اس وقت کے واقعات کو یاد کرو)۔

یُقَتِّلُوْنَ باب تفعیل سے ہے اور باب تفعیل بھی تکثیر کے لئے آتا ہے یعنی بکثرت قتل کرتے تھے۔ یُقَتِّلُوْنَ کا پورا جملہ یَسُوْمُوْنَكُمْ سُوْٓءَ الْعَذَابِ کا بیان ہے۔ وَفِيْ ذٰلِكُمْ اور اس میں یعنی دکھ اور اذیت میں یا تمہاری نجات میں۔ بَلَآءٌ آزمائش تھی اول صورت میں بصورت دکھ آزمائش تھی اور دوسری صورت میں بصورت نعمت۔

وَوٰعَدْنَا مُوْسٰى ثَلٰثِيْنَ لَيْلَةً وَّاَتْمَمْنٰهَا بِعَشْرٍ فَتَمَّ مِيْقَاتُ رَبِّهٖٓ اَرْبَعِيْنَ لَيْلَةً (اور ہم نے موسیٰ سے تیس شب کا وعدہ کر لیا اور مزید دس راتوں کو تیس کا تتمہ کر دیا اس طرح اللہ کا مقرر کردہ وقت چالیس شب ہو گیا)

ابن ابی حاتم نے ابو العالیہ کا قول نقل کیا ہے کہ ایک چلہ ہو گیا یعنی ذیقعدہ کا ایک مہینہ اور ذی الحجہ کے دس دن۔ مسروق نے لکھا ہے کہ اللہ نے موسیٰ سے ایک ماہ پورا ہونے کے بعد کلام کرنے کا وعدہ کیا تھا۔ بغوی نے لکھا ہے جب بنی اسرائیل مصر میں تھے تو حضرت موسیٰ نے ان سے وعدہ کیا تھا کہ جب اللہ تمہارے دشمن کو ہلاک کر دے گا تو تم کو ایک کتاب عطا فرمائے گا جس میں تمام اوامر و نواہی کا بیان ہوگا۔ پھر جب اللہ نے دشمن کو ہلاک کر دیا تو حضرت موسیٰ نے اللہ سے کتاب نازل فرمانے کی درخواست کی اللہ نے تیس روزے رکھنے کا حکم دیا جب تیس دن ہو گئے تو حضرت موسیٰ کو منہ میں کچھ بدبو محسوس ہوئی تو آپ نے کسی نرم لکڑی سے مسواک کر لی۔ ابو العالیہ نے کہا کسی درخت کی چھال کو چبایا تھا۔ فرشتوں نے حضرت موسیٰ سے کہا پہلے ہم کو آپ کے منہ سے مشک کی خوشبو آتی تھی آپ نے مسواک کر کے اس کو خراب کر دیا اس پر اللہ نے ذی الحجہ کے دس دن کی روزے رکھنے کا حکم دیا اور فرمایا کیا تم کو نہیں معلوم کہ روزہ دار کے منہ کی بو میرے نزدیک مشک کی خوشبو سے زیادہ پاکیزہ ہے۔ بنی اسرائیل کا فتنہ اسی عشرہ میں اٹھا تھا۔ دیلمی نے اسی کی ہم معنی روایت حضرت ابن عباسؓ کی طرف بھی منسوب کی ہے۔ فَتَمَّ مِيْقَاتُ رَبِّهٖٓ یعنی کلام کرنے اور کتاب عطا کرنے کے وعدہ کا وقت۔

وَقَالَ مُوْسٰى لِاَخِيْهِ هٰرُوْنَ اخْلُفْنِيْ فِيْ قَوْمِيْ وَاَصْلِحْ وَلَا تَتَّبِعْ سَبِيْلَ الْمُفْسِدِيْنَ ۝ وَلَمَّا جَآءَ مُوْسٰى لِمِيْقَاتِنَا وَكَلَّمَهٗ رَبُّهٗ ۙ قَالَ رَبِّ اَرِنِيْٓ اَنْظُرْ اِلَيْكَ ۭ قَالَ لَنْ تَرٰىنِيْ وَلٰكِنِ انْظُرْ اِلَى الْجَبَلِ فَاِنِ اسْتَقَرَّ مَكَانَهٗ فَسَوْفَ تَرٰىنِيْ (اور موسیٰ نے اپنے بھائی ہارون سے کہہ دیا تھا کہ میرے بعد میری جگہ ان لوگوں کا انتظام رکھنا اور اصلاح کرتے رہنا اور بد عمل لوگوں کی رائے پر عمل مت کرنا اور جب موسیٰ ہمارے مقرر کردہ وقت پر آئے اور ان کے رب نے ان سے باتیں کیں تو موسیٰ نے عرض کیا اے میرے رب مجھے اپنا دیدار کرا دے کہ میں ایک نظر تجھے دیکھ لوں۔ اللہ نے فرمایا تم مجھے ہرگز نہیں دیکھ سکتے لیکن اس پہاڑ کی طرف دیکھتے رہو سو اگر یہ اپنی جگہ پر برقرار رہا تو تم بھی دیکھ سکو گے)۔

وَقَالَ مُوْسٰى یعنی مناجات کے لئے پہاڑ کی طرف جاتے وقت موسیٰ نے کہا۔ اخْلُفْنِيْ یعنی میرا قائم مقام ہو جا۔ وَاَصْلِحْ اور جن امور کی اصلاح کی ضرورت پڑے ان کی درستی کرتا رہ۔ مطلب یہ کہ بنی اسرائیل کی اصلاح کرتے رہنا اور ان کو اللہ کی اطاعت کی ترغیب دیتے رہنا۔ حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا اَصْلِحْ فرمانے سے حضرت موسیٰ کی مراد یہ تھی کہ بنی اسرائیل سے نرمی کرنا اور ان سے حسن سلوک کرنا۔ وَلَا تَتَّبِعْ یعنی نافرمانوں کی راہ پر نہ چلنا اور جو لوگ معصیت کی راہ پر جانا چاہیں ان کی بات نہ ماننا۔ وَلَمَّا جَآءَ یعنی جب موسیٰ طور سینا پر آئے لِمِيْقَاتِنَا اس میعاد پر جس کی تخصیص کر دی گئی تھی جو ہم نے مقرر کی تھی۔ بغوی نے لکھا ہے کہ حضرت موسیٰ طہارت کر کے پاک کپڑے پہن کر اللہ کے وعدہ کے مطابق تیار ہو گئے۔ وَكَلَّمَهٗ رَبُّهٗ اس واقعہ کی تفصیل میں آیا ہے کہ اللہ نے سات فرسخ تک ہر طرف تاریکی کر دی اس حصہ سے شیاطین کو باہر نکال دیا۔ زمین کے کیڑوں کو بھی ہٹا دیا اور دونوں فرشتوں کو بھی الگ کر دیا اور آسمان تک فضا کو صاف کر دیا اس وقت حضرت موسیٰ نے تو (ن) دیا مگر موسیٰ کے ساتھ جو اس وقت جبرئیل موجود تھے ان کو کچھ سنائی نہیں دیا یہاں تک کہ حضرت موسیٰ نے قلم چلنے کی آواز بھی سنی۔

بیضاوی نے لکھا ہے روایت میں آیا ہے کہ حضرت موسیٰ ہر طرف سے کلام سن رہے تھے۔ میں کہتا ہوں اس سے مراد یہ ہے کہ کسی ایک جہت سے نہیں سن رہے تھے (یعنی وہ کلام کسی جہت کا محتاج نہیں تھا تمام جہات و اطراف کی قیود سے آزاد تھا)

جس طرف رخ کرتے تھے وہی کلام بے جہت سنتے تھے اس طرح موسیٰؑ پر کلام رب کا انکشاف ہو گیا اور اس سے آگے دیدار کے مشاہدہ کا اشتیاق پیدا ہو گیا۔ اَرِنِیْ یعنی مجھے اپنا دیدار دکھا۔ (اَرِ کا مفعول محذوف ہے) اَنْظُرْ اِلَیْکَ حسن نے کہا موسیٰؑ کا شوق دیدار اتنا جوش میں آیا کہ انہوں نے رویت آخرت پر قیاس کرتے ہوئے اس دنیا میں بھی دیدار ہونے کا گمان کر لیا (یعنی جذبہ شوق سے مجبور ہو کر حضرت موسیٰؑ نے اَنْظُرْ اِلَیْکَ کہا تھا)۔

قَالَ لَنْ تَرٰىنِیْ اللہ نے فرمایا تو ہرگز مجھے نہیں دیکھ پائے گا، نہ کوئی انسان دنیا میں میری طرف نگاہ کر سکتا ہے جو شخص میری طرف دیکھے گا، مر جائے گا۔ موسیٰؑ نے کہا الٰہی میں تیرا کلام سن کر تیرے دیدار کا مشتاق ہوا اگر میں تیری طرف دیکھ لوں اور مر جاؤں تو بغیر دیدار زندہ رہنے سے مجھے زیادہ پسند ہے۔ سیوطیؒ نے لکھا ہے کہ لَنْ تَرٰىنِیْ (تو مجھے نہیں دیکھ پائے گا) فرمایا لَا اُرٰی (میں نہیں دیکھا جا سکتا) نہیں فرمایا اس سے ثابت ہوتا ہے کہ اللہ کا دیدار فی نفسہٖ محال نہیں ہے (اگرچہ اس عالم میں اس کو کوئی نہیں دیکھ سکتا)۔

اِلَی الْجَبَلِ مدین میں یہ سب سے بڑا پہاڑ تھا جس کو زبیر کہا جاتا تھا۔ سدیؒ کا بیان ہے کہ جس وقت اللہ نے موسیٰؑ سے کلام کیا تھا اسی وقت ابلیس نے زمین کے اندر گھس کر اور پھر موسیٰؑ کے دونوں قدموں کے درمیان سے زمین چیر کر اوپر کو سر نکال کر موسیٰؑ کے دل میں وسوسہ ڈالا تھا کہ یہ کلام کرنے والا اللہ نہیں شیطان ہے۔ اس وقت حضرت موسیٰؑ نے دیدار کی درخواست کی۔

اس آیت سے ثابت ہو رہا ہے کہ دنیا میں اللہ کا دیدار (فی نفسہٖ) ممکن ہے انبیاء ناممکن چیز کی طلب نہیں کر سکتے، خصوصاً ایسی ناممکن چیز کی طلب جس سے معرفت خداوندی میں جہالت لازم آتی ہو۔ ہاں لَنْ تَرٰىنِیْ کا لفظ یہ ضرور بتا رہا ہے کہ موسیٰؑ کو اس دنیا میں دیدار ملا نہیں لیکن کبھی نہیں ملے گا اس کا کوئی ثبوت آیت میں نہیں . دوامی عدم وقوع اس آیت سے ثابت نہیں۔ عدم امکان کا تو ذکر ہی کیا ہے۔

ایک شبہ

کیا موسیٰؑ اللہ کے معاملہ میں اتنے نادان تھے کہ ان کو معلوم ہی نہ تھا کہ اللہ کا دیدار ہو سکتا ہے یا نہیں اور اس نادانی ہی کی وجہ سے وہ دیکھنے کی درخواست کر بیٹھے۔

ازالہ

لَنْ تَرٰىنِیْ کے نزول سے پہلے حضرت موسیٰؑ کا بعض احکام سے ناواقف ہونا لازم آتا ہے اور اس میں کوئی قباحت بھی نہیں ہے۔ حضرت نوحؑ نے اپنے بیٹے کی نجات کی دعا کی تھی اور ان کو معلوم نہ تھا کہ وہ ڈوبنے سے بچایا جائے گا یا نہیں۔ حضرت ابراہیمؑ نے اپنے باپ کی مغفرت کی دعا کی تھی اور آپ کو معلوم نہ تھا کہ مشرک کی مغفرت نہیں ہوگی۔

رسول اللہ ﷺ نے ابوطالب کی مغفرت کی درخواست کی تھی جس پر آیت مَا كَانَ لِلنَّبِیِّ وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْۤا اَنْ یَّسْتَغْفِرُوْا لِلْمُشْرِكِیْنَ وَلَوْ كَانُوْۤا اُولِیْ قُرْبٰى نازل ہوئی۔ بعض منافقوں کی بخشش کی دعا بھی حضور ﷺ نے کی تھی جس پر آیت اِسْتَغْفِرْ لَهُمْ اَوْ لَا تَسْتَغْفِرْ لَهُمْ اِنْ تَسْتَغْفِرْ لَهُمْ سَبْعِیْنَ مَرَّةً فَلَنْ یَّغْفِرَ اللّٰهُ لَهُمْ اور آیت وَلَا تُصَلِّ عَلٰۤى اَحَدٍ مِّنْهُمْ مَّاتَ اَبَدًا وَّلَا تَقُمْ عَلٰى قَبْرِهٖ نازل ہوئی۔ یہ تمام دعائیں اس وقت کی گئیں جب کہ یہ معلوم نہ تھا کہ کافروں کے لئے مغفرت کی دعا ناقابل قبول ہے۔

(معتزلہ کی نزدیک دیدار الٰہی ناممکن ہے (نہ دنیا میں ممکن ہے نہ آخرت میں) دلیل یہ ہے کہ لَنْ تَرٰىنِیْ فرمایا اور لَنْ کا لفظ تابید کے لئے نہیں بلکہ دنیا میں رویت کی نفی کی تاکید کے لئے ہے (تو ہرگز مجھے نہیں دیکھے گا۔ ہرگز سے تاکید نفی ہوتی ہے اور یہی مطلب نفی رویت کا دوام) دیکھو یہودیوں کے متعلق اللہ نے فرمایا ہے وَلَنْ یَّتَمَنَّوْهُ اَبَدًا (یہ ہرگز موت کی تمنا نہیں

مریں گے۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ کبھی موت کی تمنا نہیں کریں گے کیونکہ) آخرت میں کافروں کو موت کی تمنا ہوگی۔ اللہ نے خود فرمادیا ہے وَنَادَوْا يَا مَالِكُ لِيَقْضِ عَلَيْنَا رَبُّكَ (وہ پکاریں گے اے مالک کاش تیرا رب ہم کو تمام ہی کر دیتا۔ ہماری موت کا حکم ہی دے دیتا) اور فرمایا يَا لَيْتَهَا كَانَتِ الْقَاضِيَةَ (کاش پہلی موت ہی تمام کر دینے والی ہوتی) وَيَقُولُ الْكَافِرُ يَا لَيْتَنِي كُنْتُ تُرَابًا (اور کافر کہے گا کاش میں خاک ہو گیا ہوتا)۔

بعض لوگ کہتے ہیں کہ موسیٰؑ نے دیدار کی درخواست قوم کی زبان بندی کے لئے کی تھی کیونکہ انہوں نے اَرِنَا اللّٰهَ جَهْرَةً کہا تھا مگر یہ خیال قطعاً غلط ہے۔ واقعہ ہی دوسرا ہے اس گستاخانہ سوال کی پاداش میں تو ان پر عذاب آگیا تھا اور ان پر بجلی گر پڑی تھی فَأَخَذَتْهُمُ الصَّاعِقَةُ بِظُلْمِهِمْ وہ ایسی بات کہنے کا حق نہیں رکھتے تھے اسی لئے پکڑے گئے۔

جس وقت حضرت موسیٰؑ نے رب سے کلام کیا اور اللہ نے توریت عطا فرمائی اور موسیٰؑ نے دیدار کی درخواست کی اس وقت تو وہاں کوئی بھی نہ تھا اور چونکہ موسیٰؑ غیر مستحق نہ تھے (یہ درخواست گستاخانہ نہ تھی) اس لئے اللہ کی طرف سے اس درخواست پر کوئی عتاب بھی نہیں ہوا صرف رؤیت سے انکار کر دیا گیا کیونکہ موسیٰؑ میں رؤیت کو برداشت کرنے کی طاقت نہ تھی اور استقرار جبل سے رؤیت کو مشروط کر دیا گیا۔

اگر رؤیت واقع میں محال ہوتی تو جب قوم نے دیدار رب کی خواہش کی تھی موسیٰؑ پر لازم تھا کہ ان کو جاہل قرار دیتے اور سرزنش کرتے، جس طرح کہ قوم والوں نے جب اجْعَلْ لَنَا إِلَٰهًا کہا تھا تو حضرت موسیٰؑ نے ان کو توبیخ کی اور جاہل قرار دیا تھا۔ حضرت موسیٰؑ نے تو حضرت ہارونؑ کو بھی مفسدوں کے راستہ پر چلنے کی ممانعت کر دی تھی پھر خود کس طرح مفسدوں کے راستہ پر چل کر ان کی زبان بندی کے لئے خود دیدار کی درخواست کرنے لگتے۔ فَإِنِ اسْتَقَرَّ مَكَانَهُ فَسَوْفَ تَرَانِي میں یہ جتانا مقصود ہے کہ پہاڑ بھی برداشت کرنے کی طاقت نہیں رکھتا تم کو رؤیت کی برداشت کیسے ہوگی۔ استقرار جبل سے رؤیت کو مشروط کرنا بتا رہا ہے کہ رؤیت فی نفسہ محال نہیں کیونکہ استقرار جبل بجائے خود محال نہیں اور شرط کا امکان مشروط کے امکان کو ثابت کرتا ہے (استقرار جبل ممکن ہے لہٰذا رؤیت جو استقرار جبل کی شرط سے مشروط ہے وہ بھی ممکن ہے)۔

وہب بن منبہ اور ابن اسحاق نے بیان کیا ہے کہ جب موسیٰؑ نے دیدار کا سوال کیا تو کہر اور تاریکی چار فرسخ تک پہاڑ پر چھا گئی، بجلیاں کڑکنے لگیں، بادل گرجنے اور کڑکنے لگے اور اللہ نے آسمانوں کے فرشتوں کو حکم دے دیا کہ موسیٰؑ کے سامنے آجائیں۔ حسب الحکم سب سے نچلے آسمان کے ملائکہ بیلوں کی شکل میں بارش کی طرح گرجدار آواز میں اللہ کی تسبیح و تقدیس کرتے سامنے سے گزرے پھر دوسرے آسمان کے ملائکہ بشکل شیر سامنے آئے ان کے منہ سے بھی اللہ کی تسبیح و تقدیس کی چیخیں نکل رہی تھیں۔ ضعیف بندہ (موسیٰؑ بن عمران) اس منظر کو دیکھ کر اور ان آوازوں کو سن کر خوف زدہ ہو گیا لرز گیا بدن کا رونگٹا رونگٹا کھڑا ہو گیا اور کہنے لگا اب مجھے اپنی درخواست پر پشیمانی ہے کاش کوئی چیز مجھے اس مقام سے الگ کر دیتی (کہ میں یہ منظر نہ دیکھتا) اس پر ملائکہ کے سرگروہ نے جو سب کا بڑا تھا کہا موسیٰ ابھی تو اپنے سوال پر قائم رہو ابھی تو بہت میں سے تھوڑا تم نے دیکھا ہے۔ پھر تیسرے آسمان کے فرشتے اتر کر موسیٰؑ کے سامنے آئے ان کی شکلیں بھی گدھ جیسی تھیں گرجتی آوازوں سے متواتر تسبیح و تقدیس کا شور کر رہے تھے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ جیسے کسی لشکر کا مخلوط شور ہے۔ آگ کے شعلے کی طرح ان کا رنگ تھا۔ موسیٰؑ خوف زدہ ہو گئے اور زندگی کی آس نہ رہی۔ سرگروہ ملائکہ نے کہا ابن عمران ابھی اپنی جگہ ٹھہرو تمہارے سامنے تو ایسا منظر آئے گا کہ برداشت نہ کر سکو گے پھر چوتھے آسمان کے ملائکہ موسیٰؑ کے سامنے آئے پچھلے ملائکہ کی شکلوں سے الگ ان کی صورتیں تھیں رنگ تو شعلہ کی طرح تھا اور جسم برف کی طرح سفید تھا ان کی تسبیح و تقدیس کی اونچی آوازیں ایسی تھیں کہ سابق فرشتوں کی آوازیں ان جیسی نہ تھیں۔ حضرت موسیٰؑ کا جوڑ جوڑ چھٹنے اور دل دھڑکنے لگا اور شدت کے ساتھ گریہ طاری ہو گیا۔ سید الملائکہ نے کہا ابن عمران ابھی اپنے سوال پر ٹھہرو تم نے دیکھا ہے زیادہ دیکھو گے۔ پھر پانچویں آسمان کے ملائکہ اتر کر موسیٰؑ کے سامنے آئے جن کے سات رنگ تھے موسیٰؑ ان کو دیکھتے رہنے کی تاب نہ لا سکے ایسی شکلیں تو انہوں نے پہلے کبھی نہیں دیکھی

نہیں سنا ایسی آوازیں سنی تھیں۔ دل بھر آیا غم نے گھیر لیا اور خوب رونے لگے۔ سر گروہ ملائکہ نے کہا ابن عمران ابھی اپنی جگہ (یعنی اپنے سوال پر) صبر کیے رہو ایسی چیزیں سامنے آئیں گی کہ صبر نہ کر سکو گے۔ پھر حسب الحکم چھٹے آسمان کے فرشتے اتر کر موسیٰ کے سامنے آئے ہر فرشتے کے ہاتھ میں سورج سے زیادہ روشن درخت کھجور کی طرح لمبا آگ کا ایک نیزا تھا سب کا لباس آگ کے شعلوں کی طرح تھا ہر فرشتے کے ایک سر میں بیس منہ تھے گزشتہ فرشتوں کی مجموعی آواز کی طرح اونچی آواز سے تسبیح و تقدیس کر رہے تھے انتہائی بلند آواز سے کہہ رہے تھے۔ سُبُّوْحٌ قُدُّوْسٌ رَبُّ الْمَلٰٓئِكَةِ وَالرُّوْحِ رَبُّ الْعِزَّةِ اَبَدًا لَّا یَمُوْتُ۔ موسیٰ ان کی تسبیح کی آواز سن کر خود بھی تسبیح پڑھنے اور رونے لگے اور عرض کرنے لگے اے میرے رب مجھے اور ہمارے اپنے بندہ کو نظر انداز نہ کر معلوم نہیں اس منظر سے میرا چھٹکارا ہوگا یا نہیں اگر میں (یہاں سے) نکل گیا تو جل جاؤں گا اور رکتا ہوں تو مر جاؤں گا۔

فرشتوں کے سردار نے کہا اے ابن عمران تمہارا خوف تو حد سے بڑھ گیا اور تمہارا دل نکلا پڑتا ہے تم نے جس چیز کا خود سوال کیا ہے اس کے لئے صبر کرو اس کے بعد ساتویں آسمان کے ملائکہ کو عرش الٰہی اٹھانے کا حکم ہوا جوں ہی نور عرش نمودار ہوا پہاڑ شق ہو گیا اور تمام فرشتوں نے سُبْحَانَ الْمَلِكِ الْقُدُّوْسِ رَبِّ الْعِزَّةِ اَبَدًا لَّا یَمُوْتُ کی آوازیں بلند کیں پہاڑ میں لرزہ آیا اور جو درخت بھی وہاں تھا پھٹ گیا اور بندہ ضعیف موسیٰ منہ کے بل بے ہوش ہو کر گر پڑا پھر اللہ نے اپنی رحمت سے اس کے پاس روح کو بھیجا روح موسیٰ پر سایہ فگن ہو گیا اور چھا گیا اور جس پتھر پر موسیٰ کھڑے ہوئے تھے اسی پتھر کو موسیٰ پر الٹ کر قبہ کی طرح بنا دیا تاکہ موسیٰ جل نہ جائیں کچھ دیر کے بعد روح نے ان کو کھڑا کر دیا موسیٰ تسبیح پڑھتے اٹھ کھڑے ہوئے اور مناجات کرنے لگے میرے مالک میں تجھ پر ایمان لایا اور تصدیق کرتا ہوں کہ جو شخص بھی تجھے دیکھے گا زندہ نہ رہے گا جو شخص تیرے فرشتوں کو بھی دیکھے گا اس کا دل (خوف سے) باہر نکلنے لگے گا، تیری عظمت بہت بڑی ہے تو سب کا رب اور معبود کل اور شاہنشاہ ہے۔ تیرے مساوی اور مقابل کوئی شے نہیں اے میرے رب میں تیری طرف رجوع کرتا ہوں۔ حمد تیرے ہی لئے ہے تیرا کوئی شریک نہیں تو بڑی بزرگی والا ہے تو بڑی عظمت رکھتا ہے تو رب العالمین ہے۔

فَلَمَّا تَجَلّٰى رَبُّهٗ لِلْجَبَلِ جَعَلَهٗ دَكًّا وَّخَرَّ مُوْسٰى صَعِقًا ۚ فَلَمَّآ اَفَاقَ قَالَ سُبْحٰنَكَ تُبْتُ اِلَیْكَ وَاَنَا اَوَّلُ الْمُؤْمِنِیْنَ۝ (پس جونہی رب نے پہاڑ پر جلوہ ڈالا اس کے پرخچے اڑا دیے اور موسیٰ بے ہوش ہو کر گر پڑے پھر جب ہوش آیا تو عرض کیا بے شک تیری ذات پاک ہے میں تیری بارگاہ میں معذرت کرتا ہوں اور سب سے پہلے یقین رکھتا ہوں) کہ میں تجھے براہ راست نہیں دیکھ سکتا۔

تجلی ظاہر ہوئی، نمودار ہوا یعنی اس کا کچھ نور چمکا۔ سعدی نے لکھا ہے کہ چھنگلی کے آدھے پورے کے برابر نور خداوندی کا ظہور ہوا۔ حاکم کی صحیح حدیث میں یہی آیا ہے۔ صوفیہ کہتے ہیں کہ کسی چیز کا دوسرے درجہ پر ظہور (یعنی عکس پڑنے کا ظہور) تجلی کہلاتا ہے جیسے آئینہ کے اندر کسی کی صورت کا ظہور حقیقت میں یہ جلوہ ذاتی اور جلوہ شیونی رویت ذات نہ تھی کیونکہ ظاہر ہے کہ موسیٰ کی استعداد و قوت پہاڑ سے زائد تھی اور موسیٰ کو دید ذات سے تاکید کے ساتھ روک دیا گیا تو پہاڑ میں نور ذات کو برداشت کرنے کی صلاحیت کہاں سے آسکتی ہے اللہ نے فرمایا ہے اِنَّا عَرَضْنَا الْاَمَانَةَ عَلَى السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَالْجِبَالِ فَاَبَیْنَ اَنْ یَّحْمِلْنَهَا وَاَشْفَقْنَ مِنْهَا وَحَمَلَهَا الْاِنْسَانُ۔

حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا نور خداوندی پہاڑ پر نمودار ہوا تھا۔ ضحاک کا قول ہے اللہ نے اپنے نور سے پردے ہٹا لئے تھے اور بیل کی ناک کے سوراخ برابر (نور کو) ظاہر کر دیا تھا حضرت عبداللہ بن سلام اور کعب احبار نے فرمایا عظمت خداوندی کی جلوہ پاشی صرف سوئی کے ناکے کی برابر ہوئی تھی کہ پہاڑ شق ہو گیا۔ سدیؒ نے کہا چھنگلی کے برابر تجلی ہوئی تھی اس کی تائید حضرت انسؓ کی روایت سے ہوتی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے چھنگلی کے آخری جوڑ پر انگوٹھا رکھتے ہوئے یہ آیت تلاوت کی اور فرمایا بس اتنی تجلی ہوئی تھی کہ پہاڑ آہستہ آہستہ چلا (یعنی لرزا اور موسیٰ بے ہوش ہو کر گر پڑے)۔

ابو الشیخ کی روایت میں آیا ہے کہ حضور ﷺ نے چھنگلی سے اشارہ کیا (اور فرمایا) اس کے ہی نور سے پہاڑ کے پرخچے اڑا دیئے۔ حضرت سہل بن سعد ساعدی کی روایت میں آیا ہے کہ اللہ نے نور کے ستر ہزار حجابوں میں سے درہم کی برابر ہٹایا تھا کہ پہاڑ کے پرخچے اڑ گئے۔ جَعَلَهٗ دَكًّا یعنی ریزہ ریزہ۔ دک اور دق ہم معنی ہیں۔ قاموس میں ہے دک، دق اور ہدم کا معنی ہے ہموار ہونا۔ حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا پہاڑ کو خاک کر دیا پہاڑ آہستہ آہستہ چلا یہاں تک کہ سمندر میں جا گرا اور سمندر کے اندر (برابر اب بھی) چلا جا رہا ہے۔ عطیہ نے کہا پہاڑ ریگ رواں ہو گیا۔ کلبی نے کہا دَكًّا کا معنی ہے کسرًا پارہ پارہ یعنی چھوٹی چھوٹی پہاڑیوں میں بٹ گیا۔ بغویؒ نے لکھا ہے اس آیت کی تفسیروں میں آیا ہے کہ عظمت نور کی وجہ سے وہ پہاڑ چھ پہاڑوں میں منقسم ہو گیا، تین مدینہ میں آپڑے احد، ورقان اور رضوی اور تین مکہ میں ثور، ثبیر، حرا۔ مصنف نے تخریج بیضاوی میں لکھا ہے کہ ابن مردویہ نے حضرت علیؓ کا قول نقل کیا ہے کہ اللہ نے موسیٰؑ کو سنایا اور فرمایا اِنَّنِیْۤ اَنَا اللّٰهُ یہ واقعہ عرفہ کی شام کو ہوا وہ پہاڑ جس پر تجلی ہوئی موقف (حج) میں تھا تجلی پڑتے ہی اس کے سات ٹکڑے ہو گئے ایک ٹکڑا سامنے گر گیا یہ ٹکڑا تو وہی ہے جس کے قریب امام موقف میں کھڑا ہوتا ہے، تین ٹکڑے مدینہ میں جا پڑے، طیبہ، احد، رضوی اور طور سینا شام میں چلا گیا اس کو طور کہنے کی وجہ یہی ہے کہ یہ اڑ کر شام میں جا پہنچا تھا۔

میں کہتا ہوں اس روایت میں انتہائی غرابت ہے اللہ نے موسیٰؑ سے کلام تو طور سینا علاقہ شام میں کیا تھا وہیں توریت عطا فرمائی تھی کہ مکہ میں نہ کلام کیا نہ کتاب عطا فرمائی۔

صَعِقًا حضرت ابن عباسؓ اور حسن نے ترجمہ کیا بے ہوش اور قتادہ نے کہا مردہ۔ کلبی نے کہا عرفہ کے دن پنج شنبہ کو موسیٰؑ بے ہوش ہوئے تھے اور جمعہ کو قربانی کے دن اللہ نے توریت عطا فرمائی۔ واقدی نے کہا موسیٰؑ بے ہوش ہو کر گر گئے تو آسمانی ملائکہ نے کہا ابن عمران کا اور دیدار کی درخواست کا کیا ہوا۔ فَلَمَّاۤ اَفَاقَ یعنی جب بے ہوشی سے افاقہ ہوا۔ قَالَ تو اللہ کی عظمت کے زیر اثر کہا، سُبْحٰنَكَ تُبْتُ اِلَیْكَ یعنی بغیر اجازت کے سوال کرنے کی جرأت سے توبہ کرتا ہوں۔ وَاَنَا اَوَّلُ الْمُؤْمِنِیْنَ یعنی (اس امت میں) میں سب سے پہلا مومن ہوں ہر نبی کا ایمان اپنی امت سے پہلے ہوتا ہی ہے۔

قَالَ یٰمُوْسٰۤی اِنِّی اصْطَفَیْتُكَ عَلَی النَّاسِ بِرِسٰلٰتِیْ وَبِكَلَامِیْ ۖ فَخُذْ مَاۤ اٰتَیْتُكَ وَكُنْ مِّنَ الشّٰكِرِیْنَ ۝

(اللہ نے فرمایا میں نے پیغمبری اور اپنی ہم کلامی سے اور لوگوں پر تم کو امتیاز دیا ہے، سو جو کچھ میں نے تم کو دیا ہے اس کو لو اور شکر کرو)۔

اِصْطَفَیْتُكَ عَلَی النَّاسِ یعنی تمہارے زمانہ کے لوگوں پر تم کو امتیاز عطا کیا اور برتری دی۔ بِكَلَامِیْ یعنی کلام سے مراد کلام کرنا۔ مَاۤ اٰتَیْتُكَ یعنی جو پیام میں نے تجھے دیا ہے اس کو لے۔

روایت میں آیا ہے کہ جب موسیٰؑ سے اللہ نے کلام کیا تو اس وقت آپ کے چہرہ پر ایسی چمک آگئی تھی کہ کوئی بھی آپ کی طرف نظر اٹھا کر نہیں دیکھ سکتا تھا اور مرتے دم تک آپ کے چہرہ پر تابانی قائم رہی۔ بیوی نے ایک روز آپ سے کہا جب سے اللہ نے آپ سے کلام کیا ہے تو آپ سے میں معطل ہو کر رہ گئی۔ حضرت موسیٰؑ نے چہرہ سے نقاب اٹھایا تو بیوی کے چہرہ پر سورج کی کرنوں کی طرح شعاعیں پڑنے لگیں اس نے فوراً اپنا چہرہ اپنے ہاتھ سے چھپا لیا اور اللہ کے سامنے سجدہ میں گر پڑی اور حضرت موسیٰؑ سے کہا آپ اللہ سے دعا کریں کہ جنت کے اندر بھی مجھے آپ کی بیوی بنائے۔ حضرت موسیٰؑ نے فرمایا یہ بات تجھے مل جائے گی بشرطیکہ میرے بعد کسی سے نکاح نہ کرے کیونکہ عورت آخری شوہر ہی کی بیوی ہوگی۔

بغوی نے حضرت کعب احبار کا بیان نقل کیا ہے کہ حضرت موسیٰؑ نے توریت کا مطالعہ کیا اور عرض کیا اے میرے رب میں (توریت میں) ایک امت کا ذکر پاتا ہوں جو تمام امتوں سے بہتر ہوگی جو لوگوں کی ہدایت کے لئے پیدا کی گئی ہوگی اچھائیوں کا حکم دے گی اور برائیوں کی ممانعت کرے گی اس کا ایمان اللہ پر اور پچھلی کتاب پر ہوگا وہ گمراہوں سے جہاد کرے گی یہاں تک کہ کانے دجال سے لڑے گی اے میرے رب اس کو میری امت بنا دے۔ اللہ نے فرمایا موسیٰؑ وہ محمد

ﷺ کی امت ہوگی۔ حضرت موسیٰ نے کہا میرے رب مجھے (توریت میں) ایک امت کا تذکرہ ملتا ہے جو بکثرت حمد کرنے والے ہوں گے اور سورج کی نگرانی رکھیں گے (یعنی اوقات صلوٰۃ کی تعیین سورج کے طلوع و غروب سے کریں گے اور نمازوں کے منتظر رہیں گے) جب وہ کسی کام کا ارادہ کریں گے تو کہیں گے انشاء اللہ تعالیٰ ہم یہ کام کریں گے۔ ان لوگوں کو میری امت بنا دے۔ اللہ نے فرمایا یہ محمد ﷺ کی امت ہوگی۔ حضرت موسیٰ نے عرض کیا میں (توریت میں) ایک امت (کا ذکر) پاتا ہوں جو اپنے کفارات اور صدقات کو باہم کھائیں گے (یعنی آگ میں نہیں جلائیں گے گزشتہ شریعتوں والے نذر اور صدقہ کی چیز آگ میں جلا دیتے تھے۔) وہ دعائیں کریں گے اور ان کی دعائیں قبول ہوں گی وہ شفاعت کریں گے اور ان کی شفاعت قبول ہوگی۔ ان لوگوں کو میری امت بنا دے۔ اللہ نے فرمایا یہ محمد ﷺ کی امت ہوگی۔ موسیٰ نے عرض کیا مجھے ایسی امت کا بھی تذکرہ ملتا ہے کہ جب وہ لوگ کسی ٹیلہ پر چڑھیں گے تو اللہ اکبر کہیں گے اور نشیب میں اتریں تو حمد کریں گے (یعنی حاجی ہوں گے) ساری مٹی ان کے لئے طہور (پاک اور پاک کن) ہوگی ساری زمین ان کے لئے مسجد ہوگی جہاں ہوں گے جنابت سے طہارت کریں گے مٹی سے بھی ان کی طہارت ایسی ہوگی جیسی پانی سے بشرطیکہ پانی دستیاب نہ ہو۔ ان کے چہرے اور ہاتھ پاؤں وضو کے اثر سے گورے ہوں گے (یعنی قیامت کے دن) اے رب ان کو میری امت بنا دے۔ اللہ نے فرمایا یہ محمد ﷺ کی امت ہوگی۔ حضرت موسیٰ نے عرض کیا اے رب مجھے ایسے لوگوں کا تذکرہ ملتا ہے کہ اگر وہ نیکی کا صرف ارادہ کریں گے، عمل نہ کرپائیں گے تب بھی ان کے ایک نیکی لکھی جائے گی اور اگر نیکی کرلیں گے تو دس گنے سے سات سو گنے تک ان کو ثواب ملے گا اور اگر گناہ کا صرف ارادہ کریں گے تو گناہ نہیں لکھا جائے گا اور اگر گناہ کرلیں گے تو اتنا ہی لکھا جائے گا جتنا انہوں نے کیا ہوگا۔ ان کو میری امت بنا دے۔ اللہ نے فرمایا یہ احمد کی امت ہوگی۔ موسیٰ نے عرض کیا میں ایک مرحوم امت کا تذکرہ پاتا ہوں جو کمزور ہوگی وہ ان لوگوں سے کتاب میراث میں پائیں گے جن کو (عطاء کتاب کا) تو نے امتیاز دیا ہوگا ان لوگوں میں سے کچھ تو اپنے آپ پر ظلم کرنے والے ہوں گے (یعنی گناہگار ہوں گے) اور کچھ متوسط الحال ہوں گے (ان کی نیکیاں بدیاں مخلوط ہوں گی) اور کچھ نیکیوں کی طرف پیش قدمی کرنے والے ہوں گے اور ان میں سے ہر ایک (گروہ) مرحوم ہوگا کوئی بھی ایسا نہ ہوگا کہ مرحوم نہ ہو۔ اے رب ان لوگوں کو میری امت بنا دے۔ اللہ نے فرمایا یہ احمد کی امت ہوگی۔ موسیٰ نے عرض کیا میں ایسے لوگ بھی (توریت میں) پاتا ہوں جن کے مصحف ان کے سینوں میں ہوں گے (یعنی حافظ قرآن ہوں گے) وہ اہل جنت کے لباس کے رنگ کے کپڑے پہنیں گے نمازوں کے اندر ان کی صفیں ملائکہ کی صفوں کی طرح ہوں گی، مسجدوں کے اندر ان کی (تلاوت و قرأت کی) آوازیں شہد کی مکھیوں کی گونج کی طرح ہوں گی ان میں سے کوئی بھی آگ میں نہیں داخل ہوگا، سوائے اس شخص کے جو نیکیوں سے اس طرح الگ ہو جائے جیسے پتھر درختوں کے پتوں سے الگ ہو جاتا ہے۔ اے رب ان لوگوں کو میری امت بنا دے۔ اللہ نے فرمایا یہ احمد کی امت ہوگی۔ موسیٰ کو جب اس بات پر تعجب ہوا کہ محمد ﷺ کو اور آپ کی امت کو اللہ نے یہ بھلائیاں عطا فرمائی ہیں، تو عرض کیا کاش میں محمد کے ساتھیوں میں سے ہوتا اس پر موسیٰ کو خوش کرنے کے لئے اللہ نے تین چیزوں کی وحی بھیجی اور فرمایا يٰمُوسٰى اِنِّي اصْطَفَيْتُكَ عَلَى النَّاسِ بِرِسٰلٰتِي وَبِكَلَامِي..... سے ..... سَاُورِيْكُمْ دَارَ الْفٰسِقِيْنَ، وَمِنْ قَوْمِ مُوْسٰى اُمَّةٌ يَّهْدُوْنَ بِالْحَقِّ وَبِهٖ يَعْدِلُوْنَ۔ موسیٰ اس سے کامل طور پر خوش ہوگئے۔

وَكَتَبْنَا لَهٗ فِي الْاَلْوَاحِ مِنْ كُلِّ شَيْءٍ مَّوْعِظَةً وَّتَفْصِيْلًا لِّكُلِّ شَيْءٍ فَخُذْهَا بِقُوَّةٍ وَّاْمُرْ قَوْمَكَ يَاْخُذُوْا بِاَحْسَنِهَا سَاُورِيْكُمْ دَارَ الْفٰسِقِيْنَ ۝ (اور ہم نے چند تختیوں پر ہر قسم کی (ضروری) نصیحت اور (احکام ضروریہ کے) متعلق ہر چیز کی تفصیل ان کو لکھ کر دے دی سو تم خود بھی کوشش کے ساتھ ان پر عمل کرو اور اپنی قوم کو بھی حکم دو کہ ان کے اچھے اچھے احکام پر عمل کریں۔ میں اب بہت جلد تم لوگوں کو ان بے حکم لوگوں کا مقام دکھاؤں گا۔)

لَهٗ یعنی موسیٰ کے لئے۔ فِي الْاَلْوَاحِ یہ تختیاں سات یا دس تھیں۔ حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا الواح سے مراد ہیں

توریت کی تختیاں۔ حدیث میں آیا ہے کہ وہ تختیاں جنت کے بیری کے درخت کی تھیں۔ ایک تختی کی لمبائی بارہ ہاتھ تھی۔ یہ روایت ابو الشیخ نے کی ہے جس کی نسبت حضرت جعفر کی وساطت سے حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی طرف کی گئی ہے۔ حدیث میں آیا ہے کہ اللہ نے آدم کو اپنے ہاتھ سے بنایا اور تورات اپنے ہاتھ سے لکھی اور طوبیٰ کا درخت اپنے ہاتھ سے بویا۔ حسن نے کہا وہ تختیاں لکڑی کی تھیں۔ کلبی نے کہا زبرجد سبز کی تھیں۔ سعید بن جبیر نے کہا یاقوت سرخ کی تھیں۔ آخری قول کعب کا بھی ہے جو طبرانی اور ابو الشیخ نے بیان کیا ہے۔ ربیع بن انس نے کہا زبرجد کی تھیں۔ ابن جریج کا قول ہے زمرد کی تھیں جو جبرئیل جنت عدن سے لائے تھے جن کو اس قلم سے لکھا تھا جس سے ذکر کو لکھا تھا اور قلم نور کی روشنائی سے لکھتا تھا۔ ابو الشیخ کی روایت میں ابن جریج کا قول آیا ہے کہ وہ زمرد یا زبرجد کی تھیں۔ وہب کا بیان ہے کہ سخت پتھر سے اللہ نے ان تختیوں کو اکھاڑنے کا حکم دیا پھر ان کو نرم بنا دیا کہ موسیٰ نے ان کو تراش لیا پھر ان کو چیر لیا اور ان پر انسانی لکھنے کی طرح لکھا گیا اور قلم کی آواز موسیٰ نے خود سنی۔ یہ واقعہ یکم ذیقعدہ کو ہوا۔ تختیوں کی لمبائی حضرت موسیٰ کے قد کے موافق دس ہاتھ کی تھی۔ مقاتل اور وہب نے کہا لکھائی ایسی تھی کہ نگینوں کی طرح تختیوں پر حروف کندہ کئے گئے تھے۔ ربیع بن انس نے کہا تورات نازل ہوئی تو ستر اونٹوں کا بوجھ تھی اس کا ایک جز ایک سال سے کم میں نہیں پڑھا جا سکتا تھا۔ حضرت یوشع، حضرت عزیر اور حضرت عیسیٰ کے علاوہ اور کسی نے پوری توریت نہیں پڑھی۔

مِنْ كُلِّ شَيْءٍ یعنی دین کی ضرورت کی ہر چیز۔ مَوْعِظَةً یعنی نصیحت اور طلب اعمال سے باز داشت جن کا نتیجہ خوفناک ہے۔ تو مِن یعنی وَكَتَبْنَا مَوْعِظَةً سے مراد ایسا ذکر اس طرح کیا کہ دل نرم پڑ جائے۔ وَتَفْصِيلًا لِّكُلِّ شَيْءٍ یعنی ہر شئی حلال، حرام، حدود وغیرہ احکام میں سے ہر چیز کی تفصیل لکھ دی۔ تَفْصِيلًا کا عطف مَوْعِظَةً پر ہے۔ بِقُوَّةٍ یعنی کوشش کے ساتھ باقوت قلب اور صحت عزیمت کے ساتھ کیونکہ ارادہ کے ضعف کے ساتھ پڑھنے کا نتیجہ اعمال میں سستی اور کاہلی ہے۔ بِأَحْسَنِهَا احسن اس جگہ اسم تفضیل کے معنی میں مستعمل نہیں ہے کیونکہ اللہ کی کتاب میں جو حکم ہے وہ بہترین ہی ہے کم و بیش کا احتمال ہی نہیں ہے۔ کتاب میں کوئی برا حکم موجود ہی نہیں ہے جیسے محاورہ میں کہا جاتا ہے الصَّيْفُ أَحَرُّ مِنَ الشِّتَاءِ موسم گرما موسم سرما سے زیادہ گرم یعنی گرم ہوتا ہے (موسم سرما میں تو گرمی ہوتی ہی نہیں ہے پھر موسم گرما کا سرما سے زیادہ گرم ہونا کوئی معنی نہیں رکھتا) کذا قال قطرب۔

عطاء نے حضرت ابن عباسؓ کا تفسیری قول يَأْخُذُوا بِأَحْسَنِهَا کی تشریح میں نقل کیا ہے کہ اس کے حلال کو حلال اور حرام کو حرام سمجھیں، احکام پر غور کریں، امثال و واقعات سے نصیحت حاصل کریں، اس کے احکام پر عمل کریں اور متشابہات میں غور و خوض نہ کریں۔ بعض علماء نے کہا بِأَحْسَنِهَا سے مراد ہیں فرائض اور مستحبات جن پر ثواب مرتب ہوتا ہے۔ ان کے علاوہ مباحات ہیں جن پر نہ ثواب مرتب ہوتا ہے نہ عذاب۔

بعض نے کہا عزیمت مراد ہے یعنی رخصت سے کام نہ لو۔ عزیمت کو اختیار کرو اور ہر چیز میں جو دو حکم ہوں ان میں سے اعلیٰ پر عمل کرو مثلاً عفو، قصاص سے افضل ہے۔ صبر انتقام سے اولیٰ ہے پس اعلیٰ کو اختیار کرو۔ سَأُرِيكُمْ دَارَ الْفَاسِقِينَ اس جملہ میں تخویف ہے کہ کتاب کو ترک نہ کرو ورنہ فاسقوں کی طرح ہو جاؤ گے اور جو مقام ان کا ہے وہی تمہارا ہو جائے گا۔ دَارَ الْفَاسِقِينَ سے مراد ہیں مصر کے اندر فرعون اور اس کی قوم کے ٹوٹے پھوٹے ویران کھنڈر۔ عطیہ عوفی کا یہی قول ہے۔ سدی نے کہا کافروں کی ہلاکت گاہیں (مرنے کے مقامات) مراد ہیں۔ کلبی اور قتادہ نے کہا عاد و ثمود اور دوسری گزشتہ تباہ شدہ قوموں کی ویران بستیاں مراد ہیں، جن کو سفر کی حالت میں بنی اسرائیل سرراہ دیکھتے گزرتے تھے۔ مجاہد، حسن اور عطاء نے کہا جہنم مراد ہے جہاں آخرت میں ان کا مقام ہوگا۔

سَأَصْرِفُ عَنْ آيَاتِيَ الَّذِينَ يَتَكَبَّرُونَ فِي الْأَرْضِ بِغَيْرِ الْحَقِّ وَإِن يَرَوْا كُلَّ آيَةٍ لَّا يُؤْمِنُوا بِهَا وَإِن يَرَوْا سَبِيلَ الرُّشْدِ لَا يَتَّخِذُوهُ سَبِيلًا وَإِن يَرَوْا سَبِيلَ الْغَيِّ يَتَّخِذُوهُ سَبِيلًا ذَٰلِكَ بِأَنَّهُمْ كَذَّبُوا بِآيَاتِنَا

وَكَانُوا عَنْهَا غَافِلِينَ ۝ وَالَّذِينَ كَذَّبُوا بِآيَاتِنَا وَلِقَاءِ الْآخِرَةِ حَبِطَتْ أَعْمَالُهُمْ ۚ هَلْ يُجْزَوْنَ إِلَّا مَا كَانُوا يَعْمَلُونَ ۝

(میں ایسے لوگوں کو اپنے احکام سے برگشتہ ہی رکھوں گا جو دنیا میں تکبر کرتے ہیں جس کا ان کو کوئی حق نہیں، اگر تمام نشانیاں بھی دیکھ لیں تب بھی ان کو نہ مانیں اور اگر ہدایت کا راستہ دیکھیں تو اس کو اپنا طریقہ نہ بنائیں اور گمراہی کا راستہ دیکھ لیں تو اس کو اپنا طریقہ بنا لیں اور یہ اس سبب سے ہے کہ انہوں نے ہماری آیتوں کو جھوٹا بتلایا اور ان سے غافل رہے اور جن لوگوں نے ہماری آیات کو اور قیامت کے پیش آنے کو جھوٹا قرار دیا ان کے سب کام اکارت گئے ان کو ان کے کئے ہوئے اعمال کی ہی سزا دی جائے گی)۔

سَأَصْرِفُ یعنی اندرونی، بیرونی اور انفسی و آفاقی آیات پر غور کرنے اور ان سے عبرت اندوز ہونے سے پھیر دوں گا۔ یا اپنی نازل کردہ آیات اور معجزات کو باطل کرنے اور نور الٰہی کو پھونکیں مار کر بجھانے سے روک دوں گا۔ مطلب یہ کہ اپنی آیت کا بول بالا کروں گا اور ان کی تکذیب کرنے والوں کو ہلاک کر دوں گا جیسے فرعون اور اس کے ساتھیوں کو ہلاک کر دیا اور اپنا دین پورے طور پر پھیلا کے رہے گا خواہ کافروں کو کتنا ہی ناگوار ہو۔ یا یہ مطلب ہے کہ چونکہ ان کو حق سے عناد ہے اس لئے ان کو ہدایت سے محروم رکھوں گا اور قرآنی آیات کو قبول کرنے اور ان پر ایمان لانے سے پھیر دوں گا۔ دوسری آیت میں بھی اسی طرح کا مضمون آیا ہے فرمایا ہے فَلَمَّا زَاغُوا أَزَاغَ اللَّهُ قُلُوبَهُمْ۔ نقلہ قول ابن عباس۔ سفیان نے سَأَصْرِفُ کی تشریح اس طرح کی کہ میں قرآن کو سمجھنے اور اس کے عجائب کو جاننے سے روک دوں گا۔

الَّذِينَ يَتَكَبَّرُونَ فِي الْأَرْضِ یعنی ان لوگوں کو جو ملک میں تکبر کرتے ہیں، میرے بندوں پر جبر کرتے ہیں اور میرے دوستوں سے لڑتے ہیں۔ بِغَيْرِ الْحَقِّ اس کا تعلق يَتَكَبَّرُونَ سے ہے یعنی باطل دین کی وجہ سے تکبر کرتے ہیں، بِغَيْرِ الْحَقِّ سے مراد ہے باطل دین۔ یا بِغَيْرِ الْحَقِّ، يَتَكَبَّرُونَ کی ضمیر فاعل سے حال ہے۔ بہرحال آیت کا حکم تمام کافروں کے لئے عام ہے۔ بعض علماء کے نزدیک آيَاتِيَ سے مراد ہیں وہ نو آیات جو اللہ نے حضرت موسیٰ کو عطا فرمائی تھیں اور الَّذِينَ سے مراد ہیں خاص کفار (یعنی قبطی) اس وقت آیت کا حکم خاص ہوگا۔

وَإِنْ يَرَوْا یعنی یہ متکبر اگر دیکھ لیں۔ كُلَّ آيَةٍ یعنی ہر نازل شدہ آیت و ہر معجزہ کو۔ لَا يُؤْمِنُوا بِهَا تو اس کو نہیں مانیں گے کیونکہ ان کے دلوں میں عناد ہے یا اس وجہ سے کہ اندھی تقلید اور خواہش پرستی میں غرق ہونے کے سبب ان کی عقلیں بگڑ گئی ہیں یا عدم ایمان کی وجہ صرف یہ ہے کہ اللہ نے ان کے دلوں پر گمراہی کا ٹھپہ لگا دیا ہے۔ وَإِنْ يَرَوْا سَبِيلَ الرُّشْدِ اور اگر انبیاء اور علماء کی رہنمائی کی وجہ سے ہدایت کا راستہ ان کے سامنے آ بھی جائے۔ لَا يَتَّخِذُوهُ سَبِيلًا تو چونکہ شیطنت ان پر غالب ہے اس لئے اپنے لئے اس کو اختیار نہیں کرتے۔ رُشْد، رَشَد، رَشَاد سب ہم معنی ہیں جیسے سُقْم، سَقَم، سَقَام۔ ابو عمرو نے کہا رُشد کسی کام کی درستی کو کہتے ہیں اور رَشَد دین کی استقامت کو۔

وَإِنْ يَرَوْا سَبِيلَ الْغَيِّ اور اگر نفس یا شیطان کے دکھانے سے گمراہی کا راستہ دیکھ لیں۔ ذٰلِكَ یہ آیات سے پھیر دینا۔ بِأَنَّهُمْ اس سبب سے ہے كَذَّبُوا بِآيَاتِنَا کہ انہوں نے ہماری نازل کردہ آیات اور معجزات کو جھٹلایا اور کائنات سماوی و ارضی کو نظر غور سے نہیں دیکھا۔ وَكَانُوا عَنْهَا غَافِلِينَ اور ان آیات سے غافل رہے یعنی ان کو بھول گئے اور لہو سمجھ کر ان کو ترک کر دیا یا عناد کی وجہ سے ان کی طرف توجہ نہیں کی۔ وَلِقَاءِ الْآخِرَةِ مفعول ہے یعنی اور آخرت کو پانا یعنی اور آخرت میں اللہ نے جس ثواب و عذاب کا وعدہ کیا ہے اس کو پانا جن لوگوں کو تسلیم نہیں۔ حَبِطَتْ أَعْمَالُهُمْ تو جو نیکیاں انہوں نے کی ہوں گی سب اکارت جائیں گی، غریبوں کو مال دینا، کنبہ والوں کے ساتھ سلوک کرنا، رشتہ داروں سے قطع تعلق نہ کرنا وغیرہ، بہرحال یہ سب نیکیاں اس میدانی سراب کی طرح ثابت ہوں گی جو دور سے پیاسے کو پانی دکھائی دیتی ہیں اور قریب پہنچا جائے تو (ہلاکت کے سوا) کچھ نہیں ملتا۔ هَلْ يُجْزَوْنَ استفہام انکاری ہے یعنی ان کو بدلہ نہیں دیا جائے گا۔ إِلَّا مَا كَانُوا يَعْمَلُونَ مگر انہی اعمال کا جو وہ دنیا میں

کرتے تھے اور اللہ کے نزدیک بھی وہ اعمال قابل اعتبار تھے یعنی خالص نیت کے ساتھ محض اللہ کے لئے (بغیر کسی شہرت و ریاء کے جذبہ کے) اعمال کئے تھے صرف انہی کی جزا ملے گی۔ یا یہ مطلب ہے کہ جو برا اعمال یاں وہ دنیا میں کرتے تھے انہی کی سزا دی جائے گی (ظلم نہیں کیا جائے گا) اور ان کے تمام اعمال برے ہی ہوں گے کوئی بھی اچھا ثابت نہ ہوگا۔ اللہ کے ساتھ دوسروں کی پوجا بدترین گناہ ہے۔ اگر اللہ کے دشمنی دینی نفسانی خواہش کی تسکین کے لئے مال خرچ کیا یا کچھ جوڑا جائے تو یہ بھی بہت برا عمل ہے اس سے کفر کی مدد ہوتی ہے (اور کافروں کی یہی عملی خصوصیات ہیں اس لئے ان کے تمام اعمال برے ہی ہیں)۔

وَاتَّخَذَ قَوْمُ مُوسٰى مِنْۢ بَعْدِهٖ مِنْ حُلِيِّهِمْ عِجْلًا جَسَدًا لَّهٗ خُوَارٌ (اور موسیٰ کے بعد ان کی قوم (بنی اسرائیل) نے (اپنے معبود بنانے کے لئے) زیور کا ایک بچھڑا (پوجا کے لئے) بنالیا جو ایک جسم تھا اور اس کی ایک آواز تھی)۔

قَوْمُ مُوسٰى یعنی بنی اسرائیل نے۔ مِنْۢ بَعْدِهٖ یعنی جب موسیٰ طور کی طرف مقرر کردہ وقت پر (مناجات کرنے اور کتاب لینے کے لئے) چلے گئے اور تیس دن گزرنے کے بعد چلہ کا چوتھا عشرہ شروع ہو گیا۔ مِنْ حُلِيِّهِمْ یعنی اس زیور کا جو بنی اسرائیل نے شادی کے بہانہ سے مصر سے نکلتے وقت قبطیوں سے بطور عاریت لے لیا تھا اور نکلنے کے بعد انہی کے پاس رہ گیا تھا۔ مِنْ حُلِيِّهِمْ میں اضافت قبضہ پر دلالت کر رہی ہے یعنی وہ زیور جو ان کے قبضہ میں تھا ملکیت کو ظاہر کر رہی ہے کیونکہ قوم فرعون کے غرق ہونے کے بعد بنی اسرائیل اس زیور کے مالک ہو گئے تھے۔ حُلِيّ بضم حاء وکسر لام حَلْی کی جمع ہے جیسے ثُدِیّ ثَدْی کی جمع ہے۔ عِجْلًا یہ پہلا مفعول ہے دوسرا مفعول محذوف ہے یعنی بنالیا بچھڑے کو معبود۔ جَسَدًا یہ عِجْلًا سے بدل ہے۔

حضرت ابن عباسؓ، قتادہؒ اور اہل تفسیر کی ایک جماعت کا قول ہے کہ یہ بچھڑا سامری نے بنایا تھا اور حضرت جبرئیل کی نشان قدم کی خاک اس کے منہ میں ڈال دی تھی جس کی وجہ سے وہ گوشت اور خون والا جسم بن گیا تھا۔ سامری کے قول کو نقل کرتے ہوئے اللہ نے فرمایا ہے بَصُرْتُ بِمَا لَمْ يَبْصُرُوْا بِهٖ فَقَبَضْتُ قَبْضَةً مِّنْ اَثَرِ الرَّسُوْلِ فَنَبَذْتُهَا الخ سورۂ طٰہٰ میں ہم سامری کا قصہ نقل کریں گے۔ خُوَارٌ گائے کی آواز۔ روایت میں آیا ہے کہ بچھڑے نے صرف ایک بار آواز نکالی تھی۔ بعض کا قول ہے کہ وہ برابر آوازیں نکالتا ہی تھا جب آواز نکالتا تھا بنی اسرائیل اس کے سامنے سجدے میں گر پڑتے تھے اور خاموش ہو جاتا تھا تو سجدے سے سر اٹھا لیتے تھے۔

وہب کا قول ہے اس کی آواز ضرور تھی مگر وہ حرکت نہیں کرتا تھا۔ سدیؒ نے کہا وہ چلتا بھی تھا۔ بعض اہل دانش نے لکھا ہے سونے کا ایک مجسمہ تھا جس میں جان نہ تھی جب ہوا اس کے پیٹ کے اندر داخل ہوتی تھی (اور پھر دوسری طرف سے نکلتی تھی) تو گائے کی آواز کی طرح اس کی آواز سنائی دیتی تھی۔ اب کی بجائے اسی تدبیر سے کی گئی تھی۔ اس تشریح کی تردید آیت فَقَبَضْتُ قَبْضَةً مِّنْ اَثَرِ الرَّسُوْلِ سے ہو رہی ہے۔

اَلَمْ يَرَوْا اَنَّهٗ لَا يُكَلِّمُهُمْ وَلَا يَهْدِيْهِمْ سَبِيْلًا ۘ اِتَّخَذُوْهُ وَكَانُوْا ظٰلِمِيْنَ ۞ (جب ان احمقوں نے بچھڑے کو معبود بنالیا تو) کیا انہوں نے اتنا بھی نہیں دیکھا کہ وہ (کیسا معبود ہے کہ) ان سے بات بھی نہیں کر سکتا اور نہ ان کو راہ ہدایت بتا سکتا ہے۔ (یعنی انسانوں کی طرح بھی اس میں قدرت نہیں ہے کہ بات کر سکے یا راستہ بتا سکے پھر کیسے انہوں نے اس کو آسمان و زمین اور ساری طاقتوں کا خالق مان لیا) ایسے کو معبود بنالیا اور وہ بڑا بے ڈھنگا کام کرنے والے تھے)۔ یعنی ایک ذلیل چیز کو معبود بنالیا یہ ظلم تھا ایک چیز کا بے محل استعمال تھا۔

وَلَمَّا سُقِطَ فِيْۤ اَيْدِيْهِمْ وَرَاَوْا اَنَّهُمْ قَدْ ضَلُّوْا ۙ قَالُوْا لَئِنْ لَّمْ يَرْحَمْنَا رَبُّنَا وَيَغْفِرْ لَنَا لَنَكُوْنَنَّ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ ۞ (اور جب وہ نادم ہوئے اور جان گئے کہ واقعی ہم گمراہی میں پڑ گئے، تو کہنے لگے اگر ہمارا رب ہم پر رحم نہ کرے اور ہم کو معاف نہ کرے تو ہم بالکل گئے گزرے ہو گئے)۔

سُقِطَ فِيْۤ اَيْدِيْهِمْ، سُقِطَ فعل مجہول کی اسناد فِيْۤ اَيْدِيْهِمْ کی طرف ہے، بطور کنایہ سخت پشیمانی مراد ہے، پشیمان

بِيَ الْاَعْدَآءَ وَلَا تَجْعَلْنِيْ مَعَ الْقَوْمِ الظّٰلِمِيْنَ ۝ قَالَ رَبِّ اغْفِرْ لِيْ وَلِاَخِيْ وَاَدْخِلْنَا فِيْ رَحْمَتِكَ ۖ وَاَنْتَ اَرْحَمُ الرّٰحِمِيْنَ ۝ (اور اپنے بھائی کے سر کے بالوں کو پکڑ کر اپنی طرف گھسیٹنے لگے، ہارون نے کہا اے میرے ماں جائے ان لوگوں نے مجھے بے حقیقت سمجھا اور قریب تھا کہ مجھے قتل کر ڈالیں، سو آپ (مجھ کو ذلیل کر کے) مجھ پر دشمنوں کو نہ ہنسوائیں اور مجھ کو ان ظالم لوگوں کے ذیل میں مت شمار کریں، موسیٰ ؑ نے کہا اے میرے رب میری اور میرے بھائی کی خطا معاف فرما دے اور ہم کو اپنی رحمت میں داخل فرما دے، تو سب سے بڑا رحیم ہے)۔

وَاَخَذَ بِرَاْسِ اَخِيْهِ موسیٰ ؑ اپنے بھائی ہارون کے سر کے بال پکڑ کر اپنی طرف گھسیٹنے لگے آپ کو گمان ہوا کہ ہارون کے قصور سے قوم گمراہی میں مبتلا ہوئی۔ بغوی نے برأسہ کی تشریح میں لکھا ہے کہ گیسو اور داڑھی پکڑ کر کھینچی۔ حضرت ہارون، حضرت موسیٰ ؑ سے تین سال بڑے تھے اور چونکہ غصہ آور نہ تھے اس لئے بنی اسرائیل آپ سے حضرت موسیٰ ؑ کی بہ نسبت زیادہ محبت کرتے تھے۔ اِبْنَ اُمَّ حضرت ہارون، حضرت موسیٰ ؑ کے حقیقی بھائی تھے لیکن موسیٰ ؑ کے دل میں نرمی پیدا کرنے اور اپنی محبت قلبی کا مظاہرہ کرنے کے لئے ماں جایا کہا۔ ابن عامر، حمزہ اور کسائی وغیرہ نے تو ابن اُمِّ پڑھا ہے اور ہونا بھی یہی چاہئے کیونکہ اصل میں یا ابن امی تھا حرف ندا اور یاء متکلم کو حذف کر دیا گیا میم کا کسرہ باقی رہ گیا لیکن فتحہ چونکہ خفیف ہے۔ زیادتی تخفیف کے لئے ابنَ امَّ اکثر قاریوں کی قرأت میں آیا ہے جیسے خَمْسَةَ عَشَرَ میں تا ہمیشہ مفتوح آتی ہے (کیونکہ دونوں لفظ مل کر ایک کلمہ بن گئے اور اعراب ایک کلمہ کے درمیان جاری نہیں ہوتا جیسے بعلبک میں لام پر ہمیشہ فتحہ آتا ہے) اسی کی مشابہت سے ابن ام کہا گیا۔

اِنَّ الْقَوْمَ یہ لوگ یعنی بچھڑے کے پجاریوں نے کادوا قریب تھا انھوں نے ارادہ کر ہی لیا تو مطلب یہ کہ میں نے ان کو روکنے میں اپنی کوشش کر لی مگر یہ مجھ پر غالب آگئے اور انھوں نے مجھے بے حقیقت سمجھ لیا قریب تھا کہ مجھے قتل کر دیں میں نے روکنے میں کوئی کوتاہی نہیں کی آپ اس میں میری کوشش کا قصور نہ سمجھیں۔

فَلَا تُشْمِتْ بِيَ یعنی مجھ سے ایسا سلوک نہ کیجئے کہ دشمن خوش ہوں۔ دشمن کی مصیبت پر خوش ہونے کو شماتت کہتے ہیں۔ کذا فی القاموس۔ وَلَا تَجْعَلْنِيْ اور غصہ اور غضب میں مجھے ان ظالموں کا شریک نہ بنایئے۔ ظالموں سے مراد ہیں گوسالہ پرست (کیونکہ گوسالہ پرستی جیسی غیر موزوں نالائق حرکت کا صدور ان سے ہوا تھا) رَبِّ اغْفِرْ لِيْ یعنی جو حرکت میں نے اپنے بھائی کے ساتھ کی اس کو معاف فرما دے وَلِاَخِيْ اور اگر میرے بھائی سے بنی اسرائیل کو روکنے میں کوئی قصور ہوا ہو تو اس کو بھی معاف فرما دے۔ کلام کا سیاق بتا رہا ہے کہ اصل مقصود اپنے بھائی کے قصور کی معافی کی طلب تھی، بھائی کو خوش کرنے اور دشمنوں کی شماتت دفع کرنے کے لئے دعاء مغفرت میں حضرت موسیٰ ؑ نے اپنی ذات کو بھی شریک کر لیا، پھر ایک بات یہ بھی ہے کہ دوسروں کے لئے استغفار کا طریقہ بھی یہی ہے کہ اپنی ذات کے لئے اول استغفار کیا جائے تاکہ اپنے نفس کو پاک سمجھنے کا شبہ بھی باقی نہ رہے۔ ایک بات یہ بھی ہے کہ گناہ دعا کو قبول ہونے سے روکتے ہیں اس لئے سب سے پہلے اپنے گناہوں کی معافی کی درخواست کی جائے اس کے بعد کوئی دعا کی جائے، یہی وجہ ہے کہ جنازہ کی (نماز کی) دعا میں اَللّٰهُمَّ اغْفِرْ لِحَيِّنَا وَمَيِّتِنَا آتا ہے، زندوں کا ذکر مردوں سے پہلے آتا ہے کیونکہ دعا کرنے والا زندہ ہی ہوتا ہے۔ اور نماز تہجد کی دعا میں بھی يَغْفِرُ اللّٰهُ لَنَا وَلَكُمْ آتا ہے۔ مخاطب سے پہلے متکلم کا ذکر کیا جاتا ہے۔ رسول اللہ ﷺ اگرچہ معصوم تھے آپ سے کسی گناہ کا صدور ہی نہ ہوتا تھا لیکن امت کی تعلیم کے لئے اللہ نے اپنے نبی کو خطاب کر کے فرمایا وَاسْتَغْفِرْ لِذَنْۢبِكَ وَلِلْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُؤْمِنٰتِ۔ وَاَدْخِلْنَا فِيْ رَحْمَتِكَ یعنی دنیا میں ہم کو معصوم رکھ اور آخرت میں ہم پر رحم فرما اور دونوں جہان میں ہم کو ترقی درجات عنایت کر۔ وَاَنْتَ اَرْحَمُ الرّٰحِمِيْنَ یعنی تو سب سے زیادہ ہم پر مہربان ہے یہاں تک کہ جتنے مہربان ہم اپنے اوپر ہیں اس سے بھی زیادہ تو ہم پر مہربان ہے۔

اِنَّ الَّذِيْنَ اتَّخَذُوا الْعِجْلَ سَيَنَالُهُمْ غَضَبٌ مِّنْ رَّبِّهِمْ وَذِلَّةٌ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۭ وَكَذٰلِكَ نَجْزِي الْمُفْتَرِيْنَ ۝

وَالَّذِيْنَ عَمِلُوا السَّيِّاٰتِ ثُمَّ تَابُوْا مِنْ بَعْدِهَا وَاٰمَنُوْۤا اِنَّ رَبَّكَ مِنْ بَعْدِهَا لَغَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝ (بے شک جن لوگوں نے بچھڑے کی پوجا کی بہت جلد ان پر دنیوی زندگی میں ان کے رب کا غضب آئے گا اور ذلت پڑے گی۔ ہم افتراء پردازوں کو ایسی ہی سزا دیا کرتے ہیں اور جن لوگوں نے برے کام کرنے کے بعد توبہ کر لی اور (سچے دل سے) ایمان لے آئے تو آپ کا رب اس توبہ کے بعد گناہ کو معاف کرنے والا اور رحم کرنے والا ہے)۔

اِتَّخَذُوا الْعِجْلَ یعنی جنہوں نے گوسالہ کو معبود بنایا غَضَبٌ یعنی عذاب اس سے مراد ہے وہ حکم جو ان کو دیا گیا تھا کہ آپس میں ایک دوسرے کو قتل کر دے۔ وَذِلَّةٌ ذلت سے مراد ہے گھروں سے نکل جانا، جلاوطن ہو جانا۔ اس مطلب پر سَيَنَالُهُمْ میں سین استقبال کے لئے ہو گا اور حضرت موسیٰ کے غضب ناک ہونے کے بعد آنے والا زمانہ جس میں بنی اسرائیل کو سزا دی گئی مراد ہو گا۔ لیکن عطیہ عوفی کا قول ہے کہ اِنَّ الَّذِيْنَ اتَّخَذُوا الْعِجْلَ سے مراد ہیں رسول اللہ ﷺ کے زمانہ کے یہودی۔ باپ دادا کے ناشائستہ افعال کا ذکر کر کے ان کو عار دلائی گئی ہے اور انہی یہودیوں سے فرمایا گیا ہے کہ تم کو آخرت میں اللہ کی طرف سے عذاب ہو گا اور دنیا میں ذلت پڑے گی چنانچہ بنی قریظہ اور بنی نضیر پر یہ ذلت پڑی کہ ایک قبیلہ کو قتل کیا گیا اور دوسرے قبیلہ کو جلاوطن کیا گیا۔ حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا ذلت سے مراد ہے جزیہ۔

وَالَّذِيْنَ عَمِلُوا السَّيِّاٰتِ یعنی حضرت موسیٰ کی قوم میں سے جنہوں نے گوسالہ پرستی کی پھر توبہ کی اور مومن ہو گئے اور اللہ کی خوشنودی حاصل کرنے کے لئے حکم کے مطابق آپس میں ایک نے دوسرے کو قتل کیا۔ مِنْ بَعْدِهَا یعنی توبہ کے بعد۔ لَغَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ بلاشبہ وہ معاف کرنے والا اور رحم کرنے والا ہے خواہ گناہ کتنے ہی بڑے اور زیادہ ہوں (سب معاف فرما دے گا)۔

وَلَمَّا سَكَتَ عَنْ مُّوْسَى الْغَضَبُ اَخَذَ الْاَلْوَاحَ ۚ وَفِيْ نُسْخَتِهَا هُدًى وَّرَحْمَةٌ لِّلَّذِيْنَ هُمْ لِرَبِّهِمْ يَرْهَبُوْنَ ۝ (اور جب موسیٰ کا غصہ فرو ہوا تو ان تختیوں کو اٹھا لیا اور ان کے مضامین میں ان لوگوں کے لئے جو اپنے رب سے ڈرتے تھے ہدایت اور رحمت تھی)۔

سَكَتَ یعنی ساکن فرو ہوا۔ عَنْ مُّوْسَى الْغَضَبُ حضرت ہارون کی معذرت اور قوم کی ندامت و توبہ کے بعد جب حضرت موسیٰ کا غصہ فرو ہوا سکون کو بلفظ سکوت سے تعبیر کرنے میں کلام کی بلاغت زور آگیا۔ وہ غضب جس نے گزشتہ حرکت حضرت موسیٰ سے صادر ہوئی تھی اس کو آمر و حاکم کی صورت میں پیش کیا گیا ہے (گویا پہلے غضب نے حکم دیا تھا کہ تختیاں پھینک دو موسیٰ نے تختیاں پھینک دیں، پھر غصہ خاموش ہو گیا تو موسیٰ نے تختیاں اٹھا لیں)۔

اَخَذَ الْاَلْوَاحَ تختیاں لے لیں جن کا کچھ حصہ ٹوٹ چکا تھا۔ وَفِيْ نُسْخَتِهَا بعض علماء کے نزدیک نسخہ سے مراد ہے لوح (کیونکہ نسخہ کا لغوی معنی ہے کاپی، نقل اور لوح لوح محفوظ کی نقل تھی۔ بعض کا قول ہے کہ پھینکنے سے اصل تختیاں تو ٹوٹ گئی (ناکارہ اور ناقابل قراءت ہو گئیں) پھر حضرت موسیٰ نے چالیس دن روزے رکھے تو دو تختیوں پر لکھی ہوئی توریت دوبارہ عطا کی گئی۔ هُدًى گمراہی سے ہدایت اور حق کا بیان۔ وَرَحْمَةٌ اور عذاب کی جگہ رحمت۔ لِرَبِّهِمْ اس میں لام زائد ہے (کیونکہ يَرْهَبُوْنَ کا مفعول بغیر لام کے عربی کلام میں آتا ہے) جیسے رَدِفَ لَكُمْ میں لام زائد ہے۔ کسائی نے کہا فعل کے موخر ہونے کی وجہ سے اس کے عمل میں کمزوری آگئی ہے اس لئے مفعول پر لام زائد کیا گیا جیسے لِلرُّءْيَا تَعْبُرُوْنَ میں۔ قطرب کے نزدیک یہ لام مِنْ کے معنی میں ہے اپنے رب سے ڈرتے ہیں۔ بعض نے کہا يَرْهَبُوْنَ بمعنی رَاهِبُوْنَ (اسم فاعل) کے ہے۔ بعض کے نزدیک لام تعلیل کا ہے یعنی اللہ کی وجہ سے گناہوں سے ڈرتے ہیں۔

وَاخْتَارَ مُوْسٰى قَوْمَهٗ سَبْعِيْنَ رَجُلًا لِّمِيْقَاتِنَا ۚ (اور موسیٰ نے ہمارے مقرر کردہ وقت (پر کوہ طور کو جانے) کے لئے اپنی قوم میں سے ستر آدمی چنے)۔

قَوْمَهٗ یعنی مِنْ قَوْمِهٖ اپنی قوم میں سے۔ سَبْعِيْنَ رَجُلًا یعنی ان لوگوں میں سے ستر آدمی جنہوں نے بچھڑے کی پوجا

نہیں کی تھی۔ لمیقاتنا یعنی ہم نے ان کی حاضری کا جو وقت مقرر کیا تھا اس وقت کے لئے

روایت میں آیا ہے کہ اللہ نے حضرت موسیٰؑ کو حکم دیا کہ اپنی قوم میں سے ستر آدمیوں کو لے کر آؤ اور بچھڑے کی پوجا کی معذرت پیش کرو (یعنی قصور معاف ہونے کی دعا کرو) آپ نے ہر سبط میں سے چھ آدمی چھانٹ لئے، اس طرح دو آدمی بڑھ گئے کیونکہ کل اسباط بارہ تھے آپ نے فرمایا دو آدمی کم کر لو اس پر کوئی راضی نہ ہوا آخر آپ نے فرمایا جو آدمی ساتھ نہ جائے گا اس کو بھی ساتھ جانے والے کے برابر ثواب ملے گا اس پر کالب اور یوشع بیٹھ گئے اور باقی کو ساتھ لے کر آپ چل دیئے۔ پہاڑ کے قریب پہنچے تو موسیٰؑ اور ساتھیوں کو ایک باریک ابر نے اپنی آغوش میں لے لیا، سب لوگ سجدہ میں گر پڑے اور سب نے سنا کہ اللہ نے موسیٰؑ سے کلام کیا، بعض اوامر و نواہی کی ہدایت کی۔ تھوڑی دیر کے بعد ابر چھٹ گیا تو ساتھی حضرت موسیٰؑ سے کہنے لگے جب تک کھلم کھلا ہم اللہ کو دیکھ نہ لیں یوں ہم کو آپ کی باتوں کا یقین نہیں آئے گا معلوم نہیں کس کی آواز تھی (اس گستاخی کی وجہ سے ان کو بجلی نے آپکڑا۔ بعض نے کہا پہاڑ میں زلزلہ آگیا اور سب بے ہوش ہو گئے یعنی مر گئے۔ سدی کا یہی قول ہے۔

حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا جن ستر لوگوں پر بجلی گری تھی ان کا واقعہ بعد کا ہے اور جن لوگوں نے بغیر رو در رو خدا کو دیکھے، صرف آواز سن کر ماننے سے انکار کر دیا تھا، ان کا واقعہ پہلے ہو چکا تھا اللہ نے موسیٰ کو حکم دیا تھا کہ ستر آدمیوں کو چن کر اپنے ساتھ باہر لاؤ حضرت موسیٰؑ نے ستر افراد چن لئے اور سب کو لے کر بستی سے باہر آ کر سب نے دعا کی۔ من جملہ دعا کے انہوں نے یہ الفاظ بھی کہے تھے کہ اے اللہ ہم کو وہ چیز عطا فرما جو تو نے ہم سے پہلے کسی کو نہ دی ہو نہ ہمارے بعد کسی کو دے۔ یہ (تحکم طلبی کی) بات اللہ نے نامنظور کر دی اور ان کو بجلی نے آپکڑا۔ وہب نے کہا وہ رجفہ موت نہ تھا (یعنی مرے نہیں) بلکہ منظر دیکھ کر ان پر لرزہ طاری ہو گیا، کپکپانے لگے، بے چین ہو گئے، جوڑ جوڑ ٹوٹنے لگا۔

فَلَمَّآ اَخَذَتْهُمُ الرَّجْفَةُ قَالَ رَبِّ لَوْ شِئْتَ اَهْلَكْتَهُمْ مِّنْ قَبْلُ وَاِيَّايَ ؕ اَتُهْلِكُنَا بِمَا فَعَلَ السُّفَهَآءُ مِنَّا ۚ اِنْ هِيَ اِلَّا فِتْنَتُكَ ؕ تُضِلُّ بِهَا مَنْ تَشَآءُ وَتَهْدِيْ مَنْ تَشَآءُ ؕ اَنْتَ وَلِيُّنَا فَاغْفِرْ لَنَا وَارْحَمْنَا وَاَنْتَ خَيْرُ الْغٰفِرِيْنَ ۝ وَاكْتُبْ لَنَا فِيْ هٰذِهِ الدُّنْيَا حَسَنَةً وَّفِي الْاٰخِرَةِ اِنَّا هُدْنَآ اِلَيْكَ ؕ

(سو جب ان کو زلزلہ یا بجلی نے آپکڑا تو موسیٰؑ نے عرض کیا اے میرے مالک اگر تو چاہتا تو اس سے پہلے ہی ان کو ہلاک کر دیتا اور مجھ کو بھی، کیا تو ہم میں سے ان بے وقوفوں کی حرکت پر سب کو ہلاک کر دے گا، یہ واقعہ تو تیری طرف سے محض ایک امتحان ہے (یعنی ہلاک کرنے کے لئے تو نے ایسا نہیں کیا) ایسے امتحانات سے تو جس کو چاہتا ہے گمراہی میں ڈال دیتا ہے اور جس کو چاہتا ہے سیدھی راہ پر چلاتا ہے۔ تو ہمارا کارساز ہے ہم کو معاف فرما دے اور ہم پر رحم فرما تو سب سے زیادہ معاف کرنے والا ہے اور ہم لوگوں کے نام دنیا میں بھی نیک حالی لکھ دے اور آخرت میں بھی ہمارا رجوع تیری ہی طرف ہے)۔

فَلَمَّآ اَخَذَتْهُمُ الرَّجْفَةُ سیوطی نے لکھا ہے کہ حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا الرَّجْفَةُ یعنی سخت زلزلہ۔ چونکہ گوسالہ پرستوں سے وہ لوگ گوسالہ پرستی کے وقت الگ اور کنارہ کش نہیں ہوئے اس لئے سخت بھونچال میں گرفتار ہو گئے۔ حضرت موسیٰؑ کو ان کی حالت دیکھ کر رحم آیا اور اندیشہ ہوا کہ کہیں وہ مر نہ جائیں اور حضرت موسیٰؑ کے ہاتھ سے نکل نہ جائیں۔ یہ لوگ تمام نیک کاموں میں حضرت موسیٰؑ کے مددگار تھے، اطاعت گزار اور فرماں بردار تھے ان کی یہ حالت دیکھ کر حضرت موسیٰؑ رونے لگے اور عرض کیا رَبِّ لَوْ شِئْتَ اے مالک اس منظر کو دیکھنے سے پہلے ہی اگر تو چاہتا تو ان سب کو اور مجھے مار ڈالتا۔ یعنی فرعون کے ہاتھ سے ان کو مروا دیتا اور دریا میں غرق کر دیتا یا کسی اور طرح سے مار ڈالتا مگر تو نے رحم کیا ان کو بچا لیا فرعون سے بھی اور دریا سے بھی ہر مصیبت سے رہائی دی اب اگر ایک بار اور تو ان پر رحم فرما دے تو تیری عمومی رحمت سے بعید نہیں۔ بعض علماء نے کہا لَوْ شِئْتَ کا یہ مطلب ہے کہ اگر تو چاہتا تو یہاں آنے سے پہلے ہی قوم کے سامنے ان کو ہلاک کر دیتا سب لوگ دیکھ لیتے اور مجھ پر تہمت تراشی نہ کر پاتے۔

بِمَا فَعَلَ السُّفَهَآءُ مِنَّا ان بے وقوفوں نے جو طلب دیدار کی جرأت کی یا بچھڑے کی پوجا کی ان کی اس حرکت سے تو

کیا سب کو ہلاک کر دے گا۔ مبرد نے کہا کلام استفہامی ہے مگر استفہام کی غرض طلب رحم ہے کیونکہ موسیٰ واقف تھے کہ اللہ بڑا منصف ہے، بعض کے جرم سے سب کو ہلاک نہیں کرتا (اور جس چیز سے واقف تھے اس کو دریافت کرنے کا کوئی معنی نہیں اس لئے استفہام سے مراد ہے مہربانی کی طلب) یعنی ہلاک نہ کر۔ اِنْ بھی نہیں ہے وہ یعنی رؤیت کی طلب یا گوسالہ پرستی۔ اِلَّا فِتْنَتُكَ مگر تیری طرف سے امتحان کہ ان کو کلام سنایا جس سے ان کو تیرے دیدار کا لالچ ہو گیا تو نے ایک بچھڑا چیختا کار بنوا دیا جس سے یہ بچھڑا لوگ گئے اور پھر تو نے ان کو یونہی بے مدد چھوڑ دیا۔

"اِلَّا فِتْنَتُكَ" کے لفظ میں اللہ کے قول اِنَّا قَدْ فَتَنَّا قَوْمَكَ مِنْ بَعْدِكَ کی طرف اشارہ ہے گویا حضرت موسیٰ نے عرض کیا یہ تیرا ہی امتحان ہے جس کی تو نے مجھے اطلاع پہلے ہی دی تھی کہ کچھ لوگوں کو تو نے گمراہی میں ڈال دیا اور وہ فتنہ میں پڑ گئے اور کچھ کو ہدایت پر قائم رکھا اور گمراہ کر دیا کہ وہ دین پر جمے رہے۔ تُضِلُّ بِهَا مَنْ تَشَاءُ تو جس کو گمراہی میں ڈالنا چاہتا ہے اس کو گمراہی میں ڈال دیتا ہے کہ اس کی مدد نہیں کرتا بے مدد چھوڑ دیتا ہے، نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ اپنی حد سے آگے بڑھ جاتا ہے۔ وَتَهْدِي مَنْ تَشَاءُ اور جس کی ہدایت چاہتا ہے اس کو ہدایت پر کر دیتا ہے (اور اس کی مدد کرتا ہے) جس کی وجہ سے اس کا ایمان مضبوط ہو جاتا ہے۔ اَنْتَ وَلِيُّنَا تو ہمارا مددگار اور محافظ ہے۔ وَاَنْتَ خَيْرُ الْغَافِرِيْنَ یعنی برائی کو معاف کر دیتا ہے اور اس کی جگہ بھلائی عطا کرتا ہے۔ وَاكْتُبْ لَنَا اور ہمارے لئے لکھ دے یعنی واجب کر دے۔

حَسَنَةً نیک حال یعنی طاعت کی توفیق اور نعمت اور عافیت۔ وَفِي الْآخِرَةِ اور آخرت میں بھی نیک حال یعنی مغفرت اور رحمت اور جنت۔ اِنَّا هُدْنَا اِلَيْكَ ہم نے تیری طرف رجوع کیا توبہ کی یہ لفظ هَادَ يَهُوْدُ سے (جمع متکلم ماضی کا صیغہ) ہے۔ قتادہ اور ابن جریج کا قول ہے اور محمد بن کعب نے بھی یہی کہا ہے کہ ان لوگوں کا قصور اتنا تھا کہ گوسالہ پرستی کے وقت یہ لوگ گوسالہ پرستوں سے کنارہ کش نہ ہوئے تھے (انہی کی معاشرت میں گھلے ملے رہتے تھے) نہ بھلائی کا حکم دیا نہ برائی سے روکا تھا اسی جرم کی وجہ سے عذاب رجفہ میں پکڑے گئے۔

قَالَ عَذَابِيْٓ اُصِيْبُ بِهٖ مَنْ اَشَآءُ ۚ وَرَحْمَتِيْ وَسِعَتْ كُلَّ شَيْءٍ ؕ فَسَاَكْتُبُهَا لِلَّذِيْنَ يَتَّقُوْنَ وَيُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ وَالَّذِيْنَ هُمْ بِاٰيٰتِنَا يُؤْمِنُوْنَ ۚ (اللہ نے فرمایا میں اپنا عذاب تو اسی پر واقع کرتا ہوں جس پر چاہتا ہوں اور میری رحمت ہر چیز کو اپنے اندر سموئے ہوئے ہے تو وہ میں ان لوگوں کے لئے تو ضرور ہی لکھوں گا جو (اللہ کی نافرمانی سے) بچا کرتے ہیں اور زکوٰۃ دیتے ہیں اور ہمارے آیات پر ایمان رکھتے ہیں)۔

قَالَ یعنی موسیٰ کی دعا کے جواب میں اللہ نے فرمایا۔ وَسِعَتْ كُلَّ شَيْءٍ یعنی میری رحمت ہر شے کے لئے عام ہے (کوئی میری رحمت سے محروم نہیں) دنیا میں کوئی مومن ہو کافر ہو مکلف ہو غیر مکلف ہو۔ البتہ آخرت میں کافروں پر رحمت نہ ہوگی کیونکہ دوسروں کی پوجا کر کے اللہ کی رحمت میں داخل ہونے سے خود انکار کر دیا۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا میری ساری امت جنت میں جائے گی سوائے اس کے جس نے انکار کیا۔ عرض کیا گیا، انکار کس نے کیا (امت میں منکر کون ہو سکتا ہے) فرمایا جس نے میری اطاعت کی وہ جنت میں جائے اور جس نے نافرمانی کی اس نے انکار کیا (رواہ البخاری)۔

عطیہ عوفی نے آیت کی تشریح میں فرمایا اللہ کی رحمت سموئے ہوئے تو ہر چیز کو ہے لیکن رحمت کا وجوب صرف متقیوں کے لئے ہے۔ اللہ کی رحمت اہل ایمان کے لئے وسیع ہے ان کی وجہ سے کافروں کو بھی رزق ملتا اور بلائیں دفع ہوتی ہیں اور یہ بھی اللہ کی رحمت سے بہرہ اندوز ہوتے ہیں پھر جب مومن آخرت کو سدھاریں گے اور رحمت خداوندی خصوصیت کے ساتھ انہی پر ہوگی (کافر بلا رحمت رہ جائیں گے) جیسے دوسرے کے چراغ کی روشنی سے کوئی شخص فائدہ اندوز ہوتا ہو اور جب چراغ والا اپنا چراغ لے جائے تو یہ اور بھی محروم رہ جائے۔

فَسَاَكْتُبُهَا یعنی اے بنی اسرائیل میں آخرت میں تم لوگوں میں سے انہی کے لئے رحمت واجب کروں گا۔ لِلَّذِيْنَ يَتَّقُوْنَ جو کفر و معصیت سے بچتے ہیں۔ وَيُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ (يَتَّقُوْنَ میں ادائے فرض بھی داخل تھی مگر) زکوٰۃ کا ذکر خصوصیت

سے اس لئے کیا کہ نفس پر زکوٰۃ بہت شاق ہوتی ہے (دل پر بڑا پتھر رکھ کر آدمی اپنا مال بلا احسان دوسرے کو دیتا ہے) یعنی میری تمام کتابوں پر۔ یُؤْمِنُوْنَ ایمان رکھتے ہیں کسی کا بھی انکار نہیں کرتے۔

چونکہ اللہ کے علم میں تھا کہ حضرت موسیٰ کی شریعت کو ایک وقت پر منسوخ کیا جائے گا اس لئے آئندہ آیت میں اس پر تنبیہ فرمائی اور بنی اسرائیل کو رسول امی خاتم الانبیاء ﷺ کی اتباع پر برانگیختہ کیا۔

اَلَّذِيْنَ يَتَّبِعُوْنَ الرَّسُوْلَ النَّبِيَّ الْاُمِّيَّ الَّذِيْ يَجِدُوْنَهٗ مَكْتُوْبًا عِنْدَهُمْ فِي التَّوْرٰىةِ وَالْاِنْجِيْلِ يَاْمُرُهُمْ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهٰىهُمْ عَنِ الْمُنْكَرِ وَيُحِلُّ لَهُمُ الطَّيِّبٰتِ وَيُحَرِّمُ عَلَيْهِمُ الْخَبٰٓئِثَ

(جو لوگ اتباع کرتے ہیں اس رسول نبی امی کا جس (کے صفات و احوال) کو وہ اپنے پاس انجیل و توریت میں لکھا ہوا پاتے ہیں جو ان کو نیک باتوں کا حکم دیتا ہے اور بری باتوں کی ممانعت کرتا ہے اور پاکیزہ چیزوں کو ان کے لئے حلال بتاتا ہے اور گندی چیزوں کو (بدستور) ان پر حرام قرار دیتا ہے)۔ اَلَّذِيْنَ يَتَّبِعُوْنَ مبتداء ہے یَاْمُرُهُمْ خبر ہے یا مبتداء محذوف ہے اور اَلَّذِيْنَ خبر ہے یعنی وہی لوگ ہیں جو اتباع کرتے ہیں۔ اَلرَّسُوْلَ النَّبِيَّ یعنی اللہ کا پیغمبر اور بندوں کے ذمہ لگانے والے نبی۔ اَلْاُمِّيَّ مراد رسول اللہ ﷺ۔ اُمّی، ام (ماں) کی طرف منسوب ہے یعنی اسی حالت پر جس حالت پر پیدائش کے وقت تھا مطلب یہ کہ نہ لکھا ہے نہ پڑھا۔

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہم امی گروہ ہیں نہ لکھتے ہیں نہ حساب دانی ہیں۔ رواہ البخاری و مسلم عن ابن عمر۔ امی کا وصف ذکر کرنے سے اس بات پر تنبیہ فرمائی کہ باوجودیکہ محمد ﷺ لکھے پڑھے نہیں اس حالت میں ان کا علمی کمال اعلیٰ ترین معجزہ ہے۔ بعض علماء نے کہا امی امت کی طرف منسوب ہے آپ کی امت کثیر ہونے والی تھی اس لئے آپ کو امی فرمایا۔ حضرت انسؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا قیامت کے دن میرے تابع تمام انبیاء سے زائد ہوں گے اور میں ہی سب سے پہلے جنت کا دروازہ کھٹکھٹاؤں گا۔ رواہ مسلم۔

امی اصل میں امتی تھا نسبت کی وجہ سے تاء کو حذف کر دیا جیسے مکی اور مدنی میں تاء کو حذف کر دیا گیا ہے (مکی، مکتی تھا اور مدنی مدنتی)۔ بعض کے نزدیک امی، ام القریٰ کی طرف منسوب ہے یعنی مکہ کے رہنے والے۔ اس آیت کی وجہ سے وہ بنی اسرائیل حکم آیت سے خارج ہو گئے جنہوں نے رسول اللہ ﷺ کا دور نبوت پایا اور ایمان نہ لائے، مگر وہ بنی اسرائیل حکم میں داخل رہے جنہوں نے حضور ﷺ کا عہد رسالت نہیں پایا تھا اور آپ کی نبوت سے پہلے گزر گئے کیونکہ آیت میں صاف صراحت ہے کہ مَا تَفَرَّقَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ اِلَّا مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَتْهُمُ الْبَيِّنَةُ۔

ابن حبان نے حضرت انسؓ کی روایت سے بیان کیا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا قیامت کے دن ہر نبی کے لئے نور کا ایک منبر ہوگا اور میں سب سے اونچے اور سب سے زیادہ نور والے منبر پر متمکن ہوں گا کہ ایک منادی ندا دے گا نبی ﷺ امی کہاں ہے۔ انبیاء کہیں گے ہم میں سے ہر ایک نبی امی ہے (یعنی امت والا ہے) پھر کس کے پاس پیام آیا ہے۔ منادی دوبارہ لوٹ کر آئے گا اور کہے گا نبی امی عربی کہاں ہے اس پر محمد ﷺ (منبر سے) اتر کر آئے گا اور جنت کے دروازہ پر پہنچ کر دروازہ کھٹکھٹائے گا دریافت کیا جائے گا کون ہے جواب ملے گا محمد ﷺ اور احمد ﷺ دریافت کیا جائے گا کیا بلایا گیا تھا جواب ملے گا ہاں۔ دروازہ کھول دیا جائے گا اور رب جلوہ انداز ہوگا اس سے پہلے جلوہ انداز نہ ہوگا، تجلی پڑتے ہی محمد ﷺ سجدہ میں گر پڑے گا اور اس طرح سے اللہ کی حمد کرے گا کہ کسی نے نہ کی ہوگی۔ حکم ہوگا سر اٹھاؤ بات کرو اور شفاعت کرو تیری شفاعت قبول کی جائے گی۔ اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ نبی کا لفظ امی امت کی طرف منسوب ہے اسی لئے ہر پیغمبر اپنے کو امی کہے گا۔ رسول اللہ ﷺ کے لئے لفظ امی کی خصوصیت اس لئے ہوگی کہ آپ کی امت ہر پیغمبر کی امت سے زیادہ ہے (بڑی امت والا ہے)۔

يَجِدُوْنَهٗ جس کو بنی اسرائیل پاتے ہیں۔ مَكْتُوْبًا لکھا ہوا نام بھی اور خصوصی اوصاف بھی۔ حضرت انسؓ کی روایت ہے کہ ایک یہودی لڑکا رسول اللہ ﷺ کی خدمت کیا کرتا تھا وہ بیمار ہو گیا رسول اللہ ﷺ اس کے پاس تشریف لے گئے اس کا باپ اس کے سرہانے توریت پڑھ رہا تھا رسول اللہ ﷺ نے فرمایا یہودی میں تجھے اس اللہ کی قسم دیتا ہوں جس نے موسیٰ پر توریت

وذکرہ فی المصابیح۔ دارمی نے بھی یہ حدیث کسی قدر تغیر کے ساتھ نقل کی ہے۔

حضرت عبداللہ بن سلام نے فرمایا توریت میں محمد ﷺ کے اوصاف لکھے ہوئے ہیں اور (یہ بھی لکھا ہے کہ) عیسیٰ بن مریم کو ان کے ساتھ دفن کیا جائے گا۔ رواہ الترمذی۔ ابو داؤد نے کہا حجرہ میں ایک قبر کی جگہ چھوٹی ہوئی ہے۔

یَاْمُرُهُمْ بِالْمَعْرُوْفِ یعنی ان باتوں کا حکم دیتا ہے جو شریعت الٰہیہ میں اچھی جانی گئی ہیں۔ وَیَنْهٰىهُمْ عَنِ الْمُنْكَرِ یعنی ان باتوں کی ممانعت کرتا ہے جو شرع، عقل سلیم اور سنجیدہ غیر جذباتی ہوش رکھنے والوں کے نزدیک بری ہیں جیسے شرک، محسن کی ناشکری اور نافرمانی، قرابت داروں سے رشتہ قرابت کو توڑ لینا۔ وَیُحِلُّ لَهُمُ اور بنی اسرائیل کے لئے حلال کرتا ہے۔ الطَّیِّبٰتِ وہ پاکیزہ چیزیں جو نافرمانی کی سزا میں توریت کے اندر ان کے لئے حرام کر دی گئی تھیں جیسے چربی اور اونٹ کا گوشت اور ان چیزوں کو بھی حلال کرتا ہے جو اہل جاہلیت نے خود اپنے لئے حرام قرار دے رکھی تھیں جیسے بحیرہ، سائبہ، وصیلہ، حام (ان چاروں اقسام کے اونٹوں کی تفصیل کئی جگہ گزر چکی ہے)

وَیُحَرِّمُ عَلَیْهِمُ الْخَبٰٓئِثَ اور گندی چیزوں کو ان کیلئے حرام کرتا ہے جیسے خون، شراب، خنزیر، مردار، سود، رشوت۔

وَیَضَعُ عَنْهُمْ اِصْرَهُمْ وَالْاَغْلٰلَ الَّتِیْ كَانَتْ عَلَیْهِمْ اور ان پر جو بوجھ اور طوق تھے ان کو دور کرتا ہے (یعنی اتار پھینکتا ہے)۔

اِصْر لغت میں اس بوجھ کو کہتے ہیں جو حرکت کرنے سے روک دے۔ حضرت ابن عباسؓ، حسن، ضحاک، سدی اور مجاہد کے نزدیک اصر سے مراد وہ عہد ہے جو بنی اسرائیل سے توریت کے کل احکام کی پابندی رکھنے کا لیا گیا تھا۔ قتادہ کے نزدیک وہ دینی تشدد مراد ہے جس کے بنی اسرائیل مکلف تھے۔ وَالْاَغْلٰلَ یعنی وزنی بار جو حضرت موسیٰ کی شریعت میں تھے جیسے توبہ قبول ہونے کے لئے قتل کئے جانے کا ضروری حکم، گناہ کرنے والے عضو کو کاٹ ڈالنے کا حکم، کپڑے پر نجاست لگ جائے تو اس کو قینچی سے قطع کر دینے کا حکم، قتل عمداً ہو یا خطاءً بہر حال قصاص کا وجوبی حکم اور خون بہا لینے دینے کی ممانعت، سنیچر کے دن کوئی دنیوی کام بند کرنے کا حکم، گرجا کے علاوہ کہیں اور کسی جگہ نماز کی ادائیگی نہ ہونے کا حکم یہ اور اسی طرح کے دوسرے سخت احکام تھے جو طوق کی طرح یہودیوں کی گردنوں میں پڑے ہوئے تھے۔

فَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا بِهٖ وَعَزَّرُوْهُ وَنَصَرُوْهُ وَاتَّبَعُوا النُّوْرَ الَّذِیْٓ اُنْزِلَ مَعَهٗٓ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ﴿۱۵۷﴾

(سو جو لوگ اس (نبی امی) پر ایمان لاتے ہیں اور اس کی حمایت کرتے ہیں اور اس کی مدد کرتے ہیں اور اس نور کا اتباع کرتے ہیں جو اس کے ساتھ بھیجا گیا ہے ایسے ہی لوگ پوری فلاح پانے والے ہیں)۔

عَزَّرُوْهُ اس کی تعظیم کی یعنی قوت پہنچا کر (اس کی عملی) تعظیم کی۔ وَنَصَرُوْهُ اور دشمنوں کے خلاف اس کی مدد کی۔ النُّوْر یعنی قرآن مجید۔ مَعَهٗ یعنی اس کی نبوت کے ساتھ جو قرآن بھیجا گیا ہے اس پر ایمان لاتے ہیں۔ قرآن کو نور کہنے کی وجہ یہ ہے کہ (نور اس چیز کو کہتے ہیں جو خود بالکل ظاہر ہو اور دوسری چیزوں کو بھی ظاہر کر دینے والی ہو) قرآن اپنے معجزہ ہونے کی وجہ سے خود ظاہر اعجاز ہے بغیر اس کا کلام اللہ ہونا پوشیدہ نہیں ہے اور (افکار و اعمال کو روشن کرنے والے) احکام کو ظاہر کرنے والا بھی ہے یا یوں کہا جائے کہ قرآن حقائق کے چہرے سے پردہ اٹھا دینے والا ہے اس لئے اس کو نور کہا گیا۔

مَعَهٗ کا تعلق اِتَّبَعُوْا سے ہو (اُنْزِلَ سے نہ ہو) اس وقت یہ مطلب ہو گا کہ نازل شدہ نور یعنی قرآن کا بھی اتباع کرو اور نبی کا بھی اتباع کرو، قرآن اور سنت دونوں کی پیروی کرو۔ الْمُفْلِحُوْنَ یعنی ابدی فلاح پانے والا اور لازوال دائمی رحمت سے سرفراز ہونے والے۔ الْمُفْلِحُوْنَ تک حضرت موسیٰ کی دعا کا جواب تھا۔

نوف بکالی حمیری کا بیان ہے کہ حضرت موسیٰ نے اپنی قوم سے ستر آدمی چھانٹے، پھر اللہ نے حضرت موسیٰ سے فرمایا میں تم لوگوں کیلئے تمام زمین کو عبادت گاہ اور پاک قرار دے دوں گا جہاں نماز کا وقت ہو جائے تم نماز پڑھ سکو گے بجز پاخانہ، غسل خانہ یا قبر کے پاس پڑھنے کی ممانعت ہو گی اور تمہارے دلوں میں ٹھہراؤ (اطمینان زیبائی) پیدا کر دوں گا تم دل سے (یعنی حفظ)

توریت پڑھا کریں گے مرد، عورت، آزاد، غلام، چھوٹا بڑا ہر شخص توریت حفظ پڑھے گا۔ حضرت موسیٰ سے یہ فرمان اپنی قوم کو سنایا، لوگ کہنے لگے ہم نہیں چاہتے کہ گرجا کے علاوہ کہیں اور نماز پڑھیں نہ ہم دلوں سے توریت پڑھنے کی طاقت رکھتے ہیں ہم تو صرف دیکھ کر پڑھنا چاہتے ہیں۔ اس پر اللہ نے فرمایا فَسَاَكْتُبُهَا لِلَّذِيْنَ يَتَّقُوْنَ سے اَلْمُفْلِحُوْنَ تک۔

چنانچہ اس امت کے لئے اللہ نے یہ بات مخصوص کر دی، حضرت موسیٰ نے دعا کی اے میرے رب مجھے اس امت کا پیغمبر بنا دے اللہ نے فرمایا ان کا نبی انہی میں سے ہوگا۔ حضرت موسیٰ نے عرض کیا تو مجھے اس امت میں سے ہی کر دے اللہ نے فرمایا تم ان کے زمانہ کو نہیں پہنچ سکتے (یعنی وہ امت آخری زمانہ میں آئے گی تم اس وقت تک زندہ نہیں رہو گے) حضرت موسیٰ نے عرض کیا اے میرے رب میں بنی اسرائیل کا وفد لے کر حاضر ہوا تھا اور ان کی نمائندگی کا فائدہ دوسروں کو تو نے عطا کیا (یہ محروم رہ گئے) اس پر اللہ نے نازل فرمایا وَمِنْ قَوْمِ مُوْسٰٓى اُمَّةٌ يَّهْدُوْنَ بِالْحَقِّ وَبِهٖ يَعْدِلُوْنَ حضرت موسیٰ اس پر خوش ہو گئے۔ نوف بکالی کی یہ تشریح اور تفصیل آیت کے صریحی الفاظ اور کلام کی رفتار کے خلاف ہے آیت اَلَّذِيْنَ يَتَّبِعُوْنَ الرَّسُوْلَ النَّبِيَّ الْاُمِّيَّ .... فِي التَّوْرٰىةِ وَالْاِنْجِيْلِ صراحت کے ساتھ بتا رہی ہے کہ یہ آیت صرف مومنین اہل کتاب کے حق میں ہے (ان مومنوں سے اس کا تعلق نہیں جو پہلے مشرک تھے)۔

بغوی نے لکھا ہے کہ حضرت ابن عباسؓ، قتادہ اور ابن جریج نے فرمایا جب آیت وَرَحْمَتِيْ وَسِعَتْ كُلَّ شَيْءٍ نازل ہوئی تو ابلیس کہنے لگا میں بھی كُلَّ شَيْءٍ میں داخل ہوں (میں بھی رحمت سے محروم نہیں رہوں گا) اس پر اللہ نے فرمایا فَسَاَكْتُبُهَا لِلَّذِيْنَ يَتَّقُوْنَ وَيُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ وَالَّذِيْنَ هُمْ بِاٰيٰتِنَا يُؤْمِنُوْنَ یہ آیت سن کر یہودی اور عیسائی بھی آرزومند ہو گئے اور کہنے لگے ہم بھی تقویٰ رکھتے ہیں زکوٰۃ دیتے ہیں اور اللہ پر ہمارا ایمان ہے اس پر اللہ نے رحمت کو صرف اس امت کے لئے محدود کر دیا اور فرمایا اَلَّذِيْنَ يَتَّبِعُوْنَ الرَّسُوْلَ النَّبِيَّ الْاُمِّيَّ الخ

اس قول سے معلوم ہوتا ہے کہ آیت میں خطاب کا رخ رسول اللہ ﷺ کی طرف ہے حالانکہ آیت کا سیاق چاہتا ہے کہ حضرت موسیٰ کی دعا کے جواب میں اللہ نے ان الفاظ سے حضرت موسیٰ کو خطاب فرمایا اور رسول اللہ ﷺ پر اس آیت کا نزول بطور نقل ہو (گویا رسول اللہ ﷺ کو اطلاع دی گئی کہ موسیٰ نے یہ دعا کی تھی اور ہم نے ان کی دعا کا یہ جواب دیا) واللہ اعلم۔

قُلْ يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اِنِّيْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَيْكُمْ جَمِيْعَا الَّذِيْ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۚ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ يُحْيٖ وَيُمِيْتُ

(آپ کہہ دیجئے کہ اے تمام لوگو! میں تم سب کی طرف اس اللہ کا بھیجا ہوا پیغمبر ہوں جس کی بادشاہی تمام آسمانوں اور زمین میں ہے اس کے سوا کوئی عبادت کے لائق نہیں وہی زندگی دیتا ہے اور وہی موت دیتا ہے۔

قُلْ اے محمد آپ کہہ دیجئے اِنِّيْ رَسُوْلُ اللّٰهِ میں اضافت عہد خارجی کی ہے یعنی میں وہ رسول نبی امی ہوں جس کا ذکر اوپر کیا گیا اور جس کے اتباع کا حکم دیا گیا تھا۔ اِلَيْكُمْ یعنی تم سب لوگوں کو خطاب ہے اسی لئے آگے جَمِيْعًا بطور تاکید فرمایا لفظ جَمِيْعًا كُمْ سے حال ہے۔

رسول اللہ ﷺ کی بعثت تمام انسانوں کے لئے بلکہ جنات کے لئے بھی تھی باقی انبیاء کو صرف اپنی اپنی قوم کے لئے پیغمبر بنا کر بھیجا گیا تھا۔ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا مجھے پانچ باتوں کی وجہ سے انبیاء پر برتری عطا فرمائی گئی مجھے جامع الفاظ عطا کئے گئے (یعنی تھوڑے الفاظ میں زیادہ معانی کو ادا کرنے والے مختصر ترین الفاظ بولنے کا ملکہ عطا کیا گیا) میرا رعب ڈال کر میری مدد کی گئی (دشمنوں پر دور دور تک میرا رعب ڈال دیا گیا) میرے لئے مال غنیمت حلال کر دیا گیا میرے لئے تمام زمین کو عبادت گاہ بنا دیا یا پاک کر دیا گیا مجھے سب مخلوق کی ہدایت کے لئے بھیجا گیا، مجھ پر نبوت ختم کر دی گئی۔ رواہ مسلم و الترمذی عن ابی ہریرہ۔

طبرانی نے الکبیر میں صحیح سند سے حضرت سائب بن یزید کی روایت سے متعدد مختلف الفاظ کے ساتھ حدیث نقل کی ہے مجھے پانچ باتوں کی وجہ سے انبیاء پر برتری عطا کی گئی۔ مجھے تمام لوگوں کی طرف بھیجا گیا، میری امت کے لئے میری شفاعت ذخیرہ کی گئی، ایک ماہ (کی راہ) آگے اور ایک ماہ (کی راہ) پیچھے تک رعب ڈال کر میری مدد کی گئی میرے لئے تمام زمین

عبادت گاہ اور طاہر بنا دیا گیا میرے لئے مال غنیمت حلال کر دیا گیا۔ مجھ سے پہلے کسی کے لئے حلال نہیں کیا گیا۔ بیہقی نے صحیح سند سے حضرت ابو امامہؓ کی روایت سے بیان کیا ہے مجھے چار باتوں کی وجہ سے برتری عطا کی گئی اس روایت میں شفاعت کا ذکر نہیں ہے۔

میں کہتا ہوں آیت میں خطاب اگرچہ عام طور پر سب لوگوں کو ہے لیکن بیان کی رفتار بتا رہی ہے کہ عموم کے ذیل میں مدینہ کے یہودی اور بعض عیسائی خصوصیت کے ساتھ مخاطب ہیں انہی کے خلاف بطور دلیل مَكْتُوبًا عِنْدَهُمْ فِي التَّوْرَاةِ وَالْإِنْجِيلِ فرمایا اس کے بعد عناد و خصومت کے زیر اثر ان کا انکار اللہ کے دربار میں بے سود ہو گا (انکار کی کوئی وجہ باقی نہیں)

الَّذِي لَهُ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ یہ اللّٰه کی صفت ہے یعنی میں اس اللہ کا رسول ہوں جس کی حکومت سارے جہان پر ہے۔ یا الَّذِي مبتدا ہے اور لَا إِلٰهَ إِلَّا هُوَ خبر ہے یعنی جس اللہ کی بادشاہت تمام جہان میں ہے اس کے سوا کوئی معبود نہیں۔ اس آخری صورت میں الَّذِي لَهُ الخ پیام رسالت کا بیان ہو گا یعنی مجھے یہ پیام پہنچانے کے لئے بھیجا گیا ہے کہ جو بادشاہ کائنات ہے وہی معبود ہے اس کے سوا کوئی معبود نہیں۔

فَآمِنُوا بِاللّٰهِ وَرَسُولِهِ النَّبِيِّ الْأُمِّيِّ الَّذِي يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَكَلِمٰتِهِ وَاتَّبِعُوهُ لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُونَ ۝

(پس تم اللہ پر ایمان لاؤ اور اللہ کے اس رسول نبی امی پر بھی جو خود اللہ پر اور اس کے احکام پر ایمان رکھتا ہے اور اس رسول کا اتباع کرو تاکہ تم راہ (مقصود) پر آ جاؤ)۔

رَسُولِهِ النَّبِيِّ الْأُمِّيِّ یعنی اس امی پیغمبر ﷺ کا اتباع کرو۔ جس کے اتباع کا پکا وعدہ تم سے گزشتہ کتابوں میں لے لیا گیا ہے۔ وَكَلِمٰتِهِ اور اللہ کے احکام پر۔ یعنی ان کتابوں پر اور وحی پر جن کا نزول اللہ کی طرف سے نبی امی اور دوسرے پیغمبروں پر ہوا ہے۔ لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُونَ یعنی ہدایت یاب ہونے کی امید رکھتے ہوئے۔ ہدایت پانے کی امید کی دونوں باتوں کے مجموعہ کا نتیجہ قرار دیا (ایمان اور اتباع دونوں کے مجموعہ پر امید ہدایت کو مرتب کیا) تاکہ یہ معلوم ہو جائے کہ جو شخص صرف تصدیق تو کرتا ہو رسول اللہ ﷺ پر اس کا ایمان تو ہو مگر شریعت کی پابندی نہ کرتا ہو اور رسول اللہ ﷺ کا پیرو نہ ہو تو وہ (فکر و عقیدہ کے لحاظ سے اگرچہ ہدایت یافتہ ہو جائے گا مگر عمل کے اعتبار سے) برابر گمراہی میں پڑا رہے گا۔

وَمِنْ قَوْمِ مُوسٰى أُمَّةٌ يَهْدُونَ بِالْحَقِّ وَبِهِ يَعْدِلُونَ ۝ وَقَطَّعْنٰهُمُ اثْنَتَيْ عَشْرَةَ أَسْبَاطًا أُمَمًا

(اور قوم موسیٰ میں ایک جماعت ایسی بھی ہے جو دین حق کے موافق ہدایت کرتے ہیں اور اسی کے موافق انصاف بھی کرتے ہیں۔ اور ہم نے بنی اسرائیل کو بارہ خاندانوں میں تقسیم کر کے سب کی الگ الگ جماعت مقرر کر دی)۔

وَمِنْ قَوْمِ مُوسٰى موسیٰ کی قوم میں سے یعنی بنی اسرائیل میں سے۔ أُمَّةٌ یعنی ایک جماعت۔ بِالْحَقِّ (یہ لفظ حال ہے) یعنی اسی حالت میں کہ وہ خود بر حق ہیں اصحاب حق ہیں یا بِالْحَقِّ سے مراد ہے بِكَلِمَةِ الْحَقِّ یعنی وہ لوگوں کو حق بات کی طرف ہدایت کرتے ہیں۔ اسی حق کے سبب جس پر وہ خود قائم ہیں لوگوں کو ہدایت کرتے ہیں۔ وَبِهِ يَعْدِلُونَ یعنی آپس کے معاملات میں بھی حق کے ساتھ ہی انصاف کے فیصلے کرتے ہیں۔

ضحاک، کلبی اور ربیع کا بیان ہے کہ جس جماعت کا اس آیت میں تذکرہ ہے وہ انتہائی مشرق میں چین سے بھی آگے ایک دریا کے کنارے جس کا نام وردانہ ہے رہتی ہے۔ ان میں کوئی شخص بھی ایسا نہیں کہ اس کے پاس مال ہو اور اس کے ساتھی کے پاس نہ ہو وہاں (روز) رات کو بارش ہوتی ہے اور دن کو ابر کھل جاتا ہے وہ لوگ کھیتی کرتے ہیں ہم میں سے کوئی وہاں نہیں پہنچ سکتا۔ وہ سب دین حق پر ہیں۔

روایت میں آیا ہے کہ شب معراج میں حضرت جبرئیل رسول اللہ ﷺ کو لے کر ان کی طرف پہنچے اور ان سے پوچھا کیا تم ان کو پہچانتے ہو جن سے کلام کر رہے ہو، انہوں نے انکار کیا، تو جبرئیل نے کہا یہ محمد نبی امی ﷺ ہیں۔ یہ بات سن کر وہ سب آپ پر ایمان لے آئے اور عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ حضرت موسیٰ نے ہم کو وصیت کی تھی کہ تم میں سے جو کوئی بھی احمد

کو پالے میرا ان سے سلام کہہ دے۔ رسول اللہ ﷺ نے موسیٰؑ کے سلام کا جواب دیا، پھر ان کو دس مکی سورتیں سکھائیں اور نماز پڑھنے اور زکوٰۃ دینے کا حکم دیا اور یہ بھی حکم دیا کہ اپنی جگہ پر ہی قیام پذیر رہیں وہ لوگ سنیچر کے دن عبادت کرتے تھے آپ نے ان کی سنیچر کی جگہ جمعہ کی تعلیم دی۔

بعض علماء کا قول ہے کہ آیت میں وہ یہودی مراد ہیں جو رسول اللہ ﷺ کے زمانہ میں موجود تھے اور مسلمان ہوگئے تھے بغویؒ کے نزدیک اول قول زیادہ صحیح ہے۔ میرے نزدیک اول روایت غریب ہے مکہ میں معراج کے وقت جمعہ کی نماز کا حکم ہوا اتنہ تھا اور نہ کوئی دس مکی سورتیں ایسی ہیں جن میں اسلام کے پورے احکام مذکور ہوں۔ زیادہ ظاہر یہ بات ہے کہ آیت میں مراد وہ مومن ہیں جو حضرت موسیٰؑ کے زمانہ میں حضرت موسیٰؑ پر ایمان لائے اور جو یہودی رسول اللہ ﷺ کے زمانہ میں موجود تھے ان میں سے جو لوگ مسلمان ہوگئے وہ بھی مراد ہیں جیسے عبداللہ بن سلامؓ وغیرہ۔

وَقَطَّعْنٰهُمُ یعنی ہم نے بنی اسرائیل کے فرقے بنا دیئے۔ اِثْنَتَيْ عَشْرَةَ بارہ یعنی ان کی جماعت بارہ حصوں میں بانٹ دیا۔ اَسْبَاطًا بدل ہے تمیز نہیں ہے اولاد (لڑکی ہو یا لڑکا) کی اولاد کو سبط کہتے ہیں۔ حضرت اسرائیل کے بارہ بیٹے ان کی اولاد یہ بارہ اسباط تھے۔ اُمَمًا اسباط کی صفت ہے یا دوسرا بدل۔ زجاج نے کہا آیت کا معنی ہے کہ ہم نے بنی اسرائیل کے بارہ فرقے یعنی جماعتیں بنا دیں۔

وَاَوْحَيْنَآ اِلٰى مُوْسٰٓى اِذِ اسْتَسْقٰىهُ قَوْمُهٗٓ اَنِ اضْرِبْ بِّعَصَاكَ الْحَجَرَ ۚ فَانْۢبَجَسَتْ مِنْهُ اثْنَتَا عَشْرَةَ عَيْنًا ۭ قَدْ عَلِمَ كُلُّ اُنَاسٍ مَّشْرَبَهُمْ ۭ (اور ہم نے موسیٰؑ کو حکم دیا جبکہ ان کی قوم نے ان سے پانی مانگا کہ اپنی اس لاٹھی کو فلاں پتھر پر مارو، پس (مارتے ہی) اس سے بارہ چشمے پھوٹ نکلے۔ ہر ہر شخص (یا ہر جماعت) نے اپنا پانی پینے کا مقام (یعنی گھاٹ) پہچان لیا)۔

اِذِ اسْتَسْقٰىهُ یعنی جب تیہ میں بنی اسرائیل نے موسیٰؑ سے پانی طلب کیا۔ فَانْۢبَجَسَتْ یعنی موسیٰؑ نے جوں ہی لاٹھی ماری فوراً چشمے پھوٹ نکلے۔ لاٹھی مارنے کا لفظ یہ بتانے کے لئے حذف کر دیا کہ حکم کے بعد موسیٰؑ نے فوراً تعمیل کی جس کے ذکر کی ضرورت نہیں اور تعمیل حکم کرتے ہی چشمے بہ نکلے۔ ایک بات یہ بھی معلوم ہوگئی کہ موسیٰؑ کا لاٹھی مارنا بذات خود موثر نہ تھا (اسی لئے اس کو حذف کر دیا) کہ اس پر چشموں کا پھوٹ نکلنا موقوف ہوتا۔ انبجاس کا معنی ہے پھوٹ جانا۔ لیکن ابو عمرو بن علاء نے اِنْۢبَجَسَتْ کا ترجمہ کیا ہے عرقت۔ یعنی پسیج کر اور پھوٹ کر نکلے بارہ چشمے: ہر خاندان کے لئے ایک چشمہ۔ كُلُّ اُنَاسٍ یعنی ہر سبط نے بارہ اسرائیلی قبائل میں سے ہر قبیلہ نے۔

وَظَلَّلْنَا عَلَيْهِمُ الْغَمَامَ وَاَنْزَلْنَا عَلَيْهِمُ الْمَنَّ وَالسَّلْوٰى ۭ كُلُوْا مِنْ طَيِّبٰتِ مَا رَزَقْنٰكُمْ ۭ وَمَا ظَلَمُوْنَا وَلٰكِنْ كَانُوْٓا اَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُوْنَ ۝ وَاِذْ قِيْلَ لَهُمُ اسْكُنُوْا هٰذِهِ الْقَرْيَةَ وَكُلُوْا مِنْهَا حَيْثُ شِئْتُمْ وَقُوْلُوْا حِطَّةٌ وَّادْخُلُوا الْبَابَ سُجَّدًا نَّغْفِرْ لَكُمْ خَطِيْۗـٰٔتِكُمْ ۭ سَنَزِيْدُ الْمُحْسِنِيْنَ ۝

(اور سایہ کر دیا ہم نے ان پر ابر کا اور پہنچایا ان کو ترنجبین اور بٹیریں (اور اجازت دے دی کہ) ہماری عطا کردہ نفیس چیزوں میں سے (جو دل چاہے) کھاؤ اور انہوں نے ہمارا کوئی نقصان نہیں کیا بلکہ اپنا ہی نقصان کرتے تھے اور (وہ زمانہ یاد کرو) جب کہ ان کو حکم دیا گیا تھا کہ تم لوگ اس بستی میں جا کر رہو اور بستی میں سے جہاں چاہو (رغبتکر) کھاؤ اور (داخل کے وقت) زبان سے حِطَّةٌ (توبہ ہے توبہ ہے) کہتے جاؤ اور جھکے جھکے دروازہ میں داخل ہو، ہم تمہاری (پچھلی) خطائیں معاف کر دیں گے اور جو لوگ نیک کام کریں گے ان کو مزید عنایت کریں گے)۔

كُلُوْا یعنی ہم نے کہا کھاؤ۔ سَنَزِيْدُ الْمُحْسِنِيْنَ یعنی مغفرت گناہ کے ساتھ نیکوکاروں سے مزید ثواب دینے کا وعدہ فرمایا۔ بغیر عطف کے اس جملہ کو ذکر کرنے سے اس طرف اشارہ ہے کہ اللہ کی طرف سے یہ ثواب محض مہربانی ہے ان احکام کی تعمیل کے عوض نہیں ہے جو ان کو دیئے گئے تھے۔

کرتے تھے ویسی ہی ہم ان کی جانچ کرتے تھے یا یہ مطلب ہے کہ ان کی نافرمانی کی وجہ سے ہم ان کی جانچ اس سخت امتحان کی صورت میں کرتے تھے۔ روایت میں آیا ہے کہ شیطان نے ان کے دل میں یہ خیال پیدا کر دیا کہ اللہ نے سنیچر کے دن شکار کرنے سے منع نہیں کیا ہے کھانے سے منع کیا ہے اس لئے وہ شکار کرنے لگے یا یہ وسوسہ پیدا کیا کہ مچھلیاں پکڑنے کی ممانعت کی ہے لہٰذا انہوں نے لب ساحل بڑے بڑے حوض کھود لئے جن کے اندر سمندر سے پانی کے ساتھ سنیچر کے دن مچھلیاں آجاتی تھیں اور اتوار کے دن لوگ ان کو پکڑ لیتے تھے ایسی حرکت بہت دنوں تک کرتے رہے پھر سنیچر کے دن بھی شکار کرنے کی جرأت کرنے لگے اور بولے ہمارے خیال میں اب سنیچر کے دن مچھلیاں پکڑنا بھی ہمارے لئے حلال کر دیا گیا ہے۔ چنانچہ اس خیال کے بعد وہ سنیچر کے دن مچھلیاں پکڑنے بھی لگے اور خرید فروخت بھی کرنے لگے اور کھانے بھی لگے۔ ایک تہائی آدمی تو اس نافرمانی میں مبتلا ہو گئے مگر ایک تہائی آدمیوں نے ان کو روکا اور باز داشت کی باقی ایک تہائی نے نہ تو جرم میں شرکت کی نہ ممانعت کی، خاموش رہے۔

وَإِذْ قَالَتْ أُمَّةٌ مِّنْهُمْ لِمَ تَعِظُونَ قَوْمًا ۙ اللَّهُ مُهْلِكُهُمْ أَوْ مُعَذِّبُهُمْ عَذَابًا شَدِيدًا ۖ قَالُوا مَعْذِرَةً إِلَىٰ رَبِّكُمْ وَلَعَلَّهُمْ يَتَّقُونَ ﴿١٦٤﴾ (اور (اس وقت کا حال دریافت کرو) جب کہ ان میں سے ایک جماعت نے (اپنے ساتھیوں سے) کہا تم ایسے لوگوں کو کیوں نصیحت کئے جاتے ہو جن کو اللہ ہلاک کرنے والا ہی ہے یا سخت عذاب دینے والا ہے انہوں نے جواب دیا تمہارے رب کے سامنے عذر پیش کرنے کے لئے اور اس لئے بھی کہ شاید یہ پرہیزگار ہو جائیں)۔

وَإِذْ قَالَتْ أُمَّةٌ یعنی خاموش رہنے والے گروہ نے نصیحت کرنے اور (سنیچر کے دن مچھلیاں پکڑنے سے) روکنے والے گروہ سے کہا۔ اللَّهُ مُهْلِكُهُمْ یعنی جن کو اللہ دنیا میں ہلاک کرنے والا ہے یا آخرت میں سخت سزا دینے والا ہے۔ قَالُوا نصیحت کرنے والوں نے کہا مَعْذِرَةً یعنی اس لئے ہم نصیحت کرتے ہیں کہ ہماری طرف سے باز داشت میں کوتاہی نہ ہونے پائے۔ اور اللہ کے سامنے ہم عذر پیش کر سکیں۔ وَلَعَلَّهُمْ يَتَّقُونَ اور شاید یہ لوگ باز ہی آجائیں (ہم نا امید نہیں ہیں) نا امیدی تو ہلاکت کے بعد ہی ہو گی۔

فَلَمَّا نَسُوا مَا ذُكِّرُوا بِهِ أَنجَيْنَا الَّذِينَ يَنْهَوْنَ عَنِ السُّوءِ وَأَخَذْنَا الَّذِينَ ظَلَمُوا بِعَذَابٍ بَئِيسٍ بِمَا كَانُوا يَفْسُقُونَ ﴿١٦٥﴾ فَلَمَّا عَتَوْا عَن مَّا نُهُوا عَنْهُ قُلْنَا لَهُمْ كُونُوا قِرَدَةً خَاسِئِينَ ﴿١٦٦﴾

(آخر جو بات ان کو سمجھائی جاتی تھی جب وہ اس کے تارک ہی رہے (یعنی نصیحت نہ مانی) تو ہم نے بری بات سے روکنے والوں کو تو بچا لیا اور جو لوگ بے جا حرکت کرتے تھے ان کی نافرمانی کی وجہ سے ہم نے ان کو سخت عذاب میں پکڑ لیا یعنی جب وہ اس کام میں حد سے نکل گئے جس سے ان کو روکا گیا تھا تو ہم نے (بطور قہر) ان کو کہہ دیا کہ تم ذلیل بندر ہو جاؤ (وہ ذلیل بندر ہو گئے)۔

فَلَمَّا نَسُوا پھر جب نافرمان فرقہ نے واعظ و صالح فرقہ کی نصیحت بھول گیا یعنی نصیحت کا تارک رہا۔ سمجھانے پر عمل نہ کیا۔ الَّذِينَ يَنْهَوْنَ عَنِ السُّوءِ تو نصیحت کرنے والے نیکوکار فرقہ کو ہم نے ہلاکت سے بچا لیا۔

وَأَخَذْنَا الَّذِينَ اور نافرمان گروہ کو سخت عذاب میں گرفتار کر لیا۔ بَئِيسٍ بروزن شَدِيدٍ بمعنی شدید بؤس، بأساً شدید ہو گیا (باب نصر)۔

حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا میں سن رہا ہوں کہ اللہ نے أَنجَيْنَا الَّذِينَ يَنْهَوْنَ عَنِ السُّوءِ وَأَخَذْنَا الَّذِينَ ظَلَمُوا بِعَذَابٍ بَئِيسٍ تو فرمادیا (یعنی بری بات سے روکنے والوں کے بچانے کی اور ظالموں کے گرفتار عذاب ہونے کی تو صراحت فرمادی) مگر معلوم نہیں خاموش رہنے والے (نیکوکار) گروہ کا کیا ہوا۔ عکرمہ نے کہا میں نے عرض کیا حضرت پر میری جان قربان کی۔ آپ نے ملاحظہ فرمایا کہ اس خاموش رہنے والے گروہ نے ظالموں کی حرکت سے اپنی نفرت اور بیزاری کا اظہار کر دیا اور ان کے عمل کو برا قرار دیا اور نصیحت کرنے والوں سے کہہ دیا لِمَ تَعِظُونَ قَوْمًا ۙ اللَّهُ مُهْلِكُهُمْ ایسے لوگوں کو

کیوں نصیحت کرتے ہو جن کو اللہ ہلاک کرنے والا ہے۔ ان کے متعلق اللہ نے اگرچہ یہ نہیں فرمایا کہ میں نے ان کو بچا لیا مگر یہ بھی نہیں فرمایا کہ میں نے ان کو ہلاک کر دیا۔ حضرت ابن عباسؓ کو میری یہ بات پسند آئی اور مجھے دو چادریں پہنانے کا حکم دے دیا یعنی پورا خلعت بطور انعام عنایت فرمایا اور فرمایا خاموش رہنے والے گروہ نے (یقیناً) نجات پائی۔ رواہ الحاکم۔

یمان بن رباب نے کہا دونوں گروہوں نے نجات پائی اس گروہ نے بھی جس نے لِمَ تَعِظُونَ قَوْمًا ن اللّٰهُ مُهْلِكُهُمْ کہا تھا اور ان لوگوں نے جنہوں نے مَعْذِرَةً إِلَىٰ رَبِّكُمْ کہا تھا اور مچھلیاں پکڑنے والوں کو اللہ نے غارت کر دیا۔ یہ قول حسن اور مجاہد کا ہے۔ ابن زید نے کہا صرف روکنے اور باز داشت کرنے والے گروہ نے نجات پائی باقی دونوں گروہ ہلاک ہو گئے۔ نہی عن المنکر کو ترک کرنے کے سلسلہ میں یہ سخت ترین آیت ہے۔ فَلَمَّا عَتَوْا یعنی گناہگار مجرم گروہ ممنوع کے ترک کی حد سے بڑھ گیا۔ عَنْ مَّا نُهُوْا میں مضاف محذوف ہے۔ یعنی عَنْ تَرْكِ مَا نُهُوْا۔

خٰسِئِیْنَ دور (یعنی پھٹکارے ہوئے ذلیل) یہ امر (ایجاب عمل کے لئے نہیں ہے کیونکہ عمل کرنا اور بندر بن جانا ان کے اختیار میں نہ تھا بلکہ) تکوین اور تسخیر کے لئے ہے (یعنی تم کو ہو جانا پڑے گا بندر ذلیل) ظاہر کلام بتا رہا ہے کہ اللہ نے پہلے ان کو کوئی سخت سزا دی لیکن اس پر بھی انہوں نے سرکشی جاری رکھی اور باز نہ آئے تو اللہ نے ان کی صورتیں مسخ کر دیں یہ بھی جائز ہے کہ آیت فَلَمَّا عَتَوْا آیت فَلَمَّا نَسُوْا کی تاکید اور تفصیل ہو (ہم نے ترجمہ اسی شق کے مطابق کیا ہے)۔

بعض اہل تفسیر کا قول ہے کہ وَاِذْ قَالَتْ اُمَّةٌ سے مراد یہ ہے کہ نیکوکار فرقہ میں سے بعض نے بعض سے کہا تم کیوں ان کو نصیحت کرتے ہو یعنی بطور افسوس انہوں نے وعظ کے بے سود ہونے کا اظہار کیا اور آپس میں ہی انہوں نے جواب دیا اور کہا مَعْذِرَةً إِلَىٰ رَبِّكُمْ۔

یا یوں کہو کہ (وعظ کرتے کرتے) جو لوگ نصیحت کرنے سے رک گئے تھے انہوں نے ان لوگوں سے جو نصیحت کرنے سے نہیں رکے تھے (برابر وعظ کئے جا رہے تھے) کہا لِمَ تَعِظُوْنَ قَوْمَاۨ اللّٰهُ مُهْلِكُهُمْ۔ بعض اہل علم کے نزدیک یہ مطلب ہے کہ بطور استہزاء اور تمسخر جاتے ہوئے خطاکار لوگوں نے نصیحت کرنے والے گروہ سے کہا کہ جب تمہارے خیال میں اللہ ہم کو ہلاک کرنے والا ہی ہے تو پھر ایسے لوگوں کو تم نصیحت کیوں کرتے ہو۔ اس کے جواب میں نیک گروہ نے کہا مَعْذِرَةً إِلَىٰ رَبِّكُمْ مگر لَعَلَّهُمْ يَتَّقُوْنَ میں غائب کی ضمیر اس مطلب کو غلط قرار دے رہی ہے اگر یہی مطلب تھا تو لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ مخاطب کی ضمیر کے ساتھ کہنا چاہئے تھا (ممکن ہے کہ گناہگار گروہ نے جب اپنے کو بصیغۂ غائب ذکر کیا اور قَوْمَاۨ اللّٰهُ مُهْلِكُهُمْ کہا تو نصیحت کرنے والوں نے بھی اسی رعایت سے مخاطب کو بصیغہ غائب ذکر کر دیا۔ مترجم)۔

روایت میں آیا ہے کہ جب واعظ ناامید ہو گئے تو خطاکاروں کے ساتھ رہنا بھی ان کو گوارا نہ ہوا اور انہوں نے بستی کو تقسیم کر لیا مسلمانوں کی آبادی کا دروازہ الگ ہو گیا اور مجرموں کی آبادی کا دروازہ الگ ہو گیا اور دونوں آبادیوں میں دیوار حائل ہو گئی اور حضرت داؤد نے مجرموں کے لئے بددعا کی ایک روز صبح کو جب نیکوکار گروہ تھا اور بدکاروں میں سے کوئی گھر سے نہیں نکلا تو انہوں نے کہا آج ضرور ان پر کوئی افتاد ہوئی ہے۔ چنانچہ گھروں کے اندر جا کر دیکھا تو سب بندر نظر آئے یہ لوگ اپنے قرابتداروں کو نہ پہچان سکے مگر بندروں نے ان کو پہچان لیا اور پاس آ کر ان کے کپڑے سونگھنے لگے روتے تھے اور ان کے آس پاس لوٹتے پھرتے تھے۔ نیک گروہ والے ان سے کہنے لگے کیا ہم تم کو منع نہیں کرتے تھے بندر جواب میں اپنا سر ہلا دیتے تھے۔ تین روز تک اسی حال میں رہے لوگ ان کو دیکھتے تھے اور تین روز کے بعد سب مر گئے۔

وَاِذْ تَاَذَّنَ رَبُّكَ لَيَبْعَثَنَّ عَلَيْهِمْ اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ مَنْ يَّسُوْمُهُمْ سُوْٓءَ الْعَذَابِ ؕ اِنَّ رَبَّكَ لَسَرِيْعُ الْعِقَابِ ۖۚ وَاِنَّهٗ لَغَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝ (اور وہ وقت یاد کرنا چاہئے جب آپ کے رب نے بتا دیا تھا کہ وہ ان (یہودیوں) پر روز قیامت کے قریب تک ایسے لوگوں کو ضرور مسلط کرتا رہے گا جو ان کو سخت دکھ پہنچائیں گے بلاشبہ آپ کا رب وقتی جلد سزا دینے والا ہے اور بلاشبہ وہ واقعی غفور رحیم ہے)۔ تَاَذَّنَ تَاَذَّنَ ماضی باب تفعل، اِذْنٌ سے مشتق ہے یعنی

کا معنی ہے اہل اردو کیونکہ کسی کام کا عزم کرنے والا اپنے نفس کو اس کام کی محکم اطلاع دے دیتا ہے یقین کر دیتا ہے اسی لئے بعض قسم عَلِمَ اللّٰهُ، شَهِدَ اللّٰهُ وغیرہ کے قائم مقام اس کا استعمال کیا جاتا ہے اور جواب قسم کی طرح اس کا جواب ذکر کیا جاتا ہے۔ حضرت ابن عباسؓ نے تَاَذَّنَ کا ترجمہ قَالَ (فرمایا) کیا ہے اور مجاہد نے اَمَرَ (امر کیا) اور عطاء نے حَکَمَ (حکم دیا) لَيَبْعَثَنَّ آخری تینوں اقوال پر جواب قسم محذوف ہوگا یعنی خدا کی قسم اللہ روز قیامت تک یہودیوں پر مسلط کرتا رہے گا۔ مَنْ يَّسُوْمُهُمْ سُوْٓءَ الْعَذَابِ سوء عذاب سے مراد ہے قتل کرنا قید کرنا جزیہ لینا چنانچہ اول اللہ نے حضرت سلیمانؑ کو یہودیوں پر مسلط کیا، پھر بخت نصر کو، بخت نصر نے ان کی بستیوں کی اینٹ سے اینٹ بجادی، جوانوں کو قتل کیا، عورتوں اور بچوں کو باندی غلام بنایا جو باقی رہے تھے ان پر ٹیکس مقرر کیا اور رسول اللہ ﷺ کی بعثت تک مجوسیوں کو وہ ٹیکس دیتے رہے۔ رسول اللہ ﷺ نے بنی قریظہ کو قتل کرایا ان کی عورتوں اور بچوں کو گرفتار کیا اور بنی نضیر و قینقاع کو مدینہ سے نکال دیا۔ پھر حضرت عمرؓ نے خیبر اور فدک سے بھی ان کو نکال باہر کر دیا اور اللہ نے قیامت تک کے لئے حکم دے دیا کہ یہودیوں سے اس وقت تک جنگ جاری رکھی جائے جب تک ذلت کے ساتھ یہ جزیہ ادا نہ کریں۔

لَسَرِيْعُ الْعِقَابِ یعنی نافرمانوں کو جلد سزا دینے والا ہے اسی لئے دنیا میں ہی اس نے سزا دے دی وَاِنَّهٗ لَغَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ لیکن ان میں سے جو شخص توبہ کرلے اور ایمان لے آئے اس کو اللہ معاف کرنے والا مہربان بھی ہے۔

وَقَطَّعْنٰهُمْ فِى الْاَرْضِ اُمَمًا ۚ مِنْهُمُ الصّٰلِحُوْنَ وَمِنْهُمْ دُوْنَ ذٰلِكَ ۖ وَبَلَوْنٰهُمْ بِالْحَسَنٰتِ وَالسَّيِّاٰتِ لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُوْنَ ﴿۱۶۸﴾ (اور ہم نے دنیا میں ان کی متفرق جماعتیں کردیں، بعض ان میں نیک تھے اور بعض ان میں اور طرح کے بھی تھے اور ہم ان کو خوش حالیوں (صحت، دولت حکومت) اور بدحالیوں (بیماری، مفلسی، محکومی) سے آزماتے رہے کہ شاید باز آجائیں۔

وَقَطَّعْنٰهُمْ یعنی ہم نے ان کو ٹکڑے ٹکڑے کر کے فرقے فرقے بنادیئے، اس سے ان کی طاقت ایسی منتشر ہوگئی کہ آئندہ کبھی باہم اتفاق نہ ہوگا اور نہ اجتماعی قوت حاصل ہوگی۔ مِنْهُمُ الصّٰلِحُوْنَ ان میں سے کچھ صالح ہیں۔ حضرت ابن عباسؓ اور مجاہدؒ نے فرمایا الصّٰلِحُوْنَ سے مراد ہیں وہ یہودی جو مسلمان ہوگئے۔

میں کہتا ہوں کہ ظاہر کلام کا تقاضا ہے کہ وہ لوگ مراد ہوں کہ شریعت موسوی کے منسوخ ہونے سے پہلے حضرت موسیٰؑ کی شریعت پر تھے کیونکہ آگے فَخَلَفَ مِنْۢ بَعْدِهِمْ خَلْفٌ آیا ہے یہ قرینہ ہے اس بات کا کہ الصّٰلِحُوْنَ سے مراد وہ یہودی ہیں جو (حضرت عیسیٰؑ سے پہلے) حضرت موسیٰؑ کے سچے دین پر تھے۔

وَمِنْهُمْ دُوْنَ ذٰلِكَ اور کچھ لوگ ان سے گرے ہوئے تھے یعنی درجہ صلاح پر فائز نہ تھے یہ لوگ (حضرت ابن عباسؓ کے قول پر) وہ یہودی ہیں جو رسول اللہ ﷺ پر ایمان نہیں لائے یا (ظاہر کلام کے اعتبار سے) وہ یہودی ہیں جو شریعت موسوی کے منسوخ ہونے سے پہلے اس کو مانتے تھے مگر بد اعمال تھے یا وہ لوگ مراد ہیں جنہوں نے حضرت داؤدؑ، حضرت سلیمانؑ اور حضرت عیسیٰؑ کی نبوت کا انکار کیا۔

وَبَلَوْنٰهُمْ اور ہم نے ان کو جانچا بِالْحَسَنٰتِ نعمتیں دے کر وَالسَّيِّاٰتِ اور تکلیفیں دے کر لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُوْنَ تاکہ وہ متنبہ ہو کر کفر و بدکاری سے لوٹ جائیں، نعمت کے وقت اللہ کا شکر ادا کریں اور تکلیف کے وقت توبہ کریں۔

فَخَلَفَ مِنْۢ بَعْدِهِمْ خَلْفٌ وَّرِثُوا الْكِتٰبَ يَاْخُذُوْنَ عَرَضَ هٰذَا الْاَدْنٰى وَيَقُوْلُوْنَ سَيُغْفَرُ لَنَا ۚ وَاِنْ يَّاْتِهِمْ عَرَضٌ مِّثْلُهٗ يَاْخُذُوْهُ ۭ اَلَمْ يُؤْخَذْ عَلَيْهِمْ مِّيْثَاقُ الْكِتٰبِ اَنْ لَّا يَقُوْلُوْا عَلَى اللّٰهِ اِلَّا الْحَقَّ وَدَرَسُوْا مَا فِيْهِ ۭ وَالدَّارُ الْاٰخِرَةُ خَيْرٌ لِّلَّذِيْنَ يَتَّقُوْنَ ۭ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ﴿۱۶۹﴾

(پھر ان کے بعد ان کے جانشین ایسے لوگ ہوئے جنہوں نے ان سے کتاب توریت کو حاصل کیا یہ لوگ دنیا دنی کے حقیر متاع کو علم کتاب کے عوض لے لیتے ہیں اور (اس گناہ کو حقیر سمجھ کر) کہتے ہیں کہ ہماری ضرور مغفرت ہو جائے گی حالانکہ اگر

ان کے پاس دنیا کا مال و متاع پھر آ جائے تو اس کو بھی لے لیتے ہیں کیا ان سے توریت کے اس مضمون کا عہد نہیں لیا گیا تھا کہ خدا کی طرف بجز سچی بات کے اور کسی بات کی نسبت نہ کریں (یعنی خود تراشیدہ بات کی نسبت اللہ کی طرف نہ کریں بلکہ جو اللہ کا حکم ہے اسی کی نسبت اللہ کی طرف کریں) اور کتاب میں جو کچھ تھا اس کو انہوں نے پڑھ بھی لیا۔ اور آخرت والا گھر (اس دنیا سے) ان لوگوں کے لئے بہتر ہے جو (نافرمانی سے) بچتے ہیں، پھر اے یہودیو تم یہ بات کیوں نہیں سمجھتے۔

مِنۢ بَعۡدِهِمۡ یعنی جن لوگوں کا ذکر پہلے کر دیا گیا ان کے بعد جانشین ہوئے۔ خَلۡفٌ خلف ایک دور کے بعد دوسرا آنے والا دور، کذا فی القاموس۔ ابو حاتم نے کہا خَلۡفٌ بسکون لام اولاد، اس میں واحد و جمع برابر ہیں اور خَلَف کے معنی ہیں قائم مقام خواہ اولاد ہو یا غیر۔ ابن اعرابی کا قول ہے خَلَفٌ بفتح لام اچھا جانشین اور بسکون لام برا جانشین۔ نضر بن شمیل کا قول ہے کہ برے جانشین کے لئے خَلَف بفتح لام بھی آتا ہے اور بسکون لام بھی اور اچھے جانشین کے لئے صرف لام کے فتح کے ساتھ آتا ہے۔ محمد بن جریر کا قول ہے کہ مدح کے لئے اکثر بفتح لام آتا ہے اور ذم کے لئے بسکون لام لیکن کبھی قلت کے ساتھ اس کے برعکس بھی استعمال ہوا ہے۔ بیضاوی نے لکھا خَلۡف مصدر ہے اور صفت (اسم فاعل یا اسم مفعول) کے معنی میں مستعمل ہے مصدر ہونے کی وجہ سے ہی اس کا اطلاق واحد پر بھی ہوتا ہے اور جمع پر بھی۔ بعض اہل علم اس کو جمع کہتے ہیں۔ یہاں خلف سے وہ یہودی مراد ہیں جو رسول اللہ ﷺ کے زمانہ میں موجود تھے۔ وَرِثُوا الۡكِتٰبَ یعنی باپ دادا سے توریت ان کو ملی، اسلاف سے منتقل ہو کر ان کے پاس پہنچی جس کو وہ خود پڑھتے اور اس کا مطلب سمجھتے ہیں۔ عَرَضَ هٰذَا الۡاَدۡنٰى یعنی اس ادنیٰ عالم کا حقیر سامان۔ عالم ادنیٰ سے مراد ہے دنیا۔ لفظ اَدۡنٰى، دنو قرب سے مشتق ہے یا دنائت (حقارت) سے۔

ہر سامان کو سوائے سونے چاندی (یعنی روپیہ پیسہ، کرنسی، سکہ) کے متاع کہا جاتا ہے یا ہر مال کو متاع کہتے ہیں خواہ کم ہو یا زیادہ، سامان ہو یا روپیہ، کرنسی۔ اس جگہ یہی معنی مراد ہے۔ بعض علماء کا قول ہے عرض کا معنی ہے ناپائیدار۔ باقی نہ رہنے کی چیز جس چیز کا بذات خود (بغیر کسی جوہر کے) قیام نہ ہو۔ متکلمین کے نزدیک اس کو عرض اسی لغوی مناسبت کی وجہ سے کہا جاتا ہے جیسے رنگ کسی طرح کا ہو، بو اچھی ہو یا بری وغیرہ اسی لئے دنیا کو عرض حاضر کہا جاتا ہے یعنی ناپائیدار۔ یہاں عرض سے مراد ہے وہ رشوت جو یہودی عالم جاہل لوگوں سے لے کر کھاتے اور شرعی فیصلہ کو توڑنے موڑنے کی رشوتیں لیا کرتے تھے۔ رسول اللہ ﷺ کے وہ اوصاف امتیازی جو توریت میں مذکور تھے یہودی عالموں نے اسی ڈر سے چھپا دیئے تھے اور اللہ کے کلام میں (لفظی اور معنوی) تحریف اسی خوف سے کر دی تھی کہ کہیں ان کی آمدنی میں فرق نہ آ جائے اور سیادت قومی نہ چلی جائے۔

وَيَقُوۡلُوۡنَ سَيُغۡفَرُ لَنَا یعنی توبہ نہیں کرتے گناہ کرتے رہتے ہیں اور اس کے باوجود مغفرت کا یقین رکھتے ہیں۔ اور یہ بہت بری حرکت ہے۔ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے کہ دانشمند وہ ہے جس نے اپنے نفس کو مطیع کیا اور مرنے کے بعد کے لئے کام کئے اور بیوقوف وہ ہے جس نے نفس کی خواہشات کی اطاعت کی اور اللہ سے (بے بنیاد جھوٹی) تمنائیں رکھیں۔ رواہ احمد و الترمذی و ابن ماجہ والحاکم والبغوی عن شداد بن اوس۔

وَاِنۡ يَّاۡتِهِمۡ عَرَضٌ مِّثۡلُهٗ يَقُوۡلُوۡنَ کی ضمیر سے حال ہے۔ مطلب یہ ہے کہ وہ گناہ پر اصرار کرتے ہوئے اور دوسری مرتبہ گناہ کا ارادہ رکھتے ہوئے بغیر توبہ کئے مغفرت کے آرزومند ہوتے ہیں۔ سدی کا بیان ہے کہ بنی اسرائیل میں جب کوئی قاضی ہوتا تھا اور لوگ معاملہ اس سے کسی مقدمہ کا فیصلہ طلب کرتے تھے تو وہ بغیر رشوت لئے فیصلہ نہیں دیتا تھا، جب اس سے رشوت لینے کی وجہ دریافت کی جاتی تو کہتا یہ (حقیر بات ہے) اس کو اللہ معاف کر دے گا فریق مخالف اس پر نکتہ چینی کرتا تھا پھر جب وہ قاضی مر جاتا یا معزول کر دیا جاتا تھا اور نکتہ چینی کرنے والی جماعت میں سے کوئی فرد قاضی بنا دیا جاتا تھا تو وہ بھی رشوت لیتا تھا آیت وَاِنۡ يَّاۡتِهِمۡ عَرَضٌ مِّثۡلُهٗ يَاۡخُذُوۡهُ کا یہی مطلب ہے یعنی نکتہ چیں فریق مخالف کو اگر رشوت کا مال ہاتھ لگ جاتا تھا تو وہ بھی نہیں چھوڑتے تھے۔

مِّيۡثَاقُ الۡكِتٰبِ یعنی وہ عہد جو توریت میں مذکور ہے کہ اللہ کی طرف کسی غلط بات کی نسبت نہیں کریں گے اور یہ بات

غلط ہے توریت میں یہ نہیں بیان کیا گیا کہ گناہ پر جمارہنے کے باوجود مغفرت کر دی جائے گی۔

وَدَرَسُوا مَا فِيهِ اس کا عطف اَلَمْ يُؤْخَذْ پر ہے یاوَرِثُوا پر۔ درس کتاب سے مراد ہے پڑھنا اور بار بار غور کرنا۔ مطلب یہ ہے کہ جو کچھ وہ کرتے ہیں اس کو جانتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ یہ گناہ ہے۔ يَتَّقُونَ یعنی جو لوگ اللہ سے ڈرتے اور رسول اللہ ﷺ پر ایمان رکھتے ہیں، ان کے لئے آخرت دنیا کے اس حقیر مال سے بہتر ہے۔ اَفَلَا تَعْقِلُونَ اس جملہ کا عطف محذوف جملہ پر ہے اصل کلام اس طرح تھا کیا تم برائی کو پسند کرتے ہو اور بھلائی کو چھوڑتے ہو اور سمجھتے نہیں (کہ شر کو اختیار کرنا اور خیر کو ترک کرنا برا ہے) یعنی تمہارے پاس عقل ہی نہیں ہے (ہم نے "سمجھتے نہیں" کے بعد قوسین کے درمیان کچھ عبارت بڑھادی ہے جو سمجھتے نہیں کا مفعول ہے، لیکن حضرت مؤلف نے جو یعنی کے بعد "تمہارے پاس عقل ہی نہیں ہے" عبارت لکھی ہے اس سے اشارہ اس طرف ہے کہ اَفَلَا تَعْقِلُونَ کا کوئی خاص مفعول محذوف نہیں ہے بلکہ مراد یہ ہے کہ تم اہل عقل ہی نہیں ہو) کیونکہ عقل کا تقاضا تو یہ ہے شر کو ترک اور خیر کو اختیار کیا جائے بلکہ دو خیروں میں بھی جو بہترین ہو اس کو لیا جائے اور تم ادنیٰ کو اعلیٰ کے مقابلہ میں لیتے ہو۔ وہ زوال پذیر فائدہ جس کا نتیجہ دوامی عذاب ہے اختیار کرتے ہو اور لازوال ابدی نعمت کو ترک کرتے ہو۔

وَالَّذِينَ يُمَسِّكُونَ بِالْكِتٰبِ وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ ۭ اِنَّا لَا نُضِيعُ اَجْرَ الْمُصْلِحِينَ (اور (ان میں سے) جو لوگ کتاب کے پابند ہیں اور نماز کی پابندی کرتے ہیں ہم ان اہل اصلاح کا ثواب ضائع نہیں کریں گے)

مجاہد نے کہا ان سے مراد حضرت عبداللہ بن سلام اور ان کے ساتھی دوسرے مؤمنین اہل کتاب ہیں جو توریت پر بھی ایمان لائے تھے اور توریت میں انہوں نے کسی طرح کی تحریف نہیں کی تھی اور نہ اس کے احکام کو بگاڑ کر کمائی کا ذریعہ بنایا تھا بلکہ خالص حکم توریت پر عمل کرتے تھے، پھر حضور اقدس ﷺ کی بعثت ہوئی تو آپ پر بھی ایمان لائے اور آپ کا اتباع کیا۔ عطاء نے کہا ان سے مراد امت محمدیہ ہے۔

اِنَّا لَا نُضِيعُ یعنی ان میں سے اہل اصلاح کا ثواب ہم ضائع نہیں کریں گے۔ یا یوں کہا جائے کہ اِنَّا لَا نُضِيعُ اَجْرَهُمْ کی جگہ اَجْرَ الْمُصْلِحِينَ اس بات پر تنبیہ کرنے کے لئے کہا کہ ان کا مصلح ہونا اجر کو ضائع کرنے سے مانع ہے (گویا لفظ مصلحین علت حکم کی طرف اشارہ کر رہا ہے)۔

وَاِذْ نَتَقْنَا الْجَبَلَ فَوْقَهُمْ كَاَنَّهٗ ظُلَّةٌ وَّظَنُّوْٓا اَنَّهٗ وَاقِعٌۢ بِهِمْ ۚ خُذُوْا مَآ اٰتَيْنٰكُمْ بِقُوَّةٍ وَّاذْكُرُوْا مَا فِيْهِ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ (اور وہ وقت بھی قابل ذکر ہے جب ہم نے پہاڑ کو اٹھا کر چھت کی طرح ان کے اوپر معلق کر دیا تھا اور ان کو یقین ہو گیا تھا کہ اب وہ ان پر گرنے ہی والا ہے اور (ان سے کہہ دیا تھا کہ) مضبوطی کے ساتھ جلد قبول کر و اس کتاب کو جو ہم نے تم کو دی ہے اور جو احکام اس میں ہیں ان کو یاد رکھو اس امید پر کہ تم متقی ہو جاؤ گے (گناہوں سے اور عذاب سے بچ جاؤ گے۔

وَاِذْ نَتَقْنَا اذکروا محذوف ہے اذ کا اسی محذوف سے تعلق ہے۔ نتق کا لغوی معنی ہے کھینچنا یہاں مراد ہے اکھاڑ کر اوپر کو اٹھانا۔ فَوْقَهُمْ بنی اسرائیل کے اوپر۔ بنی اسرائیل نے توریت کے احکام کو شدت سختی کی وجہ سے قبول کرنے سے انکار کر دیا تھا تو اللہ نے پہاڑ کو زمین سے اکھاڑ کر ان کے سروں کے اوپر معلق کر دیا (تاکہ ڈر کر) قبول کر لیں۔ كَاَنَّهٗ ظُلَّةٌ ظلہ چھت، سائبان۔ ظَنُّوْٓا یعنی ان کو یقین ہو گیا تھا۔ یقین کو لفظ ظن سے تعبیر کیا کیونکہ اس یقین کا نتیجہ واقع نہ ہوا تھا (تو گویا یقین صرف گمان ہو کر رہ گیا) خُذُوْا اور ان سے کہہ دیا گیا کہ توریت کے احکام کو قبول کرو ورنہ پہاڑ تمہارے اوپر گرا دیا جائے گا۔ بِقُوَّةٍ کوشش کے ساتھ اور احکام توریت کو برداشت کرنے کے پختہ ارادے کے ساتھ۔ یہ خُذُوْا کی ضمیر سے حال ہے۔ وَاذْكُرُوْا اور یاد رکھو یعنی ان پر عمل کرو اور بھولی بسری چیز کی طرح ترک نہ کرو۔ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ اس امید پر کہ برے اعمال بد عادات اور گناہوں سے تم بچ جاؤ گے۔

وَاِذْ اَخَذَ رَبُّكَ مِنْۢ بَنِيْٓ اٰدَمَ مِنْ ظُهُوْرِهِمْ ذُرِّيَّتَهُمْ وَاَشْهَدَهُمْ عَلٰٓي اَنْفُسِهِمْ ۚ اَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ ۭ

قَالُوا بَلٰى شَهِدْنَا أَنْ تَقُولُوا يَوْمَ الْقِيَامَةِ إِنَّا كُنَّا عَنْ هٰذَا غَافِلِينَ ۝ أَوْ تَقُولُوا إِنَّمَا أَشْرَكَ آبَاؤُنَا مِنْ قَبْلُ وَكُنَّا ذُرِّيَّةً مِنْ بَعْدِهِمْ أَفَتُهْلِكُنَا بِمَا فَعَلَ الْمُبْطِلُونَ ۝

اور جب آپ کے رب نے (آدم اور) اولاد آدم کی پشت سے ان کی نسل کو نکالا اور ان سے انہی کے متعلق اقرار لیا کہ کیا میں تمہارا رب نہیں ہوں سب نے جواب دیا کیوں نہیں ہم سب (اس واقعہ کے) گواہ بنتے ہیں (یہ اس لئے کیا) تاکہ تم لوگ قیامت کے دن یوں یا نہ کہنے لگو کہ ہم تو اس توحید سے بے خبر تھے یا یوں کہنے لگو کہ اصل شرک تو ہمارے بڑوں نے کیا تھا اور ہم تو ان کے بعد ان کی نسل میں ہوئے تو کیا ان غلط راہ نکالنے والوں کے فعل پر تو ہم کو ہلاکت میں ڈالے دیتا ہے۔

مِنْ بَنِيْ اٰدَمَ کلام میں اختصار ہے اصل کلام یوں تھا مِنْ اٰدَمَ وَ بَنِيْ اٰدَمَ آدم اور اولاد آدم سے مِنْ ظُهُوْرِهِمْ بھی آدم سے بدل ہے یعنی ہم نے آدم کی پشت سے ان کی اولاد کو نکالا۔ وَاَشْهَدَهُمْ یعنی بعض کو بعض کا شاہد بنا کر ایک دوسرے کو گواہ بنا دیا اور کہا۔ کیا اَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ۔ قَالُوْا بَلٰى۔

حضرت ابو ہریرہؓ راوی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ اللہ نے آدم کو پیدا کرنے کے بعد ان کی پشت پر ہاتھ پھیرا تو جو انسان ان کی نسل سے قیامت تک پیدا ہونے والا تھا وہ برآمد ہو گیا اور اللہ نے ہر انسان کی دونوں آنکھوں کے درمیان نور کی ایک چمک پیدا کر دی، پھر سب کو آدمؑ کے روبرو کیا۔ آدمؑ نے عرض کیا اے میرے رب یہ کون ہیں، اللہ نے فرمایا یہ تیری اولاد ہیں۔ آدم نے ان میں سے ایک شخص کی دونوں آنکھوں کے درمیان چمک دیکھی تو ان کو بہت اچھی معلوم ہوئی اور عرض کیا پروردگار یہ کون ہے، اللہ نے فرمایا یہ داؤد ہے، آدم نے عرض کیا پروردگار تو نے اس کی عمر کتنی مقرر کی ہے، اللہ نے فرمایا ساٹھ سال، عرض کیا پروردگار میری عمر میں سے اس کو چالیس برس اور عطا فرما دے، چنانچہ حضرت آدمؑ کی عمر جب پوری ہو گئی صرف چالیس برس رہ گئے جو انہوں نے حضرت داؤد کو دے دیئے تھے تو موت کا فرشتہ آ گیا، آدمؑ نے کہا ابھی تو میری عمر کے چالیس برس باقی ہیں۔ ملک الموت نے کہا کیا آپ نے اپنے بیٹے داؤد کو چالیس برس نہیں دے دیئے تھے، آدمؑ نے انکار کیا اسی لئے ان کی اولاد بھی (کئے ہوئے وعدہ کا) انکار کرتی ہے اور آدمؑ نے اللہ کے حکم کو بھول کر ممنوعہ درخت کا پھل کھا لیا تھا اسی لئے ان کی اولاد بھولتی ہے اور آدمؑ نے خطا کی تھی اسی لئے ان کی اولاد خطا کرتی ہے۔

ترمذی نے اس حدیث کو حضرت ابو الدرداءؓ کی روایت سے اس طرح نقل کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اللہ نے آدم کو جس وقت پیدا کیا تو ان کے داہنے شانہ پر ہاتھ مارا اس سے چھوٹی چیونٹیوں کی طرح ان کی ساری گوری نسل نکل پڑی اور بائیں شانہ پر ہاتھ مارا تو کوئلہ کی طرح سیاہ نسل نکل پڑی۔ داہنی طرف والوں کے متعلق اللہ نے فرمایا یہ جنت کی طرف (جانے والے) ہیں اور مجھے (ان کی طاعت کی) پروا نہیں اور بائیں شانہ والوں کے متعلق فرمایا یہ دوزخ کی طرف (جانے والے) ہیں اور مجھے (ان کی نافرمانی کی) پروا نہیں۔ دونوں روایتیں۔ مقاتل اور دوسرے اہل تفسیر نے بھی اسی طرح ذکر کیا ہے۔ مقاتل کی روایت کے آخر میں اتنا زائد بھی ہے کہ اللہ نے پھر سب کو آدم کی پشت میں لوٹا دیا جب تک تمام میثاق ازل والے باپوں کی پشت اور ماؤں کے پیٹ سے برآمد نہ ہو جائیں گے قبروں والے قبروں کے اندر رہیں گے (قیامت نہ آئے گی اور حشر نہ ہوگا) اسی میثاق ازل کو توڑنے والوں کے متعلق اللہ نے فرمایا ہے وَمَا وَجَدْنَا لِأَكْثَرِهِمْ مِنْ عَهْدٍ۔

مسلم بن یسار کی روایت ہے کہ حضرت عمر بن خطابؓ سے آیت وَاِذْ اَخَذَ رَبُّكَ مِنْ بَنِيْ اٰدَمَ الخ کے متعلق دریافت کیا گیا۔ فرمایا میں نے خود سنا جب رسول اللہ ﷺ سے اس کا مفہوم دریافت کیا گیا تو حضور ﷺ نے فرمایا اللہ نے آدم کو پیدا کرنے کے بعد دایاں ہاتھ ان کی پشت پر پھیرا تو ان سے ان کی کچھ اولاد نکل پڑی اور اللہ نے فرمایا ان کو میں نے جنت کے لئے پیدا کیا ہے اور یہ اہل جنت کے عمل کریں گے۔ پھر آدم کی پشت پر بایاں ہاتھ پھیرا تو کچھ اور ان کی اولاد برآمد ہو گئی اور اللہ نے فرمایا ان کو میں نے دوزخ کے لئے پیدا کیا ہے اور یہ دوزخیوں کے عمل کریں گے۔ ایک شخص نے عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ پھر عمل کی کیا ضرورت ہے، فرمایا اللہ نے جس بندہ کو جنت کے لئے پیدا کیا ہے اس سے جنتیوں کے اعمال کراتا ہے یہاں تک کہ وہ

مرنے کے وقت بھی اہل جنت کا کوئی عمل کرتا ہے جس کی وجہ سے اس کو جنت میں داخل کر دیتا ہے اور جب کسی بندہ کو دوزخ کے لئے پیدا کرتا ہے تو اس سے دوزخیوں کے کام کراتا ہے یہاں تک کہ وہ مرنے کے وقت بھی دوزخیوں کا کوئی کام کرتا ہے جس کی وجہ سے اس کو دوزخ میں لے جاتا ہے۔ رواہ مالک و ابو داؤد والترمذی و احمد فی مسندہ والبخاری فی التاریخ و ابن حبان والحاکم والبیہقی۔ ترمذی نے اس حدیث کو حسن کہا ہے۔ چونکہ مسلم بن یسار کے درمیان ایک اور راوی کا ذکر کیا ہے جس کا نام نہیں بیان کیا۔

حضرت ابن عباسؓ راوی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اللہ نے آدمؑ کی پشت سے اولاد کو نکال کر ان سے میثاق نعمان یعنی عرفات میں لیا تھا جتنی نسل اس کو آئندہ پیدا کرنی تھی سب کو آدم کی پشت سے برآمد کیا اور اپنے سامنے چھوٹی چیونٹیوں کی طرح ان کو بکھیر کر روبرو ان سے فرمایا کہ میں تمہارا رب نہیں ہوں سب نے جواب دیا کیوں نہیں ہم اس کے شاہد ہیں الیٰ آخر الآیۃ۔ رواہ احمد والنسائی والحاکم۔ حاکم نے اس کو صحیح کہا ہے۔ ابن جریر نے ضعیف سند کے ساتھ حضرت ابن عمرؓ کی روایت سے بیان کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے اسی آیت کے بیان میں فرمایا آدم کی پشت سے اللہ نے آدمؑ کی نسل کو اس طرح لے لیا جیسے کنگھی سے سر کی جوئیں لے لی جاتی ہیں۔ پھر فرمایا کیا میں تمہارا رب نہیں ہوں سب نے جواب دیا کیوں نہیں۔ فرشتے بولے ہم اس اقرار کے شاہد ہیں۔ بغویؒ نے حضرت ابن عباسؓ کا قول نقل کیا ہے کہ ملک ہند میں دہنا کے مقام پر جہاں حضرت آدمؑ اترے تھے اللہ نے آدم کو برآمد کیا اور ان سے (ربوبیت کا) اقرار لیا تھا۔ کلبی کا قول ہے کہ مقام میثاق مکہ اور طائف کے درمیان تھا۔ سدیؒ کا بیان ہے کہ پیدا ہونے کے بعد حضرت آدم آسمان سے اترے بھی نہیں تھے کہ اللہ نے ان کی پشت پر ہاتھ پھیرا اور ان کی نسل کو برآمد کیا تھا۔

حضرت ابی بن کعب کا بیان ہے اللہ نے سب اولاد آدمؑ کو جمع کیا، پھر ان کی قسمیں جدا جدا بنائیں، پھر ان کو صورتیں عطا کیں، پھر ان کو گویا کیا چنانچہ سب نے کلام کیا، پھر ان سے عہد و میثاق لیا اور ان سے خود انہی پر اقرار طلب کیا اور فرمایا کیا میں تمہارا رب نہیں ہوں، سب نے کہا کیوں نہیں۔ اللہ نے فرمایا میں (تمہارے اس اقرار پر) ساتوں آسمانوں اور ساتوں زمینوں کو شاہد بناتا ہوں اور تمہارے باپ آدم کو بھی گواہ بناتا ہوں، تاکہ قیامت کے دن تم یہ نہ کہنے لگو کہ ہم کو تو اس توحید کا علم بھی نہ تھا، خوب سمجھ لو کہ میرے سوا کوئی معبود نہیں میرا کسی کو شریک نہ بنانا، میں تمہارے پاس اپنے پیغمبر بھیجوں گا جو تم کو میرے اس عہد و میثاق کی یاد دہانی کریں گے اور میں تم پر اپنی کتابیں اتاروں گا۔ سب نے جواب دیا ہم شہادت دیتے ہیں کہ تو ہی بلاشک ہمارا رب ہے ہمارا معبود ہے تیرے سوا نہ ہمارا کوئی رب ہے نہ کوئی معبود۔ اس کے بعد ان کو حضرت آدمؑ کے سامنے لایا گیا حضرت آدم نے اوپر سے ان کا معائنہ کیا مالدار، نادار، خوبصورت بدصورت سب ہی دکھائی دیئے، عرض کیا پروردگار تو نے اپنے بندوں کو یکساں کیوں نہیں کر دیا۔ اللہ نے فرمایا میں چاہتا ہوں کہ میرا شکر ادا کیا جائے (امیر فقیر کو دیکھ کر شکر ادا کرے اور خوبصورت بدصورت کو دیکھ کر) حضرت آدمؑ نے اپنی اولاد میں انبیاء کو چراغوں کی طرح نورانی دیکھا انبیاء سے خاص طور پر رسالت و نبوت کے متعلق ایک میثاق علیحدہ لیا گیا اسی میثاق کی بابت اللہ نے فرمایا ہے وَإِذْ أَخَذْنَا مِنَ النَّبِيِّينَ مِيثَاقَهُمْ سے ...... وَعِيسَى ابْنِ مَرْيَمَ تک۔ عیسیٰ بن مریم بھی انہی ارواح میں شامل تھے جن کو اللہ نے مریم کی طرف بھیجا تھا۔ حضرت ابی بن کعبؓ کا قول روایت میں آیا ہے کہ عیسیٰ مریمؑ کے منہ سے ان کے اندر داخل ہوئے۔ رواہ احمد۔

بعض روایات میں یہ الفاظ آئے ہیں کسی چیز کو میرا شریک نہ بنانا جو میرا شریک قرار دے گا اور مجھ پر ایمان نہیں لائے گا میں اس سے انتقام لوں گا اور سب نے اس کا اقرار کیا۔ اس جملہ کے بعد اتنا اور بھی آیا ہے کہ اللہ نے ان کی عمریں، رزق اور مصائب لکھ دیئے اور میں چاہتا ہوں کہ میرا شکر ادا کیا جائے۔ اس کے بعد اس روایت میں یہ الفاظ بھی آئے ہیں کہ اللہ نے جب ان سے توحید کا اقرار لے لیا اور بعض کو بعض پر گواہ بنا لیا تو سب کو آدمؑ کی پشت کی طرف لوٹا دیا اب اس وقت تک قیامت برپا نہ ہوگی جب تک وہ تمام آدمی پیدا نہ ہو جائیں جن سے میثاق لیا گیا ہے۔

بغوی نے لکھا ہے کہ جب اللہ نے اولاد آدم کو آدمؑ کی پشت سے برآمد کیا تو پھر وَإِذْ أَخَذَ رَبُّكَ مِنْ بَنِي آدَمَ مِنْ

ظُهُوْرِهِمْ کا کیا معنی ہے (کیونکہ اس آیت میں اولاد آدمؑ کی پشت سے بر آمد کرنے کا ذکر کیا ہے آدمؑ کی پشت سے نکالنے کا ذکر نہیں ہے) میں کہتا ہوں کہ آدم کی پشت سے بر آمد کرنے کا ذکر احادیث میں آیا ہے۔ بعض علماء نے مذکورہ بالا شبہ کا یہ جواب دیا ہے کہ اللہ نے اولاد آدمؑ میں سے ایک کو دوسرے کی پشت سے بر آمد کیا جیسا کہ دنیا میں ان کی پیدائش ہوئی ہے تو اب آدمؑ کی پشت سے بر آمد کرنے کے ذکر کی کوئی ضرورت نہ رہی کیونکہ سب آدمؑ ہی کی اولاد تھی لہٰذا سب کا خروج آدمؑ ہی کی پشت سے کیا گیا۔ اسی لئے آیت میں آدمؑ کی پشت کا ذکر نہیں کیا گیا۔

میں کہتا ہوں حدیث میں سب کا خروج آدمؑ کی پشت سے بیان کیا گیا ہے کیونکہ جب بعض لوگ بعض کی پشت میں تھے اور سب کے اصول آدمؑ کی پشت میں تھے تو سب آدمؑ کی پشت میں ہوئے لہٰذا آدمؑ کی پشت سے سب کا بر آمد ہونا صحیح ہو گیا یوں کہا جائے کہ حدیث میں جو لفظ آدمؑ کہا ہے اس سے مراد آدمؑ مع اولاد ہیں، اصل کو ذکر کرنے کے بعد شاخوں کے ذکر کی ضرورت نہیں اس لئے صرف آدم کا نام آگیا۔

میں کہتا ہوں کہ حدیث میں حضرت آدمؑ کے دائیں بائیں شانہ پر ہاتھ مارنے اور گوری کالی نسل کے بر آمد ہونے کا ذکر کیا ہے اس حدیث میں مراد یہ ہے کہ اللہ نے آدمؑ کے شانہ پر یا ان کی اولاد میں سے بعض کے شانہ پر ہاتھ مارا۔

بغوی نے لکھا ہے اہل تفسیر کا قول ہے کہ اہل سعادت نے تو برضائے قلبی ربوبیت کا اقرار کیا تھا اور اہل شقاوت نے بکراہت خاطر منافقت کے ساتھ۔ آیت وَلَهٗۤ اَسْلَمَ مَنْ فِی السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ طَوْعًا وَّ كَرْهًا کا یہی مطلب ہے۔

شَهِدْنَا ہم گواہ ہیں۔ سدی نے لکھا ہے یہ اللہ کا قول ہے (بندوں کا جواب بَلٰی پر ختم ہو گیا) اللہ نے اپنی طرف سے اور اپنے ملائکہ کی طرف سے فرمایا کہ ہم اس میثاق اول کے شاہد ہیں۔ بعض کے نزدیک یہ فقرہ بھی بندوں کے کلام کا جزء ہے اور بَلٰی کے بعد شَهِدْنَا بھی بندوں نے ہی کہا تھا) جب اللہ نے اَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ فرمایا تو بندوں نے بَلٰی کہا اور جب ایک کو دوسرے کے اقرار کا شاہد بنایا تو سب نے شَهِدْنَا کہا۔ کلبی کا بیان ہے کہ یہ ملائکہ کا قول ہے کلام کا کچھ حصہ محذوف ہے۔ اصل کلام اس طرح تھا اولاد آدمؑ نے جب بلٰی کہا تو اللہ نے فرشتوں سے فرمایا اس اقرار کے شاہد رہو فرشتوں نے عرض کیا ہم شاہد ہیں۔

اَنْ تَقُوْلُوْا یَوْمَ الْقِیٰمَةِ یہ جملہ کلام سابق کی علت ہے گویا مفعول لہ ہے یعنی تم کو اَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ کہہ کر خطاب اس لئے کیا کہ قیامت کے دن تم کہیں یہ نہ کہنے لگو اِنَّا كُنَّا عَنْ هٰذَا غٰفِلِیْنَ ہم اس اقرار یا اس میثاق سے بے خبر تھے۔ وَكُنَّا ذُرِّیَّةً مِّنْۢ بَعْدِهِمْ یعنی ہم ان کے بعد آئے تھے اور ان کے تابع تھے ہم نے تو ان کی پیروی کی تھی (مجرم تو ہمارے بڑے تھے) اَفَتُهْلِكُنَا کیا تو ہم کو عذاب دے گا سزا دے گا۔ الْمُبْطِلُوْنَ یعنی مشرک اسلاف۔ مطلب یہ ہے کہ قیامت کے دن کہیں تم اپنی بے خبری کو یا تقلید اسلاف کو عذر کے طور پر پیش کرنے لگو۔

وَكَذٰلِكَ نُفَصِّلُ الْاٰیٰتِ وَلَعَلَّهُمْ یَرْجِعُوْنَ۝ (اور ہم آیات کو اسی طور پر صاف صاف بیان کیا کرتے ہیں (تاکہ وہ غور کریں) اور تاکہ وہ باز آجائیں)۔

وَكَذٰلِكَ نُفَصِّلُ یعنی ہم یوں ہی آیات کو واضح طور پر کھول کر بیان کرتے ہیں تاکہ بندے ان پر غور کریں اور بھولے ہوئے عہد کو یاد کریں اور کفر سے توحید کی طرف لوٹ آئیں۔ اس مطلب پر لَعَلَّهُمْ یَرْجِعُوْنَ کا عطف ایک محذوف جملہ پر ہو گا یعنی لعلہم یتدبرون ویتذکرون ما نسوا ویرجعون۔

جمہور مفسرین اور علمائے سلف نے احادیث کی روشنی میں آیات مذکورہ کا مطلب حسب تفسیر مندرجہ بالا بیان کیا ہے۔

بیضاوی اور بیضاوی کے مقلدوں نے (جمہور سلف کے خلاف) آیات مذکورہ کی تفسیر اس طرح کی ہے۔

وَاِذْ اَخَذَ رَبُّكَ اور جب آپ کے رب نے لیا یعنی آدم اور نسل آدم کی پشت سے مختلف زمانوں میں انسانوں کو ایک کے بعد ایک کو پیدا کیا۔ وَاَشْهَدَهُمْ عَلٰۤى اَنْفُسِهِمْ یعنی دلائل ربوبیت قائم کر دیں اور لوگوں کے دماغوں کے اندر وہ قوت

فہم پیدا کردی جو اقرار توحید کی دعوت دے رہی ہے گویا وہ اس درجہ پر پہنچ گئے اور تقاضائے فطرت یہ ہو گیا کہ جب ان سے اَلَسْتُ بِرَبِّکُمْ کہا گیا تو انہوں نے بَلٰی کہہ دیا (یعنی یہ سوال و جواب اگرچہ واقع نہیں ہوا لیکن جب اللہ نے ان کو علم عطا کر دیا اور دلائل ربوبیت کی فطری تخلیق کر دی تو یہی تخلیق اور عطاء قوت بطور تشبیہ گویا سوال اور اقرار کرنا ہو گیا۔ بیضاوی نے اس مطلب کی تائید میں لکھا ہے کہ آیت کے الفاظ خود اسی مطلب پر دلالت کر رہے ہیں اِنَّا کُنَّا عَنْ ھٰذَا غٰفِلِیْنَ یعنی کہیں قیامت کے دن تم یہ نہ کہنے لگو کہ ہم اس سے غافل تھے تو نے کسی دلیل سے ہم کو آگاہ نہیں کیا تھا۔ شرک تو ہمارے اسلاف نے کیا تھا ہم شرک کے مؤسس نہ تھے ہم تو ان کے مقلد و پیرو تھے، ہم نے ان کی اقتداء کی۔ قیامت کے دن یہ عذر اس وجہ سے نہیں پیش کیا جا سکتا کہ جب دلائل موجود ہیں اور دلائل توحید کا علم حاصل کرنے کی قدرت ہے تو پھر کورانہ اتباع اسلاف نا قابل معذرت ہے۔

بیضاوی نے لکھا ہے اس کلام کی اصل غرض یہ ہے کہ ایک تو توریت کے اندر یہودیوں سے میثاق خاص طور پر لیا گیا تھا، دوسرے فطری عمومی میثاق توحید بھی موجود ہے اس طرح نقلی دلیل کی بھی تکمیل ہو گئی اور عقلی شہادت بھی کافی ہو گئی لہٰذا خود نظر اور استدلال سے کام لینے کی ضرورت ہے اور تقلید اسلاف کے بندھن کاٹ دینے لازم ہیں (گویا اس آیت کے مخاطب خاص طور پر یہودی ہیں جن کو فطرت سلیمہ، قوت عقلیہ اور فہم و دانش کی تمام طاقتیں عطا کی گئی تھیں جیسے دوسرے لوگوں کو عطا کی گئی ہیں پھر توریت میں بھی ان سے میثاق لے لیا گیا تھا) اسی مضمون پر دلالت کر رہی ہے آخری آیت وَکَذٰلِکَ نُفَصِّلُ الْاٰیٰتِ وَلَعَلَّھُمْ یَرْجِعُوْنَ۔

میثاق اَلَسْتُ کے متعلق جو احادیث آئی ہیں بیضاوی اور ان کے متبعین ان احادیث کی اسی نہج پر تاویل کرتے ہیں۔

وَاتْلُ عَلَیْھِمْ نَبَاَ الَّذِیْٓ اٰتَیْنٰهُ اٰیٰتِنَا فَانْسَلَخَ مِنْهَا فَاَتْبَعَهُ الشَّیْطٰنُ فَکَانَ مِنَ الْغٰوِیْنَ ۝ وَلَوْ شِئْنَا لَرَفَعْنٰهُ بِهَا وَلٰکِنَّهٗٓ اَخْلَدَ اِلَی الْاَرْضِ وَاتَّبَعَ هَوٰىهُ (اور آپ ان لوگوں کو اس شخص کا حال پڑھ کر سنایئے جس کو ہم نے اپنی آیتیں عطا کیں، پھر وہ ان سے بالکل ہی نکل گیا، پھر شیطان اس کے پیچھے لگ گیا، سو وہ گمراہ لوگوں میں سے ہو گیا۔ اگر ہم چاہتے تو اس کو ان آیتوں کی بدولت بلند مرتبہ کر دیتے لیکن وہ تو دنیا کی طرف مائل ہو گیا اور اپنی نفسانی خواہش کے پیچھے ہو لیا)۔

عَلَیْھِمْ یعنی یہودیوں کو۔ فَانْسَلَخَ مِنْهَا پس وہ آیتوں سے نکل گیا یعنی آیات سے روگرداں ہو گیا اور انکار کر دیا۔ یہ قصہ بقول حضرت ابن عباسؓ بلعم بن باعور کا اور بقول مجاہد بلعام بن باعور کا ہے۔ عطیہ نے حضرت ابن عباسؓ کا قول نقل کیا ہے کہ بلعم اسرائیلی تھا۔ ابو طلحہؓ نے حضرت ابن عباسؓ کا قول نقل کیا ہے کہ وہ کنعانی تھا اور جبارین (یعنی عمالقہ) کے شہر کا رہنے والا تھا۔ مقاتل نے کہا وہ شہر بلقاء کا باشندہ تھا۔ حضرت ابن عباس، محمد بن اسحٰق اور سدی وغیرہ نے اس کا قصہ حسب تفصیل ذیل بیان کیا ہے۔

حضرت موسیٰؑ نے جب عمالقہ سے جنگ کرنے کا ارادہ کیا اور ملک شام میں علاقہ کنعان میں جا کر قیام کیا تو کچھ (کنعان کے) آدمی بلعم کے پاس گئے کیونکہ بلعم کو اسم اعظم معلوم تھا اور اس سے کہا موسیٰ تیز مزاج کے آدمی ہیں ان کے پاس لشکر بھی بہت ہے وہ اس لئے ہمارے ملک میں آئے ہیں کہ ہم کو ہماری بستیوں سے نکال دیں اور ہم کو قتل کر دیں اور ہماری جگہ بنی اسرائیل کو آباد کر دیں، آپ کی دعا قبول ہوتی ہے ہمارے لئے آپ دعا کر دیجئے کہ اللہ بنی اسرائیل کو ہماری طرف سے پھیر دے۔ بلعم نے جواب دیا ارے کمبختو موسیٰؑ نبی ہیں ان کے ساتھ فرشتے اور مؤمن ہیں میں ان کے خلاف کس طرح دعا کر سکتا ہوں، اللہ کی طرف سے جو میں جانتا ہوں تم نہیں جانتے اگر میں تمہارے کہنے کے موافق کروں گا تو دنیا اور آخرت دونوں میری تباہ ہو جائیں گی۔ لوگوں نے پھر اصرار کیا اور بہت زاری کی تو بلعم نے کہا اچھا میں اپنے رب سے استخارہ کر لوں۔ بلعم کا قاعدہ تھا کہ جب تک خواب میں کسی بات کی اجازت اس کو نہیں مل جاتی تھی وہ دعا نہیں کرتا تھا، چنانچہ بنی اسرائیل کے خلاف بددعا کرنے

کے معاملہ میں بھی اس نے استخارہ کیا مگر خواب میں اس کو بددعا کرنے کی ہدایت کر دی گئی بیدار ہو کر اس نے قوم والوں سے
کہہ دیا کہ میں نے استخارہ کیا تھا مجھے بددعا کرنے کی ممانعت کر دی گئی ہے یہ انکاری جواب سن کر لوگوں نے اس کو کچھ تحفے ہدیہ
پیش کیے اس نے قبول کر لیے تو لوگوں نے پھر بددعا کرنے کی مکرر درخواست کی اور بلعم نے حسب سابق جواب دیا کہ میں اپنے
رب سے استخارہ کر لوں چنانچہ اس نے استخارہ کیا مگر اس مرتبہ اس کو کوئی جواب نہیں ملا بیدار ہو کر اس نے قوم سے کہہ دیا کہ میں
نے استخارہ کیا تھا مگر مجھے کوئی جواب نہیں ملا لوگوں نے کہا اگر رب کا بددعا کرنا اللہ کو ناپسند ہوتا تو وہ ضرور اول مرتبہ کی طرح
ممانعت فرما دیتا اور اس مرتبہ کی طرح ممانعت نہیں فرمائی جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کو بددعا کرنا ناپسند نہیں ہے لہٰذا آپ
بنی اسرائیل کے لیے بددعا کر دیجئے لوگ اپنی درخواست پر برابر اصرار کرتے رہے اور اتنی زاری اور عاجزی کی کہ بلعم فریب کھا
گیا اور قوم والے بہکانے میں کامیاب ہو گئے چنانچہ
بلعم ایک خچر پر سوار ہو کر کوہ حسبان کی طرف گیا تاکہ اوپر چڑھ کر بنی اسرائیل کے لشکر کا
معائنہ کرے مگر پہاڑ پر کچھ ہی چڑھا تھا کہ خچر بیٹھ گیا۔ بلعم نے اتر کر خچر کو مارا، خچر اٹھ کھڑا ہوا، بلعم پھر سوار ہو گیا مگر زیادہ نہ چلا
تھا کہ پھر بیٹھ گیا، بلعم نے پھر اسے مارا اب اللہ نے خچر کو بات کرنے کی طاقت عنایت کر دی اور خچر نے (اللہ کی طرف سے) حجت
تمام کرتے ہوئے کہا اے بلعم تو کہاں جا رہا ہے کیا تجھے میرے سامنے ملائکہ نظر نہیں آتے جو مجھے لوٹا رہے ہیں تو اللہ کے نبی اور
اور مومنوں کے خلاف دعا کرنے جا رہا ہے۔ بلعم نے پھر بھی خچر کو نہیں چھوڑا اور اس پر سوار ہو کر بنی کوہ حسبان کے اوپر بددعا کرنے
کے لیے پہنچ گیا لیکن بددعا کا جو کلمہ زبان سے نکالتا تھا وہ قوم کے لیے نکلتا تھا اور خیر کی دعا جو اپنی قوم کے لیے مانگنے کا ارادہ کرتا تھا
اس وقت زبان بنی اسرائیل کی طرف پھر جاتی تھی (گویا بنی اسرائیل کا لفظ زبان سے نکالتا تھا مگر اپنی قوم کا نام زبان سے نکلتا تھا اور
اپنی قوم کا نام زبان سے لیتا تھا تو بنی اسرائیل کا لفظ زبان پر آ جاتا تھا) قوم والوں نے کہا بلعم آپ کو معلوم بھی ہے آپ کیا کر رہے
ہیں، بنی اسرائیل کے لیے دعا اور ہمارے لیے بددعا کر رہے ہیں، بلعم نے جواب دیا اس پر میرا کچھ اختیار نہیں ہے یہ تو اللہ تعالیٰ کی طرف
سے کرا دیا جاتا ہے میں مجبور ہوں (بددعا کرنے کے وبال میں) بلعم کی زبان سینہ پر لٹک آئی کہنے لگا لو۔ اب میری دنیا اور
آخرت دونوں تباہ ہو گئیں اب سوائے چالبازی اور مکاری کے تمہارے کام کا اور کوئی راستہ نہیں رہا اب مجھے تمہارے لیے مکاری
سے کام لینا پڑے گا جاؤ کچھ عورتوں کو بناؤ سنگھار کرا کے کچھ تجارتی سامان ان کے ہاتھوں میں دے کر بنی اسرائیل کے لشکر میں
بیچنے کے لیے بھیج دو اور حکم دے دو کہ اگر بنی اسرائیل میں سے کوئی شخص اگر تمہاری طرف دست درازی کرے تو وہ انکار نہ
کریں کیونکہ اگر ان میں سے کسی ایک نے بھی زنا کر لیا تو پھر سب لشکر کے مقابلہ میں تم کو کامیابی ہو جائے گی۔ لوگوں نے اس
مشورہ کو مان لیا جب عورتیں لشکر میں پہنچیں تو ایک کنعانی عورت جس کا نام کستی بنت صور تھا۔ ایک اسرائیلی سردار کی طرف
سے گزری اس سردار کا نام زمری بن شلوم تھا یہ سبط شمعون کا سر کردہ تھا زمری عورت کے حسن پر فریفتہ ہو گیا اور اٹھ کر اس نے
عورت کا ہاتھ پکڑ لیا اور عورت کو لے جا کر حضرت موسیٰ کے سامنے کھڑا ہو گیا اور کہنے لگا میرا خیال ہے کہ آپ یہی کہیں گے کہ
یہ عورت تیرے لیے حرام ہے۔ حضرت موسیٰ نے فرمایا ہاں یہ تیرے لیے حرام ہے، تو اس کے قریب بھی نہ جانا۔ زمری بولا،
خدا کی قسم اس کے معاملہ میں آپ کی بات نہیں مانوں گا، چنانچہ عورت کو لے کر خیمہ کے اندر چلا گیا اور اس سے قربت کی، یہ زنا
کرنا تھا کہ فوراً اللہ نے طاعون کو بنی اسرائیل پر مسلط کر دیا۔ جس سے ستر ہزار آدمی ایک گھنٹہ میں مر گئے۔
فیحاص بن عیزار بن ہارون حضرت موسیٰ کا مقرر کردہ ایک سردار تھا جو حاکم لشکر تھا یہ شخص قوی الجثہ اور طاقتور
بھی تھا زمری نے جس وقت یہ حرکت کی تھی اور اس وقت فیحاص لشکر میں موجود نہ تھا جب لشکر میں لوٹ کر آیا اور فوج میں
طاعون پھیلا ہوا دیکھا اور زمری کی حرکت معلوم ہوئی تو فوراً اپنا بھالا جو پورے لوہے کا تھا لے کر زمری کے خیمہ میں گھس
گیا زمری اور وہ عورت دونوں ہم خواب تھے فیحاص نے نیزہ چبھو کر دونوں کو ایک ہی نیزہ میں پرو دیا اور دونوں کو اسی حالت میں
اٹھائے ہوئے باہر آیا ہاتھ میں نیزہ پکڑے ہوئے تھا ہاتھ اوپر کو تھا اور کمر پہلو سے لگی ہوئی تھی اور دونوں لاشیں فیحاص

کے جبڑوں سے لگی ہوئی تھیں اسی حالت میں رو کر دعا کرنے لگا کہ جو تیری نافرمانی کرتا ہے اس کے ساتھ یہی سلوک کیا جاتا ہے اس پر (اللہ کو رحم آگیا اور اس نے) بنی اسرائیل سے طاعون اٹھالیا یہی وجہ ہے کہ بنی اسرائیل جو ذبیحہ ذبح کرتے ہیں اس کا دست، جبڑا اور پہلو فیحاص کی اولاد کو دیتے ہیں کیونکہ فیحاص نے زمری اور عورت کو نیزہ میں پرو کر نیزہ ہاتھ میں اٹھا کر کچھی کو اپنے پہلو سے ٹیکا تھا اور لاشوں کو اپنے جبڑوں سے لگا کر روک رکھا تھا اور بنی اسرائیل اپنے لونٹوں میں سے ایک نوجوان لونٹی بھی فیحاص کی اولاد کو دیتے ہیں کیونکہ فیحاص عیزار کا جیٹھا بیٹا تھا۔ بلعم ہی کے متعلق اللہ نے آیت وَاتْلُ عَلَيْهِمْ نَبَأَ الَّذِي آتَيْنَاهُ آيَاتِنَا الخ نازل فرمائی۔

مقاتل کا بیان ہے کہ شاہ بلقاء نے بلعم سے کہا کہ موسیٰ کے لئے بددعا کرو، بلعم نے کہا وہ میرے ہم مذہب ہیں میں ان کے لئے بددعا نہیں کروں گا۔ بادشاہ نے صلیب کے تختے نصب کرائے (اور حکم دیا کہ بددعا کرو ورنہ تم کو صلیب پر لٹکا دوں گا) بلعم نے یہ حالت دیکھی تو خچر پر سوار ہو کر بددعا کرنے کے لئے بستی سے باہر نکلا بنی اسرائیل کے لشکر کے سامنے پہنچا تو خچر رک گیا، بلعم نے خچر کو مارا خچر نے کہا" تو مجھے کیوں مارتا ہے مجھے تو تم ہی پہ ملا ہے میرے آگے یہ آگ ہے جو مجھے چلنے سے روک رہی ہے" بلعم لوٹ آیا اور بادشاہ سے واقعہ بیان کر دیا۔ بادشاہ نے کہا تم کو بددعا تو کرنی ہو گی ورنہ میں صلیب پر لٹکا دوں گا۔ آخر بلعم نے اسم اعظم پڑھ کر حضرت موسیٰ کے لئے بددعا کی کہ وہ اس شہر میں داخل نہ ہوں، بددعا قبول ہو گئی اور اس کی بددعا کی وجہ سے بنی اسرائیل تیہ میں پھنس گئے۔ حضرت موسیٰ نے عرض کیا پروردگار جس طرح تو نے اس کی بددعا میرے متعلق قبول فرمائی میری بددعا اس کے متعلق بھی قبول فرمالے۔ اس کے بعد حضرت موسیٰ نے بددعا کی کہ بلعم سے اسم اعظم اور ایمان چھین لیا جائے۔ موسیٰ کی بددعا سے اس کی معرفت سلب کر لی اور ایمان اس طرح کھینچ لیا جیسے بکری کی کھال کھینچی جاتی ہے، سفید کبوتر کی شکل کی ایک صورت اس کے اندر سے نکل گئی آیت فَانْسَلَخَ مِنْهَا سے یہی مراد ہے۔

حضرت عبداللہ عمرو بن عاص، سعید بن مسیب، زید بن اسلم اور لیث بن سعد کا قول روایت میں آیا ہے کہ آیت مذکورہ کا نزول امیہ بن صلت ثقفی کے متعلق ہوا اس شخص نے (آسمانی) کتابیں پڑھی تھیں اور اس کو معلوم تھا کہ اللہ ایک پیغمبر ضرور بھیجے گا مگر اس کو امید لگی ہوئی تھی کہ وہ پیغمبر میں ہی ہوں گا۔ جب محمد ﷺ کو پیغمبر بنا دیا گیا تو امیہ کو حسد ہو گیا اور آپ کی بعثت کا اس نے انکار کر دیا تھا۔ یہ بڑا دانشمند اور اچھا واعظ۔ ایک بادشاہ کے پاس سے لوٹ رہا تھا تو مقام بدر کی طرف سے اس کا گزر ہوا اور بدر کے مقتولوں کو اس نے دیکھا، دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ محمد ﷺ نے ان کو قتل کیا ہے کہنے لگا اگر محمد ﷺ نبی ہوتے تو اپنے قرابت داروں کو قتل نہ کرتے۔

امیہ کے مرنے کے بعد اس کی بہن فارعہ رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئی تو حضور ﷺ نے اس کے بھائی کے مرنے کے متعلق دریافت کیا فارعہ نے عرض کیا امیہ نے سوتے میں دیکھا کہ دو آنے والے چھت پھاڑ کر نیچے اترے، ایک اس کے پائیں بیٹھ گیا اور دوسرا سرہانے۔ پائیں والے نے سرہانے والے سے پوچھا کیا (اس کا دل) ہوشیار ہے اس نے کہا ہوشیار ہے پائیں والے نے کہا کیا (نفسانی جذبات سے) پاک ہے، اس نے کہا مغرور ہے۔ فارعہ کا بیان ہے کہ میں نے امیہ سے اس کی تعبیر پوچھی تو اس نے جواب دیا کسی بھلائی کا میرے بارے میں ارادہ کیا گیا تھا مگر وہ بھلائی لوٹا دی گئی اتنا کہنے کے بعد اس پر بیہوشی طاری ہو گئی جب ہوش آیا تو کہنے لگا۔

زندگی کتنی ہی مدت تک لمبی ہو اس کو بھی زوال کی طرف جانا ہے۔ جو حالت میرے سامنے آئی کاش اس سے پہلے ہی میں پہاڑوں کی چوٹیوں پر پہاڑی بکرے چراتا (یعنی گوشہ گیر ہو کر سب انسانوں سے الگ پڑا رہتا)۔ بلاشبہ حساب فہمی کا دن بڑا ہولناک ہو گا ایسا بھاری دن ہو گا کہ (شدت ہول سے) بچے بھی بوڑھے ہو جائیں گے۔

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا مجھے اپنے بھائی کے کچھ اور شعر سناؤ۔ فارعہ نے بعض قصائد سنائے حضور ﷺ نے فرمایا اس کے شعر مؤمن ہیں مگر دل کافر تھا امیہ ہی کے بارہ میں اللہ نے نازل فرمایا وَاتْلُ عَلَيْهِمْ نَبَأَ الَّذِي آتَيْنَاهُ آيَاتِنَا فَانْسَلَخَ مِنْهَا الخ

حضرت ابن عباسؓ کا قول ایک روایت میں آیا ہے کہ اس آیت کا نزول بنی اسرائیل کے ایک شخص بسوس کے متعلق ہوا۔ اس شخص کو تین دعائیں کرنے کا حق دیا گیا تھا (یعنی اطلاع دے دی گئی تھی کہ تیری تین دعائیں قبول کر لی جائیں گی) اس کی بیوی بھی تھی اور بیوی سے کچھ اولاد بھی۔ بیوی نے ایک دن کہا ایک دعا میرے لئے کر دے۔ بسوس نے پوچھا تو کیا چاہتی ہے۔ بیوی نے کہا اللہ سے دعا کرو کہ مجھے بنی اسرائیل کی سب سے زیادہ حسین عورت بنا دے۔ بسوس نے دعا کر دی۔ عورت سب سے زیادہ خوبصورت ہو گئی، خوبصورت ہونے کے بعد اس کو احساس ہوا کہ میری طرح حسین بنی اسرائیل میں کوئی بھی نہیں ہے، یہ احساس ہوتے ہی اس نے شوہر سے بے التفاتی شروع کر دی، شوہر کو غصہ آیا اور اس نے بددعا کی عورت فوراً کتیا ہو گئی جو بھونکتی رہتی تھی۔ بسوس کی دو دعائیں ختم ہو گئیں۔ ماں کی یہ حالت دیکھ کر اس کے لڑکے آئے اور کہنے لگے ہم صبر نہیں کر سکتے ہم کو چین نہیں آتا کہ ہماری ماں کتیا بنی رہے اور لوگ ہمیں عار دلاتے ہیں آپ دعا کیجئے کہ اللہ ہماری ماں کو پہلی حالت پر کر دے۔ مجبوراً بسوس نے دعا کی اور بیوی اصلی حالت پر آ گئی اس طرح اس کی تینوں دعائیں بے کار گئیں۔

بغوی نے لکھا ہے پہلے دونوں قول (یعنی بلعم یا امیہ کے متعلق آیت کا نزول) زیادہ ظاہر ہے۔ میں کہتا ہوں دوسرے قول کی ترجیح تو خود آیات کر رہی ہیں اللہ نے فرمایا ہے قَالُوا يَا مُوسَىٰ إِنَّا لَن نَّدْخُلَهَا أَبَدًا مَّا دَامُوا فِيهَا فَاذْهَبْ أَنتَ وَرَبُّكَ فَقَاتِلَا إِنَّا هَاهُنَا قَاعِدُونَ قَالَ رَبِّ إِنِّي لَا أَمْلِكُ إِلَّا نَفْسِي وَأَخِي فَافْرُقْ بَيْنَنَا وَبَيْنَ الْقَوْمِ الْفَاسِقِينَ قَالَ فَإِنَّهَا مُحَرَّمَةٌ عَلَيْهِمْ أَرْبَعِينَ سَنَةً يَتِيهُونَ فِي الْأَرْضِ الخ یہ آیت صاف بتا رہی ہے کہ بنی اسرائیل کا تیہ میں سرگرداں پھرنا بلعم کی بددعا کی وجہ سے نہ تھا بلکہ خود انہی کے قول (إِنَّا لَن نَّدْخُلَهَا الخ) کی وجہ سے تھا۔ حسن اور ابن کیسان کا قول ہے کہ اس آیت کا نزول منافقین اہل کتاب کے متعلق ہوا جو اپنے بیٹوں کی طرح بلاشبہ رسول اللہ ﷺ کو پہچانتے تھے اور پھر بھی سچے دل سے ایمان نہیں لاتے تھے۔ قتادہ نے کہا (آیت میں کوئی خاص شخص یا گروہ مراد نہیں ہے بلکہ) اللہ نے بطور تمثیل اس شخص کی حالت بیان کی ہے جس کے سامنے ہدایت کو اللہ لے آیا لیکن وہ استقبال ہدایت کے لئے تیار نہ ہوا اور قبول کرنے سے انکار کر دیا (گویا آیت سے مراد ہے ہدایت)۔

حضرت ابن عباسؓ اور سدی کے نزدیک آیات سے مراد اسم اعظم ہے۔ دوسری روایت میں حضرت ابن عباسؓ کا قول آیا ہے اس کو اللہ کی کوئی کتاب دی گئی تھی مگر وہ کتاب (کے احکام) سے اس طرح نکل گیا جیسے سانپ کینچلی سے نکل جاتا ہے۔ ابن زید نے کہا واللہ سے جو کچھ اس کو اللہ عطا فرما دیا تھا (آیات سے مراد ہے)۔

فَأَتْبَعَهُ الشَّيْطَانُ پھر شیطان اس کے پیچھے لگ گیا یا شیطان نے اس کو اپنے پیچھے لگا لیا۔ فَكَانَ مِنَ الْغَاوِينَ پھر وہ گمراہوں میں شامل ہو گیا۔ وَلَوْ شِئْنَا لَرَفَعْنَاهُ بِهَا یعنی آیت کے ذریعہ سے ہم چاہتے تو اس کا مرتبہ ابرار کے مرتبہ کی برابر کر دیتے۔ مجاہد نے یہ مطلب بیان کیا کہ اگر ہم چاہتے تو آیات کے ذریعہ سے ہم اس کو کفر سے اٹھا لیتے اور بچا لیتے۔ أَخْلَدَ إِلَى الْأَرْضِ مگر وہ دنیا اور پستی کی طرف مائل ہو گیا۔ زمین پست ہے، دنیا بھی پست ہے، پستی کی مناسبت سے بطور کنایہ دنیا کو ارض فرمایا یا یوں کہا جائے کہ دنیا کا سارا مال متاع اسباب جائیداد زمین ہی کی پیداوار ہے، اس لئے زمین بول کر دنیا مراد لی۔ زجاج نے کہا خَلَدَ (مجرد) اور أَخْلَدَ (مزید) دونوں ہم معنی ہیں۔ خلد کا اصل (لغوی) معنی ہے دوام اور قیام۔ أَخْلَدَ فُلَانٌ بِالْمَكَانِ فلاں شخص نے فلاں جگہ قیام کیا۔ وَاتَّبَعَ هَوَاهُ اور وہ اپنی نفسانی خواہش کے پیچھے لگ گیا یعنی دنیا کو اس نے اختیار کیا اور اپنی قوم کی رضامندی کا خواستگار رہا اور آیات کے تقاضوں سے اعراض کیا۔

انسان کے لئے امکان اور عدم ذاتی ہے اسکی فطرت کا تقاضا ہے کہ پستی کی طرف مائل ہو یعنی زمین پر رہتا اور دنیا کی طرف مائل ہونا اس کا ذاتی اقتضاء ہے اور بلند درجات کی طرف اٹھایا جانا ایک امر وہبی ہے جو اللہ کی مہربانی سے حاصل ہوتا ہے۔ اسی لئے اونچے مراتب کی طرف اٹھانے کی نسبت اللہ کی طرف کی اور زمین کی طرف مائل ہونے یعنی دنیا کی طرف راغب ہونے کی نسبت بندہ کی جانب کی گئی۔ بیضاوی نے کہا رفع درجات کو اللہ نے اپنی مشیت سے وابستہ کیا (لیکن شبہ ہو سکتا تھا کہ

بلندی حاصل کرنے پر پستی میں پڑے رہنے کے لئے افعال بے سود ہیں) تو اس وہم کو دفع کرنے کے لئے فعل مشیت خداوندی اور
اتبع کا ذکر کیا تاکہ یہ معلوم ہو جائے کہ مشیت خداوندی انسان کے اس فعل کا سبب ہے جو موجب رفعت ہے اور جب انسان
موجب رفعت فعل نہیں کرتا تو اس عدم فعل سے عدم مشیت خداوندی معلوم ہوتا ہے۔ انتفاء سبب، انتفاء مسبب پر دلالت
کرتا ہے۔ سبب حقیقی تو اللہ کی مشیت ہے باقی جو ظاہری اسباب ہم دیکھتے ہیں وہ حقیقت میں اسباب نہیں بلکہ درمیانی واسطے ہیں
جن سے مسبب (نتیجہ) کا وجود وابستہ ہے یعنی اللہ کی مشیت کے ساتھ جو نتائج کی وابستگی ہے وہ انہی ظاہری اسباب و ذرائع کی
وساطت سے ہے۔ اصل کلام تو یوں ہونا چاہئے تھا ولکنہ اعرض عنہا لیکن اس کی جگہ اخلد الی الارض و اتبع ھواہ
فرمایا تاکہ معلوم ہو جائے کہ الاعراض عن الآیات کا باعث کیا ہے اور اس بات پر بھی تنبیہ ہو جائے کہ دنیا کی محبت ہر گناہ کا
سرچشمہ ہے۔ یہ حدیث مرفوع ہے جس کو بیہقی نے بروایت حسن مرسلاً بیان کیا ہے (موقوف کا ذکر نہیں کیا)۔

فَمَثَلُهٗ كَمَثَلِ الْكَلْبِ ۚ اِنْ تَحْمِلْ عَلَيْهِ يَلْهَثْ اَوْ تَتْرُكْهُ يَلْهَثْ ؕ ذٰلِكَ مَثَلُ الْقَوْمِ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا ۚ
فَاقْصُصِ الْقَصَصَ لَعَلَّهُمْ يَتَفَكَّرُوْنَ ۝ سَآءَ مَثَلَا ِۨالْقَوْمُ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا وَاَنْفُسَهُمْ كَانُوْا
يَظْلِمُوْنَ ۝ مَنْ يَّهْدِ اللّٰهُ فَهُوَ الْمُهْتَدِيْ ۚ وَمَنْ يُّضْلِلْ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْخٰسِرُوْنَ ۝

(سو اس کی حالت کتے کی سی ہو گئی کہ اگر تو اس پر حملہ کرے تب بھی ہانپے یا اس کو چھوڑ دے
تب بھی ہانپے، یہی حالت عام طور پر ان لوگوں کی ہے جنہوں نے ہماری آیتوں کو جھٹلایا، سو آپ اس حال کو بیان کر دیجئے شاید وہ
لوگ کچھ سوچیں۔ ان لوگوں کی حالت بھی بری حالت ہے جو ہماری آیتوں کو جھٹلاتے ہیں اور اس سے وہ اپنا ہی نقصان کرتے
ہیں۔ جس کو اللہ ہدایت کرتا ہے سو ہدایت پانے والا وہی ہوتا ہے اور جس کو وہ گمراہ کر دے تو ایسے ہی لوگ خسارہ میں رہتے
ہیں)۔

فمثلہ یعنی اس کی ذلت کی حالت ایسی ہے۔ کمثل الکلب جیسی کتے کی ذلیل ترین حالت۔ یلھث کہ وہ ہر حال
میں زبان باہر نکال دیتا ہے ہانپتا ہے پیاس ہو، تھکان ہو یا اس کو ڈانٹ ڈپٹ کی جائے اور دھتکار کر باہر نکالا جائے یا ایسا نہ کیا جائے،
ہر حال وہ ذلت کے ساتھ زبان باہر نکالے رہتا ہے۔ دوسرے جانوروں کی حالت ایسی نہیں ہے وہ اسی وقت ہانپتے اور زبان باہر
نکالتے ہیں جب کوئی خاص سبب ہو، تھک جائیں، پیاس لگی ہو یا کوئی اور محرک ہو تب وہ زبان باہر نکال دیتے ہیں۔
مجاہد نے کہا یہ حالت اس شخص کی ہوتی ہے جو قرآن پڑھتا تو ہے مگر اس پر عمل نہیں کرتا مطلب یہ ہے کہ کافر کو تم
نصیحت کرو نصیحت کرو یا نہ کرو وہ کفر سے باز نہیں آتا کچھ نہ کرو تب بھی ہدایت نہیں حاصل کرتا ہمیشہ ہر حال میں گمراہ اور ذلیل
رہتا ہے وہ ذلت میں ایسا ہی ہوتا ہے جیسے کتا جو ہمیشہ زبان باہر نکالے رہتا ہے اسی کی ہم معنی ایک اور آیت آئی ہے فرمایا ہے وَاِنْ
تَدْعُوْهُمْ اِلَى الْهُدٰى لَا يَتَّبِعُوْكُمْ ؕ سَوَآءٌ عَلَيْكُمْ اَدَعَوْتُمُوْهُمْ اَمْ اَنْتُمْ صَامِتُوْنَ۔
ذٰلِكَ مَثَلُ الْقَوْمِ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا یعنی یہ حالت ہے ان یہودیوں کی جنہوں نے آیات کی تکذیب کی۔ رسول
اللہ ﷺ کے احوال و صفات کو خود توریت میں پڑھا اور لوگوں کو پیغمبر آخر الزماں کی بعثت قریب ہونے کی بشارت دیتے رہے
لیکن جب آپ مبعوث ہو گئے اور ان کے سامنے آ گئے اور معجزات ظاہر کر دیئے اور قرآن پیش کیا جو عظیم الشان معجزہ ہے اور
یہودیوں نے آپ کو یقینی طور پر بغیر کسی شبہ کے پہچان بھی لیا جیسے اپنی اولاد کو پہچانتے ہیں، تو توریت کی آیات سے صاف نکل
گئے اور رسول اللہ ﷺ کی نبوت کا انکار کر دیا اور زبان لٹکائے ہوئے کتے کی طرح ذلیل ہو گئے توریت کی تعلیمات اور نصیحتوں
نے ان کو کوئی فائدہ نہیں پہنچایا۔
تمثیل مذکور کے حکم میں عام طور پر وہ تمام لوگ داخل ہیں جو آیات الٰہیہ کی تکذیب کرتے ہیں۔
فاقصص القصص یعنی یہودیوں کے سامنے آپ وہی حال بیان کیجئے جو اوپر ذکر کر دیا گیا تاکہ وہ سوچیں اور غور کر کے
نصیحت پذیر ہو جائیں اور شخص مذکور کی بد انجامی سے عبرت اندوز ہو کر اس کی رفتار پر نہ چلیں۔ بعض علماء کا قول ہے کہ تمثیل

مذکور میں کفار مکہ مراد ہیں ان کو پہلے آرزو تھی کہ کوئی ہادی ہوتا جو ان کو سیدھا راستہ دکھاتا اور کوئی داعی اللہ کی طرف آنے کی دعوت دیتا لیکن جب رسول اللہ ﷺ مبعوث ہو گئے تو باوجودیکہ کافروں کو آپ کی صداقت میں پہلے بھی شک نہ تھا لیکن رسالت کے دعوے کی تکذیب کرنے لگے اور ہدایت یاب نہ ہوئے دعوت دینا نہ دینا دونوں ان کے لئے یکساں ہو گیا۔

وَاَنْفُسَهُمْ كَانُوْا اس کا عطف كَذَّبُوْا پر ہے یا سابق کلام سے یہ بالکل جدا ہے (اور تقدیم مفعول حصر کے لئے ہے) مطلب اس طرح ہو گا وہ نہیں ظلم کرتے ہیں مگر اپنے ہی اوپر وبال تکذیب انہیں پر پڑے گا۔

فَهُوَ الْمُهْتَدِيْ چونکہ مَنْ کا لفظ مذکر تھا اس رعایت سے مذکر غائب کی ضمیر ذکر کی لیکن مَنْ يُّضْلِلْ معنی کے اعتبار سے جمع ہے اس لئے اُولٰٓئِكَ هُمُ الْخٰسِرُوْنَ بصیغہ جمع فرمایا چونکہ تمام ہدایت پانے والوں کا طریقہ ایک ہی ہے۔ (توحید نبوت اور قیامت کا اقرار اور ایمان بالقدر وغیرہ) اس لئے فَهُوَ الْمُهْتَدِيْ فرمایا گویا اس بات پر تنبیہ کی کہ جتنے ہدایت پانے والے افراد ہیں وہ ایک شخص کی طرح ہیں اور چونکہ گمراہی کے راستے جداجدا متعدد ہیں اس لئے الْخٰسِرُوْنَ بصیغہ جمع فرمایا۔

آیات میں صراحت ہے کہ ہدایت ہو یا گمراہی دونوں اللہ کی طرف سے ہوتی ہیں اور اللہ کی ہدایت کرنے کا معنی ہے ہدایت یاب بنا دینا، خالی راہ ہدایت بتا دینا اور بیان کرنا نہیں ہے جس کو اللہ ہدایت کرتا ہے وہ کامیاب ہو جاتا ہے۔ معتزلہ کے نزدیک ہدایت الٰہی کا معنی ہے بتا دینا بیان کر دینا۔ مگر آیات کی صراحت اس کے خلاف ہے۔

فَهُوَ الْمُهْتَدِيْ کا لفظ اس امر کو بھی بتا رہا ہے کہ ہدایت یاب ہو جانا ہی اور حقیقت بہت بڑا کمال اور عظیم الشان نفع ہے کیونکہ اس سے آئندہ عظیم الشان نعمتوں کا حصول لازمی ہے، پس آئندہ زندگی کی کامرانی اور کامیابی کا ذکر کرنے کے بجائے اتنا ہی کہہ دینا کافی ہے کہ جس کو اللہ ہدایت کرتا ہے وہ ہی ہدایت یاب ہوتا ہے۔

مقام جابیہ میں حضرت عمر بن خطابؓ نے ایک روز خطبہ دیا اور حمد و ثنا کے بعد فرمایا مَنْ يَّهْدِهِ اللّٰهُ فَلَا مُضِلَّ لَهٗ وَمَنْ يُّضْلِلْهُ فَلَا هَادِيَ لَهٗ کوئی عیسائی یا یہودی یا مجوسی آدمی کوئی عالم سامنے بیٹھا تھا اس نے آخری لفظ سن کر فارسی زبان میں کچھ کہا حضرت عمرؓ نے مترجم سے پوچھا یہ کیا کہتا ہے مترجم نے کہا یہ کہہ رہا ہے کہ خدا کسی کو گمراہ نہیں کرتا۔ حضرت عمرؓ نے فرمایا اے دشمن خدا تو جھوٹا ہے۔ اللہ ہی نے تجھے پیدا کیا اور تجھے گمراہ کر دیا اور وہی انشاء اللہ تجھے دوزخ میں داخل کرے گا۔ اگر ہمارا معاہدہ نہ ہوتا تو میں تیری گردن مار دیتا۔ اس بیان کے بعد لوگ اٹھ گئے اور تقدیر کی بابت کسی کو اختلاف نہ رہا۔

وَلَقَدْ ذَرَاْنَا لِجَهَنَّمَ كَثِيْرًا مِّنَ الْجِنِّ وَالْاِنْسِ ۖ لَهُمْ قُلُوْبٌ لَّا يَفْقَهُوْنَ بِهَا ۡ وَلَهُمْ اَعْيُنٌ لَّا يُبْصِرُوْنَ بِهَا ۡ وَلَهُمْ اٰذَانٌ لَّا يَسْمَعُوْنَ بِهَا ؕ اُولٰٓئِكَ كَالْاَنْعَامِ بَلْ هُمْ اَضَلُّ ؕ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْغٰفِلُوْنَ ۝

(ہم نے بلاشبہ جہنم کے لئے ایسے بہت سے جنات اور انسان پیدا کئے ہیں جن کے پاس دل ہیں مگر وہ ان سے سمجھتے نہیں وہ چوپاؤں کی طرح ہیں۔ بلکہ چوپاؤں سے بھی زیادہ بے راہ ہیں۔ ایسے سب لوگ غافل ہیں) حقیقت اور انجام سے بے خبر۔

ذَرَاْنَا ہم نے پیدا کئے۔ كَثِيْرًا بکثرت جنات و انسان۔ یعنی وہ لوگ جن کا پیدائش کے بعد کفر پر جما رہنا اللہ کو پہلے سے ہی معلوم ہے۔

حضرت عائشہؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اللہ نے جنت پیدا کی اور اس کے مستحق بھی پیدا کر دیئے جب کہ وہ اپنے باپوں کی پشت میں ہی تھے یعنی حضرت آدمؑ کی پشت میں اور جہنم کو پیدا کر دیا اور اس کے مستحق بھی پیدا کر دیئے جبکہ وہ اپنے باپوں کی پشت میں تھے (یعنی دنیا میں آئے بھی نہ تھے) رواہ مسلم۔ اسی مضمون کی حدیث اوپر گزر گئی جس میں حضرت آدم کی پشت سے سب کا برآمد ہونا بیان کیا گیا ہے۔ حضرت عبداللہ بن عمرو بن عاصؓ راوی ہیں کہ ایک روز رسول اللہ ﷺ دو تحریریں دونوں ہاتھوں میں لئے ہوئے برآمد ہوئے اور فرمایا جانتے ہو یہ دو تحریریں کیسی ہیں، ہم نے عرض کیا اے اللہ کے رسول ﷺ ہم کو کچھ نہیں معلوم البتہ آپ بیان فرما دیں تو معلوم ہو جائے گا، حضور ﷺ نے داہنی ہاتھ والی تحریر کی طرف

اشارہ کر کے فرمایا یہ رب العالمین کی طرف سے تحریر ہے اس میں جنتیوں کے نام ان کے باپ اور قبائل کے نام درج ہیں اور آخر میں جمع کو ختم کر دیا گیا ہے، آئندہ کبھی اس میں کمی ہو گی نہ بیشی، پھر بائیں ہاتھ والی تحریر کی طرف اشارہ کر کے فرمایا یہ رب العالمین کی طرف سے تحریر ہے اس میں تمام دوزخیوں کے اور ان کے باپوں کے اور قبائل کے نام درج ہیں اور آخر میں اس کو ختم کر دیا گیا ہے، آئندہ کبھی اس میں اضافہ ہو گا نہ کمی۔ صحابہؓ نے عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ پھر عمل کس غرض سے ہے جب کہ یہ اہل جنت و اہل جہنم کا معاملہ ختم ہو چکا، فرمایا سیدھی چال چلتے رہو۔ جنتی کا خاتمہ اہل جنت کے عمل پر ہو گا خواہ اس نے (زندگی میں) کوئی عمل کیا ہو اور دوزخی کا خاتمہ دوزخیوں کے عمل پر ہو گا خواہ اس نے (زندگی میں) کیسا ہی عمل کیا ہو۔ پھر حضور ﷺ نے دونوں ہاتھوں سے اشارہ کیا اور دونوں تحریروں کو گویا پھینک دیا، پھر فرمایا تمہارا رب بندوں کے فیصلہ سے فارغ ہو گیا، ایک گروہ جنت میں اور ایک گروہ دوزخ میں کر دیا گیا۔ رواہ الترمذی۔

ایک شبہ

آیت وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْإِنْسَ إِلَّا لِيَعْبُدُونِ میں اور اس آیت میں تضاد ہے (اس جگہ کی آیت بتا رہی ہے کہ اللہ نے کچھ لوگوں کو گمراہ کر دیا ہے کفر و معصیت کے لئے ہی ان کو پیدا کیا ہے جن کو کوئی ہدایت یاب نہیں کر سکتا اور آیت وَمَا خَلَقْتُ بتا رہی ہے کہ انسان کی تخلیق عبادت اور معرفت کے لئے ہوئی ہے، ہر انسان کو معرفت اور عبادت کے لئے پیدا کیا گیا ہے) دونوں میں موافقت کیسے ہو سکتی ہے۔

جواب

تخلیق کے ارادہ کے وقت اس بات کا کوئی لحاظ نہیں کہ اللہ کا علم بندہ کے متعلق کیا ہے اور وہ بندہ کو جنتی جانتا ہے یا دوزخی (یعنی واقع میں بندہ دوزخی ہے یا جنتی اس کا علم تو اللہ کو ہے) تخلیق کا تقاضا اور مصلحت تو یہی ہے کہ ہر شخص عبادت گزار اور صاحب معرفت ہو، رہی یہ بات کہ بہت انسانوں اور جنوں کو دوزخ کے لئے پیدا کیا ہے تو اس کا مقصد یہ نہیں ہے کہ (ان کی تخلیق کی غرض یہ ہے کہ وہ جہنمی ہوں بلکہ مقصد یہ ہے کہ) اللہ پہلے سے واقف ہے کہ وہ کفر اختیار کریں گے اور اس طرح اللہ کی بات پوری ہو کر رہے گی کہ لَأَمْلَأَنَّ جَهَنَّمَ مِنَ الْجِنَّةِ وَالنَّاسِ أَجْمَعِينَ۔

بعض علماء تفسیر نے یہ جواب دیا ہے کہ آیت وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْإِنْسَ إِلَّا لِيَعْبُدُونِ اگرچہ عام ہے لیکن اس سے مراد خاص ہے یعنی صرف وہی لوگ معرفت و عبادت کے لئے پیدا کئے گئے ہیں جن کے متعلق اللہ جانتا تھا کہ یہ ایماندار اور اطاعت گزار ہوں گے، یہ جواب بے دلیل اور غلط ہے۔ معتزلہ کہتے ہیں کہ لِجَهَنَّمَ میں لام عاقبت کا ہے یعنی کثیر مخلوق کی پیدائش کا نتیجہ جہنمی ہونا ہے اور جس کی پیدائش کا نتیجہ جہنمی ہونا ہے وہ گویا جہنم ہی کے لئے پیدا ہی کیا گیا ہے۔ معتزلہ نے یہ تاویل اس لئے اختیار کی کہ وہ گناہوں کو اللہ کی مشیت و ارادہ کے تحت نہیں مانتے مگر یہ تاویل ظاہر کلام کے خلاف ہے۔

لَا يَفْقَهُونَ بِهَا یعنی حق کی شناخت کرنے اور دلائل پر غور کرنے کی ان میں استعداد و صلاحیت ہی نہیں رہی ہے۔ لَا يُبْصِرُونَ بِهَا یعنی آنکھیں تو ہیں مگر دلائل کو عبرت اندوز نظر سے نہیں دیکھتے۔ لَا يَسْمَعُونَ بِهَا یعنی ان کے کان تو ہیں مگر آیات و مواعظ کو گوش قبول سے نہیں سنتے۔ أُولَٰئِكَ كَالْأَنْعَامِ یعنی کھانے پینے، جماع کرنے اور اسباب عیش میں مشغول رہنے کے لئے ہی ان کی ساری قوتیں اور احساسات وقف ہیں۔ وہ بے سمجھی میں اور عبرت اندوز نظر نہ رکھنے میں اور گوش قبول و عقل کے فقدان میں چوپایوں کی طرح ہیں۔ بَلْ هُمْ أَضَلُّ بلکہ وہ جانوروں سے بھی زیادہ گم کردہ راہ ہیں۔ جانوروں میں تو کسی قدر ضرر رساں اور فائدہ بخش چیزوں میں تمیز کرنے کی صلاحیت ہے اور وہ منافع کو حاصل کرنے اور مضرات کو دفع کرنے کی اپنی انتہائی کوشش کرتے ہیں لیکن کافروں میں کچھ لوگ تو ایسے ہیں جو محض عناد کی وجہ سے دوامی دوزخ کی طرف دوڑے جاتے ہیں

پاتے ہیں کہ جانتے ہیں کہ یہ راستہ سچی بات کا ہے۔ اللہ نے انہی کے متعلق فرمایا ہے یَعْرِفُوْنَهٗ كَمَا يَعْرِفُوْنَ اَبْنَآءَهُمْ وَجَحَدُوْا بِهَا وَاسْتَيْقَنَتْهَآ اَنْفُسُهُمْ ظُلْمًا وَّعُلُوًّا اور بغض کافر ایسے ہیں کہ فطری دانش و شعور کو ضائع کر دیتے ہیں، تقاضائے عقل کا مقابلہ وہم سے کرتے ہیں یہ دونوں گروہ مکلف ہیں، مامور ہیں اور جانور نہ مکلف ہیں نہ مامور، فطری مجبور ہیں اس لئے کافر زیادہ گمراہ ہیں: قابل مواخذہ ہیں اور جانور گمراہ ہیں، معذور و مجبور۔

اُولٰٓئِكَ هُمُ الْغٰفِلُوْنَ یعنی کامل طور پر یہی غافل ہیں کوئی دوسرا ان کی غفلت کا ماثل نہیں ہے۔ اس آیت (در حصر) سے معلوم ہو رہا ہے کہ جانوروں کو بلکہ جمادات کو بھی اپنے خالق کا کسی قدر شعور ہے، وہ کامل طور پر اپنے رب سے غافل نہیں ہیں۔ اسی کی تائید دوسری آیات سے بھی ہو رہی ہے فرمایا ہے وَاِنْ مِّنْ شَیْءٍ اِلَّا یُسَبِّحُ بِحَمْدِهٖ۔ دوسری آیت ہے اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ يَسْجُدُ لَهٗ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَمَنْ فِي الْاَرْضِ وَالشَّمْسُ وَالْقَمَرُ وَالنُّجُوْمُ وَالْجِبَالُ وَالشَّجَرُ وَالدَّوَآبُّ وَكَثِيْرٌ مِّنَ النَّاسِ ؕ وَكَثِيْرٌ حَقَّ عَلَيْهِ الْعَذَابُ۔

مقاتل کی روایت ہے کہ ایک شخص نے اللہ کا نام لے کر بھی نماز میں دعا کی اور رحمٰن کا لفظ کہہ کر بھی۔ اس پر کافر کہنے لگے ان مسلمانوں کا یہ دعویٰ ہے کہ ہم ایک ہی رب کی عبادت کرتے ہیں پھر اس شخص کو کیا ہو گیا کہ دو کو پکار رہا ہے۔ اس پر آیت ذیل نازل ہوئی۔

وَلِلّٰهِ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰى فَادْعُوْهُ بِهَا ۪ وَذَرُوا الَّذِيْنَ يُلْحِدُوْنَ فِيْٓ اَسْمَآئِهٖ ؕ سَيُجْزَوْنَ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ۝

(اور اچھے اچھے نام اللہ ہی کے ہیں سو ان ناموں سے اللہ کو پکارا کرو اور ایسے لوگوں سے تعلق بھی نہ رکھو جو اس کے ناموں میں کج روی کرتے ہیں ان لوگوں کو ان کے کئے کی سزا ملے گی)۔

یعنی جن ناموں کے معنی تمام معانی سے اچھے ہیں وہ اللہ ہی کے نام ہیں۔ ان سے مراد وہ الفاظ ہیں جو صرف صفات پر ہی دلالت نہیں کرتے بلکہ اس ذات کو بتاتے ہیں جو صفات کی حامل ہے دونوں میں بڑا فرق ہے (دوسری زبانوں کے اندر جو اللہ کے نام ہیں وہ محض صفات پر دلالت کرتے ہیں جیسے "پرماتما" یعنی روح کائنات، واجب الوجود، صانع عالم، بھگوان وغیرہ) فَادْعُوْهُ بِهَا پس انہی ناموں سے اس کو پکارا کرو۔

صحیحین میں حضرت ابوہریرہؓ کی روایت آئی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اللہ کے ننانوے یعنی ایک کم سو نام ہیں جو ان کو یاد کرے گا جنت میں داخل ہوگا۔ دوسری روایت میں آیا ہے اللہ وتر ہے طاق کو پسند کرتا ہے۔ شیخین نے اس حدیث میں ننانوے ناموں کی تفصیل ذکر نہیں کی کیونکہ شیخین کی شرط کے موافق تفصیل مروی نہیں۔ ترمذی نے اور بیہقی نے الدعوات میں حضرت ابوہریرہؓ کی روایت سے ذکر کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اللہ کے ننانوے نام ہیں جو ان کو یاد کرے گا جنت میں جائے گا۔ هو الله الذی لا اله الا هو الرحمن الرحیم الملک القدوس السلام المؤمن المهیمن العزیز الجبار المتکبر الخالق البارئ المصور الغفار الوهاب الرزاق الفتاح العلیم القابض الباسط الخافض الرافع المعز المذل السمیع البصیر الحکم العدل اللطیف الخبیر الحلیم العظیم الغفور الشکور العلی الکبیر الحفیظ المقیت الحسیب الجلیل الکریم الرقیب المجیب الواسع الحکیم الودود المجید الباعث الشهید الحق الوکیل القوی المتین الولی الحمید المحصی المبدی المعید المحی الممیت الحی القیوم الواجد الماجد الصمد الواحد القادر المقتدر المقدم المؤخر الاول الاخر الظاهر الباطن الوالی المتعالی البر التواب المنتقم العفو الرؤف مالک الملک ذوالجلال والاکرام الجامع الغنی المغنی المانع الضار النافع النور الهادی البدیع الباقی الوارث الرشید الصبور۔

خوب سمجھ لو کہ اللہ کے اسماء کا حصر انہی مذکورہ بالا اسماء میں نہیں ہے (دوسرے نام بھی ہیں) حدیث مذکور میں جن اسماء کا ذکر ہے ان سے مراد شاید یہ ہے کہ جو ان کو یاد کرے گا وہ جنت میں جائے گا، اسی لئے رسول اللہ ﷺ نے ان سب کو ایک لڑی

میں پرودیا ہے (تاکہ لوگ یاد کر لیں)۔

ترمذی کی روایت مذکورہ میں جن اسماء کا ذکر ہے ان میں سے ستائیس ایسے ہیں جو لفظاً صراحتاً قرآن مجید میں نہیں آئے القابض الباسط الخافض الرافع المعز المذل العدل الجلیل الباعث المحصی المبدی المعید المحی الممیت الواجد الماجد المقدم المؤخر الوالی ذوالجلال والاکرام (ذی الجلال والاکرام آیا ہے) المقسط المغنی المانع الضار النافع الباقی الرشید الصبور۔

مندرجۂ ذیل توصیفی اسماء حسب ذیل آیات میں آئے ہیں مگر ترمذی کی روایت میں نہیں آئے۔

ھو خیر و ابقٰی اِلٰہ شاکر رب العالمین احد مالک یوم الدین الاعلی الاکرم خفی اعلم بمن ضل عن سبیلہ واعلم بالمھتدین القریب النصیر القدیر المبین الخلاق مبتلیکم الموسع الملیک الکافی فاطر السموات والارض القائم بالقسط غافر الذنب قابل التوب شدید العقاب نعم المولی الغالب علی امرہ سریع الحساب فالق الحب والنوی فالق الاصباح جاعل اللیل سکنا علام الغیوب عالم الغیب والشہادۃ ذو الطول ذو انتقام رفیع الدرجات ذو العرش ذو المعارج ذو الفضل العظیم ذو القوۃ ذو المغفرۃ جامع الناس لیوم لا ریب فیہ متم نعمتہ متم نورہ عدو للکافرین ولی المؤمنین القاھر فوق عبادہ اسرع الحاسبین مخرج الخبء من الحی محی الموتی ارحم الراحمین احکم الحاکمین خیر الرازقین خیر الشاکرین خیر الفاتحین مخزی الکافرین موھن کید الکافرین فعال لما یرید المستعان نور السموات والارض اھل التقوی اھل المغفرۃ نعم الماھدون رب الناس ملک الناس الٰہ الناس اقرب الیہ من حبل الورید القائم علی کل نفس بما کسبت احق ان تخشاہ الذی ھو اغنی واقنی والذی ھو امات واحیی والذی ھو اضحک وابکی والذی خلق الزوجین الذکر والانثی والذی اھلک عاد الاولی الذی لم یکن لہ ولد لم یلد ولم یولد ولم یکن لہ کفوا احد ولم یکن لہ شریک فی الملک ولم یکن لہ ولی من الذل الذی انزل علی عبدہ الکتاب الذی بیدہ ملکوت کل شیء الذی یبسط الرزق لمن یشاء ویقدر الذی یبدؤ الخلق ثم یعیدہ الذی بیدہ الملک الذی بعث فی الامیین رسولا لا الٰہ الا انت سبحانک انی کنت من الظالمین۔ اس آیت کو حدیث میں اللہ کا اسم اعظم فرمایا گیا ہے اس کے علاوہ قرآن مجید میں اللہ کی صفات اور بھی بیان کی گئی ہیں۔

بعض نام ایسے بھی دوسری احادیث میں آئے ہیں جو نہ قرآن مجید میں مذکور ہیں نہ ترمذی کی روایت مذکورہ میں مثلاً الحنان المنان المعبود الاحد الفرد الوتر الصادق الجمیل المحسن الستار الوافی العادل المعطی المغیث الطبیب الطاھر المبارک خالق الشمس والقمر المنیر ذی الطول المعز جابر عظم الکسیر کبیر کل کبیر الذی نفسی بیدہ وغیرہ وغیرہ۔ یہ بھی ضروری نہیں کہ اللہ کے جتنے نام قرآن مجید اور احادیث میں آئے ہیں بس یہی اللہ کے نام ہیں ان کے علاوہ اور کوئی نام اللہ کا نہیں ہے کیونکہ روایت میں آیا ہے کہ اللہ نے توریت میں اپنے ایک ہزار نام نازل فرمائے تھے۔ رسول اللہ ﷺ بھی دعا کیا کرتے تھے اَللّٰہُمَّ اِنِّیْ اَسْئَلُکَ بِکُلِّ اسْمٍ ھُوَ لَکَ سَمَّیْتَ بِہٖ نَفْسَکَ اَوْ اَنْزَلْتَہٗ فِیْ کِتَابِکَ اَوْ عَلَّمْتَہٗ اَحَدًا مِّنْ خَلْقِکَ اَوِ اسْتَأْثَرْتَ بِہٖ فِیْ عِلْمِ الْغَیْبِ عِنْدَکَ۔ اے اللہ میں تجھ سے دعا کرتا ہوں تیرے ہر نام کے ساتھ جو تو نے اپنی ذات کا مقرر کیا ہے اور اس کو کتاب میں نازل کر دیا ہے یا اپنی مخلوق میں سے کسی کو سکھایا ہے یا اپنے علم غیب میں تو نے خاص طور پر رکھ چھوڑا ہے۔ لہٰذا ضروری ہے کہ اللہ کے تمام ناموں پر جو اللہ کو معلوم ہیں اجمالی ایمان رکھا جائے۔

وَذَرُوا الَّذِیْنَ یُلْحِدُوْنَ فِیْٓ اَسْمَآئِہٖ۔ الحاد (مزید) اور لحد (مجرد) دونوں کا لغوی معنی ہے سیدھے راستہ سے

مڑ جانا، کج راہ ہو جانا۔ یعقوب بن سکیت کا قول ہے کہ الحاد کا معنی ہے حق سے مڑ جانا اور جو چیز حق نہیں ہے اس کو حق کی فہرست میں شامل کر دینا اَلْحَدَ فِي الدِّيْنِ اور لَحَدَ فِي الدِّيْنِ دونوں طرح بولا جاتا ہے۔

آیت میں مشرک مراد ہیں جنہوں نے اللہ کے ناموں کو اصلی مصداق سے موڑ کر بتوں کو ان ناموں سے موسوم کر دیا پھر ان میں کمی بیشی بھی کر لی۔ اَللّٰہُ سے اللات، اَلْعَزِیْزُ سے العزیٰ اور منّان سے منات بنا لیا۔ حضرت ابن عباسؓ و مجاہد نے بھی یہی تفسیر فرمائی۔

بعض علماء نے کہا الحاد فی الاسماء سے مراد یہ ہے کہ مشرکوں نے بتوں کا نام اِلٰہ رکھ دیا۔ ایک روایت میں آیا ہے کہ حضرت ابن عباسؓ نے یُلْحِدُوْنَ فِيْٓ اَسْمَآئِهٖ کی تشریح میں فرمایا یُكَذِّبُوْنَ۔ اہل معنی کہتے ہیں کہ اللہ کے ناموں میں الحاد کا یہ مطلب ہے کہ اللہ کے وہ نام رکھ چھوڑے ہیں جو اللہ نے اپنے لئے نہیں اختیار کئے، نہ اللہ کی کتاب میں آئے، نہ رسول اللہ ﷺ کی حدیث میں۔ خلاصہ یہ کہ اللہ کے نام صرف توقیفی (تنزیلی) ہیں اللہ کا نام جواد ہے سخی نہیں، عالم ہے عاقل نہیں، رحیم ہے رفیق نہیں۔ اللہ نے فرمایا ہے یُخٰدِعُوْنَ اللّٰهَ وَهُوَ خَادِعُهُمْ۔ دوسری آیت ہے وَمَكَرُوْا وَمَكَرَ اللّٰهُ وَاللّٰهُ خَيْرُ الْمٰكِرِيْنَ۔ لیکن اللہ کو خادع اور ماکر یا مکّار نہیں کہا جا سکتا یا قَآئِمًۢا بِالْقِسْطِ کہا جا سکتا ہے قائم نہیں کہا جا سکتا یا خالق کہا جا سکتا ہے۔ خَالِقُ الْقِرَدَةِ وَالْخَنَازِيْرِ (بندروں اور سوروں کے خالق) کے نام سے موسوم نہیں کیا جا سکتا۔ زید اگرچہ تمام بادشاہوں سے بڑا بادشاہ ہو مگر اللہ کو کبیر من زید نہیں کہا جا سکتا (مطلب یہ کہ کسی صفت کے موجود ہونے کی بنا پر اللہ کا وصفی نام از خود نہیں بنایا جا سکتا) بلکہ اللہ کو انہی ناموں سے پکارا جائے گا جو بطور تعظیم قرآن یا حدیث میں آگئے ہیں (یعنی اللہ نے اظہار عظمت کے نشان کے طور پر جن کو نازل کیا ہے۔ جہاں صرف تقابلی صورت میں آئے ہیں اظہار عظمت کے لئے نہیں آئے جیسے هُوَ خَادِعُهُمْ یا مَكَرَ اللّٰهُ تو ایسے ناموں سے بھی اللہ کو نہیں پکارا جا سکتا) توریت میں ذکر کئے ہوئے نام بھی لینا درست نہیں کیونکہ یہودیوں کی معرفت جو نام آئے ہیں ان کا اعتبار نہیں کیا جا سکتا۔ ہاں علماء یہود میں سے جو لوگ مسلمان ہوگئے اور دل سے مسلمان ہوگئے ان کی روایت سے توریت میں ذکر کئے ہوئے ناموں کے لینے میں کوئی حرج نہیں ہے۔

حضرت عمرؓ، حضرت ابن عباسؓ، حضرت ابوہریرہؓ اور بعض دوسرے صحابی حضرت عبداللہ بن سلامؓ اور بعض دوسرے مسلمان علماء یہود سے توریت کی اطلاعات دریافت کرتے تھے اور کوئی اس کی مخالفت نہیں کرتا تھا۔ اس صورت میں آیت کا معنی یہ ہوگا کہ جو لوگ اللہ کے ناموں کے متعلق کجروی اختیار کرتے ہیں۔ شریعت نے اللہ کا جو نام نہیں بتایا وہ نام اللہ کا رکھتے ہیں ان کو چھوڑ دو یا یہ مطلب ہے کہ اللہ نے جو نام اپنا مقرر کیا ہے اور مشرک اس نام کو نہیں مانتے تو تم ان مشرکوں کی پرواہ نہ کرو جیسے اللہ نے اپنا نام رحمٰن فرمایا تو مشرک کہنے لگے ہم تو رحمٰن یمامہ کے علاوہ کسی اور رحمٰن سے واقف نہیں (یعنی اللہ کا نام رحمٰن نہیں ہے) یا یہ مطلب ہے کہ اگر مشرک اللہ کے ناموں کا اطلاق بتوں پر کرتے ہیں اور اس کے ناموں سے (مونث کے) صیغے مشتق کرتے ہیں تو ان کو کرنے دو تم ان کی موافقت نہ کرو۔ یا یہ مطلب ہے کہ تم ان سے اعراض کرو اللہ خود ان کو سزا دے گا۔ ان کے کئے کی سزا ان کو دی جائے گی۔

وَمِمَّنْ خَلَقْنَآ اُمَّةٌ يَّهْدُوْنَ بِالْحَقِّ وَبِهٖ يَعْدِلُوْنَ ﴿۱۸۱﴾ وَالَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا سَنَسْتَدْرِجُهُمْ مِّنْ حَيْثُ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴿۱۸۲﴾ (اور ہماری مخلوق میں ایک گروہ ایسا بھی ہے جو حق (یعنی اسلام) کے مطابق ہدایت کرتا ہے اور حق ہی کے موافق عدل کرتا ہے اور جو لوگ ہماری آیتوں کو جھٹلاتے ہیں ہم ان کو (جہنم کی طرف) آہستہ آہستہ لئے جا رہے ہیں اس طور پر کہ ان کو خبر بھی نہیں اور ان کو مہلت دیتا ہوں، بے شک میری پوشیدہ تدبیر بڑی مضبوط ہے)۔

وَمِمَّنْ خَلَقْنَآ اُمَّةٌ بغوی نے لکھا ہے کہ عطاء نے حضرت ابن عباسؓ کا قول نقل کیا ہے کہ آیت میں امت سے مہاجرین و انصار اور وہ لوگ جو ان کے پیرو ہیں مراد ہیں۔ قتادہ نے کہا ہم کو اطلاع ملی ہے کہ رسول اللہ ﷺ اس آیت کو پڑھ کر

فرمایا یہ تمہارے لئے ہے اور موسیٰ کی قوم (کی طرح) اس امت کو بھی دی گئی تھی جو تمہارے سامنے موجود ہے (یعنی یہودی، یہودیوں کے متعلق آیا تھا) وَمِنْ قَوْمِ مُوْسٰىٓ اُمَّةٌ يَّهْدُوْنَ بِالْحَقِّ وَبِهٖ يَعْدِلُوْنَ۔ کلبی نے کہا (کوئی خاص امت مراد نہیں ہے بلکہ آیت عام ہے) تمام قوموں میں ایسا گروہ موجود ہے۔ بہرحال (آیت میں خاص امت مراد لی جائے یا عام) اللہ نے پہلے ذکر کیا کہ ایک گروہ کو دوزخ کے لئے پیدا کیا گیا ہے جو غافل اور حق سے اعراض کرنے والے ہیں پھر (اس آیت میں) ذکر کیا کہ ایک گروہ کو جنت کے لئے پیدا کیا ہے جو حق کے موافق ہدایت کرتا اور عدل کرتا ہے۔

بعض لوگوں نے اس آیت سے استدلال کیا ہے کہ ہر زمانہ میں مجتہد اور ہادی کا وجود (ایک حکم قرآنی ضروری الوجود) ہے اور اس آیت سے وہ حدیث تعلق رکھتی ہے جس میں حضور ﷺ نے فرمایا ہے کہ میری امت میں برابر ایک گروہ پیدا ہوتا رہے گا جو اللہ کے امر کو پورے طور پر ادا کرتا رہے گا، ان کی مدد نہ کرنے والے اور ان کی مخالفت کرنے والے ان کو کوئی ضرر نہ پہنچا سکیں گے یہاں تک کہ اسی حالت میں قیامت آجائے گی۔ متفق علیہ من حدیث معاویۃ بن ابی سفیان و مغیرہ بن شعبہ۔ مگر یہ استدلال غلط ہے اور حدیث مذکور کو بھی اس آیت سے کوئی تعلق نہیں کیونکہ اس آیت میں یہ نہیں فرمایا کہ ہر زمانہ میں ایک گروہ ایسا ضرور ہوگا۔

وَالَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا اس سے مراد مکہ کے کافر ہیں۔ سَنَسْتَدْرِجُهُمْ ہم آہستہ آہستہ ان کو ہلاکت کے قریب لئے جا رہے ہیں۔ استدراج کا لغوی معنی ہے آہستہ آہستہ چڑھانا یا درجہ بدرجہ اتارنا۔ مِّنْ حَيْثُ لَا يَعْلَمُوْنَ عطاء نے کہا مراد یہ ہے کہ ہم ان کے متعلق ایسی پوشیدہ تدبیر کریں گے کہ ان کو خبر بھی نہ ہوگی۔ کلبی نے کہا ہم ان کے اعمال ان کی نظر میں مرغوب بنا دیں گے پھر ان کو ہلاک کر دیں گے۔ ضحاک نے کہا جس قدر وہ نئے گناہ کریں گے ہم نئی ان کو نعمتیں دیں گے۔ سفیان ثوری نے کہا ہم ان کو پوری پوری نعمت دیں گے اور شکر ادا کرنا فراموش کرا دیں گے۔

وَاُمْلِيْ لَهُمْ اس کا عطف سَنَسْتَدْرِجُهُمْ پر ہے یعنی میں ان کی عمریں طویل کر دوں گا اور ان کے برے اعمال کو ان کی نظر میں مرغوب بنا دوں گا اور ان کو بداعمالی کی سہولت عطا کر دوں گا تاکہ وہ گناہوں میں بڑھتے چلے جائیں اور آخر ہلاک ہو جائیں۔ اِنَّ كَيْدِيْ مَتِيْنٌ میری گرفت سخت ہے۔ گرفت کو کید سے اس لئے تعبیر کیا کہ اللہ کی گرفت بظاہر انعام نظر آتی ہے اور حقیقت میں تباہی آفریں ہے۔ حضرت ابن عباسؓ نے ترجمہ کیا میری پوشیدہ تدبیر سخت ہے۔ بعض روایات میں آیا ہے کہ اس آیت کا نزول ان لوگوں کے حق میں ہوا جو اللہ کا، اللہ کے رسول کا اور اہل ایمان کا مذاق اڑاتے تھے، چنانچہ ایک ہی رات میں اللہ نے سب کو قتل کرا دیا۔ ابن جریر، ابن ابی حاتم اور ابو الشیخ نے قتادہؒ کی روایت سے بیان کیا کہ ایک رات رسول اللہ ﷺ نے کوہ صفا پر چڑھ کر قریش کے ایک ایک قبیلہ اور شاخ کو نام بنام یا بنی فلاں یا بنی فلاں کہہ کر پکارا اور اللہ کے عذاب و حوادث الٰہیہ سے ان کو ڈراتے رہے۔ ایک شخص بولا تمہارا یہ ساتھی یقیناً دیوانہ ہے رات بھر صبح تک چیختا رہا ہے۔ اس پر آیت ذیل نازل ہوئی۔

وَاُمْلِيْ لَهُمْ ۚ اِنَّ كَيْدِيْ مَتِيْنٌ ۝ اَوَلَمْ يَتَفَكَّرُوْا ۜ مَا بِصَاحِبِهِمْ مِّنْ جِنَّةٍ ۭ اِنْ هُوَ اِلَّا نَذِيْرٌ مُّبِيْنٌ ۝ اَوَلَمْ يَنْظُرُوْا فِيْ مَلَكُوْتِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا خَلَقَ اللّٰهُ مِنْ شَيْءٍ ۙ وَّاَنْ عَسٰٓى اَنْ يَّكُوْنَ قَدِ اقْتَرَبَ اَجَلُهُمْ ۚ فَبِاَيِّ حَدِيْثٍۢ بَعْدَهٗ يُؤْمِنُوْنَ ۝ مَنْ يُّضْلِلِ اللّٰهُ فَلَا هَادِيَ لَهٗ ۭ وَيَذَرُهُمْ فِيْ طُغْيَانِهِمْ يَعْمَهُوْنَ ۝

(کیا انہوں نے اس بات پر غور نہیں کیا کہ ان کے ساتھی کو ذرا بھی جنون نہیں ہے وہ تو بس صاف صاف (نافرمانی کے عذاب سے) ڈرانے والا ہے اور کیا انہوں نے آسمانوں کی اور زمین کی اور ان دوسری چیزوں کی حکومت پر جن کو اللہ نے پیدا کیا ہے غور نہیں کیا اور اس بات پر بھی غور نہیں کیا کہ ممکن ہے ان کی اجل قریب ہی آ پہنچی ہو۔ پھر قرآن کے بعد کس بات پر یہ لوگ ایمان لائیں گے، جس کو اللہ گمراہ کر دے اس کو کوئی راہ پر لانے والا نہیں اور اللہ ان کو ان کی گمراہی میں بھٹکتا ہوا چھوڑ دیتا ہے)۔

صَاحِبِهِمْ سے مراد ہیں رسول اللہ ﷺ۔ مِّنْ جِنَّةٍ یعنی جنون۔ مُّبِيْنٌ صاف صاف، کھول کر واضح طور پر ڈرانے والا جس سے کوئی بات پوشیدہ نہ رہے (سب کی سمجھ میں آجائے) اَوَلَمْ يَنْظُرُوْا کیا دلیل آفریں اور استدلال کی نظر سے انہوں نے نہیں دیکھا۔ مَا خَلَقَ اللّٰهُ مِنْ شَيْءٍ یعنی جس پر لفظ شَيْءٍ کا اطلاق ہوتا ہے کوئی چیز ہو۔ شَيْءٍ کے افراد و اجناس ان گنت ہیں اور سب اپنے بنانے والے کی ہمہ گیر قدرت اور توحید پر دلالت کر رہی ہیں۔ ان کو استدلال کی نظر سے کائنات عالم کو دیکھنا چاہیے تاکہ ان پر واضح ہو جائے کہ رسول اللہ ﷺ جس چیز کی ان کو دعوت دے رہے ہیں وہ حق ہے۔

وَاَنْ عَسٰى اس کا عطف مَلَكُوْتِ پر ہے اَنْ مصدری ہے یا مخففہ ہے اور ضمیر شان اس کا اسم ہے اسی طرح اَنْ يَّكُوْنَ میں اَنْ مصدری ہے یا مخففہ دونوں جگہ استفہام انکاری ہے اور تعجب پر دلالت کر رہا ہے۔ کلام کا مطلب اس طرح ہے تعجب ہے یہ لوگ قرآن اور پیغمبر پر ایمان نہیں لائے اور پیغمبر ﷺ کو دیوانہ بنانے لگے اور اس بات پر غور نہیں کیا کہ شاید ان کی اجل قریب آگئی ہو اگر اس پر غور کرتے تو طلب حق کی طرف تیزی سے بڑھتے اور ایسی چیز کی طرف توجہ کرتے جو مرنے سے پہلے ان کی نجات کا باعث ہو جاتی۔

فَبِاَيِّ حَدِيْثٍۭ بَعْدَهٗ يُؤْمِنُوْنَ یعنی جب انہوں نے اس قرآن کو نہیں مانا جو علم و حکمت سے بھرا ہوا ہے اور معجزہ ہے تو اس کے بعد اور کون سی بات کا یقین کریں گے یعنی ممکن ہے ان کی موت قریب ہو پھر قرآن پر ایمان لانے کی طرف کیوں نہیں بڑھتے اور قرآن سے بڑھ کر اور کون سی واضح دلیل چاہتے ہیں قرآن سے بڑھ کر اور کون سی بات ہے جس پر یہ ایمان لانا چاہتے ہیں۔ حقیقت میں ان کی روگردانی کی علت یہ ہے کہ مَنْ يُّضْلِلِ اللّٰهُ فَلَا هَادِيَ لَهٗ جس کو اللہ گمراہ چھوڑ دے اس کو راہ پر لانے والا کوئی نہیں وَيَذَرُهُمْ فِيْ طُغْيَانِهِمْ يَعْمَهُوْنَ۔ يَعْمَهُوْنَ يَذَرُهُمْ کی ضمیر مفعول سے حال ہے۔

ابن جریر نے قتادہ وغیرہ کی روایت سے لکھا ہے کہ قریش نے رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں عرض کیا آپ ہمارے قرابت دار ہیں، ہم کو بطور راز بتا دیجئے کہ قیامت کب آئے گی ابن جریر وغیرہ نے حضرت ابن عباسؓ کا قول نقل کیا ہے کہ حمل بن ابی قشیر اور سموئل بن زید نے رسول اللہ ﷺ سے عرض کیا اگر آپ نبی ہیں جیسا کہ آپ کا دعویٰ ہے تو بتائیے کہ قیامت کب آئے گی ہم بھی تو جان لیں کہ قیامت کیا ہے اس پر آیات ذیل کا نزول ہوا۔

يَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ السَّاعَةِ اَيَّانَ مُرْسٰىهَا ۭ قُلْ اِنَّمَا عِلْمُهَا عِنْدَ رَبِّيْ ۚ لَا يُجَلِّيْهَا لِوَقْتِهَآ اِلَّا هُوَ ۘ ثَقُلَتْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۭ لَا تَاْتِيْكُمْ اِلَّا بَغْتَةً ۭ يَسْـَٔلُوْنَكَ كَاَنَّكَ حَفِيٌّ عَنْهَا ۭ قُلْ اِنَّمَا عِلْمُهَا عِنْدَ اللّٰهِ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ ۝ (یہ لوگ آپ سے قیامت کے متعلق پوچھتے ہیں کہ اس کا وقوع کب ہوگا آپ کہہ دیجئے کہ اس کا (تحقیقی) علم تو میرے رب کے پاس (محفوظ) ہے اس کے وقت پر بس وہی اس کو ظاہر کرے گا وہ آسمان و زمین کا سب سے بھاری حادثہ ہوگا بس وہ تم پر اچانک ہی آپڑے گی وہ آپ سے اس طرح پوچھتے ہیں گویا آپ اس کی تحقیقات کر چکے ہیں۔ آپ کہہ دیجئے کہ اس کا (تحقیقی) علم تو بس اللہ ہی کو ہے لیکن اکثر لوگ نہیں جانتے)۔

اَلسَّاعَةُ قیامت کے اسماء غالبہ میں سے ہے یا تو قیامت کو ساعت کہنے کی وجہ یہ ہے کہ اچانک آجائے گی یا اس وجہ سے کہ قیامت کے دن حساب بہت جلد ہو جائے گا یا اس وجہ سے کہ قیامت کا دن باوجودیکہ بہت لمبا ہوگا مگر اللہ کے نزدیک گھڑی بھر ہوگا۔ اَيَّانَ کب۔ مُرْسٰىهَا مُرْسٰى مصدر میمی ہے اِرْسَاءٌ بھی مصدر ہے یعنی استقرار قیامت کب ہوگا۔ رَسَا الشَّيْءُ کسی چیز کا ثابت اور استقرار پذیر ہونا۔ رَسَا الْجَبَلُ پہاڑ جما ہوا ہے۔ اَرْسَتِ السَّفِيْنَةُ کشتی لنگر انداز ہو گئی رک گئی۔ حضرت ابن عباسؓ نے مُرْسٰىهَا کا لفظی ترجمہ کیا منتہٰی اور قتادہ نے کہا وقوع۔ اِنَّمَا عِلْمُهَا عِنْدَ رَبِّيْ یعنی اللہ نے قیامت کا علم اپنے پاس ہی رکھا ہے اس کے سوا کوئی نہیں جانتا اس نے کسی کو نہیں بتایا نہ کسی مقرب فرشتہ کو واقف کیا نہ کسی نبی مرسل کو۔

لَا يُجَلِّيْهَا یعنی اس کا پردہ نہیں کھولے گا اس کو ظاہر نہیں کرے گا۔ لِوَقْتِهَآ لام بمعنی فی ہے یعنی اس کے وقت پر۔

ثَقُلَتْ یعنی قیامت کا علم ثقیل اور اس کا معاملہ زمین و آسمان کے رہنے والوں سے پوشیدہ ہے۔

ہر پوشیدہ چیز کا حصول ثقیل ہوتا ہے یا یہ مطلب کہا جائے کہ آسمانوں کے ملائکہ اور زمین کے باشندے سب کے پیش نظر قیامت کی حالت کو جاننا ہی ہے ہر ایک کی تمنا ہے کہ قیامت کا علم اس کو حاصل ہو جائے۔ علم قیامت کا مخفی رہنا سب پر بار ہے یا یوں کہا جائے کہ قیامت کی شدتیں اور ہولناکیاں زمین و آسمان میں بھاری ہیں۔ جس نے حکمت کا مطلب یہ بیان کیا کہ ملائکہ اور جن وانس غرض تمام زمین آسمان والوں پر قیامت ثقیل اور عظیم ہے (اسی لئے قیامت کو مخفی رکھا گیا ہے) گویا ثقلت کے لفظ سے قیامت کو مخفی رکھنے کی حکمت کی طرف اشارہ کیا ہے۔

اِلَّا بَغْتَةً مگر اچانک، غفلت کی حالت میں۔ صحیحین میں حضرت ابوہریرہؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا دو شخص (یعنی بائع اور مشتری) اپنے بیچ میں کپڑا پھیلائے ہوں گے اور خریدنے بیچنے نہ پائیں گے کہ قیامت آجائے گی، کوئی آدمی اپنا حوض درست کرتا ہو گا اور اس کا پانی پلانے نہ پائے گا کہ قیامت برپا ہو جائے گی، کوئی آدمی اونٹنی کا دودھ دوہ کر لے کر لوٹ رہا ہو گا اور پینے نہ پائے گا کہ قیامت برپا ہو جائے گی، کوئی شخص لقمہ اٹھا کر منہ میں لے جانا چاہتا ہو گا اور کھانے نہ پائے گا کہ قیامت قائم ہو جائے گی (یعنی قیامت کا وقوع اچانک ہو جائے گا اگرچہ اس کی نشانیاں مدت سے ظاہر ہو رہی ہوں گی)۔

ابن ابی حاتم نے حضرت ابن عمرؓ کی روایت سے بیان کیا ہے صور میں پھونک ماردی جائے گی جبکہ لوگ راستوں، بازاروں اور اپنی اپنی مجلسوں میں ہوں گے یہاں تک کہ بیچنے خریدنے والے آپس میں بھاؤ چکا رہے ہوں گے اور ایک اپنے ہاتھ سے اس چیز کو چھوڑنے نہ پائے گا کہ صور پھونک دیا جائے گا جس کی آواز سے وہ بے ہوش ہو جائے گا۔ حضرت ابن عمرؓ نے فرمایا یہی مطلب ہے آیت مَا يَنْظُرُوْنَ اِلَّا صَيْحَةً وَّاحِدَةً کا، لوگ بازاروں میں خرید فروخت کر رہے ہوں گے، کپڑے ناپ رہے ہوں گے، اونٹنیوں کا دودھ دوہ رہے ہوں گے، اپنے اپنے کاموں میں مشغول ہوں گے کہ قیامت آجائے گی اور کوئی کسی کو وصیت کر سکے گا نہ گھر لوٹ سکے گا۔

عبداللہ بن احمد نے الزہد کی روایت میں حضرت زبیر بن عوام کا بیان نقل کیا ہے کہ قیامت ایسی حالت میں آجائے گی کہ کچھ لوگ کپڑا ناپ رہے ہوں گے کچھ لوگ اونٹنیوں کا دودھ دوہ رہے ہوں گے، پھر آپ نے پڑھا فَلَا يَسْتَطِيْعُوْنَ تَوْصِيَةً وَّلَآ اِلٰٓى اَهْلِهِمْ يَرْجِعُوْنَ۔ طبرانی نے کھری سند سے حضرت عقبہ بن عامرؓ کی روایت سے لکھا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا قیامت سے پہلے ڈھال برابر ایک کالا ابر مغرب کی طرف سے اٹھے گا اور اونچا ہوتا جائے گا پھیلتا جائے گا یہاں تک کہ آسمان کو بھر دے گا پھر ایک (یعنی) منادی ندا دے گا لوگو اَتٰٓى اَمْرُ اللّٰهِ فَلَا تَسْتَعْجِلُوْهُ۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا قسم ہے اس کی جس کے ہاتھ میں میری جان ہے کہ دو آدمی اپنے بیچ میں کپڑا پھیلائے ہوئے ہوں گے اور لپیٹنے نہ پائیں گے (کہ قیامت آجائے گی) کوئی آدمی اپنا حوض درست کر رہا ہو گا اور اس سے پانی پلانے نہ پائے گا (کہ قیامت آجائے گی) اور کوئی آدمی اونٹنی دوہ رہا ہو گا اور دودھ پینے نہ پائے گا کہ قیامت آجائے گی۔

يَسْــَٔلُوْنَكَ كَاَنَّكَ حَفِيٌّ عَنْهَا۔ حَفِيٌّ بروزن فَعِيْلٌ تحقیقات کرنے والا۔ حَفِيَ الشَّيْءَ اس چیز کی پوری تفتیش کی۔ حفیؔ سے اس جگہ مراد ہے عالم ہونا کیونکہ کسی چیز کی پوری تحقیقات اور کامل تفتیش کرنے والا اس سے واقف ہو ہی جاتا ہے اور اس چیز کا پورا پورا علم اس کو حاصل ہو ہی جاتا ہے۔ علمی تحقیقات کے مضمون کو ظاہر کرنے کے لئے یہاں حَفِيٌّ کے بعد عَنْ کا استعمال کیا ہے (ورنہ حَفِيٌّ کا استعمال بغیر عن کے ہوتا ہے) بعض اہل تفسیر نے لکھا ہے کہ عَنْهَا کا تعلق يَسْــَٔلُوْنَكَ سے ہے یعنی وہ لوگ آپ سے قیامت کے متعلق پوچھتے ہیں گویا آپ قیامت کا پورا علم رکھتے ہیں۔ بعض اہل تفسیر کے نزدیک حَفِيٌّ، حَفَاوَةٌ سے مشتق ہے حفاوۃ کا معنی ہے شفقت و مہربانی کیونکہ قریش نے رسول اللہ ﷺ سے کہا تھا ہماری آپ سے قرابت داری ہے، ہمیں آپ بتا دیجئے کہ قیامت کب آئے گی۔ اس صورت میں مطلب یہ ہو گا وہ آپ سے قیامت کے متعلق (خصوصی) سوال اس طرح کرتے ہیں گویا آپ قریش سے اپنی قرابتداری کی وجہ سے خصوصیت کے ساتھ ان کو بتا دیں گے کہ قیامت کب آئے گی۔

حاملہ عورتوں کو حالت حمل میں عام طور پر جو دکھ اور تکلیف کا احساس ہوتا ہے حضرت حوا پر وہ دکھ نہیں پڑا۔ ترجمہ یہ ہے وہ اس کو لئے چلتی پھرتی رہی اٹھنے بیٹھنے میں کوئی دشواری محسوس نہیں کی یا یہ مطلب کہ پیدائش کے وقت تک وہ حمل کو لئے رہی اس نے صحیح سالم حمل کے ساتھ یہ مدت گزار دی نہ اخراج ہوا نہ اسقاط۔ فَلَمَّآ اَثْقَلَتْ یعنی جب بچہ بڑا ہو گیا اور وہ عورت بار دار ہو گئی، بچہ کا بوجھ اس پر پڑنے لگا۔ دَّعَوَا تو آدم و حوا دونوں نے دعا کی۔ صَالِحًا صحیح سالم ہماری طرح۔ لَنَكُوْنَنَّ مِنَ الشّٰكِرِيْنَ تو ہم تیری اس نئی نعمت کے شکر گزار ہوں گے۔

بغوی نے لکھا ہے اہل تفسیر کا بیان ہے کہ جب حوا حاملہ ہو گئیں تو ابلیس مرد کے بھیس میں ان کے پاس آیا اور پوچھا تیرے پیٹ میں کیا ہے حواء نے کہا مجھے نہیں معلوم۔ ابلیس نے کہا مجھے اندیشہ ہے کہیں یہ کوئی چوپایہ یا کتا یا خنزیر نہ ہو اور یہ بھی نہیں معلوم کہ کس طرح باہر آئے گا اگر پیچھے سے برآمد ہوا تو تیری ہلاکت کا سبب ہو جائے گا ممکن ہے منہ سے برآمد ہو یا تیرا پیٹ پھٹ جائے۔ حوا کو ڈر لگنے لگا اور آدم سے اس کا تذکرہ کیا ان کو بھی فکر ہو گئی ابلیس دوبارہ لوٹ کر آیا اور حواء سے کہا میرا اللہ کی بارگاہ میں مرتبہ ہے اگر میں دعا کر دوں کہ بچہ صحیح سالم تیری طرح خدا پیدا کر دے اور اس کا برآمد ہونا بھی سہولت سے ہو تو کیا تو اس کا نام عبدالحارث رکھ دے گی۔ ابلیس کا نام ملائکہ میں حارث تھا۔ حواء نے اس کا ذکر حضرت آدمؑ سے کیا۔ حضرت آدمؑ نے فرمایا شاید یہ وہی شخص ہے جس کو میں پہلے سے جانتا ہوں (یعنی شاید یہ وہی ابلیس ہے) لیکن ابلیس (بصورت مرد) برابر دونوں کے پاس آتا رہا آخر دونوں فریب کھا گئے اور بچہ پیدا ہونے کے بعد اس کا نام عبدالحارث رکھا۔ کلبی کا بیان ہے کہ ابلیس نے حواء سے کہا تھا اگر میں اللہ سے دعا کروں اور تو انسان کا بچہ جنے تو کیا میرے نام پر تو اس کا نام رکھ دے گی حواء اس کے نام سے واقف نہیں ناواقفی کی وجہ سے اقرار کر لیا بچہ پیدا ہو گیا تو ابلیس نے کہا میرے نام پر اس کا نام رکھو۔ حواء نے پوچھا تیرا کیا نام ہے ابلیس نے کہا الحارث۔ حواء جانتی نہ تھیں کہ جس ابلیس کی وجہ سے جنت سے دونوں کو نکالا گیا اس کا نام حارث تھا اس لئے بچہ کا نام عبدالحارث رکھ دیا۔ ایک روایت میں حضرت ابن عباسؓ کا قول آیا ہے کہ حواء کے بطن سے ایک کے بعد ایک متعدد بچے ہوتے رہے حضرت آدمؑ کسی کا نام عبداللہ کسی کا عبیداللہ اور کسی کا عبدالرحمٰن رکھتے رہے لیکن سب مرتے رہے آخر ایک بچہ کا نام عبدالحارث رکھا تو وہ جیتا رہا۔

حضرت سمرہ بن جندب کی روایت سے امام احمد اور ترمذی اور حاکم نے بیان کیا ہے ترمذی کے نزدیک یہ روایت حسن غریب اور حاکم کے نزدیک صحیح ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا۔ حواء کے بچے پیدا ہوتے تھے مگر زندہ نہ رہتے تھے ایک بچہ جو پیدا ہوا تو ابلیس نے ادھر کا چکر کیا اور حواء سے کہا اس کا نام عبدالحارث رکھو۔ حواء نے عبدالحارث نام رکھ دیا اور وہ بچہ زندہ رہا یہ حرکت شیطان کے مشورہ اور وسوسے سے ہوئی۔

بغوی نے لکھا ہے حدیث میں آیا ہے کہ حواء کے پاس ابلیس دوبارہ آیا (اور حواء اس کے بہکاوے میں آ گئیں) ایک بار جنت میں اور ایک بار زمین پر۔ ابن زید کا بیان ہے کہ حضرت آدم کا ایک بچہ پیدا ہوا آپ نے اس کا نام عبداللہ رکھا۔ ابلیس نے آکر پوچھا تم نے بچہ کا کیا نام رکھا؟ حضرت آدم اور حواء نے کہا عبداللہ۔ اس سے پہلے حضرت آدمؑ کا ایک بچہ پیدا ہوا تھا جس کا نام آپ نے عبداللہ رکھا تھا اور وہ مر چکا تھا۔ ابلیس نے کہا کیا تمہارا یہ خیال ہے کہ اللہ بندہ کو تمہارے پاس چھوڑ دے گا ایسا نہیں ہو سکتا خدا کی قسم جس طرح پہلے بچہ کو اس نے لے لیا اس کو بھی لے لے گا۔ میں تم کو ایسا نام بتاتا ہوں کہ اگر وہ تم رکھ دو گے تو جب تک تم زندہ رہو گے وہ بچہ بھی جیتا رہے گا چنانچہ دونوں نے اس کا نام عبدالشمس رکھا۔ بغوی نے لکھا ہے اول روایت زیادہ صحیح ہے۔ مطلب یہ ہے کہ پورا انسان صحیح سالم حَعَلَا لَهٗ شُرَكَآءَ بغوی نے لکھا ہے شُرَكَآءَ جمع کا صیغہ ہے مگر مراد واحد ہے یعنی عبدالحارث نام رکھ کر غیر کو اللہ کا شریک قرار دے دیا۔ لیکن یہ شرک نہ عقیدہ میں تھا نہ عبادت میں کیونکہ حضرت آدمؑ نبی معصوم تھے شرک نہیں کر سکتے تھے بلکہ یہ شرک صرف نام رکھنے میں تھا اس سے آپ کی مراد یہ تھی کہ حارث بچہ کی صحت اور اس کی سلامتی کا سبب ہے کبھی عبد کا اطلاق ایسے شخص پر ہوتا ہے جو مملوک نہ ہو (یعنی بمعنی خادم) جیسے رب کا اطلاق بھی

ایسے (مربی اور سرپرست) شخص پر ہو جاتا ہے جو معبود نہیں ہوتا۔ بعض لوگ اپنے مہمان کی تواضع کرنے کے لئے اپنے آپ کو عبدالضیف کہتے ہیں اس کا یہ مطلب نہیں ہوتا کہ ضیف اس کا معبود ہے اور وہ ضیف کا بندہ۔

بعض لوگ دوسروں سے کہتے ہیں میں آپ کا بندہ ہوں۔ حضرت یوسف نے عزیز مصر کے متعلق کہا تھا اِنَّهٗ رَبِّیْٓ اَحْسَنَ مَثْوَایَ آپ کی مراد اس سے یہ نہ تھی کہ عزیز مصر آپ کا معبود ہے۔ عبدالحارث نام بھی اسی طرح رکھا گیا۔ حسن اور عکرمہ نے کہا جَعَلَا سے مراد ہے جَعَلَ اَوْلَادُهُمَا یعنی آدم اور حوا کی اولاد نے اللہ کے شریک بنا رکھے اس سے مراد مکہ کے کافر اور دوسرے مشرک ہیں، مضاف محذوف ہے، جیسے ان یہودیوں کو جو رسول اللہ ﷺ کے زمانہ میں تھے خطاب کر کے فرمایا ہے ثُمَّ اتَّخَذْتُمُ ... وَاِذْ قَتَلْتُمْ نَفْسًا حالانکہ گوسالہ پرستی اور قتل نفس ان کا فعل نہ تھا بلکہ ان کے اسلاف کا تھا اس مطلب کی تائید لفظ شُرَکَآءَ سے بھی ہو رہی ہے (کیونکہ حضرت آدم و حوا نے عبدالحارث نام رکھا یعنی نام رکھنے میں شرک کیا اگر یہ مطلب ہے تو شرکاء کا لفظ کیوں استعمال کیا، حارث تو واحد ہے اور فعل بھی واحد ہے، ہاں کفار بہت ہیں اور انہوں نے بکثرت شرکاء بھی بنا رکھے ہیں اس لئے جَعَلَا کی اسناد حضرت آدم و حوا کی طرف حقیقی نہیں بلکہ مضاف محذوف ہے یعنی جَعَلَ اَوْلَادُهُمَا۔

فَتَعٰلَى اللّٰهُ عَمَّا يُشْرِكُوْنَ پس اللہ برتر ہے ان چیزوں سے جن کو وہ شریک کرتے ہیں یعنی بتوں سے (اس صورت میں مَا مصدری نہ ہوگا بلکہ موصول ہوگا) البغوی نے لکھا ہے بعض علماء کا خیال ہے کہ یہ کلام ابتدائی ہے (پہلے کلام سے مربوط نہیں ہے) اور مشرکوں سے مراد ہیں کفار مکہ اور اگر پہلے کلام سے اس کو مربوط بھی قرار دیا جائے اور آدم و حوا مراد ہوں تب بھی مطلب صحیح ہو جائے گا (اور شرک سے مراد ہوگا نام رکھنے میں شرک کرنا) کیونکہ حضرت آدم و حوا کے لئے بہتر یہی تھا کہ نام میں بھی شرک نہ کرتے۔ سیوطی نے لکھا ہے کہ اس جملہ کا عطف خَلَقَكُمْ پر ہے اور درمیانی کلام بطور معترضہ ہے۔

بغوی نے لکھا ہے کہ يُشْرِكُوْنَ کی ضمیر یہود و نصاریٰ کی طرف راجع ہے یعنی اللہ نے ان کو اولاد عنایت فرمائی (جو موحد اور مسلم تھی) مگر انہوں نے ان کو یہودی اور عیسائی بنا ڈالا۔ اللہ اس فعل سے بری اور برتر ہے۔ ابن کیسان نے کہا يُشْرِكُوْنَ سے مراد وہ کفار ہیں جو اپنی اولاد کا نام عبدالعزیٰ، عبداللات، عبدالمناۃ اور عبدالشمس رکھتے تھے۔

بغوی نے لکھا ہے کہ عکرمہ اور حسن کے نزدیک آیات کی تفسیر سب سے الگ ہے۔ ان بزرگوں کے نزدیک خَلَقَكُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ سے مراد ہے کہ اس نے تم سب کو ایک شخص سے یعنی ہر ایک کو اس کے باپ سے پیدا کیا پھر اس نفس سے یعنی اسی کی جنس سے اس کا جوڑا بنایا اور دونوں کے نطفہ سے اولاد ہوئی تو وہ شرک کرنے لگے۔ اگرچہ یہ قول حضرت ابن عباس، مجاہد، سعید بن مسیب اور جمہور مفسرین کی تفسیر کے خلاف ہے مگر میرے نزدیک یہی صحیح ترین قول ہے اس کی دلیل حسب ذیل ہے۔

اللہ نے حضرت آدم و حوا کو کھلی شجر کی ممانعت فرمادی تھی جب دونوں نے شجر کو کھالیا تو چند مقامات پر بطور تشنیع اس کا اظہار کیا اور فرمایا وَعَصٰٓى اٰدَمُ رَبَّهٗ فَغَوٰى۔ حضرت آدم کو بھی اپنے اس قصور پر بڑی ندامت ہوئی اور انہوں نے دعا کی رَبَّنَا ظَلَمْنَآ اَنْفُسَنَا وَاِنْ لَّمْ تَغْفِرْ لَنَا وَتَرْحَمْنَا لَنَكُوْنَنَّ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ۔ اللہ نے ان کی توبہ قبول فرمالی اور فرمایا ثُمَّ اجْتَبٰهُ رَبُّهٗ فَتَابَ عَلَيْهِ وَهَدٰى۔ حضرت آدم کو توبہ قبول ہونے کے بعد بھی اپنی اس لغزش پر پشیمانی رہی۔ صحیحین میں آیا ہے۔ حضرت انس کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا قیامت کے دن مومنوں کو روک لیا جائے گا ان کو سخت پریشانی ہوگی اور کہیں گے کاش اس وقت کوئی سفارشی ہوتا جو اللہ سے سفارش کر کے ہم کو اس جگہ سے رہا کرا دیتا چنانچہ لوگ آدم کے پاس جا کر کہیں گے آپ سب آدمیوں کے باپ ہیں اللہ نے خود اپنے ہاتھ سے آپ کو بنایا تھا اور اپنی جنت میں سکونت عطا کی تھی اور اپنے فرشتوں سے آپ کو سجدہ کرایا تھا اور تمام چیزوں کے نام آپ کو سکھا دیئے تھے آپ اپنے رب سے شفاعت کر کے ہم کو اس جگہ سے نجات دلا دیجئے حضرت آدم اپنی اس لغزش کو یاد کریں گے جو ممنوعہ درخت کو کھالینے کی صورت میں ہوئی تھی اور کہیں گے

میرا یہ مقام نہیں کہ تمہارے کام آؤں۔ اس حدیث پر غور کرو حضرت آدم سے درخت کو کھا لینے کی صورت میں جو خطا ہوئی تھی اس کو تو اس وقت یاد کریں گے (باوجودیکہ وہ لغزش معاف بھی ہو چکی ہے) لیکن دوسری (شرک والی) غلطی کو یاد نہیں کریں گے باوجودیکہ پہلی خطا سے دوسری خطا زیادہ سخت تھی (اور اس کی معافی کی بھی کوئی صراحت نہیں کی گئی) لہٰذا آیت مذکورہ کی تفسیر وہی صحیح ہے جو عکرمہ اور حسن نے کی۔

أَيُشْرِكُونَ مَا لَا يَخْلُقُ شَيْئًا وَهُمْ يُخْلَقُونَ ﴿١٩١﴾ وَلَا يَسْتَطِيعُونَ لَهُمْ نَصْرًا وَلَا أَنفُسَهُمْ يَنصُرُونَ ﴿١٩٢﴾ وَإِن تَدْعُوهُمْ إِلَى الْهُدَىٰ لَا يَتَّبِعُوكُمْ ۚ سَوَاءٌ عَلَيْكُمْ أَدَعَوْتُمُوهُمْ أَمْ أَنتُمْ صَامِتُونَ ﴿١٩٣﴾ إِنَّ الَّذِينَ تَدْعُونَ مِن دُونِ اللَّهِ عِبَادٌ أَمْثَالُكُمْ ۖ فَادْعُوهُمْ فَلْيَسْتَجِيبُوا لَكُمْ إِن كُنتُمْ صَادِقِينَ ﴿١٩٤﴾

(کیا ایسوں کو شریک ٹھہراتے ہیں جو کسی چیز کو پیدا نہ کر سکیں اور خود ہی (اللہ کی قدرت سے) پیدا کئے جاتے ہوں اور وہ ان کو کسی طرح کی مدد بھی نہ دے سکتے ہوں اور نہ اپنی مدد کر سکتے ہیں اور اگر تم ان کو راہ راست کی طرف بلاؤ تو تمہارے کہنے پر نہ چلیں۔ تمہارے اعتبار سے دونوں امر برابر ہیں خواہ تم ان کو پکارو یا خاموش رہو۔ واقعی تم خدا کو چھوڑ کر جن کی عبادت کرتے ہو وہ بھی تم ہی جیسے بندے ہیں اگر تم سچے ہو تو ان کو پکارو پھر ان کو چاہئے کہ تمہارا کہنا کر دیں)۔

أَيُشْرِكُونَ کیا اللہ کے ساتھ شریک کرتے ہیں۔ مَا لَا يَخْلُقُ جو کسی چیز کو پیدا نہ کر سکیں، یعنی ابلیس اور بت۔ وَهُمْ يُخْلَقُونَ هُمْ ضمیر بتوں کی طرف راجع ہے (اگرچہ هُمْ کی ضمیر جمع اصحاب عقل کی طرف راجع ہونا چاہئے اور بت جامد چیز ہے لیکن) بتوں کو مشرک معبود قرار دیتے تھے (اس لئے بت بھی اصحاب عقل کے حکم میں ہو گئے)۔ وَلَا يَسْتَطِيعُونَ اور بت طاقت نہیں رکھتے۔ لَهُمْ نَصْرًا ان مشرکوں کی مدد کرنے کی جو ان کے پجاری ہیں۔ وَلَا أَنفُسَهُمْ يَنصُرُونَ اور نہ اپنی مدد کر سکتے ہیں کہ نامناسب ناگوار چیز کو دفع کر سکیں مثلاً اگر کوئی ان کو توڑے تو اپنے کو محفوظ نہ رکھ سکیں۔ وَإِن تَدْعُوهُمْ إِلَى الْهُدَىٰ اور اگر تم مشرکوں کو اسلام کی طرف بلاؤ۔ بعض علماء کے نزدیک تَدْعُوا سے خطاب مشرکوں کو ہے اور هُمْ ضمیر بتوں کی طرف راجع ہے یعنی اے مشرکو اگر تم بتوں کو بلاؤ کہ وہ تم کو ہدایت کریں راستہ بتا دیں تو وہ تمہارے کہنے پر عمل نہیں کر سکتے، یعنی تم کو راستہ نہیں بتا سکتے نہ اللہ کی طرح تمہاری دعا قبول کر سکتے ہیں۔

سَوَاءٌ عَلَيْكُمْ أَدَعَوْتُمُوهُمْ أَمْ أَنتُمْ صَامِتُونَ بجائے (صَمَتُّمْ) فعل کے (صَامِتُونَ) اسم فاعل ذکر کیا یا تو صرف آیت کے مقاطع کے لحاظ سے یا غیر مفید ہونے کو پرزور طور پر ظاہر کرنے کے لئے کہ تمہارا ان کو پکارنا بھی خاموش رہنے کے برابر بے سود ہے (نہ پکارنے سے تم کو کوئی فائدہ پہنچ سکتا ہے نہ خاموش رہنے سے) یا اسلوب بدلنے کی یہ وجہ ہے کہ (فعل حدوث و تجدد پر دلالت کرتا ہے اور اسم دوام و استمرار پر اور) مشرک اپنی اغراض کے لئے تو بتوں کو پکارتے ہی تھے (مگر غیر مقاصد کے وقت خاموش رہنا ان کی عادت جاریہ تھی جس پر وہ قائم تھے) اغراض کے لئے پکارنا ایک نئی بات ہوگی اس لئے فرمایا کہ (خلاف معمول اور برخلاف عادت) ان کو پکارنا یا (حسب معمول) خاموشی پر قائم رہنا دونوں غیر مفید اور بے سود ہونے میں برابر ہیں۔

إِنَّ الَّذِينَ تَدْعُونَ مِن دُونِ اللَّهِ یعنی اے مشرکو اللہ کے سوا تم جن کی عبادت کرتے اور ان کو معبود کہتے ہو۔ عِبَادٌ أَمْثَالُكُمْ تمہاری طرح بندے ہیں یعنی مخلوق ہیں اللہ کے مملوک اور تابع ارادہ ہیں۔ مقاتل نے کہا خطاب کا رخ ان لوگوں کی طرف ہے جو فرشتوں کو پوجا کرتے تھے۔ پس تے الَّذِينَ تَدْعُونَ سے مراد ملائکہ ہیں اول تفسیر زیادہ صحیح ہے۔ إِن كُنتُمْ صَادِقِينَ اگر تم سچے ہو کہ وہ الٰہ ہیں۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ مطلب اس طرح ہو کہ چونکہ انسانوں کی شکل کی انہوں مورتیاں بنا رکھی تھیں تو ان سے (گویا) فرمایا کہ زیادہ سے زیادہ یہ ہے کہ یہ تمہاری طرح زندہ اور عاقل ہو جائیں اگر ایسا ہو بھی جائے تب بھی وہ تمہاری عبادت کے مستحق نہیں ہو سکتے جس طرح تم میں سے کوئی کسی کی عبادت کا مستحق نہیں ہے اس سے آگے واضح فرمایا کہ وہ تو تم سے کمتر درجہ پر ہیں۔

اَلَهُمْ اَرْجُلٌ يَّمْشُوْنَ بِهَآ اَمْ لَهُمْ اَيْدٍ يَّبْطِشُوْنَ بِهَآ اَمْ لَهُمْ اَعْيُنٌ يُّبْصِرُوْنَ بِهَآ اَمْ لَهُمْ اٰذَانٌ يَّسْمَعُوْنَ بِهَا ؕ

(کیا ان کے پاؤں ہیں جن سے وہ چلتے ہوں یا ان کے ہاتھ ہیں جن سے پکڑتے ہوں یا ان کی آنکھیں ہیں جن سے وہ دیکھتے ہوں یا ان کے کان ہیں جن سے وہ سنتے ہوں یعنی تمہاری طرح نہ ان کے ہاتھ پاؤں ہیں نہ آنکھ کان پھر اپنے سے کمتر درجہ والوں کی پوجا تم کس طرح کرتے ہو)۔

قُلِ ادْعُوْا شُرَكَآءَكُمْ ثُمَّ كِيْدُوْنِ فَلَا تُنْظِرُوْنِ ۝ اِنَّ وَلِيّٖۧ اللّٰهُ الَّذِيْ نَزَّلَ الْكِتٰبَ ۖ وَهُوَ يَتَوَلَّى الصّٰلِحِيْنَ ۝ وَالَّذِيْنَ تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِهٖ لَا يَسْتَطِيْعُوْنَ نَصْرَكُمْ وَلَآ اَنْفُسَهُمْ يَنْصُرُوْنَ ۝ وَاِنْ تَدْعُوْهُمْ اِلَى الْهُدٰى لَا يَسْمَعُوْا ۚ وَتَرٰىهُمْ يَنْظُرُوْنَ اِلَيْكَ وَهُمْ لَا يُبْصِرُوْنَ ۝

(آپ کہہ دیجئے کہ تم اپنے سب معبودوں کو جن کو تم اللہ کا شریک قرار دیتے ہو بلا لو پھر میری ضرر رسانی کی تدبیر کرو پھر مجھے ذرا مہلت مت دو بے شک میرا حامی اللہ ہی ہے جس نے کتاب نازل فرمائی ہے اور وہی نیک بندوں کی مدد کیا کرتا ہے اور جن کو اللہ کو چھوڑ کر تم پوجتے ہو وہ تمہاری مدد بالکل نہیں کر سکتے اور نہ اپنی مدد کر سکتے ہیں اگر ان کو کوئی بات بتانے کو پکارو تو نہیں سنتے آپ کو نظر آتے ہیں کہ وہ آپ کی طرف دیکھ رہے ہیں حالانکہ وہ کچھ بھی نہیں دیکھتے)۔

ثُمَّ كِيْدُوْنِ یاء متکلم محذوف ہے اسی طرح فَلَا تُنْظِرُوْنِ میں بھی یاء محذوف ہے یعنی تم اور تمہارے معبود جس قدر ہو سکے میرے خلاف تدبیریں کرو اور مجھے دکھ پہنچانے کی کوشش کرو اور ذرا مجھے مہلت نہ دو چونکہ میرا اعتماد اللہ پر ہے اس لئے مجھے تمہاری کوئی پروا نہیں۔

اِنَّ وَلِيّٖۧ بے شک میرا حامی اور مددگار اللہ ہے جس نے کتاب یعنی قرآن نازل فرمائی ہے اور وہی اپنے نیک بندوں کی حفاظت و مدد کرتا ہے انبیاء کا تو ذکر ہی کیا ہے۔ حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا جو لوگ اللہ کے برابر کسی کو نہیں سمجھتے ان کی مدد کا ذمہ دار اللہ ہوتا ہے دشمنوں کی دشمنی ان کو ضرر نہیں پہنچا سکتی۔ وَالَّذِيْنَ سے يَنْصُرُوْنَ تک پرواہ نہ کرنے کی علت کی تکمیل ہے۔

لَا يَسْمَعُوْا وہ یعنی بت نہیں سنتے وَتَرٰىهُمْ اور اے مخاطب تجھے وہ نظر آتے ہیں کہ تیری طرف دیکھ رہے ہیں حالانکہ وہ کچھ نہیں دیکھتے چونکہ مشرکوں نے اپنے معبودوں کی مورتیاں انسانی شکل کی بنا رکھی تھیں تو دیکھنے والوں کو محسوس ہوتا تھا کہ یہ ہماری طرف دیکھ رہے ہیں۔ حسن بصری نے لَا يَسْمَعُوْا اور تَرٰىهُمْ کی ضمیریں مشرکوں کی طرف راجع کی ہیں یعنی اگر مشرکوں کو آپ اسلام کی دعوت دیں تو وہ دل سے نہیں سنتے اور کچھ نہیں سمجھتے بظاہر آنکھوں سے آپ کی طرف دیکھتے نظر آتے ہیں مگر دل کی آنکھوں سے نہیں دیکھتے۔

خُذِ الْعَفْوَ وَاْمُرْ بِالْعُرْفِ وَاَعْرِضْ عَنِ الْجٰهِلِيْنَ ۝ وَاِمَّا يَنْزَغَنَّكَ مِنَ الشَّيْطٰنِ نَزْغٌ فَاسْتَعِذْ بِاللّٰهِ ؕ اِنَّهٗ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ۝

(سرسری برتاؤ قبول کر لیا کیجئے اور نیک کام کی تعلیم کر دیجئے اور جاہلوں سے کنارہ کش ہو جایا کیجئے اور اگر شیطان کی طرف سے وسوسہ آنے لگے تو اللہ کی پناہ مانگ لیا کیجئے بے شک وہ خوب سننے والا اور خوب جاننے والا ہے)۔

حضرت عبداللہ بن زبیرؓ اور مجاہدؒ کا بیان ہے کہ اللہ نے اپنے پیغمبر کو حکم دیا کہ لوگوں کی طرف سے سرسری برتاؤ اور سہل ترین اعمال کو قبول کریں مثلاً کوئی عذر کرے تو عذر قبول کر لیں عفو اور سہولت سے کام لیں چھان بین اور احوال کا تجسس نہ کریں ایسی بات نہ لوگوں سے طلب کریں جس کو پیش کرنا ان کے لئے دشوار اور ناگوار ہو۔ اس تفسیر پر عفو کا معنی ہوگا سرسری برتاؤ کوشش اور جہد کی ضد۔

بعض علماء کے نزدیک عفو سے مراد ہے مجرموں اور گناہگاروں کو معاف کر دینا۔ بخاری نے حضرت ابن عباسؓ کی روایت سے بیان کیا ہے کہ عیینہ بن حصن بن حذیفہ اپنے بھتیجے حر بن قیس کے پاس آکر ٹھہرا، حر حضرت عمرؓ کے مقربین میں سے تھے۔ حضرت عمرؓ کے اہل مجلس اور مشیر قراء ہوتے تھے جوان ہوں یا بوڑھے۔ عیینہ نے حر سے کہا بھتیجے کیا تدبیر ہے تم

ان سے (یعنی حضرت عمرؓ سے) اجازت لے سکتے ہو کہ وہ مجھے اپنے پاس حاضر ہونے کی اجازت دے دیں۔ حرؓ نے وعدہ کر لیا اور حضرت عمرؓ سے عیینہ کے حاضر ہونے کی اجازت طلب کی، آپ نے اجازت دے دی۔ عیینہ حاضر ہوا اور کہنے لگا ابن خطاب خدا کی قسم تم ہم کو زیادہ مال نہیں دیتے اور ہمارے درمیان انصاف سے فیصلہ کرتے ہو (گویا تقسیم مال میں جائز اور فعل عدالت میں ظالم ہو) حضرت عمرؓ کو یہ بات گراں گزری قصد کیا کہ قریب تھا عیینہ پر حملہ کر دیں (یا کوئی سخت حکم دے دیں) حرؓ نے کہا امیر المومنین اللہ نے اپنے پیغمبر سے فرمایا ہے خُذِ الْعَفْوَ وَأْمُرْ بِالْعُرْفِ وَأَعْرِضْ عَنِ الْجَاهِلِينَ اور یہ شخص جاہل ہے۔ حضرت عمرؓ آیت کے مطابق فوراً رک جاتے تھے آپ کی یہ عادت تھی جب یہ آیت سنی تو پھر اس آیت کے حکم سے آگے نہیں بڑھے۔

حضرت انسؓ بن مالک کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جب بندے حساب کے لئے روکے کھڑے ہوں گے ..... اسی حدیث میں ہے پھر ایک منادی ندا کرے گا جس کا اجر اللہ کے ذمہ ہو وہ کھڑا ہو جائے اور جنت میں داخل ہو جائے، لوگ کہیں گے اللہ کے ذمہ کس کا اجر ہو سکتا ہے، منادی کہے گا لوگوں کو معاف کر دینے والوں کا اجر اللہ کے ذمہ ہے، یہ سن کر اتنے ہزار لوگ کھڑے ہو جائیں گے اور بلا حساب کے جنت میں چلے جائیں گے۔ رواہ الطبرانی باسناد حسن۔

روایت میں آیا ہے کہ یہ آیت نازل ہوئی تو رسول اللہ ﷺ نے پوچھا جبرئیلؑ اس کا مطلب کیا ہے، جبرئیلؑ نے کہا مجھے معلوم نہیں اللہ سے دریافت کر کے بتاؤں گا کچھ دیر کے بعد جبرئیلؑ لوٹ کر آئے اور کہا آپ کے رب نے آپ کو حکم دیا ہے جو تم سے (قرابت) کاٹے تم اس سے جوڑو، جو تم کو محروم رکھے تم اس کو دو، جو تم پر ظلم کرے تم اس کو معاف کر دو۔ رواہ ابن مردویہ عن جابر وابن ابی الدنیا وابن جریر وابن ابی حاتم عن الشعبی مرسلاً۔

حضرت ابیؓ بن کعب راوی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جو شخص (جنت کے اندر) اپنے مکان کا بلند ہونا اور درجات کا اونچا ہونا پسند کرتا ہو اس کو چاہئے کہ جو شخص اس کی حق تلفی کرے اس سے درگزر کرے اور جو اس سے قرابت منقطع کرے وہ اس سے قرابت جوڑے رکھے۔ رواہ الحاکم وقال صحیح الاسناد، مگر اس حدیث کی سند منقطع ہے۔

حضرت ابن عمرؓ راوی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا برابر دینے والا واصل (قرابت) نہیں۔ قرابت جوڑنے والا وہ ہے کہ اگر اس کی رشتہ داری توڑی جائے تو وہ جوڑے رکھے۔ رواہ البخاری۔

حضرت ابو ہریرہؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں ایک شخص نے عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ میرے کچھ قرابت دار ہیں کہ میں ان سے جوڑتا ہوں تو وہ کاٹتے ہیں، میں ان سے بھلائی کرتا ہوں وہ مجھ سے برائی کرتے ہیں، میں ان کی طرف سے برداشت کرتا ہوں اور وہ میرے خلاف جہالت کرتے ہیں (برداشت سے کام نہیں لیتے) رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اگر تو ایسا ہی ہے جیسا تو کہہ رہا ہے تو تو ان کو بھوبل (گرم راکھ) پھنکا رہا ہے اور جب تک تو اس سلوک پر قائم رہے گا برابر اللہ کی طرف سے ایک مددگار تیرے ساتھ رہے گا۔ رواہ مسلم۔

حضرت ابن عباسؓ ضحاک اور کلبی نے آیت کا معنی اس طرح بیان کیا ہے وہ مال لے لو جو عفو ہو یعنی جو مال اہل و عیال کی ضرورت سے فاضل ہو وہ لے لو، آیت يَسْأَلُونَكَ مَاذَا يُنْفِقُونَ قُلِ الْعَفْوَ میں بھی عفو کا یہی معنی ہے (یعنی لوگ پوچھتے ہیں کہ اللہ کی راہ میں کیا دیں، آپ کہہ دیجئے کہ جو مال اہل و عیال کی ضرورت سے بچا ہوا ہو (وہ سب دے دو) جب زکوٰۃ فرض کر دی گئی تو یہ حکم منسوخ کر دیا گیا۔

وَأْمُرْ بِالْعُرْفِ یعنی جو فعل شرعاً اور عقلاً اچھا ہے اس کا حکم دیجئے۔ حضرت سعید خدری (رضی اللہ عنہ) کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تم میں سے جو شخص کسی بری بات کو دیکھے اس کو اپنے ہاتھ سے بدل ڈالے، اگر اس کی طاقت نہ ہو تو زبان ہی سے روکے، اگر ایسا بھی نہ کر سکتا ہو تو دل سے ہی (اس سے نفرت کرے) اور یہ ضعیف ترین ایمان (کا درجہ) ہے۔ رواہ مسلم

حضرت حذیفہؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا قسم ہے اس کی جس کے ہاتھ میں میری جان ہے (یاتو) تم بھلائی کا حکم دو گے اور برائی سے روکو گے ورنہ اغلب ہے کہ اللہ اپنی طرف سے تم پر عذاب بھیج دے گا اس وقت تم دعا کرو گے مگر تمہاری دعا قبول نہ ہوگی۔ رواہ الترمذی۔

وَاَعْرِضْ عَنِ الْجٰهِلِيْنَ یعنی اگر کوئی جاہل تمہارے خلاف حماقت کرے تو تم بے وقوفی اور سبک سری سے اس کا مقابلہ نہ کرو اور اس کے برتاؤ کی طرح خود برتاؤ نہ کرو۔ اسی مضمون کو بیان کیا ہے آیت وَاِذَا خَاطَبَهُمُ الْجٰهِلُوْنَ قَالُوْا سَلٰمًا میں۔ حضرت امام جعفر صادقؒ نے فرمایا اللہ نے اپنے پیغمبر کو برگزیدہ اخلاق اختیار کرنے کا حکم دیا ہے اور قرآن میں کوئی اور آیت اس آیت سے بڑھ کر مکارم اخلاق کی جامع نہیں ہے۔

حضرت جابر رضی اللہ عنہ راوی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اللہ نے مجھے اخلاق برگزیدہ اور محاسن افعال کی تکمیل کے لئے بھیجا ہے۔ رواہ البغوی۔

حضرت عائشہؓ نے فرمایا رسول اللہ ﷺ فحش گو نہ تھے نہ فحش پسند نہ بازاروں میں چیخ و پکار کرنے والے تھے نہ آپ برائی کا بدلہ برائی سے دیتے تھے بلکہ معاف فرما دیتے اور درگزر کرتے تھے۔ رواہ الترمذی والبغوی۔

وَاِمَّا يَنْزَغَنَّكَ ۔ اِمَّا میں مَا زائدہ ہے اِنْ شرطیہ ہے۔ نَزْغ کا معنی ہے انگلیوں کے پوروں سے چوکا دینا، ٹھوکا دینا۔ اس جگہ مراد ہے شر پر برانگیختہ کرنا یعنی ابھارنا وسوسہ ڈالنا۔

عبدالرحمٰن بن زید کا بیان ہے جب آیت خُذِ الْعَفْوَ نازل ہوئی تو رسول اللہ ﷺ نے عرض کیا میرے رب سخت غصہ (کی حالت) ہو تو غصہ کی کیا صورت ہوگی اس پر آیت وَاِمَّا يَنْزَغَنَّكَ مِنَ الشَّيْطٰنِ نَزْغٌ الخ نازل ہوئی۔

فَاسْتَعِذْ بِاللّٰهِ تو اللہ سے پناہ کی طلب کرو اللہ کی پناہ مانگو، امر کا جواب محذوف ہے یعنی اللہ شیطان کے اغوا اور وسوسہ کو دفع کر دے گا۔

اِنَّهٗ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ وہ بلاشبہ آپ کی بات کو سنتا اور آپ کی پناہ جوئی کو جانتا ہے اور جس بات میں آپ کے کام کی درستی ہو اس سے واقف ہے یا یہ مطلب ہے کہ آپ کو دکھ پہنچانے والوں کی باتوں کو اللہ سنتا اور ان کے اعمال کو جانتا ہے وہ خود ان کو بدلہ دے گا آپ کو انتقام لینے اور شیطان کا اتباع کرنے کی ضرورت نہیں۔

اِنَّ الَّذِيْنَ اتَّقَوْا اِذَا مَسَّهُمْ طٰٓئِفٌ مِّنَ الشَّيْطٰنِ تَذَكَّرُوْا فَاِذَا هُمْ مُّبْصِرُوْنَ ۝ وَاِخْوَانُهُمْ يَمُدُّوْنَهُمْ فِى الْغَىِّ ثُمَّ لَا يُقْصِرُوْنَ ۝ (بے شک جو لوگ اللہ سے ڈرتے ہیں جب ان کو شیطانی وسوسہ آ جاتا ہے تو وہ یاد میں لگ جاتے ہیں سو یکایک ان کی آنکھیں کھل جاتی ہیں اور جو شیطان کے بھائی ہیں وہ ان کو گمراہی میں کھینچتے ہیں پھر وہ باز نہیں آتے)۔

طٰٓئِفٌ یہ لفظ یا طَافَ يَطُوْفُ سے اسم فاعل کا صیغہ ہے اس سے مراد ایک شیطانی وسوسہ ہے گویا یہ وسوسہ اور شیطانی خیال اہل تقویٰ کے چار سمت گھومتا ہے مگر متقیوں پر اثر انداز ہونے پر اس کا قابو نہیں چلتا یا طاف یطیف الخیال سے ماخوذ ہے اس کے اندر ایک تصویر خیالی آ گئی (اس وقت طائف کا مادہ طیف ہوگا طوف نہ ہوگا)۔

مِنَ الشَّيْطٰنِ اس سے مراد جنس شیطان ہے خواہ ایک ہو یا چند، اسی لئے اِخْوَانُهُمْ میں جمع مذکر کی ضمیر الشیطٰن کی طرف راجع کی ہے۔ تَذَكَّرُوْا وہ یاد میں لگ جاتے ہیں یعنی اللہ کے امر و نہی اور ثواب و عذاب کو یاد کرتے ہیں اور سمجھ جاتے ہیں کہ یہ شیطانی خیال ہے۔ فَاِذَا هُمْ مُّبْصِرُوْنَ تو یکایک وہ حق و روشن نظر ہو جاتے ہیں وہ گناہ کے مقام اور شیطان کے جال کو دیکھ لیتے ہیں اور اس سے بچ جاتے ہیں، شیطانی خیال کے پیچھے نہیں لگ جاتے۔

سدی نے کہا معنی یہ ہے کہ پھسلنے ہی لوٹ پڑتا ہے۔ مقاتل نے کہا معنی یہ ہے کہ اگر کوئی شیطانی ٹھوکا لگتا ہے تو وہ فوراً یاد کرتا اور سمجھ لیتا ہے کہ یہ گناہ ہے یہ جانتے ہی اس کی (دل کی) آنکھیں کھل جاتی ہیں اور وہ اللہ کے حکم کی خلاف ورزی سے نکل آتا ہے۔ یہ آیت

سابق کلام کی معنوی تاکید ہے۔

وَإِخْوَانُهُمْ یعنی شیطانوں کے بھائی، مراد فاسق بدکار لوگ۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اخوان سے مراد شیاطین ہوں اور اِخْوَانُهُمْ کی ضمیر اَلْجَاهِلِيْنَ کی طرف راجع کی جائے جاہلوں کے بھائی یعنی شیطان یَمُدُّوْنَهُمْ یعنی شیاطین ان کی مدد کرتے ہیں ابھارتے ہیں، برانگیختہ کرتے ہیں، سہولت پیدا کرتے ہیں یا وہ شیطانوں کو مدد دیتے ہیں شیاطین کے کہنے پر چلتے ہیں ان کے احکام کا اتباع کرتے ہیں۔

ثُمَّ لَا يُقْصِرُوْنَ پھر اہل فسق کمراہی سے باز نہیں آتے، ان کی آنکھیں نہیں کھلتیں، بر خلاف اہل تقویٰ کے کہ شیطانی خیال آتے ہی وہ اللہ کے احکام کو یاد کرتے ہیں اور آنکھیں کھول لیتے ہیں۔ ضحاک اور مقاتل نے یہی مطلب بیان کیا ہے یا یہ مطلب ہے کہ وہ شیاطین کو اغوا کرنے سے نہیں روکتے۔ حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا نہ تو انسان اپنی بدکاری سے باز آتے ہیں نہ شیاطین ان سے رکتے اور باز رہتے ہیں۔

وَإِذَا لَمْ تَأْتِهِمْ بِآيَةٍ قَالُوْا لَوْلَا اجْتَبَيْتَهَا قُلْ إِنَّمَا أَتَّبِعُ مَا يُوْحَى إِلَيَّ مِنْ رَّبِّيْ هٰذَا بَصَائِرُ مِنْ رَّبِّكُمْ وَهُدًى وَّرَحْمَةٌ لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ ۝ (اور اگر آپ کوئی معجزہ ان پر پیش نہیں کرتے تو کہتے ہیں آپ معجزہ کیوں نہیں لائے آپ کہہ دیجئے کہ میں اس حکم کا اتباع کرتا ہوں جو میرے رب کی طرف سے میرے پاس وحی کے ذریعے سے پہنچتا ہے یہ حکمتوں کا مجموعہ ہے تمہارے رب کی طرف سے اور ہدایت و رحمت ہے ان لوگوں کے لئے جو ایمان رکھتے ہیں۔

بِآيَةٍ آیت سے مراد قرآن مجید کی آیات یا کافروں کا طلب کیا ہوا معجزہ۔

لَوْلَا اجْتَبَيْتَهَا آپ نے خود تراش کر کیوں نہیں لائے، عرب کہتے ہیں اِجْتَبَيْتُ الْكَلَامَ میں نے بات خود گھڑ لی۔ الکلبی کا بیان ہے کہ مکہ والے محض ضد اور دشمنی کے زیر اثر رسول اللہ ﷺ سے آیات کے طلب گار ہوتے تھے اور جب آیات (کے ظہور یا نزول) میں دیر ہو جاتی تو کہتے آپ نے (حسب سابق) خود اپنی طرف سے آیات کیوں نہ بنا لیں اس کی تردید میں اللہ نے یہ کہنے کا حکم دیا کہ آپ کہہ دیجئے اِنَّمَا أَتَّبِعُ میں تو خود آیات نہیں بنا لیتا اپنی طرف سے آیات طلب نہیں کرتا جو رب کی طرف سے بھیج دی جاتی ہیں ان کا اتباع کرتا ہوں۔

هٰذَا یہ قرآن بَصَائِرُ بصیرتوں کا مجموعہ ہے۔ دل اس کے ذریعہ سے حق کا باطل سے اور صحیح کا غلط سے امتیاز کر لیتے ہیں یا یہ قرآن، دلائل اور براہین کا مجموعہ ہے جن سے میرے دعویٰ کی سچائی ظاہر ہوتی ہے۔

وَإِذَا قُرِئَ الْقُرْاٰنُ فَاسْتَمِعُوْا لَهٗ وَأَنْصِتُوْا لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ ۝ (اور جب قرآن پڑھا جایا کرے تو اس کی طرف کان لگا دیا کرو اور خاموش رہا کرو امید ہے کہ تم پر رحمت ہو گی)۔

ابو عیاض کے طریق سے حضرت ابو ہریرہؓ کی روایت ہے کہ لوگ نماز میں باتیں کر لیتے تھے اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔ رواہ ابن جریر و ابن المنذر و ابن ابی حاتم و ابو الشیخ و ابن مردویہ و ابن ابی شیبۃ فی المصنف و البیہقی فی السنن۔ حضرت ابو ہریرہؓ کی دوسری روایت میں آیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے پیچھے آواز بلند کرنے کے متعلق اس آیت کا نزول ہوا۔

حضرت ابن مسعودؓ راوی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نماز میں مشغول تھے میں نے جا کر سلام کیا آپ نے جواب نہ دیا، اس سے پہلے لوگ نماز میں کلام کر لیا کرتے تھے اور اپنے کام کے لئے کہہ دیا کرتے تھے۔ نماز سے فارغ ہو کر حضور ﷺ نے سلام کا جواب دیا اور فرمایا اللہ جو چاہتا ہے کرتا ہے اور آیت وَإِذَا قُرِئَ الْقُرْاٰنُ فَاسْتَمِعُوْا لَهٗ وَأَنْصِتُوْا لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ نازل ہوئی۔ رواہ ابن ابی حاتم مردویہ۔

حضرت عبداللہ بن مغفل کی روایت ہے کہ لوگ نماز میں کلام کر لیا کرتے تھے اس پر یہ آیت نازل ہوئی اس کے بعد رسول اللہ ﷺ نے نماز میں بولنے کی ممانعت فرما دی۔ اخرجہ ابن مردویہ والبیہقی فی السنن۔

طرح صحیح ہوگا کہ رسول اللہ نے ہم کو نماز پڑھائی۔ حدیث میں اس وقت کا واقعہ مذکور ہے جب نماز میں بولنا جائز تھا اسی لئے حضرت ابوبکرؓ، حضرت عمرؓ اور دوسرے لوگوں نے قصداً کلام کیا۔

حدیث کے اول اعتراض کا جواب یہ ہے کہ ائمہ حدیث کے نزدیک بالاتفاق یہ حدیث صحیح ہے حضرت ذوالشمالین کی شہادت جنگ بدر میں ہوئی تھی حضرت ذوالیدین تو رسول اللہ ﷺ کے بعد بھی زندہ تھے، ذوالیدین کا نام حضرت عمران بن حصین کی روایت میں خرباق آیا ہے اور حضرت ذوالشمالین کا نام عمیر تھا۔ درحقیقت یہ اعتراض زہری کی روایت پر پڑتا ہے جس میں آیا ہے کہ ذوالشمالین کھڑے ہو گئے۔ ابوداؤد سجستانیؒ نے لکھا ہے کہ زہری کو نام میں دھوکہ ہو گیا انہوں نے خیال کر لیا کہ ذوالشمالین اور ذوالیدین دونوں ایک شخص کے نام تھے اس لئے روایت میں بجائے ذوالیدین کے انہوں نے ذوالشمالین کہہ دیا۔

دوسرے اعتراض کا جواب یہ ہے کہ حضرت ابوہریرہؓ کی روایت میں کوئی اختلاف نہیں، تین رکعت پڑھ کر سلام پھیرنے کی حدیث تو حضرت عمران بن حصین کی روایت سے آئی ہے جو مسلم کے روای ہیں حضرت ابوہریرہؓ کی حدیث زیادہ صحیح ہے پھر اگر تعدد میں شک بھی ہو تب بھی کوئی حرج نہیں، اس حدیث تو مختلف ہے اور بھول کر بات کرنے کا ثبوت موجود ہے۔ رہا کلام کا نماز میں حرام ہو جانا تو زید بن ارقمؓ (جو مدنی تھے) کا قول ہے کہ ہم نماز میں بات کر لیا کرتے تھے یہاں تک کہ آیت وَقُومُوا لِلّٰهِ قَانِتِينَ نازل ہوئی اور ہم کو خاموش رہنے کا حکم دیا گیا۔ ابو سلیمان خطابی نے لکھا ہے کہ ہجرت سے کچھ مدت کے بعد ہی نماز میں کلام کرنے کی اجازت منسوخ کر دی گئی۔ دونوں قولوں پر حضرت ابوہریرہؓ کے اسلام سے پہلے یقیناً نماز کے اندر کلام کرنے کی ممانعت ہو گئی تھی باقی حضرت ابوبکرؓ، حضرت عمرؓ اور دوسرے لوگوں کے کلام کرنے سے استدلال تو اس کا جواب دو طرح سے دیا گیا ہے۔

۱ ... حماد بن زید نے جو ایوب کی روایت بیان کی ہے اس میں آیا ہے کہ لوگوں نے اشارہ سے ہاں کہنے کا اظہار کیا تھا یعنی زبان سے ہاں نہیں کہا تھا اور جس روایت میں ہاں کہنے کا ذکر آیا ہے اس سے مراد بھی اشارہ سے ہاں کا اظہار کرنا ہے۔

۲ ... رسول اللہ ﷺ کے سوال کا جواب دینا اس وقت تک منسوخ نہیں ہوا تھا کیونکہ حضرت ابو سعید بن معلیؓ کا بیان ہے کہ میں مسجد میں نماز پڑھ رہا تھا اسی دوران میں رسول اللہ ﷺ نے مجھے آواز دی میں نے جواب نہیں دیا پھر (نماز ختم کرنے کے بعد) جب حاضر خدمت ہوا تو عرض کیا یارسول اللہ ﷺ میں نماز پڑھ رہا تھا۔ حضور ﷺ نے فرمایا کیا اللہ نے نہیں فرمایا ہے اِسْتَجِيْبُوْا لِلّٰهِ وَلِلرَّسُوْلِ اِذَا دَعَاكُمْ، رواہ البخاری۔

امام ابوحنیفہؒ نے اپنے قول کے استدلال میں حضرت معاویہ بن حکمؓ کی حدیث پیش کی ہے۔ حضرت معاویہؓ کا بیان ہے ہم رسول اللہ ﷺ کے ساتھ نماز پڑھ رہے تھے کہ مقتدیوں میں سے کسی کو چھینک آئی میں نے کہا یرحمک اللہ لوگوں نے مجھے گھورنا شروع کر دیا۔ میں نے کہا ہائے بلا، تم کیوں مجھے گھور گھور کر دیکھ رہے ہو لوگوں نے اپنے ہاتھ رانوں پر مارے۔ جب میں نے دیکھا کہ لوگ مجھے خاموش کر رہے ہیں تو میں چپ ہو گیا۔ رسول اللہ ﷺ نماز پڑھ چکے تو مجھے طلب کیا میرے ماں باپ حضور ﷺ پر قربان میں نے نہ آپ سے پہلے ایسا اچھا تعلیم دینے والا معلم دیکھا نہ حضور ﷺ کے بعد، آپؐ نے نہ میرے منہ پر مارا نہ برا کہا نہ جھڑکا بلکہ فرمایا یہ نماز ہے اس میں لوگوں کی کسی طرح کی بات درست نہیں یہ تو صرف تسبیح، تکبیر اور قرآن کی قرأت ہے رواہ مسلم۔

حضرت جابرؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کلام نماز کو توڑ دیتا ہے وضو کو نہیں توڑتا۔ رواہ الدارقطنی۔

اول حدیث کا جواب یہ ہے کہ یہ تو امام اعظمؒ کے قول کی تائید میں نہیں بلکہ خلاف جاری ہے اس حدیث میں یہ ذکر نہیں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے معاویہؓ کو نماز لوٹانے کا حکم دیا بلکہ ان کو نماز کے احکام کی تعلیم دی اور فرمایا بات کرنا درست نہیں نماز میں کلام ممنوع ہے۔ رہی دوسری حدیث تو اس میں ایک راوی ابو شیبہ ہے جس کا نام عبدالرحمن بن اسحٰق ہے۔ یحییٰ بن معین نے اس کو ضعیف کہا ہے اور امام احمد نے فرمایا ہے کہ اس کی روایت کچھ نہیں ہے یہ منکر الحدیث ہے اگر یہ منفرد ہو تو اس کی

روایت سے استدلال صحیح نہیں ہے۔ ابن حبان کا بھی یہی بیان ہے۔ سعید بن جبیر، عطاء اور مجاہد کا بیان ہے کہ آیت وَاِذَا قُرِئَ الْقُرْاٰنُ کا
نزول جمعہ کے خطبہ کے متعلق ہوا، امام جمعہ کا خطبہ پڑھ رہا ہو تو خاموش رہنے کا حکم دیا گیا ہے۔ سیوطی نے اسی قول کو پسند کیا ہے
ہم نے خطبہ کے دوران خاموش رہنے کا مسئلہ سورۂ جمعہ کی تفسیر میں بیان کر دیا ہے۔
حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ نے فرمایا ہر واعظ کے وعظ کے وقت خاموش رہنے کا حکم ہے۔ کلبی کا بیان ہے کہ نماز میں جب
لوگ جنت اور دوزخ کا تذکرہ سنتے تھے تو چیخ پڑتے تھے۔ یعنی جنت کی دعا اور دوزخ سے پناہ مانگتے تھے۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ
نماز کے اندر امام کے پیچھے آواز سے قرأت نہ کرنے کا حکم اس آیت میں دیا گیا ہے۔ بغوی نے بروایت زید بن اسلمؒ حضرت
ابوہریرہؓ کا بیان نقل کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے پیچھے نماز کے اندر لوگ اونچی آوازیں کرتے یعنی اونچی آواز سے قرأت کرتے
تھے تو انہی کے متعلق یہ آیت نازل ہوئی۔
بغوی نے لکھا ہے کہ حضرت مقدادؓ نے لوگوں کو امام کے ساتھ (نماز پڑھتے وقت) قرأت کرتے سنا تو نماز ختم کرنے
کے بعد فرمایا کیا ابھی تم کو اتنی سمجھ بھی نہیں ہوئی کہ جب قرآن پڑھا جائے تو کان لگا کر سنو اور خاموش رہو جیسا کہ اللہ نے تم کو
حکم دیا ہے۔ بغوی نے لکھا ہے کہ حسن، زہری اور نخعیؒ کا قول بھی یہی ہے کہ اس آیت کا نزول امام کے پیچھے قرأت کرنے کے
سلسلہ میں ہوا جو لوگ کہتے ہیں کہ آیت کا نزول جمعہ کے خطبہ کے متعلق ہوا ان کے قول سے حسن و زہری کا قول زیادہ بہتر
ہے کیونکہ آیت مکی ہے اور نماز جمعہ کا وجوب مدینہ میں ہوا تھا۔
بیہقی نے لکھا ہے کہ امام احمد نے فرمایا سب لوگوں کا اتفاق ہے کہ اس آیت کا نزول نماز کے متعلق ہوا۔ کذا قال ابن ھمام۔
بغوی نے مجاہد کی روایت سے لکھا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نماز میں قرأت کر رہے تھے کہ ایک انصاری جوان کو آپ نے
قرأت کرتے سنا اس پر آیت مذکورہ نازل ہوئی۔ ہم نے امام کے پیچھے قرأت کرنے کا مسئلہ سورۂ مزمل کی آیت فَاقْرَءُوْا مَا تَيَسَّرَ
مِنَ الْقُرْاٰنِ کی تفسیر میں مفصل لکھ دیا ہے۔
ابن جریر نے زہری کی روایت نقل کی ہے کہ اس آیت کا نزول ایک انصاری جوان کے حق میں ہوا۔ رسول اللہ ﷺ جب
قرأت کر رہے تھے تو وہ بھی ان کی قرأت کر رہا تھا۔ میں کہتا ہوں کہ اس سے مراد نماز سے باہر قرأت کرنا ہے۔ کیونکہ سعید
بن منصور کا قول ہے کہ محمد بن کعب نے فرمایا لوگ رسول اللہ ﷺ سے سیکھتے تھے جب حضور کچھ پڑھتے تھے تو لوگ بھی آپ
کے ساتھ پڑھتے تھے یہاں تک کہ سورۂ اعراف میں یہ آیت نازل ہوئی۔ لباب المنقول فی اسباب النزول کے مؤلف نے
لکھا ہے اس روایت سے بظاہر یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ یہ آیت مدنی ہے۔

فصل

اگر کوئی شخص نماز سے باہر ہو اور نماز کے اندر یا نماز سے باہر کسی کو قرآن پڑھتے سنے تو کیا کان لگا کر سننا اور خاموش رہنا
واجب ہے یہ اتفاقی مسئلہ ہے علماء کا اس میں اختلاف ہے۔ بیضاوی نے لکھا ہے کہ عام علماء کے نزدیک صورت مذکورہ میں
قرآن کو کان لگا کر سننا مستحب ہے (واجب نہیں) ابن ہمام نے لکھا ہے ہمارے علماء کا کلام دلالت کر رہا ہے کہ اگر قرآن آواز
سے پڑھا جا رہا ہو تو کوئی نماز کے اندر ہو یا نماز کے باہر ہر حال کان لگا کر سننا واجب ہے۔ خلاصہ میں لکھا ہے اگر کوئی شخص فقہ کی
کوئی تحریر لکھ رہا ہے اور اس کے برابر کوئی شخص قرآن اونچی آواز سے پڑھ رہا ہو کہ لکھنے والے کو کان لگا کر سننا ممکن نہ ہو تو گناہ
پڑھنے والے پر ہوگا اسی پر مبنی ہے یہ مسئلہ کہ اگر رات کے وقت چھت پر کوئی شخص چلا کر قرآن پڑھے جب کہ لوگ سو رہے
ہوں تو گنہگار ہوگا اس میں کان لگا کر سننے کا وجوب صراحۃً مذکور ہے اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ سبب نزول خواہ خاص ہو مگر
حکم اسی پر محدود نہ ہوگا الفاظ کے عموم کا اعتبار ہے۔

میں کہتا ہوں حدیث میں ثابت ہے کہ رسول اللہ ﷺ رات کو بلند آواز سے قرآن اس طرح پڑھتے تھے کہ حجرہ سے باہر والے بھی سن لیتے تھے اور اکثر ہمسائے بھی سنتے تھے رواہ الترمذی و النسائی و ابن ماجۃ عن ام ہانیؓ۔
حضرت ام ہانیؓ کا بیان ہے کہ میں اپنی چھت پر ہوتی تھی اور رسول اللہ ﷺ کے رات کو قرآن پڑھنے کی آواز سنتی تھی۔ اس حدیث میں لفظ عریش آیا ہے بغوی نے شرح السنۃ میں لکھا ہے کہ عریش کا معنی ہے چھت نما کے گھروں کو عریش اس لئے کہتے تھے کہ وہ چاندنی کی طرح لکڑی کے ستونوں پر نصب کئے جاتے تھے (جن کے اوپر لوگ سوتے لیٹے بیٹھتے تھے) اور ان کا سائبان ہو جاتا تھا ابوداؤد اور ترمذی نے حضرت ابن عباسؓ کا قول نقل کیا ہے کہ گھر کے اندر رسول اللہ ﷺ کی قرأت اس انداز پر ہوتی تھی کہ حجرہ سے باہر والے سن لیتے تھے اور حضور ﷺ کے گھروں کے اندر بیبیاں موجود ہوتی تھیں اور حضور ﷺ کے نماز مشغول ہونے کے وقت بعض بیبیاں سوتی بھی ہوتی تھیں۔ بخاری نے صحیح میں حضرت عائشہؓ کا بیان نقل کیا ہے کہ میں رسول اللہ ﷺ کے سامنے سوتی ہوتی تھی میرے دونوں پاؤں آپ ﷺ کے قبلہ کی طرف ہوتے تھے جب آپ سجدہ کرتے تو مجھے دبا دیتے، میں ٹانگیں سمیٹ لیتی پھر جب آپ سجدے سے کھڑے ہو جاتے تو میں ٹانگیں پھیلا لیتی اس وقت گھروں میں چراغ نہ ہوتے تھے۔ صحابہؓ رات دن بلند آواز سے قرآن پڑھا کرتے تھے اور کوئی مخالفت نہ کرتا تھا۔
مسلم نے حضرت ابو موسیٰؓ کا قول نقل کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے مجھ سے فرمایا مجھے وہ منظر نظر آرہا ہے کہ رات تم قرآن پڑھ رہے تھے اور میں تمہاری قرأت سن رہا تھا۔ صحیحین میں حضرت ابو موسیٰؓ کا بیان منقول ہے آپ ﷺ نے فرمایا تھا کہ میرے ہم سفر اشعری جب رات کو قرآن پڑھتے تھے تو دوران سفر میں، میں ان کی آوازیں پہچان لیتا تھا اور آوازوں سے رات کو ان کی فرودگاہیں بھی پہچان لیتا تھا باوجودیکہ دن میں مجھے معلوم نہ ہوتا تھا کہ رات کو انہوں نے کہاں کہاں پڑاؤ کیا۔ اور یہ حقیقت ہے کہ جب اشعری لوگ قرآن پڑھتے ہوں گے تو کچھ لوگ لشکر میں سونے کی حالت میں بھی پڑھنے کی آوازیں سنیں اور فرمایا اور ان لوگوں کے لئے بشارت ہو یہ رسول اللہ ﷺ کو بڑے پیارے تھے۔ یہ تمام احادیث دلالت کر رہی ہیں کہ مصنف خلاصہ کا فتویٰ غلط ہے۔
ابن مردویہ نے ابو اسامہ از سفیان از ابی المقدام ہشام بن زیاد از معاویہؓ بن قرہ کی سند سے بیان کیا ہے کہ معاویہؓ نے کہا میں نے صحابہؓ میں سے اپنے بعض مشائخ سے (غالباً معاویہؓ نے حضرت عبداللہ بن مغفلؓ کا نام لیا تھا) دریافت کیا کہ جو شخص قرآن سنے کیا اس پر کان لگا کر سننا اور خاموش رہنا واجب ہے انہوں نے جواب دیا کہ آیت إِذَا قُرِئَ الْقُرْآنُ فَاسْتَمِعُوا لَهُ وَأَنْصِتُوا امام کے پیچھے قرأت کرنے کی ممانعت کے لئے نازل ہوئی تھی۔
میں کہتا ہوں کہ إِذَا قُرِئَ الْقُرْآنُ میں الْقُرْآن میں الف لام عہد کے لئے ہے جنس کے لئے نہیں ہے اس سے مراد وہ قرآن ہے جو پڑھنے والا تمہارے سنانے کو پڑھ رہا ہو جیسے امام مقتدیوں کو سنانے کے لئے پڑھتا ہے یا خطیب اہل مجلس کو خطاب کرنے کے وقت پڑھتا ہے یا قاری شاگردوں کو سکھانے کے لئے پڑھتا ہے۔ واللہ اعلم۔

فصل

اگر پڑھنے والا خود یا امام نماز میں قرأت کے اندر جنت اور دوزخ کا تذکرہ پڑھے تو (جنت میں داخل ہونے کی) دعا مانگنا اور دوزخ میں داخل ہونے سے) پناہ مانگنا اجنبی ہے دعا اور تعوذ جائز نہیں۔ کلبی کا قول ہم نے اوپر ذکر کر دیا ہے۔ ابن ہمام نے لکھا ہے کہ قرآن سننے کے وقت کان لگانے اور خاموش رہنے والے سے اللہ نے رحمت کا وعدہ فرمایا ہے، ارشاد فرمایا ہے فَاسْتَمِعُوا لَهُ وَأَنْصِتُوا لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُونَ اور اللہ کا وعدہ غلط نہیں ہو سکتا اور قرآن کی طرف سے غافل ہو کر دعا کرنا اور اس دعا کا قبول ہونا کوئی قطعی یقینی نہیں ہے۔

پر روایت کرتی ہیں جن میں بیان کیا گیا ہے کہ گھر کے اندر رسول اللہ ﷺ اتنی آواز سے پڑھتے تھے کہ حجرہ سے باہر قراءت سنائی دیتی تھی اور حضرت ام ہانی نے اپنی چھت پر حضور ﷺ کی قراءت کی آواز سنی تھی۔

جمہور کے نزدیک پڑھنے والے کو اختیار ہے آواز سے پڑھے یا چپکے چپکے۔ حضرت ابو ہریرہؓ اور حضرت عائشہؓ کی روایات میں آیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ کبھی آواز اونچا کر کے پڑھتے تھے کبھی پست آواز سے۔ طحاوی نے لکھا ہے کہ حضرت ام ہانی اور حضرت ابن عباسؓ کی حدیثوں میں رسول اللہ ﷺ کی آواز سے قراءت کرنے کا اظہار ضرور ہے مگر یہ روایات اس بات کے منافی نہیں کہ حضور ﷺ کبھی پست آواز سے قراءت کرتے تھے (یعنی ان روایات میں ہمیشہ اونچی آواز سے پڑھنے کا اظہار نہیں ہے) حضرت ابو ہریرہؓ کی حدیث ظاہر کر رہی ہے کہ نمازی کو اختیار ہے چپکے چپکے پڑھے یا آواز سے۔ جس طرح چاہے پڑھے۔ مؤخر الذکر صورت افضل ہے۔ امام ابو حنیفہ اور امام ابو یوسف اسی کے قائل ہیں۔ جو لوگ نمازی کو اخفاء و جہر کا اختیار دیتے ہیں ان میں پھر دو گروہ ہیں ایک گروہ اخفاء کو افضل کہتا ہے کیونکہ حضرت عقبہ بن عامرؓ کا بیان ہے کہ میں نے خود سنا رسول اللہ ﷺ فرما رہے تھے آواز سے قرآن پڑھنے والا سب کے سامنے صدقہ دینے والے کی طرح ہے اور چپکے چپکے قرآن پڑھنے والا چھپا کر صدقہ دینے والے کی طرح ہے۔ رواہ ابو داؤد والترمذی والنسائی۔ ترمذی نے اس حدیث کو حسن کہا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ چھپا کر خیرات کرنا علانیہ خیرات کرنے سے افضل ہے۔ اللہ نے فرمایا ہے اِنْ تُبْدُوا الصَّدَقٰتِ فَنِعِمَّا هِيَ وَاِنْ تُخْفُوْهَا وَتُؤْتُوْهَا الْفُقَرَآءَ فَهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ۔ سلف کی ایک جماعت کا یہی قول ہے۔

اعمش کا بیان ہے میں ابراہیم کی خدمت میں حاضر ہوا وہ قرآن مجید دیکھ کر پڑھ رہے تھے اتنے میں ایک شخص داخلہ کا خواستگار ہوا۔ آپ نے فوراً قرآن مجید کو ڈھک دیا اور فرمایا یہ شخص دیکھے نہ پائے کہ میں ہر وقت قرآن پڑھتا ہوں۔ ابو العالیہ کا بیان ہے میں صحابہ کرام کے پاس بیٹھا ہوا تھا ایک شخص نے کہا: آج رات میں نے اتنا قرآن پڑھا صحابہ نے فرمایا قرآن سے تیرا نصیب یہی تھا۔

اکثر علماء کے نزدیک آواز سے پڑھنا افضل ہے۔ اس قول کی تائید ان احادیث سے ہوتی ہے جن میں آواز سے پڑھنے کا ذکر ہے اس مضمون کی چند احادیث پہلے نقل کی جا چکی ہیں۔

ان کے علاوہ ایک حدیث حضرت ابو ہریرہؓ کی روایت سے صحیحین میں مذکور ہے کہ رسول اللہ ﷺ فرما رہے تھے اللہ کسی چیز کو اتنی توجہ سے نہیں سنتا جتنا خوش آواز نبی کی آواز کو توجہ سے سنتا ہے جو آواز سے قرآن کو اچھی لے سے پڑھ رہا ہو۔ سننے سے اشارہ ہے رضامند ہونے اور قبول کرنے کی طرف۔

صحیحین میں حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ کا بیان منقول ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے مجھ سے فرمایا تجھے داؤد کے مزامیر میں سے ایک مزمار دیا گیا ہے۔

ابن ماجہ نے حضرت فضالہ بن عبیدؓ کی روایت سے بیان کیا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جس قدر گانے والی عورت کے گانے کی آواز توجہ سے اس کا آقا سنتا ہے اس سے زیادہ توجہ سے اللہ اس خوش آواز شخص کی قراءت سنتا ہے جو آواز سے قرآن پڑھتا ہے۔

ابو داؤد اور نسائی وغیرہ نے حضرت براء بن عازب کی روایت سے لکھا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اپنی آوازوں سے قرآن کی سجاوٹ کرو (یعنی خوش آوازی سے پڑھو کہ سننے والے کو قرآن کی عمدگی معلوم ہو اور تحسین محسوس ہو) مختلف احادیث میں مطابقت پیدا کرنے اور تضاد کو دور کرنے کے لیے امام نووی اور کچھ دوسرے علماء نے لکھا ہے کہ اگر پڑھنے والے کو خود اپنے متعلق ریاکار ہو جانے کا اندیشہ ہو اور دوسرا یہ ہو کہ آواز سے قرآن پڑھنا میرے اندر عجب و غرور پیدا کر دے گا تو چپکے چپکے پڑھنا افضل ہے اگر ریا کا اندیشہ نہ ہو تو آواز سے پڑھنا اولیٰ ہے۔ جہر کے ساتھ پڑھنے سے دوسروں کو بھی فائدہ پہنچتا ہے پڑھنے والے کے دل میں بیداری بھی پیدا ہوتی ہے، خیالات کی پراگندگی زائل ہو جاتی ہے، کان بھی قرآن کی طرف متوجہ ہو جاتے ہیں، نیند بھاگ

ہوتی ہے، جس سے جہالت جاتی ہے، سونے والے اور غافل آدمی بھی اس کے پڑھنے سے بیدار اور ہوشیار ہو جاتے ہیں۔ ان تمام مقاصد
کے پیش نظر آواز سے پڑھنا افضل ہے اور ثواب چند گنا ہو جاتا ہے۔ اسی لئے ہم کہتے ہیں کہ قرآن میں دیکھ کر پڑھنا اولیٰ ہے۔

میں کہتا ہوں کوئی شک نہیں کہ آواز سے قرآن پڑھنے کی احادیث بکثرت آئی ہیں اور صحابہ و تابعین کے آثار و
اقوال بھی اس سلسلہ میں بے شمار ہیں لیکن یہ حکم اسی شخص کے لئے ہے جس کو اپنے اوپر ریا کا شبہ نہ ہو، غرور و عجب پیدا ہو جانے
کا اندیشہ نہ ہو، کسی کو تکلیف بھی نہ ہو، کسی کی نماز میں خلل بھی نہ پڑتا ہو، اگر اس قسم کا کوئی اندیشہ ہو تو آواز سے پڑھنا درست
نہیں۔ اندیشہ نہ ہو تو جہراً قرأت مستحب ہے۔ اگر ایک جماعت سننے کے لئے جمع ہو تب تو آواز سے پڑھنا اور بھی افضل ہے۔
مگر بہت چیخ کر پڑھنا اور اپنے کو تکلیف و مشقت میں ڈال کر جہر کے ساتھ پڑھنا جائز کسی طرح نہیں۔ اللہ نے فرمایا ہے وَدُونَ
الْجَهْرِ مِنَ الْقَوْلِ۔ امام محمد نے موطا میں امام مالک کی روایت سے ابو سہیل کے باپ کا قول نقل کیا ہے کہ حضرت عمر بن
خطاب نماز میں اتنی آواز سے قرأت کرتے تھے کہ ہم ابو جہم کے گھر کے پاس ان کی قرأت سن لیتے تھے۔ اسی لئے امام محمد نے فرمایا
کہ جہری نماز میں آواز سے قرآن پڑھنا چاہئے لیکن پڑھتے وقت زور لگا کر اپنے کو دکھ میں نہ ڈالنا چاہئے۔

ایک شبہ:۔ اللہ کے ذکر اور دعا میں جہر کرنا بدعت ہے، چپکے چپکے ذکر اور دعا کرنا سنت ہے۔ آیت ادْعُوا رَبَّكُمْ
تَضَرُّعًا وَّخُفْيَةً کی تفسیر میں یہ مسئلہ آ چکا ہے۔ پھر قرأت اور ذکر میں کیا فرق ہے قرأت بھی تو ذکر ہی ہے۔

جواب:۔ قرآن میں نصیحتیں بھی ہیں۔ عبرت انگیز سبق آموز قصے بھی ہیں اور احکام بھی ہیں۔ اس کی عبارت معجزہ
میٹھی اور دلکش بھی ہے۔ یہ چیزیں ذکر سے زائد ہیں۔ ذکر سے تو دل سے غفلت دور ہو جاتی ہے بجائے خود یہ عبادت ہے لیکن
دوسرے کو سنانا اور اس میں بیداری پیدا کرنا مزید عبادت ہے۔ دعا کی غرض صرف قبولیت ہے اور ذکر کا مقصد ازالۂ غفلت اور
اتنا انہماک کہ خود ذاکر کو اپنا بھی ہوش نہ رہے وہ اپنے کو بھول جائے اور بصیرت کے اندر خدا ہی خدا رہ جائے۔ قرأت میں یہ
بات نہیں ہے۔

فائدہ:۔ شعبہ کا بیان ہے مجھے ابو عبیدہ نے حدیث زَيِّنُوا الْقُرْآنَ بِأَصْوَاتِكُمْ بیان کرنے سے منع کر دیا تھا۔ ابو عبیدہ
نے کہا ممانعت کی وجہ ہمارے خیال میں یہ ہو گی کہ اس حدیث کو سن کر لوگوں کو ان نو ایجاد لحنوں کا جواز ہاتھ لگ جائے گا جو
لوگوں نے ایجاد کر رکھے ہیں۔ اس کے بعد ابو عبیدہ نے قرآن کو خوش آوازی سے پڑھنے کے سلسلہ کی بکثرت احادیث نقل
کیں اور فرمایا ان تمام احادیث کا مقصد یہ ہے کہ غم انگیز، خوف آفریں اور شوق انگیز طریقہ اختیار کیا جائے۔ یہ تفریحی نو آئین
لہجے اور لے مراد نہیں ہیں۔ ابو عبیدہ نے اپنے اس قول کے ثبوت میں مرفوع اور غیر مرفوع متعدد احادیث بیان کیں جن میں
اسی مفہوم کی تشریح تھی۔ طاؤس کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ سے دریافت کیا گیا سب سے زیادہ اچھی آواز سے قرآن
پڑھنے والا کون ہے۔ اچھی قرأت کرنے والا کون ہے۔ فرمایا (سب سے اچھا پڑھنے والا) وہ شخص ہے کہ جب تم اس کی قرأت سنو
تو سمجھو کہ یہ اللہ سے ڈر رہا ہے (یعنی اس پر اس وقت خشیت کی کیفیت طاری ہے)۔

دارمی نے طاؤس کا قول مرسلاً بیان کیا ہے کہ قرآن پڑھنے میں سب سے زیادہ خوش آواز وہ شخص ہے جو پڑھتے وقت
سب سے زیادہ اللہ سے ڈرتا ہو۔

حضرت حذیفہ راوی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا عرب کی لے اور آوازوں میں قرآن پڑھو۔ اہل عشق کی لے اور اہل
دونوں کتابوں والوں کے ترانوں سے پرہیز رکھو۔ آئندہ میرے بعد ایسے لوگ آئیں گے جو گانے کی ٹکڑی سے اور نوحہ کے
طرز سے قرآن پڑھیں گے، مگر قرآن ان کے حلق سے نیچے نہ اترے گا۔ ان کے اور ان کی کیفیت کو پسند کرنے والوں کے دل
فتنہ میں مبتلا ہوں گے۔ رواہ البیہقی فی شعب الایمان و رزین فی کتابہ۔

مجاہد نے کہا آیت کا مطلب یہ ہے کہ دلوں کے اندر ذکر کریں یعنی دعا میں عاجزی اور تضرع کریں، آواز بلند نہ کریں،
چیخ پکار نہ مچائیں، چپکے چپکے دعا کرنے سے خلوص قلبی میں اضافہ ہوتا ہے۔ میں کہتا ہوں اس تفسیر پر وَدُونَ الْجَهْرِ مِنَ

اَلْقَوْلِ کا یعنی نَفْسِكَ پر عطف تفسیری ہو گا (جو مطلب فِیْ نَفْسِكَ کا ہو گا وہی مطلب دُوْنَ الْجَهْرِ کا) ذکر کی جہری کا مسئلہ آیت اُدْعُوْا رَبَّكُمْ تَضَرُّعًا وَّ خُفْيَةً کی تفسیر میں بیان ہو چکا ہے۔

بیضاوی نے لکھا ہے۔ یہ مقتدی کو حکم ہے کہ جب امام قرأت سے فارغ ہو جائے تو مقتدی چپکے چپکے پڑھ لے جس طرح امام شافعی کا قول ہے مگر بیضاوی کا یہ قول غلط ہے کیونکہ آیت میں رسول اللہ ﷺ کو خطاب ہے آپ ﷺ امام تھے مقتدی نہ تھے اور مقتدیوں کو خطاب ہوتا تو جمع کا صیغہ استعمال کیا جاتا جیسے فَاسْتَمِعُوْا لَهٗ وَاَنْصِتُوْا لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ میں ہے۔ پھر یہ بھی ایک بات ہے کہ قرأت جہری ہو یا سری کان لگا کر سننے اور خاموش رہنے کے تو بہر حال منافی ہے اور امام کی قرأت کے بعد مقتدی کا پڑھنا آیت سے مستفاد نہیں ہے مذ آیت فَاسْتَمِعُوْا اور آیت دُوْنَ الْجَهْرِ میں تضاد لازم آئے گا دونوں پر عمل ایک وقت میں نہیں ہو سکتا۔ اس کے علاوہ امام قرأت سے فارغ ہو کر رکوع کو چلا جائے گا تو موقع ہی کہاں ہو سکتا ہے کہ مقتدی بھی قرأت کرے اور امام سے رکوع کی حالت میں مقتدی کا قرأت کرنا بالاجماع علاوہ درست نہیں ہے اور اگر امام مقتدی کی قرأت کے انتظار میں ٹھہرا رہے گا تو امام تابع رہے گا مقتدی کا تابع ہو جائے گا۔

بِالْغُدُوِّ غدو مصدر ہے تڑکے میں داخل ہونا۔ غَدَا يَغْدُوْا اس کا فعل آتا ہے یہاں مراد ہے دن کا ابتدائی وقت۔ قاموس میں ہے اَلْغُدْوَةُ بالضم تڑکا، دن کا ہو پھٹنے سے طلوع آفتاب تک کا وقت۔

وَالْاٰصَالِ یعنی دن کا آخری وقت یہ اٰصِيْلٌ کی جمع ہے۔ بغوی نے لکھا ہے اٰصِيْلٌ کا وقت عصر سے مغرب تک ہوتا ہے ان دونوں وقتوں کو فضیلت حاصل ہے، اس لئے خصوصیت سے ان کا ذکر کیا ورنہ مراد ہے دوام ذکر، ہر وقت اللہ کا ذکر کرنا۔ آیت وَلَا تَكُنْ مِّنَ الْغٰفِلِيْنَ دوام ذکر پر ہی دلالت کر رہی ہے۔

وَلَا تَكُنْ مِّنَ الْغٰفِلِيْنَ یعنی کسی وقت اللہ سے غافل نہ ہو۔ میں کہتا ہوں آیت وَاذْكُرْ رَّبَّكَ فِیْ نَفْسِكَ کے بعد بِالْغُدُوِّ وَالْاٰصَالِ وَلَا تَكُنْ مِّنَ الْغٰفِلِيْنَ فرمانا اس بات پر دلالت کر رہا ہے کہ ذکر سے مراد عام مفہوم ہے، خواہ قرأت قرآن ہو یا کوئی اور ذکر، مقصد یہ ہے کہ غفلت دور ہو جائے جس طرح بھی ممکن ہو۔

اِنَّ الَّذِيْنَ عِنْدَ رَبِّكَ لَا يَسْتَكْبِرُوْنَ عَنْ عِبَادَتِهٖ وَيُسَبِّحُوْنَهٗ وَلَهٗ يَسْجُدُوْنَ ۩

(بے شک وہ لوگ جو تیرے رب کے پاس ہیں (یعنی مقرب ہیں) اس کی عبادت سے تکبر نہیں کرتے اور اس کی پاکی بیان کرتے ہیں اور اسی کو سجدہ کرتے ہیں)۔

اِنَّ الَّذِيْنَ عِنْدَ رَبِّكَ اَلَّذِيْنَ سے مراد ہیں ملائکہ، انبیاء اور نیک بندے۔ اللہ کو قرب مکانی طور پر محال ہے۔ اللہ جسم نہیں ہے اس کے پاس ہونے اور مقرب ہونے کے معنی ہیں معزز و مکرم ہونا۔ لَا يَسْتَكْبِرُوْنَ عَنْ عِبَادَتِهٖ اللہ کی عبادت سے اپنے کو بڑا نہیں سمجھتے، غرور نہیں کرتے بلکہ عبادت کی وجہ سے بڑے بنے ہیں۔ وَيُسَبِّحُوْنَهٗ اور نازیبا غیر مناسب صفات سے اس کو پاک سمجھتے اور پاک قرار دیتے ہیں اور کہتے ہیں سُبْحَانَ رَبِّیَ الْاَعْلٰی۔ وَلَهٗ يَسْجُدُوْنَ اور اسی کو سجدہ کرتے ہیں یعنی اسی کی عبادت کرتے ہیں کسی دوسرے کو عبادت میں شریک نہیں کرتے۔

معدان بن طلحہ کا بیان ہے کہ میں حضرت ثوبانؓ سے ملا جو رسول اللہ ﷺ کے آزاد کردہ تھے اور عرض کیا مجھے کوئی ایسا عمل بتا دیجئے کہ جس کی وجہ سے میں جنت میں پہنچ جاؤں، آپ خاموش رہے۔ میں نے دوبارہ درخواست کی۔ آپ پھر بھی خاموش رہے۔ میں نے تیسری بار سوال کیا تو فرمایا میں نے رسول اللہ ﷺ سے یہی سوال کیا تھا حضور ﷺ نے فرمایا تھا اللہ کو بکثرت سجدہ کرنے کا التزام کرو، تم جو سجدہ بھی اللہ کو کرو گے اللہ اس سے تمہارا ایک درجہ اونچا کر دے گا اور ایک گناہ معاف کر دے گا۔ معدان کا بیان ہے پھر میں حضرت ابو درداءؓ سے ملا اور ان سے بھی یہی سوال کیا تو انہوں نے بھی یہی جواب دیا جو حضرت ثوبانؓ نے فرمایا تھا، رواہ مسلم۔ دوسری روایت میں حدیث ان الفاظ کے ساتھ آئی ہے جو بندہ بھی اللہ کو کوئی سجدہ کرتا ہے تو اللہ اس سجدہ کے سبب سے ضرور اس کا ایک درجہ اونچا کرتا اور ایک گناہ گراتا ہے۔ رواہ احمد والترمذی والنسائی وابن حبان والبغوی۔

حضرت ابوہریرہؓ راوی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جب ابن آدم سجدہ کی آیت پڑھ کر سجدہ کرتا ہے تو شیطان روتا ہوا الگ ہو جاتا ہے اور کہتا ہے ہائے ابن آدم کو سجدہ کا حکم دیا گیا تو اس نے سجدہ کیا اور اس کے لئے جنت ہو گئی اور مجھے سجدہ کا حکم دیا گیا تو میں نے سجدہ سے انکار کر دیا میرے لئے دوزخ ہو گئی رواہ مسلم۔

حضرت ربیعہ بن کعبؓ کا بیان ہے میں رات کو رسول اللہ ﷺ کے ساتھ رہتا تھا، حضور ﷺ کے لئے وضو کا پانی اور دوسری ضروریات کی چیزیں فراہم کر دیتا تھا ایک روز حضور ﷺ نے مجھ سے فرمایا مانگ (کیا مانگتا ہے) میں نے عرض کیا میں حضور ﷺ کی رفاقت جنت میں چاہتا ہوں، فرمایا اس کے علاوہ کچھ سوال کرو، میں نے عرض کیا میرا سوال تو یہی ہے، فرمایا تو سجود کی کثرت سے اپنے لئے میری مدد کرو (یعنی سجود کی کثرت کرو تاکہ جنت میں، میں تم کو اپنے ساتھ رکھ سکوں) رواہ مسلم۔

ہم نے سجدہ تلاوت کے مسائل سورۂ انشقت کی تفسیر میں بیان
کر دیئے ہیں واللہ اعلم۔ ۱۶ محرم ۱۲۰۰ھ کو سورۂ
اعراف ختم ہوئی۔ اور ۱۳ رمضان ۱۳۸۳ھ
کو فجر کے وقت بحمد اللہ ترجمہ کی تکمیل ہوئی۔